فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

جلد ۱۲
شمارہ ۱

فاران کراچی

رکنِ انجمن ادبی رسائل، پاکستان

ماہ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

ترتیب

قیمت سالانہ: چھ روپے　　فی پرچہ: آٹھ آنے

ساجد سعید تحریر نمود
M. SAEED.

مقامِ اشاعت: دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش اوّل

اس مہینہ میں عوام کی طرف سے جگہ جگہ "اقبال ڈے" منایا جائیگا اور سرکاری حلقوں سے بھی علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا، غیر ممالک سے جب علمی و ثقافتی وفود آتے ہیں، یا مُسلم حکومتوں کے اربابِ حل وعقد کا پاکستان میں نزولِ اجلال ہوتا ہے تو حکومت کی زبان اقبالؔ ہی کی شخصیت کو پاکستان کے نشانِ امتیاز اور بین الاسلامی اتحاد کے نقیب کی حیثیت سے پیش کرتی ہے! پاکستان کے عوام و خواص، بوریا نشین اور کرسی نشین اقبالؔ کے ساتھ جس عقیدت و محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اقبالؔ یقیناً اس کا مُستحق ہے! اس کی شاعری نے بلاشبہ دین کی تجدید و احیاء کا انقلابی کارنامہ انجام دیا ہے، یہ نہیں ہے کہ اقبال دُنیا کے عظیم شاعروں میں ایک شاعر ہے بلکہ وہ دُنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے!

شاعری کو "پیغمبری" نہیں ——— جزویست از پیغمبری ——— کہا گیا ہے، اور "جزویست از پیغمبری" وہی شاعری ہو سکتی ہے جس کا مقصود دل و دماغ کی تفریح اور جذبات کا عیش و نشاط نہیں بلکہ انسانیت کی اصلاح اور معاشرے کی تعمیر ہو۔ اقبالؔ کی شاعری میں اسی "پیغمبرانہ حکمت" کی جھلک نظر آتی ہے!

شاعری عام طور پر لوگوں کو "لذتیت" کی طرف مائل کرتی ہے اور نوجوانوں کی تنہائیاں شاعری کی بدولت کم سے کم خیالی طور پر معصوم نہیں رہتیں! یہ تو ہم انتہائی محتاط انداز میں نرم سے نرم بات شاعری کے بارے میں کہہ رہے ہیں اور اس میں خود ہمارے نفس کی چوریاں بھی چھپی ہوئی ہیں، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کی تمام شاعری کو جمع کر کے اگر اس کا جائزہ لیا جائے، تو شاعری کا غالب حصہ ایسا نکلے گا، جو ہوسناک جذبات کو شہہ دیتا ہے اور نفس کو ایسی باتیں سجھاتا ہے:۔

می خور کہ بر فسانۂ واعظ نہ داد گوش　　آنرا کہ چشم بر کرم کردگار بود　　(وصالؔ شیرازی)

من نہ خود توبہ شکستم کہ گنہگار شوم　　توبہ خود را شکند چوں تو شوی بادہ پرست　　(لعلی تبریزی)

من آں نیم کہ حلال از حرام نہ شناسم　　شراب با تو حلالست و آب بے تو حرام　　(سعدیؔ)

——— اور ———

ناصح کو پاکبازی اور نیکوکاری کی باتوں پر یہ کہہ کر دھتکارا جاتا ہے...... کہ:۔ ؎

کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

——— مگر ———

اقبالؔ کی شاعری شرافتِ نفس، عصمتِ کردار، تعمیرِ حیات اور سب سے بڑھ کر ایمان و یقین کی تعلیم دیتی ہے، اقبالؔ کے کلام سے نوجوانوں کی تنہائیاں اخلاق کی خوشبو سے مہکتی ہیں!

مقصود کلام اقبالؔ کے محاسن کو پیش کرنا نہیں ہے، کہنا یہ ہے کہ پاکستان میں عوام و خواص کو اقبالؔ سے جو اس قدر عقیدت ہے

اور جھونپڑیوں سے لے کر قصر وایوان تک جو اس کے کلام کی دھوم مچی ہوئی ہے ——— تو اقبالؔ کے کلام و پیام کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے؟ کیا اقبالؔ کے کلام کی بس اتنی ہی قدر و قیمت ہے کہ مشاعروں کی طرح اُس پر تالیاں بجیں، واہ واہ کا شور برپا ہو اور مدح و منقبت کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے اقبالؔ کی قدر دانی کا حق ادا کر دیا، ایسی داد و تحسین جس کے ساتھ اقبالؔ کے پیام کی عملی روح نہ ہو، اقبالؔ جیسے صاحبِ دعوت شاعر کی ہجوِ ملیح نہیں تو اور کیا ہے؟

اقبالؔ نے ملّتِ اسلامیہ سے اجتماعی طور پر بھی خطاب کیا ہے اور افراد کو بھی مخاطب بنایا ہے، پیامِ مشرق میں حکیم الاُمت کا بظاہر خطاب تو شاہ امان اللہ خاں سے ہے مگر حقیقت میں یہ پیغام ہر مسلم حکمراں کے نام ہے۔ فرماتے ہیں:- ؎

تازہ کن آئینِ صدیقؓ و عمرؓ ۔۔۔ چوں صبا بر لالۂ صحرا گزر

سروری در دینِ ما خدمت گری است ۔۔۔ عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند ۔۔۔ در شہنشاہی فقیری کردہ اند

در امارت فقر را افزودہ اند ۔۔۔ مثلِ سلماںؓ در مدائن بودہ اند

حکمرانے بود و سامانے نداشت ۔۔۔ دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت

دُنیا کی تاریخ باجبروت بادشاہوں اور صاحبِ سطوت حکمرانوں سے بھری پڑی ہے مگر اقبالؔ کی نگاہ ضحاک و جمشید، قیصر و کسریٰ، قسطنطین و سکندر، اشوک و بکرماجیت، ہارون الرشید اور اکبرِ اعظم، نپولین اور شاہ ولیم، کمال پاشا اور رضا شاہ پہلوی میں سے کسی پر جاکر نہیں ٹھہرتی، وہ ان میں سے کسی شخصیت کو بھی حکمرانی اور جہاں بانی کے لئے قابلِ تقلید نمونہ نہیں سمجھتا، اقبالؔ کی نگاہِ حقیقت بیں میں صدیقؓ و عمرؓ اور علیؓ و سلماںؓ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) وہ عظیم شخصیتیں ہیں جو سلطنت و حکمرانی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں، ان کی زندگیوں میں کشور کشائی بھی ہے، شمشیر افگنی اور ضرب و حرب کی معرکہ آرائیاں بھی ہیں، تدبیر و سیاست بھی ہے، عدل و انصاف بھی ہے ایثار و رواداری بھی ہے، خدمتِ خلق بھی ہے، تقویٰ اور پاکیزگی بھی ہے، اُن کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھا ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان تھے، وہ اپنی ذات پر کم سے کم خرچ کرتے تھے، اُن کے یہاں نہ جام و مینا کھنکتے تھے اور نہ رقص و نغمہ کی محفلیں جمتی تھیں، طاؤس و رباب تو انھوں نے توڑ کر پھینک دیئے تھے، انھوں نے جس تہذیب و ثقافت کو پھیلایا تھا وہ اسلامی اخلاق کی ثقافت و تہذیب تھی!

پس اقبالؔ کے نقطۂ نگاہ سے

مُسلم حکمرانوں اور کشور کشاؤں کو چاہیے وہ اہلِ قلم ہوں یا اہلِ سیف۔ اپنی زندگیوں میں صدیقؓ و فاروقؓ اور علیؓ مرتضیٰ کی سیرت و کردار کی زیادہ سے زیادہ جھلک پیدا کرنی چاہیئے! حکومت بہت بڑی آزمائش ہے، اس آزمائش میں پورا اترنے کے لئے ہر لمحہ خشیتِ الٰہی اور محاسبۂ آخرت کے خوف کی ضرورت ہے، جس کی جتنی زیادہ ذمہ داریاں بڑھی ہوئی ہیں، اُسی قدر اُس سے سخت باز پُرس بھی ہوگی، قیامت کے دن نہ شعرا کی قصیدہ خوانیاں کام آئیں گی، اور نہ ہوا خواہوں کے سپاسنامے! اُس دن ہر شخص سے اس کے اعمال کا محاسبہ ہوگا! صدیقؓ و فاروقؓ رضی اللہ عنہما کے آئینِ جہاں بانی اور طرزِ حکومت کی کامیابی کا راز ہی یہ تھا کہ وہ ہر کام اپنے نفس کی لذّت اور اپنی شخصیت کی نمود کے لئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے!۔ وہ صاحبِ امر مبارک ہے، جس کے سامنے صدیقؓ و فاروقؓ کی مقدس زندگیاں ہوں، اور جو اپنے کو انہی پاک سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہو!

اقبال قرآنی تعلیمات کا بہت بڑا مبلغ ہے، دُنیا کا یہ شاعرِ اعظم کس سوز و درد اور اخلاص و یقین کے ساتھ کہتا ہے :-

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

اقبال کے نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، قرآنی احکام کے تحت بسر ہونی چاہیے، قرآنی احکام پر عمل کئے بغیر مسلمان کی زندگی کوئی زندگی نہیں، قرآن کی اس قسم کی تلاوت جس کا مقصود صرف حصولِ برکت ہو، اور پوری زندگی سے قرآنی تعلیمات کی نفی ہوتی ہو! ایسی تلاوت قرآنِ کریم کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے، قرآن بے شک صحیفہ برکت بھی ہے مگر ساتھ ہی دستورِ عمل اور منشورِ حیات بھی تو ہے! اگر کوئی شخص اس ملک میں چوری کرتا ہوا پکڑا جائے، اور وہ عدالت میں حاضر ہو کر، اپنی صفائی میں یہ کہے کہ میں تو تعزیرات پاکستان کو دن میں کئی مرتبہ چومتا ہوں..... اور اس کتاب پر میں نے ریشمیں غلاف چڑھا رکھے ہیں اور رات کو اُسی کے سایہ میں سوتا ہوں. تو ایسے مجرم کو مجسٹریٹ جیل خانہ بھیجنے سے پہلے، چند دنوں کے لئے اُس کو پاگل خانہ میں رکھے جانے کا حکم دے گا کہ ایسی باتیں ایک دیوانہ اور مخبوط الحواس ہی کر سکتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو اس لئے نازل فرمایا ہے کہ مسلمان اسے پڑھیں، اس میں غور و تدبر کریں اور تلاوت و تدبر کر کے ہی نہ رہ جائیں، قرآنی احکام پر عمل پیرا بھی ہوں، اور اپنی زندگیوں کو قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال دیں، یہاں تک کہ :-

قاری نظر آتے ہیں حقیقت میں ہیں قرآن

بن جائیں، یعنی مسلمانوں کی صرف زبان ہی نہیں، ان کی زندگیاں بھی قرآن کی تلاوت کرتی ہوں، اور وہ عملاً قرآن مجید کے ترجمان بن کر شہادتِ حق اور اقامتِ دین کا فرض انجام دیں۔

عشقِ رسولؐ بھی اقبال کے افکار کا سب سے زیادہ اہم موضوع ہے :-

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

اور

عشق کا لازمی نتیجہ اطاعتِ نبیؐ ہے۔ اطاعت کے بغیر عشق نامعتبر ہے، اطاعتِ رسولؐ کی لائی ہوئی کتاب کی اور حضورؐ کی سُنّت کی! اخلاقِ محمدیؐ کی زندگی میں جتنی جھلک آئے گی، اُسی قدر زندگی کو جلا اور روشنی نصیب ہوگی، جو زندگی اخلاقِ نبویؐ کی جھلک سے محروم ہے، وہ زندگی دو کوڑی کے مول کی بھی نہیں ہے، چاہے اُس نے چاند سورج ہی کو کیوں نہ مسخر کر لیا ہو! "عشقِ مصطفےٰ" ایمان کی علامت ہے بلکہ لازمۂ ایمان ہے! جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی نافرمانی کر کے عشقِ رسولؐ کا دعویٰ کیا، اُس نے عشق کو بدنام کیا، عاشقی تو ——— "بندۂ جاناں بودن" ——— کا نام ہے!

اقبال مغربی تہذیب کا بہت بڑا مخالف تھا، اُس نے مغربی تہذیب و تمدن کے قلب اور مرکز میں رہ کر اس تہذیب کا مشاہدہ کیا اور اسے برت کر دیکھا، لیکن اُس نے اس تہذیب کو انتہائی کھوکھلا، پست اور بے وزن پایا، ظاہر بہت کچھ چمکیلا مگر باطن "دلِ چنگیز سے بھی زیادہ تاریک" صرف بناوٹ، ملمع سازی، نفاق! یہی تجربہ اور مشاہدہ شعر کے قالب میں ڈھل گیا

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ　　من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

انساں کہ رُخ زغازۂ تہذیب برفروخت
خاکِ سیاہ خویش چو آئینہ وانمود
ایں بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت
رقصید گرد اُو بہ نواہائے چنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید
جز "یسفک الدماء" "خصیم مبیں" نہ بود

اقبالؒ کے لفظوں میں اس مغربی تہذیب کا کام ہی انسانیت کا خون بہانا ہے، یہ تہذیب امن و آشتی کی دشمن اور اخلاق و نیکوکاری کی قاتل ہے۔

فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ
فریاد ز شیرینیٔ و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!

اقبالؒ اس تہذیب و تمدن کو دیکھ کر درد و کرب سے چیخ اٹھتا ہے، وہ سراپا فریاد بن جاتا ہے، اُس کی نگاہ میں مغرب مکر و حیلہ کی کارگاہ ہے، جہاں اُسے ہر طرف پرویز ہی پرویز نظر آتے ہیں، اُس کی نگاہِ فراست اُس ویرانی اور تباہی کو دیکھ لیتی ہے، جو ان مغربی چنگیزوں نے برپا کی ہے، ان ظالموں نے انسانیت کے قصر و ایوان اور اخلاق و نیکی کے محلوں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیا ہے! اس عالم میں اقبالؒ معمارِ حرم ——— یعنی مردِ مومن کو آواز دیتا ہے کہ خدا کے لئے عمل کے میدان میں آ، اور دنیا کی تعمیر کا فرض انجام دے!

اقبالؒ نے اپنے کلام میں جگہ جگہ مغربی سیاست، مغربی ثقافت، مغربی تہذیب اور مغربی فکر پر طنز کی ہے، کہیں کہیں تو یہ چٹکیاں "ضربِ کلیم" بن گئی ہیں کہ جس کی زد میں آ کر مغربیت کے بُت کھیل کھیل ہو گئے ہیں مگر عجیب ستم ظریفی ہے کہ اقبالؒ نے مغرب زدہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ خطاب کیا ہے، اور اُن کے دل میں اپنے دل کی بات اُتارنے کی کوشش کی ہے، لیکن مغرب زدہ طبقہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ اس خطاب کے مخاطب ہم نہیں، دوسرے لوگ ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے جس تہذیب کو "چنگیزیٔ افرنگ" کہا ہے، اس کے آثار پاکستان میں ابھی تک پائے جاتے ہیں، ان کو مٹ جانا چاہیئے تھا، لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگ ان آثار کو اس طرح سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں، جیسے انگریز نے یہ مقدس امانت اُن کو سونپ دی تھی اور وہ یہاں سے جاتے جاتے اپنے کلیسائے تہذیب کا سجادہ نشین ان کو بنا گیا ہے، پاکستان ان آثار کو ڈھا کر اسلامی تہذیب کے حرم کی تعمیر کے لئے وجود میں آیا تھا، عوام و خواص، بوریا نشین اور کرسی نشین سب کو اپنے ذہن و فکر کا، زبان کا لب و لہجہ کا، نشست و برخاست اور گھریلو زندگی کا جائزہ لینا چاہیئے کہ انگریز کی "باقیات السئیات" کس کس صورت میں ابھی تک ہماری تہذیب کو چیلنج کر رہی ہیں!

علمِ حقیقی کیا ہے!

حکیم الامت کا ارشاد ہے:—

دل اگر بندد بہ حق پیغمبری است
ور ز حق بیگانہ گردد کافری است

اللہ تعالیٰ سے بے گانہ ہو جانے کو اقبال "کافری" کہتا ہے اور سچ کہتا ہے! اللہ سے بے گانگی، بے تعلقی اور بے پروائی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اہمیت دلوں میں باقی نہ رہے! اللہ تعالیٰ نے کسی رمز و ابہام اور تشابہ کے بغیر زنا کو، شراب نوشی کو، قمار بازی کو، سود خواری کو، اور اسی طرح کے دوسرے کبائر کو حرام قرار دیا ہے، ان معاصی کا قانون کی سرپرستی میں، جہاں بھی ارتکاب ہو رہا ہے، وہاں علامہ اقبال کے بقول: ؎

در زحق بیگانہ گردد کافری است

کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

وہ اقبال جو مشرقی اور مغربی علوم کے سمندر پئے ہوتے ہے، اور اپنے دور کے اونچے درجہ کے فلسفیوں میں ممتاز مقام رکھتا تھا، "علم" کے بارے میں کہتا ہے۔

ایں تماشا ئیست سحرِ سامری است

علم بے روح القدس افسوں گری است

اقبال کی نگاہ میں "علم بے وحی" یعنی جس علم کو کتاب و سنّت کی تائید حاصل نہ ہو افسوں گری ہے کہ جو تھوڑی دیر کے لئے دل و نگاہ کو فریب تو دے سکتا ہے مگر دل و دماغ کو روشن نہیں بنا سکتا، حقیقی علم وہ ہے جو وحیٔ الٰہی کے مطابق ہو۔ باقی تو اصطلاحات کی نمود و نمائش اور لفظوں کی جادوگری ہے، اور جادو نے آج تک انسانیت کی کوئی خدمت انجام نہیں دی بلکہ اُلٹا نقصان پہنچایا ہے! اقبال مغرب کے علوم کو ایک کھیل تماشا یا زیادہ سے زیادہ سحرِ سامری سمجھتا ہے! اس جادو نے لوگوں کے دل و دماغ کو مخبوط بنا دیا ہے چونکہ یہ "علم بے وحی" ہے، اس لئے اس سے دل و دماغ کی تہذیب و تربیت اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہوتی جس طرح:-

شبِ مہ سایہ کی ظلمت کو فزوں کرتی ہے

اسی طرح یہ علم بھی دھندلے دلوں کو تاریک تر بنا رہا ہے، لوگوں اسے پڑھ کر بننے کے بجائے، بگڑ رہے ہیں! "علم بے وحی" سے معاشرے کی تعمیر کے بجائے تخریب ہی ہوتی ہے، ایسا علم صرف الفاظ و معانی کی پہچان ہے، اُسے پڑھ کر آدمی بہت سے بہت کارل مارکس، ڈارون اور فرائڈ بن سکتا ہے کہ جن کی عقل و دانش نے، تبحر علمی نے اور فکر و تدبر نے پوری انسانیت کو ضلالت و آوارگی کی راہ پر ڈال دیا ہے، ان "علماء بے وحی" کے یہاں کوئی شک نہیں بڑی باریک بینی، عمیق فلسفہ اور ندرتِ فکر پائی جاتی ہے مگر ان کی تمام علمی کوششوں اور نفسیاتی تجربوں کا حاصل گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے!

بوعلی سینا کتنا عظیم مسلمان فلسفی تھا۔ لیکن اُس کے کردار میں اور افکار میں "علم کتاب و سنت" کا گہرا رنگ اور موثر کیفیت نہیں ملتی، اس لئے اقبال اُس کے علم و فضل سے مرعوب نہیں ہوتا، وہ پوری جرأت کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے:-

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم

دستِ رومی پردہ محمل گرفت

بوعلی سینا کا سرمایہ افلاطون و ارسطو کی حکمت تھی، وہ "علم باوحی" کے مقابلہ میں یونانی علم سے زیادہ متاثر تھا، اس لئے اقبال کو وہ منزلِ حقیقت کے گرد و غبار میں کھویا ہوا نظر آتا ہے، لیکن دوسری طرف پیر رومی کو وہ محملِ حقیقت کے پردے تھامے ہوئے دیکھتا ہے کہ ان کی فکر و نظر پر علم کتاب و سنت غالب تھا۔ اور وہ صہبائے یقین و معرفت کے نشے سے سرشار تھے! اقبال کی نگاہ میں علوم و فنون میں اصل اعتبار "یقین" کا ہے، جہاں بے یقینی اور تذبذب ہے، وہاں ایک کروڑ فیثا غورث اور

فارابی بھی غبارِ ناقہ میں گم ہی نظر آئیں گے:

طاؤس و رباب آخر اقبال کی پوری شاعری اس کی گواہ ہے کہ اُس نے بت سازی، تصویر کشی، تھیٹر، سینما اور رقص و موسیقی کو لطیف و شریف فن نہیں سمجھا اور نہ انہیں اسلامی ثقافت کا مظہر قرار دیا ہے۔ یورپ اپنی لذت پرستی اور اخلاق بیگانگی کے سبب جن کو FINE ARTS کہتا ہے، اقبال نے تو اپنی شاعری میں اُن پر طنز کی ہے، اقبال کا بہت مشہور شعر ہے

آتجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

اقبال کی نگاہ میں "طاؤس و رباب" اُمتوں اور قوموں کی زوال کی علامت ہیں!

اقبال نہ تو خشک مُلا تھا، نہ بے ذوق تھا، اور نہ وہ لذتِ جمال سے بے گانہ تھا، وہ رنگینی و رعنائی کے تمام تقاضوں کو پہچانتا تھا۔ اُس کا ذوقِ جمال بھی معتبر تھا اور خود اُس نے "طاؤس و رباب" کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اس کے ساتھ حکومتوں اور قوموں کے عروج و زوال کی پوری تاریخ پر بھی اُس کی نگاہ تھی، اسی لئے طاؤس و رباب اور اس کے تمام متعلقات رقص و اداکاری پر علامہ اقبال کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے، اقبال چلتی ہوئی بات نہیں کہا کرتا تھا، اور نہ چھیڑ چھاڑ کی خاطر "طنز" اُس کا مشغلہ تھا، وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ نقد و احتساب کرتا تھا، کہ ؎

قلندر ہر چہ گوید، دیدہ گوید

مغربی تہذیب کو جو اقبال نے انسانیت کے لئے "چنگیز" قرار دیا تھا، تو اُس کا سبب یہ نہیں تھا کہ متعصب مُلاؤں اور خشک مولویوں کی زبان سے برائی سن کر یا ان کی کتابیں پڑھکر وہ مغربی تہذیب سے متنفر ہو گیا تھا، اقبال نے مغربی تہذیب کا خود تجربہ اور مغربی ماحول اور وہاں کی سوسائٹی کا عینی مشاہدہ کیا تھا، اس طوفان میں وہ خود اترا، اگر اس کے پاس یقین و ایمان کی قوت نہ ہوتی تو کیا عجب تھا کہ اس طوفان کی پُر شور موجوں کے سامنے وہ بے دست و پا ہو جاتا پھر یہ بھی نہیں تھا کہ اپنی کم علمی کے سبب اقبال تہذیب و مغرب کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکا ہو، جہاں تک علم و ذہانت کا تعلق ہے، اقبال یورپ کے کسی فلسفی اور مفکر سے گھٹ کر نہیں تھا، اس کی ذات مشرق و مغرب کے علوم کا سنگم تھی! اس لئے اُس نے مغربی تہذیب پر جو نقد و احتساب کیا ہے تو اس بارے میں اس کا موقف کسی جہت سے بھی کمزور نہیں تھا! اقبال کی یہ ایمانی جرأت تھی کہ فتنہ مغربیت پر طنز کرتے ہوئے اس نے ذرہ برابر جھجک محسوس نہیں کی کہ لوگ مجھے کیا کہیں گے اور خاص طور سے جدید تعلیم یافتہ اور تجدد زدہ طبقہ مجھے کن ناموں سے پکارا کرے گا!

اقبال کے زمانہ میں ہندوستان میں بے حجابی کا فتنہ دبا ہوا تھا مگر اقبال یورپ میں اس فتنہ کی دراز دستیوں کو دیکھ چکا تھا، اُس نے یورپ میں مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط کے اخلاق سوز مناظر کا مشاہدہ کیا تھا، اس لئے اقبال نے مسلمان عورت کو پوری دردمندی اور سوز و اخلاص کے ساتھ یہ پیغام دیا:

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

— اور —

"بتول" کا کردار کیا ہے؟ حجاب و شرم و حیا، وقار و سنجیدگی، غیرت و متانت خشیتِ الٰہی، پاکبازی، شوہر کی اطاعت، گھریلو زندگی

کی خوشگواری، تدبیر منزل، بچّوں کی دیکھ بھال اور اخلاق محمدی کی بنیاد پر اُن کی تربیت . . . . اور سے

آسیا گردان ولب قرآن سرا

پھر اسی مقدس آغوش میں شبیر جیسے نونہال پرورش پاکر، دنیا میں حق و صداقت اور جرأت و سرفروشی کے نقش دوام جریدہ عالم پر ثبت کرجاتے ہیں۔

مگر

آج کی تہذیب عورت کو رقاصہ اور ایکٹریس بنارہی ہے، شرم وحیا سے نفرت، شوہر کی اطاعت سے گریز، گھریلو زندگی سے فرار، کلب گھروں سے دل چسپی، اپنے حسن وادا کی نمائش کا شوق، غیرمردوں سے بے باکانہ اختلاط اور خوفِ خدا کا تو اس زندگی میں سرے سے کوئی خانہ ہی نہیں ہے۔

اقبال مسلمان عورت کو انہی حیاسوز فتنوں سے بچانا چاہتا ہے، وہ دیوکارانی اور گریٹاگاربو جیسے کرداروں کو انتہائی نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، عورت کے لئے خدیجہؓ، عائشہؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ، فاطمہؓ، اور رابعہ بصری رحؒ جیسی زندگیاں نمونہ ہیں!

جو عورت ناچ کر، کولھے مٹکاکر، بدن کو تھرکاکر، باہیں لچکاکر، اپنے اعضاء کے لوچ اور اُن کے نشیب و فراز کی نمائش کرکے مردوں کے دل ونگاہ کی تفریح اور جذبات کے لئے ہیجان کے اسباب مُہیا کرتی ہے، وہ درصل زنا کے داعیات کو اُبھارتی ہے اور جو کوئی اس قسم کے رقص وسرود کے جلسوں کا اہتمام کرتا ہے، وہ انتہائی ناپسندیدہ اور قابل مذمت . . . . . . پارٹ اداکرتا ہے، اقبال نے ہوسکاری اور سفلی جذبات کی اسی نمود و نمائش کو دیکھ کر ہی تہذیب افرنگ سے پناہ مانگی تھی سے

فریاد ز افرنگ و دل آویزی رنگ

کوئی شک نہیں لسان العصر اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال سے بہت پہلے عورتوں کی بے پردگی کے خلاف شاعرانہ زبان میں احتجاج کرچکے تھے، مگر اقبال نے وہ بات کہی، جو کسی نے بھی نہیں کہی، اس نے اس زمانہ کی عورت کو مخاطب کرکے کہا کہ تجلی وظہور اللہ تعالیٰ سے سیکھ :۔ سے

کہ او با صد تجلی در حجاب است

یہ وہ حقیقت ہے جو شاعر کے ذہن وفکر پر القا کی گئی ہے، یہ شاعرانہ الہام اور نوائے سروش ہے!

مُلّا اور اقبال

اقبال ایک داعی، مُصلح اور انقلابی شاعر ہے، وہ معاشرے کے کسی ایک مخصوص طبقہ کی نہیں بلکہ پوری سوسائٹی کی اصلاح چاہتا ہے، اور ہر طبقہ اور گروہ کی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے اس لئے اقبال نے پست ہمت، تنگ نظر، زمانہ ساز اور بندگانِ درہم و دینار "مُلّاؤں" پر بھی احتساب کیا ہے . . . . :۔ سے

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن

مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

اور

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

یہاں اس غلط فہمی کو بھی رفع کردینا ضروری ہے اقبال نے جس مُلّا کا اپنی شاعری میں ذکر کیا ہے، وہ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا "مُلّا"

ہرگز ہرگز نہیں ہے! خلیفہ عبدالحکیم کا دینی مسائل میں جو نقطۂ نگاہ تھا، اُس لحاظ سے تو خود علامہ اقبالؒ بھی "مُلّا" قرار پائیں گے کہ وہ اپنی تمام تنویرِ فکر اور روشن خیالی کے باوجود "پردے" کی حمایت کرتے ہیں اور بے حجابی کے سخت مخالف ہیں! آج اگر علامہ اقبال زندہ ہوتے تو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (لاہور) کے علی الرغم "برتھ کنٹرول" کی اخلاقی خرابیوں پر پرجوش نظم کہتے کہ دینی مسائل میں وہ بڑی صحیح اور متوازن فکر رکھتے تھے!

اقبالؒ نے جس مُلّا پر طنز کی ہے، وہ مغلیہ خاندان کے جاہل بادشاہ اکبرؔ کے دربار کے جی حضوری جیسے عالم تھے۔ جنھوں نے اکبر کی دینی گمراہیوں کے لئے جواز کی سندیں مہیا کی تھیں۔ اس ہمارے زمانے میں تیونس کا مفتی اعظم اقبالؒ کے "ملّا" کا مصداق ہے جس نے بورقیبہ جیسے تجدد زدہ، مغرب پرست اور گمراہ فرمانروا کو خوش کرنے کے لئے رمضان کے روزوں کی عام معافی کا فتویٰ صادر فرما دیا ہے، یا پھر "ملّایانہ ذہنیت" وہ ہے جس کا اظہار حجّاج جیسے ظالم و سنگدل حاکم نے کیا تھا کہ اُس نے ہزاروں مسلمانوں کو ذبح کر دیا، حرمِ کعبہ تک اُس کے ظلمِ بے پناہ سے محفوظ نہ رہ سکا ہاں اپنے ظالمانہ کرتوتوں کی اُس کے دل میں کوئی کھٹک نہ تھی! ہاں! اس کی کھٹک تھی، اور اسے ایک عالمِ دین کے سامنے ظاہر بھی کر دیا کہ احرام کی حالت میں جوں کسی محرم سے مر جائے، تو اس کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ ملّایانہ ذہنیت یہ ہے کہ پورے نظامِ دین کو خطرہ لاحق ہو مگر چند مولوی رفع یدین اور سری و جہری آمین پر جھگڑ رہے ہوں!

حرفِ آخر

اگر تنہا شعر و سخن کی فنکاری ہمارے لئے جاذبِ توجہ ہوتی تو پھر امرء القیس، ہومر، فردوسی، اور شکسپیر کی شاعری ہماری توجہات کا مرکز ہوتی؛ اقبالؒ کے کلام اور پیام کی عظمت شاعرانہ فنکاری کے علاوہ صحتِ افکار سے وابستہ ہے، اقبالؒ کی شاعری کتاب و سُنّت کی ترجمان ہے، اُس میں اخلاقی اسپرٹ پائی جاتی ہے، اُس کے مطالعہ سے ایمان و یقین کی روشنی ملتی ہے، اقبالؒ کے افکار ملت کو جوش و ولولہ بخشتے ہیں، اقبالؒ ممولے کو شاہبازہ سے لڑانے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے! اُس کی شاعری میں مایوسی نہیں اُمید و آرزو پائی جاتی ہے، اس کے یہاں عشق بھی ہے مگر کیسا عشق؟

عشق با نانِ جویں خیبر کُشاد

اقبالؒ کی شاعری ہمارے نوجوانوں کو پاکبازی و حیا کی تعلیم دیتی ہے ؎

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

اُس کی شاعری ہماری عورتوں کو مریمؑ صفت، فاطمہؓ مزاج اور عائشہؓ کردار بنانا چاہتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ اقبالؒ زمانہ کی برائیوں سے کسی قیمت پر بھی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اس کی عزیمت کا تو یہ عالم کہ

زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ ستیز

وہ یہ نہیں کہتا کہ حالات کے آگے ہتھیار ڈال کر یا تو گوشہ نشین ہو جاؤ، یا پھر زمانے کی ہاں میں ہاں ملانے لگو! اُس کا تو یہ پیام ہے ؎

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

اقبالؒ کے دینی افکار کی روشنی میں پاکستان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کہاں افکارِ اقبالؒ سے مطابقت پائی جاتی ہے اور کہاں اُن کی نفی کی جا رہی ہے؟ ——— اقبالؒ نے شاعری میں اپنا خونِ جگر اس لئے حل نہیں کیا تھا کہ مشاعروں کی طرح واہ واہ کا شور بلند ہو کر رہ جائے، اقبالؒ کی شاعری کی حقیقی داد "تحسینِ عمل" اور صرف "عمل" ہے!

ماہر القادری ۲۳ رمضان المبارک

م ۔ ادیب

اخلاق نبوی پر ایک اجمالی نظر

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

یا صاحب الجمال ویا سید البشر — من وجھک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ — بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

وہ مقدس ترین انسان کون تھا جس کے نور سے سارا ظلمت کدۂ جہاں روشن ہوگیا؟ وہ کون آفتاب ہدایت تھا جس کے طلوع کے ساتھ ہی افق عالم سے کفر و ضلالت کے بادل منتشر ہوگئے؟ ــــ وہ ایک یتیم، پسرِ عبداللہ و جگر گوشۂ آمنہ تھا، جس کا نامِ نامی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ــــ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اس مبارک ہستی کے اوصافِ جمیلہ اور اخلاقِ حمیدہ سے قرآنِ کریم اور کتب مقدسۂ قدیمہ اور احادیث قدسی ہی نہیں، بلکہ دنیا کی اَن گنت کتابیں بھری پڑی ہیں۔ سخت متعصب مصنفین اور مورخین نے بھی حضورؐ کے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے میں کافی دل چسپی لی ہے، بایں ہمہ سچ تو یہ ہے کہ اس انسانِ کاملؐ کی مدح و توصیف کے بیان کا کسی سے ذرہ برابر بھی حق ادا نہیں ہوسکا۔ اس مضمون کا عنوان تو بہت ہی وسعت رکھتا ہے اور ہماری قوتِ تحریر محدود۔ ہمارے امکان سے باہر ہے کہ اس منبع اوصاف اور مصدرِ اخلاق کے شمائلِ مبارک کا اختصار کے ساتھ بھی ذکر کرسکیں۔ تاہم بہ خیالِ حصولِ برکات کوشش کی جائے گی کہ اوصافِ حسنہ کے اس ناپیدا کنار کے چند ہی قطرے اور اخلاقِ حمیدہ کے صحرائے بے پایاں کے چند ہی ذرے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوجائے۔

فصاحت و بلاغت میں آپؐ اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ تمام قبائل عرب کی زبانیں جانتے تھے۔ حالانکہ آپؐ اُمّی تھے اور کبھی کسی استاد کی تعلیم کے زیرِ بارِ احسان نہیں بنے۔

جو کلمہ زبانِ مبارک سے نکلتا، ایسا جامع و پرمعنی ہوتا کہ ملک بھر میں مشہور ہوجاتا۔ نمونۂ کلامِ فیض التیام:-

اذا لم تستحِ فاصنع ما شئت ــــ ارحموا ترحموا ــــ اَسلم تسلم ــــ اِنّما الاعمال بالنّیات ــــ
الاسلام حسن الخلق ــــ ایاک دعوۃ المظلوم ــــ ترک الشر صدقۃ ــــ تعس عبد الزوجہ
حُبّک الشئ یعمی ویصم ــــ الدعاء مُخ العبادۃ ــــ الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ ــــ
سید القوم خادمھم ــــ صوموا تصحوا ــــ من صمت نجی ــــ وغیرہ

(ترجمہ) جب تو حیا نہیں کرتا تو جو چاہے کر۔ رحم کرو تو رحم کئے جاؤ گے۔ کسی کی سلامتی چاہو تو سلامت رہو گے۔ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اسلام حسن خلق کا نام ہے۔ مظلوم کی پکار سننا ضروری ہے، برائی چھوڑنا بھی صدقہ ہے برا ہو زن مرید کا، کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ دعا عبادت کا مغز ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے

کسی قوم کا خادم اس کا سردار ہوتا ہے ۔ روزہ رکھو تو تندرست رہو گے ۔ جس نے خاموشی اختیار کی اس نے نجات حاصل کی ۔

محاصرۂ طائف کے بعد تقسیمِ غنائم کے معاملہ میں بعض انصار آپؐ سے بدگمان ہو گئے ، جب آپؐ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ان کے مجمع عام میں ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ خطبہ دیا ۔ انصار کو مخاطب کر کے فرمایا :۔

"کیا یہ سچ نہیں کہ تم گمراہ تھے ، خدا نے میری بدولت تم کو ہدایت کی ، تم لوگ باہم دشمن تھے میرے ذریعے سے تم میں اتحاد پیدا ہوا ، تم مفلس تھے میری وجہ سے متمول بنے ؟"

ہر ہر بات پر انصار کہتے جاتے "اللہ اور رسولؐ کا بڑا احسان ہے" ۔ ارشاد ہوا :۔

"نہیں ، تم مجھ کو جواب دے سکتے ہو کہ ، ساری دنیا نے تجھ کو جھٹلایا اور ہم نے تیری تصدیق کی ۔ اوروں نے تجھے چھوڑ دیا ہم نے تجھے پناہ دی ، تو نادار تھا ، ہم نے تیری مدد کی ، تم یہ جوابات دیتے جاؤ اور میں اقرار کرتا جاؤں گا ــــــــــ لیکن اے جماعتِ انصار کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ اور لوگ تو اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے چلو ؟"

یہ تقریر سُن کر انصار بے اختیار رو پڑے اور آنسوؤں سے اکثروں کی ڈاڑھیاں تر ہو گئیں ۔

خموشی اور حسنِ تکلم ۔ میں آپؐ مشہور تھے ۔ اکثر اوقات خاموش رہتے بوقتِ ضرورت کلام فرماتے ۔ مگر بالکل جامع اور مختصر مسلسل گفتگو فرماتے ، ہر فقرہ کا تین تین مرتبہ اعادہ فرماتے[1] تھے ۔ ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتے کہ اگر کوئی گننا چاہتا تو ایک ایک لفظ گن سکتا تھا[2]

آپؐ مزاح بھی فرماتے تھے ، چنانچہ ایک بڑھیا نے آپ سے درخواست کی کہ "یا رسول اللہؐ ! دعا کیجئے کہ خدا مجھے جنت میں داخل کرے " آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "اے اُمّ فلاں ! جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہیں ہو گی " ۔ وہ روتی ہوئی چلی گئی ، حضرتؐ نے فرمایا کہ اس ضعیفہ کو خبر کر دو کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں داخل نہیں ہو گی بلکہ جوان ہو کر جائے گی[3]

شرم و حیا میں آپؐ اپنی آپ نظیر تھے ۔ آنحضورؐ کو اس لڑکی سے بھی زیادہ شرم تھی ، جو کنواری اور پردہ نشین لڑکی میں ہوتی ہے[4] آپ بدزبان نہ تھے اور نہ بدکلامی فرماتے تھے ۔ ارشادِ گرامی ہوتا تھا کہ " ان من خیارکم احسنکم اخلاقا " (تم میں سے بہتر لوگ وہی ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں)

صبر و رضا میں حضورؐ بے مثال تھے ، کفارِ مکہ آپؐ پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے ، پتھر پھینکتے ، راہ میں کانٹے بچھا دیتے ، بحالتِ نماز آپ پر غلاظت ڈالتے ، ایک دفعہ آپؐ نماز میں مصروف تھے کہ لعین نے آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر کھینچی اور گھٹنوں کے بل گرا دیا ۔ ان دردناک مظالم ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ دشمنانِ اسلام حضورؐ کے قتل کے بھی درپے ہو گئے تھے ، لیکن قدرت نے ان کو ناکام رکھا ۔ ان تمام مصائب و آلام کے باوجود آپ نے صبر و تحمل سے کام لیا اور ہمیشہ راضی بہ رضائے الٰہی رہے ۔

قناعت و بے غرضی کا یہ عالم تھا کہ جو غذا میسر آ جاتی کھا لیتے ، جس طرح کا لباس مل جاتا پہن لیتے ، کبھی تہمد ، کبھی یمانی چادر کبھی صوف کا جبہ ۔ آپؐ کو صاف اور ستھرے کپڑے پسند تھے ۔ آپؐ اور آپؐ کے اہل بیت اکثر فاقے سے رہتے تھے ۔ چنانچہ

---

[1] وسائل الوصول الی شمائل الرسول ۔ [2] بخاری [3] وسائل الوصول الی شمائل الرسول ۔ [4] صحیح بخاری ۔ صحیح بخاری ۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ "ہم اہل بیتِ محمدؐ مہینہ بھر تک آگ نہیں جلاتے تھے۔ خرموں اور پانی پر ہماری گذر ہوتی تھی" حضرت طلحہ رضؓ سے مروی ہے کہ "سرورِ کائنات صلعم نے ہم کو اپنا شکمِ مبارک دکھایا جس پر (فاقہ کی وجہ سے) دو پتھر بندھے ہوئے تھے[1]۔ آپؐ نے کسی کھانے کو بُرا نہیں کہا، دل چاہتا نوش فرماتے ورنہ چھوڑ دیتے۔ آنحضرت صلعم کی بے غرضی کے بارے میں قرآنِ حکیم کہتا ہے :-

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا[2]

کلامِ پاک میں اس قسم کے ارشادات اکثر مقامات پر موجود ہیں۔ غیر مسلم مورخین کی تحریریں بھی آپؐ کی بے غرضی اور قناعت کا اقرار و اعتراف کر رہی ہیں۔ وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ مسٹر جان ڈیون پورٹ رقمطراز ہیں کہ :-

"یوں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے ہر واقعہ سے ان کی دنیوی جاہ و عظمت کی خواہش کے عیب سے بالکل پاک ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا ثبوت اس مسلمہ واقعہ سے ملتا ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ ان کا دین مستحکم ہو چکا ہے اور وہ ایک بڑی طاقت و اختیار پر قابو رکھتے ہیں، انھوں نے کبھی بھی ایسے موقعوں سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ آخر دم تک اپنی پہلی سی معمولی حالت پر قائم رہے۔"

جود و سخا میں آپؐ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضرت ابنِ عباس رضؓ سے روایت ہے کہ "آن حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے زیادہ سخی تھے، اور رمضان میں تو سخاوت اور بھی بڑھ جاتی تھی[3]۔ آپؐ نے کسی سائل کے سوال پر "لا" (نہیں) کبھی نہیں فرمایا[4]۔

نہ رفتہ لا بزبانِ مبارکش ہرگز　　　　مگر در اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

ایک مرتبہ آپؐ سے ایک شخص نے، آپؐ کی وہ سب بکریاں مانگیں جو دو پہاڑوں کے درمیان چر چُگ رہی تھیں۔ آنحضرت صلعم نے اسی وقت سب بکریاں اس کو بخش دیں[5]۔

ایک دفعہ آپؐ کی خدمت میں کہیں سے نوّے ہزار درہم کا نذرانہ وصول ہوا۔ حضور صلعم نے سب کے سب خیرات کر دیئے اور اپنے لئے ایک درہم بھی نہیں چھوڑا۔

صداقت و امانت میں تو آنحضور صلعم کی کم سنی ہی سے شہرت تھی کاروبارِ تجارت کے ذریعہ لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے رہتے تھے۔ حسنِ معاملت کی وجہ سے آپؐ نے صداقت و راستبازی اور دیانت و امانت میں بڑا نام پیدا کیا اور اپنے ابنائے وطن سے امین کا لقب حاصل کیا۔ آپؐ قولاً و فعلاً راستباز ہی نہ تھے بلکہ آپؐ کے رُخِ انور سے بھی ایسی صداقت ٹپکتی تھی کہ کتنے ہی کفار آپؐ کے روئے مبارک...... کو دیکھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ عبداللہ بن سلام رضؓ جو ایک یہودی عالم تھے حضورؐ کو دیکھتے ہی کہنے لگے "وَاللّٰهِ مَا هٰذَا الْوَجْهُ كَذَّابٌ" (خدا کی قسم یہ چہرہ جھوٹے آدمی کا ہو ہی نہیں سکتا) اور مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ابوجہل نے کہا: "ہم تجھ کو دروغ گو نہیں جانتے، بلکہ جس چیز کو تو لایا ہے، اس کو جھٹلاتے ہیں۔" اب سنیئے آپؐ کی راستبازی کے متعلق زبانِ اعدا کیا کہتی ہے :- مسٹر ٹامس کارلائل لکھتے ہیں کہ :-

---

[1] رسائل الوصول الی شمائل الرسولؐ۔ [2] قرآنِ حکیم۔ ترجمہ (اے پیغمبرؐ) کہو کہ میں تم سے اس رہدایت کی کچھ اجرت تو طلب نہیں کرتا۔ مگر (میری اجرت تو بس یہی ہے کہ) جو چاہے اپنے رب تک پہنچ جانے کا راستہ اختیار کر لے۔

[3] صحیح بخاری

[4] صحیح مسلم۔ [5] مشکوٰۃ المصابیح۔

"ہم لوگوں (یعنی عیسائیوں) میں جو یہ بات مشہور ہے کہ محمد (صلعم) ایک پرُفن اور فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کے اوتار رکھتے اور ان کا مذہب دیوانگی اور خام خیالی کا ایک تودہ ہے اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھہرتی جاتی ہیں۔ جو جو جھوٹ باتیں دور اندیش اور مذہبی سرگرمی رکھنے والے آدمیوں (یعنی عیسائیوں) نے اس انسان (یعنی محمد صلعم) کی نسبت قائم کی تھیں، اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کے باعث ہیں......
اس وقت جتنے آدمی محمد (صلعم) کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کسی کے کلام پر، اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے، پھر کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جس کے کلام پر خدائے قادر مطلق کی اس قدر مخلوق زندگی بسر کر گئی اور اسی پر مر گئے کیا وہ ایسا جھوٹا کھیل ہے جیسا ایک بازی گر کا ہوتا ہے؟"[1]

پادری ڈاکٹر مارکس ڈوڈز صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"سچائی کی خاطر انھوں (یعنی محمد صلعم) نے اپنی جان کو طرح طرح کے خطرات میں ڈالا۔ برسوں تک وہ روزانہ تکلیفیں سہتے رہے اور آخر کار جانی و مالی نقصان سے بچنے کے لئے اپنے ہم وطنوں کی فائدہ رسانی کے لئے، اور اپنے خیر خواہ دوستوں کے نفع کے لئے جلا وطنی، اختیار کی۔ الغرض انھوں نے موت کے علاوہ ہر طرح کی تکلیف اٹھائی۔"[2]

اینی بیسنٹ آنجہانی (سابق پریسیڈنٹ تھیوسوفیکل سوسائٹی مدراس) رقم پرداز ہیں کہ:-

"پیغمبر اعظم (صلعم) کی جس بات نے میرے دل میں ان کی عظمت اور بزرگی قائم کی ہے وہ ان کی وہ صفت ہے جس نے ان کو ان کے ہم وطنوں سے الامین (یعنی بڑا امانت دار) کا خطاب دلوایا کوئی صفت اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی اور کوئی بات اس سے زیادہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے قابل اتباع نہیں۔ ایک ذات جو مجسم سچ ہو اس کے اشرف ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے ایسا ہی شخص اس قابل ہے کہ پیغام حق کا حامل ہو۔"[3]

شجاعت و علو ہمتی کے لحاظ سے بھی آپؐ کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ قوت وطاقت کی یہ کیفیت تھی کہ مکہ معظمہ کے مشہور پہلوان رُکانہ نامی کو جس نے آپؐ سے عرض کیا تھا کہ "اگر آپ مجھے پچھاڑ دیں تو میں ایمان لے آؤں گا" تین مرتبہ بلا کسی دقت کے زمین پر پٹک دیا۔

شیر خدا حضرت علی رضؓ فرماتے ہیں کہ "ہر سخت معرکہ میں ہم حضورؐ کے پیچھے پناہ لیتے تھے، اور آنجنابؐ ہمیشہ دشمن کے سامنے رہتے تھے۔"

غزوہ حنین کے موقع پر جب کہ اسلامی لشکر میں شکست کے آثار پیدا ہو گئے تھے تیروں کی بارش ہو رہی تھی، دشمن کی تلواریں چل رہی تھیں، مسلمانوں کے پیر اکھڑ چکے تھے لیکن ایک پیکرِ قدس و عظمت اور مجسمہ استقلال و حریت تھا، جس کے.....

---

[1] خطبات احمدیہ صفحہ ۲۳، ۲۴ [2] نظام المشائخ جلد ۳ نمبر ۲ و ۳ صفحہ ۹۳
[3] نظام المشائخ جلد ۳ نمبر ۲ و ۳ صفحہ ۱۰۰ [4] وسائل الوصول الی شمائل الرسولؐ

پائے ثبات لغزش سے ناآشنا تھے، ایک زبردست چٹان کی طرح کھڑا ہوا، عزیمت و شجاعت کی لازوال مثال قائم کر رہا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)
مستقل مزاجی کا یہ عالم تھا کہ کفار نے آپؐ کے چچا ابو طالب سے شکایت کی کہ :- "دیکھو! تمہارا بھتیجا، ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے علانیہ ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے، تمہاری خاطر اب تک ہم خاموش رہتے تھے، اب ان کو سمجھا دو ورنہ ہم آئندہ سے تمہارا کوئی لحاظ نہیں کرینگے" آپؐ کے چچا نے آپؐ سے کہا کہ :" جانِ عم! مجھ پر اتنا بار نہ ڈالو کہ میں متحمل نہ ہو سکوں"۔ حضورؐ نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا کہ "اگر آپ میرا ساتھ چھوڑ دیں تو کچھ مضائقہ نہیں، لیکن قسم خدا کی اگر قریش میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں پر ماہتاب بھی رکھدیں اور کہیں کہ ان حرکتوں سے باز آجاؤ تو بھی میں ان کی بات نہیں مانوں گا، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ یا تو خدا اس کام کو پورا کر دے گا یا اس فرض کی انجام دہی میں میری جان جاتی رہے گی"۔ یہ الفاظ کچھ ایسے مؤثر لہجہ میں ادا ہوئے تھے کہ ابو طالب جوش میں آگئے اور آپؐ سے کہدیا کہ "جا! تیرا جو جی چاہے کر، کوئی شخص تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا"۔

پادری ڈاکٹر مارکس ڈوڈز رانشا طراز ہیں کہ :-

"انھوں (محمد صلعم) نے موت کے علاوہ ہر قسم کی تکلیف اٹھائی اور موت سے ہجرت کے سبب بچے، لیکن باوجود ان ایذاؤں کے وہ اپنا پیام اسی تندہی اور استقلال سے لوگوں کو سُناتے رہے، کسی قسم کی رشوت، دھمکی یا لالچ ان کو خاموش نہیں کر سکتے تھے... اور یہی راسخ الاعتقادی اور یقین کامل کا سبب تھا کہ وہ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت کا ڈنکا بجاتے رہے اور یہی اسلام کی جان ہے"۔ [1]

مسٹر جان ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ :-

"بے شک محمد (صلعم) بجز دلی نیک نیتی اور ایمانداری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال کے ساتھ اپنی کارروائی پر ابتداء نزولِ وحی سے جو خدیجہ رضؓ سے بیان کی اخیر دم تک جب کہ عائشہ (رضؓ) کی گود میں شدتِ مرض میں وفات پائی، مستعد نہیں رہ سکتے تھے"۔ [2]

وقار و ہیبت سردارِ دو عالمؐ کی اس درجہ تھی کہ آپؐ کی مجلس میں کوئی زور سے بول نہیں سکتا تھا، بے کار گفتگو کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی، آپؐ کے ارشادات کے موقع پر خموشی طاری ہو جاتی تھی، اور حاضرین ہمہ تن گوش ہو کر کلامِ مبارک سے مستفید ہوتے تھے! یہ بات کسی دنیوی شہنشاہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی، باوجودیکہ آپؐ نرم خو، رحمدل اور شیریں دہن تھے اور ہر ایک سے نہایت فراخدلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایک شخص جو حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا آپؐ کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ رحمتِ عالمؐ نے فرمایا کہ "هون علیك فانی لست بملك انما انا ابن امراة من قريش تاكل القديد"

تواضع و انکساری میں آپؐ بے مثل تھے، ہر ایک کے ساتھ عزت، بھلائی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے، سلام اور مصافحہ میں پہل کرتے جب کسی سے مصافحہ کرتے تو اس وقت تک اپنا ہاتھ نہ کھینچتے جب تک کہ وہ اپنا ہاتھ حضورؐ کے دستِ مبارک سے خود ہی نہ کھینچ لیتا۔ جب تک آپ سے کوئی روگردانی نہ کرتا اس، وقت تک آپؐ بھی اپنا روئے منور اس کی طرف سے نہ پھیرتے۔ آپؐ کبھی بھی اپنے زانوئے اطہر ہم نشینوں کے آگے دراز نہ فرماتے تھے۔ اصحابؓ کو آگے آگے چلنے دیتے، خود پیچھے پیچھے چلتے۔ کسی کو

---

[1] نظام المشائخ جلد ۳ نمبر ۲ و ۳ صفحہ ۹۳ — [2] خطبات احمدیہ صفحہ ۱۲ [3] وسائل الوصول الی شمائل الرسولؐ (ترجمہ) کچھ پروا نہ کر، میں بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھاتی تھی۔

ارتے تو ادب کے خیال سے، کنیت سے پکارتے۔ حضرتؐ کے پاس ایک بڑھیا آئی تو آپؐ نے اپنی چادر اس کے لئے بچھا دی راوی نے
یافت کیا کہ یہ کون ہے؟ تو معلوم ہوا کہ حضورؐ کی رضاعی ماں ہیں۔

عدل والنصاف آپؐ کا کم عمری ہی سے مشہور ہے، حجرِ اسود کے جھگڑے میں رؤسائے عرب نے آپؐ ہی کو اپنا جج بنایا تھا۔ بعثت کے
بتر قریش نے اپنے اکثر نزاعات میں حضورؐ کو ہی اپنا حکم مقرر کیا تھا۔ آپؐ نے ہمیشہ امن وامان کو دوست رکھا۔ چنانچہ آپؐ ہی کی
ارک تعلیم کا اثر تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اہلِ عرب نے اپنی تمام قدیمی لڑائی جھگڑوں اور لوٹ مار کی عادتِ قبیحہ کو بالکل خیرباد
دیا۔ ملک بھر میں چوری چکاری کا خوف نہ رہا۔ اگرچہ آپؐ ایک اُمّی نبی تھے لیکن ملک کی تمدنی حالت میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں
ا تنا بڑا انقلاب برپا کیا، جو بڑے بڑے سیاست داں فرمانرواؤں سے ممکن نہ تھا۔

پادری ریورنڈ بوسورتھ اسمتھ صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

"ملک کے بادشاہ اور نبی ہونے کی حیثیت سے وہ (محمد صلعم) ایک ہی وقت میں سیزر اور پوپ کا سا مرتبہ رکھتے تھے، وہ پوپ تھے لیکن پوپ کی سی دھوکہ بازیوں سے معرّا تھے وہ سیزر تھے لیکن سیزر کی سی کارروائیوں سے مبرّا تھے باقاعدہ فوج کے بغیر، حفاظت کے سپاہی نہ ہونے کے باوجود محل کے بغیر، مقررہ خراج کے بغیر، اگر کوئی آدمی یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ اس نے خدائی طاقت سے حکومت کی تو وہ محمد (صلعم) ہی تھے۔ کیونکہ ان کو یہ طاقت وحکومت سب مہیا تھی لیکن ہتھیار نہ تھے"۔[1]

رحم وعفو سے تو فیاضِ ازل نے آپ کو خاص طور پر متصف کیا تھا خالقِ کائنات نے اپنے کلامِ پاک میں رحمتِ عالمؐ
رؤف ورحیم سے خطاب فرمایا ہے، آپؐ ہر دشمن پر احسان فرماتے، ہر نقصان رساں کو فائدہ پہنچاتے، بہت کم غصہ ہوتے،
بہت جلد خوش ہو جاتے۔ خداوند کریم حضورؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے "وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ"
(آلِ عمران) آپؐ نے اپنی ذات کے لئے کبھی بدلہ نہیں لیا[2]۔ سوا جہاد کے موقع کے آپؐ نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہ مارا، نہ عورت
خادم کو[3]۔ آنحضرتؐ کے حکم کے مطابق اسیرانِ جنگ کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ عموماً وہ بہت جلد آزاد کئے جاتے تھے
نچہ حنین کے اسیرانِ جنگ کو، جن کی تعداد چھ ہزار تھی آپؐ نے بیک وقت رہا کر دیا۔ احد کی جنگ درپیش تھی۔ ہر طرف سے
لواروں کے وار ہو رہے تھے اور تیروں کی بارش نے میدانِ کارزار کی دہشت بڑھا دی تھی۔ عبداللہ بن قمیہ ایک ملعون کافر نے حضورؐ
تلوار چلائی۔ جس کی ضرب سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ اقدس میں پیوست ہو گئیں۔ معاً میدان کا نقشہ بدل گیا۔ سردارِ دو جہاں کے
انثار فدایانِ رسولؐ جمع ہو گئے اور پروانہ وار، شمعِ رسالتؐ پر سے اپنی جانیں نثار کرنے لگے۔ کفار تو جنابِ رسالت مآبؐ
تیر برسا رہے تھے، لیکن رحمتِ عالمؐ کی زبانِ فیض سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے :۔

رَبِّ اغْفِرْ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ[4]

ترے منہ سے مگر ایسی گھڑی میں بھی دعا نکلی — مصیبت پر ہمیشہ تیرے منہ سے مرحبا نکلی

---

[1] نظام المشائخ جلد ۳ نمبر ۲، ۳ صفحہ ۱۵ ۱۹ء [2] (ترجمہ) اے محمدؐ! اگر تم اکھڑ مزاج ہوتے تو لوگ کبھی کے تمہارے پاس سے الگ ہو گئے ہوتے۔ [3] صحیح بخاری [4] صحیح مسلم
اے رب! تو میری قوم (کفارِ قریش) کو معاف فرما۔ وہ جانتے نہیں۔

اللہ اکبر! یہ تھا رحم سردارِ دوعالمؐ کا۔ کیا تاریخ کے صفحات آپؐ سے بڑھ کر کسی رحیم ہستی کو پیش کر سکتے ہیں؟
شفقت و رحمت میں بھی آپؐ شانِ یکتائی رکھتے تھے۔ قرآنِ کریم خود اس کا شاہد ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ
لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ[۱])
دوسری جگہ رسالت مآبؐ کی شان میں رب العزت فرماتا ہے وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ .... (الانبیاء[۲])

حضرت انس بن مالک رضؓ سے مروی ہے کہ "میں نے کسی کو بچوں پر اتنی شفقت کرتے نہیں دیکھا جتنی آپؐ کرتے تھے[۳]۔

ایک مرتبہ قرع بن خابس نے دیکھا کہ آپؐ حضرت امام حسن رضؓ کو پیار کر رہے تھے، اس نے عرض کی کہ "یا رسول اللہؐ میرے دس بچے ہیں میں نے ان میں سے کبھی کسی کو بھی پیار نہیں کیا"۔ آپؐ نے فرمایا "مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ[۴]" جب کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے، جس کی ماں جماعتِ نماز میں شریک رہتی تو آپؐ قرأت ہلکی کرکے نماز جلد ختم کر دیتے تھے۔ لوگوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ کافروں کے حق میں بد دعا کیجیے تو رحمتِ عالمؐ نے ارشاد فرمایا کہ "میں لعنت کرنے والا نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ رحمت بن کر آیا ہوں"[۵]

حسنِ معاشرت میں آنحضورؐ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپؐ ہر شخص سے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اچھا برتاؤ کرتے۔ ہر شخص کی عزت کا خیال رکھتے۔ ہدیہ کو قبول فرماتے، دعوت میں شرکت کرتے اور ہر احسان کا بدلہ دیتے تھے۔ بچوں سے اس قدر محبت تھی کہ آپؐ نماز پڑھتے ہوتے اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسین رضؓ کھیلتے اور آپؐ کی پشتِ مبارک پر بیٹھتے تھے[۶]
قسطلانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم ازواج مطہرات کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہیں کرتے تھے۔ اُن سے عذر خواہی کرتے تھے اور اگر کسی امر میں ان کے ساتھ انصاف کرنا ہوتا تو آپؐ بلا قلق اور غصہ کے انصاف فرماتے تھے[۷] ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مع ازواج مطہرات رضؓ سفر فرما رہے تھے، ساربان سے فرمایا کہ "آہستہ چل اے انجشہ! آبگینوں کا خیال رکھ"۔

حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دس برس خدمت کی (اس مدت میں) قسم خدا کی کبھی آپؐ نے مجھ سے اُف تک نہ کہا۔ نہ کبھی یہ کہا کہ یہ کام تو نے کیوں کیا؟ یا یہ کام کیوں نہ کیا؟ جو خادم کو کرنا چاہیے تھا[۸]۔ آنجنابؐ کے اخوان یعنی اصحابؓ میں سے جس وقت کوئی شخص تین دن تک نہیں آتا تو آپؐ اس کے احوال دریافت فرماتے۔ اگر وہ غائب ہوتا تو اس کے لئے دعا کرتے، اگر موجود ہوتا تو اس کے دیکھنے کو جاتے۔ اگر بیمار ہوتا تو اس کی عیادت فرماتے تھے[۹]
صحابہ رضؓ اگر کسی کام میں منہمک رہتے تو آپؐ بھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ چنانچہ غزوہ خندق کے لئے تیاریاں ہو رہی تھیں خندق کی کھدائی میں صحابہؓ کے ساتھ رسول خداؐ بھی شریک تھے اور معمولی مزدور کی طرح شہنشاہِ کونینؐ بھی مٹی کے ٹوکرے سر پر لیجا رہے تھے اور صحابہ رضؓ جوشِ محبت میں ہم آواز ہو کر اشعار پڑھتے تو حضورؐ بھی لے میں لے ملا دیتے اور ان کے حق میں دعا فرماتے تھے

---

[۱] تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک، رسول آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان پر گراں گزرتی ہے ان کو تمہاری بہبودی کی حرص ہے اور مسلمانوں پر بے حد شفیق اور رحم کرنے والے ہیں۔ [۲] ہم نے تم کو دونوں جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے [۳] صحیح مسلم۔
[۴] صحیح مسلم۔ ترجمہ:۔ جو رحم نہیں کرتا، وہ رحم نہیں کیا جاتا۔ [۵] مشکوٰۃ المصابیح۔
[۶] [۷] [۸] وسائل الوصول الی شمائل الرسول۔
[۹] صحیح مسلم
[۱۰] وسائل الوصول الی شمائل الرسول

کھودتے کھودتے ایک چٹان نکل آئی، جو کسی سے نہ ٹوٹ سکی۔ اس وقت فخرِ دو عالم ؐ کو تین دن کا فاقہ تھا، مگر آپ ؐ نے دستِ مبارک میں کدال لیا اور ایک ہی ضرب لگائی کہ چٹان مٹی کا ڈھیر تھی۔

آپ ؐ ہر مسلمان سے بھائی دوست اور مربی کی طرح پیش آتے، یہی اخوت و مساوات اسلام کی روح ہے۔

پادری کینن آئزک ٹیلر فرماتے ہیں کہ:

"اخوت کی نسبت عیسوی خیال سب سے ارفع و اعلیٰ ہے، لیکن اسلام ایک عملی اخوت سکھاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔" [1]

ایفاءِ عہد کا آپ ؐ کو بہت خیال رہتا تھا۔ نبوت سے قبل عبداللہ بن ابی الحمساء رضؓ نے آپ ؐ سے خرید و فروخت کا معاملہ کیا۔ ابھی وہ پورے طور سے طے نہیں ہوا تھا کہ عبداللہ رضؓ نے کہا کہ میں پھر آؤں گا، آپ ٹھہرے رہیئے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ "اچھا" عبداللہ رضؓ اپنا وعدہ بھول گئے۔ لیکن تین روز کے بعد جب یاد آگیا تو اسی مقام پر گئے جہاں آپ ؐ انتظار فرما رہے تھے۔ اس وعدہ خلافی کی وجہ سے آپ ؐ کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ بس اتنا ہی فرمایا: "تم نے مجھے تکلیف دی، میں اسی جگہ پر تین روز سے منتظر ہوں۔" [2]

توکل علی اللہ آپ ؐ کی خاص صفت تھی۔ دشمن ہر وقت آپ ؐ کی ایذا رسانی کے لئے بلکہ آپ ؐ کے قتل کی فکر میں رہتے تھے کئی مرتبہ آپ ؐ ایسے خطرات میں گھر چکے تھے کہ بظاہر زیست کی کوئی امید نہ رہی تھی، لیکن اسی ذاتِ وحدہٗ لا شریک نے آپ ؐ کو بچا لیا۔ جس پر آپ ؐ ہمیشہ توکل کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ؐ نجد کی ایک وادی میں کسی درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے، درخت میں آپ ؐ کی تلوار لٹک رہی تھی۔ حضور ؐ فرماتے ہیں کہ "میں سو رہا تھا کہ) میرے پاس ایک شخص آیا اور اس نے تلوار اتار لی۔ جب بیدار ہوا تو دیکھتا کیا ہوں کہ وہ شمشیر برہنہ لئے سر پہ کھڑا ہے، اس نے مجھ سے کہا کہ، مجھ سے اب تمہیں کون بچائے گا؟" میں نے کہا کہ "اللہ تعالیٰ" دوسری مرتبہ بھی اس نے یہی سوال کیا، تو پھر بھی میں نے کہا "اللہ تعالیٰ" یہ سن کر اس نے تلوار نیام میں کر لی۔" [3]

مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز اپنے ایک مضمون "رسول کا ساتھی" میں لکھتے ہیں:

"وہ (یعنی حضرت محمد صلعم) اپنے کام سے نہیں چوکے، انھوں نے ہمیشہ خدائے تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کیا (ہجرت کے لئے جب آپ ؐ مکہ سے نکل کھڑے ہوئے اور کچھ دور چل کر غارِ ثور میں قیام فرمایا اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے) آپ ؐ نے فرمایا کہ "اے ابوبکر! اس بات کا خیال نہ کرو ہم دو ہیں بلکہ خدا درمیان میں ایک تیسرا ہے۔" یہ الفاظ ایسے وقت میں بولے جاتے ہیں تو میرے دل میں روحانی جوش پیدا کر دیتے ہیں، اور بھی بہت سے ایسے واقعات ہیں جو بعد میں وقوع میں آئے اور جن کو بحیثیت عیسائی ہونے کے زیادہ وقعت نہیں دیتا لیکن میں ان الفاظ کی تعریف میں بالکل رطب اللسان ہوں، میں جب کبھی ان کو پڑھا کرتا ہوں تو میرا دل روحانی جوش اور وجدانی حالت سے پُر ہو جاتا ہے، اور میں ان کو بار بار اپنے دل میں دہراتا ہوں "اے ابوبکر! اس کا مت خیال کرو کہ ہم دو ہیں بلکہ خدا درمیان میں ایک تیسرا ہے۔" [4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر جس قدر اعتماد، یقین اور توکل تھا، اُس کی مثال انسانیت کی تاریخ پیش

---

[1] نظام المشائخ جلد ۳ نمبر ۲، ۳ صفحہ ۹۲ [2] صحیح مسلم [3] نظام المشائخ جلد ۳ نمبر ۲، ۳ صفحہ ۸۲، ۸۳

(باقی مضمون صفحہ ۳۹ پر دیکھیے)

ایک مکتوب اور اس کا جواب

مولانا محمد عبدالغفار الحزی

پس از سلام مسنون!

میں ایک عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ بعض مسائل کے متعلق آپ سے تبادلۂ خیالات کروں مگر کچھ عدیم الفرصتی اور کچھ پیرانہ سالی روک بنی رہیں۔ آج اتفاق سے ایک صاحب کے ہاتھ میں آپ کا ایک پرانا رسالہ دیکھ کر میں نے اس کو لے لیا اس کے صفحہ ۹ پر زیر عنوان "نقش اول" آپ کے عقیدے کی ترجمان حسب ذیل عبارت جاذب نظر بن گئی:۔

> "اَفَتُؤمِنُونَ ببعض الکتاب وَتَکْفُرُونَ ببعض" ہمارا مسلک ہرگز نہیں ہے۔ ہم پورے کے پورے اسلام کو مانتے ہیں اور اسی کے عملی نفاذ کے لئے جدوجہد کرنے کا ایمان کا سب سے ضروری بلکہ ناگزیر تقاضہ سمجھتے ہیں، پاکستان میں ہم نظام حق کا قیام چاہتے ہیں۔ ایسا نظام جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ستونوں پر قائم ہو۔ جہاں اللہ کے قانون کے سوا اور کسی کا قانون نہ چلے، جہاں فاسقوں اور فاجروں پر شرعی حدیں جاری کی جائیں جہاں حاکم اپنے کو ملت کا خادم سمجھتے ہوں جنکو اقتدار کی ہوس نہ ہو"

حضرت محترم! اس پاکستان میں میرے خیال میں مسلمانوں کے چار فرقے ہیں۔ (۱) دیوبندی احناف (۲) بریلوی احناف (۳) شافعی اور (۴) اہل حدیث (میں نے شیعہ حضرات کو قصداً الگ رکھا) ان چاروں میں ہر ایک دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ اس کا مسلک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلعم کے عین مطابق ہے اور اس پر بھی ان چاروں میں ایسا اختلاف ہے کہ چاروں بجائے ایک ہونے کے چار ہیں اور اللہ کے حکم وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا کی کسی کو پرواہ نہیں معلوم ہوتی۔ ان چہار میں سے کس کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ اگر باوجود اختلافات (فروعی سہی) کے سب کتاب و سنت کے مطابق ہوں تو "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا" پر عمل کی کیا صورت ہو گی اور اس حکم کا مطلب کیا ہو گا اور قرآن عظیم فرقہ سازی کی وجہ "دین میں فرق نکالنے" کو قرار دے رہا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ میں "فرقوا دینھم" قابل غور لحاظ ہے کہ "لست منھم فی شیٔ جیسی سخت وعید کا حامل ہے "دینھم" میں فرق "اپنی متاثر ماحول فکر کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور بیّن آسان، غیر ذی عوج احکام و ہدایت میں فرق کا سبب اپنی فکری تاویل کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے (لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ) جب ہم کسی امر کو پہلے سے اچھا اور قابل پذیرائی قرار دے لیتے ہیں تو اسکے جواز کے لئے دلیل کی تلاش کرتے ہیں۔ دلیل نہیں ملتی تو پھر تاویل سے کام لیتے ہیں اور جہاں تاویل بھی نہیں ہو سکتی تو اس کی مخالف دلیل کو ملازم قرار دے کر جائز کر لیا جاتا ہے یا پھر قیاس و اجماع کو حجت شرعی قرار دے کر جواز کی صورت نکال لی جاتی ہے ورنہ پھر اجتہاد کو عمومیت دے دی جاتی ہے (بل کذّبوا بما لم یحیطوا بعلمہٖ ولما یاتھم تاویلہ

انہی باتوں اور اقتدار پسندی وغیرہ کو "بغیاً بینہم" فرمایا گیا۔ یہی باعث افتراق واختلاف ہیں۔ جہاں کیفیت یہ ہو وہاں فرمایئے کہ وہ نظام جو آپ پاکستان میں چاہتے ہیں وہ کس کتاب اللہ اور کس سنت رسول اللہ کے ستونوں پر قائم ہوگا۔ ایک کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ؐ یہ ہیں کہ اطاعت مستقل صرف اللہ اور رسول اللہ ؐ کی ہے اور "اولوالامر منکم" کی اطاعت ماتحت ہے اطاعت اللہ و رسول اللہ ؐ کے اور دین میں اقوال غیر اللہ اور غیر رسول اللہ مردود ہیں (من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد) اگر کسی کا قول کتاب و سنت کے موافق ہو تو وہ تو کتاب و سنت کی ترجمانی ہے قول نہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آخری دہے کی طاق راتوں میں فرمایا کہ شب قدر تلاش کرو۔ اس کی ہیئت جو کچھ احادیث رسول اللہ سے ثابت ہے وہ اظہر ہے۔ اس میں اس موجودہ طرز مجالس وعظ کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس کی بنا اقوال الرجال پر ہے فھو رد کیوں کہ اس طرز نے تو اللہ تعالیٰ سے تقرب (جو اس کی خاص غرض تھی) کے بجائے مولوی صاحب سے تقرب کر دیا۔ ان راتوں میں صرف جاگنا مقصود نہیں ہے بلکہ خالص اللہ کے لئے جاگنا مقصود ہے (اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيلاً) اور اللہ تعالیٰ نے اسے ناشیۃ اللیل کی ضرورت پہلے ہی بتا دی کہ "انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً" اس "قولاً ثقیلاً" کی اہلیت تو جب ہی پیدا ہوگی کہ "اشد وطأ" کی گھاٹی سے گذر جائے اور یہ بات اس جم غفیر میں کہاں حاصل ہو سکتی ہے جس میں عبد و معبود کے درمیان واعظ خوش بیان کے حائل ہونے کے علاوہ اور بھی سامان ہوں توجہ کو کھینچنے کے۔ اللہ کے لئے خالصتاً جاگنا ادب کو ملحوظ رکھنا۔ عبادت میں انہماک (کانک تراہ وان لم تستطع فانہ یراک) وہیں ہوگا جہاں عبد و معبود کے سوا اور کوئی شے جاذب نظر و قلب نہ ہو۔ ان راتوں میں یہ مجالس وعظ بجائے ثواب کے کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار کے مصداق ہیں۔

محترمی آپ کا صحیح اور پاکیزہ عقیدہ میرے لئے بہت کچھ کشش رکھتا ہے اور بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ "کون کہتا ہے ہم تم میں جدائی ہوگی"۔ لیکن آپ کے رسالہ کے توحید نمبر کے صـ۳۲ پر صلوٰۃ تراویح کے سلسلہ میں "نعمۃ البدعۃ" کے متعلق جو آپ نے تاویل پیش کی ہے کہ "یہ لغوی معنی میں "نعمۃ البدعۃ" ہے۔ شرعی اصطلاح والی وہ "بدعت" نہیں ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" فرمایا ہے۔ میری ناقص سمجھ میں یہ تاویل اس وجہ سے نہیں آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم میں کسی خاص قسم کی بدعۃ کو "ضلالت" نہیں فرمایا حکم کے الفاظ ہیں "کل" بدعۃ ضلالۃ" لفظ "کل" تو کسی استثنےٰ کا حامل نہیں جب تک کہ خود متکلم استثنےٰ کا تعین نہ کرے اور حضور ؐ نے کسی استثنےٰ کا تعین نہیں فرمایا۔

دوم اسی موضوع "تراویح" کے تحت آپ نے رقم فرمایا ہے کہ "تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پڑھی جاتی تھی اور جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی"۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس جماعت سے تراویح کو "نعمۃ البدعۃ" سے کیوں تعبیر کیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل (نہ سہی حادیث) بدعۃ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ محترمی۔ خاکسار کو جہاں تک معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ جماعت سے تراویح کا کبھی حکم دیا اور نہ ترغیب دی۔ صحابہ رضؓ خود حضور ؐ کے پیچھے کھڑے ہو کر جماعۃ سے ادا کرنے لگے۔ یہ کیفیت تین دن رہی چوتھے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لائے اور پھر آپ نے حکم دیا (بصیغہ امر) "صلوافی بیوتکم" اور اس حکم کی وجہ بھی بتا دی کہ سوائے فرض نماز کے دیگر نماز اپنے گھر میں پڑھنی افضل ہے۔ یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ اس حکم کے بعد صحابہ کرام ؓ گھروں میں تراویح پڑھتے رہے یہاں تک کہ حضرت عمر ؓ کی خلافت کا زمانہ آیا اور آپ نے مسجد نبوی میں الگ الگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر جماعۃ تراویح قائم کر دی۔ مگر اس جماعت میں ایک دن بھی خود حضرت عمر ؓ کی شرکت ثابت نہیں۔ مگر آپ نے لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تراویح جماعت سے پڑھی جاتی ہے ان الفاظ سے تراویح با جماعۃ اور اس پر صحابہ کی مداومت ثابت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں "صلوافی بیوتکم" اپنے بعد کی توضیح اور

توجیہہ کے بعد مستقل حکم کا درجہ پا جاتا ہے۔ محدود یا موقت نہیں رہتا جیسا کہ اس حکم سے پہلے کے الفاظ "مجکو خوف ہے کہ تمہارے
اوپر فرض نہو جائے۔۔۔۔" کو لے کر اور بعد کے الفاظ کو در خور اعتنا نہ رکھ کر تاویل کر کے باجماعت کا جواز نکال لیا کہ اب حضورؐ کے بعد
وحی بند ہوگئی دین مکمل ہو گیا لہٰذا فرض ہو جانے کا خوف جاتا رہا (اب جماعت قائم کرلو اور فضیلت و برکت کو چھوڑ دو)
ورنہ حکم مع توضیح و توجیہہ صاف ہے یہاں آکر مجکو معلوم ہوا کہ میرے آپ کے راستہ میں فرق ہے۔ میں "ترکت فیکم امرین
لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنت رسولہ" کے ظاہری معنی پر پورا ایمان رکھتا ہوں اسی کو اپنا مسلک بتاتا ہوں آپ کی تحریروں
سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ائمہ فقہا کے قول و فعل کو بھی حجت شرعی سمجھتے ہیں۔ قرآن عظیم کی رو سے حجت شرعی صرف اللہ تعالیٰ
اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قول ہیں اور اتباع کے لئے اسوۂ حسنہ رسول اللہ صلعم اقتدا کے لئے سبیل المؤمنین صحابہ کرامؓ ہیں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ احکام و ہدایت کی اطاعت تعمیل کے لئے اور صحابہ کرامؓ اقتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و
تلقین کے لئے (وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ ۔۔۔۔۔)
اس طرح دین کو مکمل فرمایا گیا کہ نہ قولاً کسی قسم کی گنجائش رہے اور نہ عملاً اور تاکید فرمادی کہ "اطاعت و فرمانبرداری کے طریقے کے علاوہ
کوئی اور طریقہ نکالا گیا (تاویلات یا نکات و معارف کے بیان وغیرہ کا) وہ قبول نہ ہوگا اور جو ایسا کریں گے ان کے لئے خسران ہی
خسران ہے" (وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ ۔۔۔۔۔ خَاسِرِينَ) حضرت انسان نے ماحول سے متاثر ہو کر وہ جولانیاں دکھائیں کہ
چوں چوں کا مربہ اور اضداد کا پلندہ بنا کر رکھدیا۔ اللہ تعالیٰ حکم دے رہا ہے کہ سب مل کر ایک جان ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو
اور تفرقہ نہ کرو" اور ہم کہیں کہ اس کی ضرورت نہیں۔ اسلام میں فرقہ سازی جائز ہے۔ کم از کم چار مذہبوں کی گنجائش تو ضرور
ہے۔ اسی پر تو کہا تھا کہ "دین حق را چار مذہب ساختند۔ رخنہ در دین نبیؐ انداختند"

اللہ تعالیٰ نے ایک مرکز اجتماع اور ایک نصب العین خود مقرر فرما کر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ عام اور کھلی دعوت
دیدو کہ "تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ"
یہ دعوۃ عام دنیا کے لئے تھی کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو مانتے اور جانتے ضرور تھے مگر اس کے احکام و ہدایت سے بھاگتے تھے۔ اللہ کے
رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں میں (جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت عالم کے لئے انتخاب فرمایا تھا) موجود تھے اللہ کے قانون، اللہ
کے احکام و ہدایت بیان فرما رہے تھے جہاں وضاحت کی ضرورت ہوتی اللہ تعالیٰ خود فرما دیتا اور اللہ کے رسولؐ اس کے
بموجب لوگوں کو سمجھا دیتے (لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ) آج اس ہماری دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ ہیں جو اپنے
تصور پر اپنے خداؤں کی تخلیق خود کرتے ہیں (مثلاً پرمیشور، محتاج روح و مادہ بندوں کا خدا۔ گاڈ، باپ بیٹے روح المقدس کا
مجموعہ یہاں بھی تثلیث موجود۔ وہاں روح و مادہ کو نکالدیجئے پرمیشور محض بیکار رشے ہے۔ یہاں روح القدس اور بیٹے کو الگ
کر دیجئے تو گاڈ حیران و پریشان۔ اور لیجئے فارسیوں۔ آتش پرستوں کا خدا یزدان۔ اہرمن کی انجمن کا صدر یہاں بھی تثلیث
ہے مگر مسلمانوں کا "اللہ" جس کا وجود کسی انسانی تصور کی تخلیق نہیں ہے بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا ہے) تمام
کمزوریوں اور شرکتوں سے پاک صاف۔ کسی چیز کا کسی امر میں محتاج نہیں وہ اپنی ذات و صفات میں "احد" ہے "صمد" ہے۔
خالق کل ہے، قادر مطلق ہے، عالم الغیب والشہادہ ہے، سمیع علیم ہے، مانتے تو سب ہیں مگر اپنے اپنے خیال کے بموجب
اور یہی باعث تفریق ہے۔ اسلام انکے سامنے حق اور حقیقت پیش کر کے داعی ہے کہ تم نے تو اپنے ماحول سے متاثر خیالات کے
تحت لوگوں کو دخیل کار بنا رکھا ہے آؤ مل کر بنظر تحقیق حق ملونیوں کو چھانٹ کر خالص ستھری توحید پر متفق و متحد ہو کر اور سب مل کر

اس کے احکام و ہدایت کی تعمیل کریں (واعتصموا باللہ)

حضرت محترم آج خود مسلمانوں نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) محکوم اولیاء و صلحاء بنا کر رکھ دیا کہ پیروں کے حکم کی تعمیل میں کسی کو بیٹا دے۔ کسی کو روٹی دے، کسی کو شفا دے۔ کسی کے محبوب کو ملائے اور کسی کو مقدمہ میں کامیابی دے اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا بڑھایا کہ عبد سے معبود بنا دیا اور "احمد" کے "میم" کو پردہ قرار دیا اور کہیں یہ آواز بلند کرکے کہ "اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے۔ جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد سے"۔ اللہ سے بھی (نعوذ باللہ) بڑھا دیا اور کہیں ائمہ مجتہدین کو اتنا بڑھایا کہ خواجہ حالی کو بھی کہنا پڑ گیا کہ ؎ "نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں۔ اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں"

آج اگر کوئی نبی آتا تو اس پر یقیناً وحی ہوتی کہ "قل تعالوا الیٰ کلمۃ...... من دون اللہ" عام دعوت کے لئے اور مسلمان حاضرہ کے لئے اس میں اضافہ ہوتا "ولا نتبع الا محمد رسول اللہ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کا۔ جناب محترم۔ میں حیران ہوں جب میں نام نہاد دینی کتب کے انبار دیکھتا ہوں اور پھر ان کی موجودگی میں شرحوں کی شرحیں اور تفسیروں کی تفسیر کی پریسوں میں بھرمار دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں اللہ تعالیٰ نے تو اعلان فرما دیا "لقد یسرنا" "غیر ذی عوج" "ان علینا بیانہ" "وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم...... یتفکرون"۔ ھدی للناس" ان کی موجودگی میں وہ کونسی پیچیدگیاں ہیں اور مشکلات کلام ہیں کہ جو اللہ اور رسول اللہ صلعم سے وضاحت و بیان میں رہ گیا اور مابعد کے علماء ۱۳۰۰ سو برس سے کتابوں پر کتابیں لکھ رہے ہیں مگر پیچیدگیوں اور مشکلات کا حل نہیں ہوتا۔ وہ دین جو عمل کے لئے تھا جو اقتداء کے لئے نازل ہوا تھا (لا تموتن الا وانتم مسلمون) آج تقریروں اور تحریروں میں محدود ہو کر رہ گیا۔ کفار اساطیر الاولین زباں سے کہا کرتے تھے ہمارے مدارس کی طرز تعلیم نے ہمارے واعظوں، مقرروں اور محرروں کے طرز بیان و مضمون نگاری نے واقعی اساطیر الاولین (صحابہؓ کی سہرطی) بنا کر دکھا دیا۔ جناب محترم عمل کہاں ہے دعوت عمل کہاں ہے۔ عمل کے لئے نظام کہاں ہے؟ تقریر و تحریر میں" ہو نمود اپنی تو انہ صیر کی پروا کس کو۔ کوئی تاروں سے جو پوچھے تو کہیں رات اچھی"

میرے خیال میں فرقہ بندیوں کا قلع قمع، اختلافات کا خاتمہ، جماعت کی تعمیر کے لئے قرآن عظیم کی آیات محکمات۔ ھُنَّ اُمُّ الکتاب پر بغیر تاویل کے عمل و اطاعت۔ اور اس عمل و اطاعت کے لئے تعلیم و تلقین اور اسوۂ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع بغیر تاویل پر کمربستگی کی ضرورت ہے اور اس اطاعت و اتباع اسوۂ حسنہ کے لئے اول احادیث متفق علیہ (بخاری مترجم) جو متفق علیہ میں نہ ہو اس کے لئے بخاری پھر مسلم اور پھر ان احادیث پر عمل جو محدثین کی کثرت کی حامل ہوں، یہ وہ امور ہیں جو اہل سنت والجماعت کے تمام فرقوں میں سواء ہیں۔ اگر فرقوں سے نجات حاصل کرکے "جماعۃ المسلمین" تابعداروں کی جماعت پر ایمان ہو تو یہ "سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُم" اور حاضر میں فھل اَنْتُم مُسْلِمُوْن یہاں ضرورت قال کی نہیں ہے، ظاہر کتاب و سنت پر عمل کی ہے۔ آپ کے چند مضامین نے جو آپ کے دلی جذبات کے ترجمان تھے، مجھ کو مجبور کیا کہ میں اس عریضہ کے ذریعے سے "جماعت المسلمین" کے اہم مسئلہ پر دعوۃ فکر دوں۔ لفظ المسلمین سے میں مسلمان نام نہاد قوم مراد نہیں لیتا ہوں میں نے اسلام سے مشتق اسم فاعل کے معنی میں لیا ہے یعنی وہ جماعت جہاں مذاکرات علمیہ و بحث وغیرہ کا بازار قطعی گرم نہ ہو صرف اطاعت و عمل کے لئے گردنیں خم ہوں۔ اگر آپ اس تجویز اتحاد و اتفاق کے موافق ہوں تو اٹھیے اور بول اس نام کا ہر قوم میں بالا کرنے کے لئے کمر ہمت باندھیے وانا انشاء اللہ اول من المسلمین اگر آپ کو اتفاق نہ ہو تو میں جواب کا طالب نہیں۔ بجز اس کے کہ آپ اللہ کے واسطے مجھ کو میرے فہم کی اغلاط پر مطلع فرمانے کے لئے قلم اٹھائیں تو اس کا اجر اللہ دے گا۔ والسلام

خادم دین محمد عبد الغفار الخیری عفی اللہ عنہ

فاران :- سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ آپ نے اس ہیچمدان کے بارے میں جس حسنِ ظن کا اظہار فرمایا ہے اور جو کلماتِ تحسین تحریر کئے ہیں، اُن کے لئے سپاس گزار ہوں، آپ سے التجا ہے آپ میرے لئے دُعا فرمائیں کہ میں آپ کے حسنِ ظن کا صحیح مصداق بن جاؤں ۔

آپ کی تحریریں نظر سے گزرتی رہتی ہیں، آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس پیرانہ سالی کے باوجود اپنے قلم کے ذریعہ آپ مسلسل دین کی خدمت کئے جا رہے ہیں اور اپنے نزدیک جس بات کو حق سمجھتے ہیں، اُس کا کھل کر اظہار فرما دیتے ہیں، آپ کی یہ جدوجہد خالصتہ للہ ہے، جس کا اجر آپ کو دارین میں ملے گا! جہاں تک عقائد کا تعلق ہے، آپ کے اور میرے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے" فاران" میں شرک و بدعت کے رَد میں مسلسل مضامین آتے رہے ہیں اور" فاران" کے توحید نمبر کی بدولت نہ جانے کتنے اہل بدعت کو اپنے گمراہ کن عقائد سے توبہ کی توفیق نصیب ہوئی ہے، اور یہ بات میں حسن ظن، خوش فہمی یا قیاس کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں، اس قسم کے خطوط دفتر فاران میں آتے رہتے ہیں ۔

"فاران" میں شرک و بدعت کا جس جرأت اور صاف گوئی کے ساتھ رَد کیا جاتا ہے، وہ میرے بعض دوستوں تک کو کھٹکتا ہے کہ اس معاملہ میں میرا احساس بہت نازک ہو گیا ہے، یہاں تک کہ مولانا روم، مولانا جامی اور بعض اکابر دیوبند تک کے یہاں کوئی بات مجھے کھٹکی ہے، تو اس پر بھی نقد و احتساب کیا گیا ہے! آپ نے "نعمۃ البدعۃ" کے سلسلہ میں میری تحریر پر جو گرفت کی ہے اُس پر حیرت ہوئی! صلوٰۃ تراویح باجماعت کے سلسلہ میں حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا جو قول ملتا ہے، اس میں نعمۃ البدعۃ آیا ہے، اسی لفظ کو اہل بدعت اپنے مسلک کی تائید میں بڑی شد و مد سے پیش کرتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں، "بدعت سیئہ" اور "بدعت حسنہ" اور یہ دونوں بدعتیں ایک جیسی نہیں ہیں، میں نے اپنے مضمون میں، اور توحید نمبر کے دوسرے مضمون نگاروں نے بھی اہل بدعت کی اس دلیل کی پُر زور تردید کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ہر بدعت" کو گمراہی فرمایا ہے، بدعت میں اچھی اور بُری کا امتیاز قائم نہیں فرمایا، اور بدعت تو "حسنہ" ہو ہی نہیں سکتی! اس توجیہہ کے بعد میرے اور آپ کے درمیان اس مسئلہ میں ذرہ برابر اختلاف باقی نہیں رہتا، اور اختلاف تو پہلے بھی نہ تھا، آپ نے غالباً میرے مضمون کا سرسری طور پر مطالعہ فرمایا ہے! میں نے تو نہ جانے کتنی بار" فاران" میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو نقل کیا ہے:

"فقیر تو بدعت میں کوئی حسن اور خوبی نہیں دیکھتا۔"

میں "ہر بدعت" کو گمراہی سمجھتا ہوں "کل بدعۃ ضلالۃ" پر میرا ایمان ہے، اور" فاران" میں کھل کر ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو "بدعت" کو "حسنہ" کہتے ہیں!

پاکستان میں نظامِ حق کے قیام کے سلسلہ میں آپ نے فقہی مذاہب کے اختلافات کا ذکر فرمایا ہے، اس خصوص میں عرض ہے کہ اب سے چند سال پہلے جب پاکستان میں دستور سازی کا مرحلہ درپیش تھا تو حنفی (دیوبندی و بریلوی) اہل حدیث یہاں تک کہ شیعہ علماء بھی ایک مرکز پر جمع ہو گئے تھے اور سب نے متفق ہو کر حکومت کے سامنے ایک یادداشت پیش کی تھی، جس میں اُن خطوط کی نشان دہی کی گئی تھی جن کی بنیاد پر پاکستان کے دستور کی تسوید و تدوین ہونی چاہیئے! دستور سازی کے سلسلہ میں پاکستان کے علماء کا یہ اتحاد نظام حق کے قیام کے لئے ہی ہوا تھا۔

آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہے کہ نظامِ حق کے قیام میں تمام فقہی مذاہب کس طرح متفق و متحد ہوں گے؟ حالانکہ اس قسم کے

تمام اندیشے پاکستانی علماء کے مذکورہ اتحاد نے باطل کر دیئے ہیں! جس اندیشہ سے آپ کے ذہن و فکر دوچار ہیں، یہ اندیشہ علماء اہل حدیث کو بھی لاحق نہیں ہوا اور انھوں نے دیوبندی، بریلوی اور شیعہ علماء کے ساتھ جمع ہونا یہ سمجھ کر قبول کیا تھا کہ نظامِ حق کے بنیادی مسائل میں ہر مکتبہ خیال کے مسلمان علماء کے درمیان اتفاق ہو سکتا ہے دیدہ وری باریک بینی اور ژرف نگاہی اچھی چیز ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ ہر صاف اور سیدھی سادی بات میں اندیشہ اور وہم پیدا کیا جائے۔

پاکستان کے دستور میں جو یقیناً کتاب و سنت کی اساس پر مدون ہونا چاہیے، یہ مسائل طے نہیں کئے جائیں گے کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے، صفاتِ الٰہی عین ذات ہیں یا غیر ذات ہیں، جمل و صفین میں حق پر کون تھا؟ میلاد شریف کا قیام بدعت ہے یا مستحب ہے؟ نماز میں آہستہ آمین کہی جائے یا پکار کر؟ امام کی اقتدا میں مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں —— پاکستان کے دستور میں اس قسم کے مسائل اور جزئیات سے بحث نہ کی جائے گی۔

پاکستان کا دستور اسلام کے بنیادی اقدار کا حامل اور کتاب و سنت کی اسپرٹ کا مظہر کامل ہونا چاہیے، جس کی رُو سے پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہ ہو سکے گا کہ جو کتاب و سنت کا مخالف ہو، شراب، سود، زنا، قمار بازی اور اسی قسم کے تمام منکرات و کبائر قانونی طور پر جرم قرار دیئے جائیں گے اور ان منکرات و کبائر میں مسلمانوں کے کسی فرقہ اور فقہی مذاہب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی یہ کہ شراب ایک فرقہ یا فقہی مذہب کے نزدیک تو قطعاً حرام ہو، اور دوسرے کے نزدیک مباح ہو! اسی طرح پاکستان کے دستور کی رُو سے یہاں "معروف" قائم ہوں گے اور "معروف" میں بھی فقہی مذاہب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور

معروف کے قائم ہونے اور منکرات کو مٹانے کے لئے انہیں قانونی طور پر جرم قرار دیئے جانے کا نام ہی "نظام حق" ہے تو پاکستان میں اگر "نظام حق" قائم ہو تو اس کے قیام کی راہ میں فقہی مذاہب کے اختلافات رکاوٹ نہیں بنیں گے۔

تقلید کیا ہے؟ تقلید، قیاس و اجتہاد اور فقہی مذاہب کے اختلافات کے سلسلہ میں آپ نے بہت سی باتیں کہی ہیں، میں اُن سب کا ایک اصولی جواب عرض کرتا ہوں، میں پوری کوشش کروں گا، کہ اس مسئلہ کے اہم پہلو نظر انداز نہ ہونے پائیں، ایک سال پہلے میں نے اسی موضوع پر "اداریہ" لکھا تھا۔ آپ نے اس بحث کو چھیڑا ہے، تو پھر ان باتوں کو دہرایا جا رہا ہے۔

میں تقلید کو نہ واجب سمجھتا ہوں اور نہ شرک! یہ دونوں انتہائیں ہیں، اور نقطہ اعتدال انتہاؤں کے درمیان ہی ہوا کرتا ہے! اس اعتراف کے بعد عرض ہے دُنیا میں مجتہدین چند ہی ہوتے ہیں، باقی تمام مقلدین ہی ہوا کرتے ہیں، تقلید ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس سے مفر نہیں! اور میرے نزدیک ائمہ فقہ کے "اجتہاد" کی حیثیت قانونی نظائر کی ہے۔

"تقلید" دراصل کسی فن کے ماہر اور مجتہد پر اعتماد کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ کسی گروہ، جماعت، قوم یا مذہب کے تمام کے تمام افراد مجتہد اور محقق نہیں ہوا کرتے! کیا اہل حدیث کے عوام نے نماز، روزہ، زکوٰۃ حج اور دوسرے مسائل میں براہ راست کتاب و سنت سے استفادہ کیا ہے؟ ان میں کتنے ایسے نکلیں گے جو فن حدیث سے واقف ہیں اور احادیث کی صحت و ضعف اور ان کی علتوں کا علم رکھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اہل حدیث کے عوام نے اپنے علماء کے اعتماد پر مسلک اہل حدیث کو قبول کیا ہے، اسی "اعتماد" کا نام تقلید ہے، کوئی اس اعتماد کو تقلید نہ بھی کہے، تو اس کے اعتراف نہ کرنے سے حقیقت

تو نہیں بدل سکتی۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اہلِ حدیث نے اپنے فقہی مسلک کو کسی مخصوص شخصیت کے نام سے منسوب نہیں کیا۔

فقہی مسائل کی بعض جزئیات کا جہاں تک تعلق ہے خود صحابہ کرام میں تھوڑے بہت اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن کریم کی بعض آیات کی تفسیر اور ان سے مسائل کے استنباط میں صحابہ کرام کے اقوال و آرا، بالکل یکساں نہیں ہیں۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور آیا تو اسلامی حکومت کے حدود بہت وسیع ہو چکے تھے۔ دوسری قوموں کی تہذیب قانون اور رسم و رواج سے واسطہ پڑا، اور معیشت تجارت، زراعت اور حکومت کے مسائل متفرع ہوتے چلے گئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے قول و عمل بھی اُس دور کے علما تک پہنچے جن میں دونوں پہلو پائے جاتے۔ یعنی حضورؐ نے کسی کام کو کیا اور پھر اُسے ترک فرما دیا۔ ایک حکم اصول کے طور پر دیا، مگر کسی مجبوری یا بیماری وغیرہ کے سبب اس اصول میں خود حضورؐ نے استثناء فرمایا ان حالات میں اللہ تعالیٰ کے بعض نیک بندوں نے جو قابلِ اعتماد کردار رکھتے تھے اور صاحب تقویٰ تھے۔ کتاب و سنت میں جن کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی دولت سے نوازا تھا۔ فقہی مسائل کو مستنبط اور مدون کیا جن مسائل کے بارے میں کتاب و سنت خاموش تھے ان میں اجتہاد سے کام لیا مگر اس احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ کہ دین کی کوئی اصل اور اساس اس اجتہاد سے متاثر اور مجروح ہونے پائے

فقہی مسائل کے اس استنباط اور اجتہاد میں ائمہ فقہ کے درمیان اختلاف بھی واقع ہو گیا۔ یہ اختلاف بالکل فطری تھا اور یہ اختلاف دین کے اصول اور اساسی مسائل میں نہیں فروع و جزئیات میں تھا کسی امام نے کتاب و سنت، اور آثار صحابہ کی بنیاد پر ایک فعل کو مستحب سمجھا اور دوسرے امام نے مباح: اسی طرح بعض چیزوں کی حرمت و حلت کے درمیان بھی یکسانی باقی نہ رہ سکی، کیونکہ احادیث و آثار میں دونوں پہلوؤں کی گنجائش پائی جاتی تھی، اور اجتہاد و قیاس میں بھی ان جزئیات میں ایک فیصلہ پر پہنچنا دشوار تھا! مگر ائمہ فقہ جس چیز کو حرام و حلال ٹھیراتے ہیں اس کی حیثیت منصوص حرام و حلال کی سی ہرگز نہیں ہے، مثلاً ایک امام کے نزدیک ایک جانور حلال ہے اور دوسرے کے نزدیک حرام ہے، تو اس مابہ النزاع جانور کی حلت و حرمت، خنزیر کی طرح نہیں ہے کہ جس کو حلال سمجھنے سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور کھانے سے معصیت کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

کسی فقہ کے امام نے یہ نہیں کہا کہ ہماری تقلید وجوب کا درجہ رکھتی ہے جس کے ترک سے گناہ لازم آتا ہے۔ مثلاً امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں نے اپنے استاد کے سینکڑوں مسائل میں اختلاف کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ امام اعظم مطاع نہ تھے ان سے مسائل کے استنباط و اجتہاد میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کا قول کتاب و سنت کی طرح حجت نہ تھا! امام اعظمؒ کے شاگردوں کے اس عمل کے بعد "تقلید" کو جو کوئی شرک کہتا ہے یا "قلادہ برگردن نہادن" کے لغوی معنیٰ کی باریکی پیدا کر کے اس کو اطاعت منصوص کے مساوی قرار دیتا ہے وہ بہت بڑی زیادتی کرتا ہے

امام اعظمؒ کی جو کوئی تقلید کرتا ہے تو یہ سمجھ کر ہرگز نہیں کرتا کہ ان کی اطاعت منصوص ہے' یہ تقلید اس اعتماد کی بنا پر ہے کہ امام اعظمؒ کتاب و سنت اور آثار صحابہ میں بصیرت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اجتہاد کی تمام شرائط کے ساتھ مسائل میں اجتہاد اور استنباط کیا ہے ان کی تحقیق اقرب الی الصواب ہے ان کی بات ایک صاحب فن مجتہد اور اہلِ تحقیق کی حیثیت سے مانی جاتی ہے۔ یہ سمجھ کر کہ وہ اپنی ذات کی طرف نہیں بلکہ کتاب و سنت کی اطاعت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ وہ خود متبوع نہ تھے بلکہ رسول اللہ علیہ وسلم کے تابعدار تھے اور حضورؐ کے تابعداروں میں حضور کے اقوال و افعال سمجھنے کی دوسرے تابعداروں سے زیادہ اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔

اس بات کو ہم مانتے ہیں جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، تقلید میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ بعض جہلا اس حد تک پہنچ گئے — قولِ ابی حنیفہ بیار، مارا از حدیث چہ کار ——— بعض مسائل میں خاصی عصبیت اور تحزب کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، ہم اس شدت

اور غلو سے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں اُن احناف کی دینی فہم پر افسوس ہوتا ہے جو نمازوں میں "آمین بالجہر" سن کر اذیت محسوس کرتے ہیں (توبہ) اور "رفع یدین" کو دیکھ کر جن کی پیشانیوں پر شکنیں آجاتی ہیں۔ جیسے یہ کوئی مبغوض فعل کیا جارہا ہے (معاذ اللہ) دوسری طرف اہلِ حدیث حضرات کی یہ شدت بھی پسندیدہ نہیں ہے بلکہ محلِ غور اور لائقِ اصلاح ہے کہ وہ نماز پڑھنے کے طریقہ پر ہمیشہ نکتہ چینی کیا کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ احناف کی نمازیں برباد جاتی ہیں۔ دفتر "فاران" میں اہل حدیث علما کی ایسی کتابیں تبصرے کے لئے آتی رہتی ہیں جن میں حنفی فقہ پر طنز اور چوٹیں کی جاتی ہیں۔ ایک کتاب میں تو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی پر پھبتیاں اڑائی گئی تھیں۔ مگر احناف فقہ کی کتابوں میں نماز روزہ وغیرہ کے مسائل میں اپنا مسلک بیان کردیتے ہیں۔ اور اہلِ حدیث کے مسلک کو ہدفِ تنقید نہیں بناتے۔ اہلِ حدیث اہلِ قلم کی جو کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ اس قسم کی تحریروں کے سبب اہلِ حدیث حضرات سے کہیں خشونت نہ منسوب ہوجائے! اہل حدیث اہل قلم جتنا وقت، روپیہ اور انرجی "رفع یدین اور آمین" وغیرہ مسائل کی شرح و تفصیل میں صرف کرتے ہیں، اگر یہ تمام قوتیں شرک و بدعت کے رد میں صرف کی جائیں تو بہت سے مسلمان گمراہی کے اندھیرے سے نکل سکتے ہیں۔

میرے پاس ایک صاحب تشریف لاتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد دکن کے رہنے والے ہیں۔ پہلے حنفی تھے۔ پھر اہلِ حدیث مسلک اختیار کرلیا۔ جب وہ حنفی تھے تو بھی ان کا اسلام اور ایمان مشتبہ اور کمزور نہ تھا۔ اور اب اہل حدیث مسلک اختیار کرنے کے بعد بھی ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی۔ میں ان کی اس حق پسندی، جرأت اور ذاتی تحقیق و تفحص کی قدر کرتا ہوں کہ جس مسلک پر ان کو یقین ہوگیا کہ یہ اقرب الی الصواب ہے، اُسے انہوں نے قبول کرلیا۔ مگر اُن کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اپنے باپ کے بارے میں یہ تک کہہ گزرتے ہیں کہ میرا باپ حنفی مسلک پر ہونے کے سبب جہنم میں جل رہا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کس صحبت، ماحول اور تعلیم و تربیت کا اثر ہے جس سے اس قسم کا مزاج بن جاتا ہے۔

حق یہ ہے کہ تمام فقہی مذاہب، اور اہلِ حدیث مسلک بھی سب کے سب حق پر ہیں۔ فقہی مسائل میں ان کے زیادہ تر اختلافات راجح اور مرجوح کی حد تک ہیں۔ یا پھر کسی مسئلہ میں کسی کے یہاں توسع ہے کسی کے یہاں تنگی ہے، کہیں کہیں کمزوریاں ہر فقہی مذہب میں پائی جاتی ہیں مگر کوئی فقہی مذہب معاذ اللہ "گمراہ" اور حق کی راہ سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ نماز ہر فقہی مذہب میں فرض ہے اور نماز کے اوقات کی تعداد میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے! اختلاف اوقات کی تاخیر و تعجیل میں ہے اور یہ اختلاف جزئی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں صلوٰۃ کی جو تفصیل آئی ہے۔ اس کے مطابق ہر فقہی مذہب کی نماز میں قیام، رکوع، قعود، سجود، تکبیر و تسبیح اور قرآن کے کچھ حصہ کا پڑھنا مشترک ہے اور اس طرح جزئی اختلافات کے باوجود تمام مذاہب میں نماز جس طریقہ سے پڑھی جاتی ہے، بہر حال ادا ہو جاتی ہے۔

فقہی مذاہب معاذ اللہ دین کو بگاڑنے اور ملت میں افتراق پیدا کرنے کے لئے وجود میں نہیں آئے۔ ان مذاہب نے تو دین میں سہولتیں اور آسانیاں پیدا کی ہیں۔ ائمہ فقہ خدا کا خوف رکھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کے اتباع کی پوری پوری کوشش کرتے تھے! امام ابوحنیفہؒ کے سامنے اگر کتاب و سنت کی کوئی دلیل نہ ہوتی تو وہ اپنی اور اپنے ساتھ اپنے اوپر اعتماد کرنے والے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کی نماز برباد کرنے کے لئے بھلا یہ کرسکتے تھے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورہ فاتحہ پڑھنے سے روک دیں۔ یا رفع یدین کرنے کو ضروری نہ جانیں۔ ایسا کرنے میں ان کا دین اور دنیا کا آخر کیا فائدہ تھا! امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کا اگر جائزہ لیا جائے تو اُن کے اقوال اپنی پشت پر کتاب و سنت اور آثار صحابہ کی کوئی نہ کوئی دلیل اور ایماء ضرور رکھتے ہیں۔ فقہ

حنفی کی بنیاد معاذاللہ دین کی مخالفت پر نہیں، دین کی عین موافقت پر ہے۔ ائمہ فقہ کا کام شرعی مسائل کی تفریق و پراگندگی نہیں، جمع و تدوین تھا یہ مقدس بزرگ دینی مسائل کو متفرق کرنے والے نہیں بلکہ انکے شیرازہ بند تھے، ان کی کوششیں طنز و تضحیک کی نہیں۔ بلکہ قدر و ستائش کی مستحق ہیں۔

مولانا محترم! فقہی مذاہب[1] سے "تفریق دین" کو جو کوئی منسوب کرتا ہے۔ وہ "دین" اور "تفریق" دونوں کی معنویت کا غلط استعمال کرتا ہے۔ فقہی مذاہب کے اختلافات نے تو بڑی سہولتیں اور آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اور اگر مسلمان ان مذاہب کے تمام ائمہ کے اجتہادات سے فائدہ اٹھائیں اور اٹھانا چاہیے کہ حق کسی ایک فقہی مذہب میں محدود نہیں ہے تو موجودہ دور کے نئے نئے مسائل کی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں ——— اور کوئی کسی امام کی تقلید سے ہزار بار باہر ہو جائے۔ مگر دین سے ہرگز باہر نہیں ہوتا۔

اب رہے جزئی اختلافات تو کیا علماء اہل حدیث سو فی صدی جزئیات میں متفق ہیں ننگے سر نماز پڑھنے کے مسئلہ میں علماء اہل حدیث کے درمیان اختلاف ملتا ہے۔ سعودی حکومت میں نافذ شدہ نظام شریعت کو اہل حدیث حضرات سراہتے ہیں۔ حالانکہ وہاں کے نظام شریعت کی بنیاد "حنبلی فقہ" پر ہے ——— اور حنبلی فقہ مسلک اہل حدیث سے کتنا ہی قریب سہی۔ مگر تقلید کی نسبت تو وہاں بھی پائی جاتی ہے۔

اکابر و ائمہ اور علماء و صلحاء سے جو عقیدت کی وابستگی ہوتی ہے اس میں تھوڑے بہت غلو سے بچنا بڑے بڑوں کیلئے دشوار ہو جاتا ہے اس کی زندہ مثال حضرت امام ابو حنیفہ اور حضرت امام بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ کی شخصیتوں سے احناف اور اہل حدیث کی عقیدت و وابستگی ہے اور یہ کمزوری بھی انسانوں ہی میں پائی جاتی ہے کہ بعض اوقات اپنے مسلک کے کسی کمزور موقف کو چھوڑتے ہوئے بھی دل آمادہ نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ جو اہلحدیث میں "ختم بخاری" کی رسم چل پڑی ہے اس پر میں نے بعض اہلحدیث حضرات سے گفتگو کی..... تو وہ اس رسم کے لئے کتاب و سنت یا آثار صحابہ سے کوئی دلیل تو پیش نہ کر سکے۔ مگر اس کے جواز و تحسین کے موقف سے بھی دست بردار نہ ہو سکے۔ رمضان کے آخری دہے کی طاق راتوں میں مسجدوں میں جو وعظ کی محفلیں ہوتی ہیں اس پر اس "ختم بخاری" کی رسم کا قیاس کر لیا جائے۔

مولانائے مکرم میں نے اپنے نزدیک جسے حق سمجھا اُس کا خاصی شرح و بسط کیساتھ اظہار کر دیا۔ مجھ سے جہاں غلطی ہوئی ہے تو اُسے میری نیک نیتی کے ساتھ نادانستگی اور بشری لغزش پر محمول فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے اور جمے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(مخلص، طالب دعا — ماہر القادری)

---

[1] احناف جو نماز تراویح باجماعت پڑھتے ہیں اس کی ایک اصل تو خود آپ نے اپنے خط میں پیش فرما دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت و اقتدا میں تین دن صحابہ کرام نے تراویح کی نماز جماعت سے پڑھی ہے اگر یہ بات حضور کو ناپسند ہوتی تو پہلے دن ہی اس پر نکیر فرما سکتے تھے ——— پھر حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تراویح کا باجماعت ادا کیا جانا اور صحابہ کرام کی اکثریت کا اس پر نکیر نہ کرنا تو اس کے لئے روشن دلیل ہے ہمارا اس پر پورا یقین ہے کہ حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا اور ایماء کو بہتر سمجھتے تھے۔

یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ دین میں ایسی کون سی مشکل بات ہے جس کے حل کرنے کیلئے کتابوں کے انبار لگتے چلے جا رہے ہیں تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ خود آپ نے دین کی تفہیم و تبلیغ میں ہزاروں صفحے تحریر فرمائے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہی صورت دوسروں کو پیش آئی ہے۔ وہ کتابیں قابلِ اعتراض ہیں جنہوں نے دین کو پیچیدہ بنایا ہے۔ مگر جو کتابیں کتاب و سنت کی اطاعت کا شوق دلاتی اور معروف و خیر کیلئے ابھارتی ہیں اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

یکم فروری ۱۹۶۰ء سے نئے انتظامات کے تحت شائع ہو رہا ہے

تسنیم

دَورِ جدید کا

- ملی اقدار کا نقیب ہے
- تعمیر ملت کے کام میں پیش پیش ہے
- بے لاگ، صحت مند اور تعمیری تنقید کا مرقع ہے
- حکومت کو صحیح مشورے دیتا ہے
- عوام کے مسائل حل کرنے کی پرخلوص کوشش کرتا ہے
- فحاشی عریانی اور فسق و فجور کے سیلاب کے مقابلے میں ایک چٹان ہے

بدلِ اشتراک

مغربی پاکستان		مشرقی پاکستان
۵۴/-	سالانہ	۶۰/-
۲۷/-	ششماہی	۳۰/-
۱۳/۸	سہ ماہی	۱۵/-
۴/۸	ماہانہ	۵/-

زیرِ ادارت

ملک نصر اللہ خاں عزیز

اور خبروں کے معاملے میں معیاری اخبارات کی صف میں شامل ہے

تسنیم کی اشاعت بڑھا کر ملک و ملت کی خدمت میں ادارے کا ہاتھ بٹائیے

جاری کردہ:- دفتر روزنامہ تسنیم ۱۶ بیڈن روڈ، لاہور

ماہر القادری

پیام و تمنا

یہ عالمِ اسلام کہ ہے ملّتِ بیضا
مربوط و درخشاں، صفتِ عقدِ ثریا

اک باغ کے سب پھول ہیں اک ہار کے موتی
اللہ رے! کثرت میں یہ وحدت کا تماشا

رب ایک، نبی ایک، کتاب ایک، حرم ایک
اس واسطے ہے سود و زیاں ایک ہی سب کا

سب ایک ہی کشتی کے ہیں دریا میں مسافر
ترکی ہو کہ ایراں، یمن ہو کہ ملایا

ہے ایک ہی انداز، سکوں ہو کہ تموّج
وہ نیل کا ساحل ہو کہ راوی کا کنارا

خطوں کی جدائی نہیں روحوں کی جدائی
اسلام ہے خود اپنی جگہ ربط سراپا

ہیں وحدتِ افکار و نظر کے یہ کرشمے
ہے نجد کے صحرا میں بھی گلگشتِ مصلّا

ملّت سے جدا ہو کے کوئی جی نہیں سکتا
ماہی کے لئے موت ہے چھٹ جائے جو دریا

ہے رشتۂ جاں سے بھی سوا دین کا رشتہ
اس راز کو مومن کی فراست نے ہے سمجھا

کچھ روز کے مہمان ہیں یہ سرخ بگولے
دجلہ کے تلاطم سے پریشاں نہ ہونا

اس دور کی تہذیب تو اک شیشہ گری ہے
یہ صبح وہ ہے جس میں اندھیرا ہی اندھیرا

وہ دل جسے معراجِ محمدؐ پہ یقیں ہے
تسخیرِ مہ و مہر سے مرعوب نہ ہو گا

کہسار ہوں، گلشن ہو، زمیں ہو کہ فلک ہو
اللہ کی آیات ہیں ہر سو متجلّی

اخلاق و یقیں کے لئے پیغامِ اجل ہیں
افرنگ کی وہ شام ہو یا سرخ سویرا

شعلہ و شبنم

عروج زیدی

کیسا قرار، کس کی مسرت، کہاں کی خیر
خیر آفریں! مرے دلِ آتش بجاں کی خیر
ایسا نہ ہو جواب میں تلخی نصیب ہو
آسودگیٔ جراتِ عرض بیاں کی خیر
آلامِ روزگار سے ٹکرا رہا ہوں میں
تاب و تواں کی خیر ہو، عزمِ جواں کی خیر
دلِ مضطرب ہے اس کو متاعِ سکوں ملے
تیری زمیں کی خیر، ترے آسماں کی خیر
اُن کی نگاہِ لطف تلون مزاج ہے
منزل کی سمت بڑھتے ہوئے کارواں کی خیر
اب میں رسائیٔ غمِ دوراں سے دور ہوں
اُن کے دیئے ہوئے غمِ راحت رساں کی خیر
سعی کشودِ کار نہیں پھر بھی اے عروج!
حالانکہ ہر زباں پہ ہے "اردو زباں کی خیر"

ہلال صدیقی (چاٹگام)

اک عقلِ خداداد ہے اک عقلِ جہاں زاد
وہ خلدِ براہیمؑ ہے یہ جنتِ شداد
پھولوں کے تبسم سے بھی ہشیار رہو بلبل
ہے ورنہ یہاں گھات میں ہر گام پہ صیاد
جس ملک میں احکامِ شریعت نہ ہوں جاری
اُس ملک کا اسلام بھی مذہب ہے تو الحاد
ہر جذب سزاوار نہیں کوہکنی کا -!
ہر دل کا مقدر نہیں ہوتا غمِ فرہاد
اے مردِ مجاہد ہے ترا سود و زیاں اور
ہے تیرے گلستاں کی بہار اور خزاں اور
کافر کی نگاہوں میں فقط چاند ستارے
مومن کی نگاہوں میں بلندی کا نشاں اور

فضل الرحمٰن ماتی ٹونکی

مسجدیں ویران مومن بے صلوٰت ٭ ہو گئے تعمیر کتنے سومنات
دیر سے نسبت نہ کعبے کا خیال ٭ آہ اے انساں ہلاکِ شش جہات
گوش بر آواز ہیں اہلِ جنوں ٭ کہہ رہا ہے حسن شاید کوئی بات
زندگی بے چین ہے دل ہے اداس ٭ اور کوئی نغمہ لے سازِ حیات

عزیز حاصل پوری (ملتان)

عزم جو عزمِ جواں ہوتا نہیں
"جادۂ منزل نشاں" ہوتا نہیں
داغِ دل جلتے ہیں مثلِ آفتاب
ان چراغوں میں دُھواں ہوتا نہیں
جس کو مل جائے ترے غم کی خوشی
وہ کبھی ناشادماں ہوتا نہیں

ذوالفقار علی بخاری ؎

اور کچھ دن کے لئے صبر کریں اہلِ کلیم
کبھی درویشوں کی باری کبھی سلطانوں کی

فضل کریم فضلی ؎

زندگی پھول بھی ہیں، شبنم بھی
جشن بھی ہو رہا ہے ماتم بھی!
ذکر اتنا ترا کیا ہم نے
قابلِ ذکر ہو گئے ہم بھی!

مائل دہلوی

یہ کہہ کے چھیڑتے ہیں جوانانِ میکدہ
مائل! تمہیں سلام کہا ہے بہار نے
ہر غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نہ گردد
قربانِ لبِ یار گہے غنچہ گہے گل (شاعرے از ایران)

ماہر القادری

خامشی حسن بیانے دارد
نگہ شوق زبانے دارد

روحِ انتخاب

ایک عالی شان مکان کے کشادہ کمرے میں "ترقی پسندوں" کا جلسہ ہو رہا ہے میاں الف دین جنہیں ان کے ساتھی کامریڈ الف کے نام سے پکارتے ہیں، کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہیں۔ حاضرینِ جلسہ کی تعداد تیرہ (۱۳) ہے اور انہیں ناموں کی بجائے نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ ہر شخص کے سینے پر بلّہ لگا ہوا ہے جس پر اس کا نمبر درج ہے۔

کامریڈ الف (اٹھ کر) دوستو اور ساتھیو! میں نے آپ کے اصرار پر اس جلسہ کی کارروائی میں حصہ لینے کے لئے چند منٹ نکالے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج چائے پینے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے جلسے کی کارروائی فوراً شروع کر دی جائے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ آج میرے گھر سے آپ کو چائے نہیں ملے گی۔ آپ کو چائے کے ساتھ کیک، پیسٹری اور کباب وغیرہ سب کچھ ملے گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں جلسے کی کارروائی ختم کر کے آپ سے رخصت لوں اور آپ اطمینان سے چائے نوش کریں۔

اب ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہمارے طریق کار میں کوئی ایسی خامی ضرور موجود ہے جسے دور کئے بغیر ہم عوام کو اپنی طرف راغب نہیں کر سکتے۔ ہمیں اب یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیئے کہ پاکستان کے عوام کوئی ایسا عقیدہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہونگے جو اپنی ظاہری صورت میں اسلام کے نظریات سے متصادم ہو۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے نعروں میں عوام کے لئے دلچسپی اور تفریح کا سامان پیدا کریں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر اسلام کے مقابلہ میں کمیونزم کا نعرہ لگانے کی بجائے اسلام کا نام لے کر سادہ دل عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں تو یہ کام نسبتاً آسان ہو گا۔ مثلاً ہم عوام کو یہ سمجھا سکتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے باوجود ان کا یہ انسانی فرض ہے کہ وہ اپنی ثقافتی روایات کو زندہ رکھیں ایک عام آدمی کے لئے ثقافت یا کلچر کا مفہوم سمجھنا مشکل ہے ہمارا اولین کام یہ ہونا چاہیئے کہ ثقافت یا کلچر کے نعرے عوام کے کانوں تک پہنچا دیئے جائیں اور انہیں بار بار اس بات کا احساس دلایا جائے کہ یہ ایسی شے ہے جس کے بغیر انسان انسان نہیں رہتا۔ مسلمان رقص سے نفرت کرتے ہیں لیکن تہذیب اور کلچر کی دہائی دے کر انہیں بآسانی گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے پاکستان میں ایک ایسا فارغ البال طبقہ موجود ہے جو خوابوں کی جنت میں رہنا چاہتا ہے۔ یہ ہماری حماقت تھی کہ ہم ان بزرگانِ عیش و نشاط کو بوژوا کہہ کر اس قدر چڑاتے رہے ہیں کہ وہ کمیونزم کو اپنے لئے ایک بڑا خطرہ سمجھ کر اسلام پسندوں کی پناہ میں چلے گئے ہیں۔

میں اس بات کا عملی تجربہ کر چکا ہوں کہ اگر ہم تدبر سے کام لیں تو اسلامی قدروں کی بیخ کنی کے لئے ایسے لوگوں کا تعاون ہر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب روس نے کلچرل مشن کے نام سے چند سازندے اور رقاصائیں یہاں بھیجی تھیں تو اس طبقے سے تعلق رکھنے والے کمیونزم کے بدترین دشمن تھے ان کے تماشے دیکھنے کے لئے اگلی صف میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ مسلمانوں نے گانے والوں اور ناچنے والیوں کے لئے ایسے الفاظ ایجاد کئے ہیں کہ ایک عام آدمی ان سے کراہت محسوس کرتا ہے لیکن اگر ایسے الفاظ کی جگہ اچھے الفاظ ایجاد کئے جائیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں اس قدر کراہت محسوس ہو۔ مثلاً ایک گرا ہوا انسان بھی اپنی بہو بیٹی یا بہن کے لئے رقاصہ کا لفظ سننا پسند نہیں کرے گا لیکن اگر اسے آرٹسٹ کہہ دیا جائے تو اسے پریشانی نہیں ہو گی۔ پھر اگر آپ

کو یہ دعوت دیں کہ چلئے صاحب آج فلاں جگہ ناچ دیکھ کر آئیں تو وہ لاحول ولاقوۃ پڑھے گا لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ آج فلاں جگہ کلچرل شو ہے اور مجھے آپ سے یہ توقع ہے کہ آپ قومی ثقافت کی سرپرستی فرمائیں گے تو ممکن ہے وہ بیس تیس روپے کا ٹکٹ خریدنے پر آمادہ ہو جائے۔

کامریڈ ۱: ۔ جناب میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا۔ آپ جن آسودہ حال لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں وہ اگر ہر روز چوبیس گھنٹے رقص وسرود کی محفلیں منعقد کریں، تو بھی ہماری تحریک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ لوگ اسلام کے ضابطۂ اخلاق سے منحرف ہو کر بھی کمیونزم قبول نہیں کریں گے۔ ہماری تحریک کا مقصد تو یہ ہے کہ عوام کو ان کی غربت کا واسطہ دے کر ایسے لوگوں کے خلاف مشتعل کیا جائے۔

کامریڈ الف: تشریف رکھئے میں نے ابھی بات ختم نہیں کی۔

کامریڈ ۳، ۲، ۱۱: ۔ (یک زبان ہو کر) بیٹھ جاؤ ورنہ تمہیں پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔

کامریڈ ۱: ۔ بددل سا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

کامریڈ الف: ۔ آپ لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے جو بیماری کسی قوم کے طبقہ اعلیٰ میں شروع ہوتی ہے اسے عوام تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ ان لوگوں کو کلچر یا ثقافت کی سرپرستی پر آمادہ کر کے ہم عوام میں یہ تاثر پیدا کر سکتے ہیں کہ تہذیب و تمدن اور ثقافت کے نام پر جو رقص وسرود ہوتا ہے وہ اس ناچ گانے سے یقیناً مختلف ہے جسے اسلامی شعار کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ ثقافت کی حمایت میں ہمارے نعرے ابتداً اس فارغ البال طبقہ کو متاثر کریں گے جو کسی ضابطۂ اخلاق کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کرتا۔ اس کے بعد عوام خود بخود ان کے پیچھے چل پڑیں گے۔

کامریڈ ۱: ۔ معاف کیجئے میں پھر خاموش نہیں رہ سکتا۔ آپ پرسوں یہ شکایت کر رہے تھے کہ ہم نسلی اور علاقائی عصبیتوں کو ابھار کر بھی عوام میں انتشار نہیں پیدا کر سکے۔ لیکن اب آپ خود ہی انہیں ثقافت اور کلچر کے نام پر متحد کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

کامریڈ الف: (جھنجھلا کر) کامریڈ اگر تم روس میں ایسی لغویات کہتے تو تمہیں یقیناً سائبیریا بھیج دیا جاتا۔ میں ان خواص اور عوام کو کمیونزم کے خلاف نہیں بلکہ اسلامی تہذیب کے خلاف متحد دیکھنا چاہتا ہوں۔

کامریڈ ۱: ۔ لیکن آپ ہی تو کہا کرتے ہیں کہ پاکستان کے اندر عوام کے اتحاد کی ہر بنیاد یہاں کمیونزم کے مستقبل کے لئے خطرناک ہے۔

کامریڈ الف: تم نرے بدھو ہو بہر حال میں تمہیں یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ جب پاکستان کے عوام کو کلچر اور ثقافت کا بخار چڑھے گا تو ہم اپنے ترکش سے نئے تیر نکالیں گے، ہم یہ نعرہ لگائیں گے کہ پاکستان میں ہر خطے، اور ہر علاقے، ہر قبیلے اور ہر نسل کے انسانوں کی ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لئے ہم انہیں ایک قومی وحدت میں جذب کرنے کی ہر کوشش کو ان کے جداگانہ کلچر، تہذیب اور ثقافت پر حملہ تصور کرتے ہیں۔ ہم مختلف خطوں میں بسنے والے قبیلوں اور برادریوں کو یہ سمجھائیں گے کہ تمہارے لوک ناچ دوسرے قبیلوں اور برادریوں سے مختلف ہیں۔ اور یہ لوک ناچ تمہاری علیحدہ علیحدہ ثقافتوں کا قیمتی سرمایہ ہیں اگر تم ایک قومی وحدت میں جذب ہو گئے تو یہ قیمتی سرمایہ جس سے تمہاری انفرادیت قائم ہے ضائع ہو جائے گا۔ ہم نسلیت اور علاقائیت کے نام پر پاکستان کی وحدت کا شیرازہ منتشر کرنے میں ناکام رہے ہیں اور یہ اس لئے

کہ اسلام کا نعرہ ابھی تک عوام کے لئے زیادہ دل کشی کا سامان رکھتا ہے لیکن جب یہ لوگ رقص اور موسیقی کے دلدادہ بن جائیں گے تو چند برس کے اندر اندر عیاشی، فحاشی، ذہنی انتشار اور اخلاقی بے راہ روی کا ایک ایسا سیلاب اٹھے گا جو اسلام پسندوں کو تنکوں کی طرح بہالے جائے گا۔ اس وقت یہ حالت ہے کہ جب اسلام کا نام آتا ہے تو عوام اپنے نسلی، علاقائی اور ثقافتی اختلافات کو بھول کر ایک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسلامی قدروں کی بیخ کنی کے بعد ہم عوام کو ان کی جداگانہ ثقافتوں کا واسطہ دے کر علاقائی عصبیتوں کو پوری شدت کے ساتھ بیدار کر سکیں گے۔

(حاضرین تالیاں بجاتے ہیں)

کامریڈ ۱: جناب میں اپنی گستاخی کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ اب آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے مجھے افسوس ہے کہ ہم نے یہ مہم پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی کیوں نہ شروع کر دی۔

کامریڈ ۹: ۔ کامریڈ الف سے مخاطب ہو کر جناب جہاں تک گانے کا تعلق ہے۔ یہ مسئلہ تو ریڈیو والوں نے حل کر دیا ہے۔ گزشتہ چند برس میں انھوں نے کم و بیش ہر بچے کو فلمی گانے حفظ کرا دیئے ہیں لیکن یہ ناچ کا معاملہ مجھے پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ لوگوں کو اس کی طرف مائل کرنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

کامریڈ الف: ۔ میں ناچ گانے کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ لوگوں کو اس طرف راغب کرنا نہایت ضروری ہے۔ تمہیں یہ چاہیئے کہ تم دیہات میں جاؤ۔ ثقافتی میلے لگاؤ اور لوک ناچ اور لوک گیت کی تبلیغ کرو اگر عوام ناچنے گانے میں جھجک محسوس کریں تو تم خود ناچو اور گاؤ اور لوگوں کو سمجھاؤ کہ یہ ناچ اور راگ تمہاری آزادی کی روح ہیں تم ان لوگوں کے خطرناک عزائم کا مقابلہ کرو جو قومی وحدت کا نام لے کر تمہاری جداگانہ تہذیب اور کلچر کا گلا گھونٹنا چاہتے ہیں

کامریڈ ۱: جناب اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے آج ہی سے بھنگڑا اور لڈی کی مشق شروع کر دینی چاہیئے۔

کامریڈ ۹: ۔ اس کے لئے مشق کی کیا ضرورت ہے۔ بھنگڑا اور لڈی تو آپ دو دن میں سیکھ سکتے ہیں۔

کامریڈ الف: ۔ نہیں نہیں! تمہیں لوگوں کو یہ بتانا چاہیئے کہ یہ مقدس ناچ صدیوں کی محنت کا حاصل ہیں تمہارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ تم ان میں جذبے پیدا کرو اور عوام کو یہ سمجھاؤ کہ یہ ہے تمہاری وہ قدیم تہذیب اور ثقافت جو غیروں کی غلامی کے باعث تباہ ہو گئی تھی۔ اب تم زندہ رہنا چاہتے ہو، تو پہلے اسے زندہ کرو۔ رفیقو اور ساتھیو! میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ اب، اٹھو اور اس ملک کے چپے چپے میں پھیل جاؤ اور ثقافت کے نام پر ایک ایسا طوفان کھڑا کر دو جس کی تند و تیز لہریں اس ملک کی تمام روحانی اور اخلاقی قدریں بہالے جائیں! اس عظیم مہم کے لئے تمہیں ضروری ساز و سامان یعنی ڈھول، چمٹے، بانسریاں اور گھنگھرو وغیرہ پارٹی کے دفتر سے مہیا کئے جائیں گے۔

(ثقافت کی تلاش ــــــ از: نسیم حجازی)

نجمی، بی اے

قافلہ بہاروں کا

اس وقت موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ شام کی ہلکی پھلکی نکہت بیز ہوا ننھی منی رنگین تتلیوں کی طرح انتہائی بے فکری سے محو خرام تھی۔ اور سامنے کچھ دور تک پھیلا ہوا فرشِ زمردیں اس خرام ناز کی تاب نہ لاکر سو سو بل کھا رہا تھا۔ آس پاس کے کیاریوں کے ننھے منے خوبصورت پودے جیسے مژدۂ بہار پاکر انتہائی خوشی سے جھوم رہے تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی مگر اب مطلع بالکل صاف ہو گیا تھا۔ صرف کبھی کبھی آوارہ بادلوں کے ایک دو ٹکڑے ہوا کے دوش پر رقص کرتے ہوئے تیزی سے گزر جاتے تھے۔ شاید کسی کالیداس نے ان میگھ دوتوں کے ذریعہ کسی دور افتادہ محبوبہ کو پھر کوئی پیغام بھیجا تھا۔

شہر کے حسین ترین ریستوران "کہکشاں" میں اس وقت خلافِ معمول ... بھیڑ نہیں تھی۔ ہوٹل کے سامنے پھیلے ہوئے خوبصورت لان کے ایک گوشہ میں، تین خوشپوش نوجوان موسم کی رعنائیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے چائے سے شغل فرما رہے تھے۔ میز کے وسط میں رکھا ہوا تھری کیسلس کا ٹن ذوق کی غمازی کر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے کا ایک گھونٹ پیتے، ساتھ ہی سگریٹ کا ایک کش لیتے اور پھر لطیف نیلگوں دھوئیں کے مرغولے فضا کی آغوش میں رقص کرتے ہوتے دور تک چلے جاتے۔ کبھی کبھی ان کے قہقہے فضا میں جھنکار سی پیدا کر دیتے تھے۔ انتہائی بے فکری سے ایک آدھ گھونٹ پی کر کرسیوں کی پشت سے سر ٹیکے وہ کبھی تو ہر آنے جانے والے کو دیکھتے اور کبھی پھر خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتے۔ ان کی بات چیت کے موضوع مختلف تھے۔ کبھی تو اوپر گہرے نیلے آسمان پر سبک رفتاری سے تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر وہ چاند پر جانے کی باتیں کرتے اور کبھی زمین پر آکر نکسن کرشچیف، سرخ سویرے، زرد خطرے، فرائڈ کے نظریات یا اقبال کے تصورِ عشق کی گفتگو کرتے، وہ پڑھے لکھے، خوشحال، بے فکر قسم کے نوجوان تھے اور ان کے مشاغل اسی قسم کے تھے۔

سامنے رکھی ہوئی چائے دانی، اپنے سنہرے سیال کا آخری قطرہ بھی پیش کر چکی تھی۔ انھوں نے دوبارہ چائے کا آرڈر دیا اور نئے سگریٹ سلگا لئے۔ ابھی انھوں نے سگریٹ کے ایک دو کش ہی لئے ہوں گے کہ معاً ان کی نگاہیں ان کی میز کی طرف آتے ہوئے اوسط قد کے ایک خوبرو نوجوان پر پڑیں۔ آنے والا بہت متانت سے ان کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگار آدھے کے قریب جل چکا تھا۔ اس کی سفید شیروانی کے بٹن سلیقہ سے بند تھے، چشمہ کے نیلگوں شیشے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی چمک دار آنکھیں اس کی غیر معمولی ذہانت کی ترجمان تھیں۔ اس کے چلنے کا انداز، سلیقہ سے ترشی ہوئی ڈاڑھی، چہرے کے تیکھے نقوش اس کی متانت اور سنجیدگی پر دلالت کرتے تھے۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ ان کے قریب آیا اور میز کے سرے پر بیٹھا ہوا نوجوان استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سب ہی کھڑے ہو گئے۔ "ہلو" سب سے پہلے کھڑے ہونے والے نوجوان نے بے ساختگی سے کہا "سلام علیکم!!" آنیوالے نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"تو آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ میں آپ کے گھر گیا تھا۔" نووارد نے چوکور میز کی طرف رکھی ہوئی خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا

"ہاں بھئی! کچھ تو موسم کی دلفریبیوں کا تقاضا اور کچھ آپ لوگوں کا اصرار ۔" اس نے کہا اور پھر جیسے کچھ یاد آگیا ہو "میں تو بھول ہی گیا ۔ آپ لوگوں کا تعارف تو ہو جائے آپ ہیں احمد جاوید" اس نے نووارد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسی سال انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے ۔ بہت اچھے ادیب ہیں ۔ اور آپ راشد نوائی ۔ یونیورسٹی کے مجلّہ "سرخ گلاب" کے ایڈیٹر اور یہ ہیں حامد احمد ۔ اسی سال بی اے میں اول آئے ہیں ۔"

اور جب ایک بار پھر مصافحہ کی رسم ختم ہوئی اور چہروں پر رقصاں مسکراہٹ اپنے مرکز کو لوٹ گئی تو اس نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا "اور خاکسار کو عارف کہتے ہیں ۔" مگر سب بیچ ہی میں بول پڑے ۔ "کہیں نام سنا تو ضرور ہے ۔" اور پھر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا ۔ اتنے میں چائے آگئی اور سب اپنی پیالیاں سیدھی کرنے لگے ۔

چند منٹ بعد جب چائے کے مرغوب اور روح پرور جرعوں اور سگرٹ کے لطیف کشوں نے ماحول کی اجنبیت اور بیگانگی کو ختم کیا تو وہی پہلے والی بے تکلفانہ گفتگو کا سلسلہ پھر چل پڑا ۔

اس بات چیت کے دوران میں "سرخ گلاب" کے ایڈیٹر نے نووارد سے پوچھا "ایک بات پوچھوں احمد صاحب" اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی کہا "یہ آپ نے اچھے خاصے چہرے پر ڈاڑھی کیوں لگا رکھی ہے ؟"

"کس وجہ سے بھی لگا رکھی ہو ۔" عارف نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا "اس کی وجہ سے ان کے حسن میں اضافہ ضرور ہو گیا ہے ۔" اور پھر سب ہنس پڑے ۔

"لیکن یار ۔ یہ مذہب وغیرہ ہیں آثار قدیمہ قسم کی چیزیں ۔" راشد پھر بھی چپ نہ رہ سکا "کیوں آخر ؟" احمد نے مسکراتے ہوئے کہا اور جھک کر بجھے ہوئے سگار کو سلگانے لگا ۔

"اس سائنسی دور میں ہزاروں برس پرانے گلے بندھے رسم و رواج کس کام کے ؟" راشد نے کہا ۔

"دوست یہ تو بتاؤ ۔" حامد نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے عجیب انداز سے کہا "تمہارے کوٹ میں لگا ہوا خوبصورت گلاب ہمیشہ سے گلاب ہی تو رہا ہوگا ۔"

سب ایک لمحہ کے لئے خاموش سے ہو گئے اور پھر مسکرا پڑے ۔

"راشد صاحب دیکھئے" احمد نے پر اطمینان لہجے میں کہا "اس کو تو آپ مانیں گے ہی کہ زندگی ڈھنگ سے گزارنے کے لئے چند اصول و نظریات کی ضرورت ہوتی ہے ۔ پھر اگر چند آزمودہ اصول ہمارے لئے اب بھی کار آمد اور مفید ہیں تو کیا صرف قدیم ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیں گے ؟"

"بالکل ٹھیک" عارف نے کہا "اور کبھی کبھار تو مذہب کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے ۔ مثلاً شادی وغیرہ کے لئے ۔"

"اور شاید کسی اور مصیبت کے وقت بھی" ۔ حامد نے بڑی معصومیت سے کہا اور پھر ایک شاندار قہقہے نے فضا میں ایک لمحہ کے لئے ارتعاش پیدا کر دیا ۔

"یہ باتیں میں بہت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں ۔" راشد نے سگرٹ ایش ٹرے پر رکھ کر اس میں سے نکلتے ہوئے لہراتے بل کھاتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے کہا "میں اکثر یہ بھی سوچتا ہوں کہ اگر کسی مذہب کو ماننا ہی ہو تو کیوں نہ ایسے مذہب کی پیروی کی جائے جس میں رحم و کرم کے جذبات ہوں ۔ یہ کیا کہ ادھر آپ سے کوئی لغزش ہوئی ادھر حکم صادر ہو گیا پھینک دیئے جاؤ گے نارِ جہنم میں ۔" یہ آخری جملہ ....

کہتے کہتے اس کا لہجہ اچھا خاصہ تمسخرانہ ہو گیا۔ نفرت سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔

"میرے دوست!" احمد نے بڑی نرمی اور آہستگی سے کہا۔ اس کے لہجے اور آواز میں بڑا خلوص جھلک رہا تھا۔ "اپنے یہاں تو یہ بات بالکل نہیں ہے۔ شاید آپ کو صرف اسی قسم کی معلومات میلاد خواں قسم کے مولویوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ راشد نے اس کی طرف عجیب انداز سے دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو۔ اور کیا آپ سے حاصل کرتا جو زندگی بھر یونیورسٹی میں پڑھتے رہے ہوں۔" ان بیچاروں کی حالت بہت قابل رحم ہوتی ہے راشد صاحب۔ ان کو دین کی اسپرٹ کا صحیح علم ہوتا ہی نہیں۔ ہمارا خدا قہار و جبار ضرور ہے مگر اس سے کہیں زیادہ رحیم و کریم بھی ہے۔ پھر یہ بھی تو عجیب سی بات ہوگی کہ وہ غفار محض ہو اور ہم جو چاہیں کرتے پھریں۔ احمد نے کہا اور ختم ہوتا سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ کچھ دیر رک کر اس نے پھر کہا۔ کسی متوازن نظام حیات کے لئے دونوں ہی جذبے لازمی ہیں۔ پھر اس کے علاوہ جس ہستی نے اس دستور کو سب سے زیادہ سمجھا اور عملاً نافذ بھی کیا کیوں نہ خود اس کے عمل کو دیکھیں"

"بات تو معقول سی لگتی ہے" حامد نے برجستہ کہا۔

"اچھا بھئی، یہ بحث کچھ دیر کے لئے ملتوی، چائے کا ایک دور اور چل جائے"

عارف نے کہا اور سب کے سب اپنی پیالیاں خالی کر کے شکر ڈالنے لگے۔ اور پھر چائے ڈال لینے کے بعد جب نازک چمچوں اور نفیس پیالیوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہوئی مدھم موسیقی تھمی تو انھوں نے بغیر پیالی ہاتھوں میں اٹھائے جھک کر ایک دو ہلکے ہلکے گھونٹ پئے۔ اور سیدھے بیٹھ کر نئے سگرٹ سلگا لئے اور پھر فضا میں دھوئیں کے مرغولے تیرنے لگے لوگ چائے کی چسکیوں کے ساتھ سگرٹ کے ہلکے کش لیتے رہے۔ احمد دور بہت دور فضا میں محو پرواز بگلوں کی ایک قطار کو دیکھ رہا تھا۔ کتنا نظم، کتنی ہم آہنگی تھی اُن کی اڑان میں۔ شاید ان کی زندگی بھی ایسی ہی ہو۔ کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سگار منہ سے نکال کر انگلیوں میں دبا لیا اور قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کو ایک واقعہ سناؤں، کیوں راشد صاحب؟" راشد نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ کہا نہیں

"چلو یہی سہی" عارف نے بے تکلفی سے کہا۔ "مگر تم قصہ گو کب سے ہو گئے؟"

"یا بالفاظ دیگر" یہ باتیں آگئیں تم کو کہاں سے"۔ راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ..." حامد نے بڑی سادگی و سنجیدگی سے کہا، اور سب کے سب ایک ساتھ ہنس پڑے

"خیر کچھ شگفتگی تو آئی اس محفل میں" عارف نے سگرٹ کی راکھ ایش ٹرے میں گراتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی، عرض کیا ہے"۔ احمد نے کہا۔

"ارشاد!" سب نے ہم آواز ہو کر کہا اور احمد کے لبوں کے قوس پر سب کی نظریں جم گئیں۔

اس وقت اچانک دور افق میں سورج نکل آیا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں لان کے چاروں طرف سلیقہ سے گملوں میں لگے ہوئے کروٹن کی پتیوں پر سنہری گوٹ سی ٹانک رہی تھیں۔ پوری فضا اور بھی نکھر گئی تھی۔

احمد نے کہنا شروع کیا۔ "صحرا کے تقریباً وسط میں ایک چشمہ بہتا تھا اور وہیں اس چشمہ کے پاس ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ تھوڑے سے نفوس جو شاید پانی کے لالچ سے یہاں رک گئے تھے۔ اس بستی کے لوگ پہلے تو صحرا کے عام باشندوں کی طرح تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے مگر پھر صحرا کے عظیم انقلاب نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ ان کی طرز زندگی اور معاشرت

میں بہت حد تک تبدیلی آگئی تھی۔ صاف و شفاف پانی کا یہ چشمہ صدیوں سے یہاں بہتا رہتا تھا۔ شاید اسی لئے صحرا کے قافلوں کا ایک راستہ بھی اس بستی کے قریب سے ہو کر جاتا تھا۔"

"بھئی، قطع کلام معاف" راشد نے عجیب انداز سے کہا "جب کہانی ہی کہنی ہے تو کیوں نہ کسی آباد شہر، کسی صنعتی مرکز کی بات کی جائے۔ ویرانے ہی کی بات کیوں ہو؟"

"دیوانہ جو ٹھہرا" احمد نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاباش" عارف احمد کا شانہ تھپکتے ہوئے زور سے کہا۔ "ہاں تو پھر کیا ہوا"

"ہاں" احمد نے کہنا شروع کیا "اس بستی کے رہنے والے اوروں کی طرح دن بھر اپنے کام کاج میں لگے رہتے اور شام کو جو کچھ میسر ہوتا کھا کر ڈیروں خیموں اور گھروں میں سو جاتے اور بستی پر چھایا ہوا سکوت صحرا کے بے پناہ سکوت کا جز بن جاتا۔

"اسی طرح ایک رات پوری بستی محو خواب تھی، شب کا ہمہ گیر سناٹا پوری کائنات کو اپنی آغوش میں لئے شاید خود بھی محو خواب تھا۔ پوری فضا ساکت تھی۔ صرف درخشندہ ستارے شاید کسی کے انتظار میں پلکیں جھپکا رہے تھے، ورنہ پچھلے پہر کی خنک ہوا نے صحرا کے ذروں کو بھی گہری نیند سلا دیا تھا۔ اور صحرا پر سکوت طاری تھا۔ لامتناہی سکوت۔

"مگر اچانک صحرا کا یہ لامتناہی سکوت ٹوٹ گیا"

"یعنی سحر قریب آگئی!!" راشد نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"کیوں بے ذوقی کا ثبوت دیتے ہو۔ ہاں احمد صاحب" عارف نے اس قصہ میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ احمد راشد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "نہیں۔ بلکہ دور کسی رواں دواں قافلہ کی گھنٹیوں کی مرتعش آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر بیکراں سناٹے میں قریب آتی ہوئی یہ آوازیں خوابیدہ کائنات کو جیسے پیام بیداری دے رہی تھیں" اتنا کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا، سگار کے دو گہرے کش لئے اور پھر کہنا شروع کیا۔

"رات کی سیاہی کم ہوتی گئی، سحر کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ بانگ جرس قریب سے قریب تر آتی گئی۔ اور ساتھ ہی خوش الحان حُدی خوانوں کے نغمے فضا میں ارتعاش سا پیدا کرنے لگے۔ اور یہ سب آوازیں ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی بستی کے رہنے والوں تک بھی جا پہنچیں اور وہ انگڑائیاں لیتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ خاص انداز میں آتی ہوئی آواز اب صاف سنائی دینے لگی تھی۔

"شمال سے آتے ہوئے اس قافلہ کی آواز سُن کر بستی کے باشندے چونکنے ہو گئے۔ ادھر سے تو دشمنوں کے لشکر بھی آسکتے تھے پھر آجکل جنگ بھی تو ہو رہی تھی۔ انھوں نے سوچا اور مسلح ہو کر بیشتر افراد بستی کے باہر لشکر کا انتظار کرنے لگے۔ ستاروں کے ٹمٹماتے دیئوں کے سہارے، بڑھتا ہوا قافلہ بستی کے قریب آگیا تھا۔ پھر جلد ہی مرتعش آوازوں کی جگہ لوگوں کے دبے دبے شور نے لے لی۔ قافلہ شاید مقیم ہو رہا تھا۔

"بستی کے کچھ نوجوان دریافت حال کے لئے چلے، مگر اتنے ہی میں انہیں ایک پکار سنائی دی۔ "اللہ اکبر، اللہ اکبر...." اور انکے دل مطمئن اور مسرور ہو گئے۔ یہ دشمنوں کا لشکر نہیں ان کے ہم مشربوں کا قافلہ تھا اور ان میں سے کچھ یہ خوش خبری سنانے کے لئے بستی کی طرف لوٹ گئے۔"

احمد اتنا کہہ کر ایک سیکنڈ کے لئے رکا ہی تھا کہ چاروں طرف روشنی کا سیلاب سا امنڈ پڑا۔ دن غروب ہو چلا تھا۔ چاروں طرف سلیقہ سے لگے ہوئے بجلی کے قمقمے چمک اٹھے تھے۔ احمد نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور سگار ایش ٹرے پر رکھتا ہوا کھڑا ہو گیا

"کیوں خیریت تو؟" راشد نے اسے اس طرح اچانک اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

"اوہ، ٹھیک ہے"۔ عارف نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

احمد چند قدم ہی چلا ہوگا راشد نے پھر کہا "بھئی آخر اس طرح کہاں چلے؟"

"وہی ـ 'وہ ایک سجدہ ....' احمد نے مسکراتے ہوئے کہا "ابھی حاضر ہوا" کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ حامد اور عارف کے ہلکے قہقہے اسے دور تک سنائی دیتے رہے۔

چند منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو سگرٹ کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ لوگ جیسے اس کے منتظر ہی تھے۔ راشد نے فوراً ہی کہا "ہاں صاحب پھر کیا ہوا۔ کچھ ذوق تجسس بیدار ہو چلا ہے"۔

اطمینان سے بیٹھ کر احمد نے پھر کہنا شروع کیا۔

"طلوع سحر کے وقت جب سورج کی بنفشی کرنیں اس طرح دھرتی کے قدم چومنے بڑھیں تو نسیم سحر کے خوشگوار جھونکوں نے یہ خبر بستی کے بچے بچے کو پہنچا دی کہ بستی کے شمال مشرق میں ایک قافلہ ہزاروں بہاریں اپنے جلو میں لئے، خیمہ زن ہوا ہے۔ بستی کے رہنے والوں کے دل کلی کی طرح کھل گئے اور وہ اس مبارک موقع سے استفادہ کرنے اور فائدہ اٹھانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

صبح سویرے بستی کے سربرآوردہ لوگ میر کارواں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بستی میں چلنے کی استدعا کی۔ میر کارواں اپنے جاں نثاروں کے جلو میں اس بستی کی چل پڑا۔ لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ساری کائنات اپنی تمامتر رعنائیوں سمیت جنبش میں آگئی ہو۔

اس کا چودھویں ... کے چاند سے زیادہ روشن و پر نور چہرہ، اس کی متانت اور سنجیدگی اس کی تمکنت، اس کی حیا اس کا دلنشیں انداز تکلم۔ اس کا باوقار انداز خرام، غرضیکہ جمال و جلال کا ایک نادر امتزاج تھا اس کی شخصیت میں"۔

"سبحان اللہ" حامد نے اچانک بڑے والہانہ انداز سے کہا اور احمد کا سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا۔ عارف اور راشد کی نگاہیں بھی شاید اس ریمارک کی تائید ہی کر رہی تھیں۔ احمد نے آہستہ سے کہا "شکریہ" اور پھر کہنا شروع کیا۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا، وہ اور اسکے باادب جاں نثار بستی میں داخل ہوئے۔ اور بستی میں جیسے پیغام بہار آگیا۔ لوگوں کے بشاش چہرے بتا رہے تھے کہ انہیں اس تشریف آوری سے کتنی مسرت ہوئی ہے۔ لوگ جوق در جوق استقبال کے لئے آتے اور پھر انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ پیچھے شامل ہو جاتے۔ بستی کی چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنی پاکیزہ آوازوں سے استقبال کے نغمے گا رہی تھیں اور پوری فضا ہم آہنگ ہو رہی تھی۔

"چلتے چلتے ان کا گزر ایک بوسیدہ سے خیمے کے پاس سے ہوا۔ خیمے کے اندر ایک عورت چولھے پر ہانڈی رکھے آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے قریب ہی اس کا ننھا منا سا بچہ زمین پر بیٹھا ہوا کھیل رہا تھا۔ جب آگ کی لپٹ تیزی سے اٹھتی اور جب بچہ کھیلتے کھیلتے آگ کے قریب آ جاتا تو وہ عورت اس کو انتہائی شفقت سے کنارے ہٹا دیتی۔

"اس عورت نے قدسیوں کے اس جلوس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں سب سے آگے چلتے ہوئے مجسم نور و رعنائی شخصیت کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا سر جھک گیا۔ مگر فوراً ہی اس کی آنکھیں کسی اچانک خیال کے اثر سے چمکنے لگیں۔ اس نے اس گزرتے ہوئے سراپائے جمال کو دیکھا، چولھے میں جلتی ہوئی آگ کو دیکھا اور پھر ایک نظر اپنے بچے پر ڈالی۔ پھر بغیر کسی توقف کے اس نے اچانک اپنے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور سر پر چادر درست کرتی ہوئی تیزی سے باہر آئی۔ یہ مختصر سا قافلہ اس عورت کو اتنی

تیزی سے باہر آتے دیکھ کر رک سا گیا تھا۔

اتنا کہہ کر احمد نے سامنے بیٹھے ہوئے دوستوں کی طرف دیکھا، وہ سب کے سب خاموش بیٹھے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں میں بے پناہ اشتیاق چمک رہا تھا۔

احمد نے کچھ مطمئن سا ہو کر پھر کہنا شروع کیا۔

"وہ عورت آگے بڑھ کر سیدھے میر کارواں کے پاس پہنچی اور قدرے بیباکی سے پوچھا" ہمارے سردار آپ ہی ہیں؟"

"ہاں" انھوں نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ فرمایا۔

"میرے ماں باپ آپ پر قربان" اس عورت نے پھر کہا "کیا ہمارا سب کا مالک اللہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا نہیں ہے؟؟"

"ہاں، ہے تو" آپ نے جواب دیا۔

"تب اس عورت نے پھر کہا" ماں کو اپنے بچے سے جو محبت ہوتی ہے، کیا اللہ اس سے بڑھ کر بندوں پر مہربان نہیں؟؟"

"ہاں، اس سے کہیں زیادہ" میر کارواں نے انتہائی پُرسکون انداز میں جواب دیا۔

تب اس عورت نے اپنے بچے کو سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا" مگر ماں تو اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈالتی!!"

"جانتے ہو اس سوال کا اس عظیم ترین ہستی پر کیا اثر ہوا؟" احمد نے بہت حد تک دم بخود بیٹھے ہوئے دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ سب کے سب یہ کہانی سننے میں محو تھے۔ ان کی انگلیوں میں دبے ہوئے سگرٹوں کے بیشتر حصے راکھ کی دیواروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ میز پر کہنیاں ٹیکے کچھ آگے کی طرف جھکے بیٹھے تھے۔

احمد کا سوال سن کر انھوں نے بیک وقت نگاہیں اٹھائیں اور کہا "کیا اثر ہوا؟؟"

احمد نے اپنے اسی مخصوص انداز اور پُرسکون لہجہ میں پھر کہنا شروع کیا۔

"عورت کے اس سوال کو سنکر ان کی سیاہ سرمگیں آنکھوں میں ستارے لرزنے لگے انھوں نے اپنا سر جھکا لیا۔ تھکا کھڑے ہوئے رفقاء کے جسم فرط اضطراب سے لرزنے لگے۔ اس وقت ایک عجیب سماں تھا۔

"تھوڑی دیر بعد آپ نے سر اٹھایا، چہرہ پر اطمینان وسکون کی جھلک تھی۔ نگاہوں سے شعاعیں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے بدلی کا چاند ہٹ جانے کے بعد اور زیادہ رعنائیوں کے ساتھ جلوہ آرا ہو۔ اور پھر آپ نے نہایت شیریں و دل نشیں انداز میں فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ صرف سرکش اور نافرمان بندے کو سزا دے گا"

یہ سن کر وہ عورت فرط مسرت سے مسکرا پڑی، اس کی گود میں چمٹا ہوا بچہ بھی ہنس پڑا۔ پاس کھڑے ہوئے انسانوں کے دل.... بھی خوشیوں سے معمور ہو گئے۔ ان کو ایسا لگا جیسے ان کے ساتھ ساری کائنات مسکرا پڑی ہو۔ اس عورت کو، ان سب کو، اور ساری انسانیت کو ابد تک کے لئے مژدۂ جانفزا مل گیا تھا، نہ ــــ"

اتنا کہہ کر احمد نے اپنے دوستوں کی طرف غور سے دیکھا۔ ان کے چہروں پر اطمینان و مسرت کی ایک جھلک سمائی ہوئی تھی۔

کچھ سمجھ میں آیا کہ یہ ہستی کون تھی جس نے ایک ادنیٰ عورت کو اور اس طرح سارے انسانوں کو یہ مژدہ جانفزا سنایا؟"
احمد نے کچھ دیر رک کر کہا۔ اور پھر خود ہی بول اٹھا:
"خود رسول مقبول محمد مصطفیٰ ــــ صلی اللہ علیہ وسلم" سب کے سب ہم آہنگ ہو کر بول پڑے اور سارا ماحول جیسے وجد میں آگیا۔

(ادارہ ادب اسلامی اعظم گڑھ کی ماہانہ نشست میں پیش کیا گیا)

بقیہ مضمون صفحہ ۱۸ سے آگے :-

کرنے سے عاجز ہے! اس توکل کی سب سے نمایاں خصوصیت "عزیمت" ہے
زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کی اکثر راتیں شب بیداری اور عبادت گزاری میں بیت جاتی تھیں، نماز پنجگانہ بجائے اور دیگر نوافل کے علاوہ ہر وقت ذکرِ الٰہی اور درسِ اخلاق کا مشغلہ رہتا تھا، لحظہ بھر بھی یادِ خدا سے غفلت نہ ہوتی تھی۔ معرفتِ الٰہی کا جتنا علم فخرِ موجوداتؐ کو تھا، کسی بشر کو نہیں ہو سکتا۔ فقرا کی ہم نشینی پسند اور مساکین کا قرب عزیز تھا۔ ارشاد ہوتا تھا "الفقر فخری" سرفرازیٔ نبوت سے قبل برسوں تک غارِ حرا میں مصروفِ عبادت رہتے تھے۔ آنحضورؐ کے فرمودات میں سے حسبِ موقع چند کلمات زیبِ قرطاس ہیں والزھد حرفتی والطاعۃ حسنی وقرۃ عینی فی الصلوٰۃ وثمرۃ فوادی فی الذکر[1]
الغرض حضور سرورِ عالمؐ مظہرِ اوصافِ حمیدہ اور مصدرِ اخلاقِ حسنہ تھے آپؐ کی شان میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے کہ "انک لعلیٰ خُلُقٍ عظیم"[2]
دُنیا میں جتنے نبی، پیغمبر اور مصلحین آئے، ہم اُن سب کا احترام کرتے ہیں، مگر یہ نفوسِ قدسیہ خاص قوموں اور خطوں میں مبعوث ہوتے تھے، ایک نبی کے بعد دوسرا نبی آتا گیا، یہاں تک کہ:

جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا
جہاں کیواسطے اک آخری نظام آیا

حضرت سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام امّی "آخری نظام" کو لے کر مبعوث ہوئے تھے، اب قیامت تک نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی دوسرا نظامِ شریعت نافذ ہوگا! نبوت و رسالت کے منشور پر آخری مہر لگا دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی آخر کی ذاتِ گرامی پر اپنی نعمتوں کا اتمام کردیا! اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور لائی ہوئی شریعت، جامعیت میں اپنی آپ نظیر ہیں، حضورؐ اُس جامعیتِ کبریٰ کے حامل ہیں، جس سے کسی دوسرے انسان کو نہیں نوازا گیا۔ "انسانِ کامل" صرف محمدِ عربی کی ذات ہے، اس شرف میں حضورؐ کا کوئی مقابل نہیں! اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کو انسانیت کے لئے "آخری معیار" ٹھہرادیا، دین و دنیا کی ساری سعادتیں اور خوش بختیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی اور اتباع سے وابستہ ہیں جس نے نبی آخرؐ کے نقشِ قدم کو دلیلِ راہ سمجھا اُسے صراطِ مستقیم مل گئی!

---

[1] (ترجمہ) اور زہد میرا پیشہ ہے اور خدا کی تابعداری میرا حسن ہے اور نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے اور خدا کی یاد میرے دل کا پھل ہے۔
[2] آپ نہایت ہی اعلیٰ ترین اخلاق کے حامل ہیں۔

درد سر دو سرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
صحت اور
توانائی
کیلئے
کوفسول شربت
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیبارٹریز لمیٹڈ ۔ کراچی
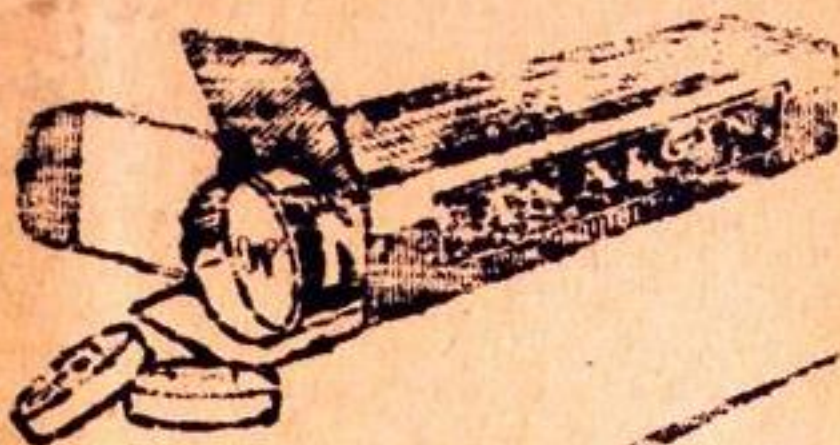
ہماری نظر میں

تبع تابعینؒ حصہ اول

مرتبہ :- مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی، ضخامت ۵۰۸ صفحات (غیر مجلد، قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ : دار المصنفین اعظم گڑھ (یو۔ پی۔ انڈیا)

دار المصنفین (اعظم گڑھ) نے دین و اخلاق اور علم و ادب کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی تعارف و تحسین کی محتاج نہیں ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی سنہری کڑی ہے! فاضل مرتب نے بڑی محنت اور تحقیق و تفحص کے ساتھ اُنیس (۱۹) تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے سوانح زندگی، اور اُن کے مذہبی، اخلاقی، علمی اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل دل نشین انداز میں پیش کی ہے! کتاب کے شروع میں فاضلانہ مقدمہ ہے (جس میں اُس دور کی خوبیوں اور خرابیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور رفض، خارجیت، جبر و قدر، اعتزال، وضع حدیث اور شعوبیت کے فتنوں کی نشاندہی کی گئی ہے!

یہ کتاب :-

امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی، امام زفر، امام اوزاعی، ابن جریج، امام اسحٰق، ابن راہویہ، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک، امام شعبہ، مسعر بن کدام، یحییٰ بن معین، عبداللہ بن وہب، یحییٰ بن سعید القطان، عبدالرحمٰن ابن مہدی، امام لیث بن سعد، علی بن مدینی، فضیل بن عیاض، امام سفیان ثوری، اور یحییٰ بن آدم رحمہم اللہ تعالیٰ کے سوانح زندگی سے مزین ہے جن کے پڑھنے سے نہ صرف یہ کہ تاریخی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ دل و نگاہ کو روشنی ملتی ہے اور کتاب کے مطالعہ کے دوران میں آئینہ دل کی صیقل ہوتی چلی جاتی ہے کہ نیک لوگوں کے ذکر سے تعلق باللہ مضبوط ہوتا ہے۔

اس کتاب میں بعض تاریخی غلط بیانیوں کو بے نقاب بھی کیا گیا ہے اور علمی و تاریخی انداز میں ان کی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ ہارون رشید کے دربار میں امام ابو یوسف اور امام شافعی کے درمیان فقہی مناظرہ ہوا تھا۔ اس مناظرے میں امام ابو یوسف کا موقف کمزور رہا، اور انھوں نے ہارون الرشید کو امام شافعی کے قتل پر آمادہ کیا! حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کی رکیک اور بے سر و پا روایتیں امام الحرمین امام رازی، اور امام نووی جیسے بزرگوں نے اپنی کتابوں میں نقل کر دیں! فاضل مرتب نے اس قسم کی روایتوں کی عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ تردید کی ہے اور اس روایت کے بارے میں یہ ثابت کیا ہے کہ امام ابو یوسف اور امام شافعی کی سرے سے کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔

جناب مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی، اس کتاب کی تالیف و ترتیب پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو دارین میں اجر جزیل عطا فرمائے گا کہ اُن کا قلم خالص دین کی خدمت کے لئے وقف ہے!

THE IDEOLOGY OF PAKISTAN AND ITS IMPLEMENTATION

از :- ڈاکٹر جاوید اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (کنٹب) پیش لفظ: از فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان

ضخامت ۱۸۸ صفحات، مجلّد، رنگین گرد پوش کے ساتھ، قیمت، سات روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ، غلام علی اینڈ سنز لاہور

ایک مدت ہوئی کہ علامہ اقبال مرحوم نے رسالت مآب ؐ کے حضور بڑی دل سوزی سے اپنے فرزند ارجمند کے بارے میں یہ آرزو کی تھی کہ "ز عشق تو بگیرد رنگ و بوئے" اور اپنے "جوان سادہ" کو جو اُن کے نزدیک "گرم خون" تھا، مغرب کی کافرنگاہوں سے محفوظ رکھنے کی تمنا کا اظہار کیا تھا۔ اب سے سوا برس پہلے جب ڈاکٹر جاوید اقبال نے رائٹرز گلڈ کراچی کے اجلاس میں "ادیب قومیت، اور لادینیت" کے موضوع پر ایک پر زور مقالہ پڑھا تھا۔ تو اس سے اندازہ ہوا تھا کہ اقبال کی دعائیں رائیگاں نہیں گئیں۔ اب ان کی تازہ کتاب پڑھ کر اور بھی یقین ہو گیا ہے کہ اقبال کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ اور جاوید کو اپنے درد دلش دل باپ کے نالۂ نیم شبی کے نیاز، اور ان کی خلوت وانجمن کے گداز کے علاوہ ان کی مومنانہ فراست اور ان کی بصیرت سے بھی وافر حصہ ملا ہے جناب جاوید صاحب قانون میں ڈاکٹریٹ کی غرض سے مغرب میں کئی سال تک رہے ہیں اور مغرب میں قیام کے دوران میں ان پر جو کچھ گزری ہے، وہ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے جو ان کے والد محترم پر گزری تھی۔ مغرب میں قیام کے دوران ان کی فکری صلاحیتیں خوب ابھریں، انھوں نے مغرب کے سرمایہ علم ودانش سے استفادہ بھی خوب کیا لیکن کوئی چیز بھی ان کے جوہر ایمانی کو زنگ آلود نہ کر سکی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں ایمان واسلام کی آب وتاب کچھ بڑھ ہی گئی۔ وہ پاکستان واپس آئے تو اُن کی نگاہیں مغربی تہذیب کی مصنوعی چمک دمک سے خیرہ نہ تھیں بلکہ وہ ایک نئے ایمان ویقین کی روشنی سے چمک رہی تھیں

ڈاکٹر جاوید اقبال کی زیر تنقید تصنیف کا پس منظر یہ ہے کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب صدر پاکستان نے زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد سے ہی ملک کے مسائل پر کھلے دل ودماغ کے ساتھ غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے اس سوچ بچار میں انھوں نے پاکستان کی اس امتیازی حیثیت کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ وہ دنیا کی دوسری ریاستوں کی طرح ایک قومی ریاست نہیں ہے، بلکہ اس کا وجود، اس کی بقا، اس کا استحکام اور اس کی سلامت روی، ان سب کا انحصار ایک آئیڈیالوجی پر ہے۔ صدر موصوف نے یہ بھی محسوس کیا کہ پاکستان کے مادی وانتظامی مسائل کے مقابل میں اس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیوں کہ یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جس کی طاقت نے اس مملکت کو وجود بخشا ہے اور اسی کو پروان چڑھانے کے لئے یہ مملکت قائم ہوئی اس لئے اس ملک کے باشندوں میں اس شعور کا باقی رکھنا ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے مقصد وجود سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل اور بے پروا نہ رہیں اور انہیں اپنی منزل اور سمت سفر کا صحیح صحیح علم ہو! ان مسائل پر خود غور کرنے کے علاوہ، صدر پاکستان نے قوم کے مفکرین کو بھی آئیڈیالوجی سے متعلق بنیادی مسائل پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی! کتاب کے پیش لفظ میں وہ بنیادی سوالات موجود ہیں، اور یہ کتاب انہی سوالات کا جواب دینے کی ایک اچھی کوشش ہے!

کتاب کا خلاصہ اور ماحصل یہ ہے کہ اسلام کو پاکستان میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور قومی تعمیر نو کے ہر شعبہ میں ہمیں اس سے رہنمائی اور روشنی حاصل کرنی ہے، پاکستان کا آئندہ نظام سیاست ومعاشرت، اس کی تعلیم وثقافت اس کی سیاست خارجہ اور سیاست داخلہ ان سب معاملات میں ہماری رہنمائی کا بنیادی سرچشمہ اسلام ہی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا ہے کہ اسلام میں ریاست و مذہب کی اُس دوئی کی گنجائش نہیں، جو عیسائی ریاستوں میں روح اور مادہ کی دوئی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، اسلئے پاکستانی ریاست کو اس بات سے شرمانا نہیں چاہئیے کہ اسلام، ریاست کا سب سے اہم اور سازگار عنصر ہے! لیکن اسلام کی روشنی میں ہمیں کس طرز کی ریاست تعمیر کرنی چاہئیے؟ اس کے بنیادی خدوخال کیا ہوں؟ اس میں ریاست (STATE) کا فریضہ کیا ہو؟ اور اس کے باشندوں کے فرائض وحقوق

کیا ہونے چاہئیں؟ اس مسئلہ پر جواں سال، جواں فکر مصنف نے نظریاتی سے زیادہ عملی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ ملکی مسائل میں نظریہ و عمل کا جو توازن پایا جاتا ہے، اور اسلامی نظریات کی روشنی میں پاکستان کی حکومت کو چلانے کے عملی تقاضے اور مختلف مسائل حل کرنے کی عملی شکلیں واضح کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ قابلِ ستائش ہے!

فاضل مصنف کے نزدیک اسلامی ریاست کا نقشہ یہ ہے کہ وہ امامت، افتاء اور قضاء کے فرائض انجام دے گی۔ امامت کا منصب پہلے خلیفہ کو سونپا جاتا تھا لیکن آج کل کی مسلم ریاست کے منتخب صدر کو اس کا بدل قرار دیا جا سکتا ہے۔ افتاء اور قضاء کے شعبوں ماضی میں اسلامی زندگی میں ستون کی حیثیت رہی ہے۔ ان شعبوں کے ذریعہ وہ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ اسلامی احکام کے خلاف قانون سازی نہ ہونے پائے اور مسلمانوں کی دینی زندگی استوار و پائندہ رہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک موجودہ دور میں قانون سازی کا اختیار مجلس قانون ساز کو ہونا چاہئے۔ لیکن وہ اس بات سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ اس صورت میں اسلامی احکام کے خلاف قانون سازی کا امکان باقی رہتا ہے۔ اس کے انسداد کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک تو "تعلیم قانون" کی تعلیم میں اہم اصلاحات کی جائیں تاکہ ایسے ماہرین قانون پیدا ہو سکیں جو اسلامی شریعت سے بھی واقف ہوں اور عصر حاضر کی زندگی اور اس کے تقاضوں سے بھی۔ دوسرے یہ کہ عدالت عالیہ کو افتاء یعنی مجلس قانون ساز کے منظور کردہ قوانین کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا اختیار دیا جائے۔ اس کے علاوہ چونکہ اسلام مذہب و ریاست کی دوئی کو تسلیم نہیں کرتا لہٰذا ریاست کا فرض ہے کہ وہ دینی زندگی کے فروغ کا اہتمام کرے۔ اس کام کے لئے فاضل مصنف ایک وزارت امور مذہبی کے قیام کے حامی ہیں۔ لیکن وزارت امور مذہبی کے قیام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بقیہ وزارتیں مذہب کی رہنمائی سے آزاد ہو گی اس علیحدہ وزارت کا قیام محض انتظامی سہولت کے پیش نظر اور تقسیم کار کے اصول پر ہوگا نہ کہ اس بناء پر کہ مذہبی اور دنیوی معاملات، ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ یہ وزارت مساجد کی تعمیر، مرمت اور ان کے انتظام و انصرام، سب کی ذمہ دار ہوگی، وہ مساجد کے ائمہ کا تقرر کرے گی اور ان ائمہ کی حیثیت حکومت کے سول ملازمین کی ہوگی ان کے مشاہرے مقرر ہونگے اور حکومت کی طرف سے ان کو امامت خطابت اور وعظ و تبلیغ کا اجازت نامہ ملا کرے گا کسی شخص کو ان اجازت ناموں کے بغیر مساجد میں وعظ اور خطبہ وغیرہ کی اجازت نہ ہوگی!

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسلامی قانون سازی کے سلسلہ میں جو تجاویز پیش فرمائی ہیں وہ خاصی سلجھی ہوئی ہیں، وزارتِ امور مذہبی کے نفس قیام کی تجویز بھی مصنف کے خلوص پر اعتماد کرتے ہوئے ایک اچھی تجویز ہے مگر اس کی جو تفصیلی شکل جاوید صاحب تجویز کر رہے ہیں، اس میں بڑے خطرات پنہاں ہیں! دوسری قوموں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں زیادہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہئیے! وزارت امور مذہبی کا مطلب اگر یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے ریاست، اسلامی اقدار کو فروغ دینے کی ایجابی طور پر خدمات انجام دے گی، تو اس تجویز کے مستحسن ہونے میں کون شک کر سکتا ہے، لیکن تنظیم مساجد کا جو نقشہ ڈاکٹر جاوید پیش کر رہے ہیں، اس کے ذریعہ ریاست کو ایک شدید قسم کے ذہنی استبداد نافذ کرنے کا موقع مل سکتا ہے آج کے حالات میں جو ائمہ سرکاری ملازم ہوں گے اور جو سرکاری قوانین ملازمین کی جکڑ بندیوں میں گھرے ہونگے ان سے اندیشہ ہے کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام و تعلیمات کے مقابلہ میں سرکاری پالیسی کی زیادہ ترجمانی کریں گے؟ اور روزی کا سوال اعلان حق کی قوت کو پوری طرح نہ ابھرنے دے گا!

ہمارے نزدیک ان معاملات میں برطانیہ کے B. B. C. طرز کے نیم آزاد اداروں کے تجربے سے ہمیں فائدہ اٹھانا

چاہیئے تنظیم مساجد کے سلسلہ میں اگر حکومت اس بات کا لحاظ رکھے کہ مساجد حکومت کی مادی امداد اور سرپرستی سے بھی محروم رہیں
اور سرکاری کنٹرول سے بھی آزاد رہیں، تو دینی زندگی کے فروغ کے لئے بہت کچھ کام ہو سکتا ہے! علاوہ ازیں حکومت کے پورے
پورے کنٹرول کا یہ نتیجہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے گاؤں یا محلہ کی مساجد کی تنظیم وغیرہ سے متعلق مسائل کے سلسلہ میں لوگوں کا ______
بھی معطل ہو کر رہ جائے! بہرکیف جناب جاوید اقبال نے ایک اہم مسئلہ اٹھایا ہے جس کے INITIATIVE ______

حسن و قبح پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔
منیر کمیٹی رپورٹ پر جناب جاوید اقبال نے جس ایمانی جرأت کے ساتھ تنقید فرمائی ہے، اس پر وہ پوری ملت کی طرف
سے تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔ "صاحب ضرب کلیم" کے لائق فرزند سے اسی عزیمت کی توقع تھی۔
اس کتاب میں بہت سے قومی مسائل پر بحث کی گئی ہے مگر یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ فاضل مصنف کا بنیادی نقطہ نگاہ
ہر مسئلہ میں یہی رہا ہے کہ ہر شعبہ کی تشکیل اور تعمیر اسلامی اقدار اور دینی ضروریات کے مطابق کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اس کتاب میں
ریاست کی تعمیر کے بنیادی مسئلہ پر غور و فکر کے لئے سنجیدہ مواد فراہم کیا گیا ہے۔
کتاب کے بعض اجزاء سے اختلاف ممکن ہے "مگر کوئی قاری مصنف کے حسن نیت، اسلامی جذبہ اور سنجیدگی فکر سے متاثر
ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا!
فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان کا پیش لفظ مفکرانہ ہے اور اس بلند پایہ کتاب کے شایان شان ہے (ظ-ا)

مسئلہ تعدد ازدواج

مرتبہ: مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواری۔ ضخامت ۹۲ صفحات، مجلد گرد پوش کے ساتھ
قیمت: ایک روپیہ بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ، لاہور

وہ بڑے لوگ جو دینی مسائل کو "تجدد کی خراد" پر چڑھا کر "سبک و موزوں" اور زمانہ کے تقاضوں کے عین مطابق بنانا
چاہتے ہیں۔ انہی کے ایماء پر ادارہ ثقافت اسلامیہ وجود میں آیا تھا، اور اس وقت سے اب تک یہ ادارہ اُس ایماء کی تعمیل
کر رہا ہے! ضبط ولادت ہو، تعدد ازدواج ہو۔ کمرشیل انٹرسٹ ہو۔ موسیقی و غنا ہو۔ مسئلہ حجاب ہو۔ غرض ہر مسئلہ میں
اس ادارہ کی طرف سے متجددین اور متفرنجین ہی کے نقطہ نگاہ کی تائید کی گئی ہے! اور سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ اس
ادارے کو بعض ایسے علماء ہاتھ لگ گئے ہیں، جو ادارہ مذکور ...... کی وابستگی سے قبل دینی مسائل میں بالکل مختلف نقطہ نگاہ رکھتے تھے
پاکستان میں "تعدد ازدواج" کا مسئلہ اپنے وجود کی کمیت کے اعتبار سے نہ ہونے کے برابر ہے، ہزار مردوں میں مشکل سے
پانچ سات مردوں کے یہاں ایک سے زیادہ بیویاں ہوں گی اور ان کی بھی صورت یہ ہے کہ کسی کے یہاں سرے سے اولاد ہی پیدا
نہیں ہوئی، اولاد کی خاطر اُس نے دوسری شادی کی، کسی کے یہاں لڑکیوں کا تانتا بندھ گیا، اس لئے اولاد نرینہ کی تمنا میں
تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھایا، پہلی بیوی سے لڑکے اور لڑکیاں ہوتے ہوئے، دوسری شادی جنھوں نے رچائی ہو
ان کی تعداد ہزار میں ایک نکلے گی، اور ایک مرد کے تین اور چار بیویاں بیک وقت واحد ہوں، ایسے شوہروں کی تعداد تو قریب
قریب صفر کے برابر ہوگی! جب پاکستان کا معاشرہ اس مسئلہ (تعدد ازدواج) سے دوچار ہی نہیں ہے، تو اس مسئلہ کو چھیڑنا
کوئی حکمت و دانشوری کی بات نہیں ہے۔

"قرآن میں بہت جگہ لونڈی، غلام کے متعلق احکام دیئے گئے ہیں، لیکن اُن کا مقصد
غلامی کی تصدیق یعنی اسے CONFIRM کرنا نہیں، بلکہ ایسا نظام زندگی تعمیر

کرنا ہے، جس میں غلامی کا وجود ختم ہو جائے۔" (ص ۱۱)

جنگ کی جن حالتوں میں لونڈیوں اور غلاموں کے بنانے کی اللہ اور رسولؐ نے اجازت دی ہے، وہ احکام آج بھی باقی ہیں اور باقی رہیں گے اور غلاموں کی تدبیر و مکاتبت کی جو فقہی شرائط پائی جاتی ہیں، وہ بھی اپنی جگہ درست ہیں! جہاد، لونڈیوں اور غلاموں اور تعددِ ازدواج کے مسائل میں جو مسلمان زمانہ کی ہوا کو دیکھ کر معذرت آمیز میں گفتگو کرتا ہے، وہ اسلام کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔

"قرآن نے امیر و مامور کے متعلق بھی احکام دیئے ہیں، لیکن اس کا منتہائے مقصود کسی نظامِ حکومت کا قیام نہیں بلکہ وہ ایسا "لا ریاست" صالح معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم ہو بلکہ ہر شخص کسی سیاسی اور روحانی واسطے کے بغیر براہِ راست اطاعتِ الٰہی کرتا ہے (ص ۱۲)

جس طرح افلاطون ایک "خیالی ریاست" کا خواب دیکھتا تھا، اسی طرح فاضل مصنف نے بھی ایسے خیالی معاشرے UTOPIAN SOCIETY) کا خواب دیکھا ہے، جس کی مشاعروں کے انداز پر واہ واہ تو کی جا سکتی ہے، مگر واقعات و عمل کی دنیا میں اسے ایک مضحکہ سمجھا جائے گا! صحابۂ کرامؓ کے مبارک عہد سے بڑھ کر اور کون سا صالح معاشرہ ہو سکتا ہے مگر وہ صالح معاشرہ ایک باضابطہ ریاست کے ماتحت تھا جس میں امیر بھی تھے اور مامور بھی تھے!

تعددِ ازدواج کی جس آیت میں اجازت اللہ کی طرف سے وارد ہوئی ہے، اس کو نقل فرمانے کے بعد مولانا جعفر شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"سارے قرآن میں تعددِ ازدواج کے متعلق صرف یہی ایک آیت ہے، اور ہمارے معاشرے کو صدیوں سے یہی آیت سب سے زیادہ یاد رہی ہے۔" (ص ۵)

قرآن پاک میں بہت سی بڑی باتوں پر صرف ایک یا دو بار تکبیر آئی ہے، تو کیا ان بڑی باتوں کو اس لئے کرٹا لا جائے کہ ان کا ذکر قرآن کریم میں بار بار کیوں نہیں آیا! کسی جائز اور مباح کام کی اجازت تو ایک بار ہی آنی چاہیئے! "ہمارے معاشرے" سے پاک و ہند ہی کا معاشرہ کا مراد ہے اور ہونا چاہیئے۔ تو اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ ہندو سماج کے اثر کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک تو۔۔۔ بیوہ عورتوں کی شادی کو ہمارے معاشرے میں ناپسندیدہ سمجھا گیا، دوسرے تعددِ ازدواج کی اجازت سے بہت ہی کم فائدہ اٹھایا گیا! اور ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کو یہی آیت سب سے کم یاد رہی۔

"تعددِ ازدواج" اپنی ذات سے کوئی "برائی" نہیں ہے، جو کوئی اسے "برائی" سمجھ کر اس مسئلہ پر گفتگو کرتا ہے، اس کے دلائل کی پوری عمارت:۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کے مصداق جتنی اونچی ہوتی ہے، اتنی ہی اور ٹیڑھی ہوتی جاتی ہے! "تعددِ ازدواج" کو مبغوض ثابت کرنے کی کوشش قرنِ اولیٰ کے صالح ترین معاشرے پر طنز ہے۔

جس آیت میں تعددِ ازدواج کی اجازت ثبت آئی ہے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے قابلِ فخر شاگرد حضرت عکرمہ کی تفسیر کے

مطابق اس سے نکاح کے لئے چار کی حد مقرر کردی گئی ہے، کیوں کہ ایام جاہلیت میں ایک ایک شخص کے ایک ایک درجن کے قریب بیویاں ہوتی تھیں! احادیث میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض لوگ جب ایمان لائے ہیں اور اُن کی متعدد بیویاں تھیں تو حضورؐ نے ان کو حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ کر باقی بیویوں کو چھوڑ دیا جائے ۔ اور یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ اس آیت کے مفہوم اور اس اجازت کے نتائج د حضرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جعفر شاہ پھلواری سے بہتر سمجھتے تھے کہ حضورؐ پر قرآن نازل ہوا تھا۔

اب رہا عدل کا مسئلہ تو ایک بیوی کے ساتھ ناانصافی کی کب اجازت دی گئی ہے، ایک مرد جب نکاح کرتا ہے تو اس کی یہی نیت ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے کہ میں بیوی کے ساتھ عدل کروں گا، پس نکاح منعقد ہوجاتا ہے، اسی طرح ایک بیوی کی موجودگی میں وہ دوسری شادی کرتا ہے، اور اس کی نیت عدل کرنے کی ہوتی ہے، تو یہ نکاح ثانی ہر لحاظ سے جائز ہوتا ہے! جس طرح کوئی شوہر ایک بیوی کی حالت میں اس بیوی کے .. حقوق پوری طرح ادا نہیں کرتا، اور ایسا کرنے سے وہ گنہگار تو ضرور ہوتا ہے مگر اس کا نکاح باطل نہیں ہوجاتا، اسی طرح دو تین یا چار بیویوں کی موجودگی میں اگر وہ عدل کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، تو وہ گنہگار ہوگا ۔ یہ چاروں نکاح اپنی جگہ برقرار رہیں گے ۔ اِلّا یہ کہ شوہر کی زیادتیوں کی وجہ سے کوئی بیوی خلع طلب کرے اور قاضی شرعی ثبوت و شہادت کے بعد علیحدگی کا حکم دیدے!

مسٹر پرویز نے "مرکزِ ملت" کا منصب وضع کیا ہے، جو منصب نبوت کے قریب قریب مماثل ہے! مولانا جعفر شاہ ندوی شریعت کے احکام میں تنسیخ و ترمیم کا حق "مرکزِ ملت" کے بجائے "معاشرے" کو دینا چاہتے ہیں! یہ فکر چاہے کتنی ہی نادر اور فلسفیانہ کیوں نہ ہو مگر اسلام کی روح کو اس سے نقصان ہی پہنچے گا، اور اس طرح اللہ کا دین ایک کھیل بن کر رہ جائے گا۔!

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعض اجتہادات کا جو اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ فاروق اعظم رضؓ کے تمام شرعی فیصلے کتاب و سنّت کی کوئی نہ کوئی سند یا ایما اپنی تائید میں رکھتے ہیں. بعض مسائل ۔ مثلاً زن کتابیہ کے نکاح وغیرہ میں حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اقوال کی حیثیت فیصلہ اور حکم کی نہیں، رائے اور مشورت کی ہے! اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ خلافتِ راشدہ کا مقدس دور، عہدِ نبوت کا ہی ضمیمہ ہے!

"تعددِ ازدواج" کو "برائی" سمجھ کر، جو کوئی اس مسئلہ پر گفتگو کرے گا، وہ فکر و نظر اور تاویل و تعبیر کے ایسے ہی عجیب نمونے پیش کرے گا، جیسے اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں، ہم اس تصور سے پناہ مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی اجازت کو "برائی" سمجھیں اور اس کے لئے دلیلیں تراشیں اور کتابیں تصنیف کریں ۔

ثقافت کی تلاش

از: نسیم حجازی، ضخامت ۱۵۲ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت: دو روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ: ملک دین محمد اینڈ سنز، اشاعت منزل، بل روڈ لاہور ۔

جناب نسیم حجازی ہماری زبان کے مشہور و مقبول ناول نویس ہیں، اُن کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کتاب چھپتی ہے اور ہاتھوں ہاتھ نکل جاتی ہے، نسیم حجازی کے ایک ایک ناول کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، اس پر بھی مانگ کم نہیں ہوتی! سب سے زیادہ خوبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ناولوں کے ذریعہ اسلام اور ادب و اخلاق کی خدمت انجام دی ہے اور سستی شہرت اور جلبِ منفعت کے لئے "رومانس" کو اپنے ناولوں کا موضوع نہیں بنایا اور یہ بھی نہیں کیا کہ بعض بسیار نویس ناول نگاروں کی طرح محض جلبِ منفعت کی خاطر، ہر وادی میں بھٹکتے پھریں! وہ ایک بامقصد ادیب ہیں!

اس ناول میں جناب نسیم حجازی نے کمیونسٹوں کے ہتھکنڈوں کو بے نقاب کیا ہے کہ وہ پاکستان کے دیہات میں جاکر

ثقافت کے نام پر ناچ گانے کو فروغ دینے کی کیسی کیسی چالیں اور ہتھکنڈے اور تدبیریں اختیار کرتے ہیں، اُن کا لیڈر اپنے ساتھیوں کامریڈوں سے کہتا ہے :-

"اٹھو اور اس ملک کے چپے چپے میں پھیل جاؤ اور ثقافت کے نام پر ایک ایسا طوفان کھڑا کر دو جس کی تند و تیز لہریں اس ملک کی تمام روحانی اور اخلاقی قدریں بہا لے جائیں۔ اس عظیم مہم کے لئے تمہیں ضروری ساز و سامان یعنی ڈھول[1] مجیرے، بانسریاں اور گھنگھرو وغیرہ پارٹی کے دفتر سے مہیا کئے جائیں گے۔"

کامریڈوں کو فحاشی کی اس مہم میں کامیابی نہیں ہوتی اور اسلامی غیرت اور مشرقی تہذیب کے مقابلہ میں ان "شہر خوں" کی چالوں کو بالآخر مات ہو جاتی ہے مگر یہ لوگ جس نفسیاتی انداز میں دیہاتی لوگوں کو ناچ گانے کی ترغیب دیتے ہیں، اس کا تجزیہ ناول نگار نے جس خوبی کے ساتھ کیا ہے، وہ بس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے! کتنی شستہ زبان ہے، کس قدر دل کش اندازِ بیان ہے، کتنے دلچسپ مکالمے ہیں!

یہ کتاب[2] بروقت منظرِ عام پر آئی ہے کہ آج کل ایک منظم پروگرام کے تحت "ناچ گانے" کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی جا رہی ہے کیا عجب ہے کہ مغرب زدہ جذبات کے ساتھ اشتراکی دماغ بھی اپنا کام کر رہے ہوں! یہ ناول اس قابل ہے کہ سرکاری حلقوں میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے!

سیاستِ شرعیہ

از :- رئیس احمد جعفری، ضخامت ۵۶۸ صفحات، قیمت پانچ روپے۔
(مجلد، گرد پوش کے ساتھ) ملنے کا پتہ :- ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ۲ کلب روڈ، لاہور۔

جناب رئیس احمد جعفری (ندوی) مشہور و مقبول انشاپرداز ہیں، اُن کی تصنیفات (جن میں تالیف و تراجم بھی شامل ہیں) کی تعداد کیا عجب ہے ایک سو تک پہنچ گئی ہو، اور اُن کے لکھے ہوئے ایک لاکھ سے بھی زائد صفحات اب تک چھپ چکے ہوں! موصوف سچ مچ لکھنے کی مشین ہیں، زود نویسی اور بسیار نویسی میں آپ ہی اپنا جواب! رئیس احمد جعفری بڑی منجھی ہوئی زبان لکھتے ہیں، اُن کے اشہبِ خامہ نے ہر وادی میں جولانیاں کی ہیں، اور خاصے جاذبِ نظر نقش چھوڑے ہیں۔

یہ کتاب ——— "علامہ خلاف کی کتاب السیاسۃ الشرعیۃ کا خاکہ ہے، مترجم کی تلخیص اور ضروری حذف و اضافہ اور ترمیم و تغیر کے ساتھ" ——— کتاب کے ابواب :-

اجتہاد ——— تدریجی ارتقاء ——— اسلام کی سیاست ——— اسلامی حکومت، کا آئین و دستور ——— اسلامی مملکت میں اقتدار و اختیار کا سرچشمہ کون ہے؟ ——— مسئلہ خلافت حکومتِ اسلامیہ کی خارجی پالیسی اور اس کی تشکیل ——— اسلام اور جنگ ——— غزواتِ نبوی ——— صلح و امن سے متعلق اسلام کے احکام و ہدایات ——— مملکتِ اسلامی کا مالی نظام ——— دولتِ اسلامیہ اور مالی وسائل و ذرائع ——— دولتِ اسلامیہ اور اس کے مصارف ——— حکومتِ اسلامیہ کا مالیہ ——— بیت المال (موارد اسلامیہ کی تاریخ کا مختصر جائزہ)

ان ابواب کی متعدد ذیلی فصول ہیں، جو اسلامی قانون و دستور کا ایک خاکہ، پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے متشکل

---

[1] "ڈھول" کو جگہ جگہ مونث لکھا گیا ہے۔ ڈھول بالاتفاق مذکر ہے، ہاں! ڈھولک مونث ہے!

[2] اس شمارے کے "روحِ انتخاب" میں اس کتاب کا ایک مختصر باب نقل کیا گیا ہے۔

گردیتی ہیں! اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے فقہاء قانون و دستور اور اُن کے لوازم و متعلقات میں کتنی باریک بیں نگاہ رکھتے تھے اور کتاب و سنّت اور آثارِ صحابہ کے مطالعہ نے اُن کے دل و دماغ اور فکر و نظر کو کس قدر متنوع بنا دیا تھا

"دولِ اسلامیہ کا محقق تاریخ کے آئینہ میں دیکھ لے سکتا ہے کہ جب کسی اسلامی حکومت نے اسلام کے نظامِ مالی پر سچائی کے ساتھ عمل کیا، اور نہج دین پر صحیح طرح سے گام فرسا ہوئی۔ تو اس کا نظامِ مالی بہت کامیاب رہا، اور اس کے باشندوں کو کبھی بھی مجبور اور مقہور زندگی بسر نہیں کرنی پڑی، اور جب کبھی دین کے راستہ اور اسلام کے نظامِ مالی کو نظرانداز کر دیا گیا، توازنِ مالی میں اختلال پیدا ہوگیا، افراد میں بے چینی پھیل گئی۔ مصالح عامہ ضائع ہو گئے۔ (صـ۳۱)

کاش! یہ حقیقت مسلم حکومتوں کے اربابِ حل و عقد کے دلوں میں اُتر سکتی! اور ان کی نگاہیں روس، امریکہ اور انگلستان کے طرزِ حکومت سے ہٹ کر، اسلامی حکومت کے روشن خطوط پر جم سکتیں کہ دوسروں کے یہاں تو خالی سیپیاں ہیں، اصل موتی تو اُن کے اپنے خزانوں میں بند ہیں۔

خلیفہ ہارون رشید کے دورِ حکومت میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الخراج" کی صورت میں نظامِ شرعی مدون فرمایا تھا۔ اس کے بارے میں فاضل مترجم لکھتے ہیں:۔

"قاضی صاحب کا یہ نظامِ اسلامی اتنا مکمل اور جامع تھا کہ اس پر عمل پیرا ہونے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس عہد میں ثروت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ حکومت کے مالیات میں بھی جائز حدود کے اندر بہت زیادہ اضافہ ہوگیا اور عوام کی حالت بھی بہت زیادہ سُدھر گئی (صـ۳۱)

نمازِ جمعہ کے بارے میں "مصر و قریہ" کے اختلافات احناف و شوافع میں ملتے ہیں:۔

"امامتِ نمازِ جمعہ کے واجب التقرر ہونے میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ اور علمائے عراق اس طرف گئے ہیں کہ یہ ولایتِ واجبہ میں سے ہے، اس لئے سلطان یا اس کے نائب کے بدون نمازِ جمعہ صحیح نہیں ہوتی، امام شافعی اور علمائے حجاز کہتے ہیں کہ اس کا تقرر مندوبات میں سے ہے، سلطان کا ہونا شرط نہیں، نمازی شرائط کے مطابق ادا کریں گے تو ادا ہو جائے گی۔" (صـ۷۵)

اس مسئلہ میں امام شافعی اور علمائے حجاز کا مسلک اقرب الی الصواب ہے، اور خود احناف اس مسئلہ میں حنفی مسلک کی عملاً تائید نہیں کرتے۔

اس کتاب میں کتابت کی ایسی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً:۔

صفحہ ۶۴ پر "قلقشندی" کو "خلقشندی" ——— "انصار نے سعد بن عبادہ کی بیعت پر لوگوں کو دعوت دی" کی جگہ "سعد نے انصار بن عبادت کی بیعت پر لوگوں کو دعوت دی" (صـ۶۰) "شریح" کی جگہ "شریع" (صـ۱۲۸) "تدفین رسول" کے بجائے "تدوینِ رسول" (صـ۱۳۸) "قفیز" کو "فقیر" (صـ۱۴۹) کتابت کیا گیا ہے ——— "کسی انسان کو بغیر بدلہ انسان کے قتل کردے" (صـ۲۱۲) "بدلہ انسان" اردو روزمرہ نہیں ہے۔

اس کتاب میں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اصل مصنف (علامہ خلاف) کی کون سی عبارت ہے، اور مترجم نے کیا اضافے کئے ہیں، تلخیص و ترجمہ اور اضافہ مخلوط ہو گئے ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ علامہ ماوردی کی مشہور کتاب "الاحکام السلطانیہ" کا ترجمہ ہے یہ کتاب بروقت شائع ہوئی ہے، پاکستان کا دستور بن رہا ہے، کاش! دستور ساز کمیشن کے ارکان کو اس قسم کی کتابوں سے استفادہ کی توفیق نصیب ہو!

ماہنامہ دعوت "امیر معاویہ رضؓ نمبر"

ادارہ مولانا سید نور الحسن بخاری، مولانا دوست محمد قریشی، ضخامت ۱۹۲ صفحات۔
قیمت: ایک روپیہ
ملنے کا پتہ: ماہنامہ "دعوت" ۱۴/ بی شاہ عالم، لاہور۔

مجلہ "دعوت" صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے محامد و مناقب اور ان نفوس قدسیہ کی دینی خدمات کے تعارف اور نشر و اشاعت کی گرانقدر خدمت انجام دے رہا ہے، یہی اس کا آغاز اشاعت سے اب تک موضوع رہا ہے کہ اہلِ ایمان کے قلوب میں صحابۂ کرام رضؓ کی طرف سے تکدر نہ ہونے پائے، مسلمان اُن کے دینی شرف کو پہچانیں اور ان کے احسان کو مانیں! اسی جذبہ کے تحت "دعوت" نے "امیر معاویہ رضؓ نمبر" شائع کیا ہے جو اپنے موضوع پر یہ ایک مستحسن اقدام ہے!

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں، اس شمارے میں اُن کی پر زور تردید کی گئی ہے یہ کہ حضرت معاویہ رضؓ، حضرت علی رضؓ پر سبّ و شتم روا رکھتے تھے ——— اس الزام کے ثبوت میں صحیح مسلم کی جو روایت پیش کی جاتی ہے، اس شمارے میں اس روایت کی تضعیف کی گئی ہے کہ اس میں درایت و روایت کے لحاظ سے بہت سے اسقام پائے جاتے ہیں ——— حضرت امیر معاویہ کو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوانے کی تہمت سے جو متہم کیا جاتا ہے اس کو بڑی تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ باطل قرار دیا گیا ہے۔

معاویہ کو ہم "حضرت" اور "رضی اللہ عنہ" کے خطابات سے یاد کرتے ہیں، اُن کا شرفِ صحابیت اپنی جگہ مُسلّم ہے، خاص طور سے "کتابتِ وحی" کے شرف میں وہ بہت سے صحابہ سے مُمتاز ہیں، اُن کے دورِ حکومت میں فتوحات بھی ہوئی ہیں، وہ تدبیر و سیاست اور رعب داب میں اپنی آپ مثال تھے

——— مگر ———

یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی پوزیشن کمزور تھی، اور حق علیؓ کے ساتھ تھا! پھر یزید کو اپنا جانشین بنا کر، انھوں نے خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا، یہ ایسی کھٹک ہے، جو اُن کے شرفِ صحابیت کے اعتراف کے بعد بھی دلوں سے دور نہیں ہو سکتی! تاریخ کے یہی وہ حقائق ہیں، جن کے سبب حضرتِ امیر معاویہ رضؓ کی حکومت کو "خلافتِ راشدہ" میں شمار نہیں کیا جاتا اور اُمت ان کے مقابلہ میں حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ حکومت کو پسند کرتی ہے بلکہ اُس دورِ مبارک کے دُہرائے جانے کی تمنا کرتی ہے!

ہفتہ وار "شہاب"

ترتیب دینے والے: نعیم صدیقی اور کوثر نیازی۔ ضخامت ۱۶ صفحات (بڑا سائز)
قیمت فی پرچہ: چھ آنے۔ ملنے کا پتہ: ہفتہ وار "شہاب" شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔

ہفتہ وار "شہاب" بڑی آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر جلوہ گر ہوا ہے، اس کے پہلے شمارے کو دیکھ کر بہت جی خوش

ہو گیا تھا مگر بعد کا ہر آنے والا نمبر پچھلے شمارے سے بہتر ثابت ہوا، کتابت، طباعت، مضامین کی ترتیب اور تنوع، غرض صورت اور معنی میں ہر لحاظ سے ترقی ہی ترقی! دین واخلاق، شعروادب، مزاح وافسانہ، زبان وتاریخ، ہر موضوع پر رنگارنگ مضامین ہر مذاق وطبیعت کی تفریح وپذیرائی کے سامان! صحت مند اور تعمیری ادب کی شروع سے لے کر آخر تک جلوہ گری! بلند پایہ ادبی اور شائستہ "شہابیے"! پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس رنگارنگی اور تنوع کے ساتھ دین واخلاق کے تقاضوں کو جس خوبی سے نباہا گیا ہے، اسے شعر کی زبان میں "جام وسنداں باختن" ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے!

پرچہ نکلنے کے دوسرے ہی مہینہ "شہاب" نے ساٹھ صفحہ کا "اتحاد عالم اسلامی نمبر" شائع کر کے اپنے ادبی موقف اور ملی ساکھ کو مضبوط تر بنا دیا ہے، کس قدر دیدہ زیب سرورق ہے، کتنے بلند پایہ مضامین ہیں، جن کے مطالعہ سے دل ودماغ کو نشاط ہی نہیں روشنی بھی ملتی ہے۔

جناب نعیم صدیقی اور جناب کوثر نیازی نے "شہاب" کی تصحیف وترتیب میں جس خوش مذاقی اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے وہ اردو دنیا کی طرف سے تبریک وتحسین کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ اس نو طلوع مجلّہ کو نظر بد سے بچائے، یہ سدا ترقی کرتا رہے اور اس کے مضامین کی اخلاقی اسپرٹ ہمارے معاشرے پر چھا جائے (آمین)

کلیاتِ غواصی

مرتبہ: پروفیسر محمد بن عمر مرحوم، ضخامت ۲۰۴ صفحات، قیمت: چار روپے
ملنے کا پتہ، سب رس کتاب گھر، خیرت آباد، حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش، بھارت)

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن جس استقامت اور خلوص کے ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت انجام دے رہا ہے وہ قابل رشک بھی ہے اور مستحق تبریک وتحسین بھی! اس کتاب پر اس ادارہ کے سلسلہ مطبوعات کا ۲۶۲ نمبر درج ہے، ہندوستان اور پاکستان میں اتنی بہت سی کتابیں شاید کسی علمی ادارے نے شائع نہیں کیں اور وہ بھی اتنی کم مدت میں!

ملا غواصی گولکنڈہ کے ملک الشعراء سمجھے جاتے تھے اور عہد محمد قلی میں اب سے تقریباً چار سو سال قبل اُن کا عالم شباب تھا اسی باکمال شاعر کے "کلیات" کو پروفیسر محمد بن عمر مرحوم نے مرتب فرما کر اس پر بڑی تحقیق وکاوش کے ساتھ دیباچہ لکھا ہے اور غواصی کے ہم عصر مثنوی گو شعراء وجہی اور ابن نشاطی کے شعروں سے مقابلہ کیا ہے۔

"کلیات غواصی" پر مقدمہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے تحریر فرمایا ہے، اس مقدمہ کا آغاز اس ٹریجڈی سے ہوتا ہے:۔

> "محمد بن عمر صاحب کو علم وفضل کی خدمت گزاری سے خاص لگاؤ تھا وہ تمام عمر طالب علم رہے، انگریزی کے علاوہ اردو اور فارسی میں بدرجہ اول ایم۔ اے کے امتحانات کامیاب کئے۔ ناگپور یونیورسٹی کے امتحانات پی، ایچ، ڈی، کے لئے غواصی پر مقالہ تیار کر رہے تھے کہ حکومت کی طرف سے ترکی زبان سیکھنے کے لئے وظیفہ دے کر ان کو ترکی روانہ کیا گیا، وہاں بھی تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ مختلف کتب خانوں میں اردو[1] کے مخطوطات اور مطبوعات کے بارے میں معلومات جمع کر رہے تھے کہ یکایک چند روز کی علالت

[1] "کے" غلط نہیں ہے، مگر اس کی ضرورت نہ تھی "اردو مخطوطات ومطبوعات" زیادہ فصیح ہے اور اس طرح ایک لفظ (کے یا کی) کی بچت بھی ہو جاتی ہے (م۔ ق)

______ میں فوت ہو گئے :

اس کلیات میں غواصی کے قصیدے، غزلیں، رباعیاں، نظمیں، مثنویاں، ترکیب بند اور مرثیے درج ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ اب سے چار سو سال پہلے، غواصی نے اتنے صاف شعر بھی کہے ہیں :۔

کتاب اس کی بیانِ کلامِ ربانی　　حدیث اس کی زبان کل ہے مخزنِ اسرار

جو دو جہاں میں ہے داماد بے بدل اس کا　　علی ولی اسد اللہ حیدر کرار

ترا جمال دیکھنے اکثر علی الصباح　　آتا ہے آفتاب نکل کر علی الصباح

ہے لب ترا مگر آبِ زلال کا تعویذ

عارف اگر تو ہے تو غلط کر اسے نہ جان　　ہر روپ کے تو عکس کی ہے مظہر آرسی

دو کون کا جو ہے خالق خدائے عز و جل!　　کیوں اس کے ناؤں (نام) پہ ہر دم نہ جاؤں میں بلبل

دولت کے آفتاب کو تیرے نہیں زوال

دل کی دیوانگی نہیں جاتی

جیت آخرت ہے محض یو دیہہ، دنیا تو ہار ہے　　گر مرد ہے تو جیت پہ دل رکھ نہ ہار پر

اس دور کی زبان اور شاعری کا عالم رنگ یہ ہے :۔

کچلے ترے لٹاں ڈر ہلتے جو ہیں یوں سوں　　ہشیار کر کے سوئے فتنیاں کو پھر چھیڑتے ہیں

نہ اختیار ہے کچ میرے اختیار کوں بی　　نہ میری یاری کی پروا ہے کچ یار کوں بی

غم منج سینے تھے بھار نکلتا نہیں ہنوز　　پاپی یو برہ لیس ہے تھے ٹلتا نہیں ہنوز

چند اشعار، شرح کے ساتھ :۔

عارف ہو بیج اخلاص کا دل کی زمین میں پیر لے

جو جھاڑ تج مقصود کا دو جگ میں لیاوے بار آج

اگر تو عارف ہے تو اپنے دل کی زمین میں اخلاص کا بیج بو، تاکہ تیرے مقصود کا درخت دونوں جہان میں بار آور ہو سکے۔

دکھت محراب بھنوں تیرا دکھ بیتاب ہو دل تھے　　کیا ہوں وقت اکثر میں قضا اپنے نمازوں کا

اے میرے محبوب! تیری محراب ابرو کو دیکھ کر دل اس قدر بے تاب اور محو ہوا ہے کہ اکثر نمازوں کا وقت قضا ہو گیا!

جو کوئی ترے عشق کے پھاندے میں پڑیا ہے　　جیتا تلک وو کدھیں آزاد نہوے

جو کوئی تیرے عشق کے پھندے میں آن پھنسا، وہ جیتے جی تو آزاد ہونے سے رہا۔

سنسار کا سواد میسر ہے یار سوں　　نزدیک یار نہیں تو یو سنسار کیا کروں

دنیا کی ساری لذت تو یار کے دم قدم سے ہے، جب یار ہی پاس نہ ہو۔ تو اس دنیا کا میں کیا کروں

بڑا ناؤں ہوتا مرا ٹھار ٹھار　　دنیا میں رہتا یک مرا یادگار

غواصی کے زمانہ میں جگہ اور مقام کو "ٹھار" بولتے تھے، پھر یہ "ٹھور" ہو گیا، مشہور ضرب المثل ہے:-

"تجھے ٹھور، نہ مجھے اور"

"باہر" کو غواصی نے "بھار" نظم کیا ہے، "صحبت" (تو صحبت اختیار کر اہل کمال کا) "خوشی" (سب کو بخشتا ہے کرگار خوشی) "دعا" (نت دعا میں تج سجن کے جاں درازی کا کروں) کو اس دور میں مذکر بولتے ہوں گے! یہ آب لال ہم تک چھلنیوں میں چھن کر اور مقطر ہو کر پہنچا ہے۔

قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، ابن نشاطی، لچھمی نرائن شفیق، ولی وغیرہ یہ وہ شعراء ہیں، جو اردو زبان اور اردو شاعری کے نقاش اول اور محسن ہیں۔ انہی کی لگائی ہوئی پود، ہمارے زمانے میں پھولی پھلی اور برگ و بار لائی ہے، ادارہ ادبیات اردو نے یہ کتابیں چھاپ کر اردو کے سلسلۃ الذہب کو اوپر تک استوار کر دیا ہے! اردو زبان کے محققین کو ان کتابوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے

SHAFIQ AND HIS ART

مرتبہ:- عزیز ربانی عزیز، ضخامت ۳۶ صفحات

ملنے کا پتہ:- اردو نسی دنیا دیکلی، ایتق پریس، جونپور (یو، پی)

حضرت شفیق جونپوری اردو زبان کے بلند پایہ شاعر ہیں، وہ نظم اور غزل پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، ان کی شاعری نے اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے، وہ جتنے اچھے متغزل ہیں، اتنے ہی بلند ناظم بھی ہیں! شفیق کے یہاں یہ معجزانہ تضاد بھی ملتا ہے کہ جسمانی طور پر وہ مریض، نحیف اور کمزور ہیں مگر ان کے افکار صحت مند ہیں:

اس کتابچہ میں شفیق جون پوری کی شاعری پر محمد رفیق ایم اے سمنانی القادری اور انور صدیقی دائم۔ اے۔ علیگ) کے تین مضامین ہیں! یہ مضامین انگریزی زبان میں مختصر ہیں مگر جامع ہیں! ایک آدھ جگہ علامہ اقبال سے شفیق صاحب کا جس انداز میں موازنہ کیا گیا ہے، وہ کھٹکا!

شفیق خوش قسمت ہیں کہ ارباب حکومت، اہل قلم اور عوام ان کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی قدر شناسی کی تھوڑی بہت بہار دیکھ لی ہے۔

الحسنات کا "معاشرت نمبر"

مرتبہ:- ابو سلیم محمد عبدالحیٔ، ضخامت ۱۰۴ صفحات، کتابت و طباعت دیدہ زیب سرورق رنگین، قیمت ایک روپیہ، رسالہ کا عام چندہ سالانہ پانچ روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- دفتر "الحسنات" رام پور (یو۔ پی۔ انڈیا)

پندرروزہ "الحسنات" دینی حلقوں میں اچھی طرح متعارف ہے، یہ رسالہ آسان زبان میں اللہ تعالیٰ کے دین کو پیش کرنے کی گرانقدر خدمت انجام دے رہا ہے، پابندی سے نکلتا ہے اور سال میں ایک دو خاص نمبر بھی شائع کر دیتا ہے

"معاشرت نمبر" کے عنوانات

قرآن و حدیث ـــــ مقالات ـــــ منظومات ـــــ افسانے اور جائزے ـــــ خطبہ و مکتوب ہیں ـــــ

ہر مضمون مفید ہے، کار آمد ہے اور بعض بعض شہ پارے تو حرز جان بنانے کے قابل ہیں، "معاشرت نمبر" اس زمانہ میں نکلا ہے جب کہ ہندوستان اور پاکستان کے معاشرے میں فساد رونما ہے اور مسلمان گھروں پر مغربیت کا سیلاب دستک دے رہا ہے، بلکہ کہیں کہیں داخل بھی ہو چکا ہے! "معاشرت نمبر" اسی طوفان بدتمیزی کو روکنے کی مثبت کوشش ہے!

الحسنات کا "معاشرت نمبر" اس کا مستحق ہے کہ ایک ایک مسلم گھرانے میں اس کو زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے اور ہماری قوم کے نومشق مضمون نگار اپنی تحریروں میں اسی فکر کو سمونے کی کوشش کریں!

برگِ گل مرتبین:۔ سید انوار الحق، سید عبدالرب اور معراج محمد بارق، ضخامت چھ سو صفحات، دیدہ زیب سرورق درجنوں تصاویر کے ٹکڑے، خوشنما ٹائپ پر قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ، اردو کالج، اردو روڈ، کراچی۔

اُردو کالج کراچی کئی برس سے سال کے سال "برگِ گل" کے نام سے ایک ضخیم "ادبی نمبر" پیش کرتا ہے، یہ اس کی پانچویں ادبی پیش کش ہے، جو تمام گزشتہ شماروں سے بڑھ چڑھ کر ہے! اس مجلّہ میں شعر و ادب، لسانیات، تاریخ، نفسیات اور دوسرے موضوعات پر بڑے معرکہ کے مقالے شامل ہیں، شاعروں کی نظمیں اور غزلیں بھی اس رسالہ میں اپنی بہار دکھا "برگِ گل" کو گلزار بنا رہی ہیں، اس قدر اہتمام، محنت اور سلیقہ کے ساتھ بہت کم پرچے مُرتب ہوتے ہیں!

مضمون نگاروں اور شاعروں کی تصویروں کے ساتھ اُن کے مختصر سوانح حیات بھی اس رسالہ کی زینت ہیں، جو مستقبل میں تذکرہ نگاروں کے لئے بہت کارآمد ثابت ہونگے، کیوں کہ اہل قلم اور شعراء کی زندگی میں جو سوانح حیات شائع ہوتے ہیں، وہ مستند ہوتے ہیں۔

یہ مجلّہ جناب میجر آفتاب حسن صاحب سابق پرنسپل اُردو کالج کے زمانہ میں مُرتب ہوا تھا بلکہ چھپ چکا تھا، مگر اس کی اشاعت کی نوبت اس دور میں آئی جب کہ اس کالج کی زمام ان کے ہاتھوں میں نہیں رہی۔

ع انقلابات ہیں زمانے کے

"برگِ گل" کی اس گرانقدر اشاعت پر اس کے مُرتبین اور خاص طور سے اس کے نگراں جناب پروفیسر حبیب اللہ غضنفر مُبارکباد کے مُستحق ہیں!

ہفت روزہ "وفاق" ادارہ تحریر:۔ مصطفےٰ صادق، شورش پاکستانی، ضخامت چھ صفحے ملنے کا پتہ: ہفت روزہ "وفاق" جناح کالونی، لائلپور۔

ہفت روزہ "وفاق" تقریباً تین ماہ سے خلوص اہتمام کے ساتھ نکل رہا ہے، اس میں مضامین کے ساتھ خبریں بھی ہوتی ہیں۔ یہ NEWS PAPER ہی نہیں VIEWS PAPER بھی ہے! اس کے اداریئے مفید اور جاندار ہوتے ہیں! مضامین کا تنوع بھی خوب ہے۔

"جہاں میں ہوں" ـــــ "قیل و قال" ـــــ "نقد و نظر" ـــــ بزم وفاق ـــــ جھلکیاں ـــــ گل و خار ... اس کے مستقل عنوانات ہیں، جو دلچسپ ہوتے ہیں، پرچہ خاصی محنت کے ساتھ مُرتب کیا جاتا ہے!

"دینی بنیادوں پر ملک و ملت کی ترقی" ـــــ وفاق ـــــ کا مطمح نظر ہے، "وفاق" کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ ہفت روزہ مجلّہ انشاءاللہ "روزنامہ" بن کر رہے گا، اللہ تعالیٰ اس کے مُرتبین کے نیک عزائم میں کامیابی عطا فرمائے! (آمین)

"غنچہ" کراچی مدیر اعزازی:۔ خاں رشید طرزی، مدیر: شفیق دہلوی، مصور ایم۔ اختر ممتاز طابع و ناشر: رؤف الرحمن، ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت فی پرچہ چار آنہ ملنے کا پتہ:۔ رحمن برادرس دفتر "غنچہ" پوسٹ بکس ۳۳۵۷ کراچی ۱

خوب صورت مصور سرورق، ہلکی پھلکی نظموں اور دلچسپ باتصویر کہانیوں کے ساتھ "غنچہ" کی نمود ہوئی ہے!

مضامین شروع سے لے کر آخر تک، دل چسپ اور بچوں کی نفسیات کے مطابق ہیں، دینی جھلک بھی پائی جاتی ہے، ناشر کو "غنچہ" کی کامیابی اور مقبولیت پر اس قدر اعتماد و یقین ہے کہ پہلے پرچہ کے بعد ہی دوسرے پرچہ کے "عید نمبر" ہونے کا اعلان کیا گیا ہے!

رحمٰن برادرس کی دوسری کتابوں کی طرح "غنچہ" بھی مقبول ہوگا اور یہ غنچۂ نوخیز مستقبل میں "گل صد برگ" بن جائے گا! ہم اس کے ادارۂ تحریر اور ناشرین کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ "غنچہ" میں دین و اخلاق کو سمونے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے!

سہ روزہ "دعوت" دہلی کی خصوصی پیش کش "روزہ"

مرتب کرنے والے: اقبال احمد انصاری، اشتیاق اختر اصلاحی، محمد مسلم۔ ضخامت ۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:- سہ روزہ "دعوت" محلہ کشن گنج، دہلی۔

سہ روزہ "دعوت" ہندوستان کی سرزمین میں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ برسوں سے پوری عزیمت استقامت اور جوش و ولولہ کے ساتھ ادا کر رہا ہے، اسی مجلّہ نے "روزہ" کے موضوع پر اپنا خاص نمبر شائع کیا ہے لکھنے والے:

حضرت سید مخدوم ہجویری، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد یوسف اصلاحی، مولانا محمد اسماعیل گودھروی، مولانا صدرالدین اصلاحی!

ان ناموں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ خاص نمبر کس قدر وقیع، بلند پایہ اور مفید ہوگا! اس خاص نمبر کے مضامین کے مطالعہ سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اور دل میں اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کی لگن پیدا ہوتی ہے!

صبح اُمید کا سلور جوبلی نمبر

ایڈیٹر: عبدالحمید خاں بوہیری، معاون شکیل بدایونی، شمس کنول، نیائے شرما۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات (بڑا سائز) قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ: ماہنامہ "صبح امید" بلاسس اسٹریٹ، بمبئی ۸

"صبح امید" کا سلور جوبلی نمبر بڑی آن بان اور اہتمام کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے، اس میں علمی و ادبی مقالے ہیں، دل چسپ افسانے ہیں، بلند پایہ نظمیں اور دل کش غزلیں ہیں ساتھ ہی طنز و مزاح کا بھی چٹخارہ ہے!۔ عنوانات۔

اپنی باتیں ——— فکر و نظر ——— جاگتی کرنیں ——— اپنا سماج ——— طنز و مزاح ——— مہر و ماہ!

"شعراء کے تخلص" ——— یہ مقالہ اُردو زبان و ادب میں بالکل نیا ہے!

جناب عبدالحمید خاں بوہیری اُردو زبان کے خاموش خدمت گزار ہیں، اب سے پچیس سال پہلے جب انھوں نے پرچہ نکالا تھا تو وہ گمنام تھے، مگر آج ان کی مسلسل جد و جہد کے سبب ادبی اور صحافتی حلقے اُن سے متعارف ہیں اور بمبئی میں خاص طور سے ان کو قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس خاص نمبر کی اشاعت پر جناب بوہیری صاحب کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

ماہنامہ

فاران
کراچی

رکن :- انجمن ادبی رسائل، پاکستان

جلد ۔۔۔۔۔ ۱۲

شمارہ ۔۔۔۔۔ ۲

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ماہ مئی سنہ ۱۹۶۰ء

ترتیب

قیمت سالانہ ۔۔۔۔ چھ روپے ۔۔۔۔ فی پرچہ ۔۔۔۔ آٹھ آنے

مقامِ اشاعت :- دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

مطبوعہ مطبع سعیدی : کراچی

پرنٹر پبلشر :- مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

"فاران" کے گزشتہ فائلوں کا اگر جائزہ لیا جائے، تو سب سے زیادہ نمایاں چیز یہ سامنے آئے گی کہ "فاران" میں عنوان بدل بدل کر "اسلام و اخلاق" ہی کے بارے میں مسلسل لکھا جاتا رہا ہے اور یہی ایک "لے" ہے جو کہیں مدھم اور کہیں تیز ہو گئی ہے، وہ جو کسی بھوکے سے سوال کیا گیا تھا کہ دو اور دو (۲+۲) کتنے ہوتے ہیں اور جواب میں اس نے کہا تھا کہ دو اور دو چار روٹیاں ہوتی ہیں ——— تو ہمارا حال بھی اسی بھوکے جیسا ہے، ہم اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اسلام ہی کی پیاس اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک انسانیت کی انفرادی اور اجتماعی فلاح و کامرانی اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور یہی وہ راہ ہدایت اور صراطِ مستقیم ہے، جس پر گامزن ہو کر، زندگی کا قافلہ اپنی منزلِ مقصود کو صحیح سلامتی کے ساتھ پہنچ سکتا ہے۔ اسلام سے ہماری یہ دلچسپی ہمارے ضمیر کی آواز اور ہماری فطرت کا عین تقاضا ہے، یہی سبب ہے کہ پیرایہ بیان کے تنوع اور اسلوب و اظہار کی رنگارنگی کے باوجود ہماری تحریروں میں یکسانی نظر آتی ہے اور یکسانی ہی نہیں اعادہ و تکرار بھی! ممکن ہے کہ بعض وہ طبیعتیں جو تحریر میں طرح طرح کے چٹخارے چاہتی ہیں، ان کو ہماری تحریریں کھٹکتی ہوں، مگر ہم موضوع کی اس یکسانی اور مقصد کے اس اعادہ و تکرار پر کوئی معذرت پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ بات اگر تحریر و انشاء کا کوئی عیب ہے تو اس پر ہم فخر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین و اخلاق کو مسلسل پیش کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائی! زبان و قلم کی اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان سے سچائی کی ترجمانی، حق کا اظہار اور صداقت کی تراوش ہو۔

اہم گزارشیں

اب سے ڈیڑھ دو سال قبل ہم نے "دستور و آئین" پر بہت کچھ لکھا ہے کہ اس دور میں یہی موضوع سب سے اہم تھا۔ مقامِ شکر و مسرت ہے کہ اس نے "انقلابی دورِ حکومت" میں ایک سال کے انتظار کے بعد "جمہوریت و دستور" کے مسائل پھر سامنے آئے ہیں! اور بنیادی جمہوریتوں کے اس انتخاب کے بعد دستور ساز کمیشن بھی مقرر ہو چکا ہے اور اس نے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں، جو خیر میں شر کے پہلو نکالنے کی فکر میں رہتے ہیں، اور جنہیں بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ اور سطحی قسم کی طنز و تنقید میں مزہ آتا ہے، محاسن سے دانستہ نظر بچا کر، صرف معائب کو دیکھتے دیکھتے نگاہ "عیب بین" ہو جاتی ہے اور "عیب بینی کوئی خوبی کی بات نہیں ہے"۔ تصویر کے دونوں پہلو نگاہ میں رہنے چاہئیں، وہ نگاہ خود عیب دار ہے جسے تصویر کا تاریک پہلو تو بڑی آسانی سے دکھائی دے جاتا ہے، مگر روشن پہلو اوجھل رہتا ہے! ہمارے نزدیک تو وہ ایک قدم بھی جو تعمیر کی جانب اٹھ رہا ہے، قدر و ستائش کا مستحق ہے!

اعترافِ محاسن میں بخل اور اسراف یہ دونوں انتہائیں غلط ہیں، جس کسی کی خوبی جتنی ہے، اسی کمیت و کیفیت سے اس کا اعتراف کرنا چاہیے، قرآنِ کریم میں حسن و قبح کے جانچنے اور پرکھنے کا یہ معیار مقرر کیا گیا ہے:۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۗ

(اے نبی) تجھ سے شراب اور جوئے کے بارے میں لوگ پوچھتے ہیں (اس کے جواب میں) اُن سے کہیے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور (ساتھ ہی کچھ) فائدے بھی لوگوں کے لئے ہیں، مگر ان کا گناہ فائدے سے بہت بڑھ کر ہے۔

دُنیا کی ہر چیز کو، ہر تحریک اور ہر پروگرام کو، ہر تنظیم اور ہر حکومت و معاشرہ کی ہر ہیئتِ ترکیبی کو اس قرآنی معیار سے جانچا جائے گا اور خیر و شر کے تناسب اور قدرِ غالب ہی کے لحاظ سے اس کے بُرے اور بھلے ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

پاکستان میں مارشل لا ہی کے دوران میں جب بنیادی جمہوریتوں کا اعلان ہوا اور اس کی تفصیلات سامنے آئیں تو بعض باتیں نقد و محاکمہ کی محتاج تھیں مگر ہم نے نقد و محاکمہ کے مقابلہ میں سکوت و درگزر کو ترجیح دی، اور ہمیں یہ خیر کا پہلو نظر آیا کہ انسانوں کی بنائی ہوئی اسکیموں، پروگراموں، تنظیموں اور منصوبوں میں کوتاہیاں رہ ہی جاتی ہیں، موجودہ حالات میں یہی غنیمت ہے کہ جمہوریت کی طرف پیش قدمی تو ہو رہی ہے اور شورائیت کی داغ بیل تو ڈالی جا رہی ہے، اگر ملک میں سالہا سال تک مارشل لا رچلتا رہے، تو اربابِ اقتدار کو اُن کے اس عزم سے کون باز رکھ سکتا ہے، اس لئے جمہوریت، شورائیت اور عوام کی نمائندگی کا یہ احساس مطلوبہ معیار کے مقابلہ میں مضمحل ہی کیوں نہ ہو، بہرحال قابلِ قدر ہے، اور خدا کرے کہ یہ تجربہ کامیاب ثابت ہو، اس کے نتائج اور ثمرات کے بارے میں مستقبل کا فیصلہ ہی صحیح فیصلہ ہوگا۔

بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات کے بعد "دستور ساز کمیشن" کا اعلان کیا گیا اور اس اعلان و تقرر کے بعد کام کا آغاز بھی کر دیا گیا کہ انقلابی حکومت میں ہر اسکیم اور ہر پروگرام کو بڑی تیزی کے ساتھ روبہ عمل لایا جاتا ہے، ڈھیل دینا اور معاملات کو کھٹائی میں ڈالنا اربابِ شمشیر و سناں کا شیوہ ہی نہیں ہے، وہ جس بات کے بارے میں یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہمیں ایسا کرنا ہے تو اسے کر گزرتے ہیں، ان کا عزم شکست و تغیر کو بہت ہی کم قبول کرتا ہے۔

عائلی کمیشن، بنیادی جمہوریت، دستور ساز کمیشن اور اس قسم کے تمام عوامی مسائل پر ملک کے اخبارات کے نقد و تبصرہ سے عوام کو روشنی مل سکتی تھی کہ اخبارات عوام کے جذبات اور پبلک کے رجحانات کے صحیح ترجمان ہوتے ہیں، پاکستان میں بھی طرح طرح کے اخبارات پائے جاتے ہیں، وہ بھی ہیں کہ آج جن وزراء کو ڈنکے کی چوٹ نااہل اور بددیانت ثابت کیا جا رہا ہے، انہی اخبارات نے اُن "سابق عزت مآبوں" کی شان میں قصیدہ خوانیاں کی ہیں اور بڑے فخر و عقیدت کے ساتھ اُن کی تصویریں چھاپی ہیں، اس قسم کے اخبارات کے سامنے سب سے پہلے اپنے مفاد، خوشحالی اطمینان و آرام اور بے خلش زندگی کا مسئلہ ہے جسے وہ جوکھوں میں ڈالنا نہیں چاہتے!

ملک میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے اخبارات و جرائد بھی ہیں جو کرسیوں اور شخصیتوں سے بلند ہو کر سوچتے ہیں اور جو کسی دور میں بھی چڑھتے سورج کے پجاری نہیں رہے اور جو ملک و ملت اور دین و اخلاق کے مقابلہ میں اپنے مفاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، جو حق بات کہتے ہوئے خطروں سے نہیں گھبراتے جن کو کسی شخصیت سے کوئی کد نہیں ہوتی، وہ تو اُسی بات پر احتساب کرتے ہیں، جو اُن کے نزدیک تائید کی مستحق نہیں ہونی چاہیئے وہ کسی کے منہ سے نکلی ہو۔ یہی وہ تعمیری تنقید ہے جو ایک طرف عوام کو گمراہ نہیں ہونے دیتی اور دوسری طرف خواص کو آئینہ دکھاتی رہتی ہے!

اِن اخبارات نے

دستور ساز کمیشن کے ارکان کی ہیئت ترکیبی کا تجزیہ کر کے اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے، ہم اس نقد و احتساب اور تجزیہ و تحلیل

پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، ہمیں تو اس فرصت میں دستور ساز کمیشن کے معزز ارکان کی خدمت میں ضروری باتیں عرض کرنی ہیں!

جو کوئی اس طرز پر سوچتا ہے وہ بالکل غلط سوچتا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت اور اسلام دونوں ناکام ہو چکے ہیں اور اب آئینِ حکومت اور نظم و نسق مملکت کی کوئی نئی راہ نکالنی ہے، پاکستان میں نہ تو جمہوریت کو آزمایا گیا اور نہ اسلام کا تجربہ کیا گیا۔ جمہوریت سے گریز کا سبب یہ تھا کہ اس سے اُن سیاست بازوں کے شاہانہ اختیارات متاثر ہوتے تھے، وہ تو حکومت کو اپنی جاگیر سمجھے ہوئے تھے اور حکومت کے نشہ نے انہیں عواقب سے بے پروا بنا دیا تھا۔ وہ آئین و دستور میں اپنے عہدہ و منصب کے لئے ایسے شخصی تحفظات اور زیادہ سے زیادہ وسیع اختیار چاہتے تھے کہ مرتے دم تک وہ بادشاہی کرتے رہیں، اُن کا حکم واجب الاذعان ہو۔ اُن کی ذات نقد و احتساب سے بالاتر رہے ——— اور اسلام سے وہ گریز اس لئے کرتے تھے کہ حکومت پر اسلام کا غلبہ ہو جانے کے بعد، اُن کے فسق و فجور، بدکاریوں اور بداعمالیوں کا قافیہ تنگ ہو جاتے گا اور عوام یہ مطالبہ کریں گے کہ جن لوگوں کے یہ کردار اور ایسے اخلاق ہوں، اُن کو اسلامی حکومت کی زمام کیسے سونپی جا سکتی ہے، یہی وہ اندیشے اور وسوسے تھے کہ جن کے ہاتھوں پاکستان میں جمہوریت اور اسلام کو دیس نکالا ہی ملتا رہا اور یہ "شہر بدر" ہی رہے!

دستور سازی کے سلسلہ میں اربابِ اقتدار نے کیسی کیسی کھنڈتیں ڈالی ہیں اور کیا کیا چالیں چلی ہیں، بالآخر عوام کے دس سال کے مسلسل احتجاج اور دباؤ کے بعد دستور بنا مگر ان غرض کے بندوں اور منصب و اقتدار کے بھوکوں نے اُسے نافذ ہی نہیں ہونے دیا! اس دستور میں کوئی شک نہیں بہت سی خامیاں اور متعدد loop holes تھے مگر ان تمام کوتاہیوں کے باوجود اگر اُس دستور کو بھی ایمانداری اور اخلاص کے ساتھ نافذ کیا جاتا تو ملک و ملت کا بہت کچھ بھلا ہو سکتا تھا!

دستور ساز کمیشن کے پیش نظر یہ حقیقت رہنی چاہیئے کہ منسوخ شدہ دستور پاکستان کے عوام کے مطالبات کا کم سے کم ترجمان تھا، لہٰذا اس دستور کو تو انہیں اپنی تحقیق و تشکیل کی پہلی منزل قرار دینے کی ضرورت ہے ——— یہ کہ اس سطح سے نیچے اُترنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، سابق دستور میں اسلام و جمہوریت کی روح تو تھی مگر بہت مضمحل تھی، ضرورت اس کی ہے کہ اس روح کو رواں دواں، فعال اور جوہر غالب بنایا جائے!

دستور ساز کمیشن کے گرامی مرتبت ارکان اس حقیقت سے یقیناً باخبر ہیں کہ پاکستان اسلام اور صرف اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے، مسلم لیگ مشترکہ ہندوستان میں بہت پہلے سے موجود تھی۔ مگر مسلمانوں میں مقبول نہ تھی۔ اسی طرح مسٹر محمد علی جناح ایک قابل وکیل اور با اصول سیاست داں کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، مسلمانوں کے وہ قائد اور لیڈر نہ تھے، یہ "اسلام" تھا جس کے مطالبہ نے مسلم لیگ کو گمنامی اور کس مپرسی کی خاک سے اٹھا کر، شہرت و ہر دلعزیزی کے عرش پر بٹھا دیا اور "اسلام" ہی کے نعرے نے مسٹر جناح کو "قائد اعظم" بنایا۔ پوری قوم والہانہ جوش و عقیدت کے ساتھ قائد اعظم مرحوم کے پیچھے چل پڑی، تو قوم کی اس عقیدت و جوش کا محور یہ خوش فہمی تھی کہ پاکستان بننے کے بعد اس ملک میں اللہ تعالیٰ کا حکم غالب اور اسلامی نظام برپا ہوگا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے "رفاہی حکومت" (Welfare State) زندگی کی خوشحالی، یا اس قسم کی کوئی اور چیز پیش کی جاتی، تو اُن میں مسلم لیگ اور اُس کے اربابِ حل و عقد کی قیادت مقبول نہیں ہو سکتی تھی ——— تو جو ملک اسلام کے نام پر اور اسلام کے لئے بنا ہے، اُس میں اسلام ہی کو غالب اور قوت نافذ بن کر رہنا چاہیئے!

مشترکہ ہندوستان میں نمازیں بھی پڑھی جاتی تھیں، وہاں مسلمان روزے بھی رکھتے تھے، مسجدیں بھی آباد تھیں اور خانقاہیں بھی معمور تھیں، لیکن مسلمان اسلام کی ان تمام علامتوں کے باوجود اس اندوہناک خلش کو محسوس کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو غلبہ حاصل نہیں ہے، اور اس مقصد عظیم بلکہ یوں کہیئے غایت مطلوب کے حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کی جائے اور مسلمان اپنی غالب اکثریت کے ساتھ ایک ایسے خطہ (پاکستان) کے سربراہ کار ہوں، جہاں انہیں اسلام کو نافذ کرنے کا پورا پورا موقعہ مل سکے! اور اسلام کا عملاً نفاذ اور دین قیم کا غلبہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ پاکستان کا دستور کتاب و سنت کے عین مطابق ہو اور یہاں کا پورا معاشرہ اسلامی اخلاق کی مقدس بنیادوں پر استوار ہو۔

پاکستان کا دستور ایسا بننا چاہیئے جس کی رو سے اس ملک میں "منکرات" قانونی طور پر جرم قرار دیئے جائیں، چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح شرابیوں، زانیوں، قماربازوں اور بدکاروں پر بھی حد جاری کی جائے، سیاست و معیشت سے لے کر تعلیم و ثقافت تک ہر شعبہ میں اسلامی اخلاق کا چلن ہو، ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں مرد و زن کی عصمتیں پوری طرح محفوظ ہوں، یورپ کی طرح مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط کے ہر موقعہ اور ہر چور دروازے کو قوتِ قاہرہ اور حکمتِ بالغہ کے توازن کے ساتھ بند کیا جائے! ہر قسم کا ایسا کاروبار جو سود، قمار اور سٹے سے مشابہت رکھتا ہو، چاہے وہ ریس کورس کی شرطیں ہوں یا کلب گھر کے کھیلوں کے STAKES ہوں، اُن کو قانونی طور پر جرم قرار دیا جائے!

پاکستان کے دستور میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو تحفظات کی پناہ (Protection) نہیں ملنی چاہیئے۔ جہاں تک قانون و عدالت کا تعلق ہے اسلام کی نگاہ میں ایک چپراسی اور امیر المومنین دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

پاکستان کے دستور سازوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور آخرت کی جواب دہی کا احساس و یقین ہر آن رہنا چاہیئے کسی دوسری حکومت کے طرز، جہاں بانی اور آئین و دستور کی نقل اتارنے کی ضرورت نہیں، مسلمان دوسروں کا نقال نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہیئے! اور:۔

نہ جا اس پر کہ دنیا کیا کہے گی
زمانہ کی روش ہے عامیانہ

پاکستان کو تو ایسی مثالی حکومت بنانا ہے، جو دنیا کو اخلاق و پاکیزگی اور دانش و فکر کی روشنی دے سکے، جہاں کے عوام حلال کمائی کے ذریعہ رزق حاصل کریں جس جگہ جھونپڑیوں سے لے کر قصر و ایوان، تک نیکی کا چلن ہو، دوسرے ملکوں میں جس کے سفارت خانے ہدایت و تبلیغ کے مرکز ہوں۔

آج دنیا کے عوام اپنی نفسانی خواہشوں کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ آزادی اور رخصت چاہتے ہیں مگر پاکستان کے عوام اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اس کی تمنا رکھتے ہیں کہ ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جائے، عوام کی اس تمنا کے ساتھ اگر حکومت بھی متفق و متحد ہو جائے تو یہ پاکستان سچ مچ جنتِ ارضی بن سکتا ہے! ایسے خیر پسند عوام کی تعمیری بنیادوں پر اگر تعلیم و تربیت کی جائے، تو ان کے "خیر الامم" بننے میں کیا دیر لگے گی؟ وہ جو حسن البنا شہید مرحوم نے فرمایا تھا کہ "مسلمان دنیا کی قیادت سے کم کسی چیز پر راضی ہو ہی نہیں سکتا" تو پاکستان میں مسلمانوں کے ایسا بننے کے پورے پورے مواقع حاصل ہیں۔

اس حقیقت کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دنیا نے مادیات میں بے شک حیرت انگیز ترقی کی ہے اور انسان

مہرو ماہ پر کمندیں ڈال رہا ہے مگر جہاں تک اخلاق اور پاکیزگی کا تعلق ہے، آج کی دنیا پستی کی آخری حد کو پہنچ چکی ہے! زندگی میں اصل اعتبار شرافتِ نفس اور پاکیزگیٔ اخلاق کا ہے، تو ہمیں اخلاقی لحاظ سے "جدت پسند" نہیں "قدامت پسند" بننا ہے، اخلاق و نیکوکاری کی اس قدامت پسندی پر ہم فخر کرتے ہیں اور اس "جدت" سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، جو عصمتِ کردار کی دشمن اور شرافتِ نفس کی قاتل ہو!

جس طرح بڑھئی اور لوہار ہمیں اوزار اور بنی ہوئی چیزیں دے سکتے ہیں فکر و نظر نہیں دے سکتے یہی طرح یورپ اور روس سے ہم اسلحہ اور دوسری اشیاء لے سکتے ہیں اور ان ایجادات و مصنوعات میں اُن کی نقل بھی اتار سکتے ہیں۔ مگر جہاں تک اخلاق و کردار کا تعلق ہے وہ ہمارے لئے بدترین نمونہ ہیں، اُن کے نظریات و افکار سے ہمارے دینی تصورات مطابقت نہیں کرتے اس لئے پاکستان کے دستور میں مغربی افکار کی جتنی بھی جھلک آئے گی، اُسی قدر یہ دستور "غیر اسلامی" ہوگا!

عائلی کمیشن میں جس فکر و ذہن نے کام کیا ہے، اس فکر و ذہن کو اگر پاکستان کی دستور سازی میں بھی دخیل ہونے کا موقع مل گیا، تو پاکستان کا دستور "اسلامی روح و فکر" کی ضد ہوگا۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئیے کہ اسلام "پاک درخت" ہے، جو کسی دوسرے "ناپاک درخت" کے پیوند اور قلم کو گوارا نہیں کر سکتا، اگر کوئی ایسا کر گزرے، تو اس کا یہ فعل اسلام کے "شجرِ طیبّب" کے لئے بہت بڑا صدمہ اور المیہ ثابت ہوگا۔

جدت و انقلاب اور اصلاح و تعمیر کی اصطلاحیں بہ ظاہر بہت خوش نما اور دلفریب معلوم ہوتی ہیں مگر نقطۂ نگاہ غلط ہو تو عملی تفصیل میں جا کر یہ خوش نما اصطلاحیں مستقل گمراہی بن جاتی ہیں! مصطفےٰ کمال پاشا کی مثال ہمارے سامنے ہے، یہ قائد اسلام کی نہیں "ترکی قوم" کی ترقی و تعمیر چاہتا تھا، اُس کے سامنے یورپ کی چمکتی ہوئی تہذیب تھی، اُس نے یورپ کے تہذیب و تمدن اور ترقیوں کو ترکی قوم کے لئے اصلاح و تعمیر کا معیار اور نمونہ قرار دیا، اور مغربی افکار کو جو دین و اخلاق کی ضد تھے، ترکی قوم کے مزاج اور سیرت و طبیعت میں سمونے کے لئے اپنی تمام توانائیوں کو صرف کر دیا، فکر و نظر کی کجی کی حد ہو گئی کہ عربی زبان میں اذان دینے تک کو ممنوع ٹھہرا دیا گیا، کمال پاشا کے ہاتھ میں طاقت تھی اسی طاقت کے بل بوتے پر وہ سب کچھ کر گزرا، ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف ترکی قوم "مغرب زدہ" ہو کر، امریکہ کی دست نگر بن گئی، دوسری طرف اسلامی اقدار کو سخت صدمہ پہونچا۔ بلکہ ان پر کاری ضرب لگی۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی فکر مسلمانوں کے جس ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی شریک کار ہوگی، وہاں اسلام کو اسی ٹریجڈی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یورپ میں معیشت و تجارت اور مالیات کا سارا نظام "سود" پر چل رہا ہے "سود" اُن کے یہاں ایک پسندیدہ چیز ہے، اُن لوگوں کے دل میں سود کی برائی کی کھٹک تک پیدا نہیں ہوتی مگر اسلام میں تو سود خواری کو "اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ" کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے ——— تو ایک مسلمان جب بھی مالیات اور اقتصادیات کے مسائل پر غور کریگا، اُس کا زاویہ نگاہ یورپ کے زاویہ نگاہ سے قطعاً مختلف ہوگا اور مختلف ہونا چاہئیے "سود" کی لعنت کے ساتھ اگر مسلمانوں کی کسی حکومت کا بجٹ متوازن اور اس کی مالی ساکھ مضبوط ہو جاتی ہے، تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے حکومت کا یہ مالی ترفہ آخرت کا بہت بڑا خسارہ ہے!

دوسروں کے یہاں رزق و روزگار، معاش و معیشت اور آمدنی کے ذرائع میں حرام و حلال کا کوئی فرق نہیں کیا جاتا مگر مسلمانوں کے دل و دماغ سے حرام و حلال کا امتیاز ہی سرے سے جاتا رہے، تو اس "کفر" کے بعد اگر مسلمانوں کی کوئی حکومت مالداری میں دنیا کی تمام حکومتوں سے بھی بازی لے جائے، تو یہ تجارت بڑے ہی ٹوٹے کی تجارت ہوگی۔

یورپ میں حسن کے مقابلے باعثِ فخر مگر ہم مسلمانوں کے لئے سببِ ننگ و عار، اُن کے یہاں ناچنا گانا تصویریں کھینچنا اور مجسمے بنانا "آرٹ" لیکن اہلِ ایمان کے نزدیک یہ "آرٹ" خرافات اور لغویات میں داخل ہے! غرض ہمارے یہاں حق و باطل، صواب و ناصواب، صحیح و غلط، جائز و ناجائز، سود و زیاں اور خوب و ناخوب کے پیمانے دوسروں کے پیمانوں سے بالکل مختلف ہیں، اُن کے یہاں جو چیز طاہر ہے وہ ہمارے یہاں نجس ہے اُن کا کمال ہمارا عیب ہے، اُن کے یہاں جسے "فائدہ" سمجھا جاتا ہے، وہ ہمارا خسارہ ہے!

مغرب کے فکر و نظر کا، اخلاق و کردار کا، طرزِ زندگی اور اصولِ سیاست و جہاں بانی کا ہماری زندگی، اخلاقیات اور افکار و معتقدات سے کوئی ربط نہیں ہے، اُن کی اور ہماری زندگی کی راہیں جدا جدا ہیں، لہٰذا پاکستان کے دستور و آئین میں مغربی اسپرٹ کو سمونے کی کوشش، اسلامی دستور کے مزاج کے خلاف ایک غلط اقدام ہوگا۔

پاکستان کے دستور کا ماخذ، اساس اور مصدر و منبع "کتاب و سنّت" ہونا چاہیئے! پاکستان کی دستور سازی میں صرف اس کی رعایت ایک مسلمان کے ذہن کو مطمئن نہیں کر سکتی کہ اُس میں کتاب و سنت کے خلاف کوئی بات نہ ہو ——— بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ اسلامی اقدار کی افادیت و برتری پر پورا یقین رکھتے ہوئے، پاکستان کے دستور کو اس انداز پر مُرتب کیا جائے کہ "کتاب و سنت" کے تقاضوں کو قدرِ غالب اور جوہرِ فعّال کی حیثیت سے کام کرنے کا موقعہ ملے، یہاں تک کہ پاکستان کا معاشرہ اسلامی اخلاق اور دینی اقدار کا مظہرِ کامل بن جائے

اس حقیقت کو مفروضہ کے طور پر نہیں، بلکہ واقعہ کی حیثیت میں ذہن میں اُتار لینا چاہیئے کہ آج کی دُنیا غلط راہ پر جارہی ہے اور جاہلیت اولیٰ پھر سے اُبھر آئی ہے، لہٰذا ہمیں آج کی غلط کار دُنیا کی راہ پر نہیں چلنا ہے اور نہ اس کی پرواکرنی ہے کہ دُنیا کیا کہے گی؟ دُنیا جو چاہے کہتی رہے، ہمیں تو وہ کام کرنا ہے، جس کا اللہ اور رسولؐ نے حکم دیا ہے!

بھارت کا قانون گائے اور بندر کی تقدیس کو تسلیم کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ دنیا کے سامنے نہیں شرماتا، بڑی بزدلی احساسِ کمتری، بے یقینی اور بدتوفیقی کی بات ہوگی، اگر ہمیں حدود اللہ کی حفاظت کرتے ہوئے شرم محسوس ہو!

پاکستان میں مسٹر پرویز جیسے "مفسرینِ قرآن" بھی پائے جاتے ہیں۔ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو من مانی تاویلوں خود تراشیدہ دلیلوں اور نکتہ آفرینیوں سے کھیل بنا دیا ہے، ایسے نام نہاد مفکرین کے پلیش کئے ہوئے "اسلام" (؟) کو اگر دستور میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی تو پاکستان کا دستور کتاب و سُنّت کے مقابلہ میں ایک حریفانہ دستور ہوگا۔ اس مزاج کے اہلِ فکر اور اُن کے افکار ذرا سی بھی توجہ اور لفٹ دینے کے مستحق نہیں ہیں۔

عائلی کمیشن کی رپورٹ نے پاکستان کے مسلمانوں کو چونکا دیا ہے، وہ دستور سازی کی کوششوں کا بڑے غور و فکر اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں، دستور سازی اور پھر اس کی منظوری اور نفاذ، اس میں واضعینِ دستور سے لے کر پاکستان کے اربابِ حل و عقد تک سب کا سخت امتحان ہے۔ ہماری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ تمام حضرات اس امتحان میں پورے اتریں اور اُن کی جد و جہد سے پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو جائے، یہ ہو گیا تو ہمارے ملک کے اربابِ کار کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور نصرت و تائید حاصل ہوگی اور اسلامی تاریخ میں اُن کا ذکر نیکنام حکمرانوں کے ساتھ کیا جائے گا اور ان کے ناموں سے اچھی شہرت اور پاکیزہ روایت وابستہ ہو جائے گی۔

یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ پاکستان کی غالب اکثریت کتاب و سنت پر ایمان رکھتی ہے، اور اس کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ پاکستان میں کتاب و سنت کا چلن ہو اور اسلام کو فروغ حاصل ہو۔ سیاست باز حکمرانوں سے یہاں کے عوام اسی لئے برہم رہے بلکہ نفرت کرتے رہے کہ وہ لوگ "اسلام" کو پاکستان کی حکمرانی میں دخیل ہونے دینا نہیں چاہتے تھے، اس انقلاب کے بعد بھی پاکستان کے مسلمانوں کے اسلامی جذبات اور دینی معتقدات وہی ہیں، جو پہلے تھے ــــ یہ کہ پاکستان اسلام کے لئے بنا ہے، اسلام کے نام پر بنا ہے، اس لئے یہاں اسلامی افکار، اسلامی تہذیب، اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاق ہی کو پھلنے پھولنے، پروان چڑھنے اور قوتِ غالب بننے کے مواقع میسر آنے چاہئیں!

ہم اس بات کو پوری صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں "معروف" میں اطاعت کا اور "منکر" میں مخالفت کا حکم دیا گیا ہے، "معصیت" میں کسی کی اطاعت نہیں کی جا سکتی،

لہٰذا

اللہ اور رسول ؐ کے احکام سے جس کسی کا بھی حکم اور قانون و آئین ٹکرائے گا، وہاں ہماری وفاداری اور اطاعت صرف اللہ اور رسول ؐ کے احکام کے ساتھ ہوگی!

محمد سلیمان فرخ آبادی

آدابِ جمعہ

احادیث مشکوٰۃ سے ماخوذ ہیں اور ترجمے کے بجائے ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ مرتب

کسی قوم کا احساسِ قومی، کسی جماعت کا جماعتی شعور اور کسی ملت کا ملّی تصور ہی وہ چیز ہے جو اس کو وجود بخشتا اور برقرار رکھتا ہے بلکہ اس قوم، جماعت اور ملت کو جو چیز ایک مستحکم وجود، ایک مضبوط قلعہ اور ایک بنیان مرصوص بناتی ہے۔ وہ اس کا یہی اپنی ہستی کا احساس، اپنے تشخص کا شعور اور اپنے امتیازی نشان کا تصور ہے۔

لیکن یہ احساس، یہ شعور اور یہ تصور خود بخود پیدا ہوتا اور نہ خود بخود جلتا رہتا ہے۔ یہ اپنے وجود میں کچھ اسباب اور محرکات کا محتاج ہے اور اسے اپنی بقا اور نشوونما کے لئے بھی کچھ ذرائع اور وسائل درکار ہیں۔

قومیں، جماعتیں اور ملتیں مختلف وجوہ سے وجود پذیر ہوتی ہیں نسل و نسب، ملک و وطن، پیشہ و فن، حکومت و سلطنت مذہب و مسلک، اور اصول و نظریات وغیرہ، قوموں، جماعتوں اور ملتوں کو جنم دیتے ہیں۔

لیکن جب جنم لے لیتی ہیں تو ان کی پرورش و پرداخت، بقا اور نشوونما کا ٹیڑھا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے

کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے اور نہ پروان چڑھ سکتی ہے۔ جب تک کہ اس کا قوم ہونا اس کو یاد نہ دلایا جاتا رہے۔ کوئی جماعت باقی رہ سکتی ہے اور نہ پنپ سکتی ہے۔ جب تک کہ اس کے نصب العین کے ذریعہ اسے بیدار نہ کیا جاتا رہے۔ کوئی ملت اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکتی ہے اور نہ ترقی کی منازل طے کر سکتی ہے۔ جب تک کہ اس کی غرض و غایت اس کے ذہن و دماغ پر غالب نہ ہو اور اسے پیہم جگاتی نہ رہے۔

قومی احساس، جماعتی شعور اور ملّی تصور کو زندہ اور تابندہ، درخشاں اور تاباں رکھنے کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ لباس خاص ہیئت ڈاڑھی، مونچھ اور سر کے بالوں کی خاص وضع، کچھ خاص قسم کے یونیفارم اور نشانات، کچھ عقائد اور ذہنی بنیادیں، کچھ رسمیں اور رواج، کچھ میلے اور تہوار، کچھ مشترک مفاد کی توقعات کی یاددہانیاں، کچھ اجتماعی مضرات کے اندیشوں اور خطرات کی تشویشناکیاں، انکے اس احساس، شعور اور تصور کو زندگی کے ڈوز دیتی رہتی ہیں۔

یہ مجوسیوں اور عربوں میں نیروز اور مہرجان کی عیدیں، عکاظ اور ذوالمجنہ کے بازار، عیسائیوں کا کرسمس ڈے، ہندوؤں کے مختلف میلے، پاکستان کا ۱۴ اگست ہندوستان کا ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری، یہ سب کیا ہیں؟ اپنا اپنا امتیاز اور تشخص برقرار رکھنے کے ذرائع اور وسائل اور اپنا قومی احساس، جماعتی شعور اور ملّی تصور زندہ رکھنے کے اسباب اور محرکات ہی تو ہیں۔ اسلام (الٰہی نظام زندگی) اپنے خاص تصورِ حیات اور نرالے رویۂ زندگی کی بنیادوں پر جس قوم جماعت اور ملت کو وجود بخشتا ہے اس کے قومی احساس، جماعتی شعور اور ملّی تصور کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے جس قدر اعلیٰ اور بہتر انتظام کیا ہے۔ دنیا کی کسی قوم، کسی

جماعت، کسی ملت اور کسی پارٹی کو اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوا۔ اسلام نے صرف ذہنی اور فکری یا انفرادی ذرائع ہی پر اکتفا نہیں۔ بلکہ اجتماعی ذرائع اور وسائل بھی اپنی قومیت جماعتیت اور ملیت کو برقرار رکھنے کے لئے اختیار کئے ہیں۔

جمعہ کی اہمیت اور فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْہِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ فِیْہِ خُلِقَ آدَمُ وَفِیْہِ اُدْخِلَ الْجَنَّۃَ وَفِیْہِ اُخْرِجَ وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ اِلَّا فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ (مسلم)

بہترین دن جس میں آفتاب طلوع ہوا جمعہ کا دن ہے اسی میں حضرت آدم پیدا کئے گئے اور اسی میں جنت میں داخل کئے گئے اور اسی میں جنت سے نکالے گئے اور قیامت جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔

تخلیق آدم اور دخول جنت جیسی اہم حقیقتوں کے لئے جس دن کا انتخاب رب العالمین کی طرف سے کیا گیا ہو اس کی فضیلت کا کوئی ٹھکانہ ہے؟ اور جنت سے اخراج نیز قیام قیامت کے لئے جس دن کو چنا گیا ہو بھلا اسکی اہمیت کا کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے

آدمی خیر و برکت سے اگر اپنی جھولیاں بھرنا چاہتا ہے تو اسے جمعہ کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ وہ اگر تخلیق نوع انسانی کے واقعہ اور غرض سے کوئی لگاؤ اور اس رکھتا ہے اور اپنی زندگی کو مقصد تخلیق آدم کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے تو جمعہ اسے ہر آٹھویں دن اور سال میں ۴۸ بار یاد دلاتا ہے کہ تم اپنی تخلیق کے واقعہ کو یاد کرو اور مقصد تخلیق کو ہر آن پیش نظر رکھو! نماز اور خطبہ وغیرہ کے ذریعہ ہمارا اپنا نصب العین تازہ ہوتا رہتا ہے اور طریق کار کی مشق ہوتی رہتی ہے۔

جمعہ ہمیں یاد دلاتا رہتا ہے کہ آدم جنت میں کیوں بسائے گئے؟ حضرت حوا کی تخلیق کیوں اور کس غرض سے ہوئی؟ ابلیس کون ہے اور اس نے کیا کردار پیش کیا؟ انسان سے کس کمزوری کا صدور ہوا؟ انکار امر رب کے نتیجہ میں ابلیس کا کیا حشر ہوا؟ آدمؑ و حواؑ نے توبہ کرکے مقام انسانیت کو کیا سرفرازیاں عنایت کیں؟ اور پھر یہ کہ جنت آدمؑ و حوا، فردوس گم گشتہ میں کیسے تبدیل ہوگئی ہبوط آدم کیوں ہوا؟ اور اب زمین پر آدمؑ کے بیٹوں اور حواؑ کی بیٹیوں کو کیا پارٹ ادا کرنا ہے ابلیس کا یا آدمؑ و حواؑ کا۔

جمعہ صرف انسان کے آغاز ہی کو یاد نہیں دلاتا، وہ صرف دنیوی زندگی کی شاہراہ مستقیم کے نشان ہائے میل ہی کی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ بلکہ انسان اور کائنات کے انجام کی طرف بھی توجہ کو موڑ دیتا ہے اور پھر خوش نصیب انسان اس کی دعوت پر لبیک بھی کہتے ہیں وہ کہتے ہیں ہی وہ ہوں جس میں یہ لیل و نہار کی آمد و رفت بند ہو جائے گی۔ شمس و قمر ماند پڑ جائیں گے، ان کی گردش رک جائیگی سیاروں اور ستاروں کی کشش جواب دے دیگی۔ آسمان پھٹ جائے گا، زمین کا جگر چاک ہو جائے گا۔ اور کائنات کی مشین خاموش ہو جائے گی۔ بالکل خاموش۔

لہٰذا میں تم سے کہتا ہوں اس دن کے لئے تیاری کرو اور اپنے امام کے ساتھ مل کر زندگی کی کشتی کو پار لگاؤ وہ تم کو خطبہ کے ذریعہ زندگی کا پروگرام دے گا۔ تم اس کے ساتھ مل کر اپنے مالک کی بندگی کی راہ پر لگ جاؤ۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا۔

اِنَّ فِی الْجُمُعَۃِ لَسَاعَۃً لَا یُوَافِقُھَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ یَسْأَلُ اللّٰہَ فِیْھَا خَیْرًا اِلَّا اَعْطَاہُ اِیَّاہُ (متفق علیہ)

بے شک جمعہ میں ایک ایسی گھڑی ہے جسے اگر کوئی بندہ مومن پالے تو اس میں جو بھی بھلائی طلب کرے گا وہ اسے ملیگی

جو دن اپنے دامن میں ایک ایسی گھڑی کو چھپائے ہوئے ہو جس میں مقبولیت دعا کی۔ زبان وحی ترجمان سے گارنٹی دی جا رہی ہے وہ کس قدر اہتمام اور توجہ کا مستحق ہوگا کس قدر اہمیت کا مالک اور فضیلت کا حامل ہوگا۔

یہ گھڑی کون سی ہے صرف اس کی تلاش و جستجو کے بجائے بہتر یہ ہے کہ تمام دن ہی کو توجہ کا مستحق قرار دیا جائے، تاکہ وہ خاص گھڑی خود بخود ہمیں میسر آجائے۔

حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ دونوں راوی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ منبر پر فرماتے تھے۔

لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ الْجُمُعَاتِ أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ ثُمَّ لَيَكُونُنَّ مِنَ الْغَافِلِينَ (مسلم)

لوگوں کو جمعہ چھوڑنے سے باز رہنا چاہیے ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ضرور مہر لگا دیگا۔ پھر یقیناً وہ غفلت شعاروں کے زمرہ میں شامل ہو کر رہیں گے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ کس قدر زور دیا جا رہا ہے جمعہ کے اہتمام پر اور جمعہ کے قیام پر۔ یہ تہدید آمیز لہجہ، یہ وعیدوں سے بھرا ہوا انداز خطاب، اور بیان کے تیور، کیا ہمارے دلوں کو ہلا دینے کے لئے کافی نہیں ہیں؟ مگر آہ اے امت مسلمہ کے افراد! تمہاری بد نصیبی... ... کہ پتھر پل جاتے ہیں۔ زمین شق ہو جاتی ہے۔ چٹانیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ مگر تم ٹس سے مس نہیں ہوتے...... جمعہ در اصل اس آفاق گیر زندہ تحریک کا مقدس اور مہتم بالشان تربیتی تنظیمی اور دعوتی اجتماع خاص ہے جس تحریک کے داعی جناب نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جمعہ ہمیں ہمارا نصب العین بھی یاد دلاتا ہے۔ طریق بھی واضح کرتا ہے ہماری تنظیم و تربیت بھی کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی شرکت ہر غیر معذور مرد مسلمان کے لئے لازمی ہے اور اس کا اہتمام امت مسلمہ کے ہر فرد کے لئے ضروری ہے۔ حدیث ہمیں بتا رہی ہے کہ ہماری غفلت شعاریوں کا علاج جمعہ کے شعوری اور مقصدی اہتمام میں پوشیدہ ہے۔ در جمعہ کو بھلا دینا در اصل خود کو بھلا دینا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ فَلْيَتَصَدَّقْ بِدِينَارٍ فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَبِنِصْفِ دِينَارٍ (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہ)

جس نے جمعہ بغیر عذر (شرعی) کے چھوڑا۔ اسے ایک دینار (سونے کا سکہ) ضرور صدقہ کرنا چاہیے اور اگر نہ کر سکے تو نصف دینار (تو ضرور کرے)

اللہ کی اطاعت، رسول کی پیروی اور آخرت کے تقاضوں سے گریز آدمی کیوں کرتا ہے۔ حب دنیا ایں و دبس بھری گانٹھ ہے جس سے انسان غفلتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ دین کہتا ہے جمعہ کا اہتمام کرو۔ شریعت کہتی ہے جمعہ قائم کرو لیکن حب دنیا اور حب مال اس سے باز رکھتی ہے۔ مال کا گرویدہ اور دنیا کا فریفتہ انسان اسلام کے کام کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے جمعہ کی بغیر عذر غیر حاضری پر سونا خیرات کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

آداب جمعہ

(۱) غسل کرنا، وضو اور مسواک کرنا، حجامت بنوانا، ناخون کتروانا، موئے زیر ناف اور بغلوں کے بال صاف کرنا۔

(۲) تیل اور خوشبو استعمال کرنا۔

(۳) مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچنے دینا۔ ان کے درمیان گھسنے کی کوشش نہ کرنا۔ گردنیں پھلانگنے سے گریز کرنا۔

(۴) خطبہ کان لگاکر غور سے سننا اور خاموش بیٹھنا

(۵) ہر لغو حرکت سے پرہیز کرنا۔

(۶) سستی اور بے پروائی سے اجتناب

(۷) جامع مسجد جلد پہنچنے کی کوشش کرنا

(۸) شور و شغب کرنے سے بچنا۔

(۹) اپنا اچھا لباس زیب تن کرنا۔

(۱۰) جمعہ کے واسطے لباس وغیرہ کا اہتمام کرنا۔

(۱۱) جمعہ عموماً اول وقت اور شدید گرمی کے موسم میں تاخیر سے پڑھنا۔

(۱۲) دوپہر کا کھانا اور قیلولہ نماز کے بعد تک مؤخر کرنا۔

(۱۳) دو خطبے دینا اور ان کے درمیان بیٹھنا

(۱۴) خطبہ میں قرآن کے ذریعہ لوگوں کو تذکیر کرنا۔

(۱۵) نماز اور خطبہ کو طول نہ دینا

(۱۶) وقار کے ساتھ بلند آواز سے خطبہ دینا۔

مذکورہ بالا آداب مندرجہ ذیل احادیث سے اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

لَا یَغْتَسِلُ رَجُلٌ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَیَتَطَہَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُہْرٍ وَیَدَّہِنُ مِنْ دُھْنِہٖ اَوْ یَمَسُّ مِنْ طِیْبِ بَیْتِہٖ ثُمَّ یَخْرُجُ فَلَا یُفَرِّقُ بَیْنَ اثْنَیْنِ ثُمَّ یُصَلِّی مَا کُتِبَ لَہٗ ثُمَّ یُنْصِتُ اِذَا تَکَلَّمَ الْاِمَامُ اِلَّا غُفِرَ لَہٗ مَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَۃِ الْاُخْرٰی (بخاری)

جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور اپنی استطاعت بھر طہارت حاصل کرے اور اسے جو تیل یا خوشبو میسر ہو اسے استعمال کرے پھر (نماز کو جائے اور (مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں) کے بیچ میں گھس کر) جدا نہ کرے پھر جو اس کے مقدر میں ہو نماز پڑھے، جب امام خطبہ دے تو چپ رہے تو یقیناً اس کے جمعہ اور دوسرے جمعہ کے درمیانی گناہ (صغائر) معاف کردئے جائینگے

غسل، خوشبو اور تیل کا استعمال مسجد میں لوگوں کو ہٹاکر اور ہٹو بچو کرکے بیٹھنے کی ممانعت اور خطبہ کے دوران خاموش رہنا تو صراحتاً ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن اگر تعمق کی نظر ڈالی جائے تو ناخن ترشوانا، ڈاڑھی، مونچھ اور سر کے بالوں کو سنوارنا، بغلوں اور موئے زیر ناف کو صاف کرنا اور مسواک وغیرہ بھی "اور اپنی استطاعت بھر طہارت حاصل کرے" میں شامل ہیں

(۲) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلعم مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ اَتَی الْجُمُعَۃَ فَاسْتَمَعَ وَاَنْصَتَ غُفِرَ لَہٗ مَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَۃِ وَزِیَادَۃُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ وَمَنْ مَسَّ الْحَصٰی فَقَدْ لَغَا (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس نے خوب اچھی طرح وضو کیا پھر نماز جمعہ کے لئے آیا۔ پس کان لگاکر (خطبہ سنا) اور خاموش رہا تو اس کے اور جمعہ کے درمیان جو صغائر ہونگے وہ سب معاف کردیے جائینگے اور مزید تین دن کے اور بھی اور جس نے کنکریوں کو چھوا اس نے

لغو کام کیا۔

وضو میں ظاہری اور باطنی محاسن حسن نیت اور سنن و مستحبات کا اہتمام کرنا، کان لگا کر خطبہ سننا اور خاموش رہنا اور ہر ایسی حرکت و سکون سے بچنا جس سے لاپرواہی اور سستی ٹپکتی ہو آداب جمعہ میں شامل ہیں۔

(۳) حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

إِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ وَقَفَتِ الْمَلَائِكَةُ عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ يَكْتُبُونَ الْأَوَّلَ فَالْأَوَّلَ فَإِذَا خَرَجَ الْإِمَامُ طَوَوْا صُحُفَهُمْ وَيَسْتَمِعُونَ الذِّكْرَ (متفق علیہ)

جمعہ کے دن فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نوٹ کرتے رہتے ہیں کہ سب سے کون آیا۔ پھر کون اور پھر کون، پس جب امام خطبہ کے لئے آتا ہے تو وہ اپنے رجسٹر بند کر کے رکھدیتے ہیں اور "ذکر" سننے لگتے ہیں۔

اس حدیث سے جہاں ایک طرف عام نمازیوں کو یہ درس ملا کہ جلد پہنچنا چاہیے۔ خطبہ سننے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ وہاں دوسری طرف یہ بھی اخذ ہوا کہ امام کو ایسا خطبہ دینا چاہیے کہ جس سے نمازیوں کی تذکیر ہو ان کی غفلتوں کے پردے چاک ہوں، ان میں جوش اور ہوش پیدا ہو اور ایسی زبان میں خطبہ دینا چاہیے جسے وہ سمجھتے ہوں، ورنہ ان کے پلے کیا پڑے گا۔

اس حدیث سے ان احادیث کا مضمون بھی تازہ ہو جاتا ہے جن میں یہ آیا ہے کہ ہر نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ملتا ہے ایک ہفتہ اور مزید تین دن ملکر ایک جمعہ کا دس گنا ہو جاتے ہیں۔

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلعم إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَنْصِتْ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ رضؓ ہی راوی ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا جب کہ تم نے اس حالت میں کہ امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو اپنے ساتھی سے کہا "چپ رہو" تو تم نے "لغو" کا ارتکاب کیا۔

کتنی اہمیت ہے جمعہ اور اس کے خطبہ کی جناب نبی کریم کی نگاہ پاک میں کہ صرف جلد پہنچنے، کان لگا کر سننے اور خاموش رہنے ہی کی ہدایتوں پر اکتفا نہیں فرمایا جاتا ہے۔ بلکہ دوسرے کو اس کی غلط حرکت پر ٹوکنا بھی غلط اور لغو قرار دیا جا رہا ہے کہ کہیں یہ بے محل نصیحت مجلس کے سکون کو غارت نہ کر دے۔

عَنْ جَابِرٍ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلعم لَا يُقِيمَنَّ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ثُمَّ يُخَالِفُ إِلَى مَقْعَدِهِ فَيَقْعُدُ فِيهِ وَلٰكِنْ يَقُولُ افْسَحُوا (مسلم)

حضرت جابر رضؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں کا کوئی ہرگز نہ اٹھائے اپنے بھائی کو جمعہ کے دن کہ پھر اس کی جگہ خود بیٹھ جائے لیکن (شریفانہ انداز میں کہو کہ فراخی اور کشادگی اختیار کرو (کھِسک کر بیٹھو)

اسلام مساوات کا علمبردار ہے۔ اور اسلامی تاریخ بلکہ اس کی ہر سطر گواہ ہے کہ مساوات اور برابری، اخوت اور بھائی چارہ اسلامی معاشرہ کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے اسلام بھلا اسے کب برداشت کر سکتا تھا کہ اس کے اہم دینی اجتماعات میں (جن میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سوا ایک غرض اخوت و مساوات تربیت اور اجتماعی اوصاف کی تخلیق بھی ہے) "ہٹو، بچو"، "یہاں کیوں بیٹھ گئے" اور "تم پیچھے جاؤ" وغیرہ کی صورت رونما ہو، بلکہ یہاں تو یہ اصول ہے کہ جو پہلے آئے گا۔ وہ پہلی صفوں میں جگہ پائے گا خواہ وہ لُولا، بدصورا، اور مُنوا ہی کیوں نہ ہو اور جو بعد میں آئے گا۔ وہ پچھلی صفوں ہی میں بیٹھ سکے گا۔ خواہ وہ ارباب جبہ و دستار اور صاحبان کرسی و اقتدار ہی کیوں نہ ہوں۔

(۶) عن ابی سعید الخدری رضؓ وابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اغتسل یوم الجمعۃ ولبس من احسن ثیابہ ومس من طیب ان کان عندہ ثم اتی الجمعۃ فلم یتخط اعناق الناس ثم صلی ما کتب اللہ لہ ثم انصت اذا خرج امامہ حتی یفرغ من صلوتہ کانت کفارۃ لما بینھا وبین جمعۃ التی قبلھا (ابوداؤد)

حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے جمعہ کے دن غسل کیا اور اپنے اچھے کپڑے زیب تن کئے اور اگر اس کے پاس خوشبو تھی تو اسے استعمال کیا۔ پھر جمعہ کے لئے آیا۔ پس لوگوں کی گردنیں نہیں پھلانگیں، جو نماز اللہ نے اس کے لئے مقدر کی تھی وہ پڑھی۔ پھر جب امام آیا تو خاموش رہا۔ یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہوگیا تو یہ (اس طرح جمعہ کی ادائیگی) اس جمعہ اور اس پہلے جمعہ کے درمیانی (صغائر) کے لئے کفارہ ہوجائیگی۔

غسل، پاکیزہ لباس، خوشبو، صفائی ستھرائی، طہارت و نظافت وغیرہ وہ کام ہیں جن سے حظ نفس بھی حاصل ہوتا ہے۔ آنکھوں کو اور دل کو سرور بھی حاصل ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کو بھی ایک طرح کا لطف میسر آتا ہے۔ وہ ہمارے اندر ایک کشش پاتے ہیں اور پھر یہ کہ اللہ کے رسول کی پیروی اور اللہ کی عبادت بھی ہے جس سے جذبہ عبودیت کی بالیدگی ہوتی ہے اور گردنیں پھلانگنے سے پرہیز یعنی حقوق العباد کا خیال، خاموشی سے خطبہ سننا اور سننے دینا، نماز کی ادائیگی۔ غرض کہ جمعہ اور اس کا اہتمام بظاہر معمولی سا ہفتہ واری پروگرام ہے مگر درحقیقت اسمیں حقوق النفس حقوق العباد اور حقوق اللہ سب ہی کا اہتمام موجود ہے اور ان حقوق کی ادائیگی سے ہی ہماری معاشرت میں شگفتگی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم ادائیگی حقوق کی اس طرح ہفتہ وار ٹریننگ کرتے رہیں گے تو آخر کار ہماری سوسائٹی میں چار چاند لگ جائیں گے اور وہ جگمگا اٹھے گی۔ اور ان میں حالت بشری کمزوریوں سے جن لغزشوں کا ہم سے صدور ہوگا اللہ تعالیٰ ان سے درگذر فرمائے گا۔

(۷) عن عبد اللہ ابن سلام رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما علی احدکم ان وجد ان یتخذ ثوبین لیوم الجمعۃ سوی ثوبی مھنتہ (امام مالکؒ ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ ابن سلام رضؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا (مشکل) ہے تم میں سے کسی پر اگر حاصل کرسکے تو دو کپڑے محنت و مزدوری کے کپڑوں کے علاوہ جمعہ کے لئے دو کپڑے بنالے۔

ہر غریب سے غریب آدمی اپنے دلچسپ مشاغل اور اپنے ان مواقع اور کاموں کے لئے جنہیں وہ ضروری سمجھتا ہو پیسہ پیسہ جوڑ کر رکھتا ہے اور بہت پہلے سے اہتمام کرتا ہے۔ مائیں لڑکیوں کے جہیز کے لئے ان کی پیدائش کے بعد ہی سے اہتمام شروع کردیتی ہیں۔ بہت سے جہالت کے مارے اور جاہلیت کے شکار باپ بیٹے کی شادی میں رنگ رلیوں کے لئے نہ معلوم کب سے روپیہ جوڑتے ہیں اور ایک رات میں لہو ولعب اور ناچ گانے کی نذر کردیتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے بیت اللہ کے فدائی اور دیار نبوی کے شیدائی غریب ہونے ہوتے بھی پیسہ پیسہ اور کوڑی کوڑی جوڑ کر حج کر آتے ہیں۔ غرض کہ آدمی جس کام اور چیز کو ضروری سمجھ لیتا ہے۔ اس کا اہتمام کرتا ہے۔ حدیث ہم سے کہہ رہی ہے کہ جمعہ ضروری ہے اس کے لئے اہتمام پہلے سے ہونا چاہیے، تم غریب ہو، صاف ستھرے اور اجلے نہیں رہ سکتے تو آٹھویں دن تو اجلا لباس زیب تن کرہی لینا چاہیئے کہ نفس، بندوں اور اللہ تعالیٰ کے حقوق اس سے وابستہ ہیں۔

(۸) عن معاذ ابن انس رضؓ ان النبی صلی اللہ علیہ

حضرت معاذ ابن انس رضؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ

وَسلم نہی عَنِ الحبوۃِ یَومَ الجُمُعَۃِ وَالامامُ یَخطُبُ (ترمذی و ابوداؤد)

وسلم نے حبوہ سے منع فرمایا (حبوہ اس طرح بیٹھنے کو کہتے ہیں کہ دونوں گھٹنوں کو کھڑا کرلیا جائے اور ان کو دونوں ہاتھوں سے گھیرے میں لے لیا جائے) جمعہ کو جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو۔

خطبہ چونکہ ذکر الٰہی اور تذکیر مومن کا ایک بڑا اور بہترین اجتماعی ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس کے سلسلہ میں ذراسی غفلت اور بے پرواہی بھی ایک بڑی چوک ہے اور حبوہ کی بیٹھک سستی اور بے پروائی کی علامت ہے اس لئے اس منع فرمایا گیا ہے

(۹) عَنِ ابنِ عمرؓ قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ عَلَیہِ وَسلم اذا نَعِسَ اَحَدُکُم یَومَ الجُمُعَۃِ فَلیَتَحَوَّل مِن مَجلِسِہٖ ذالِکَ (ترمذی)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں کا کوئی جمعہ کے دن (یعنی انتظار نماز یا دوران خطبہ میں) اونگھ جائے تو اسے اپنی جگہ بدل دینا چاہیئے۔

بیٹھے بیٹھے آدمی پر غفلت طاری ہوجاتی ہے اور وہ اونگھ جاتا ہے اس موقعہ کے لئے ایک نفسیاتی تدبیر تعلیم فرمائی گئی کہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کسی دوسری جگہ بیٹھ جائے تاکہ خطبہ سے پورا فائدہ اٹھا سکے

(۱۰) عَن نَافِعٍ قَالَ سَمِعتُ بنَ عمرؓ یَقُولُ نَہیٰ رسولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وسَلَّمَ اَن یُّقِیمَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِن مَقعَدِہٖ وَیَجلِسُ فِیہِ قِیلَ لِنَافِعٍ فِی الجُمُعَۃِ قَالَ فِی الجُمُعَۃِ وَغَیرِھَا (متفق علیہ)

حضرت نافعؒ فرماتے ہیں میں ابن عمرؓ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ آدمی دوسرے کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود بیٹھ جائے۔ نافع سے دریافت کیا گیا کہ جمعہ میں؟ جواب دیا جمعہ غیر جمعہ سب میں۔

یہ مجلسی ادب صرف جمعہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ہر مجلس اور محفل میں دوسروں کے حقوق اور ان کے آرام و آسائش کا لحاظ کرنا اور ان کو اذیت پہنچانے سے گریز کرنا ضروری ہے۔ خصوصاً جمعہ کے اجتماع میں اللہ کے دربار میں اللہ کی یاد کے لئے اللہ کے فرمانبردار اور وفادار بندے اکٹھا ہوتے ہیں۔ ان کو بھائیوں کی طرح مل جل کر کسر و انکسار کے ساتھ بیٹھنا چاہیئے۔ یہ کوئی دنیا کے حریصوں کا اجتماع نہیں ہے کہ ہر ایک اپنے مفاد کے آگے دوسروں تکلیف پہنچانے سے گریز نہیں کرتا۔ یہ مومن بندے ہیں جن میں ایثار کا جذبہ اور قربانی کی اسپرٹ ہوتی ہے۔

(۱۱) عَن اَنسٍ رضؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کَانَ یُصلِی الجُمُعَۃَ حِینَ تمتَل الشمس (بخاری)

حضرت انس رضؓ راوی ہیں کہ نبی صلعم زوال کے وقت نماز جمعہ ادا فرماتے تھے۔

(۱۲) عَن سَھلِ ابنِ سَعدٍ رضؓ قَالَ مَا کُنَّا نَقِیلُ وَلَا نَتَغَدّیٰ اِلَّا بَعدَ الجُمُعَۃِ (متفق علیہ)

حضرت ابن سعد رضؓ فرماتے ہیں ہم دن کا کھانا اور نہ قیلولہ کرتے مگر نماز جمعہ کے بعد۔

(۱۳) عَن اَنَسٍ رضؓ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صلعم اِذَا اشتَدَّ البَردُ بَکَّرَ بِالصَّلٰوۃِ وَاِذَا اشتَدَّ الحَرُّ اَبرَدَ بِالصَّلٰوۃِ یَعنِی الجُمُعَۃَ (بخاری)

حضرت انس فرماتے ہیں نبی صلعم شدید جاڑے میں نماز اول وقت ادا فرماتے تھے اور جب گرمی شدید ہوجاتی تو نماز ٹھنڈے وقت ادا فرماتے۔ جمعہ کی نماز۔

زندگی کے تمام مراحل میں راست روی کے لئے لازمی اور ضروری ہے کہ ہم ہر آن، ہر لمحہ اور ہر کام میں یہ دیکھیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارک کیا ہے؟ اس کے بغیر نہ ہم قرآن کو صحیح سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کے کسی پہلو میں توازن

اعتدال اور (balance) قائم رکھ سکتے ہیں۔ زندگی کے تمام پہلوؤں میں آج ہمارا معاشرہ بے اعتدالی اور عدم توازن کا شکار ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اسوۂ نبوی کو نظر انداز کردیا ہے۔ نمازوں کے اوقات کے سلسلہ میں بھی آج یہی صورت حال ہے۔ ایک گروہ ہر نماز ہر موسم میں اول وقت پڑھنے پر مصر ہے اور دوسرا ہر نماز ہر موسم میں آخر وقت میں پڑھنے کو ضروری شمار کرتا ہے۔ حالانکہ اسوۂ نبوی اگر سامنے رکھا جائے تو غلو فی الدین سے نجات مل سکتی ہے۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں جمعہ کی نماز اول وقت میں زوال ہونے ہی ادا کی جائے اور شدت گرما میں ایسے وقت جب کہ دوپہر کی شدت گھٹ جائے۔ کھانا اور قیلولہ بھی نماز کے بعد اسی صورت میں آسان ہوگا جب کہ نماز اول وقت ادا کی جائے۔

(۱۴) عن جابر ابن سمرۃ رضؓ قال کانت للنبي صلعم خطبتان یجلس بینهما یقرء القرآن ویذکر الناس فکانت صلوٰته قصداً وخطبته قصداً (مسلم)

حضرت جابر ابن سمرہ رضؓ فرماتے ہیں نبی صلعم دو خطبے دیا کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان بیٹھا کرتے تھے۔ قرآن پڑھتے اور لوگوں کو یاد دہانی فرماتے، آپ کی نماز اور خطبہ دونوں معتدل ہوتے تھے۔

اسلام کی جہاں یہ خصوصیت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نازل فرمودہ نظام زندگی ہے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے کامل ہے، جامع ہے، محفوظ اور مستند ہے عملی ہے۔ ہر زمانہ اور ہر قوم و طبقے کے انفرادی اور اجتماعی دکھوں کا علاج ہے۔ وہیں اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اعتدال اور توازن، عدل، قصد اور میانہ روی ہر معمولی اور اہم کام میں ملحوظ رکھی گئی ہے چنانچہ نماز روزہ اور حج و زکوٰۃ کی عبادات سے لیکر طلاق و نکاح اور سیاست و جہانبانی کے احکام تک میں اعتدال آپ کو صرف جھلکتا ہوا نہیں بلکہ نمایاں نظر آئے گا۔

خطوط اسد ملتانی مرحوم

بنام

عبدالمجید حیرت شملوی

۱

بلاک ۴۹، پاکستان سکریٹریٹ

کراچی، ۲۸ جولائی ۱۹۴۸ء

بسم اللہ

مشفقی و مکرمی حیرت صاحب

پچھلے دنوں عبدالرشید[1] صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ خط انہوں نے نہیں دیکھا۔ علاوہ ازیں بدرالدین[2] احمد کے خط میں اپنی خاموشی کا شکوہ پڑھ کر یقین ہو گیا کہ میرا خط آپ کو نہیں ملا

غزل "بہار آئی ہے"[3] دیکھلی۔

چند روز ہوئے پرویز صاحب نے بھی ایک خط کا ذکر کیا۔ یہ معلوم کر کے رنج ہوتا ہے کہ ابھی تک آپ کی حالت بدستور ہے لیکن اس قدر ہنگاموں[4] میں بفضلہ تعالیٰ آپ کے محفوظ رہنے سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ابھی خدا تعالیٰ کو آپ کی زندگی منظور ہے اور وہ آپ کو ضرور شفایاب فرمائیں گے۔

خوشی ہوئی کہ آپ کا انتخاب اشعار سلامت مل گیا

۲

کراچی، ۸ ستمبر ۱۹۴۸ء

"تاثرات[5] مخفی" پڑھے، اور پرویز صاحب کو بھی پڑھوا دیے۔ عنقریب "فردوس" کے حوالے کر دیئے جائیں گے "تقریر" بھیج دیا گیا ہے صدیقی (لطیف الرحمٰن) صاحب کی معرفت آپ نے محمود[6] الحسن صاحب کو تو چندے کیلئے لکھ دیا۔ مگر طلوع اسلام کہتا ہے کہ کیا اب میری آمدنی کا ذریعہ صرف حیرت صاحب ہی رہ گئے ہیں۔

بدرالدین احمد ملے تھے، کہتے تھے کہ اب جواب لکھوں گا۔ آئندہ پروگرام کے متعلق پرویز صاحب سے بھی مشورہ کیا (اور انہوں نے غالباً آپ کو لکھ بھی دیا ہے) میری رائے بھی یہی ہے کہ بلا تنخواہ رخصت لینا بیکار ہے۔ پنشن کے لئے درخواست دے دینی چاہیے۔ اس طرح کچھ نہ کچھ تو ملتا رہے گا۔ صحت ہو جانے پر دوبارہ ملازمت بآسانی مل سکے گی

---

[1] برادر حیرت، [2] ڈپٹی ڈائریکٹر سول ایوی ایشن پاکستان [3] پھر طبیعت جو گدگدائی ہے　کیا چمن میں بہار آئی ہے

[4] دہلی میں ستمبر ۴۷ء کے خونیں فسادات۔ اس وقت بیماری کا تیسرا سال تھا اور ماتا سندری روڈ نئی دہلی سے پرانے قلعے میں پناہ گزینی۔

[5] ایک مضمون جو فردوس میں نکلا [6] دفتر امیل پاکستان۔ پاکستان پہنچتے ہی سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے یا غالباً اس سے بھی پہلے۔

لیکن بلاتنخواہ رخصت سے رخصت کے عرصے میں کچھ بھی نہ مل سکے گا۔ پنشن کے لئے درخواست بھیج دیجئے۔ ڈاکٹری وغیرہ کے لئے جو کارروائی ضروری ہوگی اس کے بارے میں بعد میں دیکھا جائے گا۔

"ماہ نو" کے لئے وقار عظیم صاحب کو کچھ بھیجوں گا۔ اچھا رسالہ ہے۔ واحدی صاحب کا رسالہ "فردوس" نکل آیا۔ پہلے پرچے میں ایک خط اور غزل شائع ہوئی ہے۔

"زبانِ غم" کے مقدمے کے لئے پرویز صاحب سے ذکر آیا۔ وہ کچھ نہ کچھ لکھ دیں گے۔ وہ ایک دارالاشاعت قائم کر رہے ہیں۔ اس میں اس کی اشاعت بھی شامل ہے۔

ضیاء الدین صاحب غالباً بخیریت پہنچ گئے ہوں گے۔ جلیل صاحب نے ہندوستان کا انتخاب کیا تھا۔ مگر حالات نے پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اس وقت کراچی میں تشریف رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ کسی مکان کی تلاش کرتے کرتے میرے ہاں نکل آئے۔

تازہ غزلیں خوب ہیں .... آپ کے خط کا جواب لکھنے میں بہت دنوں سے آج کل ہو رہی تھی۔ مگر آپ کے اس شعر نے

آج کا کام کل پہ کیوں چھوڑا   آج ہی کیوں اسے نہ کر رکھئے

آج مجبور کر دیا۔

۳

۱۲۵، لارنس روڈ، پاکستان کالونی کراچی
۲۹ ستمبر ۴۸ء

محبی و مکرمی، السلام علیکم

۲۱، اور ۱۶ ستمبر کے خطوط مل گئے

۱۶ ستمبر کے "گزارش"[۱] بالکل موزوں اور مناسب ہے، اس میں جو کمی تھی، وہ آپ کے تازہ اضافے نے پوری کر دی۔

رخصت کے بارے میں یہ ۲۵ سال والا خیال بھی معقول ہے۔ مگر ۲۵ سال کب پورے ہوتے ہیں، بہرکیف اس معاملے میں پرویز صاحب کے مشورے پر عمل کیا جائے، کیونکہ وہ ان قواعد و ضوابط سے زیادہ واقف ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمجید صاحب کا مکان اور دکان اب ایسی جگہ ہے کہ مدتوں ادھر جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان سے ملے کئی مہینے ہو گئے ہوں گے

اور ابھی معلوم نہیں کب تک ان سے ملنے کا موقع ملے۔ امید ہے کہ آپ کے خط کے جواب میں انہوں نے

---

[۱] "آئینہ حیرت" کے لئے یہ نام ذہن میں آیا تھا۔ مگر نام "آئینہ حیرت" ہی بہتر رہے گا۔ مرحوم اختر شیرانی کا تجویز کردہ نام[۲] لیکن یہ بات جناب پرویز صاحب نے کبھی مجھے لکھی نہ میں نے ان سے کبھی پوچھا[۳]۔ حیرت کے اسکول کے زمانے میں ایک نہایت عزیز ساتھی اور دوست ان دنوں محکمہ جنگلات دہرہ دون میں سپرنٹنڈنٹ تھے[۴] "آئینہ حیرت" پر "گزارش" بقلم حیرت۔ مگر اسے مرحوم ہی کے پاس رہی انہیں کے کاغذات میں ہوگی[۵] پنشن کے سلسلے میں مدت ملازمت ۲۵ سال نہیں نکلی ۱۰، ۲۰، ۱۵ اور ۵ رہی اور اسی نسبت سے پنشن ۳۰ (؟) کی تہائی ہے مشہور ہومیوپیتھ۔ حیرت کے بھی ایک مخلص کرمفرما، علاج کیا۔ دوائیں دیں ایک پیسہ نہیں لیا۔ دہلی میں پرویز صاحب کے ساتھ مزاج پرسی کے لئے بارہا مکان پر تشریف لائے۔

کوئی نسخہ تجویز کر دیا ہوگا

دوسرے "تاثرات" بھی صدیقی صاحب کی معرفت واحدی صاحب تک پہنچا دئے گئے "نظام المشائخ" میں شائع ہوں گے۔

۲۱ ستمبر کا آپ نے جو نیا مقطع شامل کرنے کو کہا ہے

اے حیرتِ ناشاد بس اب دل کو سنبھالو اتنا بھی غمِ ہجر میں رویا نہیں کرتے

اس میں "دوا" "وحدت" کے "سنبھالو" کی جمع کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیا ایسا نہ کر دیا جائے۔

بس حیرتِ ناشاد ذرا دل کو سنبھالو

قاضی صاحب کو غزلیں بھیج دیں، تو بہت اچھا کیا۔ ہاں آپ نے کبھی یہ تحریر نہ کیا کہ اردو اشعار کا وہ انتخاب[1] آپ کو واپس مل گیا یا نہیں، اگر مل گیا ہے تو اس کی ترتیب و اشاعت کا بھی انتظام ہونا چاہیے

قائدِ اعظم کے انتقال اور سقوطِ دکن سے یہاں جو صدمہ پہنچا ہے۔ وہ بیان نہیں ہو سکتا بس یہی تشفی ہے کہ ملتوں کا وجود محض افراد سے وابستہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگہبانی خود خداوند تعالیٰ نے ذمہ ہے اسی کا سہارا ہے۔ اللہ بس اور باقی ہوس

پچھلے دنوں اکرم سلمہٗ یہیں تھا۔ آپ کا خط اور غزلیں پڑھتا رہا۔ وہ بھی آپ کی تکلیف کا حال پڑھ کر افسوس کرتا تھا

آج میں نے خط کی پیشانی پر گھر کا پتہ دیا ہے اس لئے کہ شاید میں چند روز میں دفتر کشمیر کمیشن سے پرانے دفتر (وزارت امور خارجہ) میں چلا جاؤں۔ اسلم کی طرف سے سلام

۴

پاکستان سکریٹریٹ۔ کراچی

۱۶ اکتوبر سنہ ۴۸ء

مجتبیٰ و مکرمی حیرت صاحب، السلام علیکم

عارف[2] صاحب کل تشریف لائے تھے، اور "سرکار" کے لئے آپ کی دو غزلیں طلب کیں۔ میں نے تازہ ترین "سرکار نہ ہوتے" اور "صلح و آشتی میں" ان کے حوالے کر دیں۔

دوسری غزل کا ایک شعر "نفی میں" میں نے رد کر دیا ہے، کیونکہ "نفی" کا تلفظ بروزن "تقی" صحیح نہیں۔ بروزن (صلح و آشتی) شمع صحیح ہے

رخصت کے بارے میں معلوم ہوا کہ بے تنخواہ رخصت پنشن کے حق میں شامل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ تجویز بیکار ہے،

---

[1] احقر کے دیرینہ مخلص اور عزیز کرم فرما، قاضی عبدالاحد صاحب بجنوری (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ [illegible] شاہی [illegible]) جن کی فرمائش تھی کہ "آئینہ حیرت" کی ایک نقل ان کے پاس بھی ہونا چاہیے چنانچہ جب ان کے پاس مسودہ محفوظ کر لیا گیا۔ دہلی کے ہنگامہ میں ضائع ہونے سے بچ [illegible] ہے۔ کام ہنوز بہت باقی ہے خدا کو منظور ہوگا تو شاید اس پابندِ بستر مریض کے ہاتھوں پورا ہو جائے۔ ورنہ .... (شمس ملتان)

[2] [illegible] سب سے بڑے بھائی خود اسد بھی تھے [illegible] جناب [illegible] کے بھائی [illegible] ہوا [illegible] ایسے جامد اور سخت ضوابط سے خدا کی پناہ +

۵

پاکستان کالونی، کراچی ، ۲۲ جون ۴۹ء

نفی کو خفی کے وزن پر باندھنے کی سند دیکھی۔ مگر واقعہ ہے کہ زبان کے معاملہ میں حضرت اکبر (الہ آبادی) کی سند کافی نہیں، کیونکہ وہ ظرافت کے پردے میں بہت کچھ آزادی برت لیتے ہیں۔[1] مجھے تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ؎

نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

قاضی صاحب کی تشریف آوری کے بعد[2] آپ کے حسب خواہش احباب کی ایک مجلس مشاورت قائم کر کے "زبان غم" کی اشاعت کے سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھایا جائے گا۔

آپ کی دو غزلیں ساقی کے پرچوں میں نظر سے گذریں۔ ناموافق ماحول کی غمازی کرتی ہیں۔

صدیقی صاحب بار ہا۔ اس معاملے پر غور کر چکے ہیں کہ کس طرح آپ کو یہاں لایا جائے لیکن عملی مشکلات حائل ہو جاتی ہیں۔ آپ کی صحت ذرا اس قابل ہو جائے کہ آپ سفر کر سکیں تو کوئی صورت نکل آئے۔

۶

پاکستان کالونی، کراچی ، ۱۷ اکتوبر ۴۹ء

محب مکرم، السلام علیکم۔

قبلہ قاضی صاحب ایک ماہ سے کراچی آئے ہوئے ہیں۔ اور حسن اتفاق کہ میرے کوارٹر کے قریب ہی قیام ہے۔ یہاں یہ حال کہ اتنے عرصے میں صرف تین چار بار مختصر ملاقات ہو سکی، بہر حال اُنہوں نے میری حالت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، اور انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ میں آپ کی طرف کچھ لکھنے سے کیوں قاصر رہا۔ بات یہ ہے کہ حسب دلخواہ لکھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور سرسری خط سے تسلی، اسی کشمکش میں دن گذرتے چلے جاتے ہیں لیکن اب معلوم ہوا کہ میری اس مجبوری سے آپ کے دل میں میری جانب سے کچھ بدگمانی پیدا ہو چلی ہے۔ آج یہ کارڈ محض اسی کے ازالہ کی غرض سے لکھ رہا ہوں۔ مفصل خط مہینوں سے نامکمل ہی رہ جاتا ہے۔ بہر حال نہ لکھنے سے یہ خیال ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ آپ کا خیال ہی نہ رہا۔ کونسا دن ہوگا جب کسی نہ کسی سلسلے سے آپ کا ذکر نہ آتا ہو۔ آپ بھی بالکل حق بجانب کہ جب تک کچھ لکھا ہوا نہ جائے۔ تو ان احساسات کا کیوں کر علم ہو۔ ادھر یہ عالم کہ لکھنا چاہیں اور لکھ نہ سکیں۔ بہر حال مجھے یقین نہیں آتا کہ میری طرف سے آپ کے دل میں ذرا بھی غلط فہمی پیدا ہو گی۔ — نیازمند، اسد

۷

کراچی ، ۲۷ دسمبر ۴۹ء

مکرمی، السلام علیکم

احمد علی شاہ صاحب سے اسی روز ٹیلی فون پر دریافت کر لیا تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ عبداللطیف صاحب کا پتہ وہ انہی دنوں لکھ چکے ہیں،

غزل مسلسل ہی رہے گی ابتلا کیا پڑھی، ویسے تو آپ کے ہر شعر میں مضمون خاص کی تعمیم ہوتی ہے لیکن یہ مسلسل غزل بہت سی زندگیوں پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔

---

[1] مشورہ تسلیم کر لیا گیا، اس کے باوجود کہ جہاں حضرت اکبر نے نفی باندھا تھا، وہاں ظرافت کا کوئی موقع نہ تھا۔ [2] قاضی صاحب کراچی ہو آئے، مگر ہوا کچھ بھی نہیں، [3] حیرت کے ایک محب اسد صاحب ہی کے دفتر سے وابستہ۔ شاید ڈپٹی سکرٹری ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں۔ امریکہ بھی ہو آئے

[4] حیرت کے ایک اور محب، وطن انبالہ چھاؤنی، تقسیم سے پہلے دفتر آر، ایم، ایس دہلی میں ہیڈ کلرک تھے اس کے بعد راولپنڈی جہلم سے ریٹائر۔

عرصہ ہوا کسی نے مجذوبؒ صاحب کے کلام کا مجموعہ بہم پہنچایا تھا۔ تاکہ میں اس کا دیباچہ لکھوں۔ سات آٹھ ہفتے گذر گئے کچھ نہ لکھ سکا۔ اب پچھلے دنوں ان کے فرزند خواجہ محبوب حسن اور ولی الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مکمل مجموعہ بہم پہنچایا، دیکھ رہا ہوں اور لطف اٹھا رہا ہوں، آپ یاد آ رہے ہیں، آپ کو بھی پڑھ کر سناتا، اور لطف دوچند ہوتا۔ ایک عجیب اور بالکل نئے مضمون کا شعر سنئے ؎

جسم جیسے بے شکن بستر رہا   میں نئے انداز سے مضطر رہا

آجکل جگر صاحب کہیں تشریف فرما ہیں، تین چار ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔

۸ کراچی، ۲۱ جنوری ۵۰ء

مکرمی حیرت صاحب

حضرت جگر سے پھر ملاقات نہ ہو سکی۔ ایکبار تو یہ لطیفہ ہوا کہ جلیل صاحب قدوائی نے دعوت کا انتظام کیا ۳ بجے سے ۶ بجے تک انتظار رہا۔ آدمی بھیجا گیا معلوم ہوا، گھر سے روانہ ہو چکے۔ یہاں آخر مہمانوں نے چاء پی، ایکدوسرے کو شعر سنائے اور مایوس رخصت ہوئے

اب کئی دن سے حضرت جگر لاہور میں ہیں ۲۶ کو دہلی جانا تھا مگر نہ جا سکے۔ ۲ فروری کو ڈھاکہ جانا ہے۔ پہلی ملاقاتوں میں آپ کا ذکر آیا تھا، اب کے ملنا ہوا تو شعر کا[1] معمہ بھی حل کرایا جائے گا۔ توارد بھی غیر ممکن نہیں مگر بہ ظاہر غلطی معلوم ہوتی ہے۔ بیدم مرحوم کا ذکر آیا۔ اور عجیب اتفاق کہ پچھلے دنوں ان کی ایک غزل یہاں بہت کیفیت پیدا کرتی رہی ؎

میں پردہ ہوں تو ترا راز آشکار نہیں	جو پردہ در ہوں تو پھر کوئی پردہ دار نہیں
کبھی خیال کی حد تک تھا یار کا جلوہ	اور اب ہی جلوہ ہی جلوہ خیال یار نہیں
وہ کوہ طور ہو یا سرزمین دل بیدم	جمال یار سے خالی کوئی دیار نہیں

چند روز ہوئے عبد العزیز[2] آ نکلے تھے، اس سے پہلے کچھ عرصہ ملتان بھی رہے ہیں اور اب بھی وہیں کاروبار کا سلسلہ شروع کرنے جا رہے ہیں۔ جم جائیں تو رشید وحید کو بھی بلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

غزل ("پروانے بھی ہیں") "ہمایوں" کے سالگرہ نمبر میں نظر سے گذری، اس میں رنگ حیرت کم نظر آیا

۹ کراچی، ۱۲ جون ۵۰ء

مکرمی حیرت صاحب

حاجی منظور علی یہیں ہیں۔ پچاس لاکھ کا سامان شملے اور دہلی میں چھوڑ کر پہنچے ہیں۔ ایک، دوبار ملاقات کا اتفاق ہوا۔ اب ملے تو آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔ سید حسن ریاض صاحب سے ایک ملاقات ہوئی۔ وہ اردو "ڈان" کے ایڈیٹر

لہ دہلی کی وہ صحبتیں یاد آتی ہیں جن میں حضرت مجذوب (نور اللہ مرقدہ) کبھی سید صاحب یہاں رونق افروز ہوتے تھے۔ کبھی خانۂ حیرت میں اور یہ صحبتیں جن میں لب خود حضرت مرحوم کا ہوتا تھا گھنٹوں چلتی تھیں۔ کبھی کبھی آدھی رات تک۔ حضرت مجذوب بڑے صاحب ذوق و حال بزرگ تھے۔ بڑے صاحب دل۔

[1] یہ شعر — ایک ذرّے کا اگر حسن نمایاں ہو جائے ۔ آدمی کثرت انوار سے حیراں ہو جائے۔ جگر صاحب کے شعلۂ طور میں بھی ہے۔ اور تحیفہ بیدم میں بھی لفظی فرق بہت ہی خفیف

[2] رشید کے بعد حیرت کے چھوٹے بھائی "عزیز"، مگر عجیب چیز ہیں کئی برس سے بے تعلق ہیں۔ تیازہ کچھ معلوم نہیں کہاں ہیں۔ اور کیونکر۔ وحید سے چھوٹے بھائی بمبئی سکرٹریٹ (دہلی) میں ملازم ۔ مالک رام برنس شملہ و دہلی۔ حیرت کے محسن و مربی۔ اب مرحوم۔ خدا کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے بڑے وضعدار صاحب تمیز انسان تھے

تھے۔ معلوم نہیں اب بھی ہیں یا نہیں۔

جلیل صاحب قدوائی اور بدرالدین احمد صاحب سے ٹیلیفون پر بات ہوگئی۔

حیرت کا تازہ کلام "ہمایوں" کے علاوہ "نقوش" میں نظر سے گذرا "کانٹے بچھا دیئے ہیں عزیزوں کی راہ میں"

۱۰

کراچی، ۲۹ اگست سنہ ۵۰ء

مکرمی حیرت صاحب! السلام علیکم

حاجی منظور علی صاحب مدت ہوئی ملے تھے۔ غالباً آج کل لاہور چلے گئے ہیں۔ فلموں کا کاروبار شروع کر رکھا ہے

"فاران"[1] میں آپ کا خط دیکھ کر تعجب ہوا کہ اولاً تو لکھا نہ جاتا اور اگر لکھا گیا تھا تو شائع نہ ہوتا۔ بہر حال جو ہونا تھا ہوگیا...... پرویز صاحب اتفاقاً کل شام بازار میں مل گئے، چونکہ صدیقی صاحب سے معلوم ہوچکا تھا کہ آپ نے براہِ راست خط و کتابت کی ہے اس لئے میں نے اس موضوع پر ان سے بات نہ کی۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ اس خط سے متاثر نہ ہوئے ہوں گے۔

اسمبلی والے محمود الحسن صاحب چند روز ہوئے اتفاقاً سرِ راہ مل گئے، آپ کا ذکر آیا تو "میں نہ کہتا تھا" کے انداز میں بات لی، لہٰذا میں خاموش ہوگیا۔ دوسرے دن محمد ذاکر صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی، ان میں انتہائی ہمدردی پائی، وہ ہر طرح کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کی پنشن کا کیس کسی طرح جلد طے ہو جائے۔ جتنی عملی رکاوٹیں سامنے آئیں۔ سب رفع کر چکے ہیں۔ کیس اب AG CR کے پاس ہے۔

آپ کو خط لکھنے میں ضرور کوتاہی بلکہ مجرمانہ تغافل ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ آپ یاد نہیں آتے، کونسا دن ہوگا اور کون سی صحبت جس میں آپ کا ذکر نہ ہوا ہو۔

آپ کے خطوط میرے پاس سب محفوظ ہیں۔ کسی اور صاحب کو دلچسپی سہی۔ لیکن یہاں بھی ان کی قدر و قیمت کا پورا پورا اندازہ ہے۔

سید حسن ریاض صاحب سے تین برس میں صرف ایک بار اتفاقی ملاقات ہوئی۔

حضرت مجذوب کا کلام مرتب ہوچکا ہے۔ دیباچہ گذشتہ رمضان میں کچھ وقت نکال کر مکمل کر سکا ہوں آغاز آپ ہی کی[2] اردو منزل والی پہلی ملاقات سے کیا ہے

اس طرف سے فارغ ہوکر اب آئینۂ حیرت کا دیباچہ لکھنا شروع کیا ہے۔ انشاء اللہ جلد مکمل کر کے ارسالِ خدمت کروں گا، آپ کی "گزارش" کے صفحات بھی اسی لئے روک رکھے ہیں کہ دونوں چیزیں اکٹھی بھیجی جائیں۔ سخت شرمندگی ہے کہ میں نے نہایت قیمتی تین سال یوں ہی گذار دیے۔ پچھلے دنوں اسی احساس کے تحت کہا تھا ؎

---

[1] "حدیث" پر مجھ کو جناب پرویز کے خیالات سے اختلاف تھا میں نے ماہر القادری صاحب کو لکھا کہ ان خیالات کا رد ضروری ہے سوءِ اتفاق کہ یہ خط فاران میں شائع کر دیا گیا۔ پرویز صاحب کی نظر سے گذرا ہوگا تو انہیں لازماً ملال ہوا ہوگا۔ عجب نہیں یہ خیال ہوا ہو کہ حیرت نے ان پر اس طرح حملہ کیا۔ حالانکہ یہ اختلاف انکی ذات سے نہیں ان کے خیالات سے تھا۔

[2] اور یہ ۔۔۔ خاکسار نے یہ مکان ۔۔۔ میں چھوڑا۔ جائے وقوع اردو بازار (جامع مسجد سامنے ایڈورڈ پارک برابر میں نشاط سینما) بالائی منزل میرے پاس تھی۔ نیچے انہی دنوں "فوجی اخبار" کے زمانے کے ایک دوست صدیق الحسن صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو کر آبسے تھے

کل ہی تو آج بن کے گذر جائے گا یونہی　　قبضے میں تیرے آج نہیں ہے، تو کل کہاں

مختلف رسائل میں کلام حیرتؔ باقاعدہ نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ اکثر اشعار بہ زور حافظے پر نقش ہوجاتے ہیں۔

یہاں کبھی کبھی ریڈیو کے مشاعرے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوتا ہے۔ مگر یہاں کا سٹیشن وہاں شاید نہ سنا جاتا ہو۔ یہاں ہر سنیچر کو رات کے ۱/۲ ۸ بجے مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو سن لیا کیجئے۔

۱۱

کراچی ۲ر نومبر سنہ ۵۰ء

محبی حیرتؔ صاحب

۷ر اکتوبر کے خط میں آپ کی تکلیف کی زیادتی کی خبر پڑھ کر تشویش ہوئی۔ لطیف الرحمٰن صاحب صدیقی کے خط میں پرویز صاحب کے متعلق آپ کی رائے نظر سے گذری

"طلبگار بہت ہے" والی غزل واقعی بہت خوب ہے لیکن مقطع ذرا ......

ایکدن شملے والے سید احمد صاحب[۱] (احاطہ مولوی صاحب، کارٹ روڈ، شملہ) تشریف لائے تھے آپ کو پوچھا، اور پتہ لے گئے۔

کراچی - ۵ فروری ۵۳ء

مشفقی و مکرمی! اب کے ملتان پہنچا تو تھکی ہوئی طبیعت نے کچھ یہ طے کر دیا کہ ملاقاتیں اور باتیں ہی رہیں اور قلم کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ چنانچہ جو خطوط ساتھ لے گیا تھا، ویسے ہی واپس لے آیا، واپسی میں گاڑی میں سوار ہوتے ہی کھڑکی کا شیشہ ہاتھ پر گر گیا۔ اور دو انگلیاں زخمی ہوگئیں جنوری کے آخر تک پٹی بندھی، انگشت شہادت شہید ہونے سے بچ گئی تھی، سو اس کی مدد سے دستخط کرنے کے قابل رہا۔ اور دفتر سے مزید رخصت لینے کی ضرورت نہ پڑی، مگر باقی تمام تحریری کام بند رہا ——— پچھلے ہفتہ بدر الدین احمد صاحب نے ٹیلیفون پر "اسد صاحب الضّامن" سنایا اور ساتھ ہی آپ کی غزل (نجات کب ہوگی، رات کب ہوگی) بہت اثر ہوا، خاص طور سے

دوسرے بھی کہیں کہ ہاں کچھ ہے　　ہم میں پیدا وہ بات کب ہوگی

تو لاجواب ہے، کئی روز تک اس شعر کی کیفیت دل پر طاری رہی۔

آپ کا ۱۵ر فروری کا کارڈ بھی مل گیا۔ اور "کب ہے، غضب ہے" والی غزل بھی، اب دونوں خطوط کو سامنے رکھ کر جواب لکھتا ہوں ———!

۱۲

کراچی، ۱۹ر دسمبر ۵۵ء

محبی حیرتؔ صاحب، السلام علیکم

ان دنوں ہمشیر کی علالت کے باعث پریشانی رہی، جواب تک جاری ہے۔ سب علاجوں کے بعد آپریشن کا فیصلہ ہوا ہے، خدا خیر کرے۔ ان دنوں کوئی کام نہیں ہوسکا۔ دیباچہ درمیان ہی میں رکا پڑا ہے اپنا انتخاب بھی سردست نہیں بھیج سکتا۔ انشاءاللہ اگلے خط میں مجذوب صاحب کا انتخاب ناصر میاں

---

[۱] سید احمد صاحب ابن سید عبدالغفور صاحب مرحوم ابن سید عبداللہ مرحوم۔ وسیع عریض "احاطہ مولوی صاحب" انھوں کی جائداد کے وارث۔ اب نہ معلوم کہاں ہیں۔ اور کیونکر۔ مولوی سید عبدالغفور صاحب مرحوم۔ جامع مسجد شملہ

(ابن مولوی[1] عبدالرب صاحب) کے سپرد کیا تھا۔ وہی بھیج رہا ہوں، انتخاب میں سے انتخاب آپ کا کام ہے
سید[2] وزیر الحسن صاحب کا پتہ: دانش گاہ طہران، ایران، تازہ غزل، حساب کیا ہوگا۔ بہت خوب۔ برنی صاحب[3] کو آپ کے خط دکھا دیا کرتا ہوں، آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

پچھلے نمکدان[4] میں "اخبار الموڈک نظر سے گزرا" دھڑ دھڑ، کھڑ کھڑ کے نغمے کا جیوں نے خوب لطف اٹھایا
چند مہینے ہوئے کیفی[5] جام پوری نے (جام پور ملتان کے علاقے میں ہے) آپ کی ایک غزل پر تنقید لکھی تھی

۱۳　　کراچی، ۵ فروری سنہ ۵۱ء
مجتبیٰ و مکرمی حیرت صاحب

ہمشیر ڈیڑھ دو مہینے تو ملتان کے ہسپتال میں داخل رہیں۔ پچھلے ہفتے آپریشن کے لئے لاہور بھیجی گئیں۔ آج اطلاع آئی ہے کہ کل آپریشن ہوگا۔ خدا کامیاب کرے۔

مجید لاہوری آپ کے بہت مداح ہیں۔ وہ تو ایک دن کہتے تھے کہ اگر آپ یہاں پہنچ جائیں تو "نمکدان" کی ادارت آپ کے سپرد کردیں۔ (مگر اس خیال پر عمل مجید صاحب کی سب سے بڑی غلطی ہوتی، "نمکدان" ایسے پرچے کی ادارت اس مجید کے بس کی نہیں۔ اس کے لئے تو مجید لاہوری ہی موزوں تھے، ہر کارے و ہر مردے۔ حیرت)

ہاں، "مخزن" میں تنقید شفقت کاظمی کی طرف سے تھی۔ وہ بھی ڈیرہ غازی خاں کے خوش فکر شاعر ہیں مولانا حسرت موہانی کے رنگ میں خوب لکھتے ہیں۔

"کشکول مجذوب" کا نسخہ مجھے بھی ملتان میں مل گیا، نہ صرف کتابت و طباعت معمولی ہے۔ بلکہ مجموعۂ کلام بھی بالکل نامکمل ہے۔ بہرکیف شائع تو ہوگیا۔ پاکستانی ایڈیشن یقیناً اس سے بہتر ہوگا۔

پچھلے مہینے مداح[6] صاحب کا خط پہنچا آج انہیں بھی رسید لکھ رہا ہوں
آپ کے دریافت کردہ چار امور کا جواب یہ ہے

(۱) "آئینۂ حیرت" کا مقدمہ رات ختم کیا ہے۔ (۲) اپنے اشعار (ردیف الف) کا ابھی انتخاب نہیں ہو سکا (۳) آپ کی پنشن کے سب مراحل طے ہو چکے ہیں۔ صرف تبادلۂ[7] زر کے مسئلے نے رکاوٹ پیدا کر رکھی ہے۔ یعنی ہاتھی تو نکل چکا ہے۔ مگر اس کی دم اٹک گئی ہے (۴) ان جلبوری[8] صاحب کا نام تو یاد نہیں۔ مگر تخلص مجنوں تھا

بدرالدین احمد صاحب بتاتے تھے کہ آپ کی طرف (اردو پر اس قدر عبور کے باوجود قلم سے "طرف" نکل گیا۔ حیرت) یا شاید آپ کا جواب آچکا ہے۔

---

[1] حیرت کے دیرینہ کرمفرما، جنکا نام اب کچھ دن ہوئے "طلوع اسلام" پر بحیثیت مدیر نظر آیا [2] دہلی میں بارہا کرم فرمایا، ایران گئے، بھول گئے، دو ایک عریضہ لکھا، یاد دہانی پر یہاں جواب ندارد [3] ضمیر الحسن صاحب برنی بی اے (علیگ) علیگڑھ میں اختر سے سینئر تھے، نئی دہلی 'ماتا سندری روڈ' پر پڑوسی تھے [4] "نمکدان" کراچی - تیسرا دور چوتھا شمارہ [5] کیفی جام پوری نہیں، جناب شفقت کاظمی ڈیرہ غازی خاں - یاد آیا کہ کاظمی صاحب کی اس مخلصانہ "شفقت" کا جواب حضرت جوش ملسیانی نے دیا تھا، مگر یہ یاد نہیں کہ وہ شائع کس رسالے میں ہوا [6] حضرت مداح (غلطی سے مشہور "حق" پھپھوندوی) جب سلامت تھے آج مرحوم ہیں [7] آہ یہ مسئلہ تبادلۂ زر [8] نام ہے مولوی عبدالصمد صاحب، شملے میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ پھر برسوں بے خبری رہی یہ ہی نہ تھا کہ کہاں ہیں اور کیونکر، لیکن جب سے پتہ چلا، مراسلت جاری ہے۔

۱۴ کراچی ۲۷ر فروری سنہ ۵۱ء

محبی و مکرمی حیرت صاحب -

ہمشیر کا آپریشن ۲۰ر کو ہونا تھا - مگر اس سے پہلے خون چڑھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دباؤ بالکل کم ہو گیا - حالت بالکل نازک ہو گئی - ڈاکٹر تو مایوس ہو چکے تھے - مگر خداوند تعالیٰ کی مہربانی سے دوبارہ زندگی مل گئی - اب آپریشن تین مہینے کے لئے ملتوی ہو گیا ہے - غالباً اسی میں بہتری ہو گی - دعا کرتے رہیں -

حاجی منظور علی صاحب کا پتہ :- تائب اینڈ کمپنی، آرمی پریس، وکٹوریا روڈ، کراچی -

جعفری صاحب (مشہور ظریف شاعر) لاہور گئے ہیں، واپسی پر "مکلی" غزل کے لئے یاددہانی کروں گا تاریخیں ضرور بھیجوں گا - سردست یہ کارڈ محض یہ خوشخبری سنانے کے لئے ہے کہ تبادلۂ زر کا مسئلہ طے ہو گیا کل میں نے آپ کے دفتر اسمبلی میں تاکید کر دی کہ پنشن کے کاغذات آپ جلد سے جلد مکمل کرا دیں - تاکہ ادائیگی شروع ہو جائے - معلوم ہوا ہے کہ پنشن کوئی سو روپے کے قریب ہوتی ہے - شرح کی رو سے آپ کو وہاں ۱۴۴ کے قریب ملا کرے گی[1] - یہ بھی غنیمت سمجھنا چاہیئے -

۱۵ کراچی، ۱۵ر مئی سنہ ۵۱ء

محبی و مکرمی حیرت صاحب، السلام علیکم

"آجکل" نظر سے نہیں گذرتا، البتہ پچھلے دنوں ایک بین المملکتی مشاعرے کے سلسلے میں عرش، آزاد (جگنناتھ) مرحوم واختر[2] (پنڈت ہری چند) سے ملاقات ہو گئی - عرش صاحب سے تفصیلی باتیں ہوئیں، آپ کا ذکر بھی رہا -

حاجی منظور علی صاحب ایک شادی پر مل گئے تھے آپ سے خط و کتابت کا ذکر آیا - معلوم ہوا مرگی میں ان کی ٹانگ پر فالج کا حملہ ہوا جس کی شدت تو کم ہو چکی ہے - مگر اثرات ابھی باقی ہیں، یہ وجہ تھی انکے مختصر اور بے دستخط خط کی -

کمیوٹیشن[3] (Commutation) کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ناممکن ہے، اس کی بنا ر اچھی صحت ہوا کرتی ہے جب پنشن قبل از وقت محض خرابی صحت کی بنا پر منظور ہوتی ہے تو کمیوٹیشن کا سوال ہی نہیں اٹھ سکتا - بس بقایا سابقہ ہی پر اکتفا کرنا ہو گا -

پسندیدہ[4] کتابوں کی فہرست اور چیدہ تاریخیں میرے ذمے باقی رہ گئیں -

کچھ عرصہ سے سخت پریشانیوں کا سامنا ہے دعا کیجئے -

مولانا حسرت موہانی بھی چل بسے بہت افسوس ہوا - بالخصوص اس لئے کہ ملاقات ابھی حال ہی میں تازہ ہو گئی تھی -

---

[1] مگر یہ کیا معلوم تھا کہ پورے تین برس بعد ۵۴ء میں جب پنشن ملنے کی نوبت آئے گی تو ۱۰۰/- کے ۱۰۰/- ہی ملیں گے - ۱۰۰/- کے ۱۴۴/- نہیں جب یہ صورت سامنے آئی تو معاً یہ شعر یاد آیا ؎ از چشمہ کہ یاراں شرے بدام کردند چوں نوبتے بما شد کہ آتش بجام کردند

[2] اب یہ اختر بھی "انجہانی" اختر ہیں [3] یک نہ شد دو شد یعنی معذوری کی پنشن کا گنہگار جو خیال رہا اور جب بڑھتی عمر کیساتھ ساتھ اخراجات کا بار بڑھ رہا تو وہ کمیوٹیشن کی رعایت کا بھی حق دار نہیں، کوئی بتائے کہ وہ ابھی کوئی مصیبت دور کرے تو کیسے؟ کمیوٹیشن کی بنا "اچھی صحت" معذوری کی سزا اس سے محرومی - ضوابط کی بنیاد میں نہ اخلاق نہ ہمدردی [4] ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کے نزدیک اردو نظم و نثر کی کونسی کتابیں بہترین ہیں -

۱۶

کراچی، ۳ر اگست سنہ ۵۱ء

مکرمی حیرت صاحب

۴ر اگست کا کارڈ ملا، اس میں رامپور[1] جانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔ اس لئے میں انتظار میں رہا کہ آپ وہاں پہنچ جائیں تو جواب لکھوں، بارے اب معلوم ہوا کہ آپ وہاں پہنچ گئے۔ داغ نے کہا تھا ؎

لوگ اسے رامپور کہتے ہیں ہم تو آرام پور کہتے ہیں

خدا کرے یہ شعر آپ کے بھی حسب حال ثابت ہو، اور بیماری سے آرام آجائے۔

میر[2] مرتضیٰ علی صاحب کا کوئی خط مجھے تو ملا نہیں۔ جناب[3] شوکت حسین خاں صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام نیاز غائبانہ

۱۷

کراچی، یکم اکتوبر سنہ ۵۱ء

محبی و مکرمی حیرت صاحب۔

پنشن کے متعلق یہی خبر ملتی تھی کہ A.G.C.R. کو مکمل ہدایات دی جا چکی ہیں، مزید تحققات سے پتہ چلا کہ Claims Organisation کو لکھا ہے، وہاں انچارج خواجہ[4] غلام صادق ہیں، ان سے پوچھا تو کہا حیرت صاحب تو ماما سندری روڈ پر میرے ہمسایہ تھے ان کا خیال رکھتے ہوئے میں نے ذرا بھی دیر نہیں ہونے دی۔ اور گذشتہ اپریل ہی میں کاغذات مکمل کر کے ہندوستان روانہ کر دیئے۔

ان سے ایک افسوسناک بات یہ معلوم ہوئی کہ پنشن کے متعلق دونوں حکومتوں میں جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے شرح مبادلہ کا لحاظ نہ رکھا جائے گا اور برابری کا حساب ادا ہوگا، یعنی یہاں جو آپ کی پنشن -/۱۰۱[5] مقرر ہوئی ہے۔ وہاں بھی -/۱۰۱ ہی ملے گی -/۱۴۴ نہ ملے گی، جیسا کہ پہلے خیال تھا۔ بہر حال جب دونوں طرف کے لئے ایک ہی قاعدہ مقرر ہو گیا تو اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا

رامپور کی فضا کا اچھا اثر پڑا ہے تو انشاء اللہ آب و ہوا کا بھی اچھا اثر پڑے گا، عرشی صاحب خوب آدمی ہیں، ان سے جامعہ ملیہ کی جوبلی کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی۔ جبکہ انہوں نے اردو میں پشتو کے اثرات پر مقالہ پڑھا تھا، پھر ملاقات ہو۔۔ تو میری طرف سے بھی سلام پہنچا دیئے گا۔

۱۸

کراچی ۱۶ر جنوری سنہ ۵۲ء

محب مکرم، حیرت صاحب

اس اطلاع سے قدرے تسلی ہوئی کہ رامپور میں آپ کو اچھی علمی صحبتیں میسر آرہی ہیں ماہی صاحب کا حال بھی سنا

---

[1] تاریخ ورود رامپور، ۲۲ جولائی سنہ ۵۱ء اتوار۔ وجہ ورود محض مشیت الٰہی لطیفۂ غیبی۔ مگر یہ بھی ہے ایک غیبی لطیفہ، کہ ہے حیرت شملوی رامپوری

[2] میر مرتضیٰ علی صاحب، حب سلامت اب مرحوم۔ حیرت ایک محب مخلص

[3] جنہوں نے محب مکرم قاضی عبدالواحد صاحب بجنوری کی تحریک پر حیرت کو رامپور بلایا اور اپنے یہاں ٹھیرایا۔ پھر سنہ ۵۶ء میں نہ معلوم کیوں کشیدہ ہو گئے۔ ایسے کشیدہ کہ برسوں کے تعلقات ایک منٹ میں ختم۔ انا للہ [4] خواجہ صاحب حیرت کو پہلے بھی جانتے تھے، نئی دہلی میں پڑوس نوبت بعد کی بات ہے [5] اصل پنشن -/۱۰۱ نہیں -/۴/۱۳۶ ہے۔

ان کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں ان کا یہ شعر آجاتا ہے ؎

اندازہ ترا کیا ہو، وہ کیا جانئے کیا دے
رکھ ظرف تمنا یونہی اس در پہ صدا دے

یہ بھی سننے[1] میں آیا کہ اب آپ لکڑی کے سہارے چلنے لگے ہیں۔ ایک افسوس ناک خبر[2]، آپ کے دوست ضیاء الدین احمد کا پچھلے دنوں اچانک انتقال ہوگیا، دل کی بیماری تھی، ایک دن سب مایوس ہو چکے تھے ایکدن آکسیجن دینے سے صحت عود کر آئی، لیکن ایک ہفتے بعد حرکتِ قلب بند ہوگئی۔

۱۹

کراچی، ۲۶ مارچ سنہ ۵۲ء

محب مکرم، حیرت صاحب

آپکے پہلے خط میں ضیاء الدین احمد کی وفات کا افسوس تھا۔ مگر مرحوم تو مولوی سر محمد یعقوب مرحوم کے عزیز تھے۔ اور انفرمیشن آفیسر نہ کہ ظہور الدین شاہ صاحب کے بھائی، ان کو تعزیت کا خط ملا تو وہ تعجب میں ہے شاید مجھے اطلاع دینے میں غلط فہمی ہوئی یا آپ کا ذہن دوسری طرف گیا ——————

—————— (یہ لطیفہ بھی خوب رہا کسی کی جان گئی، آپ کی ادا ٹھیری۔ ذہن دوسری طرف کیسے منتقل نہ ہوتا، جبکہ لفظ "دوست" حیرت کے ذہن میں صرف ایک ہی ضیاء سے وابستہ تھا —— دوسرے ضیاء، دوست نہ سہی شناسا ضرور تھے، خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ حیرت)

والدہ ماجدہ کا صدمہ اچانک اٹھانا پڑا کچھ ایسی بیمار بھی نہ تھیں۔ پچھلے مہینے چند دن علالت کی اطلاع کے بعد ایک دن یکایک ٹیلیفون آیا کہ حالت اچھی نہیں، بہتر ہو کہ سب آجائیں۔ چنانچہ ۲۲ فروری کو سب کو ساتھ لیکر روانہ ہوا۔ ۲۳ کو ۳ بجے ملتان پہنچا، تو اسٹیشن پر اطلاع ملی کہ صبح ۸ بجے حرکتِ قلب بند ہوگئی۔ بس اتنا غنیمت ہے کہ منھ دیکھ لیا، اور تجہیز و تکفین میں شریک ہو سکا۔ مرقد پر پہنچا تو شعر ہوا۔

تخلیق و تربیت میں اسد کے وجود پر
احساں ترا ہی سب سے زیادہ خدا کے بعد

والدہ مرحومہ کو آپ سے بڑی ہمدردی تھی۔ خط آنے پر حال دریافت فرمایا کرتیں اور صحت کے لئے دست بدعا ہوتیں کیا خبر تھی کہ خود ان کی صحت اس قدر جلد جواب دینے کو ہے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

پچھلے دنوں بدر الدین احمد صاحب، یا صدیقی صاحب کے نام جو خط آیا اس میں لکھا تھا کہ اب لیٹنے کے بجائے بیٹھ کر لکھنے کی توفیق ہوئی ہے۔ یہ سنکر امید بندھی ہے کہ انشاء اللہ چلنے پھرنے کی طاقت بھی آجائے گی۔

پچھلے دنوں ایک بین المملکتی مشاعرہ ہوا جس کی صدارت نیاز صاحب فتحپوری نے فرمائی، اور فراق جوش وغیرہ نے شرکت کی، افسوس کہ میں اپنے حادثے کے باعث اسمیں شریک نہ ہو سکا۔ ایک آدھ نجی مجلس کی دعوت بھی ملی، مگر نہ جا سکا۔

---

[1] یہ نوبت آئی تو تھی اور اسے جاری بھی رکھا۔ مگر تکلیف و تعب میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ کمی نہ جب تھی نہ اب ہے، حالانکہ اب سنہ ۱۹۶۰ء ہے

[2] اس وقت تو بے ساختہ ایک آہ دلدوز سینے سے نکلی اور کئی دن قلب پر اس کا اثر رہا، مگر تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ضیاء الدین وہ تھے محکمہ اطلاعات والے ضیاء الدین، خدا مغفرت فرمائے۔ رہے حیرت کے سکول کے زمانے کے ساتھی اور دوست سید ضیاء الدین سو وہ الحمد للہ سلامت ہیں، خدا سلامت ہی رکھے۔

۲۰ کراچی، ۱۴ اگست ۵۲ء

مشفقی و مکرمی

جنوری کے اپریل میں میرے خط پہنچنے پر آپ نے لکھا ہے

آپ نے بھی تو ہم غریبوں سے بے نیازی کی انتہا کر دی (جبرت)

اب یکم اپریل کے بعد ۱۴ اگست کو لکھ رہا ہوں، ظاہر ہے کہ "بے نیازی" کی انتہا پہلے نہیں ہوئی تھی، ورنہ اس سے زیادہ تاخیر نہ ہو سکتی۔

جلیل صاحب قدوائی سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نوائے سینہ تاب کا تحفہ مجھے بھیجا، لیکن میں ابھی تک اس کی رسید تک نہیں بھیج سکا۔ جی چاہتا تھا کہ اس پر کچھ تبصرہ کروں۔

بدرالدین احمد صاحب سے ملاقات کبھی محفل غیر میں ہو جاتی ہے۔ صبر رہا ہے ... کا امکان نہیں۔

پرویز صاحب ایبٹ آباد سے واپسی پر ریٹائر ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا کام آپ کو پسند نہ آئے، گزشتہ مجلس ایوبی میں وہی موضوع سخن تھے۔ اس قدر بلند، پختہ، حتمی اور مسکت تنقید تھی کہ آپ سنتے تو بہت خوش ہوتے، ہاں جلیل قدوائی پچھلے دنوں تنزل کے اندیشے سے ملازمت سے بیزار تھے لیکن بفضلہ تعالیٰ ان کا تبادلہ اسی درجے پر ہوا، اور اندیشہ غلط نکلا۔ چنانچہ اب کسی حد تک مطمئن ہیں۔ بیزاری کا جذبہ جاتا رہا۔

۲۱ کراچی، ۲۷ اگست ۵۲ء

مجبی جبرت صاحب

اسدؔ پھر جذب باہم کے اثر سے ادھر سے ہم چلے جبرت ادھر سے

میرا ۱۴ اگست کا خط آپ کو ۱۱ اگست کو ملا اور آپ کا ۹ اگست کا خط مجھے ۱۶ اگست کو، دو روز بعد آپ کا ۱۲ اگست کا کارڈ بھی مل گیا۔

ظہور شاہ صاحب سے بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر ضیا صاحب مجلس ایوبی میں برابر تشریف لایا کرتے ہیں

"دعوۃ الحق" کے بارے میں تعجب ہے کہ مولانا احتشام الحق صاحب نے آپ کو جواب کیوں نہ دیا۔ ان کے بھائی مولوی عزیز الحق صاحب کا پتہ یہ ہے:۔ ڈپٹی سکریٹری ورکس ڈویژن، کراچی

"نمکدان" اب مہینے میں ایکبار نکلنے لگا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب (ہومیوپیتھ) دوبارہ یورپ اور امریکہ کی سیر کے لئے تشریف لے گئے ہیں، اس دفعہ خاص طور پر جرمنی کا قصد تھا، فنی اور تجارتی غرض سے، عنقریب واپس آنے والے ہیں .... مولوی عبدالرب صاحب قریب ہی رہتے ہیں، وقتاً فوقتاً تشریف لایا کرتے ہیں، وظیفہ پا کر آزاد ہو چکے ہیں۔

لہ ابھی چند مہینے ہوئے، ایک غزل ہوئی۔ اور اس میں بے ساختہ یہ شعر

عبد صنم تو عبد صنم ہیں بہک رہے ہیں عبدالرب تک

اور یہ اس لئے کہ ہمارے مولوی عبدالرب اِدھر نہیں اُدھر ہیں، یعنی ....

مجلس ایوبی کی بات یہ ہے کہ مولانا محمد ایوب صاحب دہلوی، جنکا ذکر غالباً صدیقی صاحب کے ذریعہ آپ تک پہنچ چکا ہے، ہر دوسرے اتوار کو میرے یہاں تشریف لاتے ہیں۔ ظہر و عصر کے درمیان اہل ذوق حضرات جمع ہو جاتے ہیں۔ اور مولانا کسی موضوع پر تقریر فرماتے ہیں، سال بھر سے زیادہ ہو گیا ہے کہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ تقریر کے معیار کے متعلق اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ اس پائے کے مضامین کبھی اور کہیں سننے میں نہیں آئے۔ مولوی عبدالسلام صاحب نیازی دہلوی سے بس اتنا فرق ہے کہ ان میں قلندرانہ انداز زیادہ تھا، اور یہاں عالمانہ شان نمایاں ہے۔ موضوع میں ہمیشہ متانت اور علمی ترتیب قائم رہتی ہے۔ اور حاضرین کے معیار فہم سے بے نیازی نہیں ہوتی۔ بلکہ کوئی نکتہ پوری طرح سمجھائے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ اکثر اپنا مقصد یہ بیان فرمایا کرتے ہیں کہ دین کے بارے میں کسی کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو تو اسے علمی طور پر دور کر دوں۔ آگے ہدایت خداوند تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اتنے عرصے کا تجربہ یہی ہے کہ مولانا اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہتے ہیں۔

مولانا کا ایک یہ مقولہ خوب ہے کہ عقل کے صحیح استعمال کا نام دین ہے، اور غلط استعمال کا نام فلسفہ۔ ان کی زبان سے بہت سی ایسی باتیں سنی ہیں جنہیں "ادبیات ایوب" کہا جا سکتا ہے۔ وسعت اتنی کہ ان کا احاطہ تحریر میں آنا مشکل ہے کاش کہ آپ بھی یہیں ہوتے، اور مجلس میں شرکت کرتے۔

پرویز صاحب کئی بار مولانا کی تقریر کا موضوع بنے ہیں۔ ان کا فیصلہ قریب قریب وہی ہے جو آپ کا
صدیقی صاحب کے متعلق فکر نہ کیجیے، ان کا مسلک غالباً اسی حد تک ہے کہ بقول اکبر ؎

ہاتھ میں ان کے میں اپنا ہاتھ دے سکتا نہیں — داد دے سکتا ہوں، لیکن ساتھ دے سکتا نہیں

تلفظ کی غلطیاں جو آپ نے دیکھیں، افسوس ہے کہ ان میں ایک دو غلطیاں میری بھی ہیں، مثلاً معلوم نہیں "سمت الراس" میرے قلم سے کیونکر نکل گیا۔ کیونکہ "سمت الراس" تو ایک طرف رہا۔ لفظ سمت بھی کلام پاک میں کہیں نہیں آیا۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ حوالہ میرے قلم سے کیوں کر نکل گیا۔ اسی غلط فہمی کا کرشمہ ہے یا کیا، بہرحال نہایت افسوس ناک مضمون میں ہمہ دانی کا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ غالباً اسی کی سزا ملی ہے۔

اے۔ آر۔ صوفی صاحب وہ ہمارے والے صوفی صاحب نہیں ہیں۔ یہ ایم آئی صوفی (محمد اسمٰعیل صوفی ہیں، اور آجکل وزیر اعظم کے اسسٹنٹ سکریٹری ہیں) وہ اے۔ آر صوفی (عبدالرحیم صوفی) ریلوے بورڈ میں اکاؤنٹس آفیسر تھے کبھی قادیانیت کی طرف مائل تھے، پھر اسلامی جماعت کے سرگرم رکن بن گئے۔ ایکدن میرے ہمراہ مولانا عبدالسلام صاحب نیازی دہلوی سے بھی ملنے گئے تھے۔ چوہدری محمد علی صاحب، ممتاز حسن صاحب اور اے ڈی اظہر صاحب بھی ساتھ تھے۔ دو تین گھنٹے صحبت رہی، بہت متاثر معلوم ہوتے تھے۔ دہلی کے بعد پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیونکہ پاکستان بننے پر دیر تک بنگال میں رہے، آجکل غالباً راولپنڈی میں ہیں۔ سید نیاز قطب صاحب کا پتہ قاضی صاحب کیا چلائیں گے ان کا پاکستان بننے سے پہلے ہی انتقال ہو چکا۔ خوب آدمی تھے، خدا مغفرت فرمائے (آمین۔ واقعی خوب آدمی تھے بڑے اچھے بزرگ صاحب ذوق و شعر پسند۔ نیاز شملے میں حاصل ہوا تھا۔ مرحوم نے اپنی کوٹھی [illegible] میں اسد صاحب، جلیل قدوائی اور احقر کو مدعو کیا اور احقر نے جب یہ زحمت دی تو خود بھی بلا تکلف غریب خانہ پر تشریف لائے۔ مرحوم کو احقر کا یہ شعر بہت پسند تھا۔ ......

سر کٹا کر ایک مرد با خدا نے صبر سے
تا قیامت خنجر قاتل کے ٹکڑے کر دیئے — یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ شعر مرحوم کو کیوں پسند تھا۔ حیرت)

ے لیکن ایسا ہوا نہیں، بلکہ ہوا یہ کہ ...... یہاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں۔ بہرحال اس انقلاب سے صدیقی اور حیرت کے دوستانہ روابط میں کوئی فرق نہیں

تسکین قریشی

سلام بدرگاہ خیر الانامؐ

سرورِ دو جہاں، السلام السلام — عرش تمکین و طیبہ مقام السلام
پیکرِ نور و حسنِ تمام السلام — خاص محبوب رب الانام السلام
ہادیِ دینِ معجز نظام السلام — اے سراپا کتاب و کلام السلام
اشرف الخلق و خیر الانام السلام — فخرِ آدم علیہ السلام السلام
السلام اے دعائے خلیلؑ و ذبیحؑ — اے تجلی بیت الحرام السلام
خاتم الانبیاءؐ، مرحبا، مرحبا! — سید المرسلینؐ السلام السلام
معنی و مقصدِ کن فکاں بالیقیں — مظہرِ اولیں لاکلام السلام
مسند آرائے بزمِ وجود و شہود — حق طلب، حق نما، حق مقام السلام
مطلعِ نورِ خورشیدِ عالم فروز — منبعِ حسنِ ماہِ تمامؐ، السلام
عاشقِ ذات و محبوبِ مولا صفات — بندۂ خاص و آقائے عام السلام
احمدؐ، حامدؐ، مصطفےٰ مجتبیٰ! — السلام، السلام، السلام، السلام
راحتِ جانِ مشتاق روحی فداک — مونسِ قلبِ ناشاد کام السلام
اے کہ ہر لحظہ ذکرِ پاکِ حضورؐ — ضامنِ زندگیٔ دوام، السلام
آپ پر ختم ہے شانِ محبوبیت — آپ ہیں عبدیت کے امام السلام
ہیں سراپا گناہ، الاماں الاماں — آپ رحمت پناہ، السلام السلام

دور و درماندہ بیچارہ تسکیں سہی
ہے مگر آپ ہی کا غلام، السلام

"بادۂ کہن"

حضرت صوفی منیری تلمیذ حضرت غالب

لاکھوں دنیا میں ہیں زہد و عبادت والے
کہیں دو چار ہی نکلیں گے محبت والے

اپنی طاعت پہ ہوں مغرور نہ طاعت والے
ان سے اچھے ہیں گنہ گار ندامت والے

خشتِ خم خانقہ شیخ میں جا کر رکھ دو
کہ تیمم کریں دیندار طہارت والے

دیکھتے ہیں ترے کوچے میں ہم اپنے سر پر
جو کہ دیکھیں گے قیامت میں قیامت والے

باتیں اچھی ہیں برائی ہے تو بس اتنی ہے
نیک اپنے کو سمجھتے ہیں نصیحت والے

بیخودی راہ ہے زاہد نہیں واقف صوفی
پیرِ میخانہ سے اس مسئلہ میں فتوا لے

(مرسلہ جناب رخشاں ابدالی)

فردوسِ تغزل

ناصر کاسگنجوی

حسن میں رنگ کہاں رنگِ حیا سے پہلے
پھول کیا شوخیِ پیغامِ صبا سے پہلے

عشق ناکام ہے آہنگِ خطا سے پہلے
معتبر نشہ نہیں لغزشِ پا سے پہلے

گوشِ مشتاق و تقاضائے سماعت کی قسم
خامشی خود ہمہ نغمہ ہے نوا سے پہلے

اف وہ جینا کہ جسے جینے کی تہمت کہیے
ہائے وہ موت جو آ جائے قضا سے پہلے

شوق گستاخ کا عالم ترے جلووں کے حضور
جیسے مجرم کوئی تجویزِ سزا سے پہلے

حسن ہے شعبدہ، تنزیہہ دل و روح بغیر
عشق اک وہم ہے توفیقِ وفا سے پہلے

یہی راتیں یہی دن تھے یہی دنیا تھی مگر
ہو کا عالم تھا دل نغمہ سرا سے پہلے

ہم تو یہ سمجھے ہیں ناصر کہ غمِ دوست کے بعد
زندگی مرگِ مسلسل ہے قضا سے پہلے

عیش ٹونکی

تمہارے غم سے جو وابستگی نہیں ہوتی
عزیز مجھ کو مری زندگی نہیں ہوتی

فضول اہلِ خرد ہو رہے ہیں دیوانے
ہر اک کے واسطے دیوانگی نہیں ہوتی

شبِ فراق کی تاریکیاں معاذ اللہ!
عروجِ ماہ میں بھی چاندنی نہیں ہوتی

وہ راہِ عشق میں خود ساتھ ہو گئے ورنہ
یہاں تو خضر سے بھی رہبری نہیں ہوتی

بدل گئی ہے کچھ اس درجہ فطرتِ آدم
کسی گناہ سے شرمندگی نہیں ہوتی

"خوابِ سحر"

عاصی کرنالی

کل صبح جب جمالِ افق نقش پا تھا! ہر ذرہ حیات تجلی پسند تھا
جو شاخ نخل پر تھی وہ حافظ کا شعر تھی جو برگ شاخ پر تھا وہ سعدی کی پند تھا
سبزہ تھا یا جمال کا پرچم تھا سرفراز غنچہ تھا یا بہار کا طرہ بلند تھا
ہر برگِ گل لطافتِ شبنم سے فیضیاب سارا چمن بہ فیضِ ہوا بہرہ مند تھا
تھی صبح باریاب اور آدم تھا مستِ خواب بیدار تھی نگاہ نہ دل ہوش مند تھا

فطرت تو لے کے آئی تھی الہام کی کرن
لیکن ترے دماغ کا دروازہ بند تھا!

جائزہ

حکیم سید رئیس احمد حیرت نقوی سہسوانی

تقاضائے فطرت ہیں حالات اپنے نگاہِ تعمق سے انسان دیکھے
ذرا جائزہ اپنے کردار کا لے پرکھ کر کبھی اپنا ایمان دیکھے
پڑھے زندگی کو مقالہ سمجھ کر بغور اس کا ہر ایک عنوان دیکھے

گلہ اپنی قسمت کا کرنے سے پہلے
مسلمان ہو کر مسلمان دیکھے

نوائے سروش

ماہر القادری

خانقاہوں میں جو قالین سجا رکھے ہیں!
دامن ہم رنگِ زمیں ہیں کہ بچھا رکھے ہیں
شیخ خود بھی ہیں بہت وضع کے پابند مگر
کچھ مریدوں کو بھی آداب بتا رکھے ہیں
زہدِ خاموش سے ہنگامہ رندی اچھا
میکدے والوں نے فتنے تو اٹھا رکھے ہیں
مدرسوں میں ہے وہی بحث کلام و منطق
اور قرآن کے اسرار چھپا رکھے ہیں

ہم مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں
کسی بھی ملک کا بنیادی عنصر جس کے بغیر تہذیب و تمدن پروان نہیں چڑھ سکتے قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ ہمارے بہادر، محنت کش، محبّ الوطن عوام نے ملک کیلئے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ حکومت کا بھی عزم یہی ہے کہ عوام کے لئے خوشحال زندگی کے تمام لوازمات فراہم کئے جائیں۔
گھر، مدرسے، دواخانے، بند، نہریں اور کارخانے غرض کہ وہ تمام چیزیں جو قومی بہبودی کے لئے ضروری ہیں آج ملک کے ہر حصے میں تعمیر کی جارہی ہیں۔ تعمیر کے اس عظیم کام میں زیل پاک سیمنٹ ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔
ZEALPAK
پاکستان کی
مایۂ ناز صنعت
زیل پاک سیمنٹ فیکٹری لمیٹڈ۔ حیدرآباد
منیجنگ ایجنٹس:۔
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
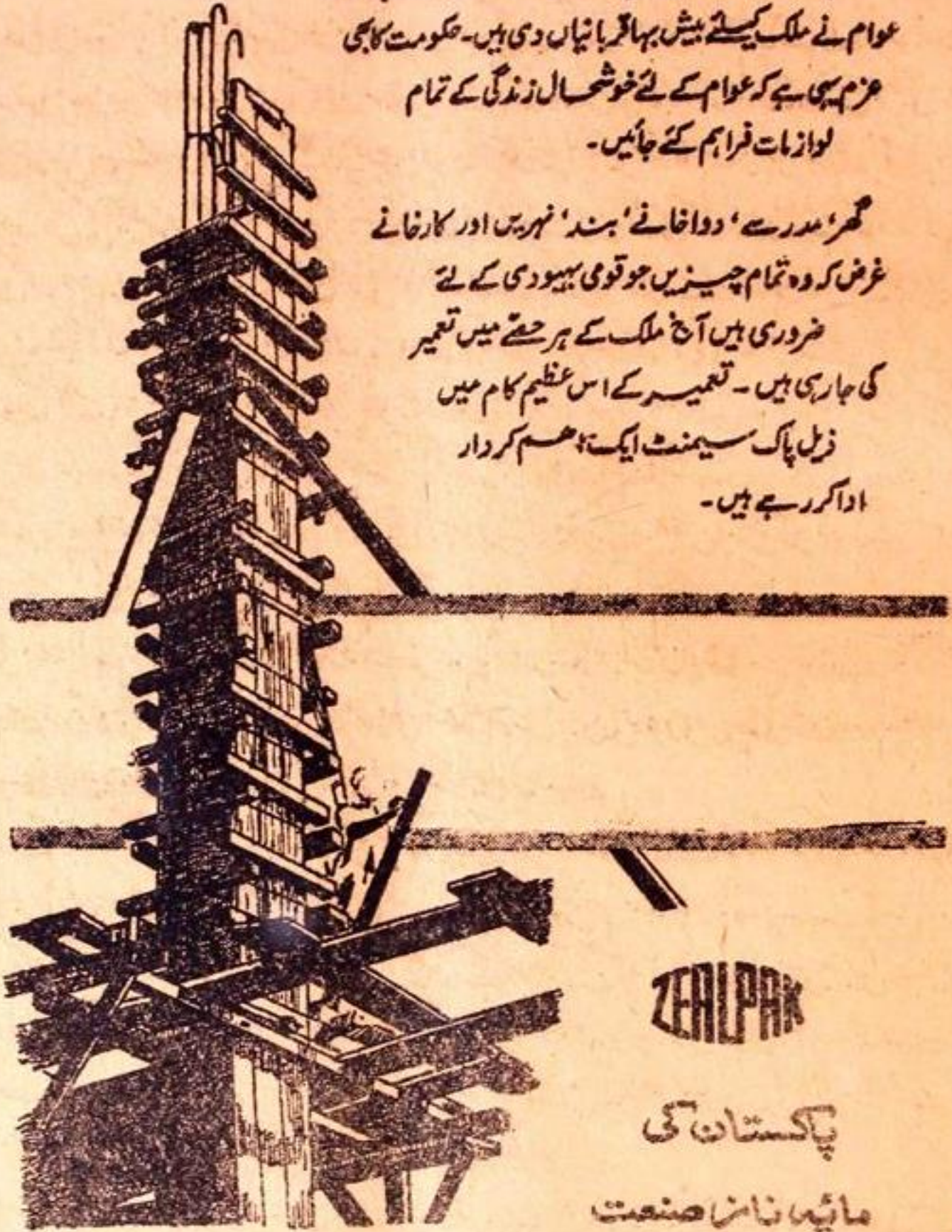
روحِ انتخاب

جمہوری معاشیات میں آدمی کو صرف معاشی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر اشتراکی معاشیات میں ایک مزید نقصان یہ ہے کہ معاشی تکلیف پر تمدنی عذاب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں تو آدمی آزاد ہے کہ اپنی مرضی سے کوئی پیشہ اختیار کرے۔ مگر اشتراکی نظام میں اسی کے ساتھ آدمی کو دفتریت اور نوکرشاہی کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے۔ آزاد لین دین اور سرکاری افسروں کے ذریعہ معاش کی تنظیم میں زبردست فرق ہے۔ پہلی صورت میں آدمی آزاد ہوتا ہے کہ وہ کس پیشہ کو اختیار کرے۔ وہ کتنا وقت کس کام میں دے۔ وہ جب کوئی کام کرتا ہے یا کسی دکان سے سامان خریدتا ہے تو دوسرے سے اس کا معاملہ ایک برابر کے آدمی کا سا ہوتا ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو اس کی ضرورت کی کوئی چیز دیتا ہے، اور اس سے اپنی ضرورت کی کوئی چیز لیتا ہے۔ اس طرح دونوں کے درمیان برابر کا معاملہ ہوتا ہے مگر سرکاری تنظیم میں ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اوپر کچھ لوگ ہیں جو اس کے خداوند ہیں۔ وہ جو کچھ کر سکتا ہے اپنے اوپر کے ایک صاحب اختیار کی اجازت سے کر سکتا ہے۔ اس طرح معاملہ دو برابر کے آدمیوں کے درمیان نہیں رہتا بلکہ دو ایسے آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے جن میں سے ایک بے اختیار ہے اور دوسرا با اختیار۔ ایک اجازت مانگنے والا ہے اور دوسرا وہ جس کے دستخط سے اجازت ملے گی۔ اس طرح ہر شخص یا تو کسی کا خداوند ہوتا ہے یا اس کے اوپر کوئی خداوند ہوتا ہے۔ آزاد معیشت میں آدمی کی خودی باقی رہتی ہے اور ترقی کرتی ہے جب کہ سرکاری انتظام میں اس کی خودی مر جاتی ہے اور ہر شخص اپنے سے اوپر والوں کی خوشامد کرنے والا اپنے سے نیچے والوں کے لئے متکبر بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "اجرتی غلامی" کا لفظ اگر صحیح معنوں میں کہیں راست آتا ہے تو وہ اشتراکی معاشرہ ہے۔ جمہوری معاشرے میں آدمی اجرت پر کام کرتا ہے مگر وہ اس کے لئے مجبور نہیں ہوتا۔ وہ اگر چاہے تو مزدوری کو چھوڑ کر تجارت یا کوئی اور آزاد پیشہ کر سکتا ہے جب کہ اشتراکی نظام میں اس کے سوا رزق کی کوئی صورت ہی نہیں کہ آدمی سرکاری ملازمت کرے یا سرکاری کارخانوں میں مزدور بن جائے۔ اس کے علاوہ جمہوری معاشرہ میں آدمی پھر بھی آزاد ہوتا ہے۔ جب کہ اشتراکی معاشرہ میں مکمل سیاسی اور معاشی آمریت اس کے اوپر مسلط ہو جاتی ہے "مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ" در اصل نام ہے، تمام لوگوں کو مزدور بنا کر ان کے اوپر ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کا۔

ملکیتی نظام کے خلاف مارکسزم کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس میں بالآخر سارا سرمایہ سمٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے، اور یہ گروہ اتنا طاقتور ہو جاتا ہے کہ تمام سیاسی اور معاشی سرگرمیوں پر اس کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے، حکومتوں کی پالیسی بالکل اس گروہ کے مفاد کی پابند ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ ملک کے باشندے، سرمایہ داروں کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں بلکہ سرمایہ داروں کے درمیان باہمی مفاد کی کشمکش بین الاقوامی دنیا کے امن کو بھی غارت کر دیتی ہے جس کی ایک نمایاں مثال دوسری جنگ عظیم ہے سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی کے بعد

تمام بڑے ممالک کے درمیان آپس میں معاشی جنگ چھڑ گئی، ہر ملک کی حکومت نے اپنے ملک کے سرمایہ داروں کے دباؤ میں پڑ کر دوسرے ملک کے خلاف فیصلے کئے دوسرے ملکوں کے مال کی درآمد پر بھاری بھاری محصول لگائے جس کا نتیجہ تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ ——— دوسری جنگ عظیم ——— کی شکل میں برآمد ہوا۔ ایک کمیونسٹ ادیب کے الفاظ میں "سرمایہ داروں کے مفاد کے باہمی ٹکراؤ کا نام دوسری جنگ عظیم ہے"

موجودہ سرمایہ داری نظام کے خلاف مارکسزم کا یہ مقدمہ بالکل صحیح ہے۔ مگر خود اس نے اس مشکل کا جو حل پیش کیا ہے وہ اسی برائی کی ایک بدترین شکل ہے جس کو مٹانے کا وہ دعویدار ہے۔

آپ اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے عام پبلک کو ملکیت کے حق سے محروم کر رہے ہیں۔ مگر کھیتی، کاروبار اور نشر و اشاعت کے مختلف اداروں کو چلانے اور ضروریات زندگی کا سامان فراہم کرنے کے لئے بہر حال آپ کو کوئی انتظام کرنا ہوگا یہ انتظام یقیناً ملک کے تمام باشندے نہیں کر سکتے۔ بلکہ کچھ مخصوص لوگوں کو اس کا انتظام سپرد کرنا ہوگا۔ یہ منتظمین قدرتی طور پر وہی لوگ ہوں گے جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی۔ جو لوگ سیاسی اختیارات کے مالک ہیں، انھیں کو آپ معاش اور روزگار کی ٹھیکیداری بھی سونپ دیں گے۔ گویا دو مختلف اختیارات جو پہلے تاجروں اور سیاسی لیڈروں میں بٹے ہوئے تھے، ان کو آپ اکٹھا کر کے صرف سیاسی لیڈروں کے حوالہ کر دینا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ نئے منتظمین جب آہستہ آہستہ تمام اختیارات پر قابض ہو جائیں گے اور روٹی کی تقسیم سے لے کر خیالات کی اشاعت تک ہر چیز ان کے قبضہ میں چلی جائے گی تو کیا اس طرح پہلی اجارہ داری سے بڑی اور خطرناک اجارہ داری نہیں پیدا ہوگی جس کے مٹانے کے لئے آپ نے تمام آبادی کو ملکیت اور آزاد ذریعہ معاش سے محروم کر کے محض سرکاری ملازمین میں تبدیل کر دیا تھا۔

اجارہ داری کا مطلب اگر یہی ہے کہ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں بیشتر لوگوں کا رزق آجائے تو کیا یہ اجارہ داری نہیں ہے کہ چند سیاسی لیڈر پورے ملک میں روٹی اور کپڑے کے ٹھیکہ دار بن جائیں۔ نہ کسی کو کھیتی کرنے کی اجازت ہو نہ کاروبار کرنے کی سارے ملک کا ایک اَن داتا ہو اور سب کا رزق اسی کے دربار سے تقسیم ہوتا ہو۔ یہ اجارہ داری جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی وہ اگر بگڑ جائیں تو پورے ملک کو جیل خانہ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ان اجارہ داروں کے ہاتھ میں محض کوئی ایک صنعت یا کارخانہ نہیں ہوگا۔ بلکہ سارے ملک کے تمام ذرائع معاش ان کے قبضہ میں ہوں گے۔ پریس اور تعلیم گاہیں بھی انھیں کے اختیار میں ہوں گی۔ ہر قسم کی پنشنوں اور ملازمتوں کے تقرر کا حق انھیں حاصل ہوگا۔ ان کو اختیار ہوگا کہ جس کو جو کچھ چاہیں دیں اور جس سے جو چاہیں چھین لیں۔ وہ اگر کسی سے خفا ہو جائیں تو سارے ملک میں اس کو کہیں روزگار نہیں مل سکتا کیونکہ روزگار کی تمام شکلوں کے وہ تنہا اجارہ دار ہیں۔ وہ جس کو روٹی نہ دینا چاہیں وہ کہیں سے اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا کیونکہ رزق کے تمام خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ وہ خواہ کتنا ہی ظلم کر ڈالے مگر کسی پریس میں اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جا سکتی، کیونکہ پریس بھی سب کے سب اسی اجارہ دار کی مٹھی میں ہیں۔ اسی طرح کی اصلاح کا مطلب صرف یہ ہے کہ برلا اور ٹاٹا کو ختم کر کے چند وزیروں اور گورنروں کو ان کی جگہ پر بٹھا دیا جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ برلا اور ٹاٹا کو ختم کر کے چند وزیروں اور گورنروں کو ان کی جگہ پر بٹھا دیا جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ برلا اور ٹاٹا کو زندہ رکھیں مگر یہ کونسی عقلمندی ہے کہ چھوٹے اور بے اختیار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ایک سب سے بڑا سرمایہ دار اپنے سروں پر مسلط کر لیں۔ اور وہ بھی ایک ایسا سرمایہ دار جس کو لامحدود اختیارات حاصل ہوں، جس کے خلاف ہڑتال کرنا اور

جس کو بدلنے کی کوشش کرنا آپ کے بس میں نہ رہے۔ آج اگر سیٹھ رام کرشن ڈالمیا کوئی زیادتی کرے تو پولیس اس کو گرفتار کر لیتی ہے۔ لیکن وزیر اور گورنر صاحبان اگر زیادتی کرنے لگیں تو ان کو کون گرفتار کر سکتا ہے۔ ان کے خلاف وارنٹ جاری کرنے والا خود ان کا ملازم ہے۔ پھر کس کو جرأت ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کا نظام انفرادی لوٹ کی بدترین شکل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوٹنے والے جو اب تک محض اپنی دولت کے زور سے لوٹ رہے تھے ان کو اس بات کا موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی کارروائیوں کے لئے قانون کی حمایت حاصل کر لیں اور فوج اور پولیس کی مدد سے زیادہ منظم طریقہ پر لوٹ کا کام کر سکیں۔

اشتراکی حل کا دوسرا فائدہ جو بتایا جاتا ہے وہ بین الاقوامی دنیا کا امن ہے۔ برٹرینڈ رسل نے کہا ہے "سوشلسٹ انقلاب عالم گیر امن کی طرف جانے والی سڑک ہے" مگر اس حل کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ چند بستیاں جو الگ الگ کئی ڈاکوؤں کا شکار ہو رہی ہوں ان سب کو ملا کر صرف ایک بڑے ڈاکو کی شکار گاہ بنا دیا جائے۔ امن عالم قائم کرنے کی اس تدبیر کا مطلب صرف یہ ہے کہ چند کامریڈوں کے ہاتھ میں ساری دنیا کے انسانوں کی قسمت دے دی جائے جس طرح اس وقت چند کامریڈ بعض ملکوں میں اس کے باشندوں کی قسمت کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ اگر سوشلزم انھیں معنوں میں امن کی طرف جانے والی سڑک ہے تو ہٹلرزم اور بوناپارٹزم بھی امن کی طرف جانے والی سڑک تھی کیونکہ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ دنیا کی تمام قوموں پر ایک شخص یا ایک پارٹی کا اقتدار مسلط کر دیا جائے۔ اگر اشتراکی سماج سے کش مکش ختم ہو جاتی ہے تو روس اور یوگوسلاویہ کے درمیان کیوں کش مکش ہوئی، مشرقی جرمنی کے مزدوروں نے ماسکو کے خلاف کیوں بغاوت کی جس کے نتیجہ میں انھیں ٹینکوں کے نیچے پیس دیا گیا۔ پولینڈ اور ہنگری کے عوام کیوں "روسی برادری" میں شامل ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ "اشتراکی برادری" طلسم آہنی غلامی کے سوا اور کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ جہاں یہ آہنی گرفت ڈھیلی ہوئی قومیں اس سے بھاگنے کے لئے بے قرار ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۵۷ء کے درمیان کمیونسٹ چین کے صدر ماؤزے تنگ نے ایک تقریر میں کہا کہ "کمیونسٹ سوسائٹی میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں" یہ عالمی کمیونزم کی ناکامی کو سرکاری طور پر تسلیم کرنا ہے۔ ماؤزے تنگ نے کمیونزم میں اختلاف کا امکان ظاہر کر کے ایک طرف خود اپنے ملک کی، روس سے جداگانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ دوسری طرف دبی زبان سے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ کمیونزم کا سانپ نیشنلزم کے مینڈک کو ہضم نہیں کر سکتا ہے۔ اس لئے جتنے مینڈک کھائے تھے وہ سب اس کے پیٹ میں پھدک رہے ہیں اور موقع پاتے ہی نکل بھاگنا چاہتے ہیں۔ اب کمیونسٹ دنیا کو جوڑے رکھنے کی یہی ایک صورت ہے کہ ان کے باہمی اختلاف کو تسلیم کیا جائے۔ یعنی کمیونزم کی عالمی برادری بنانے کے نظریہ کو قربان کر کے ان کے نیشنلزم کے لئے جگہ بنائی جائے۔

اجارہ داری کیوں

اجتماعی ملکیت کا نظام اجارہ داری کے بغیر قائم نہیں کیا جا سکتا اور یہ اس کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نظام کے اندر خود کوئی ایسی کشش نہیں ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف مائل ہوں، بلکہ اس کی کامیابی کا انحصار تمام تر اس امر پر ہے کہ لوگ اس کی طرف مائل ہونے کے لئے مجبور کر دیئے گئے ہوں۔ آزاد معیشت میں کسی چیز کے بنانے کے بہت سے کارخانے ہوتے ہیں۔ وہاں کسی کارخانے کے چلنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی حسنِ کارکردگی سے عوام کی نگاہ میں اپنے آپ کو مقبول بنا سکے آزاد معیشت میں کسی کارخانہ کی کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ اس نے دوسرے ہم عصروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کر دیا ہے۔ مگر

اجتماعی ملکیت کا نظام آزاد مقابلہ سے ڈرتا ہے۔ وہ جب کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو اس میں عام پبلک کے لئے حصہ لینا حرام قرار دے دیتا ہے اور اس طرح لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنی ضروریات کے لئے وہ صرف اسی کے یہاں آئیں دوسری جگہ کہیں نہ جائیں۔ اگر ایک عام تاجر کوئی کاروبار شروع کرے تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ ان کاروبار کے بہت سے تاجروں میں ایک تاجر کا اضافہ ہوگیا ہے مگر حکومت ایک ایسا تاجر ہے کہ دوسرے تمام تاجروں کی دوکانوں کو مقفل کرکے اپنی دکان کھولتا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ سرکاری کاروبار نجی کاروبار کے مقابلہ میں عوام کے لئے زیادہ بہتر اور مفید ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہ فوج اور پولیس کے جلو میں آئے۔ اس کو بے خوف ہو کر کھلے مقابلہ میں آنا چاہئے۔ پھر جو طریقہ انسان کے لئے زیادہ اچھا ہوگا، لوگ خود ہی اس کی طرف ٹوٹ پڑیں گے اور اس کا مخالف اس کے مقابلہ میں اپنے آپ فنا ہوجائے گا۔

معاشی دنیا میں اس اجارہ داری کے معنی وہی ہیں جو سیاسی دنیا میں ڈکٹیٹرشپ کے ہوتے ہیں۔ ہٹلر نے جرمنی میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد تمام سیاسی پارٹیوں کو ختم کر دیا تاکہ جب الیکشن ہو تو کوئی پارٹی اس کے مقابلہ میں نہ آسکے سارے ملک میں صرف ایک نازی پارٹی ہو جس کے نمائندے الکشن کے موقع پر نامزد کر دیئے جائیں اور لوگ مجبور ہوں کہ اپنے ووٹ اسی ایک پارٹی کے بیلٹ بکس میں ڈالیں۔ آج کوئی بھی ہٹلر کی اس اجارہ دارانہ سیاست کو پسند نہیں کرتا۔ مگر معاشیات میں سوشلسٹ اجارہ داری کو ترقی پسند اور جاندار نقطۂ نظر کہا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک جگہ ملک کو سیاسی قید خانہ بنا دیا جاتا ہے اور دوسری جگہ معاشی قید خانہ، دنیا پہلے نظریہ کو برا سمجھتی ہے کیونکہ اس کی غلطی سب پر واضح ہو چکی ہے۔ مگر دوسرے نظریہ کا خیر مقدم کرتی ہے کیونکہ اس کی برائیوں پر دلوار چین کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں اجارہ داری بالقصد لائی نہیں جاتی بلکہ یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب حکومت ضروریات زندگی کو پیدا کرنے والے تمام ذرائع کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو دوسرے افراد کے لئے یہ موقع کہاں رہتا ہے کہ وہ الگ سے کوئی کام کر سکیں گویا حکومت مقابلہ کرنے سے لوگوں کو روکتی نہیں بلکہ ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ لوگوں کو خود ہی رُک جانا پڑتا ہے۔ یہ اگر کوئی توجیہہ ہے تو ایسی توجیہہ ظلم کے خلاف کی جاسکتی ہے۔ بدترین ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے لوگوں کو خیالات کی آزادی سے روکا نہیں تھا بلکہ ان ذرائع پر قبضہ کرلیا تھا جہاں سے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس طرح سیاسی پابندی بالقصد ایک ایک شہری پر عائد نہیں کی گئی بلکہ وہ حکومت کے ایک عمل کا لازمی نتیجہ تھی۔

اشتراکیت ایک نظریہ کی حیثیت سے ناکام ہو چکی ہے۔ اس نظریہ کی انتہائی خرابیاں اپنے پہلے ہی تجربہ میں پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہو چکی ہیں جو اس کے اولین لیڈروں اور مفکروں کے ذریعہ روس میں ہوا تھا۔ روس اس نظریہ کی اوّلین تجربہ گاہ نہیں بلکہ درحقیقت وہ اشتراکیت کا مزار ہے جہاں وہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو چکی ہے اب اگر زمین کے بعض حصوں میں باقی ہے تو ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے باقی ہے جیسے کہ جمہوریت باقی ہے۔ جمہوری تحریک جب ابتداً اٹھارویں صدی عیسوی میں فرانس سے اُٹھی تو وہ ایک نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ زندگی کا صحیح ترین نظریہ ہے اور اسی کے ذریعہ انسانیت کے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ مگر اب کہیں بھی جمہوریت اسی

حیثیت سے زندہ نہیں ہے۔ اب وہ صرف ایک سیاسی ہتھیار ہے جس کے ذریعہ کچھ چالاک قسم کے لیڈر عوام الناس پر اپنی خدائی کا تخت بچھاتے ہیں۔ اسی طرح اشتراکیت اب کوئی نظریہ نہیں بلکہ ایک سیاسی حربہ ہے جس کے ذریعہ کچھ انسان نما دیوزمین کے ایک تہائی حصہ میں تقریباً نوے کروڑ انسانوں کا گلا دبائے ہوئے ہیں۔

اشتراکی نظام کے بارہ میں یہ تلخ حقیقت اب "سرمایہ داروں کا پروپیگنڈا" نہیں رہی بلکہ بیسویں کانگرس کے بعد خود روسی لیڈروں نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔ اس نظام میں جب ایک بار کوئی شخص برسر اقتدار آجائے تو پھر موت کا فرشتہ ہی انسانیت کو اس کے عذاب سے نجات دلا سکتا ہے۔ چنانچہ سٹالین کو نہ تو معزول کیا جا سکا اور نہ اس کی زندگی میں کسی کو اس کے خلاف بولنے کی جرأت ہوئی اس کے مظالم کو "تاریخ کے عظیم انصاف" کی حیثیت سے پیش کیا گیا، اس کے بارے میں کہا گیا کہ "وہ سٹالن کلاسیکل کیمونزم کا حقیقی ہیرو ہے"، مگر اس کے مرنے کے بعد خود اشتراکی پارٹی نے یہ تسلیم کیا کہ سٹالن تاریخ کا سب سے بڑا ظالم انسان تھا۔ اپنی حکومت کے "آخری دور میں اس کی خود پسندی نے قابل نفرت شکل اختیار کر لی، اس نے خود کو پارٹی اور عوام سے بالاتر کر لیا۔ مرکزی کمیٹی کی رائے پر غور کرنا ترک کر دیا۔ اس نے مطلق العنان طرز حکومت پر عمل کیا"[1]، روسی کیمونسٹ پارٹی کے سکریٹری اوّل مسٹر خروشچیف نے سٹالن کے مرنے کے بعد پارٹی کی بیسویں کانگرس (فروری ۱۹۵۶ء) میں ایک تقریر کی جس میں سٹالن کے جرائم گنائے یہ ایک طویل تقریر تھی جس کے بعض فقرے یہاں درج کئے جاتے ہیں :-

> "ایک شخص سب کچھ جانتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے۔ ہر فرد سے واقف ہے۔ ہر کام کر سکتا ہے۔ اس سے کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ کسی شخص میں اس قسم کی غیر معمولی صفات کو ماننا اسے خدا بنانا ہے مگر سٹالن کے بارہ میں سالہا سال تک ہمارا عقیدہ یہی تھا جس کی تردید اس کے مرنے کے بعد سنٹرل کمیٹی نے کی ہے"
>
> سٹالن سمجھانا بجھانا نہیں جانتا تھا بلکہ وہ اپنے خیالات کو زبردستی منواتا تھا اور لوگوں سے اندھی اطاعت کا مطالبہ کرتا تھا۔ جس نے بھی اس کی اطاعت نہیں کی یا اس کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ سترھویں پارٹی کانگرس کے بعد خاص طور پر پارٹی کے بہت سے بڑے بڑے لیڈر اور کارکن اس کی مطلق العنانی کا شکار ہوگئے"
>
> "سٹالن نے "عوام دشمن" کی اصطلاح ایجاد کی جس کا مطلب خود بخود یہ ہو گیا کہ ایک شخص کی رائے خواہ صحیح ہو یا غلط لازماً قبول کی جانی چاہئے۔ اس اصطلاح کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا کہ کوئی شخص جو کسی بھی پہلو سے سٹالن کی تائید نہ کرتا ہو یا جس کے بارہ میں ایسا شبہ کیا جائے اس کے خلاف ہر ظالمانہ سلوک کیا جا سکتا ہے اور اس کے خلاف ہر قسم کے تشدد کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ "عوام دشمن" کی اس اصطلاح کے

---

[1] سوویٹ لینڈ۔ یکم جون ۱۹۵۶ء

بعد اختلاف رائے اور کسی معاملہ میں بحث و نظر کے بعد ایک نتیجہ تک پہونچنے کی کوشش کرنا ناممکن ہوگیا، ایسے تمام مجرمین کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے جو قانونی بنیاد فراہم کی گئی وہ اعتراف Confession تھا جو جسمانی اذیتوں کے ذریعہ اگلوایا جاتا تھا۔

ایک شخص کی من مانی کارروائی نے دوسروں کو بھی مطلق العنان بنا دیا بے شمار لوگ گرفتار ہوئے، ہزاروں آدمی جلاوطن کر دیئے گئے، کسی عدالتی کارروائی اور تحقیق و تفتیش کے بغیر سزائیں دی گئیں، اس چیز نے عام طور پر بدامنی اور خوف کی فضا پیدا کر دی اور لوگوں کو مایوس بنا دیا۔

"حال میں خاص طور پر بیریا کے گروہ کا صفایا کرنے کے بعد سنٹرل کمیٹی نے بہت سے واقعات کی تحقیق کی جو اس گروہ نے اپنے زمانے میں گھڑے تھے اس سے سٹالن کی وحشیانہ خودرائی کے بارے میں بڑی بھیانک حقیقتوں کا انکشاف ہوا۔ معلوم ہوا کہ سٹالن نے اپنے لامحدود اختیارات کو بہت غلط طریقہ پر استعمال کیا تھا۔ وہ سنٹرل کمیٹی کے نام پر کارروائیاں کرتا تھا مگر کمیٹی کے ممبروں سے ان کی رائے تک دریافت نہیں کرتا تھا، نہ کمیٹی کی پولیٹیکل بیورو سے مشورہ کرتا تھا۔ اکثر نہایت اہم معاملات میں اس نے اپنے ذاتی فیصلوں کی انھیں اطلاع تک نہیں دی۔"

"جنگ کے بعد سات سال تک کوئی کانگرس نہیں بلائی گئی۔"

یہ واضح ہو چکا ہے کہ بہت سے جو ۳۶/۱۹۳۷ء میں "دشمن" قرار دیئے گئے تھے وہ حقیقتہً دشمن نہیں تھے۔ نہ جاسوس تھے، نہ توڑ پھوڑ کرنے والے تھے، بلکہ اکثر نہایت وفادار کمیونسٹ تھے، ان کو بدنام کیا گیا، اور سخت جسمانی عذاب کے ذریعہ ان سے زبردستی ہولناک جرائم کا اقرار کرایا گیا۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے ۱۳۹ ممبر جو سترھویں کانگرس میں چنے گئے تھے ان میں سے ۹۸ ممبروں یعنی ستر فی صدی کو گرفتار کر کے گولی مار دی گئی۔ یہ انجام صرف سنٹرل کمیٹی کے ممبروں ہی کا نہیں ہوا بلکہ اٹھارویں پارٹی کانگرس کے مندوبین Delegates کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا۔ ان کی اکثریت یعنی ۱۹۶۶ مندوبین میں سے ۱۱۰۸ کو "انقلاب دشمن" جرائم کے ارتکاب کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔"

نفرت انگیز بہتان اور مجرمانہ کارروائیوں کی ایک شرمناک مثال ایکے EIKHE کا واقعہ ہے جو سنٹرل کمیٹی کی پولیٹیکل بیورو کے لئے امیدوار تھا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کا ایک ممتاز کارکن تھا۔ وہ ۱۹۰۵ء سے پارٹی کا ممبر تھا۔ کامریڈ ایکے ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے سرکاری سامان میں خورد برد کیا ہے۔ ایکے کے مقدمہ کی تفتیش جس طرح کی گئی وہ وحشیانہ دروغ بیانی کی ایک بدترین مثال ہے۔ ایکے کو

شدید جسمانی عذاب دیکر مجبور کیا گیا کہ وہ اعترافِ جرم کی ایک ایسی دستاویز پر دستخط کرے جس کو محکمہ تفتیش کے ججوں نے تیار کیا تھا جس میں وہ اور دوسرے بہت سے ممتاز پارٹی کارکن عوام دشمن سرگرمیوں میں ماخوذ کئے گئے تھے۔ ۴م رفردی کو ایکے گولی سے مار دیا گیا۔ اس طرح کے اور بہت سے مقدمے ہیں جو محض بہتان اور جعل سازی کی بنیاد پر کھڑے گئے تھے"

جب سٹالن کسی شخص کے بارے میں یہ کہہ دیتا کہ اس کو گرفتار کرلیا جائے اس وقت یہ ایمان لانا ضروری تھا کہ وہ شخص "عوام کا دشمن" ہے۔ ان دنوں بیریا کا گروہ جو ریاستی تحفظ کا ذمہ دار تھا گرفتار شدہ شخص کو مجرم بنانے اور اس کے خلاف اپنے جھوٹے الزامات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے نہایت تیزی سے حرکت کرتا تھا۔ اور وہ ثبوت کیا ہوتا تھا اپنے جرائم کا "اعتراف" جس کو محکمہ تفتیش کا جج فوراً قبول کرلیتا تھا اور یہ کس طرح ممکن ہوتا تھا کہ ——— ایک شخص ان جرائم کا اقرار کرلے جس کو اس نے سرے سے کیا ہی نہ ہو؟ اس کا صرف ایک طریقہ تھا جسمانی مشقتوں کے ذریعہ اس پر دباؤ ڈالا جاتا تھا، اور اس کو سخت عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ اس کو ناقابل برداشت تکلیفوں کے ذریعہ نیم بے ہوشی کی حد تک پہنچا دیا جاتا تھا، اور اس طرح اس سے ہولناک جرائم کے اقرار نامے پر دستخط لئے جاتے تھے"

ہماری فلموں اور ادبی تخلیقات کا مقصد صرف یہ رہ گیا تھا کہ سٹالن کا پروپیگنڈہ کیا جائے اور اس کی شان میں قصیدے پیش کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں فلم "برلن کی شکست" The fall of Berlin کی مثال لیجئے۔ یہ فلم پچھلی جنگ میں روسیوں کے مقابلہ میں جرمنوں کی شکست کا منظر پیش کرتی ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ پوری فلم میں صرف سٹالن کا کردار نظر آتا ہے۔ وہ ایک ہال میں بیٹھا ہوا احکام جاری کررہا ہے جہاں بہت سی خالی کرسیاں پڑی ہوئی ہیں اور ایک شخص کے سوا ہال میں کوئی اور آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ سوال یہ ہے کہ فوجی محکمہ کہاں ہے، پولٹیکل بیورو کیا کررہا ہے، حکومت کس کام میں مصروف ہے۔ یہ لوگ آخر کہاں ہیں اور کس کام کے لئے رکھے گئے ہیں۔

فلم کے اندر ان کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ سٹالن اکیلا تمام کام کررہا ہے اس کو کسی شخص پر اعتماد نہیں ہے۔ وہ کسی سے مشورہ طلب نہیں کرتا۔ اس فلم میں ہر چیز نہایت غلط رنگ میں دکھائی گئی ہے، کیوں؟ صرف سٹالن کی شہرت کے لئے حقیقت اور واقعہ کے بالکل خلاف" (نیویارک ٹائمز۔ ۵ رجون سنہ ۱۹۵۶ء)[1]

---

[1] اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گریٹ سوویٹ انسائیکلوپیڈیا جس کا تازہ ترین اڈیشن ۱۹۵۰ء کے (باقی صفحہ ۴۴ پر)

اس تقریر میں سٹالن کے جن ہولناک جرائم کا اعتراف کیا گیا ہے اس نے کمیونزم کے مومنین کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ان واقعات کی اشاعت کے بعد ساری دنیا میں بہت سے کمیونسٹ ممبر پارٹی سے استعفا دے چکے ہیں امریکہ کا مشہور کمیونسٹ ادیب ہارورڈ فاسٹ Howard Fast بھی انھیں استعفا دینے والوں میں سے ہے جو گذشتہ بیس سال سے پارٹی کا اہم رکن تھا۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

خروشچیف کی خفیہ تقریر کی اشاعت سے بہت پہلے میں نے اور کمیونسٹ پارٹی کے دوسرے ممبروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ عالمی کمیونسٹ تحریک میں کوئی المناک خامی موجود ہے۔ ان باتوں نے مجھ میں اور بہت سے دوسرے لوگوں میں ایک تبدیلی کے رجحان کی ابتداء کردی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہم خروشچیف کی خفیہ رپورٹ کے آتشین اور جہنمی انکشافات کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس دہشت کی حدیں ہمارے خواب و خیال سے بھی پرے تھیں، اور ان بدترین الزامات کی حدوں سے بھی بہت آگے تھیں جو سوویٹ یونین کے دشمن اس پر عائد کرتے تھے۔ میرا دل نفرت اور حقارت سے بھر گیا۔ مجھے اس احساس سے لامحدود ذہنی کوفت ہو رہی تھی کہ میں خون کی اس سفاکانہ ہولی کی تائید کرتا رہا ہوں، دوسروں کی طرح مجھے بھی یہ محسوس ہوا کہ میں تاریخِ جدید کے ایک ناقابلِ بیان دھوکے کا شکار ہوا [1]

خروشچیف کی مبینہ رپورٹ، جس کے بعض حصے ہم نے اوپر نقل کئے ہیں اس کی اشاعت کے بعد فرانس کی کمیونسٹ پارٹی نے سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی سے مطالبہ کیا تھا کہ سٹالن کی طرف جو ہولناک جرائم منسوب کئے گئے ہیں۔ ان کی مکمل نظریاتی وضاحت کی جائے۔ اس پر سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایک طے شدہ بیان جاری کیا جو سوویٹ لینڈ ۱۵ جولائی ۱۹۵۶ء کے ساتھ بہ شکل ضمیمہ نمبر ۱۴ شائع ہوا ہے۔ اس میں اس سوال کی وضاحت کی گئی ہے کہ "آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ سٹالن کی ڈکٹیٹر شپ اپنے تمام برے نتائج کے ساتھ سوویٹ اشتراکی نظام کے حالات میں اُبھری اور اس طرح پھیل گئی" یہ بیان تمام تر تضاد بیانی سے بھرا ہوا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سٹالن ازم کے اُبھرنے کے اسباب سوویٹ سماجی نظام میں نہیں ہیں بلکہ اس کی ذمہ داری تمام تر خود سٹالن پر ہے اور اس بات پر ہے کہ اشتراکی ریاست کا وزیر اعظم بننے کے بعد وہ سماج کی خدمت کرنے

(باقی صفحہ سے آگے) شروع میں ماسکو سے شائع ہوا ہے۔ اس میں سٹالن کے سرکاری سوانح حیات صرف چھ صفحے پر مشتمل ہیں جب کہ اس کا پچھلا اڈیشن جو سٹالن کے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سٹالن کے لئے ۴۰ صفحات وقف کئے گئے تھے۔ موجودہ اڈیشن میں سٹالن کی زندگی کے بعض پہلوؤں کی تعریف کرتے ہوئے اس پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اور اس میں لینن کی وہ مشہور تحریر بھی شائع کردی گئی ہے جس میں اس نے سٹالن کو "ان گھڑ، وہمی اور اپنے ساتھیوں کے لئے غیر وفادار" کہا تھا۔ بحوالہ اسٹیٹس مین (دہلی) ۱۸ فروری ۱۹۵۸ء

[1] ماہنامہ "تحریک" (دہلی) جون ۱۹۵۷ء

کے بجائے اپنی ذات کی پرستش میں مبتلا ہوگیا اور اپنے کو عوام سے بالاتر کرلیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب اشتراکی حضرات کے دعویٰ کے مطابق روس میں لوٹنے والے طبقوں کو ختم کردیا گیا تھا، جب وہاں ذرائع پیداوار پر سماج کی ملکیت قائم ہوچکی تھی، جب سوویت نظام کے تحت حکومت کے اختیارات کسی ایک شخص کے ہاتھ میں نہیں تھے بلکہ پورے محنت کش طبقہ کی طرف منتقل کردیئے گئے تھے۔ تو آخر کس طرح ایک شخص وہاں کے تمام اختیارات پر قابض ہوگیا۔ اجتماعی ملکیت کے نظام میں انفرادی ملکیت کی برائیاں کیسے پیدا ہوگئیں۔ کیا اشتراکیت کے مخالفین کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ اشتراکی نظام ڈکٹیٹر شپ کی بدترین شکل ہے جس کو خوبصورت نظریات کا لباس اُڑھا دیا گیا ہے۔ کیا اشتراکی نظام میں بھی اقتدار عوام کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ اس ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اتفاق سے ریاست کا حاکم منتخب ہوجائے۔ کیا "مزدور ڈکٹیٹر شپ" اس کا نام ہے کہ ساری آبادی کو مزدور بنا کر محض ایک شخص ان کے اوپر ڈکٹیٹر بن جائے۔

یہ دراصل وہ سب سے بڑا تضاد ہے جس میں تمام کیمونسٹ ممالک مبتلا ہیں، جن ملکوں میں کیمونسٹ انقلاب کامیاب ہوا ہے اس کے تجربہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ کیمونزم دراصل دنیا کا بدترین سماجی نظام ہے جس سے زیادہ برا نظام اب تک کسی نے ایجاد نہیں کیا تھا۔ وہاں کی پبلک شدید عذاب میں مبتلا ہے اور کیمونسٹ شکنجہ توڑ کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ مگر کیمونسٹ حضرات کی خواہش ہے کہ بدترین نظام کو تاریخ کا بہترین نظام ثابت کر دکھائیں۔ وہ اپنے ملک کی انتہائی بے زار پبلک کو حکومت کے انتہائی وفادار کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے کیمونسٹ ممالک کے حالات پوری طرح سازگار تھے، کیمونسٹ ملکوں میں پریس پر حکومت کا مکمل قبضہ ہے۔ وہ ملک کے اندر بے کسی تردید کے خوف کے بغیر جو کچھ چاہیں نشر کرسکتے ہیں۔ وہ اگر ایسے اعلان کرے جو ملک کی پوری آبادی کی خواہشات کے خلاف ہوں تو سارے ملک میں اس کا کوئی باشندہ اس کے خلاف ایک بیان بھی شائع نہیں کرسکتا۔ چنانچہ کیمونسٹ حکومتوں نے ایک منظم اسکیم کے تحت مسلسل یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے کہ کیمونسٹ ممالک کی حکومتیں دنیا کی بہترین حکومتیں ہیں اور ان کو اپنے ملک کے باشندوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ چونکہ کیمونسٹ ممالک میں ہر شخص کا رزق براہِ راست حکومت کے ہاتھ میں ہے اس لئے انتخابات کے موقع پر لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ کیمونسٹ نمائندوں کے حق میں اپنا ووٹ دیں۔ کیونکہ ان کی مخالفت کرنے کے معنی دراصل موت کے ہیں۔ اس طرح اپنے حق میں جبری رائیں حاصل کرکے کیمونسٹ حکومتیں یہ اعلان کرتی ہیں کہ ان کے ملک کی ساری پبلک ان کے ساتھ ہے اور ان پر پورا اعتماد کرتی ہے مگر جبر اور جھوٹے پروپیگنڈوں سے کسی ملک کے واقعی حالات کو بدلا نہیں جاسکتا۔

سوشلزم کو سیاسی جبر کے بغیر نافذ کرنے کا خیال ایک خطرناک خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ انسان کی اس کمزوری کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اس کی تاویل کرکے ساری ذمہ داری حالات پر ڈال دینا چاہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ سٹالن نے جو کچھ کیا وہ اشتراکی نظام اور جدلیاتی اخلاق کا لازمی نتیجہ تھا۔ کوئی بھی دوسرا شخص جو اس کی جگہ ہوتا وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کرسکتا تھا۔ جو سٹالن نے کیا۔ مارکس کو اقتدار نہیں ملا مگر اس کی تحریروں میں اس کا جو کردار نظر آتا ہے وہ ———————— وہ سٹالن کے کردار سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ مارکس نے خود کہا تھا کہ "ہم جلاد ہیں"، مئی ۱۸۴۹ء میں جب جرمنی کی حکومت نے مارکس کو جلاوطن کردیا اور اس کو مجبوراً اپنا اخبار

جدید رائیں گزٹ بند کرکے فرانس جانا پڑا تو اخبار کے آخری نمبر ۱۹ مئی کی اشاعت میں، اس نے لکھا۔

"ہمیں ستانے کے بہانے ڈھونڈنے کے لئے حکومت کیوں جھوٹ اور افترا کے پل باندھ رہی ہے، ہم انقلابی ہیں جب ہمارے دن پھریں گے تو ہم اپنے تشدد کے لئے بہانے نہیں تراشیں گے"۔ [1]

اس طرح کی بہت سی تحریریں ہیں جن میں اشتراکیت کے پیغمبر کا اخلاق پڑھا جا سکتا ہے مگر بات صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظلم اشتراکیت کی عین فطرت ہے اجتماعی ملکیت کا حل ایک بالکل غیر فطری حل ہے، اور تاریخ کی تمام روایات کے بالکل خلاف ہے۔ اس کو نافذ کرنے اور نافذ رکھنے کے لئے تشدد ناگزیر ہے۔ سٹالن نے جو کچھ کیا وہ کمیونزم کے لازمی نتائج تھے جن کی ابتدا پورے زور شور کے ساتھ خود لینن کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ ماسکو کا یہ اعلان کہ "سٹالین آج کے دور کا لینن ہے" ایک معنی میں اس کی تعریف ہے اور دوسرے معنی میں اس واقعہ کا اظہار ہے کہ لینن اگر زندہ رہتا تو اس کی پالیسی بھی وہی ہوتی جو بعد کے زمانوں میں سٹالن نے اختیار کی۔ لینن کو زیادہ تر محنت کش طبقہ کے ان "دشمنوں" سے جنگ کرنی پڑی جو "سرمایہ دار" تھے اور سٹالن کو ان دشمنوں سے بھی لڑنا پڑا جو خود پارٹی کے اندر پیدا ہو گئے۔ لینن کا زمانہ انقلاب کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ اس وقت اندرونی جھگڑے زیادہ نہیں اُبھرے تھے۔ اس لئے اس کا نشانہ زیادہ تر روس کا "آخری سرمایہ دار"، اور ملک کی غیر بالشویک پارٹیاں تھیں۔ مگر سٹالن کے زمانہ میں خود پارٹی کے اندر لیڈرشپ حاصل کرنے کی جنگ شروع ہو چکی تھی جیسا کہ عموماً انقلاب کے بعد ہوتا ہے۔ اس لئے سٹالن کو "گھر کے غداروں" سے بھی لڑنا پڑا۔ لینن نے زیادہ تر باہر کے لوگوں پر ہاتھ صاف کئے تھے۔ سٹالن کو خود کمیونسٹوں کے خون سے بھی ہولی کھیلنی پڑی۔ یہ جو کچھ ہوا اگر خود مارکس روس کا وزیر اعظم ہوتا تو اس کو بھی وہی کچھ کرنا پڑتا جو سٹالن نے کیا۔ جہاں سماج کو دو متضاد طبقوں میں بانٹ دیا جائے وہاں دشمنی اور تشدد کے رجحانات ایک بار پیدا ہو گئے تو وہ کسی ایک حد پر نہیں رکتے۔ یہ سانپ صرف دوسروں کو نہیں ڈستا بلکہ خود اپنے بچوں کو بھی نگل جاتا ہے۔ مشہور سوشلسٹ لیڈر ماشوک مہتا نے بہت صحیح کہا ہے کہ:-

"زار کو قتل کرنے کے بعد ناگزیر طور پر　　آپ ٹراٹسکی کو بھی قتل کر دیتے ہیں"۔ [2]

یہ حقیقت ہے کہ لینن کے روس میں وہ تمام عناصر اپنی ابتدائی حالت میں موجود تھے۔ جو بعد کو سٹالینی روس میں نمایاں ہوئے اگر لینن زندہ رہتا اور اس کو وہ عمر ملتی جو سٹالن کو ملی تو یہ بات یقینی ہے کہ وہ حالات سے مجبور ہو کر ہر وہ اقدام کرتا جو سٹالن نے اپنے دور اقتدار میں کئے ہیں۔ کمیونزم جب برسر اقتدار ہو تو وہ سٹالن ازم ہی ہوگا، اس کے علاوہ کچھ اور ہونا ممکن نہیں ہے۔

("مارکسزم، تاریخ جسے رد کر چکی ہے"
از:- وحیدالدین خاں)

---

[1] شیر جنگ، صفحہ ۷۷، [2] جمہوری سوشلزم، صفحہ ۱۶۸

ہماری نظر میں

ما تمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ

از: مولانا عبدالرشید نعمانی، ضخامت ۵۶ صفحات (جہازی سائز) قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت سے لے کر امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے تک علم حدیث کی کس طرح نشوونما ہوئی ہے، اور علم حدیث ضبط و حفظ، کتابت و تدوین اور فقہی استنباط کے کن مراحل سے گزرا ہے، اس کتاب میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ بعض صحابہ کرام احادیثِ نبوی کے ضبط و حفظ میں مصروف رہتے تھے اور بعض صحابہ پر استنباط مسائل اور تفقہ کا غلبہ تھا ——— سب سے پہلے شعبی، زہری اور ابوبکر حزمی نے سُنن کو جمع کیا اور ان کے بعد امام ابوحنیفہ نے ——— صحتِ حدیث کی شرائط امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کیا ہیں؟ اور حضرت ابوہریرہؓ کی طرح بعض دوسرے صحابہ بھی روایتوں میں منفرد ہوتے ہیں، اُن کے قبول کرنے میں ابوحنیفہؒ کس لئے توقف کرتے ہیں؟

——— اس کتاب کا ———

بہت بڑا حصہ مناقب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر مشتمل ہے، بعض اکابر محدثین کے اقوال نقل کئے گئے ہیں، جنھوں نے ابوحنیفہؒ کو فنِ حدیث کا امام تسلیم کیا ہے! ——— اور ——— امام اعظم کی "کتاب الآثار" سب سے پہلی مستند کتاب ہے جس میں احادیث کو فقہی ترتیب پر مدون کیا گیا ——— علم شریعت کے سب سے پہلے مُدوّن امام ابوحنیفہ ہیں، امام مالک نے اپنی "موطا" میں اور امام سفیان ثوری نے "جامع" میں شرعی مسائل کی تدوین امام اعظم کے بعد کی ہے ——— امام بخاری اور امام مسلم کے پیدا ہونے سے پہلے حنفی اور مالکی فقہ احادیث اور آثار کی اساس پر مدون ہو چکا تھا ——— جن علماء نے امام ابوحنیفہ پر جرح کی ہے بلکہ بعض غلط باتیں اُن سے منسوب کی ہیں، اس کتاب میں ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے، دارقطنی اور خطیب کو خاص طور سے امام اعظم کا شدید مخالف بتایا گیا ہے۔

احناف کے یہاں امام بخاری کی ذات اور اہل حدیث کے یہاں امام ابوحنیفہ اور دوسرے حنفی ائمہ فقہ کی شخصیتیں جو موضوع بحث و نقد بنی ہوئی ہیں، اس کی جھلک اس کتاب میں بھی پائی جاتی ہے ——— کتاب کی یہ فصول:

"لم یقصد البخاری الاستیعاب لا فی الرجال ولا فی الحدیث"

——— اور ———

"جمع البخاری کتاباً مختصراً فی الصحیح حسبما اقتضاء نظرہ"

اور

"ان للنسائی شرطا اشد من شرط البخاری ومسلم"

اسی اختلاف اور تکدر کا پتہ دیتی ہیں۔ ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ اور بخاری دونوں شخصیتیں واجب الاحترام ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں تھا، جس کے یہاں جو کمزوری پائی جاتی ہے، اُس کے مان لینے میں تاویلیں نہیں کرنی چاہئیں! امام بخاری نے امام ابوحنیفہ پر جو نقد و جرح کی ہے، کیا ضرور ہے کہ اس کا انتقام "صحیح بخاری" سے لیا جائے۔

کتاب کا آخری باب امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے، جس میں اُن کے شیوخ حدیث اور تلامذہ اور مصنفات کے ساتھ "سنن ابن ماجہ" کے شروح و تعلیقات کی بھی تفصیل ملتی ہے! اس باب میں یہ اہم فصل بھی شامل ہے جس میں ابن ماجہ کی تیس سے زیادہ احادیث کو امام ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے۔

مولانا عبدالرشید نعمانی کا نمایاں وصف دینی علوم کا استحضار ہے، وہ جو کام کرتے ہیں پوری ذمہ داری اور کمال جدوجہد اور تفحص و جستجو کے ساتھ کرتے ہیں، ان کی یہ کتاب علمی تحقیق و جستجو کا اچھا نمونہ ہے، اہل علم کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے مولانا موصوف حنفی مسلک میں خاصے متشدد ہیں مگر اُن کی ثقاہت، خدا ترسی اور دینی شغف اپنی جگہ مسلّم ہے! اُن کے قلم نے دینی علوم کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں!

تحدیدِ نسل

مرتبہ: مولانا محمد جعفر شاہ ندوی پھلواری ضخامت ۷۵ صفحات، قیمت: بارہ آنہ
ملنے کا پتہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان، کلب روڈ، لاہور

اس کتاب میں پانچ مقالے ہیں:

اسلام اور ضبطِ ولادت (از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم) (۲) ضبطِ ولادت (از مولانا جعفر شاہ پھلواری) (۳) اسلام اور ضبط تولید (البہی الخولی اور خالد محمد کے عربی مقالوں کا ترجمہ) اور باقی کے دو مضمون فاضل مرتب کے ہیں۔

ضبطِ ولادت (Birth Control) کے اس "نسخۂ نسل کُشی" کا موجد یورپ کا وہ دماغ ہے، جسکی پرورش شراب اور لحم خنزیر سے ہوتی ہے، جس نے معاشرے کو بدکاری اور فسق و فجور کی راہ پر ڈال دیا ہے، جو رزق سے لے کر تجارت و سیاست تک حلال و حرام میں مطلق تمیز نہیں کرتا جس کے یہاں محاسبۂ آخرت کا کوئی اندیشہ اور احساسِ ذمہ داری نہیں پایا جاتا، جس کا قانون اور اخلاق وحئ الٰہی سے بے نیاز ہے اور جس کی ساری زندگی کا مقصد سوائے نفس کی تکمیل ہے،

"تحدید نسل" یا ضبطِ ولادت کے جواز پر سب سے وزنی دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ دنیا میں تیزی کے ساتھ انسانی آبادی کا اضافہ ہو رہا ہے، اگر اس اضافہ نسل انسانی کی روک تھام نہ کی گئی تو آنے والی نسلیں غذا سے لے کر دوسری مادی ضروریات تک شدید بحران کا شکار ہوں گی اور لوگ فاقے مرنے لگیں گے! جہاں تک وہم و اندیشہ اور احتیاط کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں وہمیوں کے بہت سے لطیفے ملتے ہیں ——— ایک صاحب اس ڈر سے ایکس ریز (X-Ray) نہیں کراتے تھے کہ جس کسی کا ایکس رے ہو جاتا ہے، وہ پھر زندہ نہیں رہتا۔ ایک صاحب مکان کی تیسری منزل پر پائنچے چڑھائے نکڑے تھے اور زمین پر گائے پیشاب کر رہی تھی، اُن سے کہا گیا کہ حضرت! آپ تو تیسری منزل پر زمین سے کم از کم ساٹھ ستر فٹ کی بلندی پر ہیں۔ یہاں گائے کے پیشاب کے چھینٹوں کا کہاں گزر؟ ——— اس پر انھوں نے ارشاد فرمایا ——— "احتیاطاً"۔

مگر

اس دنیا کا کاروبار اس قسم کی توہم آمیز احتیاطوں اور اندیشوں سے تو نہیں چلتا، دنیا کے جن ملکوں میں بھی "اضافہ نسل" کے اندیشہ سے "ضبطِ ولادت" پر عمل کیا جا رہا ہے، کیا وہاں زمین کے افتادہ رقبوں میں کاشت کی تمام کوششیں کی جا چکی ہیں؟ کیا زیرِ کاشت آراضی سے سائنس کے ذریعہ سال میں دو یا تین فصلوں کی جگہ چار، پانچ اور چھ فصلیں حاصل کئے جانے اور ترکاریوں کے حجم اور وزن کو بڑھائے جانے کی جدوجہد کے تمام تقاضے پورے ہو چکے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر "تحدیدِ نسل" سے پہلے یہ فطری جدوجہد کر کے دیکھئے، جب ادھر سے مایوسی ہو جائے تو پھر "ضبطِ ولادت" کے مسئلہ پر سوچا جا سکتا ہے اور یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اب تک دنیا میں انسانی آبادی میں جو اضافہ ہوتا رہا ہے، تو اسی تناسب سے اللہ تعالیٰ کی زمین میں غلہ کی پیداوار بڑھتی چلی گئی ہے، اور تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ صرف نسل انسانی کے اضافہ کے سبب کسی ملک کے لوگ بھوکے مر گئے ہوں!

اس کتاب کے سرورق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا:

"اللّٰھُمَّ انی اعوذ بک من جھد البلاء"

سے مُزین کیا گیا ہے اور "جہد البلاء" کی تشریح خود حضورؐ نے "قلتِ مال اور کثرتِ عیال" سے فرمائی ہے! حضورؐ کے اس ارشاد کی صحت پر ہم ایمان رکھتے ہیں بے شک قلتِ مال کے ساتھ اہل و عیال کی کثرت آدمی کے لئے فتنہ بن جاتی ہے مگر اس کا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضبط ولادت" نہیں بتایا، یہ حدیث تو ذہن کو اس طرف لے جاتی ہے کہ اہل و عیال کی کثرت ہو تو انسان کو معاش و معیشت کے لئے مردانہ وار جدوجہد کرنی چاہیے اور اس پر بھی اسباب و معیشت کی تنگی دور نہ ہو تو ایک سچے مسلمان کی طرح اس پر صبر کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ بھی کہ اہل و عیال کے آرام و ترفہ کے لئے مسلمان کو حرام ذرائع اختیار نہیں کرنے چاہئیں!

اس حدیث کو جو لوگ "ضبط ولادت" کے جواز میں استعمال فرما رہے ہیں، اُن کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ حضورؐ نے "ارذل العمر" سے بھی تو پناہ مانگی ہے ——— تو "ارذل العمر" (نکمے بڑھاپے) سے بچنے کے لئے کیا ایسی طبی تدابیر اور احتیاطی کوششوں کو سندِ جواز دی جا سکتی ہے جو آدمیوں کی عمروں کو زیادہ لمبا نہ ہونے دیں اور ادھیڑ عمر کے بعد ہی انہیں موت کی نیند سلا دیں کہ انسان "بڑھاپے" کے فتنہ سے دوچار ہی نہ ہونے پائے ——— بیچارے "قدیم مُلّاؤں" کو آیات و احادیث کے انطباق کا وہ عجیب و غریب فن کہاں آتا تھا جو ان "ماڈرن مُلّاؤں" کو آتا ہے۔

"عزل" کی کیا فقہی حیثیت ہے اس پر تو فقیہانِ کرام ہی روشنی ڈال سکتے ہیں، ہمیں تو صرف اتنا سا اشارہ کرنا ہے کہ "عزل" کی زیادہ سے زیادہ مطابقت French Letter سے ہو سکتی ہے "ضبطِ ولادت" سے نہیں ہو سکتی کہ "عزل" کے ذریعہ مرد اور عورت میں اولاد پیدا کرنے کی قابلیت کو ختم نہیں کیا جاتا اور "ضبطِ ولادت" میں تو مرد و زن کی اس قابلیت کو ہی معطل و مفلوج بنا دیا جاتا ہے۔

اس کتاب ——— "تحدیدِ نسل" ——— میں کوئی شک نہیں بعض باتیں علماء کو دعوتِ غور و فکر دیتی ہیں، اس اعتراف کے بعد نرم سے نرم الفاظ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "برتھ کنٹرول" اسلامی نقطہ نگاہ سے کوئی "پسندیدہ تدبیر" نہیں ہے۔

حج مسنونہ

از: حکیم مولانا محمد صادق سیالکوٹی۔ ضخامت ۳۲۰ صفحات، رنگین سرورق، (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ: دائرۃ التبلیغ، پورہ ہیراں، شہر سیالکوٹ۔

اس کتاب میں شرح و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ فریضۂ حج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کس طرح ادا کیا جانا چاہیے گھر سے روانہ ہو کر، حرم کعبہ، عرفات اور مدینہ طیبہ تک حاضری دینا اور پھر وہاں سے وطن کو واپسی اس مبارک سفر میں کن مقامات سے گزرنا پڑتا ہے، کہاں کیا دُعا پڑھنی چاہیے، اس سفر میں کیا مرحلے پیش آتے ہیں، عوام اپنی ناواقفیت کے سبب کیا کیا غلطیاں کر جاتے ہیں، یہ تمام تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہیں، حجاج کے لئے یہ کتاب معلم اور گائڈ کے فرائض انجام دیتی ہے۔

"جہاں ہر سال ۹ ذی الحجہ کو زوال کے بعد چار پانچ لاکھ کی تعداد میں حجاج حاضر ہوتے ہیں"۔ (صـ ۲۹)

"چار پانچ لاکھ" کی جگہ "لاکھوں" زیادہ مناسب تھا ——— "مدینہ میں بدعت نکلنے پر لعنت" (صـ ۱۱۲) "بدعت نکالنا" یہ روزمرہ کے خلاف ہے!

اس کتاب میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں، جن سے عوام میں پھیلی ہوئی غلط فہمیاں دُور ہوتی ہیں ——— مثلاً:

"یہ جو مشہور ہے کہ جو حج جمعہ کو واقع ہو اسے "حج اکبر" کہتے ہیں، غلط ہے، دراصل حج اکبر، حج اصغر کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے، حج اصغر عمرہ کو کہتے ہیں، اور حج اکبر بیت اللہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے واپس مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ آکر جمرۃ العقبیٰ کو کنکریاں مار کر، قربانی دے کر طواف اضافہ کرنا کہلاتا ہے، یہ ہے حج اکبر جو ہر مَنِ استطاعَ الیہ سبیلا پر فرض ہے"۔

جنت کی کنجی

از: مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم ضخامت ۲۸۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ چودہ آنہ، ملنے کا پتہ: شیخ عبدالکریم اینڈ سنز تاجران کتب بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان شہر

مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم و مغفور کی یہ مشہور تالیف ہے[1]، جو بار بار چھپی ہے اور دینی حلقوں میں پسند کی گئی ہے! اس کتاب میں ایمان، خلوص اور نیت صالح سے لے کر سلام و کلام اور خورد و نوش کے آداب تک بیان کئے گئے ہیں، دین کے سینکڑوں مسائل اور ماثورہ دعائیں آسان اور عام فہم زبان میں مولف نے پیش کر کے اس کتاب کو سچ مچ "جنت کی کنجی" بنا دیا ہے! ہر بات حدیث کی کسی نہ کسی کتاب کے حوالہ سے کہی گئی ہے! ہاں! یہ ضرور ہے کہ بخاری و مسلم سے لے کر ابن حبان اور ابو یعلیٰ تک کی ہر درجہ کی حدیثیں اس کتاب میں آگئی ہیں، مولف نے احادیث کی صحت و ضعف کا لحاظ نہیں کیا۔

یہ کتاب اپنی افادیت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ مسلمان گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ اس کو پھیلایا جائے اور اسے خواص و عام سبقاً سبقاً پڑھیں اور اس پر عمل کریں!

---

[1] کئی جگہ بزار کو بزاز اور حظیرۃ القدس کو خطیرۃ القدس لکھا گیا ہے ——— یہ کتابت کی غلطیاں ہیں۔

(۱) **مارکسزم (جس کو تاریخ رد کر چکی ہے)** از: وحیدالدین خاں ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

(۲) **سوشلزم (ایک غیر اسلامی نظریہ)**

از: وحیدالدین خاں ضخامت ۷۶ صفحات ۔ قیمت: ۷۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رامپور (یو، پی)

جناب وحیدالدین خاں صاحب صاحب فکر انشاپرداز ہیں، پچھلے چار پانچ سالوں میں اُن کے قلم سے ایسی تحریریں نکلی ہیں، جن کو دین و دانش کا "قران السعدین" کہا جا سکتا ہے! اپنی کتاب "مارکسزم" میں انھوں نے اس لادینی اور غیر فطری نظریہ کی فلسفیانہ اور عالمانہ استدلال کے ساتھ دھجیاں بکھیر کر رکھدی ہیں!

"مارکس نے پچھلی انسانی تاریخ کا جو تجزیہ کیا ہے، اس کے تحت اگر وہ یہ تجویز کرتا کہ روئے زمین سے ہمیشہ کے لئے نسلِ انسانی کا خاتمہ کر دیا جائے، تو یہ بات خواہ کتنی ہی غلط ہوتی مگر ہم کہہ سکتے تھے کہ اپنے تجزیہ کے مطابق وہ جس نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا اس کو سچائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے مگر جب وہ کہتا ہے کہ ذرائع پیداوار کو عام لوگوں سے چھین کر حکومت کے قبضہ میں دے دیا جائے تو دراصل وہ اتنے بڑے تضاد کا مظاہرہ کرتا ہے جس کی امید ایک پاگل کے سوا اور کسی شخص سے نہیں کی جا سکتی، ایک طرف تو وہ کہتا ہے کہ سماج میں زمین، کارخانے، مشین اور دوسرے ذرائع پیداوار جن لوگوں کے ہاتھ میں رہتے ہیں، پورا سماج اُن کا غلام بن جاتا ہے، مگر انہیں چیزوں کو جب وہ نجی سرمایہ داروں سے چھین کر "مزدور ڈکٹیٹروں" کے ہاتھ میں دے دیتا ہے تو اس کے نزدیک ساری برائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسانیت ہمیشہ کے لئے معاشی اور تمدنی غلامی سے نجات پا جاتی ہے، یہ ایک ایسی تلوار ہے جو نجی قبضہ میں کسی کے پاس ہو تو وہ کاٹتی ہے لیکن اگر اس کو سماجی نمائندوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو اس کی دھار کند ہو جاتی ہے"۔ (ص ۳۳)

پوری کتاب[1] کا یہی رنگ اور مدلل و دل نشین اندازِ بیان ہے۔ فاضل مصنف نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مارکسزم ایک ناکام نظریہ ہے، جسے سچ مچ تاریخ رد کر چکی ہے، انھوں نے روس کی معاشی خوشحالی کی پول بھی کھول دی ہے۔

اپنی دوسری کتاب سوشلزم میں لائق مصنف نے بتایا ہے کہ "سوشلزم خدا سے بغاوت کی نئی بنیاد ہے" اور "مارکسی نظریہ اسلام کی تردید ہے"۔ اس کتاب میں مسلم سوشلسٹوں کے دلائل کا تجزیہ کر کے، ان کا غلط ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ مصنف نے سوشلزم اور کمیونزم کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے بلکہ اُن کی فلسفیانہ گہرائیوں میں اُتر کر اُن کو خوب کھنگالا ہے، اور اس مطالعہ اور تجزیہ و تحلیل کے بعد جب اُن کا ضمیر ان نظریوں کے

---

[1] اس شمارے میں "روحِ انتخاب" کے تحت اس کتاب کے بعض اقتباسات دیئے جا رہے ہیں۔

غلط اور باطل ہونے پر مطمئن ہو گیا ہے، تو انھوں نے ان نظریوں کی تردید میں یہ کتابیں لکھ کر زندگی کے قافلہ کو ان گڑھوں میں گرنے سے روکنے کی کوشش کی ہے۔

دلائل کے علاوہ زبان و انشاء کے اعتبار سے بھی یہ کتابیں بہت بلند ہیں، انہیں پڑھ کر ذہن مطمئن اور متاثر ہوتا ہے یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ انہیں دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے! مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند نے ان کتابوں کو چھاپ کر انسانی معاشرے کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے (اللہ تعالیٰ کی نصرت ان حق پسندوں کے ساتھ ہو۔ آمین)

مقدمہ — تفسیر نظام القرآن

تالیف:- مولانا حمید الدین فراہیؒ — ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی

ضخامت ۹۰ صفحات، قیمت ۷۵ نئے پیسے،

ملنے کا پتہ: دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ (بھارت)

حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ قرآنی علوم میں شیخ کا نہیں امام کا درجہ رکھتے تھے، قرآنی علوم پر اُن کی ہر کتاب چاہے وہ "اقسام القرآن" ہو یا "ذبیح کون ہے" ہو۔ اُن کے عمیق تدبر اور عالمانہ بصیرت کی شہادت دیتی ہے! اس کتاب میں مولانا فراہیؒ نے قرآنِ مجید کے نظم و ربط پر روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآنِ پاک کی آیتیں اپنے مفہوم و الفاظ اور ترتیب کے اعتبار سے نظم و ربط کا شاہکار ہیں جس کسی کو ان میں بے ربطی نظر آتی ہے یہ خود اُس کی فہم کی کوتاہی اور نظر کا قصور ہے۔

اس کتاب کے چند ابواب:

شانِ نزول — ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے — تفسیر کے لسانی مآخذ — نظم کی دلالت — سورتوں کے نام اور اُن کے عمود — تعیین خطاب — کیفیتِ نزول —

ہر باب

اپنی جگہ ایجاز کے باوجود قرآنی بصیرت کا معیاری نمونہ ہے۔

مولانا فراہیؒ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے:-

"میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث میں اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے، تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں بلکہ بطور تائید کے پیش کرتا ہوں"۔

مولانا مرحوم "حضرت ابراہیمؑ کے جھوٹ بولنے کی روایت" اور حضورؐ کے خلاف وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت کو درست تسلیم نہیں کرتے، وہ اس کے بھی قائل نہیں ہیں کہ "خبر متواتر" قرآن کی کسی آیت یا حکم کو منسوخ کر سکتی ہے فرماتے ہیں:

"اسی طرح یہ جاننا ضروری ہے کہ خبر اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو نہیں منسوخ کر سکتی، اس کی یا تو تاویل کریں گے یا اُس میں توقف کریں گے، لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کریں گے امام شافعیؒ، امام احمدؒ بن حنبل اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لئے ناسخ نہیں مانتے اگرچہ حدیث متواتر ہو، بس جب یہ ائمہ حدیث، جو حدیث کے معاملہ میں صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بات کے قائل نہیں ہوئے، تو ہم اس بارے میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے"۔ (ص ۳۲)

نہ "مارکسزم" کے صفحہ ۷ پر "ڈاکہ بازی" کھٹکا۔ روزمرہ "ڈاکہ زنی" ہے۔

قرآن کے "اعجاز" پر مولانا فراہی نے کتنی دل لگتی اور وزنی بات کہی ہے :-

"ہمارے بعض مفسرین کے نزدیک اُن کا مقصد قرآن کے اعجاز کو ظاہر کرنا ہے، لیکن میرے نزدیک اعجاز، قرآن کے اغراض و مقاصد میں سے نہیں ہے، بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ اس کائنات کے اندر ایک چھوٹے سے چھوٹے دانے بلکہ ایک حقیر سے حقیر ذرے سے لے کر اس گنبد گردوں تک جو کچھ ہے سب معجزہ ہی معجزہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی خلقت بھی اظہارِ اعجاز کے لئے نہیں ہوئی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے لئے ہوئی ہے، یہ اور بات ہے کہ دوسرے اس کے بنانے سے عاجز ہیں، اس لئے ثابت ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں"۔ (ص ۲۸)

یہ جو بعض اہل بدعت "یا عبادی الذین اسرفوا ۔ ۔ ۔" کا اس طرح ترجمہ کیا کرتے ہیں کہ:

"اے میرے (یعنی مجھ محمد رسول اللہ کے) بندو ۔ ۔ ۔"

تو اس کتاب کے مطالعہ سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ یہ شگوفہ مولانا رومؒ کا چھوڑا ہوا ہے :-

"مولانا رومؒ اپنی ایک جگہ یہ تک کہ گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ....

"لوگوں کو نبی کا بندہ بنا دیا ہے، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو ۔ ۔ "یا عبادی الذین اسرفوا ۔ ۔" کے الفاظ سے خطاب کریں، مولانا روم کے متعلق میرا یہ گمان نہیں ہے کہ انھوں نے فی الحقیقت نبی کو خدا کا شریک بنانا چاہا ہے لیکن یہ بات ان کی زبان سے ایسی نکل گئی ہے کہ جو مشرکین کے اقوال سے مشابہت رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ اُن کی اس لغزش کو معاف فرمائے، اس آیت میں خطاب کی نوعیت بالکل واضح ہے۔ یا عبادی الذین اسرفوا ۔ کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے، اس کے شروع میں جو "قل" ہے، وہ پیغمبر کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہنچا دیں"۔ (ص ۸۱)

اردو ترجمہ بھی اس بلند پایہ کتاب کے شایانِ شان ہے "مقدمہ تفسیر نظام القرآن" نے دینی لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے!

خاص نمبر "چراغ راہ"

ادارت :- خورشید احمد، محمود فاروقی، ضخامت ۱۶۰ صفحات، رنگین سرورق،
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنہ، چندہ سالانہ : چھ روپے -

ملنے کا پتہ : دفتر "چراغ راہ"، اسٹریچین روڈ - کراچی -

ماہنامہ "چراغ راہ" اپنی مالی مشکلات کے باوجود مسلسل شائع ہو کر اخلاق و ادب کی قابل قدر ستائش خدمات انجام دے رہا ہے، چراغِ راہ کے منتظمین تبلیغ حق اور اشاعت دین کی خاطر مالی خسارے کو برسوں سے برداشت کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس ایثار و قربانی کا انہیں اجر عطا فرمائے گا، یہ تجارت دنیوی اعتبار سے ٹوٹے کی تجارت ہے مگر آخرت میں سو فیصدی نفع بخش ثابت ہوگی، اور زندگی میں اصل اعتبار عاقبت اور آخرت ہی کا ہے۔

چراغ راہ کا یہ خاص نمبر دین و اخلاق، معاشیات، ادب، نظم و غزل مشاہیر کے خطوط اور افسانوں کا رنگا رنگ گلدستہ

ہے، قریب قریب تمام چیزیں اُونچے درجہ کی ہیں، جو سنجیدہ و باوقار ہیں مگر خشک نہیں ہیں! تنوع مضامین کے ساتھ ترتیب بھی بہت خوب ہے، جو حضرات "فاران" کا مطالعہ فرماتے ہیں، انہیں تو اس صحیفہ اخلاق و ادب کے استفادہ سے محروم رہنا ہی نہیں چاہیئے۔

ماہنامہ "لقائے رب"

نگراں: علامہ شورائی[1]، مدیر اعزازی، مولانا شیخ محمد عظیم گنگوہی، قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ سالانہ چندہ چھ روپے ملنے کا پتہ دفتر لقائے رب" پارا سٹریٹ کراچی ع۲

ماہنامہ "لقائے رب" کے اب تک آٹھ شمارے نکل چکے ہیں، شورائی صاحب کے مضامین کو پڑھ کر اس کا اندازہ ہوا کہ وہ اپنی بات کہنے اور اپنے مفہوم کو ادا کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

"لقائے رب" میں مولوی صاحبان پر بہت کچھ طنز، طعن و تشنیع کی جاتی ہے کہ یہ لوگ نہ تو قرآن کریم کے سائنٹفک مفہوم سے باخبر ہیں نہ کمیونزم کی حقیقت کو جانتے ہیں، ان کا کام تو مرغن غذائیں کھانا اور نرم گدّوں پر آرام کرنا ہے . . . . لہٰذا:-

> " ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کے مسلمان سائنس دانوں کو اسلام کا سائنٹیفک مفہوم سمجھنے یعنی روح کے سائنسی ادراک کی طرف متوجہ کیا جائے تاکہ مولویوں اور پیروں کی پیدا کردہ بے شمار لغویات سے مسلمانوں کی جان چھوٹ جائے اور یہ قوم جھوٹی روحانیت کے ڈھونگ سے آزاد ہو کر بین الاقوامی مسائل کے حل میں دُنیا کی دوسری اقوام کی رہنمائی کر سکے (لقائے رب - ماہ مارچ سنہ ۶۰ء)

علماء حق کی دینی خدمات کا تو ہمیں اعتراف ہے مگر "مولوی صاحبان" سے ہم بھی خوش گمان نہیں ہیں، اور اس گروہ کی تمام کمزوریوں سے باخبر ہیں ——— مگر شورائی صاحب نے قرآن و حدیث کو اور دین کو جس طرح سمجھا ہے اور جس کے نہ سمجھنے کی مولویوں پر طنز فرمائی ہے، اُس کو پڑھ کر "مولوی صاحبان" تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور آیت نظر آنے لگے ——— ایک نمونہ:

> "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زمین پر بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرتے رہو بلکہ اللہ کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ زمین سے نکلنے کی کوشش کرو اور زمین ٹوٹنے سے پہلے مادی سے نوری بن کر اپنے تمام مُردوں کو زندہ کر کے میری قیادت میں جنت میں پہنچو۔"

یہ پوری عبارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کتنا بڑا جھوٹ ہے، مندرجہ بالا عبارت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے حضورؐ نے ایسا کبھی نہیں فرمایا، کسی حدیث کی کتاب میں حضورؐ کا کوئی قول ایسا نہیں ملتا جس میں وہ کچھ کہا گیا ہو، جو اس عبارت میں شورائی صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا ہے! اب رہی احادیثِ نبوی اور آیاتِ قرآنی کی من مانی

---

[1] جناب شورائی صاحب اس ماہنامہ کے کرتا دھرتا ہیں، لہٰذا اُن کے اپنے پرچے میں اُن نام کے ساتھ "علامہ" لکھا جانا کسی عنوان مناسب نہیں ہے! "علامہ" کا لقب تو شبلی نعمانی، سلیمان ندوی اور اقبال کو زیب دیتا ہے، اور شورائی صاحب فکر و علم اور تجربہ و مشاہدہ کے اعتبار سے اس صف کے آدمی کسی طرح بھی نہیں ہیں۔

[2] "لقائے رب" پر شاید "فاران" میں تبصرہ نہ ہوتا اور ہوتا تو بہت تاخیر سے، مگر شورائی صاحب نے خود دفتر "فاران" میں تشریف لا کر یاد دہانی کی تو ہم نے وعدہ کر لیا اور اُسی وعدہ کا ایفا کیا جا رہا ہے۔

تاویل تو مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ تک کہہ دیا ہے کہ "قادیان" کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے"! جب کوئی یہ فیصلہ کرلے کہ مجھے کوئی "جدید فلسفہ" پیش کرنا ہے اور اپنے مزعومہ تخیلات کی ایک نئی عمارت کھڑی کرنی ہے تو خدا کے خوف اور بندوں کی شرم کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا، آدمی ہر لغو سے لغو بات کہہ سکتا ہے۔ "باطنیہ فرقہ" نے "باطنی علوم" کی آڑ میں اللہ کے دین کو کھیل بنا ڈالا اور احکام الٰہی کی وہ تاویلیں کیں کہ اُن میں کی بعض باتیں تو شاید شیطان کو بھی نہ سوجھ سکتی تھیں۔

"قرآن کی رو سے دُنیا کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ نسل انسانی سائنس کی مدد سے کرۂ ارض سے آسمان پر جنت کی طرف اجتماعی ہجرت کرے یعنی تمام انسان جوہری توانائی اپنے جسم میں بھر کر نوری بن جائیں اور اپنے تمام "مردوں کو زندہ کرکے، زمین سے جنت کی طرف لے جانے والے راستے سے واقف ہستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں نوری گھوڑوں یعنی براقوں پر بیٹھ کر جنت کی طرف پرواز کریں ——
یہ ہے قرآن کی رُو سے دنیا کو چھوڑنے کا مطلب . . . " (ص ۲۲ - لقائے رب ماہ مارچ)

تمام کتب سماوی اور صحفِ آسمانی، خود قرآنِ کریم اور احادیثِ رسول اس کی گواہ ہیں کہ کسی نبی نے، رسول نے، صحابی نے تابعی اور مجاہدین و شہداء نے کرۂ ارض سے آسمانی جنت کی طرف اس "اجتماعی ہجرت" کی کوشش نہیں کی جس کا حوالہ شولائی صاحب نے دیا ہے! قرآن کریم تو دو ٹوک الفاظ میں یہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ مخلوق کو دوبارہ زندہ کریگا اور حساب کتاب کے بعد انسانوں کو اُن کے اعمال کے لحاظ سے جنت و دوزخ میں جگہ دی جائے گی۔

اور . . . سُنیئے :

"قریب قریب ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کو غیر مجسم مانتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کو غیر مجسم ماننا شرکِ عظیم ہے، اس سے بڑا اور گناہ کوئی نہیں کہ خدا کو بے جسم مانا جائے"

اس عبارت کے جواب میں ہم کیا کہیں سوائے اس کے کہ اس تصور سے کروڑ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں اور اپنی برأت کا اظہار کریں۔ استغفر اللہ! (سبحٰن اللہ عما یصفون)

"لقائے رب" کے اس شمارے میں قرآن کریم کی آیتوں کے ساتھ جو ضلالت آمیز مذاق کیا گیا ہے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ (سورہ رحمٰن)

(اے سائنس دانو اور انسانو! اگر تم کرۂ ارض اور خلا کے دوسرے کروں کے دائروں سے نکلنے کی استطاعت رکھتے ہو، تو پس نکل جاؤ۔ نہیں نکل سکتے، تم بغیر پاسپورٹ کے پس اپنے رب کی کونسی نشانی کو جھٹلاتے ہو" (لقائے رب)

صاحب "لقائے رب" نے "جن" کا ترجمہ "سائنس دانوں" کیا ہے؟ فکری کجی، ذہن کی اُپج اور عقیدہ کی گمراہی کا بڑی حد تک اندازہ اسی ترجمہ سے ہو سکتا ہے" — اور اس ترجمہ کے بعد اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی گئی ہے:—

"کلام پاک سمجھاتا ہے کہ زمین پر رہ کر زمین پر بسنے کے سامان تیار نہ کرو بلکہ زمین سے زندہ معہ جسم باہر بھاگنے کے سامان تیار کرو اسی زندہ مع جسم باہر نکلنے کو قرآن حکیم اپنے

مخصوص الفاظ میں سفرِ آخرت کی تیاری کہنا ہے۔"

اس آیت میں زمین سے زندہ جسم کے ساتھ باہر بھاگنے" کا کہیں اشارہ تک نہیں ہے، نہ اس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس آیت کے مفہوم کو اس طرح سمجھا تھا، اس آیت میں تو اللہ تعالیٰ جن وانس کو چیلنج کررہا ہے کہ تم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کی حکومت سے باہر بھاگ کر جا ہی نہیں سکتا، اس کے لئے تو قوت اور غلبہ (سلطان) کی ضرورت ہے، اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں مخلوق کے پاس قوت اور غلبہ کہاں ہے!

شورائی صاحب" زمین سے آسمانی جنت کی طرف جسم کے ساتھ ہجرت اجتماعی کی جو دعوت لے کر اٹھے ہیں، اور جو نرالا فلسفہ انھوں نے تراشا ہے"، وہ سر سے لے کر پیر تک اور اول سے آخر تک گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے! وہ ہوائے نفس اور شیطان کے شدید ترین فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں! اس فلسفہ کا اس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا کہ کچھ بے دماغ لوگ اس جذبہ انتشارِ فکر کا شکار ہو جائیں، اور شورائی صاحب اپنی اس کامیابی پر خوش ہولیں!

کفر خالص اور کھلے ہوئے باطل کے مقابلہ میں یہ "باطنی فتنے" جو خدا اور رسولؐ اور امت کی اصلاح و ترقی کے نام پر اٹھائے جاتے ہیں، بڑے خطرناک اور زہریلے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کی پرچھائیں سے بھی بچاتا رکھے!

اسلامی نظریہ اجتماع

از: حکیم حیدر زماں صدیقی، ضخامت ۲۲۰ صفحات (مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ) قیمت: تین روپے

ملنے کا پتہ: عتیق الرحمٰن صاحب صدیقی۔ ٹیچر گورنمنٹ، ماڈل پرائمری اسکول ہری پور ہزارہ

اس کتاب کے ابواب یہ ہیں:

اجتماعیت کا ترا کی تصور —— شعورِ ذات کی تکمیل —— اسلامی نظام اجتماع —— جاہلیت کا نیا بھیس ہندو پاکستان میں اسلام و جاہلیت کی ٹکر —— جاہلیت کا نیا کارنامہ —— اقوام حاضرہ کے نظریہ ہائے اجتماع۔ عصرِ حاضر کے عناصر قومیت —— اسلام کا نظریہ قومیت —— اسلام کا نظام اجتماع —— اسلامی اجتماعی و تمدن کے چند اہم اجزا۔

یہ کتاب ایک طرف ہیگل، ڈارون اور مکیاولی کے فلسفہ اور مغربی تہذیب و تمدن اور اس کے نظریہ اجتماع کی کمزوریوں کو بے نقاب کرتی ہے تو دوسری طرف اُن کے مقابلہ میں اسلام کے نظریہ اجتماع کو پورے یقین و اطمینان کے ساتھ پیش کرنے کی مثبت کوشش ہے!

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ خود مسلمان بادشاہوں کے دور میں جو "جاہلیت" ابھر آئی تھی، اس کے مقابلہ کے لئے امام احمد بن حنبل امام شافعی، امام بخاری اور مجدد الف ثانی (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسی شخصیتوں نے منظر عام پر آکر عزیمت و استقامت کا ثبوت دیا تھا فاضل مصنف کا اندازِ بیان دل کش اور اثر انگیز ہے، یہ کتاب "اقامتِ دین" کی علمی جدوجہد کا روشن باب ہے، کتاب کا خاتمہ بخاری کی اس حدیث پر ہوتا ہے کہ:

الطاعۃ فی المعروف —— (کسی کے حکم کی) اطاعت صرف نیک کام میں ہی ہو سکتی ہے۔

ع ۱ صفحہ ۱۰۵ پر "البشر حافی" کو جو "بشر حانی" (ف کے بجائے ن) لکھا ہے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

نئی کرن

از : انور ڈیرہ دونی، ضخامت ۲۴ صفحات، قیمت چھ آنہ
ملنے کا پتہ : عباسی مارکیٹ، ماڈل کالونی۔ کراچی

اس کتابچہ میں جناب انور ڈیرہ دونی کی سولہ اصلاحی اور قومی نظمیں شامل ہیں، کوئی شک نہیں انور صاحب قوم کی اصلاح کا جذبہ اور درد رکھتے ہیں، اُن کے خیالات بھی پاکیزہ ہیں مگر اس کو کیا کیجیے کہ ان کے کلام میں پختگی اور روانی ابھی تک پیدا نہیں ہوئی، اور وہ چیز جسے "شعریت" کہتے ہیں، اس کی جھلک اُن کے کلام میں دکھائی نہیں دیتی۔

الٰہی ہمیں ذوقِ لوح و قلم دے علوم و فنونِ زمن چاہتے ہیں (ص ۹)

"شوق لوح و قلم" کہنا چاہیے تھا۔ اور پھر اس "علوم و فنون زمن" کا بھی کوئی جواب ہے۔

خدمت سے ضعیفوں کی جرائیں گے نہ جی کو امداد یتیموں کی صبح شام کریں گے (ص ۱۱)

شاعر کو "صبح" کا وزن تک نہیں معلوم!

جس طرز سے توہینِ شرافت ہو ہویدا اس طرز میں ہم آگ لگا کر کے رہیں گے (ص ۱۷)

"طرز میں آگ لگانا" توبہ!

صحت اچھی متاعِ عشرت ہے صحت بگڑی غم و اذیت ہے (ص ۲۴)

مصرعہ ثانی میں "بگڑی" کی "ی" تقطیع سے گر رہی ہے، اس نظم کے آٹھ مصرعے اسی طرح ناموزوں ہیں۔

محبوبِ کبریا کی آمد

از : سید اشفاق حسین رضوی، ضخامت ۵۶ صفحات (کتابت، طباعت اور کاغذ ہر چیز دیدہ زیب اور نظر افروز) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔
ملنے کا پتہ : مصنف سے، کوچہ میر انیس، لکھنؤ (بھارت)

یہ کتاب حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نعت و منقبت میں بڑے اہتمام اور عقیدت و محبت کے ساتھ لکھی گئی ہے، ایک ایک سطر سے عشق رسولؐ جھلکتا ہے ——— "فسانۂ عجائب" کے رنگ نے صنائع بدائع کے التزام کے ساتھ تحریر کی روانی اور بے ساختگی میں "بناوٹ" اور "آورد" بھی پیدا کر دی ہے!

"جاہل و جہلا اپنی جہل و جہالت سے مجہول ہو کر رہ گئے، جو اجہل الجہال اور ابو جہل تھے وہ بری طرح ہلاک ہوئے، جو قابل و اقبل تھے، انھوں نے قبل ہی قابلیت دیکھ کر اطاعت قبول کر لی اور مقبول بارگاہ ہو گئے۔۔۔" (ص ۴۲)

اور

"صلوٰۃ و سلام اس ذاتِ افضل پر جن کی افضلیت تمام فاضل الفضلا میں فضیلت رکھتی ہے، جو فضل فضال کے فضلِ فضیل ہیں اور فضائل میں سب سے مفضول ہیں" (ص ۵)

اس زمانہ میں یہ طرز تحریر "مضحکہ" کے سوا اور کیا ہے؟

"چاند و سورج، معبدگاہ، بلبلۂ آب" جیسی غلطیاں بھی اس کتاب میں ملتی ہیں! مصنف کی خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ کتاب پر "جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ" لکھوایا گیا ہے۔

(۱) اصولِ دعوت اسلام ـــــ اور (۲) اسلام میں دعا کی اہمیت

(۱) از: مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، ضخامت ۹۶ صفحات قیمت:
(۲) از: مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی مرحوم و مغفور، ضخامت ۹۴ صفحات، قیمت:
ملنے کا پتہ: ادارۂ تاج المعارف دیوبند (یو-پی)

(۱) یہ دونوں کتابیں ایک ہی جلد میں شامل ہیں، ادارۂ تاج المعارف دیوبند کے سہ ماہی سلسلہ مطبوعات کی یہ تیرھویں دینی پیشکش کیا ہے! حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کے دعوتی نظام کی وضاحت کی ہے! اس کتاب میں دعوتی سفر، دعوت، اور دعوت کے مخاطبین کی اقسام بیان کی گئی ہیں ـــــ اور یہ بھی کہ سماعتِ دعوت کے آداب کیا ہیں! اور داعی میں ذاتی طور پر کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے! کوئی شک نہیں کہ اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد و ممتاز کتاب ہے، اس کتاب نے امام غزالی کے اندازِ فکر کو تازہ کر دیا ہے! مبلغین اور واعظین کو اس کتاب سے ضرور استفادہ کرنا چاہیئے کہ دین کی دعوت خلوص و بے نفسی کے ساتھ اپنے وقار اور بعض دوسری نفسیاتی نزاکتوں کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔

(۲) "اسلام میں دعا کی اہمیت" یہ کتاب بھی اپنے موضوع پر بہت مفید اور کار آمد ہے! "دُعا" پر بعض لوگوں نے جو اعتراضات وارد کیے ہیں، اُن کو بھی اس کتاب میں بڑی خوبی کے ساتھ رفع کیا گیا ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے تعلق باللہ میں رسوخ و استحکام پیدا ہوتا ہے!

ادارۂ تاج المعارف ان کتابوں کی اشاعت پر تبریک و تحسین کا مستحق ہے۔

درسِ توحید

شائع کردہ:- معاونین انجمن اصلاح المسلمین ۳۵۱ پیر باڑا، راولپنڈی ضخامت ۴۶ صفحات
(محصول ڈاک ایک آنہ بھیج کر یہ کتاب انجمن مذکور سے حاصل کی جا سکتی ہے)

یہ کتنی بڑی بد بختی ہے کہ جو قوم "توحیدِ خالص" کی داعی اور علمبردار ہے، اُس قوم میں طرح طرح کی بدعتیں اور مشرکانہ رسمیں پھیل گئی ہیں، کوئی خدا کا بندہ اصلاحِ حال کی کوشش کرتا ہے تو اس دعوتِ حق کو "وہابیت" کی پھبتیوں اور چٹکیوں میں اڑا دیا جاتا ہے! اس کتاب کے مُرتبین اور ناشرین کو اللہ تعالیٰ دارین میں اجرِ عظیم عطا فرمائے گا کہ انھوں نے شرک و بدعت کے رد میں بڑی مفید اور کار آمد چیز مُرتب کی ہے! یہ کتاب اس قابل ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں اسے از خود لوگ چھپوائیں، اور مسلمانوں میں پھیلا دیں!

ملا جمعراتی

از: محمود الحسن بدایونی، ضخامت ۳۲ صفحات - قیمت ۵/ (۳۱ نئے پیسے) رنگین ٹائیٹل
ملنے کا پتہ: ماہنامہ "مومن" محلہ نابرخاں بدایوں (یو-پی)

یہ ایک طنزیہ افسانہ ہے، جس میں ایک بدعتی و دنیا دار پیر کا کردار پیش کیا گیا ہے، جہاں تک "نفسِ کردار" کا

ف: صفحہ ۲۱ پر "وقال ربکم ادعونی استجب لکم" کا یہ ترجمہ "تمہارے رب نے کہا مجھ کو پکارو میں اجابت کروں گا" بہت کھٹکا، آئندہ اشاعت میں اس کھلے ہوئے ذم (میں اجابت کروں گا) کو موزوں الفاظ سے ضرور بدل دینا چاہیئے۔

اور افسانہ نگار کے جذبۂ اصلاح کا تعلق ہے، یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ لائق قدر و ستائش ہیں.... مگر کتاب میں تحریر کے اس رنگ!

"اس کے علاوہ علم و عمل کی لایعنی جھنجھٹ سے قطعاً خالی الذہن اپنے چند حوارین کے
حلقہ میں اپنا اجدادی اور آبائی اثر و وقار قائم و برقرار رکھنے کے لئے...."

نے افسانہ اور اس کی ٹیکنک کو کمزور کر دیا ہے!

ماہنامہ "اچھا ساتھی" ادارہ: رشید ارشد، آمنہ فاروقی، محمد خالد فاروقی، بلقیس مدنی۔ سالانہ ۴ روپے قیمت فی پرچہ چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ: دفتر ماہنامہ "اچھا ساتھی"، بارنس اسٹریٹ، کراچی ۳ء

"اچھا ساتھی" بچوں کا دلچسپ پرچہ ہے، جس کے تین شمارے اب تک آچکے ہیں، جن کے مضامین بچوں کے لئے ہر اعتبار سے مفید اور کام کے ہیں، سب سے خوبی کی بات یہ ہے کہ قریب قریب ہر مضمون میں نونہالوں کی اخلاقی تربیت کی رعایت رکھی گئی ہے، نظمیں، کارٹون، افسانے، لطیفے، خطوں کے جواب، سب کے سب دلچسپیوں سے لبریز ہیں، دینی رنگ خاصہ نمایاں ہے جس نے اس ماہنامہ کی افادیت کو چار چاند لگا دیئے ہیں ——— ماہنامہ "اچھا ساتھی" واقعی بچوں کا "اچھا ساتھی" ہے!

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

رکن : انجمن ادبی رسائل پاکستان

فاران

کراچی

جلد ——— ۱۲
شمارہ ——— ۵

ایڈیٹر : ماہر القادری

ماہ اگست سنہ ۱۹۶۰ء

سالانہ
چھ روپے

فی پرچہ
آٹھ آنے

ترتیب

مقام اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر : مسرور حسین

مطبوعہ : مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقش اوّل

اسلام کی سربلندی اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو غالب کرنے کے لئے جو کوئی جتنی بھی کوشش اور تگ و دو کر رہا ہے وہ تبریک و تحسین ہی کا نہیں، پوری ملت کی جانب سے نصرت و تائید اور رفاقت و معاونت کا بھی مستحق ہے! وہ چاہے کسی ملک کا آئین و دستور ہو، معاشرہ ہو، یا کوئی علمی ادارہ اور مرکزِ اکتشاف ہو" اسلام" سے ان کی وابستگی کا جب بھی ذکر آجاتا ہے تو اسلام پسندوں کے دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتے ہیں!

مگر

جو لوگ" اسلام" کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کی سربلندی کا ولولہ اور داعیہ اپنے اندر رکھتے ہیں، اُن کے لئے سب سے پہلے اس چیز کی ضرورت ہے کہ وہ اسلام کا صحیح علم بھی رکھتے ہوں، کتاب و سُنّت کے تقاضوں سے واقف ہوں اور معروف و مُنکر کو پہچانتے ہوں، اور اس علم و خبر کے ساتھ ساتھ خود اُن کی زندگی بھی عملاً اسلام کی شہادت دیتی ہو، اور بہ تقاضائے بشری اخلاق کی جو کمزوری پائی جاتی ہو۔ اُس پر اُن کو فخر نہیں ندامت ہو! علم و آگہی اور فکر و عمل کے اس امتزاج کے ساتھ اُمت کی اصلاح کے لئے جو کوشش کی جائے گی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی مقبول ہوگی اور بندوں کو بھی اُس سے فائدہ پہنچے گا۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ملک و ملت کے خدمت گزاروں اور دین کے داعیوں کو" اسلام کا صحیح علم رکھنا چاہیئے" تو اُس سے نہ تو کسی پر طنز مقصود ہوتی ہے، اور یہ بات کہتے ہوئے نہ یہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے کہ" اسلام کا صحیح علم صرف ہم رکھتے ہیں"۔ اور نہ اس اظہارِ حقیقت کو اس پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ ہم لوگوں سے بدگمان ہیں اور اصلاح و انقلاب کی کوششوں کے بارے میں بدگمانی اور غلط اندیشی سے کام لیتے اور بدفالی کی باتیں منہ سے نکالتے ہیں! اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے کہ ہمارے ذہن و فکر اور دل و دماغ اس قسم کے گھٹیا اور پست تصورات سے پاک و صاف ہیں!

تعمیری کوششوں میں جو کوئی دانستہ یا نادانستہ رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اللہ کا، ملت کا اور انسانیت کا بہت بڑا دشمن ہے، ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے، اُس پر بے صبری سے پھبتی چسُت کرنے سے پہلے، ہماری گزارشوں کو پڑھ لیا جائے، تاکہ ذہن صاف ہو جائے، اور ہماری بات اور ہمارا موقف سمجھ میں آجائے۔

کوئی شک نہیں زندگی جد و جہد اور عمل ہی کا نام ہے، حرکت ہی میں برکت ہے، سفر اور مسلسل سفر ہوش سنبھالنے کے لمحات سے لے کر آخر دم تک عمل ہی عمل، حرکت ہی حرکت، ہر آن تگ و دو اور ہر لمحہ ......

آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

لیکن

صرف" حرکت، عمل، سرگرمی اور جد و جہد" تحسین کی مستحق نہیں ہوتیں، اور نہ انہیں محمود کہا جاسکتا ہے، دیکھنا یہ چاہیئے کہ جد و جہد کس مقصد کے لئے ہو رہی ہے؟ اور کس غرض کے لئے یہ تگ و دو کی جا رہی ہے؟ ایک سپاہی وطن کی مدافعت کی خاطر حملہ آوروں کو زیر کرنے کے لئے اپنی

جان کی بازی لگادیتا ہے، دوسری طرف ایک ڈاکو بھی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ڈاکہ ڈالتا ہے ——— تو کیا صرف جان کو خطرے میں ڈالنے اور حرکت و عمل کے پُرجوش مظاہرے کو دیکھ کر، سپاہی اور ڈاکو دونوں کو سراہا جائے گا! کیا اُن دونوں کا صرف گرمیٔ عمل کی یکسانی کے سبب ایک ہی موقف قرار دیا جائے گا؟ نہیں ایسی ناانصافی کوئی انسان ہوش و حواس کے عالم میں نہیں کرسکتا، ان دونوں کی سرگرمیٔ عمل کے مقاصد مختلف اور متضاد ہیں، اس لئے سپاہی اور ڈاکو کی جدوجہد، بے خوفی اور جرأت و جسارت کے بارے میں بھی مختلف احکام لگائے جائیں گے! ایک طرف بلندی، عزت اور بھلائی ہے، اور دوسری طرف پستی، ذلت اور بُرائی ہے!

——— تو ———

تعمیر و ترقی اور اصلاح و انقلاب میں اصل اعتبار مقصد کا ہے، اگر مقصد نیک ہے تو یہ تعمیر و ترقی بھی مبارک ہیں اور مقصد نیک نہیں ہے، تو یہ تمام تعمیر فاسد ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیت خیر کی اور مقصد نیک ہی ہوتا ہے، مگر بے خبری، غفلت اور ذہول کے سبب راہِ عمل غلط متعین ہوجاتی ہے ——— مثلاً ایک قافلہ کو جانا تو مکۂ معظمہ کی طرف ہے، مگر وہ ایک ایسے راستہ پر ہولیتا ہے جو لندن کی طرف جاتا ہے تو اس قافلہ کے سفر اور جوشِ عمل کی تحسین نہیں تنقیص کی جائے گی کہ سفر تو بے شک ہورہا ہے مگر سفر کی سمت غلط ہے جو مسافروں اور قافلہ والوں کو مکہ کے بجائے لندن پہنچادے گی۔

ایک دوسری مثال: ———

ایک طبیب کی نیت بخیر ہے، وہ مریضوں کو اچھا کرنے اور اُن کی بیماریوں کے دور کرنے کے لئے ہی نبض دیکھتا، نُسخے لکھتا اور دوائیں تجویز کرتا ہے، مگر بدقسمتی سے وہ تریاق اور زہر میں تمیز نہیں کرسکتا، اور زہر کو تریاق سمجھ کر ہی مریضوں کو دیئے جاتا ہے، ظاہر ہے کہ طبیب کی نیک نیتی کے باوجود مریضوں کو نقصان پہونچ کر رہے گا، اور نیک نیتی زہر کے نقصان کی تلافی نہیں کرسکتی۔

یہ باتیں ہم کسی مفروضہ اور توہم کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں، دُنیا میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ بدنیتی اور غلط مقصد ہی نے نہیں، نیک نیتی اور جذبۂ خیر خواہی کے ہوتے ہوئے جہالت و بے خبری نے بھی بہت کچھ نقصان پہنچایا ہے اور راہِ عمل کے غلط تعین نے بھی قوموں کو تباہ کیا ہے!

صنادید قریش اپنی قوم کے دُشمن نہیں تھے بلکہ بہت بڑے خیر خواہ تھے اور عرب قوم کی سربلندی ہی چاہتے تھے، بُت پرستی، شراب نوشی، بدکاری، قمار بازی، راگ رنگ، عورتوں کی عُریانی اور مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط کو وہ عرب قوم کی ترقی کا سبب ہی سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ زمانہ کی تہذیب کا ساتھ دے رہے ہیں اور ایران و روم کے شاہانہ تمدن کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔

اسلام اور مادی ترقی

اب سے تقریباً چودہ سو سال قبل صرف عرب قوم ہی نہیں، ساری دُنیا فساد و تخریب کا شکار تھی اور یہ بات ایک یہودی اور عیسائی تک کو معلوم ہے کہ خدا کے آخری نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے دُنیا کو کیا پیام دیا، کن چیزوں کو مٹایا، کن چیزوں کو باقی رہنے دیا اور کن کو قائم کیا۔ حضورؐ نے سوسائٹی اور حکومت کو کن اخلاقی بنیادوں پر استوار فرمایا، اللہ تعالیٰ کے حکم سے کس پر "معروف" (good) کا اور کس پر "منکر" (evil) کا حکم لگایا، یہ تمام حقائق روز روشن کی طرح واضح اور عیاں ہیں، ان میں کوئی ابہام نہیں، پیچیدگی نہیں، ذومعنویت نہیں!

اسلام ٹھیک وہی ہے جو "کتاب و سُنت" میں محفوظ ہے، اور جب بھی اسلام کا نام لیا جائے گا، اس سے "کتاب و سُنت" ہی مراد ہوگی! اسلام مکمل ترین ضابطۂ حیات ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے اور اس کے علاوہ ہر مذہب، ہر مسلک اور ہر طریقۂ حیات

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، روشنی صرف اسلام میں ہے، باقی ہر جگہ اندھیرا ہے، اور جہاں تھوڑی بہت روشنی دکھائی دیتی ہے، وہ اسلام ہی کا صدقہ ہے اور اسی گوہر شب چراغ کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔

اُمت کی اصلاح و تعمیر کی جو کوشش بھی ہوگی وہ لازماً اسلام یعنی کتاب و سُنّت ہی کے احکام اور تعلیمات کے ماتحت ہوگی اور ہونی چاہیے! اسلام میں بے شک وسعت اور لچک بھی پائی جاتی ہے مگر اس وسعت اور لچک کے بھی حدود ہیں، کوئی شخص اس وسعت اور لچک کی لے کو اتنا بڑھا دے کہ خود اسلامی اصولوں پر اس توسّع اور آزادیٔ فکر کی زد پڑتی ہو تو ایسی کوشش خود اسلام کے ساتھ بڑا ظلم ہے وسعت اور لچک کی بے اعتدالی اور افراط و تفریط کا یہی وہ مقام ہے، جہاں اسلام فولاد سے زیادہ سخت بن جاتا ہے کہ جس کو نہ موڑا جا سکتا ہے اور نہ لچکایا جا سکتا ہے۔

اسلام چوں کہ دینِ فطرت ہے اس لئے وہ دُنیا کی ہر بڑی سے بڑی اور حیرت انگیز ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ سائنس سے اسلام کا کوئی تصادم نہیں ہے اور نہ اسلام نے کلیسا کی طرح کسی گلیلیو کو ہدفِ احتساب بنایا ہے، مگر اس فرق کو بھی سمجھ لینا چاہیے اسلام دُنیا کی "ترقی" کا ساتھ دے سکتا ہے، دُنیا کی ناجائز خواہشوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

سود خواری، بُت تراشی، قمار بازی، شراب نوشی، فحاشی، رقص و عُریانی اور اس قسم کی تمام خرافات یہ "ترقیاں" نہیں برائیاں اور پستیاں ہیں، اور اسلام ان خرافات اور برائیوں میں ایک قدم بھی زمانہ کی خواہشات کا ساتھ نہیں دے سکتا ——— اب کوئی قوم کا مُصلح پوری دردمندی اور نیک نیتی کے ساتھ اسلام کو ان خرافات کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لئے جدوجہد کرے اور اس غلط آہنگی کو اُس نے اپنے ذہن میں "ترقی و تعمیر" فرض کر لیا ہو۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کے اس جذبہ کو، مقصد کو اور جدوجہد کو نہیں سراہا جا سکتا

مرد و زن کے بے باکانہ اور آزادانہ اختلاط کے ساتھ جہاں کہیں بھی آرٹ کی، طب کی، فوجی تربیت کی، سائنس اور فلسفہ کی ترقی ہو رہی ہے، وہ ترقی اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے اور وہ ترقی مسلمانوں کی نہیں، فرنگیوں، جاپانیوں اور کمیونسٹوں کی ترقی ہے۔

کی ترقی جو مُسلماں نے فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے، مُسلماں کی نہیں (اسد مُلتانی)

آج دُنیا کی دوسری قومیں کس قدر ذوق و شوق اور فخر و ناز کے ساتھ اپنی عورتوں کو حُسن کے مقابلوں میں بھیجتی ہیں مگر اُمتِ مسلمہ تو اس ننگ کو گوارا نہیں کر سکتی اب کسی مُسلمان کے دماغ میں یہ خناس سما جائے کہ حُسن کے مقابلوں میں مُسلمان عورتوں کے شریک نہ ہونے سے قوم ترقی و تہذیب کی اس دوڑ میں پیچھے رہی جا رہی ہے اس لئے دانشوروں اور مفکروں کو چاہیے کہ حُسن کے ان مقابلوں کے تئیں اسلام کو ہم آہنگ بنائیں اور روایت پرستی کو چھوڑ کر زمانہ کے تجدد و تنوع اور تہذیب و ثقافت کی رنگا رنگی کا ساتھ دیں ——— تو کون غیرت مند مسلمان اس خیال کی، جذبہ کی اور روشن خیالی کی تائید کر سکتا ہے۔

اسلام میں بے شک بڑی حرکت، گرمی، توانائی اور لچک پائی جاتی ہے، مگر اُس کی یہ تمام قوتیں اس لئے ہیں کہ ان سے اسلام کی سربلندی کے لئے کام لیا جائے، نیکیوں کو پھیلایا جائے اور بُرائیوں کو مٹایا جائے، اسلام کی توانائیوں کو اُن مقاصد میں صرف کرنا جو مقاصد اسلام کی تعلیمات کی ضد ہیں اسلام کے ساتھ بڑا اسفناک مذاق ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں منحوس ترین دن وہ تھے، جب باہر کے معزز مہمانوں کو مسلم خواتین نے سینے تان کر سلامیاں دی تھیں اور بے پردہ ہو کر اور بن ٹھن کر اُن کا خیر مقدم کیا تھا، جو ذہن اس طرز پر سوچتے ہیں، وہ خود اصلاح و تربیت اور تہذیب و تزکیہ کے محتاج ہیں یہ وہ روحانی اذیت ہے، جس کا اظہار لفظوں میں نہیں کیا جا سکتا ——— روس میں، امریکہ میں، انگلستان اور

جاپان میں، عورتوں کے اس قسم کے مظاہروں کو ترقی کی نشانی، زندگی کا مظہر اور تہذیب و تمدن کے آثار و عوامل سمجھا جاتا ہوگا کہ ان ملکوں میں غیرت و شرافت کا جنازہ نکل چکا ہے، مگر مسلمان قوم تو غیرت و شرافت کی امین اور عورت کی عزت و عصمت کی محافظ ہے، وہ پستی کی اس سطح تک کہاں اُتر سکتی ہے۔

اگر دنیا یہ توقع رکھتی ہے کہ اسلام دُنیا کی ناجائز خواہشوں کا ساتھ دے گا اور وہ اُس کے جذبہ ہوا و ہوس سے ہم آہنگ اور مربوط ہو جائے گا تو ایسی بگڑی ہوئی دنیا کو اسلام سے واقعی مایوس ہو جانا چاہیئے، اور اسلام بھی ایسی فساد پسند دنیا کی برہمی، ناراضی اور مایوسی کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتا، اور اگر دُنیا جائز ترقیوں میں اسلام کی تائید و ہمنوائی چاہتی ہے تو اسلام کو وہ اپنا سب سے بڑا ہمنوا، رفیق دوست بلکہ محسن پائے گی۔

اسلام مہ و مہر اور عطارد و مشتری کی تسخیر میں دُنیا کے ساتھ ہے ان ایجادات اور ترقیوں سے اسلام کے اصول کہیں نہیں ٹکراتے مگر اسلام ناچ رنگ کے جلسوں اور ہوا و ہوس کے مظاہروں میں دُنیا کی رفاقت نہیں کر سکتا کہ اسلام کی نگاہ میں یہ تمام باتیں "ترقی" نہیں "تنزل" کی نشانیاں ہیں، اسلام دُنیا کی سربلندی کا ساتھی ہے، دُنیا کی گراوٹ کا ساتھی نہیں ہے۔

ایسے ہی مسلمان تو ان میں "بورقیبہ" جیسے مسلمان بھی موجود ہیں، جن کے سوچنے کا طریقہ اسلام کی عین ضد واقع ہوا ہے، اور سوءِ اتفاق سے جناب بورقیبہ کو ایک ایسے زمانہ ساز مفتی بھی ہاتھ لگ گئے ہیں، جنھوں نے رمضان کے فرض روزوں کی معافی کا فتویٰ صادر فرما دیا ہے۔ جمال ناصر صاحب کی فرمانروائی کا تخت "اخوان" کی لاشوں پر بچھا ہے . . . . آہ! کس زخم کو چھپایئے اور کسے ظاہر کیجئے!

تصویر کے دونوں رُخ دیکھئے!

تصویر کے صرف ایک رُخ کے دیکھنے ہی میں محو نہیں ہو جانا چاہیئے اس قسم کی محویت بڑی خطرناک محویت ہے، تصویر کے دونوں رُخ سامنے رہنے چاہئیں، خلافتِ راشدہ کے دورِ سعید میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے تصویر کے دونوں رُخ روشن و تابناک نظر آتے ہیں، دین و دنیا کی دوش بدوش ترقی! ملک بھی فتح ہو رہے ہیں، مالِ غنیمت بھی آ رہا ہے، حکومت کی آمدنی بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ نیکیاں بھی پھیل رہی ہیں، معاشرے کی تطہیر کا کام بھی جاری ہے اور اسلام غالب طاقت اور قوت نافذہ بن کر اسلامی حکومت پر چھایا ہوا ہے۔

مادی ترقیوں کے ہم منکر نہیں ہیں لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے، مادی ترقیوں کے ساتھ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ مادی ترقیوں کے آگے دین کے تقاضے کہیں دب کر تو نہیں رہ گئے، اللہ اور رسولؐ کے احکام کی تعمیل کے لئے کیا کیا گیا؟ دُنیا کی ترقی حدود اللہ پر تو اثر انداز نہیں ہوئی؟ کتنے معروف قائم ہوئے اور کتنے منکر مٹائے گئے! حلال و حرام میں کس حد تک امتیاز برتا گیا؟ اگر تصویر کے دونوں رُخ روشن ہیں اور دین و دُنیا کی ترقی کے دونوں پلڑے برابر ہیں، تو ہماری داد و ستائش کیا چیز ہے، حظیرۃ القدس سے ایسے مخلص، حق شناس اور فعال کار پردازوں کے لئے بشارتیں آئیں گی اور اللہ تعالیٰ کی نصرت قدم قدم پر اُن کی رفاقت کرے گی، اور اگر معاملہ اس کے برعکس نکلا کہ دُنیوی ترقی کے مقابلہ میں دین کے تقاضے دب کر رہ گئے، نہ کوئی منکر مٹا اور نہ کوئی معروف قائم ہوا تو مادیت کی شاندار سے شاندار ترقی کو بھی نہیں سراہا جائیگا۔ دین و دنیا کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے بلکہ دین کے مقابلہ میں دُنیا تھوڑی بہت دب بھی جائے، تو اس میں بھی کوئی خسارہ نہیں ہے، مگر دین کا موقف کمزور رہا، تو یہ بہت ہی گھاٹے کا سودا ہے!

ایک مسلمان کا اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہے، اُس کی پوری زندگی اسی ایک محور کے اردگرد مصروفِ عمل اور سرگرمِ کار رہنی چاہیئے، اسی سے اُس کی دُنیا بھی درست ہوگی۔ اور دین بھی! دُنیا کی زندگی حد سے حد سو سوا سو برس کی ہو سکتی ہے مگر آخرت کی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے، دُنیا سرائے فانی ہے اور آخرت ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے، اُس آدمی کی یقیناً مت ماری گئی ہے جو اپنے

اصلی گھر سے بے پروا ہو کر، سرائے کی ٹیپ ٹاپ اور اُس کے سنوارنے ہی میں محو ہو کر رہ جائے!

بے گھروں کے لئے گھر بنانا اور انہیں بسانا بہت بڑی نیکی ہے، مگر بے گھروں کے لئے کوارٹروں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اُن کے نماز پڑھنے کے لئے مسجدیں بھی ضرور بننی چاہئیں، مسلمانوں کی کسی بستی اور نوآبادی کا نقشہ مساجد کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تشریف لاکر، سب سے پہلے مسجد کی بنا ڈالی تھی! مسلمانوں کی ایسی نوآبادی جس میں رہنے کے مکانات تو ہوں مگر مساجد نہ ہوں، دینی نقطۂ نگاہ سے ویرانہ سے بدتر ہے۔

اسلام افلاس اور ناداری کی ہرگز ہرگز تعلیم نہیں دیتا۔ حدیث شریف میں افلاس و ناداری سے ڈرایا گیا ہے کہ اس سے ایمان تک خطرے میں پڑ جاتا ہے، انفرادی طور پر ہر مسلمان کو اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کی حکومت کو کسی کا دست نگر نہ رہنا چاہئے! زرمبادلہ کو زیادہ سے زیادہ بچانے کی پالیسی یقیناً قابلِ تعریف ہے تاکہ حکومت کا مالیہ مستحکم ہو اور بین الاقوامی دنیا میں اس کی ساکھ قائم ہو جائے مگر یہی قابلِ تعریف پالیسی بہت کچھ قابلِ غور ہو جاتی ہے، جب فریضۂ حج کی ادائگی پر پابندی لگا کر زرمبادلہ بچایا جاتا ہے۔

یہی وہ سامنے کی باتیں ہیں، جن سے تصویر کے دونوں رُخ واضح ہو جاتے ہیں، روشن اور تاریک، ! ابوالفضل اور فیضی کی ذہانت مثالی ذہانت تھی مگر اُن کی یہ ذہانت بہت کچھ شہنشاہ اکبر کی زندگی کے تاریک رُخ کی مدح سرائی بلکہ اس سیاہی کو اور گہرا بنانے میں صرف ہوئی، دوسری طرف حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت ہے کہ انھوں نے ہارون الرشید کی زندگی کے تاریک رُخ کو پوری جرأت کے ساتھ بے نقاب کر دیا، ہارون الرشید حضرت سفیان ثوری کے اس مکتوب بلکہ یوں کہئے منشورِ احتساب اور ہدایت نامہ کو رات کی تنہائیوں میں پڑھتا تھا اور روتا تھا! اللہ تعالیٰ ہر سلطنت کے اربابِ اقتدار اور صاحبانِ امر و اختیار کو حضرت سفیان ثوریؒ جیسے مشیر، ناصح اور محتسب عطا کرے، جو پوری دیانت داری، خوفِ خدا اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ، کسی کی تنقیص کی نیت سے نہیں بلکہ جذبہ خیر خواہی کے تحت اُن کی کمزوریاں اُن پر ظاہر کرتے رہیں۔

جس کی جتنی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں، اُتنی ہی اُسے لوگوں کی شکایتیں سننی پڑتی ہیں، حکومت پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے۔ یہ عوام کے سامنے جواب دہی اور مسئولیت کا وہ مقام ہے کہ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر خلیفہ کو ایک بدوی بر سرِ منبر ٹوکتا ہے اور حضرت عمرؓ اُس کے احتساب کا بُرا نہیں مانتے بلکہ دلیل و شواہد سے اُس کو مطمئن فرماتے ہیں۔

پاکستان تعمیر و اصلاح کے دور سے گزر رہا ہے، اُس دور میں ایک ایک دیوار اس طرح اُٹھنی چاہئے کہ اُس میں ذرا سی بھی کجی نہ ہو، معاشرہ ہو یا حکومت، فرد ہو یا قوم، ان سب کے لئے ایک اسوہ اور نمونہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے درمیان موجود ہے، اسی اُسوہ کی اساس پر تعمیر ہو گی، تو یہ تعمیر سراپا خیر و برکت ثابت ہو گی۔ انگریز اپنے دورِ حکومت میں ٹیکس وصول کرتا تھا اور اپنے قانون کی تعمیل چاہتا تھا اسے ہمارے بناؤ اور بگاڑ کی کوئی فکر نہ تھی، اُس کی حاکمیت اسی بے اخلاق نظامِ حکومت کے سہارے قائم تھی، پاکستان بننے کے بعد بھی سیاست دانوں نے انگریز کی اس پالیسی کو جوں کا توں رہنے دیا، اور عوام کی زندگیوں کو اخلاقی طور پر سنوارنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا، اس دورِ تعمیر و انقلاب میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ عوام کی اسلامی اخلاق کی بنیادوں پر تربیت کی جائے!

بُرائیوں کو دیکھ کر دل میں چبھن اور بھلائیوں کو دیکھ کر طبیعت میں انشراح پیدا نہ ہو اور اپنی کمزوریوں پر ندامت نہ ہو، تو سمجھ لینا چاہئے کہ ذہن و فکر اور دل و دماغ بد اخلاقی کی دق میں مبتلا ہو چکے ہیں، اس دق کا اگر علاج نہ کیا جائے تو اخلاقی موت بلکہ ایمانی موت تک کے واقع ہونے کا اندیشہ ہے ـــــــ خواص و عوام سبھی اصلاح کے محتاج ہیں اور ان سطور کا لکھنے والا بھی! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اصلاحِ حال کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

ماہر القادری ۲۵ جولائی سنہ ۶۰ء

مُلّا واحدی

موت

ولایت کی پہچان اور ایمان کی کسوٹی

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ——— (اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) یہودیوں سے کہو کہ یہودیو! تمہیں اگر دعویٰ ہے کہ تمام بندوں میں فقط تم اللہ کے ولی (اور دوست) ہو تو (اس کی پہچان بہت آسان ہے) اللہ کے نام پر) مرنے کی تمنا کرو۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو (تو مرنے سے گھبراؤ نہیں) ———

تو ولایت کی پہچان کیا ٹھہری۔ مرنے سے نہ گھبرانا اور مرنے کے لئے آمادہ رہنا ——— اور مسلمان کی تعریف یہی ہے کہ وہی اللہ کا ولی اور دوست نہیں ہوتا۔ اللہ بھی اُس کا ولی اور دوست ہوتا ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اللہ اہل ایمان کا دوست ہے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ اللہ مومنوں کا دوست ہے۔ لہٰذا مرنے سے نہ گھبرانا اور مرنے کے لئے آمادہ رہنا محض ولایت کی پہچان نہیں، ایمان کی کسوٹی ہے۔

مجھے کامل یقین ہو کہ مرنے کے بعد میرا قصہ ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ میں اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کے حضور میں حاضر کیا جاؤں گا تو مرنا کیا گھبرانے کی چیز رہے گی۔ گھبرانا صرف بداعمالی سے چاہیئے۔ اللہ کے سامنے کالا منہ لے کر پہنچنا واقعی فکر کی بات ہے بداعمالیوں کو یاد کر کے، جتنا پریشان ہوا جائے کم ہے۔ لیکن بذات خود مرنا گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ مرنا تو بالکل ایسا ہے جیسے بال کتروالئے یا ناخن ترشوالئے۔ جسم کے اندر سے بھی فاضل اجزا روز خارج ہوتے رہتے ہیں اور جسم باہر سے بھی برابر بدلتا رہتا ہے۔ اندرونی اجزا کے اخراج سے انسان تسکین پاتا ہے اور جسم کی بیرونی تبدیلیوں کا بھی اُس کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

بچپن میں میرے ٹخنے پر ایک پھوڑا نکلا تھا۔ جس کا نشان اب تک باقی ہے لیکن نشان جتنا نمایاں ساٹھ برس پہلے تھا، اُتنا اب نہیں ہے۔ وہ کھال بدل گئی جو پھوڑا نکلنے کے وقت تھی۔

جسم کے اندر کی مشینری ہم نہیں دیکھ سکتے اس واسطے بیرونی اعضاء ہاتھ پاؤں۔ آنکھ۔ ناک وغیرہ کی نسبت اندرونی مشینری سے ہمیں کم دلچسپی ہے۔ جب تصور کرتے ہیں بیرونی جسم کے مٹنے کا کرتے ہیں۔ مگر ذرا سوچئے کہ بیرونی جسم ایک حال پر قائم کہاں ہے۔ بیرونی جسم بھی ایک حال پر قائم نہیں ہے اور اندرونی مشینری بھی ایک حال پر قائم نہیں ہے۔ اور موت سے جسم خاک میں ملے گا۔ روح کو تو خاکی جسم کی بجائے نورانی جسم یا کسی اور قسم کا جسم حاصل ہو جائے گا۔ موت سے گھبرائیں وہ جنہیں حیات بعد الموت میں شبہ ہو۔ موت تو حیات ابدی کا دروازہ ہے۔ علامہ اقبال نے خوب کہا ہے ؎

نشان مرد مومن با تو گویم ۔۔۔ چو مرگ آید تبسم برلب اوست

ویسے جسم ایک دفعہ قبر میں رہ بھی چکا ہے۔ اور روح سمیت رہ چکا ہے۔ کیا ماں کا پیٹ قبر نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ
لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۭ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ۭ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

یادرکھو، اولیاء اللہ (اس قدر مطمئن رہتے ہیں کہ اُن) پر (آنے والے کھٹکوں کا) خوف طاری نہیں ہوتا۔ اور وہ (گزشتہ مصائب کو یاد کرکے) نہیں کڑھتے۔ جو لوگ (واقعی اور حقیقتاً اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر) ایمان لائے اور (پھر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی سے) بچا کئے، اُن کے لئے دُنیا کی زندگی میں بھی (راحت و آسائش کی) بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔ (راحت و آسائش کا وعدہ ہے) اللہ کے وعدے اور) اللہ کے کلمات (اللہ کے قول و فعل) بدلا نہیں کرتے (اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر واقعی اور حقیقتاً ایمان لاکر اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا فرماں بردار بن کر دیکھو اور تجربہ کرلو کہ دنیا اور آخرت کی راحتیں اور آسائشیں ملنا) یہی عظیم کامیابی ہے ۔

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ
اکبر الٰہ آبادی

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَشْتَہِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

جو (دل سے) کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور (اس قول پر) قائم رہتے ہیں اُن پر (مرتے وقت) نزولِ ملائکہ ہوتا ہے ملائکہ (طمانیت اور سکون) بے خوفی اور بے غمی اُن پر طاری کردیتے ہیں اور بشارت دیتے ہیں کہ اُس جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے مددومعاون تھے اور آخرت میں بھی تمہارے دوست ہیں۔ اس حیاتِ بہشتی میں تمہیں (ترسنا نہیں پڑے گا) جس شے کو تمہارا جی چاہے گا اُسے مہیا کردیا جائے گا۔ جو نعمت مانگو گے وہ عطا ہوگی۔ غفور ورحیم کے اب تم مہمان بن گئے۔ اور اُس کی بات سے بڑھ کر کس کی بات ہوسکتی ہے جو (لوگوں کو) اللہ کی طرف بلائے اور اچھے عمل کرے اور (برملا) کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

ایمان اور ولایت کے مدارج بے شک ہیں لیکن قرآن مجید ایمان اور ولایت کو کسی خاص طبقے میں محدود نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کا ایمان اتنا ہو کہ اُسے اللہ کا اور اللہ کو اس کا ولی کہا جائے۔

بیماری کا کرب محسوس کرنا اور بات ہے اور مرنے سے گھبرانا اور بات۔ بیماری کا کرب تو انبیاء بھی محسوس کرتے تھے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات سے ایک دن قبل اتنا کرب تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زبان پر اس قسم کا جملہ آگیا کہ ہائے میرے ابا کو کتنا کرب ہے۔ لیکن معلوم ہے، حضورؐ نے پھر کیا فرمایا تھا۔ بیٹی! تیرا باپ آج کے بعد کبھی کرب میں مبتلا نہیں ہوگا۔

حضورؐ جب بیمار پڑا کرتے تھے تو اَذْھِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ پڑھ کر ہاتھوں کے اوپر پھونکتے تھے اور ہاتھ سینے اور پُشت پر پھیر لیتے تھے۔ آخری بیماری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہی دعا پڑھ کر حضورؐ کے ہاتھوں پر پھونکی اور چاہا کہ حضورؐ کے ہاتھوں کو حضورؐ کے جسمِ اقدس کے اوپر پھیر دیں۔ حضورؐ نے ہاتھ سکیڑ لئے اور کہا:
اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَاَلْحِقْنِیْ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی الٰہی! میری مغفرت فرما اور مجھے اپنے سے واصل کر۔ رفیق الاعلیٰ سے

مراد اللہ کی ذات ہے۔

حضورؐ دوا استعمال کرنے کے قائل تھے۔ مگر مرض آخر میں جب مرض کا انتہائی زور ہوا تو حضورؐ نے دوا پینے کی ضرورت نہیں سمجھی ؎

یہ موت کیا ہے کسی کے وصال کا پیغام
یہ زندگی کے عوض مل رہی ہے سستی ہے

موت تو ایسی چیز ہے کہ جب کسی کو آئے تو اُسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ ٥ اللہ تمہیں عدم سے وجود میں لاتا ہے اور پھر تمہیں موت دیتا ہے اور پھر تمہیں دوسری زندگی بخشتا ہے۔ (لیکن اتنی عنایتوں کے باوجود) انسان ناشکر گزار ہے۔ یعنی موت ایسی چیز ہے کہ اپنی موت پر انسان کو شکر گزار ہونا چاہیئے جس طرح نیست سے ہست ہونا ایسی بات ہے کہ اللہ کا جتنا شکر کیا جائے کم ہے۔ اسی طرح اپنی موت پر انسان کو شکر کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ موت عارضی زندگی کے عوض مستقل زندگی دلاتی ہے۔ موت کی گھاٹی طے کئے بغیر مستقل زندگی میسر نہیں آسکتی۔ ایک قبر میں رہنے سے وجود عطا ہوتا ہے۔ دوسری قبر میں جاکر مستقل زندگی میسر آتی ہے۔ سورج ایک جگہ ڈوبتا ہے اور دوسری جگہ اُبھرتا ہے۔

جس طرح دوسروں کی موت پر غمگین ہونا سُنت ہے اسی طرح خوشی خوشی جان دینا سُنت ہے۔

خوشی خوشی جان دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان موجودہ زندگی سے بیزار ہو جائے۔ مندرجہ بالا آیت میں موت اور اُس کے بعد کی زندگی اور موجودہ زندگی، تینوں کا ذکر بطور عنایت کیا گیا ہے اور موجودہ زندگی کا عنایت ہونا تو عیاں ہے۔ ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے پھر اس زندگی سے بیزار کیسے ہوا جا سکتا ہے۔ اس زندگی سے بیزار ہونا خلافِ اسلام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بس ایسا تعلق رکھئے جیسا وطن سے بہت دور کی ملازمت کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ پچیس تیس برس بہت دور رہنے کا اثر اتنا قطعی ہوگا کہ وہاں سے گھر واپس آتے وقت آپ تھوڑی سی تکلیف محسوس کریں گے لیکن وہاں کی کشش پر گھر کی کشش غالب آئے گی۔ دور کی جگہ سے جتنا دل لگایا جاتا ہے اُتنا اِس زندگی سے دل لگائیے اور دور کی جگہ کے قیام کو جس طرح عارضی سمجھا جاتا ہے اُس طرح اس زندگی کو عارضی سمجھئے۔ وطن پہنچنے اور قدیم اعزا و احباب سے ملنے کا تصور جس طرح لطف دیتا ہے اسی طرح ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی کے ملنے، حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرنے اور سب سے بڑھ کر چاہنے والے اللہ کے حضور میں حاضر ہونے کے تصور سے لطف لیجئے۔

ایمان خوف اور توقع کی درمیانی کیفیت کو کہتے ہیں۔ اَلْإِيمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ اللہ کے غضب سے ڈرتا رہنا چاہیئے اور اللہ کی رحمت سے اُمیدیں باندھنی چاہئیں۔

مُلّا واحدی

صُوفی

جن کے متعلق گمان ہو جاتا ہے کہ انھوں نے قرآن و سُنّت کے مطابق زندگی ڈھال لی ہے اور اُس ڈھالنے کا اثر ان کے دل و دماغ پر خوب پڑ گیا ہے۔ اِن کا باطن "مصفّٰے" و "مزکّٰے" ہو چکا ہے، دُنیا انہیں صوفی کہنے لگتی ہے۔ صوفیا خود اپنے تئیں صوفی نہیں کہتے۔ اپنے مُنہ سے بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے اپنا تصفیہ اور تزکیہ کر لیا ہے۔ خود اگر کوئی صوفی کا لفظ استعمال کرتا ہے تو ذہن ادھر کبھی منتقل نہیں ہوتا کہ یہ تصفیے اور تزکیے کا مُدّعی ہے۔ یا تو خیال کیا جاتا ہے کہ اسے صُوفی کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ یا سمجھا جاتا ہے کہ صُوفی اس کے نام کا جزو ہے۔ جس طرح طبیب اور مولوی نہ ہونے کے باوجود طبیبوں کے خاندان کے افراد "حکیم جی" اور مولویوں کے خاندان کے افراد "مولوی صاحب" کہلاتے ہیں اسی طرح صوفی نہ ہونے کے باوجود صوفیوں سے نسبت رکھنے والوں کو صوفی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس کے ذمہ دار اگر ہیں تو غیر حقیقی صوفی ہیں یا غیر حقیقی صوفیوں کو صوفی کہنے والے۔ حقیقی صوفی اس کے ذمہ دار نہیں ہیں حقیقی صوفی نہ صوفی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یعنی مصفّٰے اور مزکّٰے ہونے کا دعویٰ۔ اور نہ کشف و کرامات کا دعویٰ کرتے ہیں

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب اُن کے ہاں آئے اور تین مہینے مسلسل ٹھیرے رہے کہ خوب جلد پہنچنے کے بعد ہاتھوں ہاتھ دیں گے۔ تین مہینے گزر گئے لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ مجبوراً واپس چلے۔ حضرت شیخؒ نے پوچھا۔ کیسے تشریف لائے تھے اور کیوں جانے ہو۔ انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ مرید ہونے کا قصد تھا مگر کچھ پایا نہیں۔ حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ اچھا اتنا بتاتے جاؤ کہ میرا کوئی فعل خلاف قرآن و سُنّت تو نہیں دیکھا۔

جس قسم کے معجزات انبیا کو انسانیت کے عہد طفلی میں ملا کرتے تھے اُس قسم کے معجزے نبی آخر الزماں صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہ کثرت نہیں ملے تو اُن کے متبعین اُس قسم کی کرامتیں کیا دکھاتے تھے۔ ہمارے پیشوا کا اہم معجزہ اُن کی نبوت سے پہلے کی چہل سالہ زندگی تھی اور پھر قرآن مجید کی ایک ایک آیت اور اس پر عمل۔ یہی سیرت اور قرآن و سُنّت پر عمل ہمارے صلحا اور صوفیا کی کرامت ہے جو مسلمان اچھی سیرت بنائیں اور قرآن و سُنّت پر خوب عمل کریں وہ قدرتاً عام مسلمانوں سے نمایاں ہو جاتے ہیں اور عام مسلمان انہیں اپنے سے بہتر مسلمان ماننے ہیں اور اُن کی صحبت میں بیٹھنا مفید جانتے ہیں۔

صوفیا معتقدوں کے محض استاد نہیں رہتے، رفیق بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات معتقدوں سے استفادہ کرتے ہیں جیساکہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ مرید کا علم اگر پیر کے علم سے زیادہ ہے تو پیر مرید سے استفادہ کرسکتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے لیکن خواجہ صاحب کا برتاؤ حضرت سے کرامت کا اظہار معجزے کی طرح ضروری بھی نہیں ہے۔ انبیاء کو اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرنا پڑتا تھا اور دعوے کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ اُن سے معجزے صادر کراتا تھا لیکن اولیا پر اپنی ولایت ظاہر کرنا فرض نہیں ہے۔ کرامتیں اولیاء اللہ سے سرزد ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں لیکن وہ کرامتیں دکھاتے نہیں پھرتے تھے۔ ایسی پاکیزہ زندگی جسے دیکھنے والا شبہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس طبیعت کا اور اس کردار کا انسان جھوٹ بولے گا۔

مجاہد صاحب کے ساتھ دوستوں کا ساتھ تھا۔

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی مجالس سماع میں شرکت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "فعلِ مشائخ سنت نہ باشد" مشائخ کا فعل سنت کا درجہ نہیں رکھتا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے مرید کا یہ قول سنا تو فرمایا: "نصیر الدین بالکل سچ کہتا ہے۔"

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے بڑے محبوب مُرید تھے مگر حضرتؒ نے اپنا جانشین حضرت امیر خسروؒ کو مقرر نہیں کیا، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کو مقرر کیا۔

تصفیہ اور تزکیہ دوسرے مذاہب میں بھی ہے مگر اُس کے حاصل کرنے کے دوسرے مذاہب میں اور اور طریقے ہیں۔ اسلام میں تصفیہ اور تزکیہ صرف پیروی قرآن و سُنّت سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ قطعی ممکن ہے کہ پیر کم علم ہو اور مریدوں میں چند جید عالم ہوں۔ مثلاً بہ اعتبار علم حضرت سید احمد بریلویؒ سے اُن کے مُرید حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ وغیرہ فائق تھے یا حضرت حاجی امداد اللہؒ سے اُن کے مُرید حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ وغیرہ فائق تھے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو دستخط تک نہیں کر سکتا تھا لیکن نہایت باعمل مسلمان تھا۔ علما کے عمل اس کے سامنے ہیچ تھے۔ علما سے جو بات سنتا تھا اُسے گرہ میں باندھ لیتا تھا۔ علما عموماً بات کہہ کر فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں وہ بات پر عمل کرتا تھا اور عمل کرتے کرتے اس قابل ہو گیا تھا کہ صوفی کہلائے۔ اللہ مغفرت کرے۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا عاشق تھا۔

نبوت ختم ہو گئی، مگر ولایت ختم نہیں ہوئی ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فدائی دنیا میں برابر آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔

نبوت اور ولایت ایک لائن کی چیزیں نہیں ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا نبی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مرتبے کے صدیقین سے بڑا ہے۔ صدیقین انبیاء کی صف میں کھڑے ہی نہیں ہو سکتے۔ انبیاء کی صف الگ ہے اور صدیقین کی صف الگ۔ اور جنھوں نے حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا وہ تو انبیا کیا اپنے آپ کو صحابہ کا خاکِ پا تصور کرتے ہیں۔ جس نے ایک دفعہ اور فقط ایک دفعہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے اتنی نماز پڑھ لی ہے کہ نماز میں شرکت کی ہی تھی جو حضورؐ نے سلام پھیر دیا۔ اُس سے اُن علما کو نسبت نہیں ہے جنھوں نے حضرت سید احمد بریلوی کے پیچھے نماز پڑھی تھی اور جن اُلجھنوں کا جواب حضرت سید احمد گفتگو کر کے نہ دے سکے تھے وہ اُلجھنیں نماز میں حل ہو گئی تھیں۔ اُس نمبر آخر کے صحابی کو حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اپنا امام تصور کرتے ہیں۔

انبیاء کے مراتب میں فرق ہے اور صحابہ کے بھی درجات ہیں۔ بعد کے مسلمان۔ اُن کا باطن خواہ کتنا ہی مصفّٰے و مزکّٰے ہو جائے انبیا تو انبیا صحابہ کی غلامی پر نازاں ہیں۔

صحابہ میں کوئی مولوی یا صوفی کے لقب سے نہیں پکارا جاتا تھا۔ حالانکہ صحابہ مولویوں سے زیادہ عالمِ دین تھے اور صوفیوں سے زیادہ مصفّٰے و مزکّٰے تھے۔ مولوی اور صوفی الفاظ اُس وقت نکلے ہیں جب خلافت نے بادشاہت کی شکل اختیار کی ہے اور بادشاہت کو مولویت اور صوفیت سے بے نیاز قرار دے لیا گیا ہے۔ مولوی وہ رہا جو علم پڑھ کر بادشاہوں سے وابستہ ہو گیا اور صوفی وہ کہلایا جس نے علم پڑھ کر اپنے نفس کے تصفیے اور تزکیے کی طرف توجہ کی۔

نفس کے تصفیے اور تزکیے کی آخری منزل یہ ہے کہ مسلمان اپنا آپا اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہے عبادتوں میں آسان ترین عبادت نماز ہے۔ اُس سے ذرا مشکل عبادت ادائگی زکوٰۃ۔ قدموں پر سر رکھدینے سے انسان محفوظ ہوسکتا ہے۔ لیکن زر می طلبی سخن درین است۔ زکوٰۃ دینا نماز پڑھنے کے مقابلے میں کٹھن کام ہے۔ زکوٰۃ اور تزکیہ لازم و ملزوم ہیں۔ زکوٰۃ سے آگے روزہ ہے اور روزے سے آگے حج۔ ان جملہ امراحل کو بطریق احسن طے کرکے مسلمان اُس منزل تک پہنچتا ہے کہ جان جاں آفریں کی مرضی پر چھوڑ دے کہ جب حکم ہوگا حاضر کردوں گا۔ قدیم صوفیوں میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے جہاد کا موقع میسر آیا ہو اور اس نے جہاد سے پہلو تہی برتی ہو۔

جو خدمت اسلام صوفیوں نے ہندوستان میں انجام دی اُسے بھی جہاد کے سوا کیا کہئے گا۔ آج جتنے کروڑ مسلمان اس برصغیر میں موجود ہیں، ان سب کے اجداد کو صوفیوں ہی نے مسلمان کیا تھا۔ ایک ایک صوفی وارد ہندوستان ہوا۔ اور ہندوؤں کا جم غفیر اور ہندو راجاؤں کی تلواریں اُس اکیلے صوفی کو تبلیغ اسلام سے نہ روک سکیں۔ اخلاص کی قوت نے فوجوں کی قوت کو پرے بٹھایا اور سارے ملک میں اسلام کا پرچم لہرا دیا۔

عزیز زبیدی

حدیثِ مصطفےٰؐ اور اقبال

(۲)

نعم الجمل

بہر آں شہزادہ خیر الملل — دوش ختم المرسلیں نعم الجمل

دنیا کی بہترین امت کے اس شہزادہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مبارک کندھا نعم الجمل تھا۔

علامہ نے مندرجہ ذیل حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے،

بچپن میں حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک پر بیٹھے ہوتے تھے تو ایک شخص نے دیکھ کر کہا کہ۔

نعم المرکب یا غلام

اے لڑکے! تو بہت عمدہ سواری پر سوار ہے

اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

نعم الراکب ھو

یہ سوار بھی تو خوب ہے! (ترمذی عن ابن عباس)

لی مع اللہ وقت

تا کجا در روز و شب باشی اسیر

رمز وقت از "لی مع اللہ" یاد گیر

روز و شب میں کب تک گرفتار رہے گا ——————————

"رمز وقت" لی مع اللہ سے اخذ کر۔

یہ اُس حدیث کی طرف اشارہ ہے، جس کو صوفیاء کرام ذکر کیا کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

لی مع اللہ وقت لا یسع فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل۔

قشیری نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

لی وقت لا یسعنی فیہ غیر ربی (رسالہ قشیریہ) (موضوعات قاری)

محدثین اس حدیث کو نہیں پہچانتے۔ اس کے معنے یہ ہیں۔:-

وہ وقت بھی آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں اور کوئی واسطہ درمیان میں نہیں رہتا۔ یہ دراصل بزرگوں کے عالم استغراق کی خصوص کیفیت کا بیان ہے۔ اور انشراح صدر کی یہ کیفیت غیر متوقع شے نہیں ہے۔ معمولی سے معمولی واقعات کی حد تک یہ کیفیت مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

لاتسبوا الدھر

زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لاتسبوا الدھر فرمان نبی است

زندگی دہر سے ہے اور دہر زندگی سے ہے۔
لاتسبوا الدھر (زمانہ کو برا بھلا مت کہو) حضورؐ کا ارشاد ہے
اس میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
لاتسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر　　　(کنوز الحقائق بحوالہ مسلم)
زمانے کو گالیاں مت دو۔ کیوں کہ دھر اللہ ہی ہے
علامہ اقبال کے خصوصی معالج شفاء الملک جناب حکیم محمد حسن قرشی نے مجھے لکھا تھا کہ
"برگساں سے ملاقات کے وقت دہر کے متعلق حدیث کا انھوں نے ذکر کیا جس پر برگساں نے تعجب کا اظہار کیا کہ تیرہ سو سال پہلے یہ کہا گیا۔"
جناب راجہ حسن اختر نے فرمایا کہ۔
فرانس میں برگساں سے ملاقات کے دوران میں مسئلہ زمان کے سلسلہ میں جو چیز سنا کر علامہ اقبال نے اس کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا وہ لاتسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر والی حدیث ہی تو تھی۔"

حبیب اللہ

آنکہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رفت
مرد کاسب را حبیب اللہ گفت

وہ ہستی جس نے کعبہ کو بتوں کی خاشاک سے پاک کیا اس نے "الکاسب حبیب اللہ" (خود کمانے والا اللہ کا پیارا ہے) فرمایا ہے۔ (حدیث) ان اللہ یحب المومن المحترف ...... (رواہ الطبرانی عن ابن عمر مرفوعا)
پہلے مصرع میں مرحوم نے ایک طویل حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فتح مکہ کے دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا تھا۔ (صحیحین و ترمذی عن ابن مسعود و ابوداؤد عن جابر)
حدیث رسولؐ کہتی ہے

از بلا ترسی؟ حدیث مصطفیٰ است
مرد را روز بلا روز صفا است　　　(جاوید نامہ)

تو بلاؤں سے ڈرتا ہے؟ حدیث رسولؐ کہتی ہے۔
کہ مصیبت کا دن مرد مومن کے تزکیہ کا دن ہے۔
حدیث رسولؐ یہ ہے
اذا احب اللہ عبدا ابتلاہ فان احبہ الحب البالغ اقتناہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ
(رواہ الطبرانی عن ابی عبید الخولانی)

جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو دوست رکھتا ہے۔ اس کو امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ جب حق تعالیٰ اسے گہری محبت سے چاہتا ہے تو اس کو مال و اولاد سے محروم کر دیتا ہے۔ اس پر اگر وہ صبر سے کام لیتا ہے تو اس کو چن لیتا ہے، اگر وہ دل سے راضی بھی ہو جاتا ہے تو وہ اس کو اپنے لئے مخصوص فرما لیتا ہے۔

نعمَ المالُ صالح

مال را گر بہر دین باشی حمول
نعم مال صالح گوید رسول

(رومیؒ کی زبان میں فرماتے ہیں) مال اگر دین کے لئے ہے تو حضور علیہ السلام نے اس مال کے حق میں "نعم مال صالح" (عمدہ مال) کے الفاظ کہے ہیں۔

"نعم مال صالح" ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

رمز لولاک

مسلماں را ہمیں عرفان و ادراک
کہ در خود فاش بیند رمز لولاک

اس میں، حدیث لولاک، ما خلقت الدنیا۔ کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے پہلے اس پر تبصرہ گزر چکا ہے۔

ما عرفناک

خدا اندر قیاس ما نگنجد
شناس آں را کہ گوید ما عرفناک

حدیث "ما عرفناک حق معرفتک" کی طرف اشارہ ہے (حدیث صحیح نہیں ہے)

خطیب و دیلمی

اقبال کو اس پر اعتراض ہے کہ۔ واعظ منش لوگ احادیث کی صحت اور ضعف کی پروا نہیں کرتے۔ اور نہ ان کتابوں کے سلسلے میں احتیاط کرتے ہیں جن میں زیادہ تر ضعیف حدیثیں ہیں۔

واعظ دستاں زن افسانہ بند
معنی او پست و حرف او بلند
از خطیب و دیلمی گفتار او
با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

اس سے معلوم ہوا کہ، احادیث کے پرکھنے کے لئے مرحوم کو محدثین کے اصول اصطلاحات اور معیاروں پر مکمل اعتماد تھا۔ جن افاضل نے میرے نام خطوط لکھے ہیں، ان میں بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محدثین کے کارہائے عظیمہ کو بہت سراہتے تھے۔

درس حدیث کی عظمت

علامہ اقبال نے ہارون رشید کی زبان میں حضرت امام مالک امام دارالہجرۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے درس حدیث کا جو

تذکرہ کیا ہے وہ اس امر پر گواہ ہے کہ، مرحوم کے دل میں ان کے دارالحدیث اور درس حدیث کی عظمت بہت زیادہ ہے۔ اور یہ صرف اس شخص کی کیفیت ہو سکتی ہے۔ جو حدیث رسولؐ کی شرعی تقدیس پر ایمان رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اے نوا پرداز گلزار حدیث
از تو خواہم درس اسرار حدیث
لعل تلکے پردہ بند اندر یمن
خیز و در دارالخلافت خیمہ زن
گفت مالکؒ مصطفیؐ را چاکرم
نیست جز سودائے او اندر سرم
بہرہ خواہی اگر از علم دیں
درمیانِ حلقۂ درسم نشین

اس میں مندرجہ ذیل امور بالخصوص قابل غور ہیں۔

(۱) علوم حدیث کو گلزار حدیث کہا ہے۔

(۲) مضامین حدیث کا نام اسرار حدیث رکھا ہے۔

(۳) درس حدیث کو حضرت امام نے مصطفیؐ کی چاکری قرار دیا ہے۔

(۴) درس حدیث کے لئے اپنی یکسوئی کا پس منظر "سودائے او" بتایا ہے۔

(۵) علم حدیث کو علم دین قرار دیا ہے۔

(۶) اور اپنے حلقۂ درس حدیث میں شرکت کے لئے ہارون الرشید کو دعوت دی ہے۔

ان مضامین کو سورۂ اخلاص کی آیت

اللہ الصمد

کی تفسیر کے تحت پیش فرمایا ہے۔

کیا یہ انداز بیان اس شخص کا ہو سکتا ہے جو سرے سے حدیث رسولؐ کی عظمت کا منکر ہو۔ اور بالخصوص اس شخص سے اس کی توقع رکھنا، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سرتاپا غرق ہو، اور جو دین کے مزاج کو پہچانتا ہو۔

آثار صحابہ

حدیثِ رسولؐ کے علاوہ علامہ اقبال نے آثار صحابہ سے بھی احتجاج کیا ہے، بطور نمونہ ایک روایت ملاحظہ فرمائیں۔

سبحہ اَقَلُّ مِنَ الدُّنیا شمار
از نعش حُرؓ اشوی سرمایہ دار

"اقلل من الدنیا تعش حرا"

یہ حضرت فاروق اعظمؓ کا ارشاد ہے۔

صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

بانگِ درا کے صفحہ ۲۵۸ پر "صدیقؓ" کے عنوان سے علامہ مرحوم نے مندرجہ ذیل حدیث کو حضرت صدیق اکبر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مناقب میں نظم کیا ہے۔

عن عمر قال امرنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان نتصدق ووافق ذلک عندی مالا فقلت الیوم اسبق ابابکر ان سبقتہ یوما قال فجئت بنصف مالی فقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ما ابقیت لاھلک فقلت مثلہ واتی ابوبکر بکل ما عندہ فقال یا ابابکر ما ابقیت لاھلک فقال ابقیت لھم اللہ ورسولہ قلت لا اسبقہ الی شئی ابدا۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ایک دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں صدقہ اور خیرات کرنے کا حکم دیا حسن اتفاق سے اس وقت میرے پاس کافی مال تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر حضرت ابوبکرؓ سے بازی لے جانا کسی دن میرے لئے ممکن ہے تو وہ آج کا دن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں آدھا مال لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا "تم نے اپنے گھر والوں کے لئے کتنا چھوڑا ہے عرض کی، اتنا ہی جتنا لایا ہوں (یعنی نصف)

اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس جو کچھ تھا وہ سب لے آئے ان سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا۔ ابوبکر! اپنے گھر بال بچوں کے لئے کیا چھوڑا ہے، عرض کی حضورؐ! ان کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کو چھوڑ آیا ہوں۔

میں نے (یہ نظارہ دیکھ کر) دل میں کہا کہ میں کبھی بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سبقت نہیں لے جا سکوں گا۔

واقعۂ معراج

معراج کا جو واقعہ منکرین حدیث کے لئے ناقابل فہم بلکہ خلاف عقل شے تصور کی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ نہ صرف اس کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس سے درس حکمت اخذ کرتے ہیں، کہتے ہیں:

ناوک ہے مسلماں! ہدف اس کا ہے ثریا!
ہے سرِّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج (ضرب کلیم)

اخترِ شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جسکو وہ ہے آج کی رات
رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات (بانگِ درا)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراج جسمانی کی تمام تفاصیل احادیث رسول اور آثارِ صحابہ سے ماخوذ ہیں۔

رَبِّیَ الْاَعْلٰی

اس دیر کہن کے فتنے باطل فسوں ہیں۔ ان کو ربی الاعلیٰ کی کاری ضرب سے توڑ پھوڑ دے۔ فرماتے ہیں۔

مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن
از دو حرفِ ربی الاعلیٰ شکن

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:
عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم .... واذا سجد فقال فی سجودہ سبحان ربی الاعلیٰ ثلث مرات فقد تم سجودہ (رواہ ترمذی وابوداؤد)

بوریا

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمیں تیغِ او
قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغِ او

ان میں مندرجہ ذیل روایات نظم کی گئی ہیں۔
عن عمر رض قال دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاذا ھو مضطجع علی رمال حصیر لیس بینہ وبینہ فراش قد اثر الرمال بجنبہ متکئا علی وسادہ من آدم مشوھا لیف ...... طویل حدیث)
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ اس وقت کھجور کے پتوں کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور چٹائی کے اوپر فرش نہ تھا بوریئے نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلوئے مبارک پر نشان ڈال دیئے تھے اور آپ کے سرہانے چمڑے کا تکیہ تھا جس میں کھجور کا پوست بھرا ہوا تھا۔ الخ
پچھلے دو شعروں میں اس حدیث کے مضمون کو قلم بند کیا ہے جس میں غزوہ بدر کے موقعہ پر ایک سائبان میں رات بھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نماز اور گریہ وزاری اور نبوی دعا اور فریادوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ (حدیث دسیر)

ترکِ وطن

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

اس میں ان احادیث کا ذکر ہے، جن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہجرت کا ذکر ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی۔ اور یہاں سے چل کر مدینہ منورہ میں فروکش ہوئے۔
علامہ مرحوم کے نزدیک ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے!

لَنَا الْمَوْلٰی وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ

نعرہ چوں آں سرکشے رہ کردہ گم
زد لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ

قَالَ للفاروق وَحیُ اللہ قُم
قُل لَنَا المَولیٰ وَلَا مَولیٰ لَکُم

یہ غزوۂ احد کی ایک تفصیلی حدیث کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ ہے

واشرف ابوسفیان فقال افی القوم محمد؟ فقال لا تجیبوہ قال افی القوم ابن ابی قحافۃ؟ فقال لا تجیبوہ قال افی القوم ابن الخطاب؟ فقال ان ھؤلاء قتلوا فلو کانوا احیاء لاجابوا فلم یملک عمر نفسہ فقال کذبت یا عدو اللہ ابقی اللہ لک ما یخزیک قال ابوسفیان اعل ھبل فقال صلی اللہ علیہ وسلم اجیبوہ قالوا ما نقول؟ قال قولوا اللہ اعلیٰ واجل قال ابوسفیان لنا العزی ولا عزی لکم فقال صلی اللہ علیہ وسلم اجیبوہ؟ قالوا ما نقول؟ قال قولوا اللہ مولانا ولا مولی لکم[1]

خلاصہ یہ کہ ابوسفیان نے تصور کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام شہید ہو گئے ہیں۔ اس نے ایک ایک کر کے ان کا نام لیا آخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ اللہ کے دشمن! آپ زندہ ہیں سب تجھے رُسوا کریں گے۔ اس نے ھُبل نامی بُت کا نعرہ لگایا۔ اُعلُ ھُبَل (ھبل کی جے) حضورؐ کے فرمانے پر صحابہ کرام نے جواباً "اللہُ اَعلیٰ وَاَجَلّ" کا نعرہ لگایا۔

پھر ابوسفیان نے کہا لنا العزی وَلَا عزی لکم"

حضورؐ نے فرمایا کہ تم یہ کہو:۔

لَنَا المَولیٰ وَلَا مَولیٰ لَکُم

______ اس کے علاوہ یہ بھی آتا ہے کہ آخر میں ابوسفیان نے کہا اُحد کی لڑائی بدر کی لڑائی کا بدلہ تصور کیجئے۔ حضورؐ نے اس کے جواب میں فرمایا، یہ کہو۔

لَا سَوَاءَ قَتلَانَا فِی الجَنَّۃِ وَقَتلَاکُم فِی النَّارِ

(بدلہ کیسا؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ساتھی شہید جنت میں ہیں اور تمہارے مقتول دوزخ میں ڈھیر برابری کیسی؟) (رزین)

قرآن و خبر

علامہ مرحوم مکتب اور ملاء (علماء سو) کی اس فرومایگی کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے قرآن و خبر (حدیث) کا کما حقہٗ گہرا مطالعہ نہیں کیا۔

ہر یکے دانائے قرآن و خبر
در شریعت کم سواد و کم نظر

"خبر" کا لفظ محدثین کی اصطلاح ہے۔ "حدیث رسول" کو خبر کہتے ہیں۔

گم شو اندر قرآن و خبر

رمز دین مصطفیٰ کیا ہے۔ دین کس کو کہتے ہیں، اسرار خودی کیا ہیں، "جہانِ نو" کس طرح پیدا ہوتا ہے بندۂ حق کون ہے۔ رزم خیر و شر میں اس کا اسوہ کیا ہوتا ہے؟

علامہ مرحوم فرماتے ہیں، ان کی تشریح اور وضاحت کے لئے قرآن و خبر (قرآن و حدیث) کے علم و عمل کے گہرے مطالعہ اور انہماک کی ضرورت ہے۔

[1] (بخاری) و ابوداؤد عن البراء بن عازب)

اندکے گم شو بقرآن و خبر
باز اے ناداں بخویش اندر نگر

عیار مصطفیٰ

علامہ مرحوم فرماتے ہیں، جو شخص جہانِ نو پیدا کرنا چاہتا ہے، اسے اپنی ذات کو پہلے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کی کسوٹی پہ پرکھ لینا چاہیئے۔

بر عیارِ مصطفیٰ خود را زند
تا جہانِ دیگرے پیدا کند

اقبال کے کلام کے چند نمونے اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال سنّتِ رسول ؐ کو دین میں حجت سمجھتے تھے۔ اور قرآن کریم کے ساتھ ساتھ اسوۂ رسول ؐ کے اتباع پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک "اطاعتِ رسول ؐ" سے انحراف "کفر" تھا۔

اقبال ؒ کے "عشقِ رسول ؐ" کی بنیاد ہی "اطاعتِ رسول" پر ہے، اور قرآنِ کریم نے "اطاعتِ رسول" کو منصوص قرار دیا ہے، اطاعتِ رسول ؐ کئے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی!

اے کائنات کی تسخیر کا بے معنی نعرہ لگانے والو! "اطاعتِ رسول ؐ" اور "عشقِ نبی ؐ" کے بغیر یہ مرحلہ سر ہو ہی نہیں سکتا۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

اور

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اسرار احمد سہاوری (ایم۔اے)

نفسیاتی زندگی

فرائیڈ نے لاشعور کا پتہ لگا کر صرف ہماری نفسیاتی زندگی اور علم تحلیل نفسی میں ہی انقلاب[1] برپا نہیں کیا بلکہ ہماری مجموعی زندگی کو اور زندگی کے ہر گوشہ کو متاثر کیا ہے۔ اسی وجہ سے اب اس چیز کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ہم اپنے ذہن کی ساخت اور اس کی کیفیات کے بارے میں، اس کے نفسیاتی عمل اور ردعمل کو اپنے عوام تک آسان اور قابلِ فہم زبان میں پہنچانے کی کوشش کریں، کیونکہ خود آگاہی بھی ہمارے لئے اتنی ہی ضروری ہوگئی ہے جتنی مردم شناسی یا معاملہ فہمی۔ پھر ہر انسان کی حیثیت بھی معاشرے کے ایک رکن کی ہوتی ہے اس لئے اگر ہم نے ایک فرد کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تو گویا پوری انسانیت کے مزاج اور زندگی کے مطالعہ کے سلسلہ میں ہم نے اپنی بنیادیں بڑی حد تک مضبوط کرلیں۔

اس کے علاوہ یہ دور "شعوری زندگی" کا ہے اور اب غیر شعوری زندگی کا دور ختم ہو رہا ہے۔ اب زندگی میں وہی فرد کامیاب ہو سکتا ہے اور وہی قوم مسابقت میں آگے جا سکے گی جو لاشعور کو تاریک پردوں سے نکال کر اپنے شعور کو تقویت دے سکے گی۔ ایسے لوگ اور ایسی قومیں ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اپنے لاشعور کی تربیت کو نظرانداز کرتے رہیں گے دیو قامت نظر آئیں گے۔ اس لئے ہماری لاشعوری قوت کے مقابلہ میں شعوری قوت کچھ بھی نہیں۔ قدرت نے لاشعور میں مختلف طاقتوں کے لامتناہی ذخائر پوشیدہ رکھے ہیں۔ جہاں زندگی کو وسعت دینے کے لئے چاند تک پہنچنا ضروری ہے وہاں معنوی زندگی کو وسعت دینے کے لئے لاشعوری دنیا تک رسائی بھی ضروری ہے۔ میں اس مختصر سے مضمون میں یہ کوشش کروں گا کہ نہایت آسان اور غیر اصطلاحی الفاظ میں انسانی لاشعور کے امکانات اور صلاحیتوں کا جائزہ لوں اور یہ بتاؤں کہ ان امکانات اور صلاحیتوں کو ہم کس طرح قابو میں لاکر زندگی کے لئے مفید بنا سکتے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے کس طرح ہم بعض توہمات سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور کس طرح ان کی مدد لیکر ہم زندگی کو پر مسرت بنا سکتے ہیں۔

شعور

ہمارے شعور کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عقلی دلائل کا تابع ہوتا ہے اور ہر کام ان دلائل کی روشنی میں کرنے کا عادی ہے۔ جہاں عقلی دلائل کا سہارا نہ ملے وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کو غور و فکر کرنے، انتخاب کرنے اور نقل کرنے کی خاص صلاحیتیں بخشی گئی ہیں۔ جتنے کام ہم سوچ سمجھ کر نفع و نقصان کا خیال کرکے کرتے ہیں، شعوری طور پر کرتے ہیں، شرم و حیا کا تقاضا، اخلاقی قدروں کا نفاذ، تہذیب و شائستگی کا لحاظ، تکلفات کا خیال، یہ تمام باتیں ہماری شعوری طاقتوں کے زیر اثر ہیں۔

لاشعور

اس کے برخلاف ہمارا لاشعور عقلی دلائل کا قطعی محتاج نہیں۔ یہ ایک نامعلوم اور پوشیدہ طاقت ہے جو ابھی تک اندھی طاقت ہے، وہ ابھی تک باقاعدگی اور تنظیم سے بالکل واقف نہیں ہے وہ ہر اس حکم کو بلاچون و چرا تسلیم کرلیتی ہے جو شعور سے اس کو مل جاتا ہے، وہ شعور کی تجاویز کو بھی کبھی رد نہیں کرتی۔ بشرطیکہ پوری قوت اور پختہ ارادے کے ساتھ پیش کی جائیں۔ البتہ نیم دلانہ تجاویز اور احکام نظرانداز کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی زیادہ پذیرائی نہیں ہوتی

---

[1] اس انقلاب کے بُرے نتائج و اثرات بھی نظر میں رہنے چاہئیں (ایڈیٹر)

اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم ہمیشہ مسرت، کامیابی ہمت، محبت اور رجائیت وغیرہ کے احکام یا تجاویز اپنے لاشعور تک پہنچائیں اور غم، ناکامی، بزدلی، نفرت اور قنوطیت کے احکام وہاں تک نہ پہنچنے دیں۔ کیونکہ لاشعور ہمارے شعور کا اندھا فرمانبردار غلام ہے، وہ خود کچھ نہیں دیکھتا اس کو جو حکم دیا جائے اس پر فوراً عمل کرنا شروع کر دیتا ہے[1]۔ اس میں شک نہیں کہ بعض معاملات ایسے بھی ہیں جہاں کہ اس کی اپنی حکمرانی چلتی ہے شعور کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً خواب کی حالت میں وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا جو اس کا جی چاہتا ہے کرتا ہے اسی وجہ سے ہم خواب میں خود کو ایسی ایسی حرکات کا مرتکب دیکھتے ہیں کہ شعوری حالت میں یا جاگتے ہوئے ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ خواب اگر یاد آجاتا ہے تو دل میں شرما کر رہ جاتے ہیں۔

ہماری کامیابیاں اور ناکامیاں زیادہ تر ہمارے اپنے خیالات پر منحصر ہوتی ہیں۔ اگر ہم ہر وقت پستی، خوف و ہراس اور کم مائیگی کے خیالات اپنے ذہن میں قایم رکھیں گے تو یقینی انہی منفی قسم کے توہمات میں گھرے رہیں گے اور زندگی کے کسی شعبہ میں بھی ہمارا کامیاب ہونا ممکن نہ رہے گا۔ لیکن اگر ہم خود اعتمادی، عزم صمیم اور وسیع النظری کو اپنانے کی کوشش کریں گے، اپنی دلچسپیوں میں وسعت پیدا کرلیں گے تو یقینی ہم ایک بامراد انسان کی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ ہم جس حالت میں فی الحال ہیں، وہ ہماری شعوری کیفیات کی مظہر ہے، جو احکام ہم نے لاشعور کو دیئے ہیں انہی پر وہ غیر محسوس طریقہ پر کاربند ہوگیا ہے اور اسی سانچے میں ہماری زندگی کو ڈھالتا چلا جارہا ہے۔ اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم کسی طرح لاشعور کو ایجابی اور تعمیری احکام پہنچاتے رہیں۔ اگر ہم ہمیشہ بیماری، خوف، پریشانی کے خیالات کو ذہن میں چھپے رہنے کی اجازت دیتے ہیں تو گویا ہم اپنی زندگی کی اپنے ہاتھوں تخریب کر رہے ہیں، اگر ہم ان خطرناک جراثیم کو اپنے دل و دماغ میں داخل کر رہے ہیں، تو گویا ہم خود ہی اپنی موت کے درپے ہیں لیکن اگر ہم تندرستی اور خوشحالی کے متعلق سوچتے ہیں تو گویا یہ جراثیم خود بخود اپنی موت آپ ہی مر جائیں گے۔ اور اس طرح سے کہ ان کی موت کی ہمیں خبر بھی نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے بچے سے یہ کہنا کہ تم بیمار ہوجاؤ گے یا تم بیمار معلوم ہوتے ہو، نہایت خطرناک سی بات ہے، بچہ کا ذہن نہایت نازک اور حساس ہوتا ہے وہ ہر وقت یہی سوچتا رہے گا کہ میں بیمار ہوں یا میں بیمار ہوجاؤں گا۔ اس طرح سے ہم خواہ مخواہ اس کی معصوم پرمسرت زندگی کو پریشانی اور فکرمندی کا مرکز بنا دیں گے۔ اس کا دل کسی کام میں نہیں لگے گا حتیٰ کہ وہ اچھی طرح سے کھیل کود بھی نہ سکے گا۔ اگر بچہ تھوڑا بہت بیمار بھی ہے تب بھی ہم خود چاہے جتنے فکرمند ہوں اور اس کی صحت کی بحالی کا انتظام کریں، دوا علاج کریں، غذا اور آرام کا خیال رکھیں لیکن اس پر جہاں تک ہوسکے اس بات کا اظہار نہ ہونے دیں کہ وہ بیمار ہے یا کہ ہمیں اس کے بارے میں کوئی تشویش لاحق ہے۔ اس میں بچے کی بہتری ہے، اور اسی طرح ہم اس کو صحت مند اور خوش رکھنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

تمام انسان ذہنی طور پر ایک طاقتور جسم کے مقناطیس ہوتے ہیں[1] ہم بیرونی دنیا سے تندرستی، بیماری، خوشی، غم، کامیابی اور ناکامی، محبت و نفرت اور رشک و حسد وغیرہ کو کھینچتے ہیں، اور نفسیاتی دنیا میں یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر چیز اپنی ہم جنس کی طرف کشش محسوس کرتی ہے، صحت کے خیالات صحت کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور اسی طرح بیماری کے خیالات بیماری کو، اسی طرح خوشی، آسودگی اور کامیابی کے خیالات ان چیزوں کو اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ یہیں سے اس چیز کی اہمیت بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ اگر آپ کی طبیعت تھوڑی بہت ناساز بھی ہو تو آپ اس کی پرواہ نہ کریں، بلکہ اپنے

---

1. Practical Psychology BY: Henry

ذہن میں بار بار اس خیال کا اعادہ کریں کہ میں بالکل تندرست ہوں مجھے کوئی تکلیف نہیں۔

ہمارے لاشعور کی کچھ مسلمہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱:۔ ہمارا لاشعور غیر محسوس طریقہ پر ہمارے جسم کی ساخت و پرداخت کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ زندگی کی بنیاد قائم ہوتے ہی ہمارے جسم کو خاص شکل دینا شروع کر دیتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارے جسم کا ایک ایک خلیہ ذی شعور ہے وہ ایک شعوری ہستی کی طرح کام کرتا ہے۔ ہنری مارکا قول ہے کہ جنین میں انسانی بچہ کی انسانی صورت ہی اس کے لاشعور[1] کی کارفرمائی کی وجہ سے بنتی ہے۔ اس کا لاشعور اس ابتدائی زندگی کی حالت میں بھی کام کرتا ہے اور اس کے جسم وصورت کو انسانی جسم وصورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ورنہ شروع میں تو ہر جاندار کے بچہ کی ماں کے پیٹ میں ایک سی صورت ہوتی ہے اور جسم بھی ایک سا ہوتا ہے کوئی ظاہری فرق نہیں ہوتا۔

۲۔ صرف یہی نہیں کہ ہمارا لاشعور ہمارے جسم کی ساخت و پرداخت کرتا ہے بلکہ وہ ہماری ہر جسمانی کمی کو بھی پورا کر دیتا ہے۔ بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اندمالِ زخم، اور زہریلی چیزوں کو جسم میں داخل ہونے سے روکنا بھی اسی کا کام ہے۔ مثلاً اگر ہمارا ہاتھ کسی چیز سے تھوڑا سا کٹ جائے تو جسم کے تمام حصوں سے سفید ذرات اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑتے ہیں جن کا یہ کام ہے کہ جتنے جراثیم اس زخم کے دروازے سے جسم میں داخل ہونا چاہئیں ان کو جذب کر کے اور ان سے باقاعدہ جنگ کر کے ختم کر دیں یہ کام کہ ان سفید ذرات کو ہر خطرے کے مقام پر پہنچا دیا جائے ہمارا لاشعور ہی کرتا رہتا ہے۔

۳۔ ہم سے جتنے غیر اختیاری یا غیر ارادی افعال سرزد ہوتے ہیں ان سب کا سرچشمہ ہمارا لاشعور ہی ہے۔ مثلاً دل کی حرکت نبض کی مقررہ رفتار۔ سانس کی آمد و رفت وغیرہ۔ ہمیں قطعی احساس نہیں ہوتا اور یہ تمام کام درست طور پر انجام پاتے رہتے ہیں۔

۴۔ اس کے علاوہ ہمارا لاشعور تکرار سے ایک عادت پیدا کر لیتا ہے۔ جو کام ہم بار بار کرتے ہیں اس کی پھر ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ بغیر ارادے کے بھی وہ کام عادت کے موافق سرزد ہوتا رہتا ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم تکرار و مشق کر کے صحت بخش عادات پیدا کر لیں اور جہاں تک ممکن ہو بری عادتوں کی تکرار نہ ہونے دیں۔

۵۔ لاشعور ہمارے شعور کے حکم کا تابع ہے۔ اسے دلائل و براہین سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ نہ تو خیر و شر میں امتیاز کرتا ہے اور نہ نفع نقصان کا خیال کرتا ہے۔ اسے تو جو بھی حکم مل جاتا ہے اسی پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔

۶۔ قوت حافظ کا بڑا خزانہ بھی اسی لاشعور میں محفوظ ہے۔ حافظ کا بہت تھوڑا حصہ شعور کے حصہ میں آیا ہے۔

۷۔ ہمارا لاشعور ہماری نوعی خصوصیات کا بھی مرکز ہوتا ہے۔ جبلت در اصل ہماری پرانی عادت ہوتی ہے جو راسخ ہو کر جبلت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر ہمارے آباؤ اجداد کی کوئی عادت راسخ ہو کر جبلت بن گئی تھی تو وہ بھی ہمیں ورثہ میں مل جاتی ہے اور اس کا مرکز بھی ہمارا لاشعور ہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض خاندان میں مخصوص علوم و فنون کمال کی حد تک بڑی آسانی سے حاصل کر لئے جاتے ہیں اور بعض ذاتیں مخصوص خوبیوں یا برائیوں کے لئے مشہور ہو جاتی ہیں اور بعض قبیلے مخصوص خوبیوں کے حامل تسلیم کر لئے جاتے ہیں۔

۸۔ ہمارا لاشعور ہی ہمارے جذبات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ تمام جذبات اسی میں پیدا ہوتے ہیں اور باہر نکل کر ہماری

[1] اور لاشعور کی خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس لئے انسانی صورتوں کو ارحام میں در اصل اللہ تعالیٰ ہی جیسا چاہتا ہے بناتا ہے (اڈیٹر)

پوری شخصیت پر چھا جاتے ہیں۔ کسی خاص چیز یا واقعہ کو ہم جس طرح سے محسوس کرتے ہیں اس سے مخصوص قسم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح خوشی اور غم کا احساس ۔ تکلیف اور آرام کا شعور سکون اور انتشار کا علم مختلف جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اپنے محبت اور نفرت ۔ انتقام اور غصے کے جذبات کو اپنے لاشعور کو حکم دے کر اختیار میں رکھ سکتے ہیں اور قابو میں لا سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو غصہ وغیرہ سے مغلوب ہو کر انتہائی بری حرکات کے مرتکب ہو جاتے ہیں ۔ جن کی وجہ سے اکثر عمر بھر پچھتانا پڑتا ہے۔ اور شرمندگی کی وجہ سے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے ۔ لوگوں کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل ہو جاتے ہیں۔

۹۔ ہمارا لاشعور ہی ہماری والہانہ کیفیات سرمستانہ ہیجانات اور عارفانہ تاثرات کا مرکز ہوتا ہے۔ بعض وقت یہ کیفیات غیر معمولی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور بزرگانہ کرامتوں کے رنگ میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ صوفیائے کرام نے جس چیز کو "قلب" کہا ہے شاید وہ لاشعور ہی ہے۔ لیکن اس کا وہ حصہ جو روحانیت اور پاکیزگی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بعض اوقات یہ بڑی قبیح حرکات کا بھی مرتکب ہو جاتا ہے۔ مثلاً خواب کی حالت میں جبکہ یہ شعور کی گرفت سے پوری طرح آزاد ہوتا ہے تو نیک و بد دونوں قسم کی حرکات اس سے سرزد ہوتی ہیں۔ غالباً شعور کی طرح اس میں بھی نیکی اور بدی دونوں کی صلاحیت موجود ہے یا یہ ہوتا ہے کہ شعور اگر بالکل خواب میں بیہوش نہیں اور کسی حد تک اثر انداز ہو رہا ہے تو یہ اخلاقی اصول کا پابند رہتا ہے اور اگر شعور بالکل بیہوش اور بے حس ہے تو یہ بدی کی طرف زیادہ مائل ہو جاتا ہے۔ فرائیڈ کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاشعور بدی کی طرف ہی مائل ہوتا ہے۔ نیکی کی اس میں صلاحیت نہیں۔ لیکن مکر اس کا قائل معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک طاقت ہے جو نیکی اور بدی دونوں کی طرف مائل ہو سکتی ہے۔ جس قسم کی تحریک مل جائے اسی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ میرے خیال سے مکر کا یہ نظریہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ خواب ہمیشہ برے ہی نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات نہایت اچھے خواب بھی نظر آتے ہیں

لاشعور کے اس مختصر سے مطالعے سے زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع یا اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں مثلاً :۔

۱:۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی جسمانی صحت کا پورا خیال رکھنا چاہیئے۔ صحت جسمانی کے ساتھ ذہنی صحت کا اہتمام کرنا بھی انتہائی ضروری ہے۔ ذہنی صحت سے مراد یہ ہے کہ غلط اور بیہودہ قسم کے خیالات کو ذہن میں نہ آنے دیں اگر کسی وقت وہ داخل بھی ہو جائیں تو ان کو جلد از جلد رخصت کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ وہ ڈیرے نہ ڈال دیں اور جم کر نہ بیٹھ جائیں۔ مثلاً ہمیں چاہیئے کہ ہم بیماری ۔ خوف ۔ پریشانی ۔ غم ۔ مایوس اور غصہ وغیرہ کے جذبات کو ذہن سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔

۲۔ دوسری ضمانت کامیابی کی یہ ہے کہ ہماری دلچسپیاں اپنی ذات کے اندر محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ ہمیں دوسروں کے معاملات میں بھی پوری دلچسپی لینی چاہیے۔ خود غرض اور خود بین انسان زندگی میں بلندیوں پر نہیں جا سکتے ۔ دوسروں کی خدمت کرنا اور ان کے غم اور خوشی میں شامل ہونا آگے جا کر بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس میں نیکی کا پہلو بھی ہے اور ٹھوس قسم کے فائدے کا بھی۔ ممکن ہے کہ فوری طور پر صلہ نہ مل سکے لیکن کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی صورت میں ہر خدمت کا صلہ ضرور مل جاتا ہے اور یوں بھی ہر خدمت کا صلہ فوراً حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے ۔ یہاں دیر آید درست آید کی مثل ہمیشہ صادق آتی ہے۔ قانونِ مکافات دہر ہماری زندگی کا ایک اہم جزو ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ کار فرما رہتا ہے۔

۳- کامیابی کے لئے اس چیز کی بھی سخت ضرورت پڑتی ہے کہ ہمیں اپنے جذبات پر پورا قابو حاصل ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ جذبات ہم پر قابو پالیں۔ اگر اپنے جذبات پر ہمیں قابو حاصل نہیں ہے تو ہم انکے ہاتھوں میں ایک بے بس کھلونا بن کر رہ جائیں گے۔ غم۔ غصہ۔ نفرت۔ خوف وغیرہ میں سے ہر ایک ہمارا حاکم بن جائیگا اور ہم سے فرمانبرداری کا مطالبہ کریگا اور انکی فرمانبرداری سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہوسکتے ہیں بالکل ظاہر ہیں انکے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔

۴- مشاہدہ- تخیل اور قوت تخلیق کا پورا پورا نشوونما ہونا چاہیئے۔ یہ قوتیں ہماری زندگی کی کامیابی اور بامرادی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتی ہیں۔ مشاہدات کے بغیر تجربات بے کار ہیں۔ تخیل کے بغیر زندگی میں رنگینی اور لطافت نہیں رہتی۔ تخلیق کے بغیر زندگی میں جمود پیدا ہوجاتا ہے اور ایک قسم کی اکتاہٹ اور بیزاری پروان چڑھتی ہے جو زندگی کے لئے زہر قاتل ہے۔

۵- ترقی اور کامیابی کے لئے ایک یہ شرط بھی ضروری ہے کہ جو کام کریں اس میں جس طرح ممکن ہو دلچسپی ضرور پیدا کریں اگر فرض ادا کریں تو اس کو ایک خوشگوار فرض بنالیں۔ طبیعت پر اس کا بار نہ رہے۔ اس طرح ہم کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے اس کام میں بڑی پیشقدمی کر سکیں گے اور یہ چیز بھی لاشعوری تکرار سے پیدا کی جاسکتی ہے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

۶- خود غرضی ہماری زندگی کو سب سے زیادہ خراب کرنیوالا جذبہ ہے۔ ہنری ملر نے اپنی کتاب "عملی نفسیات" میں بڑے فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ خود پرستی کی علامت یہ ہے کہ انسان کی تمام ظاہری و معنوی دلچسپیاں اس کی اپنی ہی ذات کے اندر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنا وقت۔ اپنا روپیہ۔ اپنی مسرت اور خوشی دوسروں کی خاطر قربان نہیں کر سکتا۔ خود غرض اور خود پرست آدمی ہمیشہ اپنے متعلق ہی گفتگو کرتا رہتا ہے۔ دوسروں کے معاملات کے متعلق گفتگو کرنے میں اسے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ ایسے آدمی کو کبھی اچھے اور مخلص دوست نصیب نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ وہ اس کی خود پرستی اور خودستائی کے دباؤ اور بار کو برداشت نہیں کرپاتے۔ ہر چیز کی آخر کوئی حد ہونی چاہیئے۔ ایسے آدمی کے قریب لوگ کس طرح ٹھہر سکیں گے جو اپنی ہی کہے جائے اور دوسرے کی نہ سنے۔ اس کی دلچسپی کے موضوع پر گفتگو ہو تو خوب چہکتا ہے لیکن کوئی دوسرا اپنی بات کہے یا کوئی اپنی پسند کا موضوع شروع کرے تو منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے یا بیدلی کے ساتھ جمائی لیتا ہوا اٹھ کر چلا جائے۔ ایسے خود پرست لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انکی خوشی اور غم۔ زندگی اور موت پر ساری کائنات کا دارومدار ہے۔ وہ خوش ہیں تو ساری دنیا کو خوش ہونا چاہیئے۔ وہ اگر غمزدہ ہیں تو سارا عالم سوگوار ہو جائے۔ ان کی زندگی تک دنیا قائم ہے اور ان کے ساتھ ساری کائنات کے مٹ جانیکا امکان ہے۔ ان کا یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں اور دوسرے ہمیشہ غلط بات کہتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے کی بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ لیکن اپنی ہر ایک سے منوانا چاہتے ہیں۔ یہ طریقہ طفلانہ ہے اور ایسے لوگ اپنی رفتار و گفتار سے ہمیشہ پیر نابالغ ہی رہتے ہیں۔ یہی خود پرستی سب سے بڑی وجہ ہے جسکی وجہ سے ہماری خانگی زندگی تباہ اور ناکام ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور مسلسل نزاع کے بعد اکثر طلاق وغیرہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ خود پرست والدین کے بچے بھی نہایت بدمزاج۔ مایوس اور ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دنیا کو اس وقت سیاسی۔ اخلاقی۔ معاشی۔ وغیرہ قسم کی اصلاحات سے زیادہ بے غرض محبت اور انس کی ضرورت ہے۔ وہ محبت جو قربانی اور ایثار کا سبق دے۔ ہمارے بہت سے معاشرتی امراض کا علاج ہوسکتی ہے۔ یہی بے لوث محبت ازدواجی زندگی کو مضبوط۔ ماں باپ کے تعلق

کو محترم ۔ ظلم کو ناممکن اور بے انصافی کو معدوم کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے ۔

ایک خود غرض آدمی خانگی زندگی میں ہی وبالِ جان ثابت نہیں ہوتا بلکہ کاروباری زندگی میں بھی بڑا سنگدل اور بے اصولا ہوتا ہے ۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی دیانت کو مشتبہ خیال کرتا ہے اور خود دیانت ۔ خوش اخلاقی ۔ لحاظ اور وضعداری سے کورا ہوتا ہے ۔ ایسا آدمی بھی خود غرض ہوتا ہے جو ہمیشہ خود کو مریض ظاہر کرکے دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ دراصل وہ بیمار نہیں ہوتا ۔ ایسا شخص خود تو خوش رہتا ہے دوسروں کے اثر پذیر اور ہمدرد ہونوں کو بلا وجہ پریشان اور غمزدہ کر دیتا ہے ایسے شخص کی صحبت سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیئے ۔ پھر وہ شخص بھی اسی فہرست میں آتا ہے جو بلا وجہ ہر آدمی کو اپنا مخالف اور دشمن خیال کرتا ہے اور ہر شخص کی طرف سے چوکنا اور ہوشیار رہنے کی کوشش کرتا ہے ۔ کسی پر اعتماد نہیں کرتا بعض خود پرست لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ہمیشہ اپنی خوبیوں کو اس درجہ سے گھٹا کر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنے فرضی عیوب بھی بیان کرنے میں تامل نہیں کرتے کہ دوسرے لوگ ان سے اختلاف کرکے ان کی تعریف کریں اور اس طرح انہیں حظِ نفس حاصل ہو سکے ۔ ایسے حضرات کے مقابلہ میں کچھ ایسے خود نمائی اور انانیت کا شکار لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو بہت بڑا اور دوسروں کو انتہائی ذلیل و خوار خیال کرتے ہیں ۔ ایسے بیہودہ لوگوں کا بہترین علاج یہ ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ نظر انداز کیا جائے اور انکی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا جائے ۔ ایسے لوگوں کی طرف آپ جس قدر متوجہ ہونگے اسی قدر انکی عادتیں خراب ہونگی ۔ بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ان کا نفسیاتی علاج کرنے کے لئے گاہے گاہے ان کے پندار کو مناسب طریقہ سے مجروح کرتے رہیں تاکہ انکے مزاج کا توازن بالکل ہی خراب نہ ہو جائے اور بالکل ہی ناقابلِ برداشت بن کر نہ رہ جائیں ۔

اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی لائقِ اعتنا نہیں ہوتے جو ہر وقت اپنے ہی مصائب و آلام کا دُکھڑا روتے رہیں جنہیں دنیا اور زندگی میں غم ہی غم نظر آئے اور کسی جگہ کسی وقت خوشی کا احساس نہ کر سکیں ۔ ہمیشہ ان کی نظر میں زندگی کے تاریک پہلو پر ہی جمی رہیں ۔ جو دنیا کے ہر شخص کو اپنے علاوہ بددیانت اور کم ظرف خیال کریں ۔ ایسے لوگ اپنی زندگی کو تو تباہ کر ہی لیتے ہیں لیکن اپنے ساتھ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی لے ڈوبتے ہیں ۔ اسی طرح وہ لوگ بھی متوازن زندگی نہیں گزار سکتے جو غم سے متاثر ہونے کی بالکل صلاحیت ہی نہیں رکھتے ۔ ایسے لوگ بڑے بے حس اور غیر ذمہ دار ہوتے ہیں ۔ اچھی اور متوازن زندگی گزارنے کے لئے آدمی کو زندگی کے ہر پہلو پر نظر رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے یک طرفہ زندگی مجموعی طور پر کچھ زیادہ مناسب اور کامیاب نہیں رہتی ۔ انسانی زندگی کے سینکڑوں پہلو ہیں اور ہزاروں داعیات اور مطالبات ہیں ۔ ان میں سے جس کسی کو نظر انداز کر دیا جائے یا اس کا مناسب نشوونما نہ ہو وہیں زندگی میں خلا اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۔ شعوری زندگی گزارنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر پہلو کا پورا شعور رہے اور اس کی آبیاری ہوتی رہے تاکہ مُرجھا نہ جائے ۔ نفسیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمارے احساسات زیادہ وسیع اور تیز ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔ بلکہ نئے نئے تاریک گوشے اُجاگر ہو رہے ہیں اسی وجہ سے ہمارا شعور بھی زیادہ ہمہ گیر ہوتا چلا جا رہا ہے اس لئے زمانہ کی رفتار کا ساتھ دینے کے لئے ہمیں اس تیز رفتار ترقی کے ساتھ قدم ملائے رکھنا چاہیئے ۔ ذرا سی غفلت سے ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے اور تیز گام قافلے سے بچھڑ جائیں گے ۔ ذہن کی پستی ۔ شعور کا نقص ۔ احساس کی کُندی ہمارے راستہ میں رکاوٹ بن جائیں گی عرفی نے اس بارے میں خوب کہا ہے ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل گردم و صد سالہ راہم دور شد

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے خطوط

جناب وحید قیصر ندوی کے نام

مہندرو پٹنہ
۲۷/۵/۶۳ ہجری

برادر عزیز سلام و رحمت

کارڈ ملا۔ شکریہ!

آپ کے "ابتلا"[1] کی داستان عبدالماجد[2] صاحب کی زبانی معلوم ہو چکی تھی۔ اللہ اپنا رحم کرے۔

ندیم[3] کے متعلق سہیل[4] صاحب سے پوچھ لیجئے۔ ان کا معاملہ طے نہیں پا سکا۔ اس لئے اب مجھے بھی اُس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

اب آپ مضمون نہ بھیجیں، یوں اگر پٹنہ آنا ہو تو ساتھ لا سکتے ہیں، باقی خیریت ہے۔ اپنے والد ماجد کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔

مجی سہیل صاحب سے اگر ملاقات ہو تو سلام پہنچا دیجئے۔

والسلام عاجز مسعود عالم ندوی

مہندرو پٹنہ۔ ۸ رجمادی الاول

الاخ العزیز سلام و رحمت

آپ کا دوسرا کارڈ بھی وقت پر مل گیا تھا۔ میں ہر طالب علم کی خدمت کو حاضر ہوں اس لئے کہ اب تک خود طالب علم

---

[1] کچھ ذاتی امور کی طرف اشارہ ہے۔

[2] مولوی عبدالماجد ندوی ان دنوں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی ادب کے استاد ہیں۔

[3] انجم مانپوری مرحوم نے یہ رسالہ ۱۹۳۱ء میں صوبہ بہار کے شہر گیا سے نکالا تھا۔ مانپوری مرحوم نے یہ رسالہ سید حسن امام رئیس اعظم گیا کے سپرد کر دیا تھا۔ بعد میں سید حسن امام صاحب نے یہ رسالہ بہار کے نامور ادیب اور مورخ مولانا سید ریاست علی ندوی کے حوالہ کر دیا تھا۔ سید ریاست علی ندوی اس رسالہ کو سہیل عظیم آبادی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ سہیل صاحب سے معاملہ نہ ہو سکا تو اس رسالہ کو سید علی صاحب نے سید محی الدین ندوی مالک برقی مشین پریس پٹنہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ سید محی الدین ندوی نے کافی دنوں تک یہ رسالہ چلایا مگر تقسیم کے کچھ دنوں بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔

[4] بہار کے مشہور افسانہ نگار۔

ہوں - والحمد اللہ - اور پھر جب ندوہ کا تعلق بھی موجود ہو - گو پچھلے سالوں کے "واقعات"[1] نے مجھے اس دائرے سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے - جب میکدہ میں جگہ نہیں تو پھر مسجد و خانقاہ ہی کو کھٹکھٹا کر دیکھا جائے اگرچہ عقیدہ اب تک وہی ہے - کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے - سہیل صاحب سیانگ کی اونچائیوں سے رانچی کی وادی میں شاید اتر آئے ہوں - آپ اُن سے ملتے رہیئے، کچھ اُن سے لیجئے اور کچھ انہیں دینے کی بھی کوشش کیجئے - ہر سوسائٹی میں جا کر منفعل ہونا دانشمندوں کا کام نہیں اور پھر آپ سے تو بڑی توقعات ہیں - سبھوں سے ملئے جو چیز لینے کی ہو ضرور لیجئے - حکمت تو مومن کی گمشدہ نعمت ہے - جہاں اس کا سُراغ ملے اس کے لئے تگ و دو کرنا چاہیئے - ساتھ ساتھ یہ بھی کہ جو حق سے بے خبر ہیں، انہیں اپنے علم اور عمل کے مطابق باخبر کرنے کی کوشش بھی ہونا چاہیئے - مطلب یہ ہے کہ جہاں جائیے اپنی انفرادیت قائم رکھئے - ہم نے یہ بہت رنج کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ طلبہ ندوہ بھی اپنی انفرادیت کھوتے جا رہے ہیں - اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ

ہاں! تو کہنا یہ تھا کہ سہیل صاحب سے ملئے اور میرا سلام کہیئے "ندیم" کا مدفن، شاید برقی پریس ہی کے لئے تنہا مقدر تھا، کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، اللہ کرے میرا خیال غلط ثابت ہو۔

آپ پٹنہ آئیں اور ضرور آئیں اگر موقع ہو - غریب خانہ حاضر ہے - اپنے والد ماجد کی خدمت میں سلام شوق عرض کیجئے اور بھی اگر کوئی جاننے والے یا ملنے والے ہوں والسلام

مسعود عالم ندوی

خط و کتابت کے متعلق ایک بات عرض کر دوں - یوں تو میں جواب دینے میں بہت Prompt ہوں مگر اب یہ ترمیم کر دی ہے کہ بے ضرورت خط نہ لکھیں - تو جن خطوط سے کام متعلق ہونگے ان کے جواب جائیں گے - باقی پر خاموشی، یہ "برتاؤ" میرا تمام احباب کے ساتھ ہے اور اس کی توقع اُن سے بھی کرتا ہوں - م - ع

ڈاکخانہ مہندرو، پٹنہ

۸ رمضان الاعز سنہ ۶۳ھ

برادر عزیز سلام و تحیات

پرسوں آپ کا کارڈ ملا، خوشی ہوئی کہ آپ اس تعطیل میں نہ آسکے، آپ کہیں گے کہ یہ خوشی کیوں؟ جی ہاں! خوشی ہوئی ——— سنیئے :-

قصہ یہ ہوا کہ میری اہلیہ، جو عرصے سے ایک سخت عارضے میں مبتلا ہیں، یک بیک رمضان سے ایک ہفتہ پہلے یہاں پہنچا دی گئیں - اس "حادثے" سے اولاً تو مجھ "بیمار" کا کچومر نکل گیا، دوسرے جتنے پناہ گزیں طالبعلم ہمارے ہاں تھے، "ترک مقام" پر مجبور ہوئے - طاہر[2] صاحب مدرسے کی "مسجد" میں معتکف ہیں - ولایت[3] علی صاحب خسرو پوری نے گھر کی راہ لی - آپ کی آمد کا ہر وقت "اندیشہ" تھا، جی چاہا کہ خط لکھ دوں اور روک دوں - طبیعت کچھ

---

[1] مرحوم دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے استاد تھے وہاں سے بعض منتظمین سے اختلاف کی وجہ سے استعفیٰ دے کر پٹنہ چلے آئے تھے جہاں وہ خدا بخش خاں لائبریری میں اورینٹل کیٹلاگر کے فرائض انجام دے رہے تھے - [2] سابق ایڈیٹر مغربی پاکستان لاہور [3] ایک طالب علم جو مولانا مسعود عالم ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مقیم تھے -

آمادہ نہ ہوئی۔ عبدالماجد صاحب آئے تو آپ کا حال معلوم ہوا۔ کچھ مسرت ہوئی، پھر بھی رانچی سے واپسی کا خطرہ لاحق رہا! باایں ہمہ "روکنے" کی ہمت نہ ہوئی، پرسوں آپ کا خط آیا تو جان میں جان آئی۔ اب آپ عید بعد سرا ہے، پٹنہ اتر جائیے۔ ملاقات ہو جائے گی اور اطمینان سے باتیں بھی ہو رہیں گی، اگر ان دنوں کوئی اور صاحب مہمان نہ ہوئے۔

عبدالماجد صاحب سے بھی معذرت کی، اب وہ غالباً گھر ہی پر ہیں۔

تبدیل آب و ہوا اور علاج کے لئے میرا عزم سفر مصمم ہے۔ مگر کیا صورت ہوگی، کچھ نہیں کہہ سکتا، صورتِ حال اتنی پیچیدہ ہو گئی ہے کہ عقل کام نہیں کرتی۔ اگر اللہ کا فضل شامل حال رہا تو انشاء اللہ دس بارہ عید تک لکھنؤ ہوتا ہوا فیروز پور کا قصد کروں گا۔

رمضان کے اواخر تک آپ کو "مفصل پروگرام" کی اطلاع دوں گا۔ ابھی قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اگر میں فیروز پور گیا اور وہاں کچھ دنوں رہ سکا تو پھر آپ کچھ "فرصت" میں ادھر ہی قصد کیجئے۔

آخر میں دعا کی درخواست ہے، آجکل میری حالت قابل رحم ہے۔

والسلام

عاجز مسعود عالم ندوی

مجی سہیل صاحب اور الیاس صاحب صدیقی سے سلام عرض کیجئے

اور اپنے والد صاحب کی خدمت میں سلام اور مزاج پرسی کیجئے مسعود

دارالاسلام

نزد پٹھان کوٹ (پنجاب)

۱۲/۱۱/۶۳ھ

برادر عزیز سلام وتحیات

پرسوں آپ کا ملفوف خط فیروز پور ہوتا ہوا یہاں پہنچا، فیروز پور کی آب و ہوا سے تنگ آ کر ۲۰ر اکتوبر کو وہاں سے چل کھڑا ہوا تین دن لاہور رہا۔ وہاں طبیعت بشاش رہی حالانکہ "کوثر" کا دفتر شہر کے آباد ترین حصے میں ہے اور وہاں صاف ہوا کا گزر نہیں۔ ۲۴ر اکتوبر کو دارالاسلام پہنچا۔ تین چار روز قیام کا قصد تھا لیکن مولانا مودودی وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ سال کا اکثر حصہ یہیں رہوں صرف برسات کے ۳ چار ماہ لاہور میں گزاروں۔ یہ جگہ آبادیوں سے دور سرنا اسٹیشن سے ایک فرلانگ پر ریلوے لائن سے متصل، بسائی گئی ہے۔ بہت مختصر سی نو آبادی ہے۔ قریب ہی نہر بہتی ہے۔ دق کے مریضوں کے لئے یہ جگہ قدرتی sanitorium ہے۔ ہمالیہ یہاں سے کل پندرہ سولہ میل ہے۔ گو موٹر سے چکر در چکر کے باعث ابتدائی پہاڑی مقامات بھی ۵۰، ۶۰ میل سے کم نہیں، ضروریات کی چیزیں بھی یہاں نہیں ملتی ہیں، پٹھان کوٹ یہاں سے چار میل پر ہے۔ ریل تانگہ، بس سروس ہر طرح کی سواریاں میسر ہیں مودودی صاحب کے پاس ذاتی تانگہ بھی ہے، جو تقریباً کسی نہ کسی ضرورت سے جاتا رہتا ہے۔ میں بھی ڈاکٹر کے ہاں انہیں کے تانگہ پر

جاتا ہوں۔ میرا ذاتی حال یہ ہے کہ فیروز پور میں لکھنؤ کی طرح دورے جاری رہے لاہور میں اگر یک قلم رُک گئے یہاں بین بین حالت ہے، ایک طرف قدرتی مناظر اور تروتازہ ہوا، دوسری طرف خنکی اور سردی کی بہتات اور رطوبت ۲۵ ر اکتوبر سے پٹھان کوٹ کے ایک ڈاکٹر کا علاج بھی شروع کرا دیا ہے، مودودی صاحب کے اصرار سے ہوا ایک ماہ کم سے کم اسے آزمانا ہوگا۔ حسب توقع اگر اس کے علاج سے دورے دب گئے تو پھر یونانی مقویات اور معجون وغیرہ استعمال کروں گا۔ سر دست کوشش یہی ہے کہ کسی طرح یہیں صحت اچھی اور بحال رہے۔ ورنہ پھر لاہور یا جالندھر مستقر بناؤں گا، زیادہ خیال لاہور ہی کا ہے۔ مودودی صاحب یہاں رہنے پر مصر ہیں ان کی رائے میں صرف برسات کے موسم میں یہاں سے دور رہنا مناسب ہوگا۔

جی ہاں برہان[1] دیکھا۔ پوری قسطوں کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو پھر کچھ عرض کیا جائے گا۔ اس ماہ کے ترجمان میں معارف سے بھی زیادہ سخت تنقید آرہی ہے "سنی خارجیت" کا ذکر سنا ہے۔ مودودی صاحب نے اس سلسلے میں مولانا گیلانی[2] کو ایک دلچسپ خط لکھا ہے، آج صدق مل جائے گا۔ برہان مل چکا ہے، ایک کتاب اور دیکھئے "الفرقان" ولی اللہ نمبر میں راقم کا ایک مضمون نکلا تھا شاید آپ نے دیکھا ہو اس کی تردید میں مولانا گیلانی نے ۵۰۰ صفحوں کی ایک کتاب "نظام تعلیم و تربیت" لکھدی ہے۔ اگر معارف نے اجازت دی تو اس پر ریویو کروں گا محمد ناظم[4] صاحب نے فرد لحاف نہ بھیجا ہو تو آپ بھیجدیں براہ راست فیروز پور۔ مظفر شاہ[3] کا ایک ماہ انتظار کروں گا نومبر کے آخر میں لاہور جانا ہوگا تو وہیں اونی رومال خریدوں گا۔ وہ اس دوران میں آجائیں تو اونی رومال اور چادر (اگر وہ لے آئے ہوں) فوراً پارسل سے بھجوادیں۔ والسلام

عاجز مسعود عالم

---

[1] رسالہ برہان دہلی میں مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مسعود عالم کے ایک مضمون سے متاثر ہو کر "نیا نظامِ تعلیم" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

[2] مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم

[3] مولانا مظفر شاہ ندوی سیکرٹری تعلیمات حکومت آزاد کشمیر

[4] مولانا محمد ناظم ندوی پرنسپل جامعہ عباسیہ ریاست بھاولپور (مغربی پاکستان)

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں جو آپ کے پتہ کی چٹ پر درج ہے۔ (ادارہ)

سراج رضوی

خونِ جگر ہونے تک

سقراط کو جب زہر کا پیالہ دیا گیا، تو اس کے چہرے پر اضطراب یا سراسیمگی کی جگہ اطمینان اور سکون کے بھرپور جذبات موجود تھے۔ وہ اس خیال سے مطمئن تھا کہ اُس نے اہلِ یونان کے لئے فلسفہ و دانش کا ایک ایسا قلمی سرمایہ چھوڑا ہے، جس سے اُس کی قوم ذہنی بالیدگی اور آسودگی حاصل کرتی رہے گی، اربابِ فکر و دانش کا یہی وہ ادبی اور فکری ترکہ ہوتا ہے، جس پر آج کی اور کل کی نسلیں نہ صرف یہ کہ فخر کرتی ہیں بلکہ قومی جدوجہد کے لئے راہِ عمل کا بھی تعین کرتی ہیں۔

فضلِ احمد کریم فضلی نے ایک ناول ——— خونِ جگر ہونے تک ——— لکھ کر کچھ اسی انداز کا عظیم کارنامہ بلکہ یوں کہیے قومی فرض انجام دیا ہے، اُن کا ناول ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ہم اپنے صحیح خد و خال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، اور پاکستان کی جدوجہد آزادی کو ایک منشور قرار دے کر، اُن پیچیدہ پگڈنڈیوں کا پتہ چلا سکتے ہیں، جن سے پوری قوم گزری تھی، اور اُن "خارِ مغیلاں" کی نشاندہی کر سکتے ہیں، جن کے راہوں میں پڑے رہنے کا اب بھی امکان ہے۔

اُردو میں ناول نگاری کا رجحان جس قدر تیزی سے ترقی پا رہا ہے، اُسی قدر تیز رفتاری سے اس صنفِ ادب میں انحطاط بھی رونما ہو رہا ہے۔ کتنے ہی ناول تو اس انداز کے منظرِ عام پر آئے ہیں، جو پاکستان کے قومی مزاج سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے، کچھ ناول جنسی جذبات کو غذا دیتے ہیں، اور بعض فن اور زبان کے اعتبار سے کمزور ہیں! اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ سرزمین پوری کی پوری بنجر نہیں ہے۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ چند اچھے ناول بھی پاکستان میں لکھے گئے ہیں اور اس خاک سے خار و خس ہی نہیں لالہ و گل بھی اُگے ہیں مگر فضلی کا یہ ناول اپنی جگہ ممتاز و منفرد ہے، اس ناول کو پاکستانی ادب کا سنگِ میل کہا جا سکتا ہے۔

جناب فضلی نے ناول نگاری کے جدید تقاضوں کو ناول میں سمویا ہے، زبان بھی شستہ اور رواں ہے، اندازِ بیان بھی دلنشین ہے، پلاٹ بھی مربوط اور مسلسل ہے، ناول کے تمام کردار (Characters) جاندار ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہوس کے چٹخاروں سے دامن بچاتے ہوئے، ناول کو انتہائی دلچسپ بنا دیا ہے کہ پڑھتے چلے جایئے اور ذرا سی بھی اُکتاہٹ محسوس نہ ہو، اُن کا ناول پُر لطف جستجو کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ کہ اب کیا ہوگا؟ اور جب کسی واقعہ کا نتیجہ سامنے آ جاتا ہے، تو دل مطمئن ہو جاتا ہے کہ "ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔" فضلی اب تک غزل گو کی حیثیت سے مشہور رہے تھے، مگر اس ناول کو لکھ کر، انھوں نے ناول نگاری کی صف میں بھی بلند مقام پیدا کر لیا ہے؟

یہ ناول مُرقع ہے اُس ثقافت کا جو بنگال کی مسلم ثقافت کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد بنگال کے بڑے بڑے شہروں میں مقیم چند پیشہ ور ناچنے اور گانے والوں کا وہ "سحر" ٹوٹ جاتا ہے جس کے مسلسل اثرات نے باخبر لوگوں کو یہ تک سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ رقص و نغمہ، مشرقی پاکستان کی ثقافت کا ایک ایسا جزو لاینفک ہے جس کے بغیر اس خطۂ پاک کی بہو بیٹیاں گرہست نہیں قرار دی جا سکتیں۔ فضلی صاحب نے مشرقی پاکستان کے چہرے سے اُس نقاب کو نوچ کر پھینک دیا ہے۔

"خونِ جگر ہونے تک" اُن لوگوں کی داستان ہے جو آج چار پونے چار کروڑ کی تعداد میں پاکستان کا ایک قوی بازو بنے ہوئے ہیں

اور جن کے "ایمان" کی قسم کھانے پر اب فضلی صاحب نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد اب یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ "مفاد پرست سیاست دانوں" نے مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کا کس قدر غلط نقشہ ہمارے سامنے کھینچا تھا اور محض اپنی قیادت کی دکانیں سجائے رکھنے کے لئے انہیں ہم مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے کس قدر مختلف اور کتنے بیزار ثابت کیا کرتے تھے۔

اس ناول کی کہانی بنگال کی ایک پر فضا اور پرسکون چھوٹی سی بستی گھوڑا مارا سے شروع ہوتی ہے اور مایوسیوں، چیخوں، کراہوں اور آنسوؤں کے ایک متلاطم سمندر سے گزرتی ہوئی سازشوں اور فتنہ پردازیوں کے جالوں میں پھنستی ہوئی مسکراہٹوں، مسرتوں اور خوشیوں کے ساحل پر پہنچ کر گھوڑا مارا ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ گھوڑا مارا کی ایک دور افتادہ اور گمنام سی بستی میں مختصر سے لوگ رہتے ہیں۔ اس بستی میں اپنی حقیر اور معمولی حیثیت کے باوجود ان شعلوں کی لپک محسوس ہوتی ہے جو لاکھوں میل دور دیار مغرب میں ۱۹۳۹ء کے موسم خزاں میں بھڑک اٹھے تھے۔ اور ان انگاروں کی دہک بھی محسوس ہوتی ہے جو جاپانیوں نے برما سے آگے بڑھ کر کلکتہ کی فضاؤں میں بکھیر ڈالے تھے۔ بنگال کے تاریخی قحط نے جب شہروں اور بستیوں کو اجاڑنا شروع کیا تو گھوڑا مارا بھی میر کی غزل بن گیا اور پھر یاس و حسرت ناکامی اور نامرادی کے ہر مصرعے پر کوئی انشار تضمین کر کے دم توڑتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس چھوٹی سی بستی میں "مسلم لیگ" کا پیغام آزادی بھی گونج رہا تھا اور کانگریس کا پروپیگنڈہ بھی۔ یہاں مہا سبھائی تحریک کے علم بردار بھی تھے اور اشتراکی انقلاب کے خواب دیکھنے والے "سرخے" بھی۔

اس بستی میں رہنے والے کردار بنگال کے "ذہن" کی نیابت کے فرائض انجام دیتے ہیں، ایک مرکزی کردار "جمعدار صاحب" کا ہے، یہ مسلم بنگال کے اس طبقہ کی نیابت کرتے ہیں جو تعلیم یافتہ نہیں ہے اور جو دراصل مشرقی پاکستان کے عوام ہیں۔ "جمعدار صاحب" نیک دل، نیک طینت اور نیک خو ہیں وہ اوروں کی مدد کرنا اس وقت بھی اپنے فرائض میں سے ایک فرض سمجھتے ہیں جبکہ وہ خود مدد کے محتاج ہیں۔ انہیں جتنا فخر مسلمان ہونے پر ہے اتنا ہی فخر مسلم لیگی ہونے پر ہے۔ انہیں جس طرح کی مصیبت اور پریشانی نے خدا سے برگشتہ ہونے پر مائل نہیں کیا، اسی طرح مسلم لیگ کے کسی ایسے فیصلہ سے بھی وہ اپنی قومی جماعت سے برگشتہ نہیں ہوئے جو خود ان کے اپنے مفاد کے سراسر منافی تھا جس میں ان کے اپنے ذاتی وقار کو نقصان پہنچا تھا۔ اور جس کی وجہ کر انہیں اپنے ہم چشموں میں شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ وہ موت کے دہانے پر کھڑے دوسروں کا سہارا بننے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی "کم علمی" کے سبب ایک برائی کو اچھائی سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن جب ان پر حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو وہ بلا تامل اور بغیر کسی مصلحت اندیشی کے اس کا ازالہ کرتے ہیں۔ جمعدار صاحب کا کردار مصنف نے کچھ اس قدر اچھوتے قسم کا پیش کیا ہے کہ اس کی مثال کم از کم اردو ادب میں کہیں نہیں ملتی۔ انگریزی ادب میں بھی ایسا کردار شاذ و نادر ہی پیش کیا گیا ہوگا۔ وکٹر ہیوگو کے ناول "لامیزریبل" میں پادری جلین کا کردار بھی بڑی مثالی حیثیت کا حامل ہے، یہ الگ ایک بات ہے کہ ہیوگو نے یہ کردار "عربی ادب" سے چرایا تھا۔ لیکن یہ بہر حال جمعدار صاحب اور پادری جلین کے کردار میں ایک بین فرق تو یہی نظر آتا ہے کہ "پادری جلین" نیکی کی راہ پا لینے کے بعد بھی نیک کام کرتا ہے اور فضلی کے جمعدار صاحب فطرتاً نیک ہیں۔ وہ نیکی "پاتے" نہیں ہیں اس لئے کہ وہ کبھی بھٹکے ہی نہ تھے۔ وہ نیکی فطرت سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ کسی صلے یا انعام کی خاطر نہیں اور نہ کسی برائی کی پاداش بھگتنے کے لئے وہ جب نیک و بد میں تمیز کرنے سے اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں تو ان افراد سے رجوع کرتے ہیں جو ان کی دانست میں عاقل بھی ہیں اور نیک و بد میں تمیز کرنے والے بھی ہیں مصائب و آلام کی شدت کے باوجود وہ نیکی کی راہ چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ وہ فرشتے نہیں ہیں۔ ان میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں۔

لیکن اُن کی یہ کمزوریاں، بے ضرر ہیں۔ ان سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ وہ اپنی زندگی کے کسی موڑ پر کسی کے لئے بھی مضرت رساں ثابت نہیں ہوتے۔ کردار کی یہ خوبی نہ ٹیگور کے کابلی والا" میں ملتی ہے نہ پریم چند کے "گئو دان" والے خاں صاحب میں نہ "قلی" میں منٹو کا دادا بھی جمعدار صاحب کا ہم پلہ نہیں بن سکتا۔ منٹو کا دادا ایک طرف تو رحم دل ہے، غریبوں کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہر لیکن ساتھ ہی ساتھ برائیوں کی پوٹ ہے۔ غنڈہ ہے، بدمعاشوں کا چودھری ہے، مجرمانہ ذہنیت کا حامل ہے۔ وہ گناہ کر کے نیکی کرتا ہے جمعدار صاحب کا کردار ان تمام آلودگیوں سے پاک ہے۔ اس لحاظ سے یہ کردار اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد کردار ہے، اور پھر جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ کردار مسلم بنگال کے اس طبقہ کی نیابت کر رہا ہے جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم و تربیت سے بالکل بے بہرہ ہے تو اس کردار کی عظمت ہماری نظروں میں اور بڑھ جاتی ہے۔

دوسرا اہم کردار "بشیر الاسلام" کا ہے۔ یہ گھوڑا مار کا ایک تعلیم یافتہ مسلمان ہے۔ اور مسلم بنگال کے اس طبقے کی نیابت کر رہا ہے جو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مذہبی اقدار سے قدرے بے نیاز ہو گیا ہے مسلم سیاست کا یہ بھی جزو لاینفک ہے۔ لیکن اس طبقے میں مغربی تعلیم اور غیروں کے ساتھ ربط و ضبط کی وجہ سے خود پرستی بلکہ مفاد پرستی بھی بڑی حد تک پیدا ہو چکی تھی۔ ہوس اقتدار نے اُسے اپنے اعلیٰ مقام سے نیچے گرا دیا تھا۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری نے اس کی ایمانی جرأت کو بہت کم کر دیا تھا۔ بشیر الاسلام جیسے کردار پاکستان کی جدوجہد آزادی میں برابر کے شریک ہونے کے باوجود "قابل مذمت" سمجھے جاتے رہے ہیں لیکن اس کردار کا بھی ایک روشن پہلو مصنف نے پیش کیا ہے۔ بشیر الاسلام متاسف نظر آتا ہے۔ شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے رویہ میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ اس سے کم از کم یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بنگالی تعلیم یافتہ مسلمان خواہ کتنا ہی بے راہ رویوں نہ ہو جائے بالآخر وہ روش اختیار کر لیتا ہے جو وقت کا تقاضہ۔ دین کا تقاضہ اور قوم کا تقاضہ کہلائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مسلم بنگال کے اس طبقے نے حصولِ پاکستان میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں اور جو جو قربانیاں دی ہیں وہ روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

تیسرا مرکزی کردار جلو دھر کا ہے۔ یہ کمیونسٹ ہے۔ اس لئے تخریب پسندی اس کا شعار ہے۔ یہ اخلاقی اقدار یا جذبہ حب الوطنی سے قطعی بے نیاز نظر آتا ہے۔ یہ اگر کوئی "نیکی" کرتا ہے تو سودے بازی کی خاطر۔ اس کا مطمح نظر اشتراکی حکومت کا قیام ہے۔ یہ عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے بعض مصلحت آمیز "نیکیاں" کرتا ہے۔ قحط اس کے لئے انسانی آلام و مصائب کا جواز بن کر اُسے ہمدردی اور اعانت کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ اشتراکیت کو مقبول بنانے کا ایک حربہ محسوس ہوتا ہے۔ مصنف نے جلو دھر کے کردار کو پیش کر کے کمیونسٹوں کے وہ سارے ہتھکنڈے بے نقاب کر دیئے ہیں، جو غیر منقسم بنگال میں اشتراکیت پسندوں نے دل کھول کر استعمال کئے تھے۔ اور جن کے اب بھی استعمال کئے جانے کا بہت کچھ احتمال ہے۔ غالباً مصنف کو ذاتی طور پر ان بنگالی کمیونسٹوں سے نمٹنے کا موقع ملا تھا۔ اسی لئے بہت ہی خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ انھوں نے ان کی سرگرمیوں کو بیان کیا ہے۔ ایک معمولی عقل و فہم والا آدمی بھی اس ناول کو پڑھنے کے بعد کمیونسٹوں کے اُس "کھیل" کو بخوبی سمجھ جاتا ہے جو برسوں سے اس برصغیر پاک و ہند میں کھیلا جا رہا ہے۔

چوتھا کردار مجید صاحب کا ہے۔ مجید صاحب اُن مسلمان افسروں کی نیابت کے فرائض انجام دیتے ہیں، جو اسلام پسند تھے اور سرکاری ملازمت کی پابندیوں کے باوجود پاکستان کی جدوجہد آزادی میں حسب استطاعت ہاتھ بڑھاتے تھے۔ بنگال کے چھوٹے سے چھوٹے قریہ میں انھوں نے "مسلم لیگ" کی آواز کو بالکل جائز طور پر ابھرنے دیا۔ یہ سلسلے کے سارے عہدیدار بنگالی عوام اور بالخصوص مسلمانوں کے دکھ درد سے بخوبی آگاہ تھے اور اپنی بساط بھر کوشش اُن کی فلاح و بہبود کی کیا کرتے تھے مسلم بنگال کو کمیونسٹ

"جال سے بچائے رکھنے کا سہرا انہی کے سر تھا۔

اس ناول میں ایک اور کردار مولانا مستنصر باللہ کا ہے۔ یہ دیو بند کے فارغ التحصیل ہیں۔ ایک قابل تقلید مسلمان اور قابل احترام دینی رہنما۔ نیشنلسٹ (قوم پرست) مسلمانوں کی طرح "کرایہ دار" ذہن نہیں رکھتے۔ سنجیدہ متین اور فاضل دینیات ہیں نیکی کی اور سچی راہ دکھانے اور سمجھانے والے بھی یہی مولوی صاحب ہیں۔ جو گھوڑا مار کی بستی میں اسلام کے حقیقی علمبردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی تحریک آزادی کے ہمدرد اور پاکستان کے سرگرم حامیوں میں سے ہیں۔ آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی کا حقیقی مفہوم اس قدر عمدگی سے موثر پیرایہ میں سمجھاتے ہیں کہ ہر بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے مستنصر باللہ کا کردار بھی اردو ادب میں پہلی مرتبہ اس قدر باعظمت اور قابل تقلید بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ مصنف کی اس جدت طبع پر داد تحسین دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ ہمارے اکثر اہل قلم کا ایک عرصے سے یہ وتیرہ بن چکا ہے کہ جب بھی کوئی تحریر پیش کرتے ہیں خدا اور رسول کی کسی نہ کسی حیثیت سے تضحیک ضرور کرتے ہیں۔ خواہ وہ "مولوی" کا کردار پیش کر کے ہی کیوں نہ کی جائے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو "مولوی" کے کردار کی آڑ میں خدا اور رسول پر دل کھول کر پھبتیاں کستا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کہنا تو اپنے آپ کو اسلام پسند ہے۔ لیکن "مولوی" پر پھبتی چست کر کے گویا خود کو "ملائیت" کا مخالف اور روشن خیال مسلمان ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح دونوں ہی گروہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام اور مسلمانوں کی اہانت کرتے رہتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے سماج میں "مولویوں" کا ایک ایسا خاص طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو بزعم خود اسلام کا اجارہ دار بنا "دین" کو نقصان پہنچا تا رہتا ہے۔ اسی طبقے نے اپنی جہالت۔ کم علمی اور مفاد پرستی کی اسلام جیسے وسیع النظر اور کشادہ قلب مذہب کو رسوا کر رکھا ہے ان لوگوں نے اسلام میں "پاپائیت" کو پروان چڑھایا ہے اور پھر بہت سے ایسے مواقع بھی آئے ہیں جبکہ اس طبقہ کے افراد نے مسلمانوں کی سیاسی تحریکات میں روڑے اٹکائے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ایسے مولوی بھی تھے اور اب بھی ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی دین اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ جو ہر کام پر عامۃ المسلمین کے ساتھ رہے، اور پاکستان کی جنگ آزادی میں بھی سب کے ساتھ سینہ سپر ہو گئے۔ یہ دینی عالم بھی ہیں اور قوم کے سپاہی بھی ان کے علم و فضل نے دین میں انتشار بھی نہیں پھیلنے دیا اور مسلمانوں میں دین سے برگشتگی کو بھی پروان نہیں چڑھنے دیا یہ لوگ قابل احترام بھی ہیں اور قابل تقلید بھی۔ فضلی صاحب نے پہلی بار اس ناول میں ایسے ہی باوقار ایک "مولوی" کا کردار پیش کر کے اسلام پسند ادیبوں کو ایک "مثبت" رویہ کی تلقین کی ہے۔ اس کردار کو خصوصیت سے پیش کرنے کا مقصد غالباً غیر مسلم اہل قلم کی ایک ایسی تحریک کو کچلنا ہے جو صدیوں سے مختلف اسلامی ممالک میں مختلف انداز سے چلائی جا رہی ہے۔ بدقسمتی سے اس معاندانہ تحریک میں بعض مسلمان اہل قلم نے بھی نادانستگی میں تعاون کیا ہے۔

دراصل اسلام اور مسلمانوں پر کیچڑ اچھالنے کے لئے اہل قلم نے دو قسم کے طرز تحریر اختیار کئے ہیں۔ ایک "مثبت" طرز اور دوسرا "منفی" طرز۔ مثبت طرز تحریر کے ذریعہ اسلامی ناموس پر کیچڑ اچھالنے کی تحریک میں مستشرقین بہت پیش پیش رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک عرب عیسائی ناول نگار "جرجی زیدان" نے تو گویا اس کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے کہ وہ اسلامی تاریخی ناولوں کے ذریعے مشاہیر اسلام کی تضحیک اور اہانت کرتا رہے گا۔ جرجی زیدان کے ناول سارے عالم اسلام میں اُتنے ہی مقبول ہیں جتنے پاکستان میں ابن صفی کے جاسوسی ناول۔ جرجی زیدان یہ اسلامی تاریخی ناول کچھ اس انداز میں لکھتا ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مشاہیر اسلام اور دین متین کے سنہری اصولوں کی قصیدہ خوانی کر رہا ہے۔ مگر ناول کے مجموعی تاثر کا اگر اندازہ لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف اپنی تاریخ سے برگشتہ ہو گیا بلکہ اپنے دین سے بھی اُس کی عقیدت متزلزل سی ہو گئی ہے۔ بدقسمتی سے جرجی زیدان کے یہ ناول ہمارے یہاں بھی بہت مقبول ہیں۔

دوسرا طرز تحریر جو "منفی" کہلایا جا سکتا ہے۔ اُس کی اعلیٰ ترین مثال بنگال کے مشہور و معروف ناول نگار رائے بہادر بنکم چیٹر جی سی۔ آئی۔ سی کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ بنگالی ادب میں بنکم چیٹر جی کو وہی مقام حاصل ہے جو اُردو میں مولانا عبدالحلیم شرر کو حاصل تھا۔ بنگال کے اس ہر دلعزیز مصنف کا شاید ہی کوئی ایسا ناول ہو جس میں مسلمانوں کے دین کی، اُن کے عقائد کی اور انکی تاریخ کی اہانت و تضحیک نہ کی گئی ہو۔ چنانچہ اگر یہ بات کہی جائے تو بے جا نہ ہوگی کہ سارے بنگال میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفاق کے بیج بونے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اپنے دین اور اپنی تاریخ سے برگشتہ خاطر کرنے میں سب سے اہم کردار بنکم چیٹر جی کے ناول نے ادا کیا ہے۔ اس کے مشہور و معروف ناول "کپال کنڈلا" "راج سنگھ" اور "سیتارام" کا ترجمہ اردو میں پنڈت سدرشن نے کیا ہے اور یہ سب کے سب ناول اُس تاریخی شہر سے یعنی لاہور سے شائع ہوتے ہیں، جہاں خدا اور رسول ؐ کے نام پر گولی کھانے والوں کی تعداد بے اندازہ ہے۔ ان ناولوں میں سب سے زیادہ دل آزاد ناول "راج سنگھ" اور "سیتارام" ہیں۔ "سیتارام" کا ترجمہ اُردو میں "زہریلا آبِ حیات" کے نام سے ہوا ہے۔ اُس میں مسلمانوں کی خوب جی بھر کے تضحیک کی گئی ہے "راج سنگھ" شہزادی زیب النساء اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی شان میں گستاخیوں کا ہجو یہ قصیدہ ہے، اُس میں جو جملے استعمال کئے گئے ہیں وہ اتنے رکیک اور اہانت آمیز ہیں کہ اُن کے دہرانے کی نہ غیرت اجازت دیتی ہے اور نہ شرافت! اس قسم کے لٹریچر کی موجودگی میں فضلی کا یہ ناول قدر و ستائش کا مستحق ہے! جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے فضلی کا تغزل اس ناول میں ڈھل کر سچ مچ "سحرِ حلال" بن گیا ہے۔ "خونِ جگر ہونے تک" وقت کا ایک اہم تقاضا ہے، اس ناول نے پاکستانی اہل قلم کو جو راہیں سجھائی ہیں، وہ بڑی مبارک راہیں ہیں

پاکستان کو آج ایسی ہی تحریروں کی ضرورت ہے، جو ہمیں قومی ولولہ، اخلاقی نیکی کا داعیہ اور اسلامی جذبہ دے سکیں! پاکستان تعمیری دور سے گزر رہا ہے، اس لئے اُسے تعمیری ادب کی ضرورت ہے، جس سے فکر کو تازگی، ذہن کو روشنی اور دل کو نیا عزم مل سکے۔

"خونِ جگر ہونے تک" ——— ایک کردار ساز ناول ہے جس کے مطالعہ سے دل و دماغ کی تربیت ہوتی ہے اور کردار اخلاق و انسانیت کے قالب میں ڈھلتے ہیں۔

ضروری گزارش

محسن اعظم گڑھی

قصیدہ در مدح حضرت سرورِ کائنات ؐ

نہ سوزشِ غم پنہاں نہ آہ پُر تاثیر
نہ احتراز تعلق نہ دید کی تدبیر

نہ شامِ غم کا تصور نہ صبح کا مژدہ
نہ بلبلوں کا ترانہ نہ نالۂ شب گیر

نہ کوہ تھا نہ بیاباں نہ وادیٔ ایمن
نہ کوئی طالبِ جلوہ نہ خواہشِ تنویر

نہ باغ تھا نہ شجر تھا نہ پھول تھا نہ کلی
نہ سبزہ زار نہ صحرا نہ کوئی حُر نہ اسیر

نہ آسمان و زمیں تھے نہ شام تھی نہ سحر
نہ انقلاب زمانہ نہ گردشِ تقدیر

نہ فلسفہ تھا نہ منطق نہ قافیہ نہ عروض
نہ نحو صرف نہ حکمت نہ ہیئت و تفسیر

نہ جوئبارِ قصیدہ نہ گنگنائے غزل
نہ رسمِ خط کی ضرورت نہ حاجتِ تحریر

نہ شاعرانِ عرب تھے نہ نکتہ دانِ عجم
نہ گیسوئے رخِ معنےٰ نہ لفظ کی تصویر

نہ طنطنہ نہ جلالت نہ صولت و سطوت
نہ بے اصول ترحم نہ بے خطا تعزیر

نہ حرب و ضرب کا خطرہ نہ احتمالِ ستیز
نہ کوئی معرکہ آرا نہ صاحبِ شمشیر

نہ اندمالِ جراحت نہ انتفاعِ خلش
نہ آبِ خضر کا امکاں نہ نسخۂ اکسیر

نہ درد تھا نہ مداوا نہ ہوش تھا نہ جنوں
نہ لفظِ کُن کا تصور نہ مقصدِ تعمیر

بھٹک رہا تھا اندھیرے میں کاروانِ وجود
کہ دفعتاً نظر آئی رسول ؐ کی تنویر

وہی رسول بنائے جو نفی کو اثبات
وہی رسول بدل دے عدم کی جو تقدیر

وہی رسول منور ہیں جس سے شمس و قمر
وہی رسول ستاروں کو جس نے دی تنویر

وہی رسول جو ذرے کو آفتاب کرے
۔۔ وہی رسول بنائے جو خاک کو اکسیر

وہی رسول وہی میر کاروانِ حیات
کہ جس کے خلق کی محسنؔ نہ ہو سکی تفسیر

راسخ عرفانی

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

محمدؐ پیکرِ ایثار و الفت
محمد مصدرِ مہر و مروت

محمدؐ مرکزِ اوصافِ حسنہ
محمد منبعِ بحرِ شریعت

محمدؐ رونقِ گلزارِ ہستی
محمدؐ زینتِ بزمِ رسالت

محمدؐ ساقیٔ تسنیم و کوثر
محمدؐ شافعِ روزِ قیامت

محمدؐ شاہِ اقلیمِ زمانہ
محمدؐ فاتحِ ابوابِ جنت

محمدؐ مخزنِ گنجِ معانی
محمدؐ مشعلِ راہِ حقیقت

محمدؐ باعثِ تکوینِ عالم
محمدؐ حاصلِ اظہارِ قدرت

محمدؐ مصلحِ اقوامِ ہستی
محمدؐ رہبرِ راہِ طریقت

محمدؐ باعثِ تسکینِ راسخؔ
محمدؐ چارہ سازِ دردِ ملت

درد سعیدی

اقبال

ترے خیال میں غلطاں خروشِ نیل و فرات
سکوتِ فکر میں تیری تلاطمِ جیحوں

ہے کوہسار سے گرمِ ستیز اک پرِ کاہ
بیاں ہو کیا ترے ذوقِ خود آگہی کا فسوں

دیا پیام یہ اک مشتِ خاک کو تو نے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

حدیں زمان و مکاں کی بدل گئیں لیکن
ترے جنوں پہ خرد کا نہ چل سکا افسوں

ترے کلام نے شاعر کو وہ مقام دیا
کہ غرقِ بحرِ ندامت ہے فکرِ افلاطوں

بشر کو دورِ حوادث سے یوں گزار دیا
کہ جیسے گردشِ ساغر ہو گردشِ گردوں

دیا یہ ظلمتِ ہستی کو روشنی کا پیام
ہیں مہر و ماہ ابھی زیرِ خاکِ تیرہ درون

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

آمنہ نفاست حزیں
(بی۔ اے)

کیا کہوں

دل کی تنہائی کا عالم کیا کہوں　　ہم نفس کوئی، نہ ہمدم کیا کہوں
آنکھ میں آنسو، نہ ہونٹوں پر ہنسی　　یہ مسرت ہے، کہ ہے غم کیا کہوں
میں جو امرت بھی پیوں! تو زہر ہو　　سُم تو ہے اپنی جگہ، سُم کیا کہوں
چشمِ عبرت ہے، نہ ہے ذوقِ جمال　　فرصتِ نظارگی! کم کیا کہوں
اک شعاعِ اولینِ مہر سے　　ہو گیا انجام شبنم کیا کہوں
واہمہ! ہے اک مرتب ذہن میں　　ہے اُسی کا، خیر مقدم کیا کہوں
کون سمجھے گا؟ بیانِ مدّعا　　قولِ فیصل ہے، نہ محکم کیا کہوں
لالہ و گل ہوں حزیں لیکن یہ لوگ　　کہتے ہیں۔ برقِ مجسّم کیا کہوں

ماہر القادری

سوز و ساز

حسن اور عشق میں واسطا[1] بن گیا ٹوٹ کر دل بڑے کام کا بن گیا

خوش نفس، خوش نظر، خوش ادا بن گیا کیا خبر عشق میں کون کیا بن گیا

اُنکے کوچہ سے اک شام گزرا تھا میں پھر یہی روز کا مشغلا[2] بن گیا

ہر حسیں اوّل اول وفادار تھا رفتہ رفتہ مگر بے وفا بن گیا

لوگ چلتے رہے، نقش اُبھرتے رہے بس اسی طرح اک راستا[3] بن گیا

حسن والوں کے لطف و کرم دیکھ کر سوچتا ہوں میں کیوں پارسا بن گیا

تیغ ابرو کا ہر وار اوچھا پڑا زخم پھر بھی بہت دل کشا بن گیا

وہ شبِ غم تصور میں جب آگئے دُور تک نور کا دائرا[4] بن گیا

میں تو گمراہ تھا میرا نقشِ قدم دوسروں کے لئے رہنما بن گیا

بے یقینی کے اس دورِ تاریک میں آدمی آدمی کا خدا بن گیا

اے مرے مہرباں دوست! فریاد ہے قرب تو اور بھی فاصلا[5] بن گیا

اس تعلق پہ ماہر مجھے ناز ہے
اُن کا انکار بھی آسرا بن گیا

نوٹ: [1] واسطہ - [2] مشغلہ - [3] راستہ - [4] دائرہ - [5] فاصلہ

روحِ انتخاب

ہم ایک ایسے زمانے میں رہتے ہیں جس کو ترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ انسان پچھلے جن زمانوں سے ہوتا ہوا اس بیسویں صدی میں پہنچا ہے۔ اس کو چار بڑے دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک پتھر کا زمانہ یعنی وہ ابتدائی دور جب آدمی پتھر کے ہتھیاروں سے کام لیا کرتا تھا۔ دوسرا لوہے کا زمانہ یعنی وہ دور جب لوہے کی دریافت ہوگئی اور آدمی لوہے کے اوزار بنانے لگا۔ تیسرے بجلی کا زمانہ، جو یورپ میں صنعتی انقلاب سے شروع ہوتا ہے۔ چوتھے ایٹم کا زمانہ جس میں ہم اس وقت داخل ہو رہے ہیں۔ اس تقسیم سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ پچھلے تمام زمانوں سے ترقی یافتہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ترقی کا پیمانہ کیا ہے۔ لوہا اور پتھر یا انسان کی زندگی ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے کیا یہ دیکھا جائے گا کہ پتھر سے پہلے کیا کام لیا جاتا تھا اور اب اس سے کونسے کام لئے جا رہے ہیں۔ یا یہ دیکھا جائے گا کہ انسان کی زندگی بہتر ہو رہی ہے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہے گا کہ انسانی ترقی کو ناپنے کے لئے خود انسانی زندگی کو پیمانہ بنانے کے بجائے، لوہے اور پتھر کو پیمانہ بنایا جائے۔ اگر لوہے اور بھاپ کے ذریعے بڑے بڑے کام ہونے لگیں لیکن انسان کو ان سے فائدے کے بجائے نقصان پہنچے تو یہ لوہے اور بھاپ کی ترقی ہوگی۔ انسان کی ترقی نہ ہوگی۔

اس حیثیت سے جب ہم آج کے حالات کو دیکھتے ہیں تو ترقیات کی حقیقت صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں جو ظلم اور جو برائیاں پہلے بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھیں وہ اب زیادہ وسیع پیمانے پر ہونے لگی ہیں۔ پہلے لڑائیاں ہوتی تھیں تو آدمی لوہے اور پتھر کے ٹکڑوں کے ذریعہ صرف تھوڑے سے آدمیوں کو زخمی کر سکتا تھا۔ مگر آج بموں اور زہریلی گیسوں کے ذریعہ وہ پوری پوری آبادی کو بھون ڈالتا ہے۔ پہلے برائی کی تبلیغ کرنے کے لئے صرف اس کی زبان تھی جس سے وہ چند آدمیوں کو بگاڑ سکتا تھا۔ مگر آج پریس ریڈیو، اور سینما کے ذریعہ ساری دنیا کو بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ پہلے کوئی ڈاکو چند گھروں اور بستیوں کو لوٹ سکتا تھا۔ مگر آج صنعتی انقلاب اور جدید بینکنگ نے یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ چند لوگ پورے پورے ملکوں بلکہ ساری دنیا کو لوٹ سکتے ہیں۔ پہلے کوئی بادشاہ حکومت کرتا تھا تو اس کے اور رعایا کے درمیان صرف یہ تعلق ہوتا تھا کہ رعایا معمولی ٹیکس ادا کر دے اور بادشاہ ملک میں امن و امان قائم رکھے۔ مگر آج کی حکومتوں نے جدید ترین ذرائع سے کام لے کر اپنے علاقے کی آبادیوں کو بالکل دبوچ رکھا ہے اور ان کی پوری زندگی کو شکنجہ میں کس لیا ہے پچھلے زمانے کے چنگیز اور ہلاکو صرف خشکی کے کسی علاقے میں فساد برپا کر سکتے تھے۔ مگر آج کوئی فسادی اُٹھتا ہے تو وہ سمندر اور ہواؤں تک اپنی فوج پھیلا دیتا ہے۔ پہلے کوئی شخص جھوٹ گھڑتا تھا تو اس کو جھوٹ کے نام پر پھیلاتا تھا۔ اور اس کی آواز بھی چند گز سے زیادہ فاصلے تک سنائی نہ دیتی تھی۔ مگر آج نئے نئے علوم کے ذریعہ جھوٹ کو اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ وہ بالکل سچ معلوم ہونے لگے۔ اور پھر اس کو بجلی کے تاروں اور ہوا کی لہروں کے ذریعہ مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا جاتا ہے۔

ایسا کیوں ہے انسان نے جو نئی نئی قوتیں دریافت کی ہیں کیا ان کی ذات میں کوئی ایسی خرابی ہے کہ وہ صرف تباہی کا سبب بن سکتی ہیں۔ کیا مادی ترقی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانیت پستی میں چلی جائے۔ کیا یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں؟ ایسا نہیں لوہا ایک طاقت ہے۔ اس کو آپ چاہے اپنا سر پھوڑنے میں استعمال کریں۔ یا زمین جوت کر غلہ پیدا کرنے میں وہ دونوں جگہ یکساں کام کرے گا کوئی ایجاد انسان کے لئے رحمت بنے گی یا زحمت۔ اس کا جواب اس ایجاد میں نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ انسان کے اپنے فیصلہ پر ہوتا ہے کہ وہ اس کو کہاں استعمال کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر قوت کے بے شمار خزانے چھپا دئے ہیں۔ ان کو معلوم کرنا بذاتِ خود اچھا یا بُرا نہیں ہے

بلکہ ان کا استعمال انھیں اچھا یا بُرا بنا دیتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترقی اصل میں مشینوں کی ایجاد کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ان کے صحیح استعمال کا نام ہے۔ موٹر خواہ کتنی ہی اچھی بنی ہو اگر ڈرائیور اس کو کسی کھڈ کی طرف دوڑا دے تو موٹر خود بھی تباہ ہو جائے گی۔ اور ان لوگوں کو بھی ہلاک کرے گی جو اس کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انسانیت کی ترقی کا سوال حقیقت میں مشین بنانے کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ انسان بنانے کا سوال ہے۔ ترقی سڑکیں نکالنے اور تار کھینچنے سے نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ انسان کو وہ راستہ مل جائے جس سے وہ اپنی صلاحیتوں کو ٹھیک ٹھیک استعمال کر سکے۔ انسان کو زندگی گزارنے کے لئے بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ایک گھر بناتا ہے۔ بازار لگاتا ہے کالج تعمیر کرتا ہے۔ عدالت قائم کرتا ہے۔ پولس اور فوج کا انتظام سنبھالتا ہے۔ حکومت کرتا ہے۔ غرض اکیلے میں اور دوسروں کے ساتھ مل کر جتنی مختلف قسم کی زندگیاں وہ گذارتا ہے۔ اس میں ہر وقت اور ہر مرحلہ میں کسی قاعدے اور ضابطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر یہ ضابطہ کون دے۔ کیا ہر شخص خود اپنی سمجھ اور خواہش کے مطابق کر لیا کرے۔ کیا زمانے میں جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کو سند مانا جائے۔ کیا حکومت کی پیروی کی جائے۔ کیا اسمبلیاں اور پارلیمنٹ یہ طے کریں کہ کب کون سا رویہ اختیار کیا جائے۔ یہی سب طریقے ہیں جو عام طور پر رائج ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کے سب بالکل غلط ہیں۔ آدمی کی خواہش ایک اندھا ذریعہ ہے جو کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچاتی۔ اس کی عقل کے پاس کوئی ذاتی علم نہیں۔ حتیٰ کہ عقل کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ خود کیا ہے۔ ایسی عقل کیا فیصلہ کر سکتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئیے۔ زمانے کا رواج بالکل ایک بے دلیل چیز ہے۔ پچھلے لوگ جو غلطی کر گئے۔ آخر بعد کو آنے والے بھی کیوں اس غلطی کو دہراتے رہیں۔ حکومت نام ہے ایک ایسے گروہ کا جو طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ پھر کیا محض اسی بنیاد پر کسی کی اطاعت کی جا سکتی ہے کہ وہ طاقتور ہے۔ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں جو لوگ قانون بناتے ہیں ان میں اور عوام میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ عوام ووٹر ہیں۔ اور یہ لوگ عوام کے دو ٹوں سے چنے جانے والے نمائندے۔ اگر وہ الیکشن میں کامیاب نہ ہوتے تو وہ بھی اسی طرح محض ایک ووٹر ہوتے۔ پھر کیا محض یہ واقعہ کہ کچھ لوگوں نے الیکشن کر کے عوام کے ووٹ اپنے بیلٹ بکس میں اکٹھا کر لئے ہیں۔ انھیں یہ صلاحیت دے دیتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے لئے قانون بنائیں۔

پھر یہ ضابطہ کون دے اس کا جواب خود ہماری اپنی ذات میں موجود ہے۔ ہم کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مگر کیا ہم اپنی آنکھ کے علاوہ اور کسی چیز سے دیکھ سکتے ہیں ہم کو سننے اور بولنے کی ضرورت ہے۔ مگر کیا یہ کام ہاتھ اور پیر سے لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہم کو اپنی روزانہ زندگی میں بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جن کے لئے ہم قدرت کے دیے ہوئے اعضاء سے کام لیتے ہیں۔ پھر اعضاء کو یہ کام کرنا کس نے سکھایا ہے۔ کیا ہم نے یا کسی دوسرے انسان نے۔ یقیناً اس کا سکھانے والا کوئی انسان نہیں ہے۔ بلکہ وہی ہے جس نے ہم کو اور ساری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ پھر جس نے ہمارے جسم کے مختلف اعضاء کے لئے کارکردگی کی شکلیں مقرر کی ہیں۔ اس نے کیا ہماری بلند تر اسلامی ضروریات کو پورا کرنے کی راہیں مقرر نہیں کی ہیں۔ اگر ہم آنکھ سے دیکھنے کے بجائے کھانے کا کام لینے کی کوشش کریں تو اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہماری آنکھ پھوٹ جائے۔ پھر جس طرح جسمانی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے فطرت کے مقرر کئے ہوئے ضابطوں کی پابندی ضروری ہے کیا اسی طرح معاشی اور تمدنی زندگی کو صحیح طور پر چلانے کے لئے خدا کی ہدایت ضروری نہیں ہے۔ اگر جسم کے مختلف حصوں میں ضرورت کے مطابق خون پہنچانے کا انتظام صرف خدا کرتا ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم اس کام کو انجام دے سکیں تو تمدن اور معاشیات میں زندگی کے ذرائع کی منصفانہ تقسیم کے لئے آخر خدا کے بتائے ہوئے ضابطے کی ضرورت کیوں نہیں ہے۔ اگر جسم کے مختلف اعضاء کو کنٹرول کرنے کے لئے خدا کے دئے ہوئے

اعصابی سسٹم کی ضرورت ہے اور کسی دوسرے آلے کے ذریعہ ہم یہ کام نہیں کر سکتے تو انسانی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لئے سیاسی نظام بھی خدا کے سوا اور کون دے سکتا ہے۔ اگر یہ کام خدا کا ہے کہ وہ بتائے کہ انسان سے کون سا کام لے۔ اور زبان سے کون سا اور آدمی اپنی اُپج سے اس میں کوئی ردو بدل نہیں کر سکتا تو معاشرتی زندگی میں عورت مرد کے تعلقات اور ان کی سرگرمیوں کے حدود مقرر کرنا۔ خدا کے بغیر کس طرح ممکن ہے

حقیقت یہ ہے کہ جس خدا نے ہمارے لئے دیکھنے اور سننے کی راہیں مقرر کردی ہیں جس نے کھانے اور بولنے کے طریقے بتائیے ہیں، اسی نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہم گھر کس طرح سنبھالیں لین دین کیسے کریں۔ علوم و فنون کو کس ڈھنگ پر ترقی دیں۔ عدالت میں کس قانون کے مطابق فیصلے کریں۔ ملکی انتظام کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں۔ حکومت اور قانون ساز مجالس کس طرح بنائیں۔ غرض پوری زندگی جو اس دنیا میں ہم گذارتے ہیں اس کے ہر گوشے اور ہر شعبے کے لئے خدا نے واضح ہدایات دے دی ہیں۔ اسی ہدایت پر عمل کرکے ہم اپنے تمام معاملات کو سدھار سکتے ہیں اور کہیں بھٹکے بغیر زندگی کا سفر مکمل کر سکتے ہیں۔ آج جو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سائنس اور صنعت کا انقلاب آدمی کو ترقی اور خوش حالی کی طرف لے جانے کے بجائے جرائم، افلاس، بیکاری اور جنگ کی طرف لے جا رہا ہے اور اس کی مشکلوں میں اضافہ کا سبب بن گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ آدمی نے اپنے مالک کو چھوڑ دیا ہے۔ اس نے زندگی کے سفر کے لئے لوہے اور فولاد کی گاڑیاں تیار کرلیں۔ مگر ان گاڑیوں کو اس راستے پر چلانا نہیں سیکھا۔ جو خدا نے اس کے لئے مقرر کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سرگرمیوں کا رخ غلط راہوں کی طرف ہو گیا۔ اور زندگی کے بجائے وہ ہلاکت کی جانب سفر کرنے لگا۔

(ماہنامہ زندگی ——— وحید الدین خاں)

م ——— تقدیر پر ایمان لانا بڑی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہے اور وہ اس طرح ہے کہ مسلمان اس پر ایمان لانے کی وجہ سے اس تدبیر کو نظر میں رکھتا ہے جو تمام عالم کو سمیٹے ہوئے ہے، جو شخص اس پر ٹھیک ٹھیک اعتقاد رکھتا ہے، تو وہ ان چیزوں پر نظر رکھتا ہے، جو خدا کے قبضہ میں ہیں، اور دُنیا و مافیہا کو اس کے عکس کی طرح سمجھتا ہے اور قضاء الٰہی کی وجہ سے بندوں کے اختیارات کو ایسا سمجھتا ہے، جیسے آئینہ میں صورت کا عکس ہوتا ہے، اور اس سے تدبیر و حدانی کے انکشاف میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اگرچہ کامل انکشاف عالمِ معاد ہی میں ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عظمت پر لوگوں کو تنبیہ فرمادی جب یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص نیکی و بدی کی تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ تو میں اُس سے جدا ہوں اور نیز آپ نے فرمایا کہ آدمی مومن نہیں ہوتا، جب تک نیکی اور برائی کی تقدیر پر ایمان نہیں لاتا، اور جب تک اُس کا یقین نہیں کرتا کہ جو اس کو پیش آتا ہے وہ ٹلنے والا نہیں، اور جو نہیں پیش آتا ہے، وہ ہرگز پیش نہیں آئے گا، واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ذاتی ہر اُس چیز کو محیط ہے، جو پیدا ہو چکی یا جو پیدا ہوگی، اور یہ محال ہے کہ کسی چیز کو اُس کو خبر نہ ہو یا کوئی ایسی چیز پیدا ہو جائے جس کو وہ نہ جانتا ہو اگر ایسا ہو، تو وہ جہل ہوگا علم نہ ہوگا۔

م ——— اکثر یوں خیال کیا جاتا ہے کہ احکام شرعیہ کسی مصلحت پر مبنی نہیں ہیں، اور نہ اعمال اور اُن کی جزا میں کوئی مناسبت ہے، جیسے کوئی آقا اپنے نوکر کو اس کی فرمانبرداری کا امتحان لینے کے لئے، یوں ہی بلا فائدہ کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کو ہاتھ لگانے کا حکم دے، پھر اگر وہ اطاعت کرے تو جزا دے، اگر نافرمانی کرے تو سزا دے، لیکن یہ گمان بالکل غلط ہے اور سنت و اجماع خیر القرون اس کی تردید کرتا ہے۔

• ـــــ خدائے تبارک و تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ اُس نے وحی کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کو ثواب اور عذاب بتلادیا جو اعمال پر مُرتب ہوتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو مُطیع کردیں۔ اور لوگوں کے دل خوف و اُمید سے پُر ہوجائیں اور دلی خواہش اور ارادہ سے شرائع کی پیروی کریں۔

• ـــــ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھ کو آسان حنیفی مذہب دے کر بھیجا گیا ہے" آسان سے حضورؐ کی مراد یہ ہے کہ اس میں اتنی سخت عبادتیں نہیں ہیں جن کو راہبوں نے ایجاد کرلیا تھا، بلکہ اس ملت میں ہر ایک عُذر کے لئے ایک رُخصت ہے جس کی وجہ سے قوی اور ضعیف کاربند اور بیکار سب عمل کرسکتے ہیں اور حنیفی سے مراد ملتِ ابراہیمؑ ہے جس میں شعائر الٰہی کا قیام اور شرک کے شعار کی برائی ہے، اور تحریف و رسوم فاسدہ کا ابطال ہے۔

اور روشن سے مراد یہ ہے کہ اس کی علتیں اور حکمتیں اور جو مقاصد جن پر شریعت کی بنیاد قائم ہے، نہایت صاف ہیں، جو شخص ان میں تامل کرے گا، اُس کو کچھ شبہ باقی نہ رہے گا، بشرطیکہ وہ سلیم العقل ہو اور ہٹ دھرمی کرنے والا نہ ہو۔

(حجۃ اللہ البالغہ ـ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "اردو ترجمہ")

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انلجین ٹکیاں
ANALGIN
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
LAXSAL
لیکسال فروٹ سیلائن
اوپل لیباریٹریز لمیٹڈ ۔ کراچی

ہماری نظر میں

اجتہادی مسائل

از: مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، ضخامت ۳۶۶ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان، کلب روڈ، لاہور۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کو جو دل و دماغ وجود میں لائے ہیں، دینی مسائل تہذیب و ثقافت اور معاشرے کے بارے میں اُن کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ان کو "ماڈرن" بنایا جائے اور اس مقصد کی تکمیل اُسی وقت ہو سکتی ہے، جبکہ ارتقا، آسانی، اجتہاد اور توسع کے نام پر اباحتوں کے دروازے کھلتے چلے جائیں۔ یہاں تک کہ ذہن و فکر اور معاشرے پر تجدد و تفریح غالب آ جائے۔ چنانچہ یتیم پوتے کی وراثت، تصویر، موسیقی، ضبطِ ولادت بنک کے سود اور ملکیتِ زمین، غرض اس قسم کے تمام مسائل میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا نقطۂ نگاہ جمہورِ امت سے مختلف اور مغربی تصورات سے ہم آہنگ رہا ہے۔

جناب مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی بھی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ایک رُکن ہیں بلکہ سب سے بڑے مفتی اور مجتہد ہیں، اس ادارے سے وابستگی سے قبل دینی مسائل میں اُن کا اندازِ فکر جمہورِ اُمت کے افکار و خیالات کا ترجمان تھا، مگر اب اُن کا نقطۂ نگاہ خاصہ بدل گیا ہے، مولانا موصوف دینی مسائل میں رخصتوں اور اباحتوں کے لئے گنجائشیں پیدا کرتے رہتے ہیں اور اس طرح انھوں نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں اپنے کو پوری طرح فٹ کر لیا ہے۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے آرگن مجلہ "ثقافت" میں مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی کے دینی مسائل پر جو مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، یہ کتاب اُنھی ۲۵ مضامین کا مجموعہ ہے، کوئی شک نہیں مولانا موصوف ایک صاحبِ فکر عالم ہیں اور فکر کے ساتھ اُن کی تحریر سُلجھی ہوئی اور پیرایۂ بیان بھی دل نشین ہوتا ہے، ان مضامین میں تلاوتِ قرآن اور ایصالِ ثواب، لیلۃ القدر اور رویتِ ہلال خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہیں، اور ان مسائل پر مُفکر علما کو غور و فکر کرنا چاہیئے۔

مگر

تصویر کے اس تاریک رُخ کو دیکھیئے، فرماتے ہیں:۔

"قرآن نے امیر و مامور کے متعلق بھی احکام دیئے ہیں، لیکن اس کا منتہائے مقصود کسی قانونی و سیاسی استبداد کا نظامِ حکومت قائم کرنا نہیں، بلکہ وہ ایک ایسا "لا ریاست" صالح معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ کوئی محکوم۔ بلکہ ہر شخص کسی سیاسی اور روحانی واسطہ کے بغیر براہِ راست اطاعتِ الٰہی کرتا ہے۔" (صفحہ ۱۵)

یہ وہ طرزِ فکر ہے، جو غیر دیندار اربابِ حکومت کے اقتدار کے اردگرد حصار کھینچتی ہے کہ اُس کو کوئی چھیڑنے نہ پائے اور دیندار طبقہ حکومت و ریاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اُس سے مجتنب اور دور دور رہے! عہدِ نبوت اور دورِ خلافت کی روشن مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ اُس سے بہتر پاکیزہ معاشرہ پھر وجود میں نہ آ سکا مگر ریاست اور حکومت موجود تھی اور امیر و مامور کا سلسلہ بھی قائم تھا!۔

"لا ریاست صالح معاشرہ" کا نکتہ جو مولانا جعفر شاہ صاحب نے پیدا فرمایا ہے وہ کتنا ہی نادر اور غامض کیوں نہ ہو، مگر علمی دنیا میں اس کی حیثیت ایک لطیفہ سے زیادہ نہیں ہے!

حدیث شریف میں بدعت کی کوئی تقسیم نہیں کی گئی ہے کہ یہ اچھی بدعت ہے اور یہ بری بدعت ہے۔ یہ سب بعد والوں کی نکتہ آفرینیاں اور غلط اندیشیاں ہیں، مگر مولانا موصوف نے عبدالغنی نابلسی کے رسالہ "کشف النور عن اصحاب القبور" کا حوالہ دیکر بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی تقسیم کی تصویب کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ صریح کے مقابلہ میں کسی نابلسی یا بریلوی کا قول پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتا، بدعت ضلالت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

"قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ بطور نصب العین کے کوئی حکومت قائم کرنا نہیں چاہتا......" (ص ۱۲۸)

"حکومت" کو نصب العین اور مقصود تو کوئی نہیں سمجھتا، ہاں! "حکومت" اقامتِ دین کا موثر ترین بلکہ لازمی ذریعہ ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا تھا، اور جو حکومت و ریاست اور تہذیب و معاشرت کی دینی حیثیت ہم سے بہتر سمجھتے تھے، انھوں نے خود حکومت قائم فرمائی اور اپنے بعد کتاب و سُنّت کے ساتھ ایک اسلامی حکومت بھی چھوڑی اور خلفائے راشدین نے دین ہی کی ضرورت سمجھ کر اس حکومت کو چلایا!

"پیغمبرؑ سارے معاشرہ انسانی کو اسی مقام پر لانا چاہتا ہے، جہاں رزق کے سارے چشمے مشترک ملکیت بن جائیں...." (ص ۱۴۴)

مولانا جعفر شاہ صاحب نے اس طرح تمام برگزیدہ پیغمبروں پر چوٹ کی ہے کہ وہ رزق کے سارے چشموں کو مشترک ملکیت بنانا تو چاہتے تھے مگر بنا نہ سکے، یہاں تک کہ نبی آخر جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا اتمام فرما دیا تھا۔ وہ بھی اس کام کو نہ کر سکے (معاذ اللہ) ہاں! آتش پرستوں کے پیغمبر مزدک نے اس تخیل کو پیش کیا۔ کارل مارکس اور اینجلز نے اس کو مستقل فلسفہ بنایا اور لینن و اسٹالن نے اس کو عملی جامہ پہنایا — مولانا موصوف کی یہ طرز فکر اشتراکی نقطہ نگاہ کی ترجمان ہے، اُس اشتراکیت کی جس کی گھٹی میں کفر و بے دینی پڑی ہوئی ہے!

ایک طرف مولانا پھلواروی کی آزادی فکر اور باریک بینی کا یہ عالم ہے کہ بخاری کی بعض صحیح حدیثوں پر تنقید فرماتے ہیں، اور دوسری طرف اُن کی جامد تقلید کا یہ رنگ ہے کہ کوئی مولانا شاہ ظہور الحق کہہ گئے ہیں تو:۔

"سورہ فاتحہ اور بعض دوسری سورتوں کا ترجمہ کر کے قرأت بھی ہندوستانی زبان ہی میں کریں..."

ان شاہ صاحب کے اس لغو خیال کو وہ حجت سمجھتے ہیں، اور اس کو بنیاد بنا کر پورا ایک مضمون لکھ ڈالتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"غرض امام اعظم اور صاحبین اور زیر بحث مولانا ظہور الحق کی عبارتوں کا ہم یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ مادری زبان میں نماز ادا کرنے کی اجازت ایک عبوری اجازت ہے۔"

حالانکہ نماز میں "ماتیسر من القرآن" پڑھنے کا حکم ہے اور ترجمہ "قرآن" نہیں ہوتا، اس لئے قرآن کا ترجمہ نماز میں پڑھا جائے گا، تو ماتیسر من القرآن کے حکم قرأت کی تعمیل نہ ہوگی، اور اس طرح نماز کا ایک بنیادی رُکن فوت ہو جائے گا۔

مولانا پھلواروی صاحب نے امام اعظم اور صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمد) کے قول سے جو گفتگو کی ہے، اُس میں امام

عظم کے بارے میں تو وہ خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا، اب رہے صاحبینؒ اور اُن کا یہ قول (اگر یہ قول واقعی انہی کا ہے) :-

"..... اور صاحبین یعنی ابو یوسفؒ اور محمدؒ کہتے ہیں کہ یہ صرف اسی کے لئے جائز ہے جو عربی زبان کو اچھی طرح نہ ادا کر سکتا ہو..."

تو

کروڑوں عجمی مسلمان عربوں کی مانند اچھی طرح سے عربی زبان کو ادا نہیں کر سکتے مگر ساڑھے تیرہ سو سال سے دُنیا کے ہر خطہ کے مسلمان عربی ہی میں نماز پڑھتے چلے آئے ہیں، اور اس طرح صاحبین کے قول کو اُمت کے اجماع نے، جمہور نے اور سو فیصدی اکثریت نے رد کر دیا ہے

لاہور میں ایک سرکاری افسر نے "اُردو زبان" میں نماز پڑھنے کا فتنہ اٹھایا تھا، اس کی تائید ظاہر ہے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ہی سے ہو سکتی تھی، اور وہ ہو کر رہی، کتابوں میں سب کچھ لکھا ہوا ملتا ہے، یہ تو اربابِ قلم کے ذہن و فکر، نیت اور معتقدات پر منحصر ہے کہ کس مواد اور اقتباس سے کیا کام لیتے ہیں، کس کو رد کرتے اور کس کو قبول کرتے ہیں!

مولانا جعفر شاہ پھلواروی ہندوستان میں جماعتِ اسلامی کے رُکن تھے، پھر وہ اس سے علیحدہ ہو گئے، اور بعد میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں ملازم ہو گئے ——— تو تجدد و تفرنج کی حمایت و اشاعت کے ساتھ (سابق) جماعت اسلامی اور خاص طور سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے دینی نظریات کی وہ کاٹ کرتے رہتے ہیں۔ بنک کا سود ہو، پردہ ہو، حکومتِ اسلامی کا قیام ہو۔ ان تمام مسائل میں مولانا پھلواروی صاحب نے مولانا مودودی سے اختلاف کیا ہے، اس کتاب میں "امامت و امارت کا غلط استعمال" جس مضمون کا عنوان ہے، اُس میں اُن کا یہ ثابت کرنا کہ دینی جماعتوں کے سربراہ کار کو "امیر" کہنا درست نہیں ہے اور اس کی زد حکومت کے منصب پر آ کر پڑتی ہے ——— مودودی صاحب کی ذات سے شدید عناد کی غمازی کرتا ہے اس مقالہ میں انھوں نے حکومت کو بھی اُکسایا ہے ——— فرماتے ہیں :-

"... لفظ امیر یا امام کو ——— "EXPLOIT" کرنے کا اب کسی کو حق نہیں پہنچتا، اگر ہم اس لفظ کو چند تاویلات کے ساتھ آج گوارا کر لیتے ہیں تو کل ہمیں "خلیفۃ المسلمین" کے لفظ بھی بلکہ "نبی و رسول" کے لفظ کو بھی بے مغز توجیہات و تاویلات کے ساتھ گوارا کرنا پڑے گا، اسلام کے نام لیواؤں کو غیر اسلامی اصطلاح وضع کر کے پھیلانے سے پرہیز کرنا چاہیئے اور خود اسلامی حکومت کا بھی فرض ہے کہ اس طرح کی شرعی اصطلاحات کو غلط تصرفات معنوی کی زد میں آنے سے محفوظ رکھے اور "صدر انجمن" کو امیر و امام و خلیفہ کہے جانے سے باز رکھے۔" (ص ۲۷۴)

ایسی چھوٹی اور اُتھلی باتیں کیا علماء کو زیب دیتی ہیں! اس پر تنویرِ فکر، آزادیٔ رائے اور وسعتِ قلب و نگاہ کے کیا کیا بلند بانگ دعوے ہیں؟

یہ جو

پاکستان کے حاکمِ اعلیٰ کو "صدر" کے سرکاری لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اور اُس کے مقابلہ میں سینکڑوں انجمنوں اور اداروں کے "صدر" پائے جاتے ہیں، تو ان "صدور" (Presidents) کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور ان کی اس لفظی مماثلت کی بناء پر

بارگاہ ثقافت سے کیا سزا تجویز کی جاتی ہے!!

یہ کتاب دینی نقطۂ نگاہ سے مجموعی طور پر خطرناک ہے، اس نے بہت سے فتنوں کے دروازے کھول دیئے ہیں، اور یہ ذہن کو اس آزادی کی طرف لے جاتی ہے، جہاں دین کے "جوہر" "نصب العین" "روح" اور "خلاصہ" کے نام پر دین کے حدود کو بے باکی کے ساتھ توڑا جاسکتا ہے، اور جس سے دین کا پیکر، قالب اور اُس کے ظواہر کے ساتھ ساتھ دین کی روح بھی مجروح ہوجاتی ہے۔

سرسید احمد خاں

از:- مولوی عبدالحق، ضخامت ۱۹۶ صفحات، قیمت: چار روپے

ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی اردو، اردو روڈ، کراچی

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سرسید احمد خاں مرحوم سے نہ صرف یہ کہ تعلق خاطر بلکہ والہانہ عقیدت و شیفتگی رکھتے ہیں، یہ کتاب مولوی صاحب موصوف کی اسی عقیدت کی زندہ یادگار ہے! مولوی صاحب نے سرسید کو بہت قریب سے دیکھا ہے بلکہ یوں کہیئے اُن کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی ہے! مولانا حالیؔ کی "حیات جاوید" سرسید احمد خاں کی نہایت ہی جامع تالیف ہے، لیکن مولوی عبدالحق صاحب کی اس کتاب میں بعض ایسے واقعات کا ذکر ملتا ہے، جن سے "حیات جاوید" کے صفحات خالی ہیں۔

اس کتاب سے تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید مرحوم نے اردو زبان کے بقاء اور اُس کی ترقی کے لئے کتنی زحمتیں اُٹھائی ہیں۔ سرسید حقیقت میں اُردو کے بہت بڑے محسن ہیں، مولوی عبدالحق صاحب در اصل اُردو کی ترقی واشاعت اور اُس کی حفاظت و مدافعت میں سرسید کے جانشین ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کے طرز نگارش کی سب سے بڑی خوبی "سادگی" ہے، جو اس کتاب میں بھی ملتی ہے، سُلجھی ہوئی فکر دل نشین اندازِ بیان[1]! بات کو خواہ مخواہ "فلسفہ" بنانے کی کوشش نہیں، سامنے کی باتیں مگر کام کی باتیں!

لیکن

اس کتاب میں مولوی عبدالحق صاحب کی پیرانہ سالی کا ضعف اور دماغی تھکن بھی محسوس ہوتی ہے۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولوی عبدالحق کی زندگی میں درازی اور صحت میں توانائی عطا فرمائے اور زندگی کے اس آخری دور میں، سرسید احمد خاں اور مولانا حالیؔ کے ایمان و یقین اور دینی جذبہ کی دولت انہیں نصیب ہو۔

اخبار الطب اشاعتِ خاص

مرتبہ، حکیم محمد سعید، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت، اشاعتِ خاص، دو روپے (سالانہ مع اشاعت خاص) دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- اخبار الطب، ہمدرد دواخانہ، کراچی

انجمن ترقی طب پاکستان کی یہ روداد حقیقت میں گرانقدر علمی و طبی پیش کش ہے، اس کے مندرجہ ذیل جلی عنوانات سے اس "اشاعتِ خاص" کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

انجمن ترقی طب کا قیام ——— پنجسالہ منصوبہ ——— تیسری صحت کانفرنس ——— دوسری فارمیسوٹیکل کانفرنس ——— طبی بل ——— ہمارے اخبارات ——— ایکٹ کے بعد ——— بورڈ کا پہلا اجلاس ——— بورڈ کا دوسرا اجلاس ——— طبی بل پر اختلافات کا جائزہ ——— طبی بل کی تنسیخ ——— نصابِ تعلیم ——— طبی فارماکوپیا

[1] کتاب میں "ڈول ڈالنا" بار بار آیا ہے، نہ جانے یہ محاورہ مولوی صاحب کو اتنا پسند کیوں ہے!

جامعہ طبیہ شرقیہ ـــــ ڈرگس ایکٹ ـــــ تیسری فارمیسوٹیکل کانفرنس ـــــ متفرقات
میڈیکل کمیشن ....

"اشاعتِ خاص" کے چند اہم اقتباسات :-

- ......"موتی بھی کیلسیم ہے اور لاجورد بھی کیلسیم ہے اور حجر الیہود بھی ۔کیلسیم ، لہٰذا ان سب کے خواص مشترک ہیں اور جو لوگ ان کے خواص میں فرق محسوس کرتے ہیں ، یہ اُن کے محسوسات کا قصور ہے حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں کے اختلاف خواص کو تجربے سے ثابت کرنا انتہائی آسان ہے لیکن جدید سائنس اپنے علم کیمیا پر اندھا ایمان رکھتی ہے ، اس لئے وہ مزید تجربات کو خلافِ عقل سمجھ کر ان کی طرف اعتنا نہیں کرتی ۔"
- ......"حقیقت زمان و مکاں سے ماورا ہے ، جو حقیقت آج ثابت ہوئی ہے ، وہ کبھی نئی نہیں ہے بلکہ پرانی ہے البتہ ہمارا علم نیا ہے ۔ ۔"
- ......"جدید سائنس کو باطنی حالت یا کلیاتی مضمرات سے کوئی غرض نہیں ، وہ جانتا ہے کہ پینی سلین بعض قسم کے جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہے ، اگرچہ وہ نہیں جانتا کہ کس طرح اور کیسے ؟ یہ جاننے کی اُسے چنداں فکر بھی نہیں ، وہ اسی کو کافی سمجھتا ہے کہ پینی سلین مریض کو فوری ہلاکت سے بچا لیتی ہے ، اس کے بعد کیا ہوگا ، اس سے کوئی غرض نہیں رکھنا چاہتا ، یہ ناعاقبت اندیشی جدید سائنس کا طغرائے امتیاز ہے ، اس کی نظر فوری اور وقتی فائدے پر رہتی ہے ، عاقبت کی فکر وہ نہیں پالتی ، آخر بینی کی برکات پر اس کا یقین نہیں ۔"
- ......"اس کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک موجودہ عہد کی طب پر عائد ہوتی ہے جس نے ہلاکت کو علالت سے بدل دیا ہے ۔"
- ......"موجودہ کیمیکل دوائیں ، جو جراثیم کو پیش نظر رکھ کر اختراع کی جا رہی ہیں ، اُن میں بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بے اثر ہوتی چلی جاتی ہیں اور بصورت بے اثر ہی نہیں ہوتیں بلکہ انسان کی ذاتی قوتِ مدافعت کو بھی ختم کر دیتی ہیں ، اور اس کے بعد کوئی دوا اثر نہیں کرتی ۔"
- ......"لندن کے ڈاکٹر گرونر دائیم ۔ ڈی) اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ طب مشرقی کا نظریہ طبیعت جدید نظریہ جراثیم سے زیادہ مستحکم اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے ۔"
- ......"قوی اندیشہ ہے اگر رائج الوقت طریقوں سے نظامِ قدرت کو بدلنے کی کوشش جاری رہی ، تو یہ تدابیر نظامِ عالم کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گی ۔ یہ چیز ناقابل انکار حقیقت بن چکی ہے کہ معیارِ صحت کو بلند کرنے میں جدید طب کی درماندگی دردناک ہی نہیں عبرتناک بھی ہے ۔"

جناب حکیم محمد سعید دہلوی انجمن ترقی طب پاکستان کے جنرل سیکرٹری ہیں ، انہی کی کوششوں سے جامعہ طبیہ شرقیہ قائم ہوا ہے ، حکیم صاحب موصوف طب مشرقی کے بقاء ترقی اور استحکام کے لئے جو علمی و عملی جدوجہد فرما رہے ہیں ، اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے ، رسالہ "ہمدردِ صحت" جس کے مدیر اعلیٰ حکیم محمد سعید صاحب ہیں مشرقی طب کی قابل قدر علمی خدمات انجام دے رہا ہے ، اس رسالہ کے علاوہ طب مشرقی کی عظمت ، افادیت اور اہمیت کو واضح کرنے کے لئے بلند پایہ کتابچے اور اعلامیے شائع ہوتے رہتے ہیں ، وزارتِ صحت پاکستان کی کسی پالیسی یا پابندی سے طب مشرقی پر جو اثر پڑتا ہے ، اُس کا بھی جرات مگر شائستگی اور معقولیت کے

ساتھ اظہار کیا جاتا ہے۔

طب مشرقی جسے یونانی طب کہا جاتا ہے ایک مکمل، مفید اور خلقِ خدا کے لئے نفع بخش طب ہے، جسے ہزاروں سال سے آزمایا جاتا رہا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے مشرقی طب تمام رائج الوقت "طبوں" پر فوقیت رکھتی ہے، اس لئے "مشرقی طب" حکومتِ پاکستان کی حوصلہ افزائی اور ہمدردی و تعاون کی مستحق ہے، مشرقی طب "پاکستان" کے نظریہ وجود کی ایک نمایاں، علامت ہے!

کوئی شخصیت کتنی ہی بڑی اور با اقتدار کیوں نہ ہو، اُس کی ذاتی دلچسپی اور شخصی رجحان نہ قانون بن سکتا ہے اور نہ معیار! کرسیاں ادلتی بدلتی اور لوگ آتے جاتے رہتے ہیں مگر حقائق نہیں بدلتے، حکومتِ پاکستان کو مشرقی طب (یونانی طب) کی اہمیت اور افادیت کو پوری طرح پہچان کر، اُس کے لئے ہر قسم کی سہولتیں اور آسانیاں مہیا کرنی چاہئیں "ایلوپیتھی" کے ترقی کے ہم مخالف نہیں ہیں، مگر اس ترقی کا انداز ایسا نہ ہو کہ مشرقی طب دب کر رہ جائے، مشرقی اطبا، جو دراصل قدیم علماء اور حکما کے قائم مقام ہیں، اُن کی تجویزیں اور شکایتیں، قابلِ سماعت ہی نہیں قابلِ توجہ بھی ہیں۔

وسیلۂ نجات

مرتبہ: مولانا ابو صالح محمد عبدالجمیل الخطیب، ضخامت ۱۹۲ صفحات - قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ: مکتبۂ "روشنی" نزد لال مسجد، بنگلور ۲۔

شرک و بدعت کے رد میں، یہ ایک مفید، موثر اور مدلل کتاب شائع ہوئی ہے، مضامین عام فہم ہیں، اس لئے عوام اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر توحید خالص کی اہمیت دل میں گھر کرتی ہے، اور اس کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دین کے نام پر جہلا نے مشرکانہ رسوم اور بدعات کی کتنی "مساجد ضرار" کھڑی کر رکھی ہیں!

"وسیلۂ نجات" عوام مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے! اس کے پڑھنے سے عقائد کی اصلاح ہوگی اور شرک و بدعت سے ربط رکھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ جسے انھوں نے روشنی سمجھ رکھا تھا، وہ تمام تر تاریکی تھی۔

آسان قرآن

از:- محمد حسام الدین غوری، ضخامت ۱۹۲ صفحات (سرورق رنگین اور دیدہ زیب) (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ: دارالادب پاکستان ۶/۶۵ پٹیل باڑہ، کراچی نمبر ۵

اس کتاب میں پارہ عمّ کی اُنیس سورتوں کی سورۃ الفاتحہ کے ساتھ تفسیر و تشریح کی گئی ہے، پہلے ہر قرآنی لفظ کے اردو معنی لکھے گئے ہیں، پھر پوری سورت کا ترجمہ ہے، کوئی شک نہیں ترجمہ عام فہم ہے اور تشریح بھی رواں اور دلنشین ہے مگر جناب غوری صاحب نے بعض صحیح احادیث پر جو نقد و جرح کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احادیث کے بارے میں وہ آگے چل کر کہیں اور زیادہ بے باک نہ ہو جائیں، یہاں تک کہ یہ "لے" بڑھ کر انکارِ حدیث تک پہنچ جائے! غوری صاحب نے "جن" کی تشریح جس انداز پر کی ہے، وہ سر سید احمد خاں اور دوسرے مُتفرنجین کے افکار کی ترجمان ہے، صلوٰۃ اور مقصد صلوٰۃ کے بارے میں بھی انھوں نے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے، وہ انتہائی خطرناک ہے۔

قرآنِ پاک میں جہاں "صلوٰۃ" (دعا اور درود کے علاوہ) آیا ہے، اُس سے ٹھیک وہی نماز مراد ہے، جسے مسلمان ادا کرتے ہیں۔ اور جس کے لئے مسجدیں بنی ہوئی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی "صلوٰۃ" کے یہی معنی سمجھے تھے، اور جنگ کے ایک

۱؎ "فاران" کے "توحید نمبر" سے جو اقتباسات لئے گئے ہیں، اور جو کئی صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں اُن کے سرنامہ پر "از مولانا سید عبدالصمد ہاشمی" پڑھ کر حیرت ہوئی!

شدید موقعہ کے علاوہ، حضورؐ کی ایک وقت کی بھی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی ——— اگر مسلمانوں کے معاشرے میں مراحل عمرانی اُستوار ہو جائیں، اور آپس کے حقوق ٹھیک ٹھیک طور پر ادا ہوتے رہیں، تو بھی مسلمانوں پر سے ایک وقت کی نماز بھی ساقط نہیں ہو سکتی، اور جو کوئی "صلوٰۃ" کی فرضیت کا قائل نہیں ہے، اور اس حقیقت کو عمرانی تقاضوں اور اصول قدرت سے ہم آہنگی" میں اُلجھاتا ہے، وُہ گناہ نہیں کفر کا ارتکاب کرتا ہے، اور "صلوٰۃ" کی فرضیت (جس طرح مسلمان اسے ادا کرتے ہیں) کے انکار کے بعد قرآن کریم کی ایک لاکھ صفحات کی تفسیر بھی، اُس کے کفر کو ایمان سے نہیں بدل سکتی۔

کوئی مسلمان "صلوٰۃ" کا فریضہ ادا کرنے کے بعد بھی، برائیوں میں مبتلا ہے، تو اُس کو برائیوں سے دور رہنے کی نصیحت کی جائے گی، اور اُسے بتایا جائے گا کہ تمہاری "صلوٰۃ" کے خاطر خواہ ثمرات ظاہر نہیں ہو رہے ہیں، مگر اُس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم نماز پڑھنا ہی چھوڑ دو! مظروف کے ساتھ ظرف کی اور رُوح کے ساتھ قالب کی حفاظت بھی ضروری ہے، جو صرف ظاہری پیکر کی حفاظت کرتا ہے اور روح کو نظر انداز کر دیتا ہے، وہ بہت بڑا غلط کار ہے مگر جس نے روح کے لئے پیکر و قالب کو یکسر نظر انداز کر دیا، وُہ دوہرے نقصان میں رہا، ایک پیکر و قالب کی بربادی کا نقصان، دوسرا "روح" کے ضائع کر دینے کا نقصان!

معاویہؓ و یزید

از:- حافظ علی بہادر خاں، ضخامت ۳۰۴ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت: چار روپے
"مکتبہ دورِ جدید" اُردو بازار، دہلی۔

(حصہ اول) محمود عباسی صاحب کی کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" یقیناً سخت ناپسندیدہ کتاب ہے، جس سے اہل سُنت والجماعت کے جمہور نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے، اس کتاب کے لکھنے والے نے دین اور دُنیا کا کوئی مفید کام انجام نہیں دیا، بلکہ ایک ایسی خطرناک بحث کا دروازہ کھول دیا ہے، جس میں پڑ کر جب شدت پیدا ہوتی ہے تو آدمی یا رفض کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا خروج کی جانب! اور چاہے وہ رفض ہو یا خارجیت یہ دونوں انتہائیں ضلالت ہیں۔

ہم حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو حق کی شہادت سمجھتے ہیں اور اُن کی محبت کو اپنے لئے دین و دُنیا میں سرمایۂ سعادت جانتے ہیں، یزید کا کردار ہماری نگاہ میں ناپسندیدہ اور مبغوض کردار ہے، اور ہمارے دل میں یزید کے لئے ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے، بلکہ اُس کا نام آتے ہی کراہت پیدا ہونے لگتی ہے۔

جمل و صفین میں حق حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا۔ علی کے مقابلہ میں امیر معاویہ کو ہم غلطی پر سمجھتے ہیں مگر اُن کے شرف صحابیت کے سبب "معاویہ" کے نام کے ساتھ حضرت اور رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں اور اُن کا احترام کرتے ہیں۔

حافظ علی بہادر خاں صاحب (ایڈیٹر "دورِ جدید" دہلی) نے محمود عباسی کی کتاب کے جواب میں جو انداز اختیار فرمایا ہے، جو زبان استعمال کی ہے جو تاریخی نتائج اخذ کئے ہیں، وہ اہل حق کے مسلک کے مطابق نہیں ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی محبت و عقیدت کا یہ تقاضا ہرگز نہیں ہے کہ امیر معاویہ پر سب و شتم کی جائے اس کتاب میں حافظ صاحب موصوف نے یہی ناپسندیدہ رنگ اختیار فرمایا ہے، اور امیر معاویہ کی صحابیت اور کتابتِ وحی تک کے شرف کو مجروح کرنے اور بے اعتبار ٹھیرانے کی کوشش کی ہے ——— لکھتے ہیں:-

"واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ آئندہ زندگی میں یہ شخص اسلامی قدروں کا دُشمن ثابت ہو گا۔"

امیر معاویہ کوئی شک نہیں حضرت علی رضؓ کے مخالف تھے مگر اسلام کے مخالف نہ تھے کہ "اسلام" علی کا نام نہ تھا۔ اُن کو اسلامی قدروں کا

دشمن کہنا بہت بڑی زیادتی ہے، حضرت امیر معاویہ سے "کتابتِ وحی" کا شرف چھیننے کے لئے حافظ علی بہادر خاں رسول اللہؐ کے اندازے اور مردم شناسی پر بھی چوٹ کر گئے۔

"ظاہر ہے یہ دوزخ میں جانے والے اصحاب زیادہ تر وہی ہوں گے، جو فتح مکہ میں تلوار کے ڈر سے ایمان لائے، پھر "صحابہ" بن گئے، پھر موقعہ ملنے پر انھوں نے اسلام کی پاکیزہ تصویر کو مسخ کرنے کی کوشش کی، یوں غیب کا حال خدا ہی جانتا ہے لیکن معاویہ مغیرہ اور عمرو بن العاص وغیرہ کی طرف نظر جاتی ہے"۔ ۔ ۔ ۔ (صفحہ ۱۹۷)

جو کوئی، معاویہ، مغیرہ اور عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہم) کو دوزخی سمجھتا ہے، وہ اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کرتا اور آتشِ دوزخ کو دعوت دیتا ہے، ہم اس عقیدہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

"ابو سفیان، معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے زندگی بھر اسلام کو مٹانے کی جدوجہد کی، مگر جب اسلام کو فیصلہ کن غلبہ ہو گیا، تو انھوں نے پینترا بدلا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اسلامی قدروں کو مٹانے کی کوشش کرنے لگے (صفحہ ۱۰۶)

فتح مکہ کے بعد جو صحابہ ایمان لائے ہیں، ان کے ایمان کو "پینترا بدلنے" یعنی "مصلحت و نفاق" سے تعبیر کرنا رفض نہیں تو اور کیا ہے، ہم ابو سفیانؓ اور معاویہؓ کے ایمان میں کسی قسم کا شک نہیں کرتے، اور ان کو مومنِ صادق ہی سمجھتے ہیں!

"اس عبارت سے ظاہر ہے کہ جس مسودہ پر دستخط ہوئے تھے، وہ اتنا ناپسند تھا کہ تقریباً بغاوت کی سی شکل نظر آنے لگی تھی"۔ (صفحہ ۱۳۷)

صلح حدیبیہ کے بعد جمہور صحابہ کرام کی حالت کو "تقریباً بغاوت" کہنا، اہلِ ایمان اور اربابِ محبت کا شعار نہیں ہو سکتا۔

"یہ وہ مشہور حدیث ہے جسے اہلِ تشیع حضرت علی کی امامت بلافصل کے لئے بڑی شدومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اہلِ تسنن اس کی توجیہ کر کے اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔ ۔ "

"اہلِ تسنن کا دامن بچا لینا" یہ جملہ غمازی کرتا ہے کہ مصنف کے دل میں کیا بھرا ہوا ہے؟ اہلِ سنت دامن نہیں بچاتے بلکہ برملا ترتیبِ خلافت کو حق سمجھتے ہیں!

صحابہ کرام کے اختلافات، کفر و اسلام کے اختلافات نہ تھے، ان میں سے جن سے غلطی ہوئی ہے، توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دوسری دینی خدمات کے عوض معاف فرما دے گا۔ تاریخ و سیر میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے، اگر انہی کی بنیاد پر حکم لگایا جائے اور شرفِ صحبت صحابہ کا احترام نہ کیا جائے تو خود حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تاریخ کیا فیصلہ کرے گی کہ خلافتِ صدیقی میں جب ارتداد کا فتنہ اٹھا تھا، تو ذوالفقار علیؓ نیام میں کیوں تھی؟ ایک مورخ جو صحابیت کے شرف و مرتبت سے واقف نہیں ہے، اس کے جی میں جو بھی آئے۔ ہر قسم کے الفاظ و زبان میں اپنا فیصلہ صادر کر سکتا ہے، مگر ہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں اور ان کی اس خموشی کو کسی بہتر مصلحت پر محمول کرتے ہیں، اسی حسنِ ظن کا الاؤنس ہمیں دوسرے صحابہ کو بھی دینا پڑے گا۔ ہاں! جس جگہ واقعات بالکل ثابت و مبرہن ہوں گے، وہاں احترام کے ساتھ مناسب الفاظ میں تنقید کی جائے گی ——— حافظ علی بہادر خاں نے جو زبان استعمال کی ہے اور جو موقف اختیار کیا ہے وہ "رفض" سے بہت قریب ہے، اللہ تعالیٰ رفض و خروج ان دونوں گمراہ کن انتہاؤں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے (آمین)

قرآن کا نظریۂ سلطنت

از :- پروفیسر ہارون خاں شروانی، ترجمہ : سعید الحق عمادی (بی اے)
ضخامت ۱۲۰ صفحات (مجلد، رنگین) گرد پوش کے ساتھ، قیمت : ایک روپیہ بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ :- آئینۂ ادب، چوک مینار، انار کلی، لاہور۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے قرآنِ کریم کے نظریۂ سلطنت کو بڑی خوبی کے ساتھ دل نشین انداز میں پیش کیا ہے، یہ موضوع بہت کچھ شرح واطناب چاہتا ہے مگر یہ کتاب اختصار کے باوجود مفید اور سلجھے ہوئے خیالات کی آئینہ دار ہے، ان عنوانات سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :-

ایران ـــــ مشرقی سلطنت روما ـــــ عرب ریاستیں ـــــ مکہ کا سیاسی نظام ـــــ صاحب قرآن کے سیاسی کارنامے ـــــ قرآن میں سیاسی استدلال کا طریقہ ـــــ قومی زوال کے اسباب ـــــ حکومتِ الٰہی اور اُس کے نتائج ـــــ بدنظمی کی مذمت ـــــ امن اور اطاعت ـــــ فرد اور جماعت ـــــ عدل اصلاحِ تمدن وسیاست ـــــ شوریٰ ـــــ بین الاقوامی معاملات ـــــ بین الاقوامیت

کتاب کا اردو ترجمہ شستہ اور رواں ہے اور مصنف کی طرح مترجم کا ذہن بھی سلجھا ہوا ہے!

قولِ سدید

از :- مولوی ضیاء احمد بدایونی، ایم۔ اے، ضخامت ۱۵۴ صفحات۔ قیمت دو روپے چار آنہ
ملنے کا پتہ :- ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن، حامد علی بلڈنگ (یونیورسٹی ایریا) علی گڑھ۔

یہ کتاب "خلافت معاویہؓ ویزید" کے رد میں لکھی گئی ہے، اور کوئی شک نہیں تردیدی دلائل بہت وزنی ہیں، اس ناپسندیدہ کتاب کے رد میں فاضل مصنف کا قلم حافظ علی بہادر خاں کے قلم کی طرح بے راہ رو نہیں ہو گیا ہے، انھوں نے حفظِ مراتب کا خیال رکھا ہے، اور جو باتیں کہی ہیں شائستہ انداز میں کہی ہیں، اہلِ بیت کرام کی محبت کی مہک ایک ایک سطر سے آتی ہے۔
پروفیسر ضیاء احمد بدایونی پر جو محبت اہل بیت کا غلبہ ہے وہ مبارک ہے، مگر یہی غلبہ شدت اختیار کر کے بدایوں کے نداق میاں) کی "تفضیلیت" بن سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر کسی کو اعتدال وسلامت روی کی حدود میں رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور زبان وقلم، صحیح عقائد اور مفید خیالات کی ترجمانی کرتے رہیں۔

خیابانِ ارم

از :- نثار احمد انور، ضخامت ۱۴۴ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ : قریشی پبلشرز، نمبر ۸ (اے) محمد اسٹریٹ، مزنگ، لاہور۔

"آویزے" کے بعد جناب نثار احمد انور کا یہ دوسرا مجموعہ کلام منظرِ عام پر آیا ہے، "ملخت لخت" کے تحت شاعر نے شعر وادب کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-
"شعر کا ایک ماحول ہوتا ہے اور شاعر کا ایک موڈ۔ قاری کو اگر شاعر کے کلام میں کہیں کہیں تضاد کا پہلو نظر آئے، تو اس کو بد کنا نہیں چاہیے، یہ چیز کم وبیش ہر انسان کی زندگی میں پائی جاتی ہے"۔

- ـــــ طبعاً میں قنوطیت پسند نہیں، مسرت پسند ہوں۔
- ـــــ ادب وشعر میں، متروکات کا قائل نہیں، البتہ جو لفظ بھی استعمال کیا جائے، وہ برمحل ہونا چاہیے، نیز اس کی سماعت بھی بار گوش نہیں ہونی چاہیے۔
- ـــــ ہر شاعر غزل تو کہہ سکتا ہے مگر ہر غزل گو نظم نہیں کہہ سکتا۔

• ـــــــ میرے لئے سب سے زیادہ ناگوار چیز شاعر کا ترنم ہے ـ

کتاب کے آخر میں "آویزے" پر تبصرے جمع کر دیئے گئے ہیں ـ

جنابِ انور کے کلام میں تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ نظم، غزل، قطعہ اور رباعی غرض ہر صنف میں اُن کی طبیعت جولانیاں دکھاتی ہے، اُن کا دل اسلام اور ملت کا درد بھی رکھتا ہے اور ساتھ ہی تیغِ ابرو اور دشنۂ مژگاں کا بھی گھایل ہے!

ان چند منتخب شعروں کو پڑھیئے اور لطف اندوز ہو جیئے :ـ

احبابِ جلوہ گاہ کے در دیکھتے رہے ــــ اے دوست! ہم تو تیری نظر دیکھتے رہے

تنظیم میں پنہاں ہیں ترقی کے مدارج ــــ بکھرے ہوئے تاروں کو ثریا نہیں کہتے

ہمارا بے خودی میں ایک سجدہ ــــ ترے سارے صنم خانے کی قیمت!

قلب نے پائی حقیقت، آنکھ نے دیکھا مجاز ــــ ہم تجھے دونوں کے اندر جانِ جاں دیکھا کئے

منم بیگانہ از ہوش و خرد در عالمِ مستی ــــ نمی دانم، چہ انجامے، نمی دانم چہ آغازے

حسن غزل، رباعی خیام بن گئیں ــــ جتنی مسرتیں تھیں ترا نام بن گئیں

طوفانِ حوادث کے تھپیڑوں کو سُنا دو ــــ اُبھرے گی جو اک موج یہ ٹکرائیں گے سو بار

چلنے والے اس متانت سے چلے ــــ سینۂ صحرا پہ گل بوٹے بنے

اے اہلِ بزم! دیدۂ بینا سے کام لو! ــــ ہر وا ہمہ یقین ہے محبت کے شہر میں

دوسرا رُخ :ـــــــــــــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں جو ایک شعر ہے، اُس کے مصرعِ اولیٰ : ؎

ایک دانائی افکار کا مینارِ عظیم

میں بڑا تکلف اور آورد پائی جاتی ہے! "دانائی افکار" کی ترکیب محلِ غور ہے، "مینارِ عظیم" نے مصرعہ کو عجیب تر بنا دیا۔

نظم "اندھی حسینہ" میں جو اللہ تعالیٰ کی قوتِ خلاقی اور عدل پر طنز کی گئی ہے، وہ ایک مسلمان شاعر کو زیب نہیں دیتی۔ ایسی جذباتی اور سطحی باتیں تو کمیونسٹ کہا کرتے ہیں۔

بہت ہی ڈر گیا ہوں یہ سانپ اب ہٹا بھی دو ــــ کلی کو انتظار ہے ذرا سا مسکرا بھی دو

مصرعِ اولیٰ کس قدر پست اور پھیکا ہے۔

فرشتے جھک کے کر رہے سلام ہیں سلام لو ــــ بلند جو مقام ہو، وہ دوڑ کر مقام لو (ص ۴۰)

"وہ دوڑ کر مقام لو" اس ٹکڑے نے نظم کے پورے بند کی شعریت کو برباد کر دیا۔

کہ یہ مسجد بھی ہے، اور وقتِ نمازِ مغرب ــــ تم نے باجے کو یہیں لا کے بجانا تھا ضرور (ص ۵۳)

"نے" کا استعمال زبان کے خلاف ہے۔

کہیں زرد روئے گلاب ہے نہ نکھار ہے نہ شباب ہے ــــ کہیں خاک و خون کے درمیان لٹے پڑے ہیں درعدن (ص ۵۵)

یہ "لٹے پڑے" ہیں کہاں کی زبان ہے۔

حُسنِ ترتیب عناصر تھی ہماری زندگی! ــــ پُرسکوں، پُرکیف، پُرعشرت تھی ساری زندگی (ص ۶۰)

زندگی کے عناصر کے "حسنِ ترتیب" کو سکون، کیف و عشرت کہنا ایک عجیب سی بات ہے۔ "پُرعشرت" اس پر مستزاد!

آدمی کو دیکھتا ہے، آدمی کی آنکھ سے — وہ کسی صورت نہ ہوگا، آپ میں چاہے کرخت (ص ۵۳)

لفظوں کے جوڑ دینے کے سوا، اس شعر میں اور کیا ہے!

یا وہ افعی نہ ہو ڈسنے میں کوئی جن کا مثیل — جو برس کر نہ کھلیں، ایسے نرالے بادل (ص ۸۵)

مصرعہ اولیٰ میں شعریت کا دُور دُور پتا نہیں۔

جن سے ایمان لرزتے ہیں یہ دو کافر ہیں — دلِ زاہد بھی معاً سمت بدل جاتا ہے (ص ۸۷)

محبوب کی چشم سرمگیں کی تعریف میں جو قطعہ کہا گیا ہے اس کا یہ آخری شعر ہے "دلِ زاہد کا سمت بدل جانا" یہ کیا اندازِ بیان ہے

اُٹھتی رہی نقاب رموزِ الست بھی — کچھ شرحِ پردہ داری حالات بھی ہوئی (ص ۱۰۴)

"الست" کی "رموز" پھر اس کی "نقاب" ——— ! تکلف ہی تکلف اور آورد ہی آورد!

مشعلیں جلتی ہیں دل ہیں کہ بجھے جاتے ہیں — ہم نے اے دوست! تجھے بزم میں اچھا دیکھا (ص ۱۱۰)

دوسرا مصرعہ کس قدر کمزور ہے۔

ہم نے کی تم سے محبت تم کو لافانی کیا — تم بھی آویزے پہن لو، ان کو لاثانی کرو

غیر شاعرانہ اندازِ بیان "لاثانی کرو" نے شعر کو اور بے مزہ بنا دیا۔

صورتِ شمس، قمر ہے مجھے معلوم نہ تھا — عشق میں یہ بھی اثر ہے مجھے معلوم نہ تھا (ص ۱۱۳)

یہ آخر بات کیا ہوئی؟

اپنے اندر ایک میخانہ چھپا پاتا ہوں میں — اک نظر میں جانِ من! اتنی پلا جاتے ہو تم (ص ۱۲۲)

سپاٹ اور سطحی شعر! "جانِ من" کے تخاطب نے اس شعر میں "سوقیت" پیدا کر دی۔

اس دل کی توڑ تاڑ سے گھبرا گیا ہوں میں — بہتر یہی ہے اب مری قسمت بھی پھوڑ دو (ص ۱۲۴)

اس شعر کو کوئی نو مشق شاعر بھی اپنے سے منسوب کرتے ہوئے عار محسوس کرے گا۔

خراماں یوسفِ بازار دیدم — شکستہ سبحہ و زنار دیدم (ص ۱۲۸)

وجدان کے لئے اذیت کوشِ اہمال!

راہِ طلب میں موت جو آئی تو کیا ہوا — اچھا ہوا کہ بخت کا لکھا ہوا ہوا (ص ۱۳۲)

ایسے سپاٹ شعروں سے شاعر کی شاعرانہ شخصیت متاثر ہوتی ہے۔

چاہ کرتے ہیں، چاہ کہتے ہیں — دل کا حالِ تباہ کہتے ہیں (ص ۱۳۸)

——— اور ———

کبھی دن کبھی رات سے کھیلتا ہوں — حسینوں کے لمحات سے کھیلتا ہوں (ص ۱۳۹)

اس طرح لفظوں کے جوڑ دینے سے آخر کیا حاصل ہے؟

نگاہوں میں مستی، اداؤں میں شوخی — یہ کیا جاں رُبا تیر برسا رہے ہو! (ص ۱۳۵)

تیر کو "جاں رُبا" کہنا کس قدر کمزور اور نامانوس اندازِ بیان ہے۔

تم نے ہمیں کچھ کہہ کے پکارا تو ہوا کیا　　　ہم بھی تو تمہیں خواب میں کیا کیا نہیں کہتے (ص ۱۵۱)

شعر کیا ہے اچھا خاصہ مضحکہ ہے　　　توبہ!

تم نے شباب کے لئے برسیں گزار دیں　　　انور کے ساتھ آج کی شب ہی بسر کرو

عکس معکوس اس کو کہتے ہیں　　　آئینہ روبروئے یار کہاں

تیرے ہاتھوں سے میں جب زہر پیا کرتا ہوں　　　تجھ کو معلوم ہے مر مر کے جیا کرتا ہوں

پھر ترے پیکرِ سیمیں کا سہارا لے کر　　　اپنے جذبات کی تکمیل کیا کرتا ہوں

اس انداز کے شعر اس کتاب میں جہاں بھی آئے ہیں، انہیں پڑھ کر وجدان نے فریاد کی ہے!

نئے چراغ

از:- عبدالحمید ارشد، ضخامت ۲۸ صفحات (خوشنما ٹائپ، رنگین سرورق)
قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ: قصر اردو، بھاولپور

یہ کتاب قصر اردو (بھاولپور) نے خاصے اہتمام سے شائع کی ہے، اس پر ایک صفحہ کا دیباچہ جناب امجد قریشی نے تحریر فرمایا ہے، لکھتے ہیں:-

"میں ارشد کی شاعری پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا، کیوں کہ یہ کام نقادوں کا ہے، صرف اس قدر عرض کروں گا کہ ارشد جیسے شاعر دنیا میں کبھی کبھی جنم لیتے ہیں"۔

دیباچہ نگار نے شاعر کی مدح میں جو مبالغہ کیا ہے وہ ہر اہلِ ذوق کو کھٹکے گا"..... ایسے شاعر دنیا میں کبھی کبھی جنم لیتے ہیں"۔ سعدی، نظیری، غالب اور اقبال جیسے شعراء اس تعریف کا مصداق بن سکتے ہیں!

"نئے چراغ" کا دیباچہ جناب مسعود حسن شہاب دہلوی نے لکھا ہے، اس میں جناب ارشد کی زندگی کے اس رخ کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے کہ وہ ادب و شعر کی ترویج و اشاعت کے لئے انجمنیں قائم کرتے رہتے ہیں اور یہ ان کی زندگی کا مشن ہے۔

جناب عبدالحمید ارشد ایک خوش گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں حرکت اور گرمی ملتی ہے، اور ان کی غزلوں میں "غمِ جاناں" اور "غمِ دوراں" کا امتزاج نظر آتا ہے، چند منتخب اشعار:-

میری فطرت کا تقاضا ہے یہی اے ارشد　　　مجھ سے دشمن بھی پریشاں نہیں دیکھے جاتے

روتی آنکھیں بہتے آنسو　　　اس بستی سے کچھ تو لائے

مصلحت کا فیض تھا ارشد کہ ہم　　　رہزنوں کو راہبر سمجھا کئے

میری تعمیر کے ارادے ہیں　　　یہ بھی انداز ہیں مٹانے کے

جب ملا دل کے آس پاس ملا　　　شکر ہے غم ہی دل شناس ملا

کچھ ستارے سے اور ابھریں گے　　　میری آنکھوں میں پھر نمی سی ہے

زندگی بھر نہ جس نے ساتھ دیا　　　زندگی بھر اسی کی آس رہی!

اجالوں نے اگرچہ پھونک ڈالا　　　تمنا ہے ابھی تک روشنی کی

شام کچھ اس طرح سے پھیلی ہے　　　جیسے اب کے سحر نہیں ہوگی

آج بھی بام پر نہ آئے تم — آج بھی چاندنی اُداس رہی
قربِ منزل سے دُور دُور رہا — جب تلک میں نے انتظار کیا
خزاں کے ظلم سے مانوس ہو چکے تھے ہم — کچھ ایسے وقت میں آئی بہار ہم نفسو
تم بکھرنے کی بات کرتے ہو — بزمِ ہستی ابھی جمی کیا ہے
کھیلتا جا رہا ہے لہروں سے — روح پابند تھی سفینے میں
پھر کوئی شعلہ اٹھے گا ارشد — طُور کو سرد ہوئے دیر ہوئی

دُوسرا رُخ :-

غم کے اثرات اگرچہ ظاہر ہیں! — غم خوشی دے تو غم نہیں ہوتا (ص ۹)

مصرعہ اولیٰ تغزل سے عاری ہے، پھر شاعر جس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہتا ہے، اُس کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل سکے۔

اک نہ اک درد کو سینوں میں بسانا ہوگا — یہ گھروندے کبھی تو ویراں نہیں دیکھے جاتے (ص ۹)

اس شعر میں بھی "اظہار" (Expression) حد درجہ ناقص ہے!

آدمیت ہی بھلا کیا کم تھی — آدمی اور پشیماں کیا ہو (ص ۱۱)

ایک پختہ مشق شاعر کے مجموعۂ کلام میں اور ایسا سطحی شعر!

زندگی مستقل عقوبت ہے — دیکھ کر طور نونہالوں کے (ص ۱۱)

یہ شاعری کے ساتھ مذاق ہے! توبہ!

ہم ہی شب سحر بنائیں گے — زندگی کی سحر نہیں نہ سہی (ص ۱۲)

کہنا یوں چاہیے تھا "ہم ہی شب کو سحر بنائیں گے"۔

دل ترستے ہیں ٹھنڈی چھاؤں کو — زلفِ برہم کہیں نہیں ملتی (ص ۱۴)

"چھاؤں" میں "واو" کا کھنچنا ناگوار محسوس ہوتا ہے، "چھاؤں" کو اس طرح نظم کیا جاتا ہے:-

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے! کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے (حفیظ جونپوری)

پھر "زلفِ برہم" کے سایہ کو "ٹھنڈی چھاؤں" کہنا عجیب سی بات ہے۔

کوئی کہہ دے نہ پھول کا انجام — میری اُمید اک کلی سی ہے (ص ۱)

یہ کیا شاعری ہے!!

غنچہ غنچہ دہائی دیتا ہے — مسکراتی ہے ایک بند کلی (ص ۱۶)

آخر یہ بات کیا ہوئی؟ ——— پھر "غنچہ" اور "کلی" کیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

میں فقط موت کو اٹل سمجھا! — زیست بھی میرے بس کی بات نہیں (ص ۱۶)

ایسے شعر پڑھ کر ذوقِ شعری بہت کچھ بے کیف ہو جاتا ہے۔

اس پہ غم کی تمام رحمت ہے — جب بھی ارشد ملا اُداس ملا (ص ۱۷)

صرف لفظوں کو جوڑ دیا گیا ہے!

منزلیں انتظار میں ہیں ابھی — کب جلیں فطرتِ بشر کے چراغ (ص ۱۸)

"فطرتِ بشر کے چراغ" کیا بات ہوئی؟ اس شعر کا مفہوم پیدا کیا جا سکتا ہے، لیکن شعر کا سارا لطف تو طرزِ ادا میں ہے۔

میری آنکھوں کا تقاضا ہے یہی — ایک کانٹا نہ بکھرنے پائے (ص ۱۹)

ہمارے پلّے تو پڑا نہیں کہ شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے۔

یہ امیدیں، یہ ناکامی، یہ پستی — تخیل کو پسینہ آگیا ہے (ص ۲۰)

"تخیل کو پسینہ آنا" یہاں بالکل بے جوڑ لگتا ہے۔

میری نیّت کا احترام کرو — اب تو ہونٹوں کو سی لیا میں نے (ص ۲۰)

ایسے شعروں سے وجدان کس قدر اذیت محسوس کرتا ہے۔

غم سے اتنا تو ہوا ہے آخر — داغِ دل اور اُبھر آئے ہیں (ص ۲۲)

مصرعہ اولیٰ کا دروبست ہی ٹھیک ہی نہیں۔

زندگی تب فریب دیتی ہے — جب کوئی بدگماں نہیں ہوتا (ص ۲۳)

اور جب کوئی خوش گماں ہوتا ہے، تو زندگی فریب نہیں دیتی — عجیب فلسفہ ہے!

غم نہیں، غم یہ روشنی بھی ہے — دل نہیں دل، یہ زندگی بھی ہے (ص ۲۵)

غم کو روشنی کہنے کا کوئی قرینہ اور ثبوت بھی تو ہونا چاہیے تھا۔

لاکھ ترغیب دی زمانے نے — پھول بوئے ہیں خار بو نہ سکے (ص ۲۷)

سپاٹ اور بے مزہ شعر!

اب ترقی پذیر ہے احساس — اب بہار و خزاں کی بات نہیں (ص ۲۸)

پورا شعر ایک چیستاں ہے!!

بستے بستے ہی بس سکے گی کبھی — بستے بستے ہی بستی بستی ہے (ص ۳۱)

"بسنے" کی تکرار نے شعریت کو غارت کر دیا، اب رہا فانی بدایونی کا یہ مشہور شعر:-

دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم — بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

تو اس میں "بسنے" کی تکرار عجیب لطف دے رہی ہے۔

میں نے اک بھولنے والے کے طفیل — جو نہ دیکھی تھی نظر دیکھی ہے (ص ۳۱)

کس کی نظر دیکھی ہے؟ بات کہنے کا کوئی ڈھب تو ہونا چاہیے۔

زخمِ دل جب بھی بھرنے لگتے ہیں! — غم کے ناخن سنورنے لگتے ہیں (ص ۳۱)

غالباً "غم کے ناخن تیز ہونے" کے مفہوم کو "غم کے ناخن سنورنے" کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے!! یہ کیا اندازِ بیان ہے۔

دل کا ہر تار بول اٹھتا ہے — آپ کی اک نگاہ کیا کم ہے (ص ۳۲)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ سازِ دل پر محبوب کی نگاہ کی جب ضرب پڑتی ہے تو سازِ دل کا ایک ایک تار بولنے لگتا ہے مگر خود شعر اپنی بناوٹ (Construction) کے اعتبار سے کس قدر کمزور ہے۔

دل کی دُنیا عجیب دُنیا تھی — نذرِ حالات ہوگئی آخر (ص۳۳)

اس پختہ عمر میں اور اس درجہ ناپختہ اور نومشقوں جیسا شعر!

جس طرف بھی نگاہ کی میں نے — دانے دانے میں دام پایا ہے (ص۳۴)

"میں" نہیں "پر" کا محل تھا ؎ دانے دانے پہ دام پایا ہے۔

پو پھٹی دن نکلنے والا ہے! — بات کہتی ہے یہ ستاروں سے (ص۲۵)

مصرعہ ثانی مفہوم کے اعتبار سے لاشے محض ہے، یہ کیا کہ جو خیال ذہن میں آیا اسے نظم کردیا۔

پھر کسی دشت کی وسعت میں اضافہ ہوگا — پھر کوئی آنکھ خماروں سے بھری رہتی ہے (ص۳۵)

غالباً کہنا یہ مقصود ہے کہ محبوب کی چشم خمار آلود کو دیکھ کر لوگ دیوانے ہو جائیں گے اور دیوانوں کی کثرت کے سبب وسعتِ دشت میں اضافہ ہو جائے گا اور ویرانگی بڑھ جائے گی۔ . . . مگر یہ خیال جن لفظوں میں ادا کیا گیا ہے وہ الفاظ مفہوم سے کس قدر غیر ہم آہنگ ہیں۔ پھر "خمار" کی جمع "خماروں" عجیب تر!

داغ دل میں تو آنکھ میں آنسو — یہ ملے ہیں محبتوں کے صلے (ص۳۶)

"محبت" کی جمع نہیں آتی۔

ضبط میں درد کا علاج سہی — ضبط اک مستقل جنوں بھی ہے (ص۳۷)

"ضبط" کو درد کا علاج بتانا واقعہ کے خلاف ہے!

جلوہ جلوہ ہے اب تعاقب میں — آپ نے آگ کیوں بجھائی ہے (ص۳۸)

اور

مرے دل کی دُنیا بہت مختصر ہے — بہت مختصر ہے مگر جاگتی ہے (ص۳۹)

اس قسم کے شعروں نے اس انتخاب کو بے وزن بنا دیا ہے۔

کن خاک نشینوں کی تباہی کا اثر ہے — ہر پھول نے رُخسار پہ پھر خاک ملی ہے (ص۴۱)

پھول سے باغ کے پھول مراد ہیں یا "گلعذار" اگر باغ کے پھول مراد ہیں، تو پھولوں کے رُخسار عام طور پر گرد آلود کب ہوتے ہیں اور اگر معشوقانِ گلرخ مراد ہیں تو نہیں دیکھا گیا کہ عشاق کی تباہی پر معشوق اپنے رخساروں پہ خاک ملا کرتے ہوں "پھر" نے شعر کو اور کمزور کر دیا۔

شعلوں کی جلا ہی سے تو ہے رنگِ نظر بھی — شعلوں سے نہ گھبراؤ اے رنگین بہارو (ص۴۲)

رنگین بہاروں کا شعلوں سے آخر کیا تعلق ہے!! شاید "شعلۂ گل" یا "شعلۂ برق" مراد ہوں۔ مگر ہر بات کے لئے ایک قرینہ چاہیئے!

آپ کچھ دیر انتظار کریں! — میں بھی گزرا شباب لے آؤں (ص۴۴)

کیا "شباب" کہیں بازار میں مول ملتا ہے، جو عاشق محبوب کو ٹھیرا کر، اُسے لینے کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

یاس بن کر ہی چلے آؤ کبھی — اب تو ہر اُمید رخصت ہوگئی

حضرت مجذوب کا مشہور شعر ہے: ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

شعر اس طرح کہا جاتا ہے اور مفہوم اس طرح موزوں الفاظ کے قالب میں ڈھل کر سحر حلال بنتا ہے۔
شاعر کا مجموعہ کلام کیا ہوگا، جب اُس کے انتخاب کلام کا یہ رنگ ہے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ "نئے چراغ" شاعر کا کوئی اچھا تعارف نہیں ہے۔

فاران
ماہر القادری

رکن: انجمن ادبی رسائل، پاکستان

فاران
کراچی
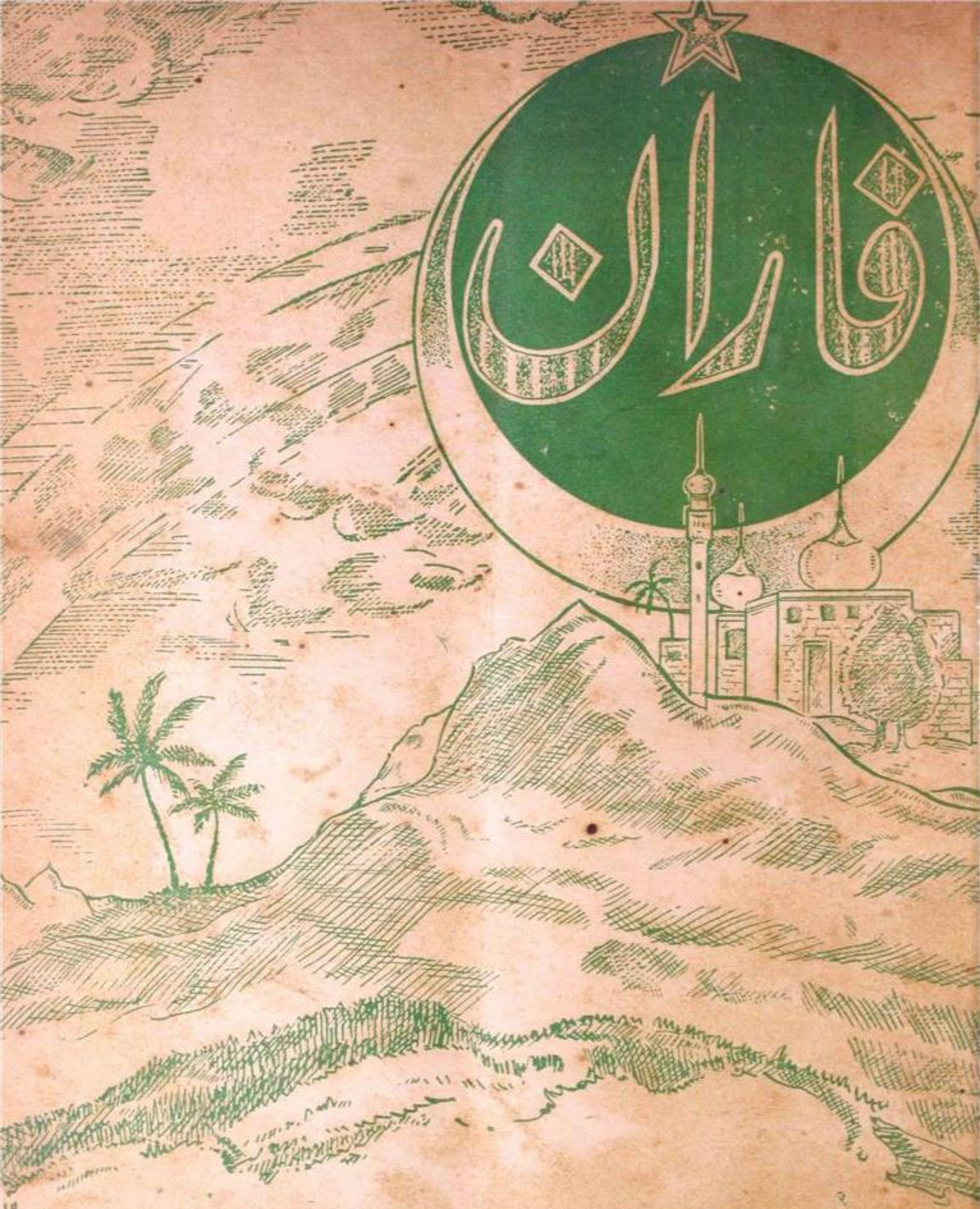
ایڈیٹر — ماہر القادری

ماہ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

جلد: ۱۲ شمارہ: ۶

ترتیب
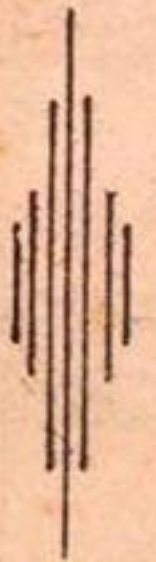
مقام اشاعت:- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

مطبوعہ:- مطبع سعیدی، کراچی

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

عصمت تنزیہی کہ جہاں کسی قسم کی بھول چوک اور اونچ نیچ کا سرے سے امکان ہی نہ ہو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اُسی کی ذاتِ بے ہمتا کو سزاوار ہے اور اس صفت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے! انسانوں میں عصمت صرف انبیاء کرام کے لئے ثابت ہے، اسی لئے انبیاء کی ذات تنقید سے بالاتر ہے!

ائمہ فقہ ہوں، یا محدثین، علماء ہوں یا زہاد، مفسرین ہوں یا مورخین، ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں ہے، ان کے کسی واقعی قابلِ گرفت قول و فعل پر احترام و ادب کی حدود میں رہ کر تنقید کی جا سکتی ہے اور کی جاتی رہی ہے، پچھلوں نے اگلوں کے تسامح اور غلطیوں پر احتساب کیا ہے، اگر اربابِ نقد و احتساب اس عظیم الشان فریضہ کو انجام نہ دیتے تو غلطیوں کے انبار پر انبار لگتے رہتے اور دھندلکوں پر اندھیروں کی تہیں جمتی چلی جاتیں۔

جب امام ابو حنیفہؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ جیسی عظیم شخصیتیں تنقید سے محفوظ نہ رہ سکیں، اور ناقدین نے اُن کی کمزوریوں کی گرفت کی ہے، تو اس ہمارے دور کا کوئی بڑے سے بڑا مفکر، عالم اور اہلِ قلم اپنی فکر و نگارش کے نقد و احتساب پر چیں بر جبیں ہوتا ہے تو اس کی یہ کبیدہ خاطری، طفلانہ برہمی سمجھی جائے گی، بڑے سے بڑے لکھنے اور سوچنے والے سے اظہارِ خیال میں غلطی ہو جاتی ہے، اس واقعی غلطی پر کوئی دیدہ ور ناقد اُنگلی رکھدے۔ تو اُس غلطی کی تاویلیں کرنے سے مزید غلطیوں میں اضافہ کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا، شرافتِ نفس اور اخلاقی فضیلت اس میں ہے کہ غلطی کو کشادہ دلی کے ساتھ مان لیا جائے۔

غلطیوں، کمزوریوں اور لغزشوں کی بھی نوعیتیں اور اُن کے درجے ہوتے ہیں۔ ایک غلطی سراسر گمراہی ہوتی ہے، جیسے منکرین حدیث کا اطاعتِ رسولؐ سے انکار ہے کہ تنہا صرف یہ ایک غلطی اتنی مہیب اور شدید ہے کہ قرآن و اخلاق کی ایک لاکھ صفحات کی تفسیر و شرح بھی اس گمراہی کی تلافی نہیں کر سکتی، اور یہ تلافی تو ایک طرف رہی، اس گمراہ ذہنیت کا انسان دین کے بارے میں جتنی زیادہ شرح و گفتگو کرے گا، یہ گمراہی اُتنی ہی پھیلتی اور شاخ در شاخ ہوتی چلی جائے گی!

دوسری قسم کی غلطی اور لغزش یہ ہے کہ جیسے علامہ ابن حزم اس کے قائل تھے کہ نبوت عورت کو بھی مل سکتی ہے، علامہ موصوف کا یہ خیال نہ صرف اصول بلکہ واقعہ کے اعتبار سے بھی غلط ہے مگر اُن کے قلم نے علم و تحقیق اور دین و شریعت کی جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو احادیث کی زیادہ پرکھ نہ تھی، اُنھوں نے اپنی کتابوں میں ضعیف و غریب ہی نہیں موضوع حدیثیں تک نقل کردی ہیں مگر اُن کی یہ کمزوری، اُن کے دوسرے فضل و شرف اور دین و اخلاق کی خدمات کو ہلکا نہیں کر سکتی۔

یہ تمہید ایک مُعیّن شخصیت کو ذہن میں رکھ کر اٹھائی گئی ہے مقصود نہ مبالغہ آرائی ہے اور نہ بیجا عقیدت کا اظہار! ہمارا ضمیر جب طرح سے مطمئن ہو لیا ہے، تب ہم نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اظہارِ حقیقت کی جُرأت کی ہے!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہمارے جیسے ایک انسان ہیں، دوسرے انسانوں کی طرح غلطیوں اور لغزشوں سے وہ بھی محفوظ نہیں ہیں، اُن کے قلم نے کوئی شک نہیں حقائق کی قابل قدر ترجمانی کی ہے مگر یہ نہیں ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ سو فیصدی حق ہو اور اس میں کسی قسم کی کور کسر، کوتاہی اور غلطی پائی ہی نہیں جاتی ——— جو کوئی مولانا موصوف کی ذات سے اس قسم کی عقیدت رکھتا ہے، وہ اُس بے جا عقیدت کا شکار ہے، جسے دین میں سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے، مودودی صاحب کے قلم سے سہو و خطا بھی ہوئی ہے، اور ناقدین کو ان غلطیوں پر نقد و احتساب کرنے کا حق حاصل ہے۔

مولانا مودودی کے ناقدین پر تنقید کر کے ہم ایک دوسری ناگوار بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ اس گفتگو سے بدمزگی اور تلخیاں پیدا ہونگی، اور مقصود بحث و نزاع نہیں بلکہ صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنا ہے ——— ایسی فضا جس میں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچا اور غور کیا جاسکے، جہاں حریفانہ تصورات کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہو، اس عرض و معروض، اور افہام و تفہیم کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی ہے کہ سال ڈیڑھ سال سے مودودی صاحب اور (سابق) جماعت اسلامی پر نقد و احتساب اور طنز و تعریض نے ایک عجیب رُخ اختیار کیا ہے اور یہ لے بڑھتی ہی چلی جارہی ہے!

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ پاکستان میں انقلابی حکومت نے تمام پارٹیوں اور جماعتوں کو ختم کر دیا تھا، اس لئے جماعتِ اسلامی کا نظام بھی ختم ہو گیا، اس اچانک واقعہ کو "جماعت اسلامی" کے زوال اور ناکامی سے تعبیر کرنا کسی طرح درست نہیں ہے، جماعتِ اسلامی کو جس لمحہ ختم کیا گیا ہے، اُس لمحہ تک اُس کا مرکز اور اُس کی شاخیں پوری تنظیمی صلاحیتوں کے ساتھ اپنے مقاصد و عزائم کو لئے ہوئے فعال اور برسرِ کار تھیں، اب رہی جماعت کے چند ارکان کی علیحدگی تو اُن رفقاء کے بچھڑ جانے کا رنج تو ضرور ہوا مگر اس سانحہ نے مجموعی طور پر جماعت کی تنظیم کو متاثر نہیں کیا۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے، جس کے دیکھنے والے کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں کہ فوجی انقلاب سے پہلے پاکستان میں دینی اقدار کی حفاظت کے لئے جو کچھ بھی ہوا، اور یہ جدوجہد جس حد تک بھی کامیاب ہوئی اُس میں (سابق) جماعتِ اسلامی کی مخلصانہ کوششیں قدرِ غالب کی حیثیت رکھتی تھیں!

یہ تو ضمناً ایک بات درمیان میں آگئی تھی۔ جس کا اختصار کے ساتھ ذکر بھی کر دیا گیا، اصل بات کہنے کی ——— یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کے بنیادی عقائد کا تعلق ہے مولانا مودودی ایک ایک عقیدے میں جمہور اُمت کے ساتھ ہیں، اور اُنھوں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی جس سے اسلام کے کسی بنیادی عقیدے کی نفی ہوتی ہو، یا اُنھوں نے اُس کی تاویل کر کے نفس عقیدہ کی اہمیت کو ہلکا اور بے وزن بنا دیا ہو۔

اسی طرح جہاں تک اسلام کے فرائض و ارکان کا تعلق ہے، مولانا مودودی نے اسلام کے کسی فریضہ اور رُکن سے نہ تو انکار کیا اور نہ اُسے تاویلات میں اُلجھایا، اور نہ اُس کی اہمیت کو گھٹایا ——— اسی طرح شریعت نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے اور جنہیں حرام قرار دیا ہے، مولانا مودودی نے اُن میں سے کسی کی بھی حلت و حُرمت کو مجروح نہیں کیا۔

ہندوستان میں سر سید احمد خاں سے لے کر ہمارے زمانہ تک آزاد خیال ارباب فکر اور اہل قلم کا میلان اعتزال کی طرف رہا ہے، جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے، مولانا مودودی اپنی تحریروں میں بہت بڑے مفکر نظر آتے ہیں اور دین کو عقل کے عین مطابق ثابت کرنے میں اُنھوں نے بلند پایہ متکلم کا گرانقدر فرض انجام دیا ہے مگر کلامی مسائل میں بھی اُن کا مسلک اہل سُنت کے مسلک ہی کے مطابق ہی رہا ہے، جبر و قدر کی بحث میں بڑے بڑوں کے قدم اُونچے نیچے پڑے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے مودودی صاحب نے وہ روش اختیار کی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کا جبر بھی سلامت رہتا ہے اور بندہ اپنے اختیار (کسب) سے تکلیفات شرعی

کا ذمہ دار بھی ٹھیرتا ہے۔

عقلی استدلال میں مولانا مودودی کے یہاں کلام و منطق اور فلسفہ کے صغریٰ و کبریٰ اور قضایا بڑے مُرتب انداز میں پائے جاتے ہیں اور بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فارابی اور رازی کی زبان سے بول رہے ہیں لیکن اُن کا عقلی استدلال یا اجتہاد شریعت کے کسی اصول سے متصادم نہیں ہوتا، اُن کی عقل و دانش اور افکار اپنی تمام تر جولانیوں کے باوجود کتاب و سُنّت کے تابع رہتے ہیں۔

اسلامی ادب میں تفاسیر کا معاملہ کس قدر نازک اور اُلجھا ہوا ہے، مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں اسرائیلی روایات سے بچ کر اور بلاغت و معانی اور کلام و فلسفہ کی بحثوں میں اُلجھے بغیر قرآنی آیات کی کس قدر دل نشین اور ایمان افروز تفسیر کی ہے! انھوں نے بہت سے ایسے مقامات کی بھی نشاندہی کی ہے جہاں قرآنِ کریم اور توریت، انجیل اور زبور ہم آہنگ ہیں اور یہ ہم آہنگی صاف طور پر بتاتی ہے کہ تمام مقدس صحیفے ایک ہی نور کا پرتو ہیں اور یہ دریا ایک ہی منبع سے نکلے ہیں اور یہ مہ و مہر ایک ہی اُفقِ ہدایت سے طلوع ہوتے ہیں ——— ساتھ ہی جہاں قرآنِ کریم اور دوسرے مقدس صحیفوں میں اختلاف ملتا ہے، اُس کی وجہ بھی بتادی ہے کہ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تحریف کا کرشمہ ہے اور پھر انھوں نے ثابت کیا ہے کہ قرآنِ کریم ہی کا بیان ہر اعتبار سے صحیح ہے اور اُس خصوصیت کا حامل ہے، جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں پائی جانی چاہیے۔

"تفہیم القرآن" مودودی صاحب کی قرآنی بصیرت اور دینی فکر کا وہ زندہ شاہکار ہے جس کے پڑھنے سے قلب و دماغ اور رُوح و ضمیر، اطمینان و تسکین اور یقین و انشراح محسوس کرتے ہیں، آیاتِ متشابہات ہوں، معجزات ہوں، قرآنی تمثیلات ہوں، ہدایت و ضلالت جبر و اختیار اور ایمان بالغیب کے مضامین ہوں یا دوسرے مابعد الطبعی مسائل ہوں، مولانا مودودی نے شرح و تفسیر کا جو اسلوب اختیار کیا ہے، اُس سے ذہن و فکر کی کھٹک اور اُلجھن دور ہوتی ہے اور شبہات صاف ہو کر یقین نکھرتا اور اُبھرتا چلا جاتا ہے۔

مولانا مودودی کی تحریروں کی سب سے نُمایاں اور ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ توحید خالص کی ترجمان ہیں، شرک و بدعت کا گرد و غبار تو کجا اس قسم کے تصورات کی کہیں چھائیں تک نظر نہیں آتی، اور یہ خصوصیت اُن کی کتابوں میں اس لئے پائی جاتی ہے کہ اشراقیت، مشائیت، ویدانت اور عجمی تصوف کے اُلجھاوے اُن کی نگاہ میں ہیں، اس لئے انھوں نے اس فکر، اسلوبِ بیان اور ان مصطلحات کو چھوا تک نہیں ہے، اُن کی کتابوں کی تنہا یہی خصوصیت بہت کچھ قابلِ قدر ہے کہ اُن کے مطالعہ سے ذہن و فکر توحیدِ خالص سے آشنا اور مُجلّا ہوتے چلے جاتے ہیں اور شرک و بدعت کی پرچھائیں تک پڑنے نہیں پاتی۔

جو حضرات اپنے اسلاف و اکابر کی تقلید اور اُنکے مسلک سے سرِ مُو انحراف کو دین کا زیاں سمجھتے ہیں اور جو اس معاملہ میں خاصے شدید و جامد ہیں، اُن کو مولانا مودودی کے افکار و اسلوب میں "آزاد خیالی" نظر آتی ہے! کوئی شک نہیں دینی مباحث میں مولانا موصوف نے آزادیٔ فکر و رائے سے بھی کام لیا ہے، لیکن صرف اسی حد تک، جہاں تک اصولِ دین ایک مسلمان کو اس آزادی کی اجازت دیتے ہیں، انھوں نے خدانخواستہ اللہ اور رسول کے احکام میں آزادیٔ خیال کو استعمال نہیں کیا وہاں تو اُن کا موقف سمع و اطاعت اور تسلیم و رضا کا ہے، جو کوئی مولانا مودودی کی اس "آزادیٔ فکر" کا جوڑ مشرقی اور پرویز کے مسلک اور افکار سے ملاتا ہے، وہ حقیقت کو اُلٹ کر اور بالکل مسخ کر کے بیان کرتا ہے! مودودی صاحب کی اصابتِ فکر و رائے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سرسید احمد خاں کے دینی افکار سے وہ ذرہ برابر مرعوب نہیں ہیں اور ان کو انھوں نے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا! اس لئے ملائکہ، جن، شیطان

عیش جنت، عذاب جہنم، وغیرہ مسائل میں اُن کا نقطۂ نگاہ جمہور اُمت کے عقائد کے عین مطابق ہے!

اسی طرح

ضبطِ ولادت، پردہ، رقص وغنا، تصویر کشی و مجسمہ سازی، بینک کا سود، یتیم پوتے کی وراثت، اور قتل مُرتد جیسے تمام مسائل میں مولانا مودودی نے آزاد خیال متفرنجین، مُتجددین اور عقلیین کی نہ صرف یہ کہ کھُل کر مخالفت کی ہے بلکہ انہیں دندان شکن جوابات دیئے ہیں، اور اُن کے مزعومات کے رَد میں معرکہ آرا کتابیں اور مضامین لکھے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب نے بے شک یہ کیا ہے کہ ائمہ فقہ کے اقوال و آرا میں محاکمہ اور موازنہ کر کے ایک کی رائے اور اجتہاد کو دوسرے کے قول و اجتہاد پر ترجیح دی ہے اور بعض مسائل میں خود اجتہاد سے بھی کام لیا ہے، کوئی یہ تو کہہ سکتا ہے کہ مودودی صاحب اس کے اہل نہیں ہیں مگر یہ کام دینی نقطۂ نگاہ سے نہ گمراہی ہے نہ گناہ ہے۔ یہاں تک کہ مکروہ، مبغوض اور ناپسندیدہ بھی نہیں ہے، جب ائمہ فقہ صحابہ کرام کے اقوال کو ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ ایک قول کو رَد کرتے ہیں اور دوسرے کو قبول کرتے ہیں، تو پھر فقہ کے اماموں کے اقوال کے ساتھ راجح و مرجوح اور رد و قبول کا سلوک کرنا ناپسندیدہ کا ہے کو ہونے لگا ——— اور اجتہاد کا دروازہ بھی نبوت کے دروازے کی طرح بند نہیں کر دیا گیا، نئے نئے مسائل میں اجتہاد کرنے کے لئے آسمان سے فرشتے تو نازل نہیں ہونگے یہ کام ہر دور کے عُلماء ہی کو کرنا ہوگا، لہٰذا مودودی صاحب کے اجتہاد میں اگر کوئی سُقم ہے تو اُسے دلائل سے رَد کرنا چاہیئے، یہ اہلیت اور نا اہلیت کی طنز کوئی معقول دلیل اور علمی بات نہیں ہے۔

مولانا مودودی صاحب کے مضامین پڑھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اُن کی دینی بصیرت اس سے اچھی طرح واقف ہے کہ شریعت میں "تقلید" کن حدود میں رہ کر مفید بلکہ ناگزیر ہے اور شدت و افراط کی کس حد پر پہنچکر یہ مفرت رساں بن جاتی ہے اسی لئے وہ تقلید کے معاملہ میں "ترک و وجوب" کی دونوں انتہاؤں میں کسی ایک کے بھی ہم نوا نہیں ہیں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کو مولانا مودودی دین میں حُجت سمجھتے ہیں، سُنت کے دین کی اساس ہونے کے ثبوت میں انھوں نے سینکڑوں صفحات لکھے ہیں اور عقل و نقل اور درایت و روایت سے ثابت کیا ہے کہ کتاب و سُنت دونوں دین کی اساس ہیں اور اللہ تعالیٰ کا دین انہی دونوں ستونوں پر قائم ہے! "مسئلہ قربانی" پر جو معرکہ کا رسالہ انھوں نے لکھا ہے صرف اُسی کو اگر پڑھ لیا جائے تو حدیث و فقہ میں اُن کا مسلک پوری طرح سمجھ میں آسکتا ہے! کتاب اللہ کی طرح سُنتِ رسول تنقید سے بالاتر ہے اور احادیث کو مجروح کرنے کے لئے نہیں بلکہ قولِ رسولؐ کی صحت کے لئے! پھر جب بھی فن حدیث سے بحث کی جائے گی، حدیث کے تمام پہلو سامنے آئیں گے، یہ تمام بحث و گفتگو اسی لئے ہوتی ہے اور ہوتی رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات خوب پرکھ کر، اور چھان پھٹک کر سامنے آئیں، مودودی صاحب نے بھی فن حدیث کے ان مباحث پر گفتگو کی ہے!

اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ قرآنی آیات کی صحت کے لئے (درایت و روایت اور اسناد و طرق کے) اُصول مقرر نہیں کئے گئے کہ قرآنِ کریم کی کسی آیت کی صحت میں شُبہ ہو ہی نہیں سکتا، ہاں! احادیث کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے اس فن کے مُبصرین اور ماہرین نے اُصول مدون فرمائے ہیں، اسی لئے احادیث کے سب سے زیادہ صحیح مجموعہ کو بھی قرآن کا درجہ نہیں دیا جاسکتا! اسی قسم کے مباحث مودودی صاحب کی تحریروں میں آئے ہیں اور اُن کا اس سے مقصد منکرین حدیث کی طرح معاذ اللہ احادیث کو مُشتبہ اور بے وزن بنانا نہیں ہے بلکہ اُن کی صحت کو موکد اور منقح کرنا ہے! "انکارِ حدیث" کے فتنہ کا تو مولانا مودودی کم و بیش پچیس سال سے رد کر رہے ہیں، اُنھوں نے خاص طور سے اُن احادیث کی بڑی دل نشین تشریح کی ہے، جن کو منکرین حدیث بڑی شد و مد کے ساتھ

احادیث کو بے وزن ٹھیرانے کے لئے پیش کرتے رہتے ہیں! مولانا موصوف نے فنِ حدیث کے مباحث پر جو کچھ لکھا ہے، اُس کا یہ اثر نہیں ہوا کہ کوئی شخص جو اُن کی تحریروں سے متاثر ہو، وہ اِن مباحث کو پڑھ کر "انکارِ حدیث" کے گمراہ مسلک کے قریب آگیا ہو ——— بلکہ جو رسالے اور ادارے مولانا مودودی کے دینی افکار سے متاثر ہیں، انھوں نے "سُنّتِ رسول" کے دین میں حجت ہونے پر مسلسل مضامین چھاپے ہیں اور "حدیث نمبر" شائع کئے ہیں! تنہا مکتبہ چراغِ راہ نے احادیث کی مدافعت اور فتنۂ انکارِ حدیث کے رَد میں کتنی معرکہ آرا کتابیں شائع کی ہیں! اب رہی بعض طبیعتوں کی کجی تو وہ قرآنِ کریم تک سے ہدایت پانے کی بجائے گمراہی اور ضلالت حاصل کرلیں تو اس کا کیا علاج!

مولانا مودودی نے اپنی کتابوں میں "تزکیۂ نفس" کی اہمیت اور ضرورت کو بہت کچھ واضح کیا ہے، جماعت کے یہاں اسی مقصد کے لئے تربیتی پروگرام رکھے جاتے تھے، جن میں درسِ قرآن و حدیث، تشیر و تنذیر اور تہجد کا اہتمام ہوتا تھا ——— تو جہانتک تصوف کی اصل روح یعنی "احسان و تزکیۂ نفس" کا تعلق ہے، مودودی صاحب اور صُوفیا کرام کے مابین کوئی نزاع نہیں ہے، ہاں! وہ رسمیں ذکر و اشغال اور طریقے جن کی دلیل نہ کتاب و سُنّت سے لائی جاسکتی ہے اور نہ اُسوۂ صحابہ سے، اُس پر مولانا موصوف نے بے شک نقد و احتساب کیا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو بہت بڑی کوتاہی کا ثبوت دیتے اور اقامتِ دین کی دعوت میں نقص رہ جاتا، تصوف کے وہ مسائل جن کی کتاب و سُنّت سے مطابقت نہیں ہوتی اور توجیہ و تاویل کا زیادہ سے زیادہ الاونس دینے کے بعد بھی راز اندر راز اور معمہ در معمہ ہی رہتے ہیں، اُن پر گرفت کرنا تو دین کی خدمت ہے، چہ جائیکہ اس گرفت و احتساب کو "اولیاء اللہ کی عداوت" جیسے بھیانک الزام سے تعبیر کیا جائے!

مولانا مودودی کی کتاب "تجدید و احیائے دین" پر بہت زیادہ لے دے ہوئی ہے، ہم اس کو مانتے ہیں کہ مولانا موصوف کی دوسری بلند پایہ اور مقبول و پسندیدہ کتابوں کے مقابلہ میں اُن کی اس کتاب کو نہیں رکھا جاسکتا، اور ہم اُن کی اس تصنیف کے ہر موقف کی تائید نہیں کرسکتے، مگر اس کتاب کا افادی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مولانا نے مجددین کی ناکامی کے جو اسباب بتائے ہیں، محققین اور معترضین کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ ان اسباب و وجوہ سے متفق نہیں ہیں، تو اُن کا تجزیہ کرکے بتائیں کہ دین میں کامیابی اور ناکامی کا یہ معیار ہوتا ہے اور اس کسوٹی پر داعیانِ حق اور مجددین کی کوششیں پرکھی جاتی رہیں!

جہاں تک "جماعت" کی تنظیم کا تعلق ہے، ایک ناقد یا مولانا مودودی کا کوئی رفیق اس کی نشاندہی کرسکتا ہے کہ مولانا موصوف نے فلاں معاملہ میں حکمت و تدبیر سے کام نہیں لیا، فلاں پیچیدگی اس اس طرح دور ہوسکتی تھی، مگر یہاں اس حقیقت کو بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ کسی معاملہ میں کسی شخص کے مناسب و موزوں تدبیر و حکمت سے کام نہ لینے کو، "گمراہی" نہیں کہہ سکتے! اور تنظیم و تدبیر کے معاملات میں جب کوئی داعی کسی بات کو واجب کہتا ہے، تو یہ واجب دین کے اُس واجب کا حکم نہیں رکھتا، جس کا ترک گناہ ہے اور جس کا انکار قریب کفر ہے، اور جس کو وہ "واجب" کہہ چکا ہے، حکمت و تدبیر کے تحت اُس "واجب" کی تغییر، دین کی تغییر نہیں ہے!

دینی اور علمی خدمات کی جھلکیاں

کوئی بالکل ہٹ دھرمی اور نری دھاندلی پر اُتر آئے تو یہ دوسری بات ہے مگر اس واقعیت اور حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا مودودی کی تحریروں نے مجموعی طور پر دین و ملت کو فائدہ پہنچایا ہے، ان کی کتابیں پڑھ کر لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوان الحاد و بے یقینی، کمیونزم اور دہریت، تذبذب اور تشکیک کی بھول بھلیوں سے نکل کر یقین و ایمان کی طرف آئے ہیں! سوچنے والوں اور لکھنے والوں کی تاریخ

کے کسی دور میں کمی نہیں رہی، مگر بہت کم ایسے اربابِ فکر اور اہلِ قلم گزرے ہیں، جن کی کتابوں نے لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہو، اور اُن کی سیرتوں کو بدلا ہو، مودودی صاحب نے بلاشبہ یہ کارنامہ انجام دیا ہے، اُن کی تحریریں زورِ استدلال کے ساتھ اخلاص و صداقت سے معمور ہیں، اُن میں جاذبیت ہے دل نشینی ہے اور دینی مسائل میں دلوں کو مطمئن بنانے کی قوت ہے! وہ اپنے پڑھنے والوں کو دین سے دُور نہیں بلکہ قریب کرتی ہیں! مولانا مودودی کی تحریروں کو پڑھ کر دلوں سے مغرب کی مرعوبیت جاتی رہتی ہے، اُن کے قلم نے مغرب زدگی کے طلسم کو توڑا ہے، اُن کی تحریروں کے مطالعہ سے دل میں عزیمت اور اسلام کو سربلند اور غالب کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کی خود زندگی میں عزیمت کا یہ روشن باب ملتا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لئے قید و بند کی سختیاں جھیلی ہیں، یہاں تک کہ سزائے موت کا حکم سُن کر بھی اُن کے ماتھے پر شکن نہیں آئی۔

مولانا مودودی امام ابو حنیفہؒ کے "قیاس" اور امام مالکؒ کے "مصالح مرسلہ" کو بھی جانتے ہیں اور دوسری طرف ڈارون کے نظریہ ارتقا اور مارکس کی "جدلیت" سے بھی واقف ہیں، اسی لئے اُن کی تحریریں نئی نسل کو اپیل کرتی ہیں اور اُن پر مُلّائیت کی پھبتی آسانی سے چسپاں نہیں کی جاسکتی، دین کے ساتھ ساتھ مغربی افکار کا مُطالعہ اور اُن سے باخبری اس چیز نے اُن کی تحریروں کو بہت وزنی اور مُفید بنادیا ہے۔

جن دینی مسائل میں ہمارے بعض مُفکر اہلِ قلم نے "معذرت" (Apologetic) کے انداز میں گفتگو کی ہے، مولانا مودودی نے جُرأت و یقین کے ساتھ اُن دینی مسائل کی صحت، افادیت اور اہمیت کو واضح کیا ہے!

اسلامی قانون، اسلامی حکومت اور اسلامی تمدن و تہذیب، یہ مودودی صاحب کے وہ مخصوص موضوع ہیں جن پر انھوں نے معرکہ آرا مضامین لکھے ہیں، یہ مضامین اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کی تشکیل میں بہت مفید ثابت ہوسکتے ہیں! یہ واقعہ ہے کہ مولانا مودودی اس دور میں "اسلامی حکومت" کے قیام کے سب سے بڑے داعی ہیں۔

مولانا مودودی کی کتابوں کے بہت سی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں، پاکستان اور ہندوستان ہی نہیں، اُن کے دینی افکار مصر، حجاز، عراق، شام، لبنان، عراق، شرق اردن، بحرین، مسقط، قطر اور جنوبی افریقہ پر کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ترکی انگلستان اور کناڈا کے اسلام پسند حلقوں میں وہ متعارف ہیں اور عرب ممالک کے تو مولانا مودودی محبوب و پسندیدہ اہلِ قلم ہیں، ادب و انشاء کے اعتبار سے اُن کی تحریروں نے اُردو زبان و ادب کی آبرو بڑھائی ہے۔

مقصودِ گزارش

اس اعتراف اور ستائش و تحسین کے بعد ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ مولانا مودودی کے قلم سے بھول چوک بھی ہوئی ہے، یہ نہیں ہے کہ انھوں نے جو کچھ کاغذ پر لکھ دیا ہے، اُس کا ایک ایک لفظ عینِ حق ہے اور اُس پر تنقید ہی نہیں ہوسکتی، ناقدین کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ ان غلطیوں پر احتساب کریں۔

مگر

ہماری گزارش یہ ہے کہ ایک تو ہوتی ہے کسی کی غلطی سہو و نسیان اور لغزش و تسامح کی گرفت، اور دوسری چیز ہے کسی کو گمراہ بے بصیرت اور جاہل ٹھہرا دینے کا منصوبہ! نقد و احتساب کے یہ دو رُخ ہیں، جو ابھی ابھی پیش کئے گئے ہیں۔

تو

مولانا مودودی کے بارے میں ایسی فضا پیدا کرنا کہ وہ گمراہ ہیں، دین میں بصیرت نہیں رکھتے، تجارت پیشہ مُصنف ہیں، دراصل دین کے محاذ کو کمزور کرنے کی ایک ایسی افسوسناک کوشش ہے، جو دین ہی کی بھلائی کی غلط فہمی کے ساتھ اپنے بُرے نتائج پیدا کرسکتی

ہے۔ عدل وانصاف کا یہ تقاضا ہے کہ جس کا جتنا جُرم ہو، اُسے اتنی ہی سزا ملنی چاہیے، کوئی شخص رات میں سائیکل پر روشنی کے بغیر سفر کر رہا ہو، تو اُسے اس بے احتیاطی کی پاداش میں قتل کے مجرموں کے ساتھ کال کوٹھری میں بند کر دینا کہاں کا انصاف ہے جن لاکھوں نوجوانوں نے مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ کر دہریت، اشتراکیت اور لادینیت سے توبہ کی ہے، جنھوں نے نفس کے غلط تقاضوں کے مقابلہ میں پاکبازی کو اختیار کیا ہے۔ اُن پر اس قسم کی تنقید، بلکہ یوں کہیے تحقیر و تذلیل کا کیا اثر ہوگا اُن میں سے نہ جانے کس کس کے دینی معتقدات متزلزل ہو جائیں گے کہ ہم نے جس کی کتابوں سے دین حاصل کیا تھا، جب اُسی کو گمراہ، جاہل اور بے بصیرت ٹھیرایا جا رہا ہے، تو دین کی حقیقت معلوم! (خاک بدہن گستاخ، معاذاللہ)

مولانا مودودی کے خلاف اس قسم کی فضا پیدا کرنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ اُن لوگوں کا کاروبار چمکے گا، اُن کو شہ ملے گی، مُسلم عوام میں اُن کی مقبولیت کے اسباب پیدا ہوں گے، جو اسلامی معاشرے میں معروف کی جگہ منکرات قائم کر دینا چاہتے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کو بے اعتبار ٹھیراتے ہیں، جو مغربی اور اشتراکی افکار کے علمبردار ہیں! خدانخواستہ ہم اس غلط قسم کی عقیدت میں مبتلا نہیں ہیں کہ آج کی دُنیا میں بے دینی، مغرب زدگی، کمیونزم اور فسق والحاد کے طوفان کو بس تنہا مولانا مودودی کی کتابیں روکے ہوئے ہیں اور اسلام کی مدافعت و تائید بس انھی کے قلم سے ہو رہی ہے، مقصود گزارش یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی مودودی صاحب کے دینی افکار پہونچے ہیں اور جن جن کو بھی اُن کی تحریروں نے متاثر کیا ہے، خاص طور سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو، اُن پر بُرے رَدِ عمل ہونے کا امکان ہے کیوں کہ مودودی صاحب کا قلم دین کی ترجمانی اور مدافعت کی عام شہرت رکھتا ہے!

عوام سے ہمارا یہ کہنا ہے کہ وہ تنقید و تنقیص پڑھ کر ہی کوئی رائے قائم نہ کر بیٹھیں اُن کو چاہیے کہ مولانا مودودی کی اصل کتابیں مطالعہ کریں تاکہ انہیں اس کا پتا لگ جائے کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے، کس اسپرٹ کے تحت لکھا ہے اور اس کو ناقدین اور معترضین نے کس رنگ میں پیش کیا ہے اور کیا نکتے پیدا کئے ہیں، اربابِ قلم اور علماء سے ہماری یہ گزارش ہے کہ مولانا کی لکھی ہوئی کتابوں کی دینی افادیت کا اندازہ لگائیں، کہ اُن کے مطالعہ سے کتاب و سُنّت کے تقاضے اُبھر یں گے یا دب جائیں گے، اور پاکبازی اور نیکوکاری کا داعیہ پیدا ہوگا یا برائی کے جذبات کو شہ ملے گی!

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے جذبہ اخلاص کے تحت عرض کیا گیا ہے، مقصود کسی سے اُلجھنا اور بحث و نزاع کرنا ہرگز نہیں ہے، مولانا مودودی کی دینی خدمات کا اعتراف بھی دین کی خیرخواہی کے لئے کیا گیا ہے، ورنہ قلم صاحبان جاہ و دولت کی مدح وستائش کر کے بہت کچھ مادی فائدے حاصل کر سکتا ہے، مودودی صاحب کی جو قدر و منزلت ہمارے دل میں ہے، وہ محض اُن کی انشاپردازی اور زباں دانی کی وجہ سے نہیں ہے، اس اعتراف خدمات کا سبب یہ ہے کہ اُن کی انشاپردازی تمام و کمال دین کی دعوت میں صرف ہو رہی ہے اور وہ ہر محاذ پر اللہ کے دین کی خاطر سینہ سپر نظر آتے ہیں تقریباً چالیس سال سے اُن کے قلم نے دین ہی کی خدمت کی ہے اور کتاب و سُنّت ہی کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہے، بہت کم مفسرینِ قرآن نے "ارض القرآن" کا سفر صرف اس غرض سے کیا ہوگا کہ سفر کے یہ مشاہدات قرآن کی تفسیر میں کام آئیں۔

نقد و احتساب کا مسئلہ انتہائی نازک اور ذمہ دارانہ ہے۔ اس میں اخلاقی حدود اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی شدید ضرورت ہے، جو کوئی تنقید نگار کسی کی تحریر کو دانستہ توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے، وہ بہت بڑی غلطی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے، یہ تنقید نہیں، تحریف اور بددیانتی ہے، کسی کی تحریر سے ایسا مطلب و مفہوم اخذ کرنا اور نکتے تراشنا جن کا صاحب تحریر کے ذہن و فکر میں خطرہ بھی نہ گزرا ہو، یہ بھی ایک طرح کی معنوی تحریف ہے!

جس کسی اہلِ قلم نے بھی کوئی غلطی کی ہے، اُس کی غلطی پر احتساب کیا جا سکتا ہے مگر اخلاق و شائستگی کی حدود میں رہ کر، اور غلطی غلطی میں بھی فرق ہوتا ہے، جہاں کھلی ہوئی گمراہی ہے، وہاں گرفت سخت بھی ہو سکتی ہے، مثلاً منکرینِ حدیث جو حقیقت میں اطاعتِ رسول ﷺ کے منکر ہیں، اُن کی تحریروں پر غیرتِ دینی مشکل ہی سے نرمی برتنے کے لئے تیار ہو سکتی ہے، وہاں گمراہی، ضلالت اور بے دینی کے الفاظ کا استعمال ناگزیر ہو جائے گا۔

کسی بڑے سے بڑے عالم، مفکر اور اہلِ قلم نے اگر دوسروں کے بارے میں، یا خود اپنے اور اپنے اسلاف و شیوخ کے بارے میں خلافِ واقعہ باتیں بیان کی ہیں یا بیجا مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، تو اُس پر گرفت کرنا دینی، علمی، اخلاقی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے کوئی نامناسب بات نہیں ہے، تحقیق و تنقید کا یہ کام ہر دور میں ہوتا رہا ہے!

کسی شخص پر اس جذبہ کے تحت تنقید کی جائے گی تو اُس میں عدل و انصاف کے تقاضے ملحوظ رہ ہی نہیں سکتے —— کہ تم نے ہمارے فلاں ممدوح پر تنقید کی ہے، ہم اُس کے جواب میں تمہارے ممدوح کو گرانے کے لئے تنقید کریں گے!

قلم و زبان سے نکلے ہوئے حرف حرف کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دینا ہوگا، اس لئے نقد و احتساب میں جس کسی کے قلم سے جتنی بھی زیادتی ہوئی ہے، اور اس کا نفس جس قدر بھی اس میں شریک رہا ہے، حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے، اپنی بات کی پیچ کے لئے دانستہ، ہٹ دھرمی اور دھاندلی سے کام لیا گیا ہے، صحیح واقعات کا اخفاء، مبالغہ آمیزی، ذرا سی بات کو نمک مرچ لگا کر اہم بلکہ خوفناک بنا دینا —— ان تمام بے عنوانیوں اور زیادتیوں کی اللہ تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہوگی، اس دنیا میں ہم اپنی چرب زبانی اور قلم کی روانی سے لوگوں کو فریب دے سکتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حضور یہ فریب نہیں چل سکتے، وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو کر رہے گا اور حق و باطل، ظلم و عدل اور کذب و صدق میں ذرا سا بھی التباس باقی نہ رہنے دیا جائے گا ہر حقیقت اور واقعیت دو اور دو چار کی طرح کھل کر سامنے آئے گی۔ اُس دن کی رُسوائی سے بچنے کی سب سے زیادہ فکر اہلِ قلم کو کرنی چاہیے کہ جو اہلِ قلم نہیں ہیں اُن کے مقابلہ میں اربابِ نگارش کی مسئولیت اور ذمہ داریاں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ کاغذ و قلم کے ساتھ بڑی نزاکتیں اور ذمہ داریاں وابستہ ہیں —— اللہ تعالیٰ ہم سب کو عملِ خیر کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے! (آمین)

ماہر القادری — ۲ ستمبر ۱۹۶۰ء

مُلّا واحدی، دہلوی

تاثرات

میں نے اپنے دادا کو نہیں دیکھا۔ لیکن دادا کی ممانی کو دیکھا ہے۔ میرے دادا کی والدہ کا سنہ ۱۸۵۶ء میں انتقال ہوگیا تھا۔ مگر دادا کی ممانی سنہ ۱۹۱۰ء تک زندہ تھیں۔

ہمارے خاندان کے زیادہ آدمی تو دلّی کے کوچہ چیلان کے رہنے والے ہیں، لیکن کچھ بلّی ماران، فراشخانہ اور پنڈت کے کوچہ کی طرف جا بسے تھے، مگر جمعہ کو ہر مرد، خواہ بوڑھا ہوتا یا جوان، جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد آتا تھا۔ اور پھر میرے دادا کی ممانی کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ کوچہ چیلان جامع مسجد سے دور نہیں ہے۔

بزرگ خاتون اُس دن اپنے دالان کی دری جھڑواتیں اور چاندنی بدلواتیں اور پاندان آگے رکھ، انتظار کرنے بیٹھ جاتیں۔ خاندان کا ایک ایک شخص اُن کے سامنے جھکتا اور اُن کی دعائیں لیتا۔

دو ڈھائی گھنٹے یہ مجلس جمتی۔ بزرگ خاتون خاندان کی اُلجھنیں سُلجھاتیں۔ رائے اور مشورے سے معاملہ نہ سلجھتا تو اُن کا حکم کافی تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ حکم کریں اور اُسے ٹال جائے۔ حکم کیا۔ اشارے پر بیٹا بیٹی کے رشتے طے پاتے تھے۔ کہتیں:۔ میاں حفیظ الرحمٰن! مسعود ماشاءاللہ جوان ہوگیا۔ اس کی بات کہیں ٹھہرائی یا نہیں؟ جواب ملتا: چچی اماں! آپ کی موجودگی میں ہم بات ٹھہرانے والے کون۔ بزرگ خاتون مجید اللہ سے فرمائیں:۔ کیوں میاں مجید اللہ! افروز جہاں اور مسعود الرحمٰن کی جوڑی کیسی رہے گی۔ میاں مجید اللہ ہاتھ جوڑ کر اور سرِ تسلیم خم کر کے عرض کرتے: جو ارشادِ عالی، بزرگ خاتون بٹوے میں سے دو روپے نکالتیں اور دو روپے کی جلیبیاں منگا، سب کا مُنہ میٹھا کر دیتیں۔

نکاح سال چھ مہینے میں ہوجائے گا۔ نکاح کی عجلت نہیں ہے۔ بات اتنی پکّی ہے کہ اب مسعود الرحمٰن اور افروز جہاں کو بھی نباہنی پڑے گی اور ہنسی خوشی نباہنی پڑے گی۔ دادی اماں کی لگائی ہوئی بات ہے اسے کون توڑ سکتا ہے۔ دادی اماں کی لاج رکھنی ضروری ہے۔ دادی اماں کے دم سے خاندان کا بندھن بندھا اور بھرم بنا ہوا ہے۔

دادی اماں اور دادی اماں کے خاندان والے آجکل جیسے تعلیم یافتہ نہیں تھے، البتہ تربیت یافتہ تھے۔ انھوں نے حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد بارہا سنا تھا کہ جو چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی توقیر نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یعنی وہ حضورؐ کے مسلک سے الگ ہے۔ لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا

کیسا جامع ارشاد ہے۔ کنبے کے چھوٹے بڑوں ہی کے نہیں، نوکروں اور آقاؤں، ماتحتوں اور افسروں کے پیشِ نظر بھی یہ ارشاد رہے تو دنیا سے ناگواری اور آزردگی کا وجود ختم ہو جائے۔ لیکن آجکل تو رنگ ہی اور ہے۔ آجکل بچوں کی افزائش اور بوڑھوں کے جینے سے دُنیا گھبرائی گھبرائی سی ہے۔

—— ۲ ——

"اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا" یہ ایک بہت بڑے شاعر کا فقرہ ہے جس کی بڑائی کا اعتراف علامہ اقبالؒ ان الفاظ میں کر رہے ہیں ؎

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ ثابت ہوا

ہے پرِ مرغِ تصوّر کی رسائی تا کجا

اور مولانا حالی نے فرمایا ہے ؎

طالب و عرفی و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط مُنہ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت — خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے وہ صاحب عظمت شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ مندرجہ بالا فقرہ انھوں نے اپنے شاگرد منشی ہر گوپال تفتہ کو لکھا تھا۔

غالب نے زندگی میں بھی عزت پائی اور آج بھی بھارت کی حکومت اُن کی قدر کر رہی ہے، بھارت کا محکمہ ڈاک اپنے ٹکٹوں پر اُن کی تصویر چھاپ چکا ہے۔ بھارت کی حکومت اُن کا مکان خرید کر محفوظ کرنے والی ہے، اور طرح طرح سے انہیں یاد رکھنا چاہتی ہے۔

انسان انہی باتوں پر جان دیتا ہے کہ زندگی میں عزت پائے اور مرنے کے بعد نام باقی رہے۔ غالب کا نام مرنے کے بعد جتنا باقی ہے اُتنا بادشاہوں کا نہیں ہے۔ مگر غالب کہتے ہیں :-

"اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا۔"

حقیقت یہی ہے کہ مرنے کے بعد اگر اللہ کی خوشنودی میسر نہیں آئی تو دنیا کی عزت و شہرت کس کام کی ہے۔ اُس سے انسان کو کیا مل جائیگا۔ غالب مولوی صاحب یا شاہ صاحب نہیں تھے۔ لیکن سو برس پہلے کے شاعروں اور ادیبوں کے جذبات اور خیالات اس قسم کے ہوتے تھے۔

سو برس بعد کے شاعروں اور ادیبوں کا نمونہ بھی ملاحظہ کیجیے :-

"امیر خاں کیلے کھاتا رہا۔ ہم پیتے رہے۔ وزیر خاں بولا : امیر کیوں نہیں پیتا۔ میں نے کہا : اُس کی مرضی۔ وزیر خاں بولا۔ یہ سالا کیسا ادیب ہے۔ بغیر پیئے۔ لوگوں کو ادیب بننے کا حق کیا ہے۔ میں نے کہا۔ واقعی میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ تمام اچھی اچھی چیزیں اسلام نے ممنوع کیوں قرار دی ہیں۔ جاوید نے پوچھا : مثلاً میں نے کہا : جیسے شراب۔ موسیقی۔ سنگ تراشی۔ مصوری۔"

واحدی عرض کرتا ہے :-

ان نینن کے یہی پرشہ بکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

غالب بھی شراب پیتے تھے۔ لیکن شراب پینا اُن کے نزدیک خوبی اور وصف نہیں تھا۔ غالب بھی کبھی جوان تھے، اُس وقت اُنکا تخلص اسد تھا۔ اُس وقت انھوں نے کہا تھا ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

اور سنگ تراشی تو بیس برس قبل تک حرام تھی۔ دلّی میونسپل کمیٹی نے ڈاکٹر انصاری کا مجسمہ بنوانے کا ارادہ کیا تو ڈاکٹر صاحب کے بھائی حکیم نابینا صاحب نے فرمایا :-

تم بنوالو۔ میں توڑ دوں گا

—— ۳ ——

امریکہ میں آجکل خیال کیا جارہا ہے کہ سمندر کے کھارے پانی سے میٹھا پانی نکالا جائے۔ جس طرح سمندر کی بھاپیں اُٹھنے سے بادل بنتے ہیں اور

بادلوں سے میٹھا پانی بنتا ہے، اسی طرح سمندر کا بہت سا پانی کسی جگہ روک کر اُس سے بھاپیں اُٹھائی جائیں اور بھاپوں سے میٹھا پانی لے لیا جائے۔ ایسے خیال اور ایسے کام کے کرنے کی اللہ دعوت دیتا ہے۔ اللہ کی ہر صفت غور کرنے اور کام لینے کے لئے ہے۔ اللہ کی کاریگریوں سے اللہ کا پتہ بھی لگتا ہے اور نئی نئی ایجادوں کی تحریک بھی ہوتی ہے (افسوس میں نے ابتدائے عمر اور حصولِ تعلیم کے زمانے میں اسے نہیں سمجھا، ورنہ سائنس ضرور پڑھتا اور اللہ کی یہ دعوت قبول کرتا) لیکن ایجادوں کی وجہ سے موجدوں کا بے آپے ہو جانا اور غلط راستوں پر پڑ جانا بڑی خراب بات ہے۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ وہ کھاری پانی سے میٹھا پانی تو نکال سکتے ہیں، مگر کھاری پانی بہر حال اللہ کے سمندر ہی سے لینا پڑے گا اور اُسے میٹھا بنانا اللہ کی بارش ہی سے سیکھنا پڑے گا ——— تمام ایجادات کی بنیاد اللہ کی کاریگری پر ہے۔ اس بنیاد کو نہیں بھولنا چاہیے، اور اس حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انسان اللہ کی صنعتوں سے کام لے سکتا ہے، اللہ کی صنعتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ رات کو دن سے اور دن کو رات سے نہیں بدل سکتا۔ ہوا کا رخ نہیں پھیر سکتا ——— جہاز اور کشتیاں بنا سکتا ہے، اُن کے واسطے لکڑی اور لوہا نہیں پیدا کر سکتا۔

جون ۱۹۶۰ء کے کسی روزنامے میں پڑھا تھا کہ حکومت پاکستان نے محکمہ موسمیات کو حکم دیا ہے کہ مصنوعی بارش برسانے کا تجربہ کیا جائے۔ اچھی خبر ہے۔ پتیلی سے بھاپیں اُٹھتی ہیں تو بڑے برتن سے بھاپیں کیوں نہ اٹھیں گی اور بھاپیں بادلوں کی شکل اختیار کر لیں تو تعجب نہیں ہوگا۔ لیکن اول تو ہر بادل برسا نہیں کرتا، دوسرے ہوا بالکل اللہ کے قبضے میں ہے۔ آپ نے مصنوعی بادل کو لاہور میں برسانا چاہا اور ہوا اُسے امرتسر لے اڑی تو کیسی رہے گی۔

جس طرح قیامت کا وقوع صرف اللہ کے علم میں ہے اور یہ بات کہ فلاں انسان کل کیا کرے گا اور کیا نہ کرے گا اور فلاں انسان کہاں مرے گا فقط اللہ جانتا ہے۔ انسان اپنے مستقبل اور اپنی موت کی بابت خود کچھ نہیں جانتا، اسی طرح اس بات کا علم کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی اور گھٹا یہاں برسے گی یا وہاں اس کا علم اللہ کے ساتھ مختص ہے اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ط

عکس ریز (X-Rays) کے ذریعے بچے کا سر، پیر، آنکھ ناک، تمام اعضا دیکھ لیجیے مگر پیٹ میں بچے کی نشست اللہ میاں نے ایسی رکھی ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ لڑکا ہے یا لڑکی ـــ علیٰ ہذا بادل شاید آپ تیار کر لیں، لیکن انھیں مرضی کے مطابق برسانا محال ہے۔ اس لئے کھاری پانی سے میٹھا پانی نکال کر نہریں ہی دوڑائی جائیں تو بہتر ہے۔ کھاری پانی کی بفضلہ تعالیٰ کمی نہیں ہے۔

—— ۴ ——

قرآن مجید کے دعوے بھی قرآن مجید کے من جانب اللہ ہونے کا بڑا اچھا ثبوت ہیں۔ مثلاً یہی دعوےٰ ہے کہ فقط اللہ جانتا ہے کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ عکس ریز (X-Rays) سے پتہ چلانے کی کوشش کے علاوہ ٹامک ٹوئیے بہت مارے جاتے ہیں۔

ہماری بے پڑھی لکھی دادیاں نانیاں، جنھیں معلوم نہیں تھا کہ قرآن نے کیا کہا ہے۔ عورت کی رفتار سے اندازہ لگایا کرتی تھیں۔ دائیں پیر پر زور پڑ رہا ہے تو لڑکی اور بائیں پیر پر زور پڑ رہا ہے تو لڑکا۔ پیر بھاری ہونا اردو زبان کا محاورہ تھا جو حاملہ عورت کے متعلق بولا جاتا تھا فلاں عورت کا پیر بھاری ہے، یعنی وہ حاملہ ہے۔ علیٰ ہذا فلاں عورت فلاں پیر پر زور دے کر چلتی ہے۔ مگر یہ سب اندازے اور ٹامک ٹوئیے تھے۔ یقینی طور پر کوئی نہیں بتا سکا اور چودہ سو برس سے قرآن مجید کا دعوےٰ سچا ثابت ہو رہا ہے۔

کیا اللہ کے سوا کسی میں اتنی جرات ممکن ہے کہ ایسا دعویٰ کرے۔ وہی اتنی جرأت کر سکتا ہے جسے اطمینان ہو کہ میں دعوے کی لاج رکھنے کی طاقت و قدرت رکھتا ہوں۔

ہمارے ہاں کی عورتیں جس نوعیت کے ٹابک ٹوئیے مارتی تھیں بالکل اسی نوعیت کے ٹابک ٹوئیے متعدد فرنگی سائنٹسٹ لگا چکے ہیں لیکن اللہ کی بات جہاں تھی وہیں ہے۔

لڑکا یا لڑکی؟ اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ راز ہمیشہ کی مثل پوشیدہ اور محفوظ ہے۔

خردبین کی مدد سے یہ تو معلوم کر لیا گیا کہ بیضہ بارور ہو کر جب جنین کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس میں دونوں جنسوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، لیکن یہ متعین نہیں کیا جا سکا کہ کس قسم کا خلیہ بیضے کے ساتھ شامل ہو کر کس جنس کی نشوونما کا سبب بنے گا۔

بعض ڈاکٹر عورت کا لعاب دہن دیکھتے ہیں۔ بعض عورت کے رحم سے سیال جزو نکال کر اس کا امتحان کرتے ہیں، بعض عورت کا پیشاب پچکاری کے ذریعہ خرگوش کے جسم میں پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں، خرگوش کے غدودوں کا خون جم جائے تو لڑکی ورنہ لڑکا۔

غرض کہ پیش گوئیاں کی جاتی ہیں، پیش گوئیاں بھکاری فقیروں کی پوری ہوتی ہیں، ڈاکٹروں کی شان تو علٰے اور ارفع ہے۔ بھیک مانگنے والے دس کو بیٹا بتاتے ہیں تو ایک دو کی گود بھر جاتی ہے.... ڈاکٹروں کی پیش گوئیاں فقیروں کی پیش گوئیوں سے آگے نہیں بڑھتی ہیں۔

۵

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کہتے کہتے عمر گزر جاتی ہے، لیکن صراط مستقیم ہاتھ نہیں آتی۔ بھلا کوئی بات ہے کہ اللہ وعدہ تو کرے کہ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا جو ہماری طرف آنا چاہے گا اسے ہم اپنا راستہ دکھا دیں گے، اور وعدہ پورا نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے اھدنا الصراط المستقیم کہتے وقت ہم سمجھتے ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں تو مطلب پر دھیان نہیں دیتے۔ ورنہ کیوں کر ممکن ہے کہ اللہ میاں روز صبح سے شام تک اھدنا الصراط المستقیم کہلوائیں اور صراط مستقیم نہ دکھائیں۔

کم از کم سورہ فاتحہ کو ضرور سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہیے تو اللہ کے احسانات کا تصور بھی کیجیے کہ اس نے ہمیں وجود دیا ہے۔ اس کی عنایت سے ہم زندہ ہیں اور بالآخر اس کے پاس واپس جائیں گے وہ حمد و ثنا کا مستحق نہیں ہو گا تو کون ہو گا۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہیے تو سوچیے کہ یہ اظہار غلط تو نہیں کیا جا رہا۔ اللہ کی بجائے یا اللہ کے علاوہ کوئی اور تو معبود نہیں بنا ہوا اور کسی اور سے تو امیدیں نہیں لگا رکھیں۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ——— کی درخواست پیش کیجیے تو درخواست کے لہجے میں پیش کیجیے، حکم مت دیجیے۔

الٰہی! سیدھا راستہ دکھا اور سیدھے راستے پر چلا زبان سے کہنا کافی نہیں ہے۔ سیدھے راستے کی جستجو ہونی چاہیے۔ سیدھے راستے پر چلنے کا عزم ہونا چاہیے۔ نیت، خواہش اور عزم کے بغیر سیدھا راستہ ملنا ممکن نہیں ہے جسے جستجو نہیں ہوتی وہ کچھ نہیں پاتا حتیٰ کہ قرآن جیسے ہدایت نامے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

الٓمّٓ - ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ج ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ..... وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ابتداء ہی کتاب ہے کہ اس کے ہدایت نامہ ہونے میں مطلق شک و شبہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ہدایت نامہ ان کے لیے ہے جو فطرتاً برے کاموں کے کرنے سے گریز بھی کرتے ہیں اور نیک کاموں کے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنی آنکھوں اور اپنی عقل کو معیار بنا کر نہیں بیٹھ جاتے ہیں بلکہ ان سے ایسی چیزوں کے وجود کا یقین کر لیتے ہیں جنہیں خود انھوں نے نہیں دیکھا ہے اور جن تک بغیر بتائے ان کی عقل

نہیں پہنچتی ہے۔ اور یہ ہدایت نامہ اُن کے لئے ہے جو فقط زبان سے اپنے تئیں مسلمان نہیں کہتے عمل بھی مسلمانوں کے سے کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں عنایت فرمایا ہی اس سے ضرورت مندوں کو مدد دیتے ہیں۔ اور اے رسول! یہ کتاب ہدایت نامہ انہیں کے لئے ہے اور صراط مستقیم انہیں دکھاتی ہے جو تمہیں دل سے پیغمبر مانتے ہیں، جو احکام تم پر نازل ہوئے ہیں اُن کی تعمیل کرتے ہیں اور جو کچھ تم سے قبل نازل ہو چکا ہے اُس کے نزول کے قائل ہیں۔ جنہیں واقعی یقین ہے کہ اللہ نبی اور رسول بھیجتا رہا اور جنہیں واقعی یقین ہے کہ مرنے کے بعد اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ ایسے لوگ اللہ کے فضل سے راہ ہدایت اور صراط مستقیم ضرور پالیتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں اور من مانی مرادیں حاصل کرتے ہیں۔

ہدایت پانے کی جتنی شرطیں اوپر بیان کی گئیں، یہ سب اہل جستجو کی علامات ہیں۔ صراط مستقیم ان علامات سے آگے کی چیز ہے۔ یہ علامات بھی صراط مستقیم میں شامل رہیں گی لیکن انہی پر صراط مستقیم ختم نہیں ہو جاتی۔ حضور سرور کائنات کی پوری اتباع کرنا صراط مستقیم پانا ہے۔

۶

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ ہندوستان تقسیم ضرور ہوگا۔ مالدار ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم لیگ کے حصے میں آنے والے علاقوں کو چھوڑنا شروع کر دیا تھا اور وہ جوق در جوق وہاں پہنچ رہے تھے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

مالدار ہندو اور سکھ پوری جمع پونجی لے کر پہنچتے تھے اور فوراً کاروبار جما لیتے تھے۔

ابھی ہندوستان کی تقسیم ہوئی نہیں تھی اور ابھی آزادی ملی نہیں تھی کہ ایک دن دلّی کے ایک ہندو نے مجھ سے کہا کہ آزادی نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ پنجاب کے ہندو اور سکھ جب سے ہمارے محلّوں اور ہمارے بازاروں میں گھسے ہیں، نہ ہماری بہو بیٹیوں کی خیر ہے اور نہ ہماری تجارت محفوظ ہے، شرنارتھیوں نے ہمیں ناک چنے چبوا دیئے ہیں۔

میں ۱۹۵۹ء میں دلّی گیا تو معلوم ہوا کہ بعض قدیم ہندو خاندانوں نے ۱۹۴۷ء سے اپنی خواتین کو پردے میں بٹھا دیا ہے، اُن کی خواتین حتی الامکان باہر نہیں نکلتیں، اور نکلتی ہیں تو بڑے اہتمام کے ساتھ نکلتی ہیں۔

مسلمانوں کے پاس پیسہ نہیں تھا اور مسلمان دور اندیش نہیں تھے۔ مسلمان اُس وقت چلے جب بھگدڑ مچی۔ اُن کا استقبال پاکستان کے قدیم باشندوں نے اُسی طرح کیا جس طرح ہندوؤں اور سکھوں کا بھارت کے قدیم باشندوں نے کیا تھا۔ کراچی کے قدیم مسلمان غربا ۱۹۴۸ء میں طعنے دیتے تھے کہ کچھ آنے میں قورمے، چپاتی اور فیرنی سے پیٹ بھر جاتا تھا، تم لوگوں نے ہر چیز مہنگی کرا دی۔

غرض بھارت میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی اور پاکستان میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے آزادی کو بُرا بھلا کہا جانے لگا تھا۔ خوش نصیب تھے مہاتما گاندھی کہ ملک کو آزاد کرا کر جھٹ پٹ سدھار گئے اور اللہ کا کرم تھا قائد اعظم اور قائد ملت پر کہ پاکستان بنوا کر انہیں جلدی بلا لیا گیا، ورنہ پنڈت نہرو کا حشر دیکھ لیجئے۔ اُن کی اتنی محبوبیت اور ہر دلعزیزی اب نہیں ہے جتنی وزیر اعظم بننے سے قبل تھی۔

آزادی کے ابتدائی ایام ہمیشہ سخت ہوتے ہیں۔ آزادی کی ابتدا میں قوم کے عوام تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھاتے ہیں اور قوم کے خواص ہر دلعزیزی کھو دیتے ہیں۔ آزادی نہ آزادی پانے والوں سے سنبھلتی ہے اور نہ آزادی دلانے والے آزادی سنبھلوا جانتے ہیں۔ طویل زمانے تک جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔ سوائے اُس انقلاب کے جسے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک اور مقدس ہاتھوں نے رونما کیا تھا آپ کسی انقلاب کی بابت نہیں بتا سکتے کہ فلاں انقلاب کے ابتدائی لمحات سے کامیابی اور کامرانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ آزادی کا جو لطف امریکہ میں آج ہے کیا وہ آزادی ملنے کے دن سے ہے۔

بھارت اور پاکستان کے بارہ تیرہ سال جیسے گزرے ہیں ایسے ہی گزرنے چاہیئے تھے۔ ابتدا میں آزادی کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے

واسطہ پڑنا ہی تھا۔ تیرنا سیکھتے وقت ڈبکیاں کون نہیں کھاتا۔

ڈبکیوں کے ڈر سے تیراکی سیکھنا تھوڑا ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا تکلیفوں اور مصیبتوں سے ڈر کر آزادی کیسے چھوڑی جا سکتی تھی۔

آزادی کا لطف ہمیں ملے یا نہ ملے۔ ہماری نسلوں کو انشاء اللہ ملے گا۔ آزادی رائگاں نہیں جائے گی۔ آزادی کا استعمال قوم دیر سویر ضرور سیکھے گی۔ ہوش کی آنکھیں کبھی نہ کبھی قطعی کھلیں گی۔ تمیز، اعتدال اور رحم کا دور آئے گا۔

تو تعمیر مکان کی باڑیں کھلنے دو اور کوڑا ہٹنے دو، مکان جگ مگ جگمگ کرے گا۔

اس قسم کی باتیں فضول اور غلط ہیں کہ آزادی اُس وقت ملنی چاہیے تھی جب آزادی کے استعمال کی طاقت پیدا ہو جاتی۔ آزادی کے استعمال کی قابلیت آزادی کا استعمال کرنے سے پیدا ہوا کرتی ہے، غلامی کی حالت میں نہیں پیدا ہوتی۔ غلامی کا زمانہ تو جس قدر اور طول پکڑتا اُسی قدر آزادی پانے کے ابتدائی زمانے کو زیادہ گدلا کرتا۔ جو کچھ ہوا وہ آزادی کا نتیجہ نہیں ہے۔ غلامی کا نتیجہ ہے۔

—— ۷ ——

ہمارے آقا اور پیشوا نے انسانی فطرت کے کسی تقاضے کو بھی تو تشنہ نہیں چھوڑا۔ مسخرہ پن اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ چیز ہے۔

ایک قتل کا پتہ چلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم (بنو اسرائیل) سے کہہ رہے تھے کہ اللہ حکم فرماتا ہے بیل ذبح کرو اور اُس کا گوشت مقتول کی لاش پر رکھو۔ مقتول بول اُٹھے گا اور خود قاتل کا نام بتائے گا۔ بنو اسرائیل نے کہا۔ موسیٰ! تم ہم سے مسخرہ پن کرتے ہو۔ حضرت موسیٰ نے جواب دیا۔ توبہ توبہ! میں جاہلوں کا سا کام کروں گا۔ اللہ کی پناہ، جو میں جاہلوں کی سی حرکت کروں۔ یعنی حضرت موسیٰ نے مسخرہ پن کو جہالت کا ثمرہ قرار دیا۔ مسخرہ پن اُبھرتا ہی جب ہے جب انسان جہالت اور غفلت میں مبتلا ہوتا ہے۔

سب سے بڑی جہالت موت اور موت کے بعد کی زندگی سے غفلت اور بے خبری ہے۔ جو شخص موت اور موت کے بعد کی زندگی کا دھیان رکھتا ہے وہ مسخرہ پن میں وقت کیسے کھو سکتا ہے۔

لوگ عموماً مسخرہ پن اور مزاح یا شگفتہ مزاجی کا فرق نہیں جانتے۔ اسلام مسخرہ پن کے خلاف ہے، مزاح اور شگفتہ مزاجی کے خلاف نہیں ہے، بلکہ شگفتہ مزاجی سے پیش آنے کی ہدایت کرتا ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ ایک ضعیف العمر صحابیہ سے فرمایا کہ جنت میں بڑھیا کوئی نہیں جائیگی مطلب یہ تھا کہ بوڑھوں کو جوان بنا کر جنت میں بھیجا جائے گا۔ لیکن اس بات کو حضورؐ نے اس طرح ارشاد کیا کہ صحابیہ گھبرا گئیں۔ اُنہیں فوراً حقیقت حال سے واقف کر دیا گیا۔

حضورؐ نے المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام کا چھوٹا سا نمونہ دکھایا تھا اور مزاح کا معیار سمجھایا تھا۔ انسان کو کبھی کبھی عارضی تفریح کی بھی ضرورت پڑا کرتی ہے۔ ورنہ اصلی تفریح تو اللہ کے اوصاف پر غور کرنے اور اللہ کے احکام کی اطاعت سے ہوتی ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

—— ۸ ——

بنو اسرائیل کا ذکر قرآن مجید میں بہت ہے۔ اور جگہ جگہ ہے۔ کیوں کہ ہمارے دین کو سب سے زیادہ سابقہ یا مکے کے غیر اہل کتاب سے پڑا تھا یا مدینے کے اہل کتاب سے، خصوصاً یہودیوں سے۔ قرآن مجید میں اور قوموں کے بھی تذکرے ہیں، لیکن بنو اسرائیل سے کم ہیں اہل کتاب کے تراشیدہ مذہب کی اصلاح غیر اہل کتاب کے تراشیدہ بُت توڑنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔

علاوہ ازیں ہمارا دین محض اچھے افراد پیدا کرنے نہیں آیا تھا۔ اچھی قوم بھی پیدا کرنے آیا تھا، لہٰذا اُس زمانے کی اہم ترین قوم کے

حالات تفصیل کے ساتھ بتانے ضروری تھے۔ خطاب اگرچہ یہودیوں سے ہے لیکن سبق مسلمانوں کو بھی دیا گیا ہے کہ اونچی سے اونچی قوم اپنے کرتوتوں سے یوں گر جاتی ہے، مسلمان گزشتہ قوموں کے حالات پڑھیں اور یاد رکھیں کہ مَن کَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ۔ جو ڈھیٹ بن کر گناہ کماتے ہیں اور خطاکاری میں گھرے رہتے ہیں وہ اہل دوزخ ہیں۔ اور فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ...... جانتے ہو، تم میں سے جو لوگ ایسے برے کام کرتے ہیں، ان کی سزا کیا ہے، دنیا کی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن شدید عذاب، اللہ ان کی حرکتوں سے غافل نہیں ہے انھوں نے آخرت نثار کر کے دنیا خریدی ہے، سو ان کے لئے جو عذاب مقرر ہو چکا ہے وہ ان پر پورا پورا ہوگا۔ اسے ہلکا بھی نہیں کیا جائیگا اللہ نہ خود عذاب میں تخفیف فرمائے گا اور نہ کسی سفارشی کی سفارش سنے گا۔ سفارش اور مدد انہیں وہاں ملے ہی گی نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِیْلًا یہ سچی تاریخ ہے، جو چاہے اس سے سبق لے اور اپنے رب کا صحیح راستہ پالے۔ اور یاد رکھو کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى بغیر سعی و کوشش کے انسان کو کچھ نہیں ملتا۔ انسان کو ملتا وہی ہے جس کی وہ جستجو کرتا ہے۔ چلتا ہے تو منزل پر پہنچتا ہے ورنہ وہیں پڑا رہتا ہے جہاں پڑا تھا۔ اس میں نہ بنو اسرائیل جیسی محبوب قوم کی قید ہے اور نہ امتِ محمدیہ کی جسے خَیْرَ اُمَّةٍ کہا جا چکا ہے۔ یہ الٰہی قانون ہے جو اسی صورت میں ٹل سکتا ہے کہ آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے گا۔

بنو اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر کی قوموں پر فوقیت اور برتری دی تھی۔ مگر وہ اسے سنبھال نہ سکے، سب آپے ہو گئے۔ لہٰذا جتنا اونچا چڑھایا تھا اتنا ہی نیچے گرایا۔ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ خواری و محتاجی ان کے پیچھے چپٹا دی گئی۔ ان میں اولو العزمی مطلق نہیں رہی۔ اللہ کے غضب میں آگئے۔

جس پیغمبرؑ کو سولی پر چڑھانے چلے تھے اسی کی امت کے آگے ہاتھ پھیلا کر ذرا سی حکومت حاصل کر لی ہے۔ چھ ہزار برس سے ذرا سی حکومت بھی میسر نہ تھی۔ اور بحیثیت قوم یہودیوں کی آج بھی عزت نہیں ہے۔

۹

قرآن مجید جس ترتیب کے ساتھ ہمیں پہنچا ہے، اس ترتیب کے ساتھ نازل نہیں ہوا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ نزول کے اعتبار سے پہلی آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ہے اور آخری آیت قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ نہیں ہے۔ سورہ بقر مدینے میں اتری تھی اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مکے میں۔ نیز قرآن مجید توریت وغیرہ کی مانند بیک وقت نہیں دیا گیا تھا۔ ایک ایک دو دو آیتیں آتی تھیں اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے رہتے تھے کہ اس آیت کو فلاں آیت کے آگے لکھو اور اس کو فلاں کے آگے۔ یہ بھی وحی کے ذریعہ بتایا جاتا تھا۔ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب بذات خود معجزہ ہے۔

آیتیں جس طرح الگ الگ آئی تھیں اسی طرح الگ الگ رہنے دی جاتیں تو وہ ایک ایک دو دو آیتیں الگ الگ بھی معجزہ تھیں اور ہیں اللہ تعالیٰ نے کفار سے پورے قرآن کا جواب لانے کو نہیں فرمایا ہے، قرآن مجید جیسی چند آیتیں لانے کا چیلنج دیا ہے، مگر قرآن مجید کی موجودہ ترتیب اپنی جگہ بے حد حیرتناک ہے، جس طرح قرآن کی کسی آیت کا کوئی لفظ بدلنا ممکن نہیں ہے اسی طرح قرآن کی موجودہ ترتیب کو ہلانا محال ہے پارہ عم آخری پارہ ہے۔ اس میں شاید تین سورتیں مدنی ہیں، باقی سب مکی۔ اور پارہ الم پہلا پارہ ہے۔ اس میں مدنی سورۃ البقر شروع ہو گئی ہے اور چلی گئی ہے ڈھائی پاروں تک۔ سوچنے کی بات ہے کہ مکی سورتیں شروع میں ہوتیں اور مدنی آخر میں تو ترتیب کیا سے کیا بن جاتی ہے۔ پھر جو آیت جس آیت کے آگے رکھی گئی ہے وہ وہاں کی بجائے کہیں اور رکھ دی جاتی تو آیت کی فائدہ رسانی میں گو کمی نہ پڑتی

مگر ترتیب کے حسن میں فرق پڑ جاتا۔

آیتیں تیئیس سال کے مختلف اوقات میں اور مختلف مواقع پر اُترتی رہی تھیں اس لئے ربط اور روانی کا سوال نہیں اُٹھ سکتا تھا لیکن آیتوں کو صحیح جگہ رکھ دینے اور سورتوں کی صحیح ترتیب سے قرآن مجید ایسا مربوط ہو گیا ہے اور ایسی روانی سے پڑھا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے پورا قرآن بیک وقت بھیجا تھا۔

قرآن کی ترتیب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ترتیب ہے اور وہ ترتیب ہے جو لوح محفوظ میں ازل سے محفوظ ہے۔ جتنے مرحلے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پیش آنے والے تھے وہ اللہ کے علم میں ازل سے تھے اور ازل ہی سے قرآن کی نزولی ترتیب اور موجودہ ترتیب مقرر تھی۔

قرآن مجید نے اپنے مربوط ہونے کا دعویٰ کہیں نہیں کیا ہے۔ احادیث میں بھی ربط کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ علماء عموماً ربط کے تصور کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن مجھے تو قرآن میں برابر ربط نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہیں میں ربط نہ سمجھ سکوں تو یہ میرے نزدیک میری سمجھ کا قصور ہوگا۔

ابو علی (اعظم گڈھ)

"الہلال" مورخہ ۱۳ اگست سنہ ۱۹۱۳ء کا اداریہ مشہد اکبر نمبر ۱

اور

مولانا سید سلیمان ندویؒ

ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی و ادبی خدمات، ان کے سیاسی و ملی مجاہدات اور ان کی زندگی کے اور دوسرے پہلوؤں اور گوشوں پر لکھتے لکھتے مولانا کے معاصرین اور مخلصین سے ان کا علمی و ادبی مقابلہ اور موازنہ بھی شروع ہو جائے گا، اور اس موازنہ و مقابلہ میں اعتدال اور توازن کو بھی خیرباد کہہ دیا جائے گا" اور وہ افسانہ تراشا جائے گا کہ جس کے سامنے طلسم ہوش ربا' اور داستان امیر حمزہ تک گرد ہو جائیں گی۔ ان مضمون نگاروں نے مولانا کے معاصرین میں سب سے زیادہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا ہے۔ موخر الذکر کا تو سلسلہ فیض مختلف صورتوں میں بحمد اللہ ابتک جاری ہے، ان کی ایک کتاب سیرۃ قرآنیہ یعنی سیرۃ النبی قرآن کی روشنی میں عنقریب منظر عام پر آنے والی ہے' اور دوسری کتاب بشریت انبیاء جو درحقیقت سیرۃ ہی کا ایک حصہ ہے' زیر قلم ہے اور 'صدق' میں باقساط شائع ہو رہی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا گناہ صرف اتنا ہے کہ 'الہلال' کی شرکت ادارت کے زمانہ کے ایک مضمون مشہد اکبر کو جو الہلال ۱۳ اگست سنہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا، انھوں نے اپنا مضمون بتایا ہے اور اس ذرا سی بات پر اتنے لمبے لمبے مقالات اور مضامین لکھے گئے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو کئی سو صفحے کی ضخیم کتاب بن جائے۔ کاش! مضمون لکھنے والے اس بے حاصل و بے نتیجہ کام پر وقت ضائع کرنے کی بجائے کسی علمی و ادبی و تاریخی موضوع پر ریسرچ کرتے اور ملک و ملت کے سامنے کوئی محققانہ کتاب لکھ کر پیش کرتے۔ ہمارے نزدیک تو سید صاحب علیہ الرحمہ نے 'الہلال' کے بے نام کے مضامین میں سے اپنے مضامین کا اپنے نام سے انتساب کر کے مولانا ابوالکلام کے مضامین کے مجموعوں کے مرتبین و ناشرین کے لئے بڑی سہولت پیدا کر دی ہے جس کے لئے ان کو سید صاحب کا مشکور ہونا چاہیئے کہ وہ موصوف کی حد تک ایسے گمنام مضامین کی تحقیق کی دردسری سے بچ گئے۔

'الہلال' کے کئی دور رہے ہیں' اور ہر دور میں اس کا اسٹاف برابر بدلتا رہا ہے۔ اس کا پہلا دور سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۶ء تک رہا ہے، اس میں بھی، اس کے اسٹاف میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، اور وقت کے بڑے بڑے اہل قلم اور مصنفین کی قلمی اعانت اس کو حاصل رہی ہے۔ اس کے تیسرے دور کا اسٹاف تو تنہا مولانا عبدالرزاق پر مشتمل تھا، اڈیٹر تو مولانا تھے اور سارا کام مولانا عبدالرزاق

کرتے تھے، اور انہی کے مضامین زیادہ تر شائع ہوتے تھے، خود انہی کا بیان ہے کہ مولانا نے اس دور میں دو تین سے زیادہ مضمون نہیں لکھے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہر دور کے مضامین کی پوری چھان بین کی جائے اور اس انبار میں سے مولانا کے قلم کے جواہر ریزوں کو الگ کر کے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا جائے اور خواہ مخواہ شعیب عمری اور مولانا کے دوسرے نادان دوستوں اور ہوا خواہوں کی طرح الہلال کی ہر سطر کو مولانا ہی کی نہ ثابت کی جائے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

شرکائے ادارۂ الہلال میں بعض بعض بعد میں بڑی حیثیتوں کے مالک ہو گئے تھے۔ خصوصاً مولانا سید سلیمان ندوی نے جن کا ادارۂ الہلال سے صرف چھ مہینے تعلق رہا، جو شہرت حاصل کی، اور علم و ادب، و تاریخ میں جو مقام پیدا کیا، اس سے انکار کرنا انتہائی خیرہ سری ہے جو کسی طرح اہلِ علم و تحقیق کے لئے زیبا نہیں ہے۔ محض الہلال کے چند مضامین پر جو ان دونوں بزرگوں کے بالکل ابتدائی دور کے ہیں' ان میں باہم موازنہ و مقابلہ کرنا قطعاً کوئی دانشمندانہ کام نہیں ہے، خصوصاً مولانا سید سلیمان ندوی کی بعد کی مختلف موضوع پر متعدد ضخیم تصانیف اور معارف کے صدہا محققانہ مضامین کے مقابلہ میں جن میں سے بعض بعض کی بڑے بڑے مستشرقین یورپ و فضلائے ہند نے داد دی ہے، الہلال کے مضامین خصوصاً "مشہد اکبر" کا کیا درجہ ہے، جس کو مولانا ابو الکلام کا مضمون ثابت کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا جا رہا ہے، اور وہ وہ داد تحقیق و تدقیق دی جا رہی ہے کہ اللہ کی پناہ اور پھر مولانا ابو الکلام کے ان نادان اور بر خود غلط دوستوں کی تحقیق انیق کی بنا پر اگر یہ سید صاحب کے وسیع ذخیرۂ مضامین سے نکل گیا جن میں خالص مذہبی' ادبی و لسانی مضامین کے علاوہ مرہٹوں کا فوجی نظم، عہد اسلام میں تعلیم نسواں کی درسگاہیں، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، عربوں کی بحری تصانیف، برمک اور برمکھ، واقدی، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، قنوج مسلمانوں کے عہد میں' ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی، جیسے محققانہ مضامین شامل ہیں جن میں سے بعض بعض رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور آخر الذکر کو تو ابھی پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے، تو ان کے شرف میں کیا کمی اور اس میں شامل کر دینے سے کیا اضافہ ہو سکتا ہے۔ "مشہد اکبر" تو سید صاحب کے خود الہلال کے اور مضامین کے مقابلہ میں سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا جس پر سید صاحب جیسا فاضل بے بدل و محقق یگانہ فخر کرے، وہ بالکل وقتی اور ہنگامی تھا۔ جس وقت اور جن حالات میں وہ لکھا گیا تھا۔ یقیناً اس کی اہمیت تھی' اور اسی اہمیت کی بنا پر الہلال کا وہ نمبر جس میں یہ چھپا تھا، ضبط کر لیا گیا تھا۔

پھر اس کے متعلق ہمارے یہ فضلا جن کو اس سلسلہ میں اپنے طویل مقالات اور غیر معمولی تحقیقات پر بڑا ناز ہے' اور سمجھ رہے ہیں کہ وہ کوئی بڑی عظیم الشان علمی خدمت انجام دے رہے ہیں' بڑی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگر انہوں نے اس موضوع پر اپنے گرانقدر مقالات حوالۂ قلم کرنے سے پہلے مشہد اکبر' کے سلسلۂ مضامین کا غائر نظر سے مطالعہ کر لیا ہوتا تو ان کو اتنی دراز نفسی نہ کرنی پڑتی۔ اصل یہ ہے کہ 'مشہد اکبر' کے عنوان سے الہلال کی مختلف اشاعتوں میں متعدد مضامین شائع ہوئے تھے۔ ایک ۶۔ اگست کے الہلال میں جو اس عنوان کے تحت ۳۔ اگست کے واقعۂ محزنۂ کانپور کی محض سادہ رپورٹ ہے۔ دوسرا ۱۳۔ اگست کے الہلال میں' تیسرا ۲۰۔ اگست کے الہلال میں جو اس حادثۂ فاجعہ سے متعلق مختلف اشخاص کے مراسلات کا مجموعہ ہے۔ جن میں انھوں نے اپنے تاثرات و احساسات درد انگیز الفاظ میں پیش کئے ہیں۔ ان مراسلات میں ایک مراسلہ جس کی سرخی رویت و روایت ہے۔ ایک ایسے صاحب کا ہے جنہوں نے اپنا نام نہیں ظاہر کیا ہے۔ صرف نظر لکھا ہے، جن کو اس وقت کے صاحب نظر ہی پہچان سکتے ہیں۔ دوسرا ملک کے مشہور اہل قلم و افسانہ نگار جناب نیاز فتحپوری کا ہے جو بڑا

جذباتی اور رقت انگیز ہے۔ تیسرا سید رضا علی بی۔ اے ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ الٰہ آباد کا ہے۔ چوتھا لکھنؤ کے نامور اور شہرۂ آفاق بیرسٹر جناب محمد وسیم کا ہے، پانچواں پھر کلکتہ کے ایک ایسے صاحب قلم کا ہے جنہوں نے اپنا نام صرف مخبر لکھا ہے، جن سے شاید مدیر الہلال باخبر رہے ہوں۔ چھٹا بانکی پور کے حکیم رکن الدین صاحب دانا کا ہے۔ ساتواں مراسلہ کیا ہے 'شہدائے کانپور کا نثر میں دلدوز مرثیہ ہے جس کا ایک ایک لفظ درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے، غالباً الہلال کے نوجوان شریک ادارت مولوی ابوالحسنات ندوی بہاری کا ہے' جو بعد میں الہلال سے علیحدہ ہو کر دار المصنفین میں آگئے تھے۔ دار المصنفین کی رفاقت یا فیلو شپ کے لئے جن طلبائے ندوہ پر مولانا شبلی کی نگاہِ انتخاب پڑی تھی۔ ان میں ایک یہ بھی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت اپنے وطن میں تھے' اور وہیں سے اس واقعۂ ہائلہ کے متعلق اپنے جذبات و تاثرات لکھ کر الہلال میں بھیجے تھے، ان مراسلہ نگاروں میں سید رضا علی اور مسٹر وسیم بڑی حیثیت و شہرت کے مالک ہوئے۔ اول الذکر نے تو اعمال نامہ کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح عمری بھی لکھی ہے، جو اردو کے سوانحی ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے، اور کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک اردو میں اس سے بہتر کوئی خود نوشت سوانح عمری موجود نہیں ہے، وہ محض سوانح عمری ہی نہیں بلکہ ان کے دور کی مکمل مستند سیاسی تاریخ ہے معلومات افزا اور دلچسپ۔ مشہدِ اکبر کا چوتھا مقالہ ۳ ستمبر کے الہلال میں ہے اور یہی مولانا ابوالکلام کے معجز نگار قلم کا ہے جس کو معجزۂ ادب کہہ سکتے ہیں، اس کا ایک ایک فقرہ، ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک لفظ مولانا ابوالکلام کے منفرد اسلوب و انشاء کا غمّاز ہے، یہ بھی اس اشاعت کا اداریہ ہے جس پر نمبر ۲ لکھا ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۳۔ اگست کا اداریہ نمبر ۱ ہے، جو مولانا ابوالکلام کی عدم موجودگی میں سپرد قلم ہوا ہے' اور اسی کے متعلق سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کا ہے۔

سید صاحب نے اس کا اظہار سب سے پہلے' اس مضمون کے لکھنے کے چار برس اور الہلال دور اول کے بند ہونے کے ایک ہی سال کے بعد مکاتیب شبلی جلد دوم کے ایک مکتوب کے سلسلہ میں جو ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی تھی، کیا، مولانا شبلی نے الہلال کی شرکت ادارت کے زمانہ میں سید صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس کا ایک پیرایہ ہے:

> "الٰہ آباد گورنمنٹ نے الہلال کا پرچہ مشہدِ اکبر قابلِ ضبطی قرار دیا ہے، اور حسن نظامی کا پمفلٹ بھی"

اس پر سید صاحب کا ایک حاشیہ ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

> "مشہدِ اکبر کی سرخی سے مکتوب الیہ ہی کا لکھا ہوا مضمون الہلال کے لیڈنگ آرٹیکل میں واقعۂ کانپور کی نسبت شائع ہوا تھا۔ تمام ملک نے اس مضمون کو پسند کیا، اور اب تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے، مضمون اس قدر پُر جوش تھا کہ گورنمنٹ نے اس کو قابلِ ضبطی قرار دیا، اور اس جرم میں الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی، مولانا شبلی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس کا لکھا ہوا تھا۔"

دار المصنفین سے جو کتاب بھی شائع ہوئی تھی، مولانا ابوالکلام کو ضرور ہدیہ کی جاتی تھی، اس کا ذکر بڑی تفصیل سے ان کے ان خطوط میں ہے' جو معارف میں شائع ہو چکے ہیں، بلکہ جب نئی کتاب کے پہنچنے میں دیر ہو جاتی تھی تو اس کا تقاضا خود کرتے تھے، دار المصنفین کے سلسلۂ تصنیفات میں ایک سلسلۂ برکلے بھی ہے، جس میں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں داخل ہیں' اسی سلسلہ کی ایک کتاب کے متعلق مولانا سید صاحب کو لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالباری صاحب کی برکلے اور اس کا فلسفہ چھپ گئی ہو تو بھجوا دیجئے"۔

مکاتیب شبلی کا یہ حصہ بھی جو مولانا شبلی کے تلامذہ اور بعض احباب کے نام کے خطوط پر مشتمل ہے، ان کی خدمت میں ضرور گیا ہوگا، اور اس کے مطالعہ کے وقت مولانا سید سلیمان ندوی کا اپنے مضمون کے متعلق یہ حاشیہ بھی ان کی نظر سے گزرا ہوگا، لیکن انہوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، حالانکہ واقعہ محزنہ کانپور پر بھی کل چار برس گذرے تھے۔ جس کی یاد لوگوں کے ذہنوں میں بالکل تازہ تھی۔ اگر یہ خدانخواستہ غلط اور خلافِ حقیقت ہوتا، تو اگر مولانا نہیں، تو اور کوئی صاحب جن کو مولانا سے عقیدت ہوتی اس کی تغلیط و تردید کرتے، لیکن ۱۹۱۷ء سے لیکر ۱۹۴۵ء تک یہ بیان بطور حقیقت ثابتہ کے اپنی جگہ پر قائم رہا اور الہلال کے پورے حلقہ میں یہی سمجھا جاتا رہا کہ ۱۳۔ اگست کا اداریہ جو مشہد اکبر کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ الہلال کے چیف آف اسٹاف مولانا سید سلیمان ندوی ہی کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ جس کی ایک ایک سطر، اور ایک ایک جملہ میں بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے "ان کی مذہبی حمیت، ملی غم خواری اور قومی درد کا طوفان اُمڈا پڑتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی خاکساری قابلِ داد ہے کہ جہاں یہ واقعہ تاریخ بن سکتا تھا، وہاں سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا، انھوں نے حیات شبلی میں ہنگامۂ کانپور کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اور اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام کی خدمات کا بڑے ولولہ انگیز الفاظ میں اعتراف کیا ہے، لکھا ہے، کہ یہ واقعہ جب ہوا تھا مولانا شبلی بمبئی میں تھے، اور راقم الحروف کلکتہ میں الہلال کے ادارۂ تحریر میں شامل تھا، لیکن اس واقعہ کو مسلمانوں کی قومی و ملی زندگی کا ایک اہم اور یادگار واقعہ بنانے میں جس کی زبان و قلم کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ وہ مولانا ابوالکلام کی ذات ہے۔ مولانا شبلی کی پرجوش نظموں اور مولانا ابوالکلام کے آتشیں مقالات نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو جوش سے لبریز کر دیا۔ اور وہ مرنے اور مارنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حالانکہ اس جوش کے پیدا کرنے میں ان کی تحریروں خصوصاً مشہد اکبر والے اداریہ کا بھی کافی دخل تھا، جس کا ذکر تو کیا اس کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔

مکاتیب شبلی حصہ دوئم کے شائع ہونے کے پورے ۲۴ برس کے بعد، اسلامی نظریۂ سیاست پر ایک مضمون معارف کے متعدد نمبروں میں شائع ہوا۔ بعد میں اس کی افادیت کے پیشِ نظر مضمون نگار نے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا چاہا، اور اس پر مقدمہ جیسا کہ ہم نے اپنے پچھلے مضمون میں لکھا ہے، بمقام بھوپال سید صاحب نے لکھوایا۔ جس میں انھوں نے بطور تحدیثِ نعمت کے لکھا کہ "اب تو الحمدللہ اس موضوع پر لکھنے والے بہت پیدا ہو گئے ہیں لیکن آج سے ۲۵، ۳۰ برس پہلے اردو میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس پر لکھنے کی توفیق عطا فرمائی، اور الندوہ ۱۹۱۰ء میں اشتراکیت اور اسلام کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جو اُس وقت بہت پسند کیا گیا، پھر اس کو الہلال کی شرکت ادارت کے زمانہ میں از سرِ نو لکھا، اور الحریۃ فی الاسلام کے عنوان سے الہلال کے کئی نمبروں میں شائع ہوا" چونکہ یہ سلسلۂ مضمون بھی اتفاق سے بلا نام کے شائع ہوا تھا، اس لئے محض اظہارِ واقعہ کے لئے اس پر سید صاحب نے یہ حاشیہ لکھا:

> "الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے۔ اسلئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعے شائع کرنے والوں نے بلاتحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر نمبر اول وغیرہ میرے مضامین ہیں۔ اسی طرح الحرب فی الاسلام اور کئی مضمون مولانا عبدالسلام ندوی کے ہیں،

اسوۂ ابراہیم وغیرہ مولانا عبداللہ عمادی کے ہیں۔"

ان میں سے ایک مضمون "الحریۃ فی الاسلام" کے بے نام ثابت ہونے کی تصدیق خود مولانا ابوالکلام کے ایک خط سے ہوتی ہے، اس مضمون کے ابھی ایک ہی دو نمبر شائع ہوئے تھے کہ سید صاحب الہلال سے علیحدہ ہو گئے۔ اور پونہ فرگوسن کالج میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرار ہو گئے اور اپنے ساتھ اس مضمون کی بقیہ قسطیں بھی لیتے گئے، مولانا ابوالکلام ان کو لکھتے ہیں:

"ہاں! "الحریۃ فی الاسلام" کے چند نمبر جو آپ نے لکھے تھے، شاید آپ لے گئے، انھیں ضرور ہی بھیج دیجئے۔ اسی طرح چھپ جائیگا اور سلسلہ مکمل ہو جائیگا۔"

کتاب کا یہی مقدمہ بعد میں مولانا ریاست علی ندوی کی سب ایڈیٹری کے زمانہ میں مزید اشاعت کے خیال سے مع حاشیہ مذکورہ معارف میں بطور سر مقالہ کے شائع ہوا پھر اس کو خانقاہ تھانہ بھون کے متوسلین و منتسبین مقیم کراچی کے واحد آرگن "مستقبل" کراچی نے اپنے صفحات میں .... نقل کیا، اور اس کا صرف حاشیہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے معارف سلیمان نمبر کے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا، اور یہ راز سربستہ واشگاف ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک بزم گہ خاص میں مولانا کے ایک دیرینہ ارادتمند نے مولانا سے براہ راست اس کے متعلق استفسار کر دیا۔ معلوم نہیں مولانا اس وقت خود ہی موڈ میں نہیں تھے، یا سوال ہی کچھ اس انداز کا تھا کہ مولانا کو برا لگا، فرمایا کہ:

"سید سلیمان اگر کسی مضمون کو اپنا بنالتے ہیں تو لے لیں، میرا اس میں کیا بگڑتا ہے۔"

اوّلاً تو یہ جواب مولانا کی طبعی فراخ دلی کے خلاف تھا، دوسرے مولانا سید صاحب کی صلاحیتوں کے معترف اور انکے علم و فضل کے بڑے قدردان اور مداح تھے (اس کا اندازہ ان کے خطوط کے ان اقتباسات سے کیجئے۔ سید صاحب نے الہلال سے علیحدہ ہو کر پونہ میں فارسی کی پروفیسری قبول کرلی، تو ان کو لکھتے ہیں:

"آپ نے پونہ میں پروفیسری قبول کرلی، حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے۔ کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی و عربی سکھلا دی، آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں۔"

سید صاحب نے مولانا شبلی کی وفات کے بعد ان کی یادگار میں دارالمصنفین قائم کیا، اور اس کا پراسپکٹس مولانا کے پاس بھیجا تو لکھتے ہیں:

"دارالمصنفین کا پراسپکٹس پہنچا، آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے، "آنریری فیلو" تو ایک عمدہ بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں گا۔"

معارف کی کمیوں کے متعلق سید صاحب نے ایک مرتبہ ان کو لکھا تو لکھتے ہیں:

"معارف کے متعلق یہ آپ کیا کہتے ہیں صرف یہی تو ایک پرچہ ہے، اور تو ہر طرف سناٹا ہے، بحمداللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں، اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی، جو صرف خدمت علم و تصنیف و تالیف کے لئے وقف

ہے، فجزاك الله جزاءً حسناً"

ایک مرتبہ سید صاحب نے ان کو لکھا کہ بحمد اللہ دار المصنفین اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا، اور اب بغیر سہارے کے بھی وہ بہت خوبی اور اطمینان کے ساتھ چل سکتا ہے، تو لکھتے ہیں:

"یہ سب آپ کے قیام وسعی کا نتیجہ ہے، بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کے آخر حیات کی امیدیں بار آور ہوئیں"

الہلال کی شش ماہہ شرکت ادارت میں سید صاحب کی صلاحیتوں کا جو اندازہ ہو گیا تھا، اس کی بنا پر جب الہلال کے بجائے البلاغ مولانا نے اسی شان سے نکالا، تو اس کی ادارت کے لئے پھر ان کی نگہِ انتخاب سید ہی صاحب پر پڑی، لکھتے ہیں:

"آپ فوراً کلکتہ آئیں اور البلاغ کو جو نکل چکا ہے، اپنی اڈیٹری میں لے لیں اور ایک خالص دینی واصلاحی رسالہ کی شکل میں مع اس کے خصائص کے اسکو جاری رکھیں یہاں آپ کی وہی پوزیشن ہوگی جو میری ہے، پورا عملہ آپ کے ماتحت ہوگا"

مولانا نے دار الارشاد کے نام سے مدارس اسلامیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے ایک تربیتی ادارہ بھی قائم کیا تھا، تو اس کے متعلق سید صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

"اگر آپ یہاں آکر قرآن حکیم اور علوم اسلامیہ کا درس جاری رکھ سکیں تو وہ بھی آپ کے تصرف میں آجائیگا بلکہ اس کا کتب خانہ بھی آپ کے سپرد کر دیا جائیگا"

البلاغ کے ساتھ مولانا نے 'اقدام' کے نام سے ایک روزنامہ بھی جاری کر دیا تھا۔ اس کو بھی مع اسٹاف کے سید صاحب کے حوالہ کرنا چاہتے تھے۔

سید صاحب سے ان کی محبت واخلاص کا یہ عالم تھا ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:

"میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے، اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں"

فضاها لغیری وابتلانی بحبها

ایک مرتبہ سید صاحب نے بہت دنوں تک کسی وجہ سے ان کے خط کا جواب نہیں دیا۔ تو بے قرار ہو کر لکھتے ہیں:-

بہر حال میں اپنی شورش قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہوں، لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہے۔ تو سوائے صبر کے چارہ کیا ہے"

سید صاحب نے کسی کام کے لئے ان کو خط لکھا تو لکھتے ہیں:-

"بہر حال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق وہم عناں یقین کیجئے، اور ہر دم خدمت گزاری کے لئے تیار ہوں"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"اتحاد مشرب وفکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا"

ارید النسی ذکرھا فکانما
تمثل لی لیلیٰ بکل سبیل

اس پس منظر میں مولانا ابوالکلام کا وہ جواب کتنا توقع کے خلاف تھا، بہرحال اس کو مولانا کے انتہائی ملال طبع اور ناگواری خاطر پر تو محمول کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے سید صاحب کے دعویٰ کی تائید یا تردید ثابت نہیں کی جاسکتی ہے۔

ہمارے نزدیک سید صاحب نے ۱۳؍ اگست کا صرف اداریہ ہی نہیں، بلکہ پورا پرچہ شروع سے آخر تک مرتب کیا تھا۔ اداریہ شذرات، نوٹس سب انہی نے لکھے تھے، مولانا ابوالکلام صرف ایک اخبار کے ایڈیٹر ہی نہیں تھے، بلکہ ملک کے مسلمہ لیڈر بھی تھے۔ اور اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ تھیں۔ جن میں قومی و ملّی و سیاسی انجمنوں، مجلسوں اور جلسوں کی شرکت بھی تھی، اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کلکتہ سے باہر بھی ان کو جانا پڑتا تھا۔ سید صاحب نے یہ عزت کہیں برسوں میں جاکر، وفد خلافت یورپ میں شرکت کے بعد حاصل کی۔ جب آخری حوادث کانپور شروع ہوئے تو وہ اتفاق سے سفر ہی میں تھے، اور ۱۳؍ اگست کا پرچہ ان کی عدم موجودگی میں سید صاحب کی براہ راست نگرانی و ادارت میں شائع ہوا تھا۔ مولانا ابوالکلام الہلال مورخہ ۳؍ ستمبر کے اپنے خاص اداریہ "مشہد اکبر ۲" کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

> کانپور کے آخری حوادث جب شروع ہوئے تو میں سفر میں تھا، پھر بھی سفر میرے لئے مانع کار نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک مقام پر قیام نہ ہونے کی وجہ سے سکون و جمعیت خاطر کہ جمع و ترتیب خیالات کے لئے ضروری ہیں۔ بالکل میسر نہ تھے پھر جس زمانہ میں بندگان الٰہی کو جان اور زندگی بھی حاصل نہ ہو تو مجھے سکون و جمعیت کے حاصل نہ ہونے کی شکایت کا کیا حق ہے، اس لئے شاکی تو نہیں ہوں۔ البتہ معذرت خواہ ضرور ہوں کہ اس واقعہ پر پوری تفصیل سے بحث نہ ہو سکی اور ایک مقالہ افتتاحیہ (سید صاحب کے لکھے ہوئے اداریہ کی طرف اشارہ ہے جو ان کی عدم موجودگی میں ۱۳؍ اگست سنہ ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں چھپا تھا) کے سوا اور کوئی تحریر نہ نکل سکی۔

یہ تو سید صاحب کے دعویٰ کے ثبوت میں خارجی شہادت ہے، داخلی شہادت دونوں بزرگوں کے افتتاحیوں کا الگ الگ طرز و اسلوب نگارش ہے جس کی صحیح تمیز انہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جنھوں نے ان دونوں کے مضامین، تصنیفات اور تحریروں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہوگا گو مشہور تو یہی ہے کہ سید صاحب جب تک الہلال میں تھے، مولانا ابوالکلام کے طرز تحریر و انداز نگارش کا تتبع کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے اسلوب میں اُس وقت بھی زمین آسمان کا فرق تھا، ایک کا صحافتی و علمی تھا اور دوسرے کا خالص علمی و محققانہ، فارسی و اردو عربی کے بکثرت محل و اشعار، فارسی کی چست تراکیب، استعارات و تشبیہات کا زور، الفاظ کی شان و شوکت مولانا ابوالکلام کے ادب کی خصوصیت ہے جس کا اپنی تحریر میں قائم رکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، سید صاحب کی اس وقت کی تحریر بھی اس خصوصیت سے خالی ہے۔ مشہد اکبر نمبر والا اداریہ گو ابوالکلام ہی کی طرح حد درجہ جذباتی اور خطیبانہ ہے۔ لیکن اُس میں کہیں بھی ابوالکلام کے ادب کا انداز نہیں آنے پایا ہے۔ وہ سید صاحب کا اپنا رنگ ہے۔ جو شدت جوش میں ان کے قلم سے بے اختیار تراوش کر گیا ہے۔ اب ہم ان دونوں بزرگوں کے افتتاحیوں شروع کے اقتباسات الگ الگ پیش کرتے ہیں جس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ دونوں افتتاحیے ایک ہی قلم کے نہیں، دو قلم کے ہیں، اور ان دونوں کا طرز انشا ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

۱۳ اگست کے افتتاحیہ کی شاہ سرخی مشہد اکبر ہے، ذیلی سرخی ہے،

اورنگ کا دردناک مظاہرہ کانپور میں

مضمون حضرت سعدیؒ کے مشہور مرثیہ بغداد کے ابتدائی تین شعروں سے شروع ہوا ہے،

اے محمدؐ گر قیامت سر برون آری نہ خاک

سر برآور ویں قیامت درمیان خلق بیں

اس کے بعد آل عمران کی اس واقعہ محزنہ کے مناسب یہ آیت ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ الآیہ

پھر اصل مضمون ان پرجوش اور ولولہ انگیز فقروں سے شروع ہوتا ہے:۔

"زمین پیاسی ہے اُس کو خون چاہیئے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے خاکِ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے، کس کا مسلمانوں کا آخر سرزمین کانپور میں خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔"

یہی رجزیہ انداز مضمون کے آخر تک چلا گیا ہے، جس کے پڑھنے سے آج بھی برطانوی شہنشاہیت اور انگریزوں کیخلاف ہمارا خون کھولنے لگتا ہے۔

۳ ستمبر کے افتتاحیہ کا عنوان بھی "مشہد اکبر" ہے، لیکن اس کے ساتھ نمبر ۲ لکھا ہوا ہے۔ شروع میں سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

حالانکہ دونوں کے مطالب اور مضامین مشترک ہیں، اس میں وہی واقعات و حالات دہرا دیئے گئے ہیں جو ۱۳ اگست میں لکھے جا چکے تھے۔

اس کے بعد وہی مذکورۂ بالا تمہید ہے، جس میں اپنے سفر اور عدم اطمینان قلب و دماغ کا ذکر ہے، پھر

سفک دماء و قتل نفوس

کی ضمن سرخی کے تحت اصل مضمون شروع ہوا ہے، مولانا لکھتے ہیں:۔

۳ اگست کی صبح کو جب آفتاب افق کانپور پہ طلوع ہوا......

تو اس نے اس خون کو دیکھا جو ہمیشہ بہا ہے،

اس نے لاشوں کی تڑپ پہ نظر ڈالی جو ہمیشہ تڑپی ہیں۔

اس نے قہقہہ وحشت کا شور اور آہ مظلومی کی سسک تھی

جو اس عصیان آباد ارضی پر ہمیشہ سنی گئی ہے۔

اس نے موت و حیات کو باہم کش مکش میں دیکھا۔

اس نے روح و جسم کی مفارقت کے آخری اضطراب کا نظارہ کیا۔

اُس نے خون کے فواروں کا جوش و خروش، زخموں کی تلملاہٹ۔
ایڑیوں کی ٹپک، زندگی کے لمحات آخریں کا اضطرار
غرضکہ انسان مذبوحیت کے تمام خوں ریز تماشے دیکھے"

اس سے زیادہ نقل کرنا طول عمل ہے، ان دونوں افتتاحیوں کے الگ الگ چند الفاظ اور ترکیبوں سے دونوں کا فرق اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔

اداریہ ۱	اداریہ ۲
مورخہ ۱۳ ؍ اگست ۱۳ء	مورخہ ۳ ؍ ستمبر ۱۳ء
سرکاری اطلاع کہتی ہے	عزت بخش بصیرتیں
غیرت کا ڈبہ	بخشش حیات
جوش مصنوع	قہقہۂ وحشت کا شعور
مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش	آہ مظلومی کی سسک
مصائب و آلام کی آغشتہ خوں اطلاعات	عجائب آباد ہستی
مصالح دمویہ و مناظر خونیں	نظارہ فرمائے آسمانی
استحلال سفک	خونریزی و بہیمیت
انتہاک حرمت	خوں چکاں قطعات ارضیہ

چھوٹے چھوٹے فقرے کی جوامع الکلمی دیکھو۔ ظلم ستانیاں ۔ حریفان کارداں
شرمندۂ اعانت و شرکت
نعائم جنت کی سرمدی خوشیوں اور راحتوں
جیب ماتم
ماتم کدہ مقدس
عصیاں آباد ہستی وغیرہ

جو شخص بھی اردو ادب کا تھوڑا بہت ذوق رکھتا ہے اور ان دونوں بزرگوں کی تحریروں کا ادا شناس ہے، وہ بیک نظر ان دونوں تحریروں کا فرق محسوس کرے گا۔ سید صاحب کے قلم کا لکھا ہوا، ۱۳ ؍ اگست، کا پورا اداریہ سلیس، رواں اور شگفتہ ہے، اور اس میں کہیں بھی مولانا ابوالکلام کے منفرد طرز نگارش کا کوئی اثر نہیں آنے پایا ہے، اور آ بھی نہیں سکتا تھا کہ سید صاحب نے مولانا کے اسلوب تحریر کے تتبع کی کبھی کوشش نہیں کی، دوسرے وہ اس کو کچھ زیادہ پسند بھی نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ مولانا ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی نے الہلال کی تعریف میں سید صاحب کو ایک خط لکھا۔ تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"الہلال کا کیا کہنا مگر مجھے صرف ایک شکایت ہے، الفاظ اس قدر پیچیدہ، ترکیبیں ایسی مشکل۔ عربی الفاظ کا اس کثرت کے ساتھ استعمال وہ کرتے ہیں کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی غیر عربی داں ان کو سمجھ سکتا ہے۔ مولانا (مولانا شبلیؒ) بھی اس کے شاکی ہیں مگر ابھی نیا نشہ ہے۔ اُترتے اترتے اترے گا۔" (۱۹۱۲ء)

۳ ستمبر کے اداریہ کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا نہیں ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں، رعنائیاں اور محاسن موجود ہیں، جو مولانا ابوالکلام کے ادب کا طغرائے امتیاز ہیں، اس میں شاندار الفاظ بھی ہیں اور پرشکوہ ترکیبیں بھی۔ پرزور استعارات بھی ہیں اور لطیف تشبیہات بھی، اردو فارسی کے پسندیدہ اشعار بھی ہیں۔ اور قرآن پاک کی مقدس آیات بھی، خطابت بھی ہے اور شاعری بھی۔ اور اسی معیار سے مولانا کے سحرنگار قلم کی ہر تحریر جانچی اور پرکھی جا سکتی ہے۔

ہم ابھی یہ مضمون لکھ ہی رہے تھے کہ ایک صاحب نے ۱۵ جولائی کے "ہماری زبان" کی طرف توجہ دلائی، جس میں ظہیر احمد صاحب صدیقی لکچرار شعبۂ اردو دہلی کالج دہلی کا مولانا ابوالکلام کے ایک مجموعۂ مضامین "مضامین آزاد" پر اس سلسلہ میں بہت اچھا نوٹ شائع ہوا ہے، جو ہمارے مقصد کے بالکل مطابق ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "فاران" کراچی کے ایک مضمون "پردہ اٹھتا ہے" میں "مضامین آزاد" کے بعض مضامین کے متعلق دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ مولانا آزاد کی کاوش فکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ اس سے میرے دل میں شبہ پیدا ہو گیا اور اس کے ازالہ کے لئے میں نے مئی ۱۹۵۲ء میں براہ راست سید صاحب کو خط لکھا! درخواست کی، کہ اس مسئلہ پر وہ ازراہ کرم خود روشنی ڈالیں، سید صاحب نے ۲۵ جون ۵۳ء کو مجھے جواب سے سرفراز فرمایا! "مشہد اکبر" والے مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"...... مسجد کانپور کے واقعہ کے زمانہ میں اڈیٹر صاحب کسی مصلحت سے مہینہ دو مہینہ کے لئے مسوری تشریف لے گئے، ان کی غیر حاضری میں میری اور عمادی صاحب کی تحریریں، ان کے تصرف کے بغیر شائع ہوئیں۔ ان تحریروں میں "مشہد اکبر"، تذکارِ نزول قرآن، قصص بنی اسرائیل وغیرہ مضامین میرے ہیں، اب اس وقت نہ الہلال سامنے ہے، اور نہ مجموعۂ مضامین ابوالکلام۔ مگر جہاں تک یاد آتا ہے "حریت اسلام کے سلسلہ میں" اسلام کے نظام سیاسی کا مضمون میں نے لکھا تھا، جو اس سے پہلے الندوہ میں اسلام اور اشتراکیت کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ اس کو دوبارہ الہلال کے رنگ (یعنی اس کے صحافتی رنگ) میں لکھا۔"

اس کے علاوہ سید صاحب نے دوسروں کے لکھے ہوئے مضامین کی بھی نشان دہی فرمائی، مثلاً کشف ساق، اسوۂ نوحی اسوۂ ابراہیمی عمادی صاحب کے ہیں۔ الحرب فی القرآن مولانا عبدالسلام ندوی کا ہے۔ اور آخری دور کے الہلال کا ایک سلسلۂ مضمون "انسانیت موت کے دروازہ پر" عبدالرزاق ملیح آبادی کا ہے، سید صاحب لکھتے ہیں:-

"مگر ناشرین نے ان سب کو ابوالکلام صاحب کے نام سے شائع کیا ہے اس میں ابوالکلام صاحب کا قصور خاموشی کے سوا کچھ دوسرا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی شہرت کے لئے ہمارے قلم کے محتاج نہیں ہیں اور ہم لوگ بھی ان کے محتاج نہیں، مگر واقعہ واقعہ ہے۔"

اس کے بعد ظہیر صاحب لکھتے ہیں:

لیکن مولانا آزاد سے ان امور کے لئے رجوع کیا گیا تو ان کا یہ کہہ کر ٹال دینا کہ "میرے بھائی اگر وہ مضامین ان کے ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے" کچھ مناسب نہیں تھا۔ مولانا نے یہ محسوس نہیں کیا کہ اردو ادب میں ان کا جو مرتبہ ہے اس پر آئندہ کوئی نقاد تبصرہ کرنے بیٹھے گا تو اس کو کس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کاش مولانا ان اعتراضات کی روشنی میں جو ان کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے

ایک مدلل بیان شائع کر دیتے تو بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ دنیا سے رخصت ہو گئے، اور ان اعتراضات کے متعلق اپنے قلم سے ایک حرف نہیں لکھا۔ اس میں ان کی کیا مصلحت تھی اس کو تو وہی سمجھ سکتے تھے۔ "انسانیت موت کے دروازہ پر" کے متعلق آزاد ہند کلکتہ کے ملیح آبادی نمبر میں تو خود ان کے صاحبزادہ نے لکھا ہے۔ اس نام سے ایک کتاب مولانا ابوالکلام کے انتساب کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ مگر وہ کتاب خود مولانا ملیح آبادی کی ہے۔ تو وہ ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے

سید صاحب کی علیحدگی کے بعد ان کی جگہ انہیں کے الیاعربی و اسلامیات کا فاضل ہی پر کر سکتا تھا اس کے لئے مولانا ابوالکلام کی نگہ انتخاب ندوہ ہی کے ایک اور فارغ التحصیل پر پڑی اور وہ مولانا عبدالسلام ندوی تھے۔ جو سید صاحب ہی کی طرح الندوہ کے سب اڈیٹر رہ چکے تھے جن کے متعلق مولانا شبلی نے جب کہ وہ ابھی طالب علم ہی تھے، یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ "خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا" اور انہوں نے آگے چل کر جس طرح اپنی غیر معمولی اخذ و استنباط کی صلاحیتوں، گرانقدر علمی مضامین اور اپنی مختلف النوع اعلیٰ تصانیف سے یہ استحقاق پیدا کر لیا۔ اس سے ہم سب واقف ہیں۔ مولانا ابوالکلام نے ان کے لئے خود مولانا شبلی سے درخواست کی، اور انہوں نے بخوشی الہلال کے ادارہ تحریر میں شرکت کی اجازت دیدی، اور وہ الہلال میں چلے گئے۔ تو چونکہ مولانا شبلی کو تجربہ ہو چکا تھا کہ بغیر نام کے الہلال میں مضامین چھپنے کی وجہ سے ملک کو جتنا مولانا سید سلیمان ندوی کو جاننا چاہیئے تھا اتنا نہ جان سکا۔ اس لئے انہوں نے مولانا عبدالسلام کو لکھا:۔

> میں تمہارے مضامین دیکھتا ہوں۔ مولوی ابوالکلام صاحب اجازت دیں تو نام لکھا کرو ایسے مضامین گمنام ٹھیک نہیں، اس سے کیا فائدہ کہ ایک شخص کی زندگی گم ہو جائے، تمہاری قوت اور نمود سے بہرحال ہماری سوسائٹی کو فائدہ ہی ہوگا"

ہر رسالہ اور ہر اخبار کی الگ الگ پالیسی ہوتی ہے جس پر قائم رہنے کا اسکو بالکل حق حاصل ہے۔ مولانا ابوالکلام کی اس وقت ادبی شہرت کا شباب تھا، انہی کی نسبت سے لوگ الہلال ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ اگر اسٹاف کے مضامین اداریے یا نوٹس ان کے نام سے چھپتے تو بہت ممکن تھا کہ اس کی مقبولیت ختم ہو جاتی۔ اسلئے الہلال کی مستقل پالیسی تھی کہ اسٹاف کے مضامین زیادہ تر بے نام کے چھپیں تاکہ ان کو بھی مولانا کا سمجھ کر پوری دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھا جائے۔ اس میں قطعاً ہمارے نزدیک کسی بدنیتی کا دخل نہیں تھا جس پر مولانا کو مطعون کیا جائے، مولانا عبدالسلام الہلال میں کتنے دنوں رہے۔ اور ان مضامین کے علاوہ جن کی نشان دہی سید صاحب نے کی ہے اور کتنے مضامین لکھے، اس کا پتہ نہ ہم کو چلا نہ چل سکتا ہے، ندوہ کی اسٹرائک ندوہ کی زندگی کا ایک اہم اور تاریخی واقعہ ہے اس کی ہمدردی میں ملک کا سارا روشن خیال طبقہ تھا جس کی رہبری مولانا ابوالکلام کر رہے تھے لیکن علما میں سے ایک گروہ اس کا سخت مخالف تھا اور اس کو بدعت سمجھتا تھا۔ اس کے سرخیل مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تھے۔ انہوں نے اخبارات میں اس کی مخالفت میں پے در پے مضامین لکھے جن کا جواب مولانا شبلی کے ایما سے انہی مولانا عبدالسلام نے بہت پرزور اور مدلل دیا۔ جو الہلال میں کئی قسطوں میں انہی کے نام سے چھپا اس کا شمار الہلال کے بہترین مضامین میں ہے۔ مولانا ابوالکلام مولانا عبدالسلام کی قابلیت، صلاحیت کار اور سلیقہ تصنیف و تالیف کے ہمیشہ معترف رہے اور ان کو بڑی عزت اور محبت سے یاد کرتے تھے۔

ہم یہ بات مولانا کے "نادان دوستوں" تک کے علم میں لانا ضروری سمجھتے ہیں، کہ عمر کے آخر تک مولانا ابوالکلام کا ذہنی تعلق، شبلی، تلامذہ شبلی، اور حلقہ شبلی ہی سے تھا، کسی اور سے نہیں تھا، اس لئے اگر وہ بلاوجہ اس میں تلخی یا ناخوشگواری پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو وہ کوئی اچھا کام نہیں کر رہے ہیں، ان کو ہمارا خیر خواہانہ مشورہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر ان کو لکھنے کی صلاحیت دی ہے، تو اس سے کوئی

تعمیری اور مفید تر کام لیں، اس طرح کے مباحث میں اپنا قیمتی وقت اور صلاحیت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کو مولانا ابوالکلام اور مولانا سید سلیمان کے سوانح نگاروں کے لئے چھوڑ دیں۔ وہ اس کو انشاءاللہ آپ سے بہتر انجام دے لیں گے، اور پھر یہ بات ہر شخص کے منہ سے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ آپ کا "قطعاً" یہ منصب نہیں ہے، کہ سید صاحب کے مضامین اور طرز تحریر پر تنقید کریں پہلے ایسا بن تو لیجئے، اور اس میں اعتبار تو پیدا کر لیجئے، یہ کیا کہ قلم پکڑتے ابھی دیر بھی نہیں ہوئی۔ اور سارے زمانے پر تنقید شروع کر دی، اسی موقعہ کے لئے شاید کسی ستم ظریف نے کہا ہے ع

ایاز قدر خود بشناس

کوئی بھی آدمی جس کو لکھنے کا ذرا بھی شعور ہے، وہ دوسروں کی لکھی ہوئی چیز کو اپنی کہنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا، کہ اس سے بڑھ کر ننگ اور بے غیرتی کی بات دوسری نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ مولانا سید سلیمان جیسا غیور اور جینیس آدمی، جس کے قلم کے فیضان کی تعریف خود مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔

"آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں"!

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ؕ

یہ کتابیں آپ کے یہاں ضرور رہنی چاہئیں!

فردوس ماہر القادری کی غزلوں، رباعیات اور قطعات کا شاہکار مجموعہ، حقیقی ترقی پسند شاعری کا سدا بہار گلدستہ! قیمت: تین روپے

کاروانِ حجاز مکہ مدینہ میں کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا۔ اس کی تفصیل اور ماہر القادری کا قلم۔ بس یوں سمجھئے کہ خدا اور رسول ؐ کی محبت کاغذ پر مصور ہوتی چلی گئی ہے۔ قیمت: چار روپے

نقشِ توحید "فاران" کا "توحید نمبر" اب کسی قیمت پر نہیں ملتا مگر اس کا معرکہ آرا "نقش اول" کتابی صورت میں چھپوایا گیا ہے "نقش توحید" کا ایک ایک حرف عقائد کو درست کرتا اور شرک و بدعت کی جڑ کاٹتا ہے۔

قیمت مجلد: ایک روپیہ چھ آنے۔ غیر مجلد: ایک روپیہ

نوٹ:۔ ان تینوں کتابوں کی جو قیمتیں درج کی گئی ہیں وہ محصول ڈاک کے علاوہ ہیں۔

پتہ

مکتبہ فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

سے طلب فرمائیے

ڈاکٹر سیّد محمد یُوسف

اِبنِ خَلدُون

ابن خُلدون، جن کا پورا نام ابوزید ولی الدین عبدالرحمٰن تھا، عرب کے مشہور قبیلہ کندہ سے تعلق رکھتے تھے، نویں صدی عیسوی میں ان کا خاندان یمن سے ہجرت کر کے اندلس پہونچا۔ ان کے مورث اعلیٰ کا نام خالد تھا جو خلدونؒ[1] کے لقب سے مشہور ہوئے۔ نویں صدی سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک اس خاندان نے اندلس میں بڑی اہمیت اور شہرت حاصل کی اور اس کے بیشتر افراد ملکی سیاست سماج، ادب اور ثقافت میں نمایاں خدمات انجام دیتے رہے۔

ابن خلدون نے جو ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوئے اس مشہور و معزز خاندان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے۔ ابن خلدون کی پیدائش کے وقت ان کا خاندان سیاسی ابتری کے باعث اندلس سے ہجرت کر کے تونس میں آبسا تھا۔ وہیں ابن خلدون کا بچپن گذرا اور ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ جو قرآن، حدیث، فقہ، صرف و نحو اور شعر و ادب پر مشتمل تھی، اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ جن حالات نے اندلس سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ انہیں حالات سے شمالی افریقہ بھی دوچار تھا اور یہاں بھی حکومت اور سیاست کو قرار نہ تھا۔ چنانچہ ابن خلدون کی جوانی کا آغاز ہی تھا کہ بنو مرین نے طاقت پکڑی اور ان کا اقتدار آس پاس کے علاقوں میں بڑھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ابن خلدون کو مغرب اقصیٰ کے علماء و فضلاء سے ملنے جلنے اور علم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اب انھوں نے منطق، فلسفہ، اور عقائد میں بھی دسترس پیدا کی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر ان کے لئے بنو مرین کے دربار میں عروج کی راہیں کھل گئیں۔ یہیں سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ دربار میں اہم مناصب پر فائز رہے جو ان کی خاندانی روایت کے عین مطابق تھا۔ ایک موقع پر بنو مرین کی طرف سے میدانِ جنگ میں بھی اترے۔ بالآخر فاس میں وہ مرینی امیر ابو عنان کے سکریٹری ہو گئے، اس مرتبہ پر پہنچ کر انہیں وہ تلخ تجربے بھی اٹھانے پڑے جو بادشاہوں کے قرب اور دربار کی زندگی کے ساتھ لازمی ہیں۔ ایک وقت وہ آیا کہ بادشاہ کی ناراضگی کے باعث انہیں قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ لیکن قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا اور نئے سلطان ابو سالم نے مہربان ہو کر انہیں پھر سکریٹری اور قاضی کے عہدہ پر بحال کر دیا۔ جب ابو سالم کے مرنے کے بعد حالات ایک مرتبہ پھر ناخوشگوار ہوئے تو ابن خلدون نے یہی غنیمت سمجھا کہ انہیں غرناطہ جانے کی اجازت مل جائے۔ غرناطہ میں انہیں مشہور وزیر ابن الخطیب کی دوستی نصیب ہوئی اور وہ کچھ دنوں بنو الاحمر کے زیر سایہ مقیم رہے۔ لیکن جب ابن الخطیب کی دوستی بھی ٹھنڈی پڑتی معلوم ہوئی تو ناچار شمالی افریقہ لوٹ آئے۔ اب کی بار بنو حفص کے دربار سے وابستہ ہوئے اور خطیب اور معلّم کی خدمات پر مامور رہے۔ پھر بھی چین نہ ملا تو تلمسان گئے اور شمالی افریقہ کی آئے دن کی خانہ جنگی میں ایسے الجھ گئے کہ بعض اوقات عہد وفا کو نہ نباہ سکے، اس سے ان کے ضمیر کو ایسا دھکا لگا کہ امراء اور بادشاہوں کی دوستی و خدمت سے توبہ کر کے، قلعہ ابن سلام میں گوشہ نشین ہو گئے اور سارا وقت تصنیف و تالیف میں صرف کرنے لگے۔ ایک مدت ... طرح گذارنے کے بعد حج بیت اللہ کے ارادے سے نکلے، راستہ میں مصر میں قیام کیا اور جامع ازہر میں درس دینا

[1] "خلدون" نہیں "خلدُون" بروزن "مرہون" (م-ق)

سلطان الظاہر برقوق کے دربار میں شہرت پہنچی تو اس نے فوراً انہیں مالکی قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا جو انھوں نے قبول کر لیا۔ جہاز کی تباہی کے باعث اپنے سارے گھر والوں کی موت کا صدمہ سہنے کے بعد جب حج سے واپس آئے تو بھی قاہرہ میں قاضی رہے۔ لیکن ان میں تدبر اور سیاست کی صلاحیتیں کچھ ایسی تھیں کہ چھپائے نہیں چھپتی تھیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تیمور کے بڑھتے ہوئے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سلطان الناصر مصر سے دمشق پہنچا تو ابن خلدون بھی اس کے ہم رکاب تھے۔ الغرض مرتے وقت بھی ابن خلدون ہم کو اسی قاضی اور سیاسی مشیر کار کی حیثیت میں دکھائی دیتے ہیں جس میں کہ ہم نے ان کو عملی زندگی کی ابتدا میں دیکھا تھا۔ انھوں نے ۱۴۰۶ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

ابن خلدون نے بڑی افرا تفری کا زمانہ پایا۔ عباسی سلطنت کبھی کی پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ ہلاکو کی لائی ہوئی تباہی و بربادی کے اثرات ابھی تک اسلامی ادب اور ثقافت پر چھائے ہوئے تھے۔ اندلس میں مسلمانوں کا اقتدار آخری سانسیں لے رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی حکومتیں سب کی سب عیسائیوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود باہمی نفرت و عداوت میں مبتلا تھیں۔ شمالی افریقہ میں بھی متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم تھیں جو آئے دن خانہ جنگی میں لگی رہتی تھیں۔ ابن خلدون کے خاندان کی طرح اور کتنے ہی خاندان تھے جو امن و سکون کی تلاش میں ایک ملک سے دوسرے ملک مسلسل ہجرت کرتے رہتے تھے اور اپنی جان و مال کو ہمیشہ خطرہ ہی میں محسوس کرتے تھے۔ ایسے حالات علم و فن کی ترقی کے لئے کیا سازگار ہو سکتے تھے۔ ہر طرف ایک جمود طاری تھا اور سب کے سب پرانی لکیروں کو پیٹتے رہنا ہی اپنے فضل و کمال کی معراج سمجھتے تھے۔ ابن خلدون نے امت اسلامیہ کے اس ہمہ جہتی زوال کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اپنے دور کے مایوس کن حالات میں درباروں کے اندر رہ کر عملی حصہ بھی لیا یہاں تک کہ بعض اوقات بے اصولی اور بے وفائی سے بھی اپنے دامن کو پاک نہ رکھ سکے۔ ان میں اور دوسروں میں فرق صرف اتنا تھا کہ ان کا ضمیر مردہ نہ تھا۔ وہ واقعات گزرنے کے بعد ان کا جائزہ لیتے اور ان پر غور و فکر کرتے، اسباب و علل کا علمی انداز میں پتہ لگاتے اور نتائج سے عبرت حاصل کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ عملی زندگی سے اکتا کر گوشہ نشین ہوئے اور تصنیف و تالیف میں لگے تو انھوں نے ایک طرف تو اپنے زمانہ کی تاریخ کی وہ تفصیلات قلم بند کیں جن کا علم ان کے سوا اور کسی کو نہ ہو سکتا تھا، دوسری طرف ابتدا سے کر اپنے زمانہ تک کی تاریخ پر ایک مجموعی نظر ڈال کر طبیعت بشری اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور زوال کے وہ اصول عامہ وضع کئے جن کی بدولت شہرت عام اور بقائے دوام سے سرفراز ہوئے۔

ابن خلدون کی اہم تصنیف "کتاب العبر" ہے۔ اس کا خاکہ وہی ہے جو صدیوں سے مسلمان مورخین کے یہاں قبول عام کی سند حاصل کر چکا تھا۔ یہ خاکہ تمام توحیدی صفات کا حامل ہے۔ سارا عالم ایک وحدت ہے اور ایک ہی قانون فطرت اور قانون اخلاق سے باہم جکڑا ہوا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے تاریخ ایک خط مستقیم پر رواں دواں ہے، ہر واقعہ ایک ندرت اور اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ کسی گذرے ہوئے لمحہ کو واپس نہیں بلایا جا سکتا۔ تاریخ کی رو تکرار سے نا آشنا ہے اور کسی واقعہ کا اعادہ ناممکن ہے۔ تاریخ کا یہ تصور اس تصور سے نمایاں طور پر مختلف ہے جو بعض دوسری قوموں میں رائج تھا یعنی یہ کہ تاریخ ایک گول دائرہ کی شکل میں چکر کاٹتی اور اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تاریخ باسی اور غیر دلچسپ بن جاتی ہے۔ اس میں ماضی کے خواب تو دیکھے جا سکتے ہیں لیکن مستقبل میں کسی جدت کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ اس کے برخلاف قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ہر لمحہ نئی آن نئی شان کا مظہر ہے۔ مسلمانوں کے یہاں تاریخ کا جو غیر معمولی اہتمام پایا جاتا ہے اس کا یہی سبب ہے۔ توحیدی نقطۂ نظر ہی کے باعث مسلمانوں نے شروع سے اجنبی غیر مسلم اقوام کی تاریخ کی بابت غیر معمولی جستجو اور کاوش کا ثبوت دیا اور جیسے جیسے مواقع میسر آتے گئے۔ تاریخ عالم کو ایک وحدت کی شکل میں پیش کرتے گئے۔ ابن خلدون نے بھی یہی خاکہ ملحوظ رکھا۔ ابن خلدون کی تاریخ متعدد جلدوں میں کافی

طول طویل ہے لیکن جہاں تک خود ان کے اپنے دور سے قبل کے حصہ کا تعلق ہے اس میں کوئی جدت نہیں، نہ تو ان کے یہاں کوئی نیا مواد ملتا ہے نہ انداز بیان میں کوئی خصوصیت نمایاں ہے۔ البتہ خود ان کے اپنے دور سے متعلق ان کی تاریخ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔ بربر قبائل اور ان کے ماضی و حال سے ابن خلدون جیسی ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ کسی دوسرے کے لئے ممکن نہ تھی، ان کی لکھی ہوئی تاریخ میں جو اہم حصہ ہے وہ صرف اتنا ہی ہے جو اُن کے اپنے دور کے واقعات سے متعلق ہے۔

زندہ جاوید کارنامہ

لیکن ابن خلدون کی عظمت کا اصلی سبب کچھ اور ہے۔ ان کی اصالت اور اپج نہ تو سیاست اور حکومت کی عملی سرگرمیوں میں ظاہر ہوئی۔ نہ سکریٹری اور قاضی کے فرائض کی انجام دہی میں اور نہ تاریخ کے واقعات کو قلم بند کرنے میں، ان کا زندہ جاوید کارنامہ تاریخ نہیں بلکہ مقدمہ تاریخ ہے جو تاریخ کے بجائے تاریخ کے فلسفہ پر مشتمل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ عالم کے واقعات میں مطالعہ میں ان کا نقطہ نظر دوسروں کے نقطہ نظر سے اسی حد تک ممتاز ہے جس حد تک کہ مادی دنیا کے تغیرات میں ایک سائنس داں کا نقطہ نظر عامیوں کے نقطہ نظر سے ممتاز ہے۔ عالم کون و فساد میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں انہیں ہر آنکھوں والا دیکھتا ہے، فرق یہ ہوتا ہے کہ ایک عامی اپنے گرد و پیش کو وسیع اور لامحدود عالم کی وحدت کے ساتھ ملا کر دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ایک سائنس داں جب مادی دنیا کو عالمگیر آفاقی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے تو اسے عالمگیر قواعد اور آئین کی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے تجربات اور غور و فکر کے سہارے نظام فطرت کو دریافت کرنے اور مستقبل میں اس سے فائدہ اٹھانے کے امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ بالکل یہی عمل ابن خلدون نے تاریخ کے واقعات کے ساتھ کیا اور اسی کی بدولت انھوں نے تقلید اور جمود کے اندھیروں میں جدت کی راہیں کھولیں۔

ابن خلدون نے امت اسلامیہ کے زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس کے عروج کا تاریخ کے آئینہ میں نظارہ کیا جس طرح احساس غم توانائی رکھنے والی شخصیتوں کی عملی قوتوں کو بیدار کر دیتا ہے اسی طرح علم و فن، ثقافت و تمدن کے زوال کے ذاتی تجربہ و مشاہدہ نے ابن خلدون کی فکر و نظر کو اکسایا۔ انھوں نے قوموں کے عروج و زوال کو اسی کلی نقطہ نظر سے دیکھا جس سے کہ ایک حیاتیات کا ماہر مختلف اجسام کی صحت و بیماری، بچپن جوانی اور بڑھاپے کو دیکھتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ابن خلدون کو وہ مفروضہ ہاتھ آگیا جس سے کہ ایک سائنس داں اپنے کام کا آغاز کرتا ہے یعنی یہ کہ تہذیب و تمدن کے نشیب و فراز میں بھی ایک نظام اور قانون کارفرما ہے۔ عروج ایک انعام اور زوال قہر الٰہی سہی لیکن انعام اور قہر بھی بے سبب نہیں بلکہ بے مثال عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ اس مفروضہ کی بنا پر ابن خلدون نے تاریخ کے ذخیرہ سے وہی کام لیا جو ایک سائنس داں تجربات کی روداد سے لیتا ہے اور جن نتائج پر وہ پہنچے وہ اسی طرح حیرت انگیز ہیں جس طرح کہ سائنس اور طب کے انکشافات۔

ابن خلدون نے تاریخ کو جغرافی اور مادی ماحول سے بھی ربط دیا اور قوموں کے مزاج میں طبیعی حالات کے اثرات کی بھی نشاندہی کی۔ جغرافیہ اور تاریخ کے باہمی ربط سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان ابتداءً غیر زرخیز علاقوں میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس دور میں وہ ایک جگہ جم کر نہیں رہتا بلکہ محدود معاشی ضروریات کی تلاش میں خانہ بدوش پھرتا رہتا ہے۔ اجتماعی تنظیم نہایت سادہ ہوتی ہے۔ جان و مال کی حفاظت کا ذاتی مفاد چھوٹی چھوٹی گروہ بندی پر مجبور کرتا ہے اور قبائلی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اخلاق میں بھی سادگی اور شدت ہوتی ہے اور جنگجوئی اور جسمانی طاقت پر اعتماد ایک نمایاں صفت ہوتی ہے۔ لیکن انسان اپنی مادی ضروریات کے لئے دوسرے حیوانات کی طرح صرف فطرت کی پیداوار پر قناعت نہیں کرتا۔ اس کے برخلاف مادی ضروریات کے بارے میں کمال و جمال کی تلاش اس کی جبلت میں ہے اور خدا نے اس غرض سے تجربہ اور غور و فکر اور قوت ایجاد سے سرفراز کیا ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وحشی انسان زراعت

اور صنعت و حرفت سیکھتا ہے اور اس دور میں داخل ہوتے ہی زرخیز علاقوں پر قبضہ جما کر خیموں کے بجائے اینٹ اور پتھر کے مکانات تعمیر کر کے شہروں کی بناء ڈالتا ہے۔ انسانی فطرت کی ایک دوسری خصوصیت تعاون ہے۔ تقسیم کار کی بدولت فنی مہارت میں تنوع اور کمال پیدا ہوتا ہے۔ پیداوار بڑھتی ہے اور شہریوں کی ضروریات زندگی بہتر سے بہتر درجہ کی اور زیادہ آسانی کے ساتھ مہیا ہو جاتی ہیں۔ وقت بھی بچتا ہے اور فرصت ہاتھ آتی ہے۔ اس سب کا لازمی نتیجہ تعیش اور نفاست پسندی ہوتا ہے۔ یہ تمدن کے کمال کی انتہا ہے، اس کے بعد زوال شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اخلاق بدلتے ہیں۔ جفاکشی کے بجائے آرام طلبی، جنگجوئی کے بجائے موت کا ڈر۔ سادگی کے بجائے تکلف، ہر قسم کا بے جا اسراف اور اس کے مضر معاشی نتائج۔ ان سب وجوہ سے ایک طرف تو معاشرہ میں بیرونی حملوں سے اپنی حفاظت کرنے کی سکت نہیں رہتی، دوسری طرف خود اندر سے ایسی قوتیں ابھرتی ہیں جو تعاون اور تقسیم کار میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ یہ گویا ایک معاشرے اور ایک تہذیب کا بڑھاپا اور موت ہے لیکن ایک معاشرہ اور ایک تہذیب کی موت ایک دوسرے معاشرے کی پیدائش اور اس کی اقبال مندی کے تابع ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ اس اثناء میں وحشی اور بدوی انسانوں کا ایک اور گروہ شہریت کے دور میں قدم رکھنے کے لئے آمادہ و تیار ہو چکا ہوتا ہے اور نزدیک کے تعیش پسند شہریوں کی طرف للچائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے تا آنکہ وہ محض جسمانی طاقت اور جنگجوئی سے غالب آجاتا ہے اور سابقہ تمدن کی فنی اور مادی ثروت کا وارث بن بیٹھتا ہے۔ ابتداءً یہ وحشیوں کا گروہ جسمانی طاقت کے نشہ میں سرمست تہذیب و تمدن کے مظاہر کو پامال کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ان کا حریص و دلدادہ بن جاتا ہے اور اس طرح تازہ دم انسانوں کے گروہ پے در پے وقتی نقصانات کے باوجود تہذیب و تمدن کی گاڑی کو آگے لئے جاتے ہیں۔ ابن خلدون نے یہ اندازہ بھی لگایا ہے کہ ایک گروہ اور قوم کی عمر یعنی اوج کمال تک پہونچنے اور زوال پذیر ہونے تک کی مدت تقریباً ۱۲۰ سال ہوتی ہے۔

موجودہ زمانہ کے مبصرین کا کہنا ہے کہ ابن خلدون کا یہ کلیہ اس حد تک تو بالکل صحیح اترتا ہے جہاں تک اسلامی سلطنت اور تہذیب و تمدن کا تعلق ہے وادی سندھ سے لے کر طنجہ اور اندلس تک جہاں اسلام پھیلا اور مسلمانوں کی حکمرانی رہی وہاں یہی صورت حال ہے کہ جابجا زرخیز علاقے ہیں اور ان کے بیچ بیچ ریگستان، صحرا اور بنجر علاقے ہیں مثلاً ریگستان عرب کے شمال اور مشرق میں وادی دجلہ و فرات کا زرخیز علاقہ ہے یا وادی نیل کے دونوں طرف ریگستان ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہزاروں برس سے یہی ہوتا آیا ہے کہ پہاڑی صحرائی اور ریگستانی علاقوں سے تازہ بہ تازہ نو بہ نو غیر متمدن گروہ پاس کے زرخیز علاقوں کی متمدن حکومتوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ایک مدت کے بعد خود متمدن ہو کر کسی دوسرے غیر متمدن گروہ کا شکار بن جاتے ہیں۔

دنیائے اسلام کے باہر بھی ابن خلدون کے نظریہ کا ہر جز و اور اس کی ہر ہر تفصیل صحیح نہ سہی لیکن ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور دوسری اُبھرتی ہوئی تہذیب کے باہمی ربط کی بابت جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس میں بڑی گہری صداقت ہے۔

حکومت و سلطنت کی بابت ابن خلدون نے کچھ اور باتیں بھی بڑے پتہ کی کہی ہیں: ان کا خیال ہے کہ حکومتوں کے تحفظ و بقا کے لئے ایک نہ ایک قوم کا غلبہ ضروری ہے۔ اسی کی بدولت عام ملک میں اطاعت شعاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور امن و اطمینان قائم رہتا ہے۔ البتہ غلبہ اسی قوم کو حاصل ہوتا ہے جس کے افراد میں عصبیت پائی جاتی ہو۔ عصبیت سے ابن خلدون کی مراد یگانگت کا احساس اور حمیت کا جذبہ ہے خواہ وہ کسی بھی بنیادوں پر قائم ہو۔ یہ جذبہ غیر متمدن قبائل میں بہت قوی ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں کے حالات میں ہر لحظہ اس کی یاد دہانی ہوتی رہتی ہے کہ ذاتی حفاظت کا دارو مدار قبیلہ کے اتحاد و وابستگی ہی پر ہے۔ لیکن یہ عصبیت اگر بہت ہی تنگ دائروں میں محدود ہو تو کسی وسیع نظام کے قیام میں مانع بھی ہوتی ہے۔ چھوٹے

چھوٹے قبیلے اگر محدود عصبیت کی بنا پر باہمی لڑائیوں میں اپنی قوت ضائع کرتے رہیں تو کسی وسیع تر نظام حکومت کا قیام ناممکن ہوگا۔ چنانچہ اسلام سے پہلے عربوں کی یہی کیفیت تھی۔ اسلام نے محدود قبائلی عصبیت کو لامحدود نظریاتی عصبیت میں تبدیل کردیا اور اسی کی بدولت عرب اس قابل ہوئے کہ تاریخ میں پہلی بار کل جزیرۂ عرب میں ایک مرکزی حکومت قائم کریں اور تھوڑے ہی عرصہ میں سندھ سے لے کر اندلس تک اپنی حکمرانی اور جہانبانی کا سکہ بٹھادیں۔ اسی بناء پر ابن خلدون یہ نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ "دین" باہمی یگانگت اور حمیت کا وہ جذبہ پیدا کرسکتا ہے جو ایک وسیع سلطنت کے مختلف اجزاء کو ایک جھنڈے تلے متحد رکھے اور غیروں کے مقابلہ کی طاقت دے۔

مقدمہ میں ابن خلدون نے تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں سے بحث کی ہے۔ منجملہ ان کے علوم و فنون کی تاریخ اور تعلیم کے طریقے بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ عالم اسلامی کے تقریباً تمام حصوں میں تعلیم کی ابتداء قرآن سے کی جاتی ہے لیکن کہیں تو صرف قرآن پڑھایا جاتا ہے جیسے مغرب اقصیٰ میں اور کہیں قرآن کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے متعلقہ علوم صرف و نحو، شعر و ادب بھی پڑھائے جاتے ہیں جیسے اندلس میں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اندلس والے زبان و ادب میں ماہر ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ابن خلدون کے زمانے میں اس خیال کے بھی تھے کہ پہلے عربی زبان و ادب اور ریاضی اور حساب کی تعلیم دینا چاہیئے پھر جب بچہ سمجھنے کے قابل ہوجائے تب قرآن پڑھانا چاہیئے، اس کے بعد اصول فقہ، حدیث اور دوسرے علوم۔ اس خیال کے لوگوں کا کہنا تھا کہ بغیر سمجھے طوطے کی طرح قرآن پڑھنا لاحاصل ہے۔ ابن خلدون بھی اس خیال کے حامی ہیں اس لئے کہ یہی طریقہ اعلیٰ اصول تعلیم کے مطابق اور سود مند ہے البتہ وہ اس کو اسی صورت میں نافذ کرنے کی حمایت کرتے ہیں جبکہ اس کا یقین ہو کہ بچہ آخر تک تعلیم جاری رکھ سکے گا ورنہ اگر درمیان میں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قرآن اور اس کی برکتوں سے محروم ہوجائے گا۔

ابن خلدون کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاشیات، سیاست و حکومت، عقائد و نظریات، علوم و فنون، صنعت و حرفت، تجارت، تہذیب و تمدن سب کو ایک جسم کی طرح وحدت شمار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی عمل کے تمام شعبوں کے مابین وہی تعلق ہے جو جسم کے مختلف اعضاء میں ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو دوسروں کے ساتھ نسبت دیکر دیکھنا اور سمجھنا چاہیئے۔ ابن خلدون نے انسان کی ساری زندگی کو ایک نظر میں دیکھا۔ انھوں نے جزوی طور پر واقعات اور تاریخ کے افراد کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ قوموں کی پوری کی پوری سرگزشت، بچپن سے لے کر عروج اور زوال تک ایک لمحہ میں اپنی بصیرت کے آگے سمیٹ کر رکھ لی۔ اسی کی بدولت انھوں نے فلسفہ تاریخ کے موجد کا لقب پایا اور اس حیثیت سے وہ ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اس وقت میں جب کہ مسلمانوں پر ہر طرف اور ہر طرح جمود ہی جمود چھایا ہوا تھا ابن خلدون نے اپج اور جدت کی ایسی نادر مثال قائم کی جو تمام عالم اسلامی کے لئے مایۂ ناز ہے۔ نہ صرف یہ کہ ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ پر فخر کیا جاسکتا ہے بلکہ آئندہ زندگی میں اور ایک نئی ابھرتی ہوئی قوم کے مستقبل کی تعمیر میں ان کی بصیرت سے فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے، ان کی حکمت کا نچوڑ یہ ہے کہ مادی طاقت اور خوشحالی انسان کی نفسیات اور اخلاق بدل دیتی ہے اور یہ اخلاق کی تبدیلی بالآخر مادی طاقت کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ اس لئے جو قوم دنیا میں سربلند رہنا چاہتی ہے اس کا فرض ہے کہ تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاق و سیرت پر کڑی نظر رکھے۔

(بہ شکریہ، ریڈیو پاکستان)

غلام مصطفیٰ سما انصاری لکھنوی

نظامِ اُردو کی تشریح

اضافہ و تحقیق کے ساتھ

دُنیا کی تمام زبانوں میں صحیح اور فصیح ادبا کی زبان سمجھی جاتی ہے جو مفاہیم ادا کرتے وقت انتخاب الفاظ میں موقع محل کے حساب سے مناسبت الفاظ و صحت کلمات کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں۔ انہیں لوگوں کو اسلوب سے ہر بات بیان کرنے کے لئے مختلف الفاظ کی زیادہ ضرورت پیش آتی رہتی ہے اور مترادف الفاظ بھی انہیں کے دماغوں میں نسبتاً زیادہ سے زیادہ محفوظ ہوتے ہیں جن کو حسب موقع یہ حضرات استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہ ادبا و فصحا کا گروہ بیشتر متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کو زبان کی حقیقت سمجھنے میں اوروں کے مقابلہ میں زیادہ مواقع بھی ملتے ہیں اور یہی لوگ زبان کی خدمت میں .... زیادہ پیش پیش بھی رہتے ہیں۔ ان ادبا و فصحا کے گروہ میں بھی وہ حضرات زیادہ مستند سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اُلجھی گتھیوں کو سُلجھایا ہے اور دلائل کے ساتھ ہر نکتہ کو سمجھایا ہے۔ بااُصول طریقوں سے زبان میں تراش خراش ترقی و توسیع ایسے ہی حضرات کا کام رہا ہے اور ایسے ہی لوگوں نے زبان کے لئے قواعد و اصول و ضوابط بھی مُرتب و معیّن کئے ہیں جن کی ضرورت کو ہر اہل نظر اور اہل علم بخوبی سمجھتا ہے کیوں کہ بغیر قواعد و اصول کوئی زبان متمدن نہیں مانی جا سکتی۔ اگر ہر متنفس چاہے اہل ہو یا نہ ہو اپنے اختراع سے زبان میں نامناسب اضافے کرتا ہے تو ایسی زبان ایک گورکھ دھندا بن کر رہ جائے گی۔ ہمارے ان جواں فکر و جواں سال ادبا و شعرا کا جوش عمل اور یہ کوشش کہ اردو زبان کی کم مائیگی بہترین اظہار مفاہیم کے ذرائع سے بدل کر اعلیٰ درجہ کی زبان ہو جائے نہایت درجہ قابل قدر ہے لیکن اپنی زبان کا مزاج سمجھنا اور قواعد کی رہبری میں کوئی معیار قائم کرنا اشد ضروری ہے۔ بامحل اور صحیح استعمال الفاظ سے بیان میں جو حسن پیدا ہوتا ہے اور غلط استعمال سے جو خرابی اور نقصان ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً میر انیس کا ایک مصرع ہے: "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا" اگر اوس کی جگہ شبنم کہیں تو سلاست و روانی کا خون ہونے کے علاوہ بہت بڑی معنوی خرابی پیدا ہو جائے گی کیوں کہ اوس کھانا ایک استعمال مستقل ہے جس کے معنی شبنم کی تری سے تازگی پیدا ہونا ہے۔ لہٰذا اگر شبنم کھانا کہیں تو غلط ہوگا۔ اوس کے ساتھ تین افعال کا یوں استعمال ہوتا ہے۔ اوس کھانا۔ اوس پڑنا۔ اوس گرنا۔ اوس کھانے کے معنی شبنم سے تری حاصل کرنا ہے۔ اوس پڑنے کے معنی۔ کوئی خرابی واقع ہونا یا کسی امید کا ناامیدی سے بدل جانا ہے۔ شبنم گرنا اور اوس گرنا ہم معنی ہیں ایک چوتھی صورت اوس چاٹنا ہے یہ سانپ کے لئے مخصوص ہے جیسے نسیم لکھنوی فرماتے ہیں "لہرا لہرا کے اوس چاٹی ؛ بن میں کالوں نے رات کاٹی"۔ اور اسی طرح ایک لفظ سمونا ہے جس کے معنی تیز گرم اور سرد پانی کو ملا کر قابل برداشت گُنگُنا بنا لینا ہے اس کو بھرنے کے معنی میں استعمال کرنا غلط اور غیر ضروری ہے کیوں کہ مصدر بھرنا موجود ہی ہے یا کم نگاہی کو نظر کی کمزوری کے معنوں میں استعمال کرنا بھی صحیح نہیں اس لئے کہ یہ بھی ایک محاورہ ہے اور ایک مستقل معنی رکھتا ہے ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو غلط استعمال ہو کر غلط فہمی کا سبب بنے ہوتے ہیں بہرحال اس تمام تمہید کا

مقصد صرف یہ ہے کہ کوئی اصول و معیار زبان کی توسیع و ترقی کے لئے ہونا چاہیے جس کی ضرورت کو ادبا و فصحا خود بھی محسوس کرتے ہونگے اس سلسلہ میں حضرت علامہ آرزو لکھنوی اعلی اللہ مقامہ کی وہ بے مثل تصنیف جو "نظام اردو" کے نام سے ایک بار چھپ چکی ہے لیکن اختصار عبارت کی وجہ سے عام فہم نہیں یہاں میں کوشش کروں گا کہ اس دقت کو ممکن حد تک دور کردوں تاکہ جس قدر اس تصنیف سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اٹھایا جائے۔ اس تشریح میں، میں نے کہیں کہیں نوٹ کے ساتھ اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہے جس کو متن کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔

علامہ آرزو مرحوم کی متذکرہ بالا تصنیف جو انھوں نے قوم کی خدمت میں پیش کی تھی۔ وہ کوئی ضخیم کتاب نہیں بلکہ چھیاسی صفحات کا ایک مختصر رسالہ سمجھئے مگر کوزہ میں دریا بھرا ہے۔ مصنف مرحوم نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ تحقیق اجزائے زبان کے متعلق ہے اور دوسرا تنسیق اجزائے زبان کے بارے میں ہے۔ پہلا حصہ اجزائے حقیقی و غیر حقیقی۔ اجزائے اصولی اور تکمیلی۔ بحث ناقصات و مرکبات۔ بیان متروکات و معیار صحت کلمات۔ مضرت ترک الفاظ ضروری اور اضافۂ الفاظ کی ضرورت اور اضافوں کے طریقہ کار مشورہ پر مشتمل ہے۔ تنسیق اجزائے زبان کے حصہ میں اصول فصاحت بیان کئے گئے ہیں جس میں ربط معنوی۔ حیثیت الفاظ۔ خصوصیات ترکیب ہندی و فارسی وغیرہ کو سمجھایا گیا ہے اور استعمال سماعی و قیاسی کی حدیں بتائی گئی ہیں تصرفات جائز و ناجائز کا ذکر اور محل استعمال الفاظ کی بحثیں ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کے خیال ہوتا ہے کہ مصنف نے ان مسائل کے حل کرنے میں نہ جانے کتنی راتیں جاگ کے کاٹی ہونگی اور خدا جانے کتنی گتھیوں کو ان تھک کوششوں سے سلجھایا ہوگا اردو ایک ایسی زبان ہے جو مختلف اجنبی قوموں کے میل جول سے عالم وجود میں آئی اور جس میں بالکل جداگانہ نسلوں کی زبانوں کے الفاظ شامل ہوئے اس کے لئے قواعد و اصول و فصاحت مرتب کرنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا اردو میں فارسی اس کے ساتھ عربی الفاظ اور عربی کے جلو میں معرب یونانی۔ لاطینی۔ عبرانی۔ سریانی الفاظ پھر ترکی۔ پشتو وغیرہ اور ہندوستان بھر کی مختلف زبانوں کے الفاظ کا مجموعہ یہ اردو زبان کہلائی۔ ان سب کے علاوہ انگریزی۔ فرانسیسی وغیرہ زبانوں کے الفاظ اردو میں شامل ہوتے اور ہوتے رہتے ہیں اب اس اردو زبان کے مختلف الوضع الفاظ میں سے ایک قسم الفاظ کے لئے جو قاعدہ بنایا وہ دوسری قسم الفاظ پر منطبق نہیں ہوسکتا تھا لہذا ایک ایک طرح کے مجموعۂ الفاظ کے لئے الگ الگ اصول و قواعد بنانے پڑے ہونگے اور ان مجموعۂ الفاظ کے لئے وجوہ امتیاز قائم کرکے امتیازات کی مناسبت سے کل مجموعۂ الفاظ کے لئے ایک مجموعی نام رکھنا پڑا ہوگا پھر اردو کے اجزائے حقیقی و غیر حقیقی بھی امتیازات اور اجزائے اصولی و تکمیلی کا فرق۔ کلمات میں تغیر اور تغیر کے بعد ان کے استعمال کا محل اور طریقہ۔ توسیع زبان یعنی زبان اردو میں اضافہ جس ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اس کے لئے اصول قائم کرنا پڑی جان لیوا محنت کا کام تھا جس کی اہمیت قواعد بنانے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ زبان کی ساخت کو اچھی طرح سمجھنے والا اور غیر معمولی ادبی سلیقہ و شعور رکھنے والا ہی ایسے کام انجام دے سکتا ہے جس کے لئے ایک عمر کی محنت بھی درکار ہے۔ ان تمام دقتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب متن کتاب کی جانب توجہ فرمایئے۔ جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ زبان اردو متعدد زبانوں کے مختلف الوضع الفاظ کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو بجائے خود ایک مستقل اور زندہ زبان ہے۔ جسکی وضع و ساخت سمجھنے کے لئے دو چیزیں قابل لحاظ ہیں۔ اول تحقیق اجزائے زبان دوم تنسیق اجزائے مذکور۔ تحقیق اجزائے زبان کے سلسلہ میں یہ بات سب سے پہلے سمجھ لینے کی ہے کہ اجزائے زبان اردو صرف وہی الفاظ ہیں جنہیں ذوق ادبا و فصحائے اس زبان کے موافق مزاج پاکر بجنسہٖ قبول کرلیا ہے یا وہ الفاظ ہیں جنہیں موافق مزاج بنالیا گیا ہے باقی تمام ان زبانوں کے الفاظ جن کے میل سے اردو بنی اُن زبانوں کے سب الفاظ داخل زبان اردو نہیں جیسے "پاؤں اور گوڑ" دونوں ہندی ہیں مگر پہلا داخل زبان اور دوسرا خارج یا ابرو اور ریغ دونوں فارسی زبان کے لفظ ہیں۔ ان میں پہلا اردو میں مستعمل اور دوسرا غیر مانوس و غریب ہے۔ بعضے الفاظ

ایک ایک معنی میں داخلِ اُردو اور دوسرے معنوں میں خارج ہیں جیسے جھاڑ بمعنی آلہ روشنی اردو زبان میں شامل اور بمعنی درخت استعمال فصحا میں نہیں ہے یا منت بمعنی خوشامد داخل اردو اور بمعنی احسان صرف ترکیب فارسی سے لائق استعمال ہے۔ الغرض تمام وہ الفاظ جو بکثرت روزمرہ کی گفتگو میں ادبا و فصحا کی زبانوں پر عموماً آتے رہتے ہیں وہی اُردو کے اجزائے ترکیبی ہیں ورنہ اجزائے غیر جو برائے تزئین یا عبارت کو رنگین بنانے کے لئے اور نثر کو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے حسب ضرورت کام میں لائے جاتے ہیں جن کی ضرورت شاعر اور نثر نگار دونوں کو پیش آتی رہتی ہے۔ مثلاً صبح و شام بولنا داخلِ عادت اور صبح و مسا کا استعمال داخل عادت نہیں مگر بربنائے ضرورت نظم صبح و شام کی جگہ صبح و مسا، دن رات کی جگہ روز و شب استعمال ہوتے رہتے ہیں اور حسن نظم کی وجہ سے ثقیل نہیں، معلوم ہوتے۔

اب اجزائے ترکیبی میں بھی وہ کلمات کہ خود ہی اُردو کے موافق مزاج ہیں دو طرح کے ہیں یعنی اجزائے حقیقی و اجزائے غیر حقیقی اور وہ کہ اردو کے موافق مزاج بنالئے گئے اپنے محل پر ذکر کئے جائیں گے۔ اجزائے حقیقی ہندی۔ فارسی اور عربی کے وہ الفاظ ہیں جن کا اُردو میں کوئی دوسرا بدل نہیں اور جن کے بغیر تکمیل زبان محال ہے کیوں کہ مذکورہ زبانوں کے بہت سے الفاظ مستقلاً داخلِ زبان اور اپنے معنی میں منفرد ہی موجود ہیں۔ جیسے۔ گٹا۔ کہنی۔ پسلی۔ کوڑی وغیرہ اعضائے جسم کے نام ایسے ہندی الفاظ ہیں جن کا فارسی یا عربی بدل اُردو میں مستعمل نہیں۔ یا شانہ۔ بغل۔ کمر۔ فارسی ہیں جن کی جگہ عربی یا ہندی کے الفاظ نہیں لے سکتے۔ اسی طرح اعتبار۔ انتظار۔ اختیار وہ عربی الفاظ ہیں جن کے فارسی و ہندی مفرد بدل نہیں، لہٰذا اس طرح کے تمام الفاظ اُردو کے اجزائے حقیقی ہیں جو اس کی بنیاد کو مشترکہ بتاتے ہیں باقی وہ الفاظ جو ضرورتاً استعمال کرلئے جاتے ہیں وہ اجزائے غیر ہیں یعنی وہ الفاظ جو عادتاً زبان پر نہیں آتے بلکہ بعض ایسے مفاہیم جن کے ادا کرنے کے لئے معتدل الفاظ نہیں تو غیر معتدل الفاظ سے کام نکالا جاتا ہے۔ عربی فارسی اور ہندی کے علاوہ بھی کچھ زبانوں کے الفاظ ہیں جو اپنے معنی کے اعتبار سے منفرد ہیں لیکن اُن کو اجزائے حقیقی میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ اُردو ایک مستقل زبان بن چکی تھی جب وہ زبان میں شامل ہوئے اور یہ بھی ہے کہ ان کے بغیر بھی اُردو زبان اُردو زبان رہے گی صرف نو ایجاد چیزوں کے نام اپنی زبان میں اختراع کرنا ہونگے۔ اس کے برخلاف اگر عربی و فارسی کے سب الفاظ نکال دیئے جائیں تو اظہار مطالب میں اردو زبان عاجز نظر آئے گی۔ ہندی الفاظ تو نکالے ہی نہیں جاسکتے کیوں کہ انہیں پر زبان کی بنیاد ہے۔

مذکورہ اجزائے حقیقی بھی دو طرح کے ہیں۔ اصلی اور تکمیلی۔ اجزائے اصولی صرف ہندی اور فارسی الفاظ ہیں کیوں کہ انہیں کی آمیزش سے اُردو کا ہیولا قائم ہوا اور انہیں کے قواعد صرف و نحو اپنی اپنی حدوں میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ اجزائے تکمیلی عربی زبان کے الفاظ ہیں جو اکثر قواعد ہندی و فارسی کے زیر اثر قلت لفظی کو پورا کرنے میں معین رہا کرتے ہیں (نوٹ میرے خیال میں اب اسی قبیل میں وہ انگریزی فرانسیسی وغیرہ کے الفاظ بھی سمجھے جانا چاہیئے جن کی ثقالت ہمارے لہجہ نے دور کردی ہے اور وقت ضرورت ہم اپنی تقریر و تحریر میں استعمال کرتے رہتے ہیں جیسے۔ انجن۔ لالٹین۔ کرکٹ۔ اسپتال۔ موٹر وغیرہ)

بہرحال اجزائے اصولی اُنہیں زبانوں کے الفاظ مانے جائیں گے جن سے محض الفاظ ہی نہیں بلکہ قواعد صرف و نحو بھی لئے گئے ہیں اس کے باوجود اجزائے اصولی کی دو قسمیں ماننا پڑیں گی یعنی بنیادی اور امدادی۔ اجزائے بنیادی صرف اس زبان کے الفاظ ہیں جن سے بلا شرکت عربی و فارسی کوئی ایسا جملہ بالکل اُسی زبان کے قواعد سے بن سکے جس کو اُردو کہا جاسکے یہ صلاحیت ہندی الفاظ کے سوا کسی زبان کے الفاظ میں نہیں۔ چنانچہ حضرت مصحفی کا یہ شعر اس دعوے کا ثبوت ہے ؎

"تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو　　رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے"

نوٹ (مزید ثبوت کے لئے خود جناب آرزو مرحوم کا پورا دیوان غزلیات "سریلی بانسری" کے نام سے موجود ہے جس میں اس قید کے تحت مظاہرہ قادر الکلامی کے علاوہ متعدد ایسے اشعار ہیں جو شاعری کا معجزہ معلوم ہوتے ہیں مثال کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں)

مطلع : کہاں نبھ سکا بن کے انجان جانا جھجکنا مرا اس کا پہچان جانا

شعر: بیڑا ہو پار کیا بھلا باندھا ہے اُس سے آسرا کھول کے ناؤ لے چلے دھالیے پہ لا کے چھوڑ دے

مقطع: اس نے لبھا کے آرزو بدلی ہے مجھ سے آنکھ یوں جیسے کوئی چھڑک کے تیل آگ لگا کے چھوڑ دے

ایک اور شعر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا نہ تمہیں دیکھا ایک نے بھی کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹا ہے

برخلاف اس کے کلمات غیر ہندی سے بلا شرکت الفاظ ہندی کوئی ایسا جملہ نہیں بن سکتا جسے اردو کہہ سکیں۔ جیسا مرزا غالب مرحوم کے ان دو مطلعوں سے ظاہر ہے۔

"شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا"

"شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا"

ان کو صرف آمد کی جگہ آیا اور بود کی جگہ تھا کہنے سے اردو مانا گیا ورنہ فارسی مطلع ہوئے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُردو کے اجزائے بنیادی ہندی اور اجزائے امدادی غیر ہندی الفاظ ہیں (نوٹ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہندی سے مراد وہ دیوبانی نہیں جس کو بھارتی ہندی کہتے ہیں اور جس سے سادہ روزمرہ کے الفاظ نکال کر مُردہ و ثقیل سنسکرت الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے شامل کئے جا رہے ہیں۔ مصنف کی مراد ہندی سے کچھ اور ہے جو انہیں کے الفاظ میں یوں ہے)

ہندی سے مراد ہندوستان بھر کے ہر حصہ کی زبانوں کے الفاظ سے ہے یعنی لفظ ہندی میں یائے نسبتی ہے جو اندرون ملک کی تمام زبانوں کے ان الفاظ کو جو اردو میں غیر منقسم ملک ہند کی طرف منسوب کر رہی ہے۔ جیسے "منڈا" پنجابی زبان کا لفظ ہے اور اردو میں تبدیل معنی کے ساتھ داخل زبان ہے۔ اور "کیس" بنگالی "آٹا" بھاشا۔ اور ننھا گجراتی زبان کا لفظ ہے۔

چُورن جو سنسکرت میں واو۔ رے۔ اور نون تینوں کے سکون سے صحیح ہے اور معنوں کے اعتبار سے ہر سائدہ چیز کو کہا جا سکتا ہے اُردو میں چُورن۔ اول ضمہ اور رے مفتوح بمعنی ایک خاص قسم کی دوائے ہاضم کے ہیں۔ یہی حالت فارسی میں بھی ہے کہ رستم و سہراب وغیرہ ژندی چلم و چق ترکی کے علاوہ عربی کے ساتھ عبرانی و سریانی اور یونانی الفاظ بھی اگر شامل ہو گئے مگر مخلوط فارسی میں کسی دوسری زبان کے الفاظ کو کوئی امتیازی حیثیت نصیب نہیں ہوئی سوا عربی الفاظ کے کہ وہ اپنی اصلی صورت میں اپنے کو پہچنوائے رہتے ہیں اسی لئے انہیں بھی اجزائے حقیقی میں ایک جزو مستقل کی حیثیت سے شمار کرنا پڑتا ہے۔ فارسی کی طرح اردو میں بھی قبول اثر کے بعد مختلف زبانوں کے الفاظ اُردو کے جزو ذات بن گئے جس طرح ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جذب ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ اپنی اصل گم کر دے۔ جیسے لفظ "شطرنج" کہ یہ طے نہیں کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے لہٰذا اب جس زبان میں بولا جائے اُسی کا جزو ذات ہے۔ دوسرے قبول اثر سے کسی طرح کا تغیر ہو جائے۔ یعنی صوری یا معنوی تبدیلیوں کے بعد اپنی اصل سے غیر ہو جائے۔ انہیں اثرات کی بنا پر کلمات غیر ہندی حکم اردو میں آجاتے ہیں اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بغیر تغیر وہ اردو کے موافق مزاج نہ تھے ان تغیرات کے دو نام ہیں۔ مہند صوری اور مہند معنوی۔ صوری تغیر دو طرح کے ہیں مستقل اور غیر مستقل۔ مستقل تغیر وہ ہے جس سے لفظ اپنی اصل کی طرف پلٹ نہ سکے جس کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی لفظ سے کوئی حرف کم ہو جائے جیسے "کاہ گل" سے کہگل۔ صابون سے صابن۔ دوسری یہ کہ

کوئی حرف لفظ میں بڑھ جائے جیسے "کان سے کھان" چوتھی یہ کہ حروف وحرکات دونوں میں تبدیلی ہو جائے جیسے افشردہ سے آبشورہ۔ خرپزہ سے خربوزہ۔ پانچویں یہ کہ صورت ومعنی دونوں بدل جائیں جیسے "آرماں" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی وضعی حسرت وافسوس کے ہیں لیکن اردو میں الف غیر ممدودہ اور اعلان نون کے ساتھ بولا جاتا ہے اور تمنا کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ با افراط و تفریط سے افراتفری کہ نہ وہ صورت رہی نہ وہ معنی۔ ایسے ہی تغیرات سے دوسری زبانوں کے الفاظ اُردو کے موافق مزاج بنکر مستقلاً اس کے جزو ذات ہو گئے ہیں جن کو اضافت فارسی کے ساتھ ستعمال کرنا غلط ہے۔ مگر صرف حرکت کی تبدیلی یا تخفیف یا تشدید سے نہ لفظ کی صلیت مٹتی ہے نہ وہ اردو کہا جاسکتا ہے۔ جیسے نُقاب۔ کَلمہ۔ عَمامہ کہ صل میں یہ نِقاب۔ کلِمہ اور عِمامہ ہیں یا اور اسی طرح کے الفاظ جو محاورہ عام میں غلط العام کہے جاتے ہیں۔ ایسے جتنے الفاظ ہیں سب جس جس زبان کے ہیں اُسی زبان کے مانے جائیں گے

غیر مستقل وہ تغیر ہے جس سے لفظ اپنی صل کی طرف پھر واپس آسکے۔ یہ تغیر کسی جزو کے اضافہ سے رونما ہوتا ہے اور جب جزو زائد دور کر دیا جائے تو صل لفظ رہ جاتا ہے یہ اضافے مصدروں کے اختراع اور صیغوں کے اشتقاق سے ہوتے ہیں۔ جیسے قبولنا۔ بخشنا۔ شرمانا۔ گرمانا وغیرہ۔ اسم مذکر بنانا جیسے بخش سے بخشو۔ یہ واو معروف۔ اسم مونث بنانا۔ جیسے شریف سے شریفن رحم سے رحمو۔ بخت سے بختو۔ یہ واو مجہول۔ مصغر کرنا۔ جیسے دیگ سے دیگچی۔ چمچہ سے چمچی۔ واحد کی جمع بنانا جیسے غنچہ سے غنچے۔ شمع سے شمعیں۔ بلبل سے بلبلیں۔ ان تمام الفاظ سے اگر جزو زائد دور کر دیا جائے تو اپنی صل پر آجائیں گے مگر جب تک صورت بدلی رہے گی غیر زبان کا لفظ بھی اُردو قاعدہ کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اردو ہی کہا جائے گا اور صرف اردو قاعدہ سے ستعمال ہوگا۔ مہند معنوی وہ کلمات غیر ہندی ہیں جن کے معنی اردو میں بدل گئے ہیں۔ جیسے روزگار بمعنی ذریعہ معاش اردو ہے اور بغیر ترکیب فارسی لائق ستعمال ہے مگر زمانہ کے معنوں میں فارسی ہے اور بغیر ترکیب فارسی لائق ستعمال نہیں ورنہ وہی معنی سمجھے جائیں گے جو مہند معنوی کی حیثیت سے اس لفظ کے معنی سمجھے جاتے ہیں۔ (نوٹ لفظ روزگار کو میر نے یوں بھی ستعمال کیا ہے فرماتے ہیں۔ شعر میر:۔

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات　　اب یہی روزگار ہے اپنا

اور عرصہ بمعنی میدان عربی ہے اور بغیر ترکیب فارسی لائق ستعمال نہیں۔ جیسے "عرصہ حشر وغیرہ۔ مگر بمعنی مدت بغیر ترکیب فارسی ہی ستعمال ہونا چاہیئے۔ مرزا غالب مرحوم نے عرصہ کو بمعنی مدت یوں ہی ستعمال کیا ہے۔ شعر

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو　　عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

(نوٹ عرصہ کی طرح۔ دریا۔ غصہ بھی بمعنی ندی اور غیض[۱] وغضب بغیر ترکیب فارسی ستعمل ہیں) کچھ ایسے عربی الفاظ ہیں جو صیغہ تثنیہ و جمع ہیں مگر اردو میں بصیغۂ واحد ستعمل ہیں جیسے نعلین اور حور انکے صیغہ ہائے واحد نعل وحور اردو میں ستعمل نہیں نعل صرف گھوڑے کے کھُروں میں جو موٹی لوہے کی پتی جڑی جاتی ہے اس کو کہتے ہیں۔ جوتہ کے لئے نعل کبھی نہیں بولا جاتا چونکہ نعلین اور حور اُردو میں واحد ستعمل ہیں لہٰذا انکی جمع بھی اردو قاعدہ سے نعلین اور حوریں بنیں جن کو جمع الجمع سمجھنا غلط فہمی ہے۔ الفاظ غیر ہندی کی طرح ہندی الفاظ میں بھی تغیرات ہوئے ہیں جیسے تروار سے تلوار۔ بادر سے بادل چندرما سے چاند اور سنسکرت لفظ واری سے پانی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کلمات غیر ہندی کا عموماً اور ہندی الفاظ کا خصوصاً اپنی صل سے ہٹ کے صحیح اور فصیح قرار پانا اردو کے ایک الگ اور مستقل زبان ہونے کی قوی ترین دلیل ہے۔

---

[۱] حیرت ہے فاضل مضمون نگار بھی "غیظ" کو "غیض" لکھتے ہیں (م۔ق)

بحث تفریق اجزائے زبان بہ اعتبار نقص و کمال

اجزائے زبان اپنے نقص و کمال کے اعتبار سے دو طرح کے ہیں - ایک وہ کہ اپنی وضع پر قائم اور انفراداً لائق استعمال ہیں جیسے
ہار جیت - ان کو مفردات تام کہتے ہیں دوسرے وہ کہ انفراداً صلاحیت استعمال نہیں رکھتے یہ اجزائے ناقصات ہیں - ناقصات کئی طرح
کے ہوتے ہیں ایک وہ جو وضعی صورت پر اپنے معنی آپ نہ ظاہر کر سکیں - جیسے دردانگیز - وحشت خیز - عطردان - لالہ زار - ہوشیار - مالدار
گاڑی وان وغیرہ میں جزو دوم - یہ الفاظ غیر مستقل کہلاتے ہیں - دوسرے وہ کہ بسبب تخفیف اظہار معنی میں عاجز ہوں - جیسے بے آب
سے بیاباں ہو کر اس کے اجزائے ترکیبی نہ علیحدہ نظر آتے ہیں نہ اپنے معنی خود ظاہر کر سکتے ہیں - یا پانی گھاٹ سے پنگھٹ بن کر دونوں مفردات
تامہ ناقص بن گئے یا گیند دھڑکا - دھوم دھڑکا میں جزو دوم دھڑکا سے دھڑکا ہو کر ناقص بن گیا - اور نہیں پر تو گمان بھی نہیں
ہوتا کہ یہ ناقص ہے حالانکہ نہ اور ہی سے بنا ہے نہ حرف نفی اور ہی ایسا لفظ ہے کہ اسم کے ساتھ حصر اور فعل کے ساتھ تاکید کا
فائدہ دیتا ہے جو کثرت استعمال سے مخفف ہو کر نہیں بن گیا - مثلاً بغیر تاکید کہیں گے کہ "یہ کام نہ ہوگا - اور جب نفی پر زور دینا ہوگا
تو کہیں گے" یہ کام نہیں ہوگا " حالانکہ یہ مفرد کے دھوکے میں بلا تاکید بھی استعمال ہوا کرتا ہے جو صورت سے ظاہر ہے فصیح و صحیح
نہیں - اس قسم کے مرکب اردو میں بہت جیسے "یہ - ہاں سے یہاں" - وہ - ہاں سے وہاں - "ہم - ہی سے ہمیں" "مجھ - ہی سے
مجھی" وغیرہ - تیسرے وہ کہ ان کی ہستی کسی دوسرے لفظ کے ساتھ وابستہ ہو - یہ تابع مہمل کہلاتے ہیں - تابع مہمل لفظ موضوع
کی اُس بگڑی ہوئی صورت کا نام ہے جو تاکید معنی کا فائدہ دیتی ہے - اگر لفظ موضوع اسم ہے تو کثرت اور فعل ہے تو شدت کے معنی
ظاہر ہوتے ہیں - توابع سماعی بھی ہیں اور قیاسی بھی - توابع سماعی وہ ہیں جو معین الفاظ کی تابعیت میں غیر مقررہ حروف کی تبدیلی کے
ساتھ پائے جاتے ہیں اور اسی صورت سے مستقلاً زبان میں ہیں - جیسے "آن بان" - "دیکھنا بھالنا" "بولنا چالنا" "رونا دھونا"
وغیرہ - نوٹ - ایسے سماعی توابع مثل محاورات اپنے اپنے تابع کے ساتھ بلا تبدیلی ہی استعمال ہونا چاہیئے کیوں کہ ہر طرح کے سماعیات
بلا تغیر استعمال فصحا میں ہیں اس کے خلاف محاورات و سماعیات کا وجود ہی باقی نہ رہے گا -

توابع قیاسی وہ ہیں جو حسب ضرورت بنا لئے جاتے ہیں جسکے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ اگر لفظ موضوع کا حرف اول واو
ہے تو الف سے بدل کر اول میں بولیں گے جیسے "احشت وحشت" اور اگر حرف اول الف ہے تو واو سے بدل کر آخر میں بولیں گے
جیسے آدمی وادمی - اور اگر حرف اول نہ الف ہے نہ واو تو اسی قیاس پر کبھی الف سے بدل کر اول میں یا واو سے بدل کر آخر میں بولیں گے
جیسے "الو میلو" "اغلی بغلی" "گھوڑا ووڑا" "بکری وکری" ان کے علاوہ کچھ ایسے توابع بھی ہیں کہ انفراداً دونوں لفظ مہمل ہیں مگر
ہیئت ترکیبی میں ایک دوسرے کے معین ہو کر خالص معنی دیتے ہیں - جیسے "اہر تہر" - "انجر پنجر" - "الم غلم" "اختر بختر" - گہما گہمی وغیرہ -
(نوٹ اہر تہر لگی ہے اس موقع پر بولتے جب بیمار کی حالت مایوس سانہ ہو - انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے یعنی جوڑ بند ڈھیلے کر دیئے -
یہ الم غلم کس نے جمع کیا - یعنی یہ کوڑا کرکٹ کس نے اکٹھا کیا ہے - اپنا اختر بختر سمیٹو - یعنی اپنا پھیلا ہوا اسباب ایک جا کرو - اگر
کسی جگہ خوب چہل پہل ہو تو کہیں گے وہاں بڑی گہما گہمی ہے - مذکورہ توابع صورتاً مرکب مگر معنی کے اعتبار سے مفرد ہیں)

کچھ ایسے توابع بھی ہیں کہ اظہار معنی میں عاجز نہیں مگر انفراداً غیر مانوس ہیں جن میں بعض کثرت استعمال سے معروف اور
بعض قلت استعمال سے غیر معروف ہیں - معروف وہ ہیں جو مثل کلمہ غیر مستقل غیر مقررہ الفاظ کے ساتھ مربوط پائے جاتے
ہیں - جیسے "نیلی فام" - لالہ فام - چراگاہ - نشست گاہ - میں جزو دوم - اس صورت پر کسی کسی حالت میں کلمات فارسی و عربی

مخلوط نظر آتے ہیں جیسے خیمہ گاہ ۔ سیرگاہ ۔ ارادت کیش ۔ عقیدت کیش وغیرہ میں جزو اول عربی ہے ۔ غیر معروف وہ کلمات ہیں جو مثل تابع مہمل اپنے مقررہ ساتھی الفاظ کے سوا غیر مقررہ کلمات کے ساتھ موانست نہیں رکھتے ۔ جیسے صبح و مسا ۔ شام و پگاہ ۔ شب یلدا ۔ زلف چلیپا وغیرہ میں جزو دوم اور پگڈنڈی میں دونوں غیر معروف ہیں ۔ اگر ان کلمات کو غیر مقررہ الفاظ کے ساتھ بولا جائے تو مہمل معلوم ہونگے پھر ایسی کوشش کا کوئی فائدہ بھی نہیں ۔ مذکورہ توابع کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے جزو دوم تابع تو ہیں مگر مہمل نہیں ۔ جیسے اُچھل کود ۔ بھاگ دوڑ وغیرہ ۔

مرکبات زبان اُردو

مرکبات اردو بھی دو طرح کے ہیں (۱) امتزاجی (۲) غیر امتزاجی ۔ امتزاجی وہ مرکب ہے جس کے اجزا یعنی وہ الفاظ جن سے مرکب بنا ہو ۔ ایک یا دونوں انفراداً استعمال میں نہوں جس کی مثالیں ناقصات کی بحث میں آچکی ہیں ۔ صرف چوتھے قسم کی مثالیں اس تعریف میں نہیں آتی ہیں یعنی شام و پگاہ ۔ لیل و نہار ۔ زلف چلیپا وغیرہ مرکب امتزاجی نہیں غیر امتزاجی وہ مرکب ہیں جن کا کوئی جزو ناقص نہو ۔ یہ بھی دو طرح کے پائے جاتے ہیں ایک وہ جن کی ہیئت ترکیبی اردو اور فارسی میں ایک سی ہے ۔ مثلاً :-

	توصیفی	مفعولی	اضافی	ظرفی	فاعلی
فارسی	خوش نصیب	دل سوختہ	شوق نامہ	قمار خانہ	تیغ زن
اردو	ہنس مکھ	جی جلا	جل بانک	ناچ گھر	لٹھ مار

اس طرح کے جتنے غیر اردو مرکب ہیں اتحاد ہیئت ترکیبی سے اپنے ہم صورت مرکبات اردو کی طرح اردو کی علامت جمع قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یعنی خوش نصیبوں ۔ صاحب دلوں ۔ قمار خانوں وغیرہ عام طور سے استعمال میں ہیں اور فصیح معلوم ہوتے ہیں ایسے مرکبات کو "مرکب مماثل کہا جائے گا" دوسرے وہ مرکبات ہیں جن کی ساخت اردو اور فارسی میں الگ الگ ہے جیسے "مہر و وفا" میں واو عاطفہ ۔ "دست دعا" میں کسرۂ اضافت ۔ یہ ایسی علامتیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ منقولات سے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جمع بھی اردو قاعدہ سے نہیں بنتی اور اگر بنائی جائے تو غیر فصیح معلوم ہوتی ہے جیسے دست دعاؤں مہر و وفاؤں نہ صحیح ہے نہ فصیح ۔ یہ مرکبات "مرکب مغائر" کے نام سے ذکر کئے جائیں گے ۔

(نوٹ) چند مثالیں مرکب مغائر ہیں مذکورہ قاعدہ کے خلاف ملتی ہیں ۔ مثلاً مصرع "کون لیتا ہے خبر بے سر و سامانوں کی"[1] یا "قفس میں لائی کشش مجھکو آب و دانے کی" ۔ ایسی ترکیبیں یقینی غلط ہیں جن سے احتراز لازم ہے) لیکن یہیں یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ جن مرکبات کی ہیئتیں اردو اور فارسی میں ایک ہی سی ہیں اُن کے افراد اگر مختلف بھی ہوں تو غلط نہیں جیسے دل اُداس ۔ نار گھر ۔ اختر نگر ۔ جوش بھرا ۔ دل جلا ۔ دماغ جلا ۔ مثال میر ۔ میر کی گرمی اس سے اچرج ہے ۔ کس سے ملتا ہے وہ دماغ جلا ۔ اس طرح کی ترکیبوں کو غلط خیال کرنا غلط فہمی ہے اور انہیں غلط کہنا خود اپنی غلطی ہے ۔

---

[1] "بے سر و سامان" کی جمع "بے سر و سامانوں" اُردو میں رواج پا چکی ہے ، اس کی حیثیت "غلط العام" کی ہے ۔ (م ۔ ق)

معیار صحت کلمات

الفاظ کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ہے کہ ہر لفظ اپنی اصل سے ہٹنے کے بعد یا صحیح خیال کیا جاتا ہے یا غلط سمجھا جاتا ہے۔ صحیح وہ لفظ ہے جو بلا اختلاف عام وخاص ایک طرح بولا جاتا ہے یعنی عربی۔ فارسی۔ ترکی یا کسی زبان کے مہند صوری یا معنوی ہو جانے کے بعد خاص وعام سب ایک طرح بولتے ہیں جیسے کہگل۔ افراتفری۔ آبشورہ وغیرہ۔ لیکن صرف اعراب کی تبدیلی کوئی چیز نہیں کہ اسے نئے نام سے موسوم کیا جائے (دفوٹ) سوا اُن الفاظ کے جن میں توالیٔ حرکات کی حالت میں تسکین اوسط بر بنائے لہجہ ہوگئی ہے۔ کیوں کہ ہمارا لہجہ اصل میں تین یا چار حرکتیں لگاتار قبول ہی نہیں کرتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم دنیا بھر کی زبانوں کا تلفظ ٹھیک ٹھیک کر سکتے ہیں اس میں خاص ارادہ شریک ہوتا ہے۔ جن میں حرکتوں کی تبدیلی ہوئی ہے وہ الفاظ اس قسم کے ہیں۔ جیسے خَرکَتْ سے خَرکَٹ۔ صَدَقہ سے صَدقہ وغیرہ یہ صرف بلا ترکیب فارسی لائق استعمال ہیں اور وہ الفاظ جو تبدیل حرکت کے ساتھ بلا ترکیب مستعمل ہیں جیسے مَوْسِم۔ بجائے مَوْسِم کے اور مُرَوَّت کی جگہ مُرَوَّت اسی طرح ہندی کے بعض الفاظ تبدیل حرکت کے بعد اُردو میں صحیح سمجھے جاتے ہیں جیسے لفظ کٹھِن کو کَٹھَن بولا جاتا ہے اور چمن کا دوسرا قافیہ کٹھن میر حسن دہلوی نے کیا اور دوسرے اساتذہ نے بھی استعمال کیا ہے ایسی تبدیلیوں کو غلط سمجھنا غلط فہمی ہے) لیکن وہ الفاظ کہ اہل علم صحیح بولتے ہیں اور جہلا اپنی نادانی کی وجہ سے جس طرح چاہتے ہیں بولتے ہیں جیسے۔ کباب کو۔ کواب شوربا کو شروا بے سمجھ کو ناسمجھ بانسوت کے قیاس پر نخاص بولنا غلط ہے اور پروا کی جگہ پرواہ یا بدبو دار کی جگہ دیوال بولنا بھی صحیح نہیں۔ جائے سکونت کو جائے رہائش کہنا بھی قطعی غلط ہے کہ کسی زبان کے مخصوص حروف کا امتزاج غیر کلمات کے ساتھ مناسب نہیں پھر ہندی لفظ کے ساتھ فارسی کلمہ ترکیب فارسی سے استعمال کرنا اور بھی غضب ہے۔ ناسمجھ صرف نوعمر کے معنوں میں غلط نہیں کیوں کہ یہ محاورۂ زبان اردو ہے۔ یا وہ حروف کہ اردو اور فارسی میں ایک ہی معنی میں مستعمل پائے جاتے ہیں جیسے۔ نہ تھا۔ نہ بود میں نون قافیہ۔ بیڈھب اور بیدم میں۔ بائے قافیہ۔ لالی۔ سُرخی میں یائے نسبتی یا جن میں مشترکہ حالت پائی جائے ایسی سب صورتیں صحیح ہیں۔ مزید یہ کہ ناقصات میں بھی غیر اُردو کا اردو کے ساتھ اس طرح خلط صحیح نہیں۔ جیسے دُکھ زدہ۔ سنسنی خیز۔ گاڑی بان وغیرہ کی ترکیب اصولاً غلط ہے جبکہ دُکھ زدہ کی جگہ دکھ بھرا۔ دُکھیارا۔ سنسنی خیز کی جگہ دہشت خیز۔ اور گاڑی بان[۱] کی جگہ گاڑی وان موجود ہے۔ کچھ ناقصات ایسے ہیں کہ اسم صفت۔ اسم فاعل اور اسم ظرف وغیرہ بنانے کے لئے وضع کئے گئے اور رائج ہیں۔ جیسے جھالردار۔ لچکدار۔ برچھی بردار۔ بیٹربازکمل پوش۔ اُگال دان۔ مودی خانہ۔ چڑیا خانہ وغیرہ میں جزو دوم غیر اُردو ہے ان سے بھی اس وقت کام لینا چاہیئے جب کوئی اور صورت نہ بن پڑتی ہو۔ اور اغلاط ترکیبی خصوصیات ترکیبات کے تحت میں بیان ہونگے۔ ابھی ان کا ذکر قبل از وقت ہے۔

بحث متروکات

قبل اس کے کہ بحث استعمال الفاظ شروع ہو ایسے الفاظ کا ذکر بھی ضروری ہے جن کا استعمال کسی وجہ سے نادرست ہے۔ اس کے وجوہ مختلف ہیں ایک یہ کہ لفظ غلط ہو۔ دوسرے یہ کہ لفظ غیر مانوس ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی لفظ زائد ہو۔ ان میں سے بعض کا ترک ضروری اور بعض کا ترک بہتر ہے۔

[۱] "گاڑی بان" اردو روزمرہ میں داخل ہے (م۔ ق)

تعریف غیر مانوس

غیر مانوس وہ کلمہ ہے جو مقابلۃً ثقیل یا کریہہ یا غریب ہو۔ ثقیل وہ ہے کہ بولا جاتا ہو مگر اس کا بدل صحیح اور سلیس موجود ہو۔ جیسے کرّاڑا۔ اور سنسناہٹ۔ کگارا اور سنسنی کی جگہ بولنا پہلی صورت ثقیل اور قابلِ ترک ہے۔ لیکن جن الفاظ کا بدل نہ ہو، وہ نہ ثقیل ہیں نہ قابلِ ترک جیسے اڑّا، گڑّا وغیرہ۔ کریہہ وہ الفاظ ہیں جنہیں بازاری عوام بولتے ہوں اور ادبار، فصحا مہذب اور شائستہ حضرات ان سے احتراز کرتے ہوں۔ جیسے جھاپڑ، لبّا۔ لیوٹا خاص شہدوں اور لنگاڑوں کی اصطلاحیں ہیں۔ غریب وہ الفاظ ہیں کہ بدل ان کے بولے جاتے ہوں اور وہ خود زبانوں پر نہ آتے ہوں۔ جیسے ابر اور میغ۔ سویرا اور بھور یعنی صبح۔ میغ اور بھور دونوں کا استعمال نہیں ہوتا۔ زائد وہ لفظ ہے جس کے استعمال کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ جیسے کہاں کو، کدھر کو اور کیونکر سے میں "کو" اور "سے" زائد ہے لیکن ایسے الفاظ کہ کوئی فائدہ دے رہے ہوں زائد نہیں۔ جیسے "میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں"، "میں نے اپنی آنکھوں سے" بظاہر حشو ہے مگر یقین پر زور دینے کی حالت میں ضروری ہے اور بعض زائد اجزا کچھ ایسے جزو کلمہ بن گئے ہیں کہ زیادہ معلوم ہی نہیں ہوتے جو فارسی میں بھی ہیں اور اردو میں بھی۔ جیسے ہجراں کا الف ونون، گودی کی یائے معروف۔ نصیبا کا الف زائد ہے مگر زائد معلوم نہیں ہوتا، ان سے احتراز کی کوئی ضرورت نہیں۔ مثال گودی۔ میر انیس مرحوم:

صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

مثال نصیبا از صبا لکھنوی مرحوم شاگرد خواجہ آتش

جا کے گلزار سے صیاد پھر آیا اُلٹا کیا نصیبا ہے ترا بلبل شیدا اُلٹا

متروکات

متروکات کی بے اصول فہرست میں ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن میں بعض کا ترک مخل فصاحت اور بعض کا ترک کرنا ادائے زبان کو تنگ کرنا ہے۔ یہ بات اہلِ نظر کے سمجھنے کی ہے کہ جن الفاظ کا صحیح اور فصیح بدل ممکن نہیں انھیں کیونکر ترک کیا جاسکتا ہے جیسے لفظ "سو" کہ اس کا مفہوم ہر جگہ "وہ" اور "تو" سے ادا نہیں ہوتا۔ مثلاً میر مرحوم کے مطلع میں لفظ "سو" جس محل پر استعمال ہوا ہے اس کا کوئی بھی بدل یہ بلاغت پیدا ہی نہیں کرسکتا۔ مطلع میر:

میرے مالک نے مرے حق میں یہ احسان کیا خاکِ ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا

لہٰذا "لفظ سو" کے ترک کی مضرت ظاہر ہے۔ اسی طرح "تئیں" ضمیر متکلم کے ساتھ "کو" کے معنی میں ترک کر دینے سے ابتک اظہار مفہوم کی کوئی اتنی صورت ممکن نہ ہوئی۔ مثلاً آپ کو کہنے میں ضمیر مخاطب کا دھوکا ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو مہمل معلوم ہوتا ہے۔ اپنے کو کہنا کچھ ٹھیک ہے مگر تکلف باقی رہتا ہے۔ بہر حال آخری صورت ہی غنیمت ہے اور جن الفاظ کی قائم مقامی دوسرے الفاظ نہ کرسکیں ایسے الفاظ ہرگز قابلِ ترک نہیں۔ جیسے فعلن فعلن کے وزن پر ہنس کر بولے "فصیح ہے تو" فاعلاتن کے وزن پر ہنس کے بولے "بھی فصیح ہے اگر ایک کی جگہ دوسرا استعمال کیا جائے تو "ہنس کے" کی یائے مجہول کے خلاف فصاحت کا اظہار ہوگا۔ اور ہنس کر کی "رے" جس کا ساقط ہونا غلط ہے گر جائے گی۔ لیکن غیروں کے وزن پر "پاؤں[1]" غیر فصیح ہے لہٰذا یہ صورت قابلِ ترک ہے اور پیروں فصیح تر اس لئے لائق اختیار ہے۔

---

[1] مگر پاؤں بوزن "چھاؤں" غیر فصیح نہیں ہے۔ آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی (م۔ق)

بحث اضافہ الفاظ

وقت ضرورت اردو میں اضافۂ الفاظ اکثر عربی وفارسی سے ہوتا رہا اور قبول اثر کے بعد یا حکم اردو میں آگیا" یعنی مہند صوری یا معنوی ہوگیا"، یا بجنسہٖ غیر زبان کا لفظ رہا۔ اسی صورت سے اردو زبان کی توسیع ہوتی رہی۔ بعد کو اسی ضرورت کی بنا پر انگریزی زبان کے الفاظ بھی اردو میں شامل ہوئے۔ حالانکہ ان کو کوئی امتیازی درجہ نصیب نہ ہوسکا۔ کیونکہ یہ اس وقت اردو میں شامل ہوئے جب اردو ایک مستقل زبان ہو چکی تھی۔ اس لئے یہ اضافہ زیادہ تر نو ایجاد چیزوں تک محدود رہا۔ جیسے موٹر۔ انجن۔ ریل سائیکل وغیرہ یا ان اصطلاحوں پر موقوف رہا جن کے بدل اردو میں نہ تھے۔ جیسے ڈگری۔ اپیل وغیرہ۔ بعض انگریزی الفاظ کی جگہ اردو الفاظ نے لے لی۔ جیسے ایروپلین کی جگہ ہوائی جہاز اور بعض میں عام لہجہ کے زیر اثر تبدیلیاں ہوگئیں۔ جیسے لین ٹرن کی جگہ لالٹین ہو کر ثقالت دور ہو گئی۔ اور گلاس میں معنوی تبدیلی ہوئی۔ اب گلاس ظرف آب کے معنوں میں مستعمل ہے جس کے لئے شیشہ کا ہونا بھی ضروری نہیں۔ چنانچہ مرزا غالب مرحوم نے جو آموں کی تعریف میں نظم کہی ہے اس کے ایک شعر میں فرمایا ہے۔ ؎

یا ملک[1] نے بحکم رب الناس　　بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

اس طرح کے الفاظ جزو زبان بن چکے انہیں ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہاں وہ غیر زبان کے الفاظ جن کے فصیح اردو بدل موجود ہیں ایسے غیر زبان کے کلمات کو بلا ضرورت و تحریر میں استعمال کرنا نہایت غیر مناسب و غیر ضروری ہے

(نوٹ) لیکن عام بول چال ہو یا ادبی زبان بعض اوقات کسی خاص خیال کو ظاہر کرنے کے لئے اردو میں کوئی لفظ نہیں ملتا اور اس حالت میں ایک نئے لفظ مفرد یا مرکب کی ضرورت پیش آجاتی ہے ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ جس زبان کا لفظ اردو کے موافق مزاج ہو یا بنایا جاسکتا ہو لے لینا چاہیئے۔ یا بنا لینا چاہیئے۔ اس میں کسی زبان کی قید نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ عربی۔ فارسی انگریزی فرانسیسی وغیرہ جس زبان کا لفظ مفہوم کو ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے۔ ساتھ ہی ساتھ موافق مزاج ہو تو اور بہتر ہے۔ ایسا لفظ لے لینے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس قسم کے الفاظ شروع شروع داخل منقولات رہیں گے۔ اگر بار بار استعمال ہوتے رہے اور زبان زد خاص و عام ہوگئے تو جزو زبان ہو جائیں گے اور دائرہ اعتدال زبان میں آجائیں گے۔ نہ غریب رہیں گے نہ غیر معتدل۔ اس صورت میں ادبا و فصحا کی صلاحیت کار اور قواعد کی صحیح پابندی سے اچھا نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے۔ بے اصول اور بے تکے پن کے اضافے زبان کے حسن و لطافت کو مٹا سکتے ہیں۔ اب کہ ہم آزاد ہیں۔ ہمارے ادبا کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے ہمیں معاشیات، نفسیات، فلسفہ، سیاسیات سائنس کے تمام شعبوں اور دوسرے علوم و فنون ترقی یافتہ صورت میں اپنی زبان میں لانا ہیں۔ ان سب کے لئے مصطلحات کی ضرورت بھی ظاہر ہے۔ مگر یہ بات نظر میں رکھنے کی ہے کہ اس سے پہلے جہاں جہاں مصطلحات کے ترجمہ کی کوشش کی گئی کچھ کامیاب نہیں ثابت ہوئی۔ عربی وفارسی کی مدد سے جو مصطلحات گڑھے گئے وہ وہیں کے وہیں رہ گئے۔ ملک بھر میں نہ پھیل سکے نہ مقبول ہوئے دوسری جنگ عظیم کی ابتدا سے اب تک ترقی کی رفتار دنیا میں اتنی تیز ہوگئی ہے کہ کل کی بات آج پرانی ہو جاتی ہے۔ اس ایٹمی دور کی ضرورتوں کے لحاظ سے مصطلحات بھی نت نئے بن بن کے شہرت پاتے جاتے ہیں۔ اگر ان کے ترجمہ کرنے یا ان کے قریب قریب مصطلحات گڑھنے اور ان کے مقبول ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔ تو اس وقت تک نہ معلوم دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی اسلئے میری ذاتی رائے ہے کہ غیر مانوس مرکبات بنانے اور مصطلحات کے عجیب الخلقت ترجمے کرنے سے کہیں یہ بہتر ہے کہ مصطلحات تو جہاں سے مناسب ہے بجنسہٖ لے لئے جائیں۔ اور مرکبات بنانے کے لئے قواعد موضوعہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ بس تحقیق اجزائے زبان

---

[1] اصل مصرع یوں ہے:۔ "انگبیں کے بحکم رب الناس" (م۔ق)

گل ہائے تازہ

تسکین قریشی

نہ ہو جب تک جنوں میں بے نیازی
حقیقت کم، بہت افسانہ سازی

محبت جاں فروشی، جاں گدازی
یہاں دل پر گراں ہے دلنوازی

ہم اہلِ دل کی شانِ امتیازی
سراپا شوق و پیکر بے نیازی

ہزاروں جام و ساغر ٹوٹتے ہیں
بہت دشوار ہے میخانہ سازی

جہاں کچھ بھی سکونِ دل کو ملا ہے
وہیں خود دل نے کی ہے فتنہ بازی

مسلسل الجھنیں ہی الجھنیں ہیں
سلامت تیری زلفوں کی درازی

صداقت کیا جو ہو محدود و پنہاں
جنوں کیا جب نہ ہو ہنگامہ سازی

ہزاروں بار جب ٹوٹی ہے توبہ
تو آیا ہے شعورِ پاک بازی

خرابِ التفاتِ ناز تھے ہم
شکستِ دل کو سمجھے دل نوازی

گدائی کیا شہنشاہی ہے تسکینؔ
گدائی میں اگر ہو بے نیازی

ماہر القادری

ہنسی ہنسی میں جو چرکے لگائے جاتے ہیں
نہ جانے کب کے یہ بدلے چکائے جاتے ہیں

خموش ہیں وہ مگر مسکرائے جاتے ہیں
یہ نغمے کیا اسی دھن میں سنائے جاتے ہیں

یہی چلن ہے، یہی ہے روش زمانے کی
گلوں کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں

جوابِ خط پہ عجب کش مکش کا عالم ہے
بنا بنا کے لکیریں مٹائے جاتے ہیں

سنبھال اے نگہِ فتنہ گر! سنبھال مجھے
میں کیا کروں کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

تری خوشی کو، تری دوستی کو کیا کہیے
کہ دشمنوں کے بھی اب ناز اٹھائے جاتے ہیں

وہ لاکھ وعدہ شکن ہوں مجھے ملال نہیں
یہی بہت ہے تصور میں آئے جاتے ہیں

یہی فلک پہ ستارے، یہی زمیں کے پھول
تری نظر کے جو کچھ نقش پائے جاتے ہیں

قوسِ قزح

ثاقب کانپوری

کسی کے لب پہ مرے غم کی داستاں نہ سہی
جہاں میں کوئی زباں، میری ہم زباں نہ سہی
جبینِ شوق تو سجدہ کہیں کرے گی ضرور
حرم کا در ہی سہی، تیرا آستاں نہ سہی
گزر گیا جو تری یاد میں سکون کے ساتھ
وہ ایک لمحہ سہی، عمرِ جاوداں نہ سہی
کہیں تو میرے لئے مژدۂ بہار آئے
قفس کا گوشہ سہی، کنجِ آشیاں نہ سہی
اسی کو حاصلِ کونین تو سمجھ ثاقب
کسی کا درد تو ہے لطفِ بیکراں نہ سہی

رضاء اللہ خاں رضا ٹونکی

وہ نظر میں آئیں تو اپنی سمانے کے لئے
اور بڑھ جائیگی اک بجلی زمانے کے لئے
آنکھ حیرت کے لئے دل ناز اٹھانے کے لئے
آپ نے جو کچھ دیا اپنا بنانے کے لئے
پوچھ کر دیکھوں تو انکی بے نیازی سے کبھی
کون آتا ہے یہ میرا دل بڑھانے کے لئے
اضطرابِ شوق میں نیند آگئی اچھا ہوا
ورنہ ہر کروٹ قیامت تھی زمانے کے لئے
بے پری دیکھیں پر پرواز کب پیدا کرے
دل تڑپتا ہے قفس میں آشیانے کے لئے

عروج زیدی بدایونی

جب ہم رضائے دوست کے سانچے میں ڈھل گئے
کوسوں حدودِ شادی و غم سے نکل گئے
دُنیا میں ہر قدم پہ نیا تجربہ ہوا
فکر و نظر کے زاویئے اکثر بدل گئے
پائے ثباتِ عشق کو لغزش اگر ہوئی
ہم نے تمہارا نام لیا اور سنبھل گئے
دُنیا میں انقلاب سے آزاد کون ہے
ہاتھوں میں آکے سینکڑوں دامن نکل گئے
دستِ طلب بڑھانے کا اٹھا اگر سوال
خود داریٔ عروج کے تیور بدل گئے

شفقت کاظمی

نکلے ہیں وطن سے منہ اندھیرے
معلوم نہیں کہاں چلے ہم
حائل تھے جو اپنے راستے میں
طے کر نہ سکے وہ مرحلے ہم
ہر حال رہے تجھی سے منسوب
اے دوست بُرے تھے یا بھلے ہم
کیا کیا دلِ زار تھا پُر اُمید
جب منزلِ دوست کو چلے ہم
شفقت یہ ہجومِ یاس و حرماں
دیکھا کئے دل کے حوصلے ہم

اختر سکندر روی

زلف جب عارضِ تاباں پہ بکھر جاتی ہے
صبح ہوتی ہے مگر شام نظر آتی ہے
یاس میں آس کی تصویر نظر آتی ہے
زندگی غم کے اُجالوں سے نکھر جاتی ہے
یوں تو اس بزم میں سب اہلِ نظر ہیں لیکن
میرے دامن کی طرف کس کی نظر جاتی ہے
میکدہ کعبہ سے کچھ دور نہیں ہے، لیکن
زندگی کتنے مراحل سے گزر جاتی ہے
دل گرفتار، تو ہم ہے سیہ بختی میں
زلفِ پیچاں مجھے زنجیر نظر آتی ہے
ایک جگنو بھی غنیمت ہے اندھیری شب میں
روشنی کچھ تو سرِ راہ نظر آتی ہے
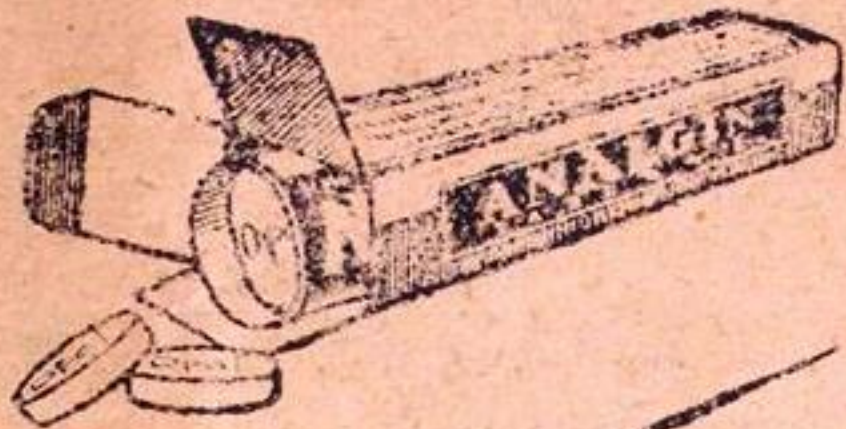
درد سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
کفنسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
یکسال
اوپل لیبارٹریز لمیٹڈ کراچی

روحِ انتخاب

حضرت سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی رح کے ارشادات

پیرانِ پیر کے عقیدت مندوں کو دعوتِ غور و فکر

فَإِنْ حَضَرَهُ مُنْكَرٌ كَالطَّبْلِ وَالْمَزَامِيرِ وَالْعُودِ وَالنَّاءِ وَالشَّرْبُوقِ وَالشَّبَّابَةِ وَالرَّبَابِ وَالْمَغَانِي لَا يَجْلِسُ هُنَاكَ لِأَنَّ جَمِيعَ ذَالِكَ مُحَرَّمٌ

غنیۃ الطالبین ص۲۷

ترجمہ: جس مجلس میں ناجائز کام ہوں، جیسے ڈھول، طبلہ سارنگی، بانسری، بربط، نے، شہنائی، شربوق، دوتارہ، ستارہ طنبورہ وغیرہ اس مجلس میں نہ بیٹھے۔ کیونکہ یہ سب حرام ہیں۔

وَاِذَا زَارَ قَبْرًا لَا يَضَعُ يَدَهُ عَلَيْهِ وَلَا يُقَبِّلُهُ فَإِنَّهُ عَادَةُ الْيَهُودِ وَيَقْرَءُ إِحْدَى عَشَرَةَ مَرَّةً قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ وَغَيْرَهُ مِنَ الْقُرْآنِ وَيُهْدِي ثَوَابَ ذَالِكَ لِصَاحِبِ الْقَبْرِ...... ثُمَّ يَسْئَلُ اللّٰهَ حَاجَتَهُ

(غنیۃ الطالبین ص۷۱)

ترجمہ: جب کوئی کسی قبر کی زیارت کرے تو قبر کو ہاتھ نہ لگائے اور نہ اس کو بوسہ دے۔ کیونکہ یہ یہودیوں کی عادت ہے اور گیارہ دفعہ قل ھو اللہ پڑھے اور دیگر آیاتِ قرآنی پڑھ کر اس کا ثواب قبر والے کو ہدیہ کرے، اس طرح کہ اے اللہ اگر تو نے قرآن پاک ان آیات کے پڑھنے کا ثواب مجھے عطا فرمایا ہے تو وہ میں اس قبر والے کو ہدیہ کرتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگے

فِي حَدِيثِ عَلِيٍّ رض إِنَّ اللّٰهَ يُحَاسِبُ كُلَّ الْخَلْقِ إِلَّا مَنْ أَشْرَكَ بِاللّٰهِ فَإِنَّهُ لَا يُحَاسَبُ وَيُؤْمَرُ بِهِ إِلَى النَّارِ۔ غنیۃ الطالبین ص۱۳

ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے روایت کی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام مخلوق سے خداوند تعالیٰ حساب لے گا۔ مگر جس شخص نے خدا کے ساتھ شریک بنایا اس سے حساب نہیں کیا جائے گا اور اسے دوزخ میں لے جانے کا حکم دیا جائے گا۔

فَكُلُّ مَا فِي الْقُرْآنِ وَمَا أَدْرَاكَ فَقَدْ أَعْلَمَهُ اللّٰهُ إِيَّاهُ وَمَا فِيهِ وَمَا يُدْرِيكَ فَلَمْ يَدْرِهِ وَلَمْ يُطْلِعْهُ عَلَيْهِ كَقَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ وَمَا يُدْرِيكَ

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے جن چیزوں کے متعلق وما ادراک فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کا علم آپ کو عطا کر دیا ہے اور جن

لَعَلَّ السَّاعَۃَ تَکُوْنُ قَرِیْبًا وَمَا تَبَیَّنَ لَہٗ وَقْتُھَا
(غنیۃ الطالبین صفحہ ۳۸۳)

چیزوں کے متعلق وَمَا یُدْرِیْکَ فرمایا ہے اُن کی اطلاع حضورؐ کو نہیں دی ہے۔ جیسا کہ قیامت کے متعلق فرمایا ہے وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ تَکُوْنُ قَرِیْبًا۔ مگر اس وقت کا بیان نہ فرمایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے وقت کی تعیین کا حکم نہیں دیا۔

فائدہ:۔ اس سے یہ روز روشن کی طرح ثابت ہوا کہ حضرت محبوب سبحانی رح کے نزدیک غیر اللہ کے لئے مَا یَکُوْنُ وَمَا یَکُوْنُ کا عقیدہ اہلِ سنت دجماعت کا عقیدہ نہیں ہے جو عقیدہ رکھے وہ سنی نہیں ہے۔

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مولانا مطلوب الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مطلوب الرحمن مرحوم سے حیدرآباد دکن میں پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ اسے بھی سترہ اٹھارہ سال ہونے کو آئے، وہاں خاصے لکھے پڑھے اور صاحبِ حیثیت لوگ ان کے مرید تھے۔ اس کے بعد کنور محمد ظفر خاں صاحب رئیس داؤ پور کے یہاں دان پور کمپاؤنڈ (علی گڑھ) میں ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا کنور صاحب موصوف کی کوٹھی میں مقیم تھے اور میں بھی اُنکے صاحبزادوں کا مہمان تھا کئی بار کھانا بھی ساتھ کھایا۔ تصوف کے موضوع پر گفتگو بھی ہوئی۔ مولانا قدس سرہ نے میرے سوالات کے جوابات انتہائی وقار، سنجیدگی، متانت اور یقین و اعتماد کے ساتھ دیے۔ پھر پاکستان بننے کے بعد جب مولانا کراچی میں آکر مستقل طور پر اقامت گزین ہو گئے تو دسیوں باران کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں جاتا بڑی شفقت سے ملتے۔ پان مرحمت فرماتے اور کبھی چائے سے بھی تواضع کرتے۔

میں مولانا مرحوم کی خدمت میں بحث مباحثہ کے لئے نہیں بلکہ حصول سعادت کے لئے حاضر ہوتا تھا، ایک دو بار تصوف پر بحث چھڑی تو میں اپنے اختلاف کو نہ چھپا سکا، مگر میں نے "ایاز قدر شناس اور حد ادب" کو ملحوظ رکھا۔ بات کو بڑھنے نہ دیا کہ مناظرہ مقصود ہی نہ تھا۔

مُدیر ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) جناب عامر عثمانی مولانا مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ جن دنوں وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کی پرزور حمایت کر رہے تھے اور تنہا ان کا قلم کتنے محاذوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اور یہ بحث اپنے شباب پر تھی ان دنوں حضرت مولانا قدس سرہ کے یہ تاثرات تھے کہ جماعت اور مودودی صاحب کی اس حمایت و مدافعت میں خیر کا پہلو نظر آتا ہو کہ "خود عامر کے دینی حالات بہتر ہوتے جا رہے ہیں"

مولانا مطلوب الرحمن صاحب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے بڑے بھائی تھے، (غالباً) درس نظامی کی متوسط کتابوں کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی اور پھر ٹامسن کالج رڑکی سے باقاعدہ انجینئرنگ کا ڈپلوما لے کر انجینئر بن گئے اور کئی سال تک اس عہدہ پر فائز رہے پھر ترک موالات کے زمانہ میں اپنے پیرومرشد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے ایما پر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ پیشہ اور روزگار کا انقلاب درصل ان کی پوری زندگی کا انقلاب ثابت ہوا۔ کہاں وہ انجینئری اور کہاں ارشاد و تزکیہ نفس کی مسند! تحت و فوق کا بُعد اور فرق!

مولانا مرحوم و مغفور کے فیض صحبت، انذار و تبشیر، وعظ و تذکیر اور ہم نشینی نے بہت سی زندگیوں میں مذہبی انقلاب بپا کر دیا تھا ذکر و شغل کا ذوق و شوق، عبادت کا اہتمام لہو و لعب اور لایعنی باتوں سے اجتناب! ان کی صحبت میں جتنے لوگ رہتے تھے۔ ان سب کے

دینی حالات کو بہتر پایا۔ سیدھی سچی زندگی نہ کسی پر تنقید نہ کسی سے نزاع و مباحثہ، ذکر الٰہی سے شغف، خدا کا خوف اور اپنے حالات کی بہتری اور درستی کی لگن۔

اسے کرامت کہیئے، ولایت سمجھئے یا کسی اور اچھے نام سے یاد کیجئے۔ اب سے تقریباً چار برس پہلے کی بات ہے۔ بدنام سیاست بازوں کا دورِ حکومت تھا، مولانا مرحوم کے ایک صاحبِ منصب مرید کو پھانسنے کے لئے ایک جال بُنا گیا اور جال کے بچھنے میں بس ایک رات باقی تھی۔ مولانا مرحوم نے ردِ بلا کے لئے وہ رات بڑے اضطراب کے عالم میں گذاری، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی دعاؤں نے صبح ہوتے ہوتے ساری بساط ہی کو الٹ دیا، وہ فضا ہی دگر گوں ہوگئی۔ حالات کا رُخ ہی بدل گیا! قبولیت دعا کی یہ خاصیت اور تاثیر اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عرض و معروض کے قبول ہونے کا یہ اعتماد اس بارگاہِ بے نیاز کے نیازمندانِ خاص ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

میں نے ایک بار عرض کیا وساوس نفسانی کا غلبہ ہوتا رہتا ہے اور نماز پڑھنے میں خیالات منتشر رہتے ہیں، کوئی ایسی دعا یا ترکیب بتایئے کہ یہ کمزوری دور ہو جائے۔ اس پر قدرے مسکرا کر فرمایا "اس کے لئے محنت کرنی ہوگی" پھر بولے، اچھا آپ "استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ" کا ورد رکھئے، اس سے انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

حضرت مولانا کے انتقال سے تین دن قبل میں حاضر ہوا۔ مولانا عامر عثمانی کو دیوبند سے کراچی آئے ہوئے غالباً ایک ہفتہ ہوا تھا اس دن ان کی حالت غیر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور حقہ میں کش لگاتے ہوئے بولے "اچھا ماہر صاحب ہیں" بس پھر اُس دن کے بعد ان کا دیدار نہ ہو سکا اور تین دن کے بعد یہ صاحب مسندِ ارشاد و تصوف "اہلِ قبر" بن گیا۔

اپنے لائق فرزند عامر عثمانی صاحب کو نصیحت کیا وصیت کی کہ "بیٹا! صرف قلم سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز تزکیہ نفس ہے" اور یہ بھی کہا کہ اگر میں زندہ رہ گیا تو ایک نصیحت پھر کروں گا..... اور اس "اگر" کو اللہ تعالیٰ نے اُس "اجل" سے بدل دیا جس میں ایک لمحہ بھی دیر ہوتی ہے نہ سویر۔ رہے نام اللہ کا! اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ عیشِ آخرت نصیب فرمائے۔ آمین

نواب[1] فخر یار جنگ بہادر مرحوم

نواب فخر یار جنگ بہادر سے پہلی بار سنہ ۱۹۲۹ء میں نیاز حاصل ہوا۔ مرحوم ان دنوں دولت آصفیہ (حیدر آباد دکن) کے معتمد امور مالیہ (فینانس سکریٹری) تھے، میری اُن سے پہلے کی نہ کوئی شناسائی تھی اور نہ وہ مجھے جانتے تھے۔ مولانا عبد القدیر بدایونی کے ہمراہ ان کی کوٹھی پر جانا ہوا اور پھر اس کے بعد تقریباً ۱۹۴۳ء تک اُن سے ملنا ہوتا رہا کسی مذہبی جلسہ میں، پارٹی میں، دفتر میں اور خود ان کے مکان پر۔

فخر الدین احمد نام تھا ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے، سر سید احمد خاں کے دور میں علی گڈھ کالج کے ممتاز طالب علم رہے اور یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی کے بعد حکومت انگریزی کے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں گزیٹڈ پوسٹ پر تقرر ہوگیا۔ وہاں چند برس گذار دینے کے بعد، حکومت نظام (حیدر آباد دکن) نے ان کی خدمات حاصل کرلیں، اور "صدر محاسب" ——— (Accountant General) کے عہدہ پر ان کو فائز کیا گیا۔ پھر نواب صاحب فینانس سکریٹری ہوئے اور اس کے بعد وزیر فینانس۔

نواب فخر یار جنگ بہادر مرحوم انتہائی دیانت دار اور فرض شناس حاکم تھے، اپنے عہدہ ہائے جلیلہ سے جلب منفعت کے لئے ذرا سی بھی ڈھیل برتتے تو چاندی سونے کی اینٹوں سے تجوریاں بھر لیتے۔ مگر دیانت و راستبازی کے معاملہ میں وہ فولاد کی طرح

---

[1] یہ تاثرات اب سے بہت پہلے آنے چاہئے تھے۔ مگر یہ تاخیر بھی مقدر کردی گئی تھی، یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا اختیار جبرِ مشیت کے سامنے عاجز نظر آتا ہے (م۔ق)

بے لچک تھے۔ حکومت نظام کے امور مالیہ کی کنجی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ریاست کے ہر محکمہ کا ان سے واسطہ پڑتا تھا اور وہ مشائخ ہوں درگاہیں اور دینی مدرسے ہوں یا اسکول اور کالج، سب کی مالی امداد کی منظوری اُنہی سے متعلق تھی اس لئے ان سے ہر کوئی ملنا اور قریب ہونا چاہتا تھا، مگر اس اعزاز و منصب اور اختیار کے باوجود نواب صاحب مرحوم ہر کسی سے جھک کر ملتے۔ نہ رعونت، نہ تکبر نہ کوئی طمطراق ایک شریف باوقار ذمہ دار انسان کی طرح، اہل معاملہ اور غرض مندوں سے شریفانہ برتاؤ۔ عید کی تقریب پر اپنے محکمہ کے چپراسیوں تک سے بغل گیر ہوتے اور مصافحہ کرتے

وزیر خزانہ اگر مالی معاملات میں نرمی اور فراخدلی سے کام لے تو حکومت کا خزانہ خالی ہو جائے۔ نواب فخر یار جنگ بہادر مالی کارروائی میں بڑی چھان بین کرتے اس لئے بعض اہلِ معاملہ کو اُن سے شکایت بھی ہو جاتی، فرض شناسی، مستعدی اور محنت کا یہ عالم تھا کہ جن دنوں انگریزی کمپنی سے محکمہ ریل اپنے تمام اختیارات و متعلقات کے ساتھ حکومت نظام کو منتقل کیا جارہا تھا، تو ہفتوں راتوں کو مسلسل جاگ کر کاغذات پڑھے، مسلیں دیکھیں اور شرائط کا مطالعہ کیا اور اس طرح انگریزی کمپنی کو جو رقم دی گئی اس میں لاکھوں روپیہ کی کمی کرالی، اس شب بیداری مطالعہ اور محنت نے ان کی بینائی کو متاثر کر دیا۔

درمیانہ قد، گوری رنگت، دل کش خدوخال چہرے پر ڈاڑھی اور بہار دیتی تھی، صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند، وضع دار، اور نیک سیرت، لایعنی باتوں سے طبعاً نفور! ایک بار کسی صاحب نے ان کے تقوے کی تعریف کی، تو بڑی حسرت اور ندامت کے لہجہ میں بولے: ——— جی، تقویٰ ——— خوب! اور یہ مجھے کروڑوں روپیہ کا سود کا حساب جو کرنا پڑتا ہے ———! ضمیر کی یہ بیداری اور خود شناسی ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔

سیرۃ النبی کے کئی جلسوں میں نواب صاحب مرحوم کی صدارت میں راقم الحروف نے نعتیہ نظمیں بھی پڑھی ہیں عشقِ رسولؐ تو ان کی زندگی کا سب سے زیادہ روشن باب تھا ؎

هر که عشقِ مصطفےؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

تقسیم ہند سے تین چار سال قبل معدہ کے مریض ہو گئے تھے۔ اور اسی زمانہ میں سننے میں آیا تھا کہ پونا کے علاقہ میں مہابلیشر میں کسی ڈاکٹر کے زیر علاج رہے۔ اُس نے مسلسل فاقے کرائے تو معدہ اور ضعیف ہو گیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے پندرہ سال صاحب فراش ہو کر گذارے، ان کے لائق صاحبزادے اور بہت سی خوبیوں میں باپ کے وارث و جانشین جناب مشتاق احمد خاں صاحب جب کراچی میں نظام گورنمنٹ کے نمایندے (ایجنٹ جنرل) تھے تو میں نے "حیدر آباد ہاؤس" میں نواب صاحب مرحوم کو آخری بار دیکھا تھا مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا، اور مولانا عبد القدیر بدایونی کا حال پوچھا کہ اُنہی کے ساتھ اب سے اکتیس سال قبل نواب صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تھا۔

نواب صاحب مرحوم بستر پر دو مردوں کے سہارے کروٹ لیتے تھے، مگر اس عالم میں نماز قضا نہیں کی اور مرتے دم تک اس کا اہتمام رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے رب کی یاد ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

ہماری نظر میں

علی رضؓ و حسین رضؓ

از: قاضی اطہر مبارکپوری، ضخامت ۳۳۶ صفحات، قیمت تین روپے آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ: تاج کمپنی ۱۰۰، مسجد اسٹریٹ، بمبئی ۳

محمود عباسی کی ناپسندیدہ کتاب "خلافتِ معاویہ رضؓ و یزید" نے مسلمانوں میں جو فتنہ کھڑا کر دیا ہے، اُس کے رد میں اب تک جتنی کتابیں آئی ہیں، اُن میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب (علی رضؓ و حسین رضؓ) سب سے زیادہ مدلل، جامع اور باوقار ہے، فاضل مصنف نے "خلافتِ معاویہ رضؓ و یزید" کے بارے میں بالکل ٹھیک لکھا ہے:۔

"اس کتاب کی حیثیت، بالکل وہی ہے، جو آزاد خیال منکرینِ حدیث کی کتابوں کی ہے، اس کتاب کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے اس قسم کی دوسری عامی کتابوں کو دیکھا جاتا ہے۔۔۔۔"

—— اور ——

"مولف کی یہ کوشش بہت محمود و مشکور ہوتی، اگر وہ حضرت معاویہ رضؓ، یزید اور بنو امیہ کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کا پول کھولتے اور تاریخی خزانوں کو کھنگال کر، ان کے مناقب و فضائل اور محاسن و کمالات کو یکجا کرتے اور اُمت کے سامنے سیاہ تصویر کا دوسرا روشن رُخ پیش کرتے۔۔۔۔۔۔۔"

—— مگر ——

"افسوس کہ مولف نے اپنے کو جادۂ مستقیم پر نہیں رکھا، بلکہ بڑی دلیری اور بے باکی سے حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وغیرہ کو جگہ جگہ گرا کر، حضرت معاویہ رضؓ اور بنو امیہ کو اُٹھانے کی کوشش کی ہے اور ان حضرات کو وہ سب کچھ بنا دیا ہے، جو احادیثِ صحیحہ، واقعاتِ معتبرہ اور حقائقِ مُسلّمہ کے سراسر خلاف ہے۔۔۔۔۔۔"

—— اور ——

"ایک طرف تو آپ (محمود عباسی) حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے معاذاللہ مثالب و معائب ثابت کرنے کے لئے بڑے بڑے اساطین علم و فن کو مجروح قرار دے رہے ہیں اور دوسری طرف یزید اور اُس کے طرفداروں کے مناقب و فضائل اُجاگر کرنے کے لئے گری پڑی بے اصل مجہول اور غیر معتبر کتابوں سے اور اُن کے مصنفوں سے بُری

طرح استفادہ کر رہے ہیں ....."

"آپ نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ ابوالفرج اصبہانی کی کتاب الاغانی" سے استفادہ کیا ہے، معلوم نہیں "الاغانی" جیسی گانے بجانے اور قصہ کہانی کی کتاب، کس طرح آپ کے نزدیک معتبر و مستند بن گئی......"!

"خلافت معاویہؓ و یزید" کے مصنف نے واقعہ کربلا کے معاملہ میں سب سے زیادہ معتبر ابن خلدون کو قرار دیا ہے، مگر یہی ابن خلدون، قاضی ابوبکر بن عربی "صاحب العواصم من القواصم" کی رائے کی غلطی ظاہر فرماتے ہیں، تو محمود عباسی صاحب اُسے چھپا جاتے ہیں........ نیز:-

"آپ جو اپنی کتاب (خلافت معاویہؓ و یزید) میں جگہ جگہ اسلامی مورخوں سے ہٹ کر، ڈوزی، گبن اور دوسرے غیر مسلم مستشرقین کا نام لیتے ہیں اور اُن کی کتابوں اور انسائیکلو پیڈیا کے اقتباسات نقل کرتے ہیں، یہ آپ کی تحقیق کا فیشن اور روشن دماغی کا مظاہرہ ہے"

"کیا لُطف کی بات ہے کہ جو شخص اپنے مورخوں اور اماموں کو غلط قرار دیتا ہے، وہ یورپ کے متعصب مصنفوں کو حجت مانتا ہے....."

فاضل مُصنف نے عبارتوں اور اقتباسات کے حوالوں کے ساتھ بتایا ہے کہ محمود عباسی صاحب نے اپنی کتاب میں ترجمہ و اقتباس میں کس قدر خیانت و بددیانتی سے کام لیا ہے ———— لکھتے ہیں:-

"باقی رہا کتاب میں مورخوں اور محدثوں کی کتابوں میں قطع و برید کرنے، درمیان سے عبارت حذف کرنے، عبارت کو غلط انداز میں پیش کرنے اور اقتباسات و حوالہ جات میں بڑی دلیری اور جرأت سے خیانت کرنے کا معاملہ تو ہمارا دعویٰ ہے کہ اس کتاب (خلافت معاویہؓ و یزید) میں کم از کم سو میں پچھتر حرکتیں اس قسم کی ہیں اور مولف نے بڑی جسارت سے علماء و محدثین کے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا ہے؟

———— اور ————

"ایک مجرمانہ حرکت یہ بھی ہے کہ مولف جس کتاب کو غیر معتبر و غلط قرار دیتے ہیں اسی سے اپنے لئے استدلال کرنا واجب سمجھ کر اپنا منشاء ثابت کرتے ہیں، اور جب اس میں خلاف منشاء بات آجاتی ہے تو اسے "غالی" کے مہمل لفظ سے نوازتے ہیں"

لائق مصنف نے محمود عباسی صاحب کے علی الرغم، عبارتوں کے مستند حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ابن تیمیہ، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ اور ابن عبدالبر (رحمہم اللہ تعالیٰ) اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت عام ہو گئی اور اُن کی خلافت کا انعقاد درست تھا؟

———— اور ————

"(۱) حضرت علیؓ کے خلاف، حضرت معاویہؓ کا اقدام دم عثمان کے پردے میں غلط تھا (۲) قتل حضرت عثمان سے حضرت علی بالکل بری تھے (۳) اِن مشاجرات میں حق حضرت علی کی طرف

تھا۔ (۴) حضرت علیؓ کی خلافت برحق و برمحل تھی، اور جو انھوں نے کردار ادا کیا، وہ اسلامی تعلیم کے عین مطابق تھا۔"

قاضی اطہر مبارکپوری نے جو کچھ اوپر فرمایا ہے، جمہور اُمت کی یہی رائے ہے اور یہی حق ہے!

"مولف کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" نے یزید کی طرفداری میں فتنہ سے بچنے اور پُرامن رہنے کے بارے میں احادیث و واقعات تو نقل کر دیئے، مگر حضرت حسینؓ کو غلط کار ثابت کرنے کے لئے ان تمام آیات و احادیث اور واقعات کو چھپا دیا، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم آیا ہے، ظالم حکمراں کے مقابلہ میں کلمہ حق کہنے کو افضل جہاد بتایا گیا ہے ہم چند آیات و احادیث مثال کے طور پر یہاں درج کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ حضرت حُسین کا خروج یزید کے خلاف ارشادات نبویؐ اور احکامِ شریعت کی رُو سے جائز بلکہ واجب تھا، اور حضرت اور اُن کی جماعت نے یہ اقدام کر کے پُوری امت کی طرف سے فرض کی ادائگی کی، اور اگر حضرت حُسین اور اُن کے ہم نوا ایسا نہ کرتے تو اُمت شاید اس سے بھی شدید اور عام فتنہ میں مُبتلا ہو جاتی۔"

"خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں حضرت محمد بن حنفیہ کے موقف اور اُن کی رائے و مشورت کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے، جس سے حضرت حُسین رضی اللہ عنہ کی پوزیشن کمزور ہو جاتی ہے"۔ قاضی اطہر مبارکپوری صاحب نے اپنی اس کتاب میں، علامہ ابن خلدون کی کتاب کا اقتباس پیش کر کے، محمود عباسی صاحب کے اس دجل و تلبیس کو بھی بے نقاب کر دیا ہے:۔

"..... صرف محمد بن الحنفیہ رہ گئے، مکہ معظمہ جانے کی محمد بن الحنفیہ ہی نے رائے دی تھی کہ تم یزید کی بیعت سے اعراض کر کے کسی دوسرے شہر میں چلے جاؤ، اور وہاں اپنے دُعاۃ کو اطراف و جوانب بلاد اسلامیہ میں روانہ کرو، اگر وہ لوگ تمہاری بیعت منظور کر لیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا، اور اگر تمہارے سوا انھوں نے متفق ہو کر، کسی دوسرے کو امیر بنا لیا تو تم کو اس سے کوئی نقصان نہ پہونچے گا..."

"خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں یزید (علیہ ما علیہ)، کو پاک سیرت اور نیکوکار بتایا گیا ہے، اس کے برخلاف حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو خطاکار، غلط کار، جاہ طلب اور نسل و خاندان کی بنا پر منصب کا دعویدار (معاذ اللہ..... توبہ) ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے، "علیؓ و حسینؓ" کے فاضل مصنف نے خود ابن خلدون کی کتاب کے اصل اقتباسات دیئے ہیں، جن سے یزید کے فسق کا اظہار ہوتا ہے.....

الاول منہا ما حدث فی یزید من الفسق ایام خلافتہ[1]	پہلا معاملہ یزید کے فسق کا ہے، جو اُس کے زمانہ خلافت میں ظاہر ہوا

—— اور ——

... وَ ما حدث فی یزید ما حدث من الفسق اختلف الصحابہ حینئذ....	اور جب یزید میں فسق ظاہر ہوا، تو اُس وقت صحابہ نے اختلاف کیا

---

[1] ابن خلدون نے "خلافت" کا لفظ یہاں عام اصطلاح میں استعمال کیا ہے، جس طرح اموی اور عباسی تمام فرمانرواؤں کو تاریخ میں "خلیفہ" ہی کہا جاتا ہے اور اُن کی حکومت کے لئے "خلافت" کا لفظ بولا جاتا ہے (م۔ ق)

محمود عباسی صاحب نے امام ابن حجر عسقلانی پر یہ تہمت جوڑی ہے کہ انھوں نے "یزید کا ذکر رواۃ احادیث میں کیا ہے۔"
حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ :-

ذکرت للتمیز بینہ وبین النخعی (ابن حجر)　　میں نے یزید بن معاویہ کا ذکر اس میں اور یزید نخعی میں فرق کرنے کے لئے کیا ہے۔

اس تصریح کے بعد، ابن حجر نے یہ تک لکھدیا ہے :-

ولیست لہ روایت تعتمد　　اور یزید کی کوئی ایسی روایت نہیں ہے، جو قابل اعتماد ہو۔

فاضل مصنف نے سند و حوالہ کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ بھی سراسر جھوٹ ہے کہ مراسیل ابوداؤد میں یزید کی مرویات ہیں، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابوداؤد میں یزید کی صرف ایک مرسل روایت ہے، جس پر میں نے اپنی کتاب "الاستدراک علی الاطراف" میں تنبیہ کردی ہے۔"

اس کتاب میں عباسی صاحب کے اس دجل و فریب کی بھی قلعی کھولی گئی ہے کہ وہ یزید کی تعریف کے الفاظ تو بڑے زور شور سے نقل فرماتے ہیں، مگر ان لفظوں کے بعد ہی جب یزید کے معائب آتے ہیں، تو انہیں دانستہ چھپا جاتے ہیں، اس طرح ادھوری عبارتیں لکھ کر، انھوں نے ان لوگوں کو فریب دیا ہے، جن کو تاریخ کی اصل کتابوں پر دسترس نہیں ہے۔

اور سنیئے

"عالم اسلام کے ہر ہر علاقہ میں لوگوں نے بلا کسی اختلاف کے بیعت کی تھی، اور ہر جگہ کے وفود تو کید بیعت کے لئے امیر یزید کے پاس حاضر ہوتے تھے، فاتسقت البیعۃ لیزید فی سائر البلاد، ووفدت الوفود من سائر الاقالیم الی یزید (البدایہ والنہایہ) امیر یزید کی ولی عہدی کی بیعت سے پہلے کبھی اس اہتمام سے بیعت نہیں لی گئی تھی کہ مملکت اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے بیعت کے لئے وفود آئے ہوں اور ہر علاقہ سے لوگوں نے بطیب خاطر اس طرح ایسے قریشی نوجوان کی بیعت کی ہو جو اپنی صلاحیتوں اور خدمات ملیہ کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے ملت کا محبوب تھا۔"
(خلافت معاویہؓ و یزید ص۲۰)

البدایہ والنہایہ کی پوری عبارت یہ ہے :-

"ثم خطب معاویہ وھولاء حضور تحت منبرہ وبایع الناس لیزید وھم قعود، ولم یوافق ولم یظہروا خلافاً لما تہدد ھم ولو تو عدھم فاتسقت البیعۃ لیزید فی سائر البلاد (ص۸۰)

پھر معاویہؓ نے خطبہ دیا، یہ لوگ ان کے منبر کے نیچے موجود تھے عام لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی اور یہ لوگ بیٹھے رہے، نہ موافقت کی، نہ مخالفت کی، کیوں کہ انہیں ڈرایا دھمکایا تھا، بس یزید کی بیعت تمام شہروں میں چل پڑی۔

یزید کی ولی عہدی کی بیعت کس طرح لی گئی، اس پوری عبارت کے سامنے آنے کے بعد، تصویر کا صحیح رخ واضح ہوتا ہے، محمود عباسی صاحب نے ولی عہدی، یزید کی بیعت کی جو تصویر کھینچی ہے اس نے اصل حقیقت کو کس قدر مسخ کردیا ہے، پوری کتاب میں اس شخص نے یہی رویہ اختیار کیا ہے!

محمود عباسی نے علامہ ابن تیمیہ کی عبارت کے درمیان سے، ایک ٹکڑا لے کر اور آگے پیچھے کی عبارت حذف کرکے، یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کے بقول یزید کی خلافت ایسی ہی تھی جیسے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت ـــــ فاضل مُصنّف نے علامہ ابن تیمیہ کی پُوری عبارت درج فرماکر، عباسی صاحب کے اس دجل و فریب کا پردہ چاک کردیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ یزید کو امر و اقتدار اور عزل و نصب وغیرہ کے معاملہ میں عبدالملک اور منصور وغیرہ خلفاء کی طرح کا خلیفہ اور فرمانروا سمجھتے ہیں۔

لائق مصنف نے "کتاب الوزراء" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب حُسین رضی اللہ عنہ کے کوفہ جانے کی خبر یزید کے پاس پہنچی، تو اُس نے سرجون بن منصور رومی سے مشورہ کیا کہ کس شخص کو عراق کا گورنر بنائے ـــــ اس لئے :

"اگر نصرانیت کی یہ چال کامیاب نہ ہوگئی ہوتی تو شاید یہ سانحہ پیش نہ آتا اور آج تک، عیسائی مصنفین اور مسیحی مورخین حضرت حسین رضؓ اور اُنکے ہمراہیوں کو غلط کار و خطاوار ثابت کرکے یزید کی حکومت اور اُس کے عمال کو نہ سراہتے، جس یزید نے سرجون بن منصور رومی اور اُس جیسے دوسرے اپنے عیسائی اہل کاروں کے مشورہ سے یہ کام کیا"

ـــــ اور ـــــ

"مولف (خلافتِ معاویہؓ و یزید) کا سب سے زیادہ کمزور پہلو یہی ہے کہ انھوں نے واقعہ کربلا کو اپنے منشاء کے مطابق بنانے کے لئے صرف مغربی مسیحیوں کو حکم اور فیصل مانا ہے۔"

ـــــ اس ناانصافی اور ظلم کو بھی تو دیکھئے ـــــ

"مولف (محمود عباسی) نے حضرت عبداللہ ابن زبیر اور اُنکے طرفدار اصحابہ و تابعین کی شان میں جو گستاخی کی ہے اور اُن کو مفتری و بہتان طراز بتایا ہے اور پُرامن فضا میں فساد برپا کرنے کا ان پر الزام لگایا ہے، وہ صرف اس لئے ہے کہ یزید اور اُس کی فوج نے "حادثہ حرہ" میں جو حرام کاری و سیاہ کاری کی اُسے جائز قرار دے کر، اپنا مقصد ثابت کیا جائے"

"خلافتِ معاویہ و یزید" کے مولف نے محاصرہ مکہ مکرمہ کا دانستہ تذکرہ نہیں کیا، یزید کے دورِ حکومت کا یہ سیاہ کارنامہ کس قدر قابل نفرت و ملامت ہے کہ جبل ابو قبیس پر منجنیق نصب کرکے خانہ کعبہ پر سنگ باری کی گئی اور پورے ایک ماہ تک یہ عالم رہا کہ مسلمان بیت اللہ کے طواف سے محروم رہے اور شامی فوجیں بڑھ بڑھ کر حرم خدا کی حرمت لوٹتی رہیں۔ اسی زمانہ میں یزید مرگیا عمر بن سعد کو ثقہ، تابعی اور بلند کردار ثابت کرنے کے لئے تاریخ و سیر کے اقتباسات میں محمود عباسی صاحب نے حسب عادت قطع و برید اور تحریف و تلبیس سے کام لیا ہے، قاضی اطہر مبارکپوری نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان دھوکوں کی قلعی کھولی ہے!

مولف "خلافتِ معاویہ و یزید" کو اس پر بڑا ناز ہے کہ اُس نے اموی خاندان اور اہل بیت کے قریبی رشتوں کی تحقیق کرکے پتہ لگایا ہے مگر مولانا مبارکپوری نے مولفِ مذکور کے اس فخر و ناز کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی، انھوں نے تاریخی حوالوں کے ساتھ محمود عباسی صاحب کی اس معاملہ میں بھی چوریاں پکڑی ہیں۔

"علی و حسین" اپنے موضوع پر نہایت ہی کامیاب علمی کوشش ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ مُصنف کو دارین میں عطا فرمائے گا کاش! مواد و استدلال کے ساتھ مُصنف کا قلم بھی شگفتہ ہوتا! اس کتاب کے پڑھنے کے بعد "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کی

قدر و قیمت دو کوڑی کی برابر بھی نہیں رہتی!

یہ بات بالکل واضح اور ثابت ہو چکی ہے کہ محمود عباسی نے اہل بیتِ اطہار کی دشمنی اور بغض کو "تاریخی تحقیق" کے پردے میں ظاہر کیا ہے اور یہ کتاب حضرت علی رضؓ اور حضرت حسین رضؓ کو لوگوں کی نگاہ میں گرانے کے لئے لکھی گئی ہے، اس ناپاک مقصد کے لئے اس شخص نے صحیح حدیثوں کو غلط ٹھہرایا ہے اور علماء، محدثین اور مورخین کی عبارتوں میں جان بوجھ کر تحریف اور کانٹ چھانٹ کی ہے۔

اس لئے ——— وہ اہل قلم اور ارباب فکر

جن کے قلم نے ہمیشہ حق کی حمایت کی ہے، جن کی بات کا مسلمانوں میں وزن محسوس کیا جاتا ہے، اور جو بہ تقاضائے بشری اس کتاب سے متاثر ہو گئے تھے۔ اُن سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ پوری جرأت کے ساتھ "خلافت معاویہؓ و یزید" پر احتساب فرمائیں گے، حق کے معاملہ میں اگر کوئی اپنی کسی بھول چوک یا سابق موقف کی کمزوری کا اعتراف کرے تو اس اعتراف سے اُس کی عزت گھٹتی نہیں ہے اور بڑھ جاتی ہے۔

ماہر القادری

رکن: انجمن ادبی رسائل پاکستان

ماہنامہ

فاران

کراچی

جلد ۱۲ شمارہ ۷

ایڈیٹر: ماہر القادری

ترتیب، ماہ اکتوبر ۱۹۶۰ء

سالانہ: چھ روپے فی پرچہ: آٹھ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین مطبوعہ مطبع سعیدی، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

جہاں تک نگارش و تحریر اور قلم و زبان کا تعلق ہے تعمیر و اصلاح اور تبلیغِ حق کے دو اسلوب ہیں، ایک یہ کہ کسی برائی اور غلط نظریہ کی نشاندہی کئے بغیر "معروف" کو پیش کیا جائے، اور "منکر" پر کسی قسم کی کوئی تنقید اور طنز نہ ہو، مثلاً سچ بولنے کی خوبیاں طرح طرح کے عنوانات بدل بدل کر بیان کی جائیں مگر جھوٹ کی خرابیوں کا کوئی ذکر ہی نہ آنے پائے یا جھوٹ کا ذکر آئے بھی تو وہ ایک عام برائی کی حیثیت سے آئے، کسی شخصیت کے جھوٹ کا تعین کر کے اُس پر گفتگو نہ کی جائے۔ کوئی شک نہیں تبلیغِ حق کا یہ انداز اور تعمیر و اصلاح کا یہ اسلوب بھی بہت مفید ہے اور جو کوئی بھی اپنی تحریر و گفتگو میں اس مثبت اسلوب کو نباہ سکتا ہے وہ تحسین و ستائش کا مستحق ہے۔

دوسرا اسلوب یہ ہے کہ "معروف" کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ "منکر" پر تنقید بھی کی جائے اور شخصیتوں کے تعین کے ساتھ اُن کی غلطیوں، لغزشوں اور گمراہیوں کی نشاندہی بھی ہوتی رہے ـــــــ تبلیغ حق کے یہ دونوں اسلوب اپنی جگہ مفید اور کارآمد ہیں اور ان میں سے کسی ایک اسلوب کی بھی ضرورت، اہمیت اور افادیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا ـــــــ دوسرا اسلوب جو تنقید و گرفت کا اسلوب ہے، پہلے اسلوب کے مقابلہ میں کھٹکتا ہے مگر یہ اسلوب اپنی جگہ "ناگزیر اسلوب" ہے، جسے ہر مبلغ، مصلح، مقرر اور انشا پرداز کو اختیار کرنا پڑتا ہے ـــــــ خود قرآن کریم میں یہ دونوں اسلوب ملتے ہیں، (۱) خالص معروف کی تبلیغ اور (۲) منکر پر شخصیتوں کا نام لے کر تنقید!

قرآنِ کریم میں صالحین اور اہلِ تقویٰ کو سراہا بھی گیا ہے اور ساتھ ہی ظالموں اور کذابوں پر لعنت بھی بھیجی گئی ہے، نیکوکاروں کو عیش جنت کی بشارت دی گئی ہے اور فاسقوں اور فاجروں کے لئے عذاب جہنم کی وعید بھی آئی ہے! ابلیس کی شخصیت کے تعین کے ساتھ اُسے رجیم اور راندۂ درگاہ قرار دیا گیا ہے، فرعون اور ابولہب جیسے کافروں، ظالموں حق ناشناسوں اور نبیوں کو ایذا دینے والوں کی دو ٹوک الفاظ میں مذمت آئی ہے۔

ـــــــ تو ـــــــ

قرآنِ کریم ہم کو بتاتا ہے کہ کچھ برائیاں، گمراہیاں اور غلط کاریاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ نہ صرف اُن کی نشاندہی کرنی ناگزیر ہوتی ہے بلکہ اُن کے کرنے والوں پر بھی نام لے کر احتساب ضروری ہو جاتا ہے۔

ہم آج کی صحبت میں جس گمراہی پر احتساب کر رہے ہیں، وہ پاکستان کے لئے، ملت کے لئے اور خود اسلام کے لئے اتنا بڑا فتنہ ہے کہ اُس کی خطرناکی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، یہ وہ گمراہی اور ضلالت ہے، جس سے اصل دین کی نفی ہوتی ہے، یہ مسلک خدانخواستہ مسلمانوں میں مقبول ہو گیا، تو ایمان، اسلام اور اخلاق، ان میں سے کوئی چیز بھی صحیح سلامت نہ رہ سکے گی! اس فتنہ نے قرآنِ کریم کے ساتھ جو دردناک سلوک کیا ہے، اُسے دیکھ کر کوئی غیرت مند اور حساس مسلمان سکوت و ضبط کی حدوں میں خاموش تماشائی بن کر

نہیں رہ سکتا۔ ہمارے دل کی یہی کراہیں اور ضمیر کی یہی چیخیں ہیں جو بیساختہ الفاظ میں ڈھل گئی ہیں، قرآن کی حفاظت کے نام پر قرآن کی یہ کھلی ہوئی معنوی تحریف کسی عنوان گوارا نہیں کی جا سکتی۔

رسالوں، اخباروں اور کتابوں میں فکر و خیال کی غلطیاں، لغزشیں اور کوتاہیاں نظر سے گزرتی ہی رہتی ہیں اور چھوٹے موٹے فتنے آئے دن اٹھتے ہی رہتے ہیں، حقائق کی تعبیر و ترجمانی میں اربابِ فکر سے غلطیاں ہوتی ہیں اور ہم خود اپنی زبان و قلم کو غلطیوں سے محفوظ نہیں سمجھتے ؎

چلے کتنا ہی بچ کے کوئی ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

مگر

بہت سی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، ہر غلطی پر کون گرفت کرتا ہے، کتنی ایسی کوتاہیاں ہیں جو دل میں بس چبھ کر رہ جاتی ہیں اور اس چبھن کے اظہار کی نوبت نہیں آتی۔

لیکن

جس فتنۂ عظیم پر ہم احتساب کر رہے ہیں وہ اسی قابل ہے کہ اُس پر خوب کھل کر گفتگو اور خوب کس کر گرفت کی جائے، یہ فتنہ دل میں چبھ ہی نہیں رہا ہے بلکہ قلبِ مومن کو زخمی اور پارہ پارہ کر رہا ہے، ایسے کاری زخموں پر کون ضبط کر سکتا ہے۔

یہ تو انسان کی فطرت کا تقاضا ٹھیرا
چوٹ لگتی ہے تو اک چیخ نکل جاتی ہے

اجمالی تعارف

پاکستان میں "بزمِ طلوعِ اسلام" نے اطاعتِ رسول ﷺ کے خلاف جو محاذ قائم کر رکھا ہے اور قرآن ہی کے نام پر قرآن کے مفہوم و منشا کی جو کھلی ہوئی تحریف کی جا رہی ہے، سب سے پہلے اُس کا اجمالی تعارف ضروری ہے۔

تقسیمِ ہند سے بھی کئی سال پہلے جناب سید نذیر نیازی کی ادارت و نگرانی میں مجلّہ "طلوعِ اسلام" نکلتا تھا جس میں اسلامی علوم پر خاصے بلند مضامین شائع ہوتے تھے "طلوعِ اسلام" میں علامہ اقبال کے افکار کی خاص طور پر ترجمانی کی جاتی تھی، غلام احمد صاحب پرویز اُن دنوں حکومتِ ہند میں ملازم تھے، اُن کی ملازمت کا آغاز گورنمنٹ آف انڈیا پریس میں ایک کلرک کی حیثیت سے ہوا تھا۔ انگریزی حکومت کے آخری دور میں وہ آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔

مسٹر پرویز کو مضمون نگاری کا شوق تھا، اُن کے مضامین "طلوعِ اسلام" کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوتے تھے، مرزا غلام احمد قادیانی نے جس طرح شروع شروع میں دین کی حمایت اور مدافعت میں مضامین اور کتابیں لکھی تھیں اور اس شخص کے وہی معتقدات تھے، جو جمہورِ اُمت کے تھے، یہی حال پرویز صاحب کا تھا، اپنے جن مضامین کے ذریعہ وہ دینی اور علمی حلقوں میں متعارف ہوئے ہیں، وہ مضامین عام مسلمانوں کے معتقدات کے مخالف نہ تھے!

یہ زخم مسلمانوں کے دلوں میں آج تک تازہ ہیں کہ ماہنامہ "نگار" کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری نے فقہ اور حدیث کے خلاف باقاعدہ مُہم شروع کر رکھی تھی اور یہ شخص "مولوی اور مُلّا" کی آڑ میں اسلام پر پھبتیاں کستا اور دینی اقدار کی ہنسی اُڑاتا تھا۔ مسٹر پرویز نے نیاز کے اس مسلک کا اثر قبول کیا اور "نگار" کے ایڈیٹر کے "اسلوب نگارش کی اپنی تحریروں میں نقل اتارنے کی کوشش کی، نیاز کی اس روش نے پرویز صاحب کو یہ بھی سُجھایا کہ دیندار طبقہ میں قلم کے ذریعہ مقبول و ہر دلعزیز بننے کے لئے علم و تقویٰ کی ضرورت ہے پھر اُس بزم میں ایسے تابناک فانوس اور روشن شمعیں موجود ہیں، جن کے سامنے سطحی معلومات

رکھنے والے اہلِ قلم کا چراغ نہیں جل سکتا، ہاں! مغرب زدہ نوجوان طبقہ میں مقبول اور مشہور ہونے کے لئے اُردو کی کتابوں کا مطالعہ اور لکھنے کا اچھا انداز کافی ہے، خاص طور سے انگریزی مصنفین کی کتابوں کے حوالے اور اُن کے اقتباسات کسی مضمون میں آجائیں کہ شوپن ہار نے یہ کہا تھا، ہیلی پال (Paul Haldane) کی فلاں مسئلہ میں یہ رائے تھی، رسل اور جوڈ کا یہ نقطہ نگاہ تھا، مغربی دانشوروں کے ان اقتباسات اور حوالوں کے ساتھ انگریزی کی کچھ اصطلاحات:۔

(مثلاً "ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISONABLE UNIT) "اعمال و خواص" —— ACTIONS AND PROPERTIES) "تحفظ خویش" ("PRESERVATION OF LIFE")

بھی آتی رہیں، تو مغرب زدہ نوجوان ایسے انشا پرداز کو بہت بڑا مُفکر اور محقق سمجھنے لگتے ہیں، اور پھر اس سطحیت اور لفظی شیشہ گری کے ساتھ زندگی کو تکلیفات شرعی اور دینی پابندیوں کی قید سے آزاد کئے جانے کے نکتے بھی بیان ہوتے رہیں، تو یہ مقبولیت اور زیادہ یقینی ہوجاتی ہے۔

یہاں اس واقعہ کا بیان کردینا بھی ضروری ہے کہ نیاز فتحپوری کے خرافات اور ملحدانہ افکار و خیالات پر ہندوستان کے مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا، اس احتجاج کے دباؤ کا یہ اثر ہوا کہ نیاز صاحب کو اپنے رسالہ "نگار" میں اعلانِ عام کے ساتھ باقاعدہ تحریری "توبہ نامہ" شائع کرنا پڑا کہ وہ آئندہ اپنے رسالہ میں اس قسم کے دینی موضوعات پر گفتگو نہ کریں گے، اس "توبہ نامہ" کے بعد کچھ دن تک تو یہ طوفانِ بدتمیزی رُکا رہا، مگر پھر اس شخص نے توبہ شکنی کی، عہد و پیمان کو توڑا اور "نگار" کے صفحات پھر اسی قسم کے خرافات سے آلودہ ہوگئے۔ جناب پرویز ہندوستان میں نیاز کا حشر دیکھ چکے تھے، اس لئے اُنہیں کھل کر اپنے گمراہ کُن مسلک کو پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، سُنّتِ رسول کی کھلم کھلا مخالفت اور قرآن کریم کی معنوی تحریف کی یہ جسارت پاکستان میں آکر پیدا ہوئی ہے، اور اس فتنہ نے اُس مُلک میں پر پُرزے نکالے ہیں جو کتاب و سُنّت ہی کے نام پر وجود میں آیا ہے!

مسٹر پرویز نے مضمون نگاری کا جب آغاز کیا ہے تو اُنہیں عربی نہیں آتی تھی اور بہت دن تک وہ عربی دانی کے معاملہ میں کورے ہی رہے، پھر اُنھوں نے "عربی بول چال" اور "معلّم عربی" جیسی کتابوں کے ذریعہ عربی زبان سے شناسائی حاصل کی اور اپنے مطالعہ کو جاری رکھا، عرض کرنا یہ ہے کہ قرآنی لُغت اور قرآنی علوم میں جس بصیرت اور مہارت کے وہ مدعی ہیں، اُس بصیرت و آگہی کے لئے اُن کی عربی دانی پر قطعًا اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اب رہی قرآنی لُغت کی تالیف، تو اس کے لئے پہلے سے لکھی لکھائی لغات موجود ہیں، ایک معمولی عربی جاننے والا شخص بھی ان کی مدد سے ایک لُغت مُرتب کرسکتا ہے، جو لوگ عربی نہیں جانتے یا تصنیف و تالیف کے فن سے ناواقف ہیں، وہ بیچارے اس قسم کے ناپختہ مولفین کی تدوین و تالیف کی موٹی لغات کو دیکھ کر مرعوب ہوجاتے ہیں!

ہاں! تو بات "طلوعِ اسلام" سے چلی تھی، عرض کیا گیا تھا کہ سید نذیر نیازی اس مجلہ کے مدیر و نگراں تھے، پھر اس کی ترتیب و نگرانی پرویز صاحب سے متعلق ہوگئی، گورنمنٹ سروس میں ہونے کی وجہ سے اُن کا نام مُدیر و منتظم کی حیثیت سے نہیں آتا تھا!

پرویز صاحب کا برسوں دلّی میں قیام رہا ہے اگر اُن کی طبیعت میں حق پسندی کا جوہر ہوتا تو دلّی میں حق پسند علما اور ارباب کمال کا قحط نہ تھا۔ "شگفتہ جذب و قلندریت" اور خود عربی دانی کے لئے مولانا عبدالسلام نیازی کی صحبت سے وہ فیض اٹھاسکتے

تھے اور اُن کی صحبت میں "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل کر کے کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتے تھے، اسی دِلّی میں مولانا محمد ایوب صاحب جیسے فاضل روزگار عالم بھی تھے کہ جن کے درس و وعظ میں نازک و غامض دینی اور کلامی مسائل کی گرہیں کھلتی ہیں۔ سب سے زیادہ معروف شخصیت مولانا کفایت اللہ مرحوم کی تھی جن کے علم و فضل اور صالحیت و تقویٰ کی قسم کھائی جا سکتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے جن کو دیکھ کر قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوتی تھی ——— ان تمام اربابِ کمال کو نظر انداز کر کے پرویز صاحب کی نگاہِ انتخاب پڑی بھی تو کس پر، مولانا اسلم جیراج پوری پر، جو عبداللہ چکڑالوی کے "مسلکِ انکارِ حدیث" کا بوریا سنبھالے بیٹھے تھے، اور جن کا سب سے بڑا کارنامہ "تاریخ الامت" ہے، جس کو تحقیق و تصنیف سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اس کتاب کی حیثیت تالیف و ترجمہ کی ہے، حالاں کہ جس جامعہ ملیہ سے اسلم جیراجپوری کا تعلق تھا، اُسی جامعہ میں مولانا خواجہ عبدالحیٔ مفسر قرآن بھی موجود تھے، لیکن اس قسم کے حق پسند علما کو چھوڑ کر، پرویز صاحب نے مولانا اسلم جیراجپوری کی رہنمائی اور قیادت کو قبول کیا ؎

پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا

اُوپر لکھا جا چکا ہے کہ مسٹر پرویز کے ابتدائی مضامین میں دینی جھلک پائی جاتی تھی اور ان میں جمہور اُمت کے دینی عقائد کی مخالفت نہیں کی جاتی تھی، توقع تھی کہ ان کا قلم مستقبل میں دین و اخلاق کی، اور بڑھ چڑھ کر خدمت انجام دے گا ان مضامین کے سبب مسلمان پرویز صاحب سے حسنِ ظن رکھتے تھے، اسی حسن ظن نے انہیں دہلی سکریٹریٹ کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دینے کا موقع عطا کیا، کچھ دنوں تک وہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے، مگر اسی زمانہ میں اُن کے مضامین کا رنگ بدلنے لگا، سب سے پہلے مسٹر پرویز نے بعض احادیث کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات پیش کئے۔ ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں ان شبہات کا پوری طرح ازالہ کر دیا گیا لیکن پرویز صاحب کے یہ شبہات ایک جویائے حق اور مخلص قلب کی کھٹک نہ تھی جو افہام و تفہیم کے بعد دُور ہو جاتی اُنکے یہ شکوک ایک برخود غلط قلب کے شکوک تھے، جو رفتہ رفتہ شاخ در شاخ اور پختہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ اُن کو سُنّتِ رسول سے عناد پیدا ہو گیا۔

پرویز صاحب کے مضامین کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ کر، مسلمانوں کے لکھے پڑھے طبقہ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے! یہ تبدیلی کیوں؟ اشہبِ خامہ سلامتی کی راہ پر چلتے چلتے کہاں بھٹکا جا رہا ہے؟ نیاز فتحپوری کے افکار و خیالات کی پرچھائیں کیسے پڑ گئی؟ ——— تحریر کے ساتھ پرویز صاحب جمعہ کے خطبہ میں بھی اپنے بدلے ہوئے خیالات کو پیش کرنے لگے شروع شروع میں یہ باتیں استعاروں اور کنایوں میں بیان کی گئیں، پھر استعارات و کنایات کے پردے بھی اُٹھنے لگے، سکریٹریٹ کے لکھے پڑھے لوگ تو سوچتے ہی رہے کہ اس فتنہ کو کس مصلحت اور حکمت کے ساتھ بند کیا جائے، مگر موسیٰ نام کے ایک چپراسی نے جرأت کر کے مداخلت کی اور پرویز صاحب کو سختی کے ساتھ ٹوکا، بس اُس دن کے بعد پھر دہلی سکریٹریٹ کی مسجد میں پرویز صاحب خطبہ نہ دے سکے اور ایک غیرت مند چپراسی کی جُرأت نے اس فتنہ کا سدِّ باب کر دیا۔

تقسیم ہند کے بعد مسٹر پرویز "طلوع اسلام" سمیت پاکستان آگئے، اور یہاں آ کر انھوں نے خوب کھل کر "انکارِ حدیث" کے مشن کی تبلیغ کی، اور اب معاملہ مخالفِ قرآن اقوال کے رد و قبول تک ہی محدود نہیں رہا، سُنّتِ رسول بلکہ اطاعتِ رسول کی ڈنکے کی چوٹ مخالفت کی گئی، اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ——— "نظامِ صلوٰۃ" کو مسلمانوں نے نماز میں تبدیل کر دیا جو حضرات آٹھ نو سال سے "فاران" باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں، اُن کی نگاہ سے وہ مضامین ضرور گزرے ہونگے

جن میں مسٹر پرویز کے باطل افکار و خیالات کا رد کیا گیا تھا، ہم نے قرآنِ کریم ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو منصوص ثابت کیا تھا، اور بتایا تھا کہ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ قیامت تک ہر دور کے لئے معیار ہے اور سُنّتِ نبوی کا انکار دراصل نبوت کا انکار ہے۔ جس زمانہ میں یہ مضامین لکھے گئے تھے، اُسی زمانہ میں پرویز صاحب کے بعض دوستوں اور عزیزوں نے ہمیں خطوط بھیجے تھے، جن میں لکھا تھا کہ اس شخص کے مزاج و طبیعت کا ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے، یہ شخص کسی نہ کسی عنوان سے لیڈر بننا چاہتا ہے کہ میرے کچھ پیرو اور ماننے والے ہوں، میرے نام سے کوئی مکتبۂ فکر و خیال منسوب کیا جائے، یہاں تک کہ سبائیت اور قرامطیت کی طرح تاریخ میں "پرویزیت" کا بھی ذکر آئے لوگ چاہے طنز و ملامت کے ساتھ ذکر کریں مگر کریں تو سہی شہرت نہ سہی، تشہیر تو ہو ؎

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اور ——

یہ جو دورِ حاضر کے بعض مسلم اربابِ فکر سے پرویز صاحب کا مقابلہ کیا جاتا ہے —— تو ان حضرت کی یہی عین تمنا ہے کہ اس قسم کے مقابلہ و موازنہ بلکہ تردید و تنقید سے اور شہرت ہوتی ہے —— خطوط نگاروں کے یہ اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ اور انھوں نے پرویز صاحب کی جو نفسیاتی تحلیل کی تھی اُس کے مظاہر سب کی آنکھوں کے سامنے ہیں!

آج کی دُنیا فکر و عمل کی اس پستی تک اُتر آئی ہے کہ "جھوٹوں کے کلب" قائم ہوتے ہیں اور لوگ فخر و ناز کے ساتھ اُنکی رکنیت قبول کرتے ہیں، "نئے پن" کے اس لپکے نے طرح طرح کی گمراہیاں اور آوارگیاں پیدا کردی ہیں، پرویز صاحب نے دُنیا کے اس مزاج و طبیعت کا اندازہ لگا کر قرآنِ کریم کی تفسیر کے پردے میں ایک ایسے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی ہے، جو ہے تو بے شک "نیا" مگر سرتاپا ضلالت ہے!

پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد کی جو زندگی اور سیرت رہی ہے، وہ سب پر روشن ہے، اس شخص کے دورِ حکومت میں پاکستان کا وقار خاک میں مل گیا تھا، توڑ جوڑ اور سازشوں کی وہ گرم بازاری کہ خدا کی پناہ —— مگر "نظامِ ربوبیت" کے داعی —— پرویز نے غلام محمد اور اُن کی حکومت کو عنوان بدل بدل کر جس طرح سراہا ہے، اُس کے ثبوت میں ماہنامہ "طلوعِ اسلام" کے گزشتہ فائل پیش کئے جاسکتے ہیں، حد ہوگئی جی حضوری، زمانہ سازی اور وقت پرستی کی کہ مسٹر پرویز نے "نبی" کے مماثل بلکہ اس عظیم منصب کے توڑ پر جو "مرکزِ ملت" کا عہدہ تراشا ہے، اُس کو —— مسٹر غلام محمد کی ذات اور حکومت سے نسبت دی گئی۔

—— جو شخص ——

اس درجہ ابن الوقت اور زمانہ کی ہوا کا ساتھی ہو، اُس کی تائید، قصیدہ خوانی اور نیازمندی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس قسم کے مرغانِ بادنما کی اربابِ اقتدار اور حکومتوں کے ساتھ نیازمندی صحرا کے بگولوں اور دریا کے بلبلوں سے بھی زیادہ ناپائدار ثابت ہوتی ہے اس ذہنیت اور مزاج کے لوگوں کی ٹیک ٹک یہ ہوتی ہے کہ اربابِ اقتدار کی وفاداری اور خیر خواہی کی آڑ لے کر اپنے فاسد مشن کو پھیلاتے رہیں۔ مسٹر غلام محمد کی مدح سرائی سے پرویز صاحب کی ذہنی سطح اور کردار کی بوقلمونی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

مسٹر غلام محمد کے دورِ حکومت کے آغاز میں "طلوعِ اسلام" بند ہونے والا تھا، مگر چند دنوں ہی میں اُس کے مالی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ "ہفتہ وار" ہوگیا، اُس زمانہ میں یہ خبر عام طور پر مشہور تھی کہ حکومت پرویز صاحب کی پشت پناہی کر رہی ہے

اب اس کی تفتیش تو موجودہ حکومت ہی کر سکتی ہے کہ "طلوع اسلام" کو اگر مالی امداد دی گئی تھی تو کس بنیاد پر اور کن لوگوں کی سعی و سفارش سے دی گئی تھی اور اُس دور کی بدنام حکومت پرویز صاحب سے کیا کام لینا چاہتی تھی اور وہ کون سرکاری افراد تھے، جو "طلوعِ اسلام" کے مشن سے دلچسپی رکھتے تھے؟

جن باتوں پر تنقید کرنی ہے، اُن کا تو ابھی ذکر ہی نہیں چھڑا اور تمہید دراز سے دراز تر ہوتی چلی جا رہی ہے، قصہ مختصر مسٹر پرویز اپنے سرکاری عہدے سے پنشن لینے کے کچھ دن بعد کراچی سے لاہور چلے گئے، وہاں کی فضا کو انھوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے زیادہ سازگار سمجھا، یہاں تک کہ رسالہ "طلوع اسلام" ایک مستقل جماعت بن گیا، اب شہروں میں جگہ جگہ "بزمِ طلوعِ اسلام" کی شاخیں اور اُس کے ریڈنگ روم قائم ہیں، انقلابی حکومت کے بعد پاکستان کی دوسری جماعتیں ختم کر دی گئیں، "بزمِ طلوعِ اسلام" کے لئے میدان خالی ہے اور وہ اپنے اس موقف سے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

اسلام سیدھا سادہ دین ہے، فطرت کے عین مطابق، اسی لئے اسلام کو "دین فطرت" کہا جاتا ہے، اسلام کے احکام میں کوئی پیچیدگی اور ابہام نہیں، کھلی کھلی باتیں، روشن دلیلیں، نہ اُن میں تضاد ہے اور نہ فلسفیانہ اُلجھاؤ ہے۔ مگر مسٹر پرویز نے اسلام کو جس انداز میں پیش فرمایا ہے، وہ ایک جدید قسم کا عجیب و غریب فلسفہ بن کر رہ گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے سیدھے سادے دین کو منطق و فلسفہ بنا کر، جدید اصطلاحات کے سلاسل و اغلال اُس کو پہنا دینا دین کی سادگی، دین کی فطرت اور دین کے مزاج کے ساتھ ایک طرح کا مذاق نہیں بلکہ ظلم ہے ان حضرت نے "قرآنی نظام ربوبیت" کی ایک اصطلاح وضع کی ہے اور سینکڑوں صفحات میں اسی "نظام ربوبیت" کی شرح فرمائی ہے! اس شرح و تفسیر میں قرآنی فکر تو برائے نام ہے، زیادہ تر پرویز صاحب کے اپنے افکار کی کارفرمائی ہے اور خود اُن کے افکار کا ماخذ و منبع مغربیت اور اشتراکیت ہیں، اور یہ وہ صاحب ہیں جو فقہ و حدیث پر عجمیت کی طنز کرتے ہیں، مگر خود انھوں نے افرنگ و روس سے فکر و خیال مانگ تانگ کر جو اپنی بزم (طلوع اسلام) سجائی ہے، اُس پر کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتے۔

حق و صداقت کی تبلیغ اور دینی مسائل کے افہام و تفہیم کے لئے جدید اصطلاحات سے بھی کام لیا جا سکتا ہے، مثلاً "صلوٰۃ" (نماز) کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کا "نظام الاوقات" (TIME TABLE) ہے، اور نماز مسلمانوں کو وقت کی پابندی بھی سکھاتی ہے، مگر نماز کے خضوع و خشوع، اخلاص و خشیت، تسبیح و تہلیل، رکوع و سجود اور دوسرے ارکانِ عبادت کو پس پشت ڈال کر یا ثانوی درجہ دے کر یا اسے "ظاہری رسم" بنا کر صرف "پابندیٔ وقت" ہی کو نماز کا اصل مقصود ٹھیرا دیا جائے، تو یہ فکر کس قدر غلط کار ہے اور یہ ذہن کس درجہ غلط اندیش ہے، فریضۂ صلوٰۃ کی اہمیت اور افادیت کو صرف "پابندیٔ وقت" کے ارد گرد گھما کر اسی کو اصل مقصود ثابت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عبادت کا مفہوم ہی ذہنوں میں خبط ہو کر رہ جائے گا، اور مسلمان اس احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے کہ "صلوٰۃ" کے اصل مقصد (پابندیٔ وقت (PUNUCTUALITY) کی تکمیل تو یورپ کر رہا ہے ....

اور پھر

یہ فکر نادرہ کار مسلمانوں کو طغیان و فساد اور گمراہی کی اس سطح تک لے آئے گی، کہ جو کوئی وقت کی پابندی کو شعار بنائے گا، وہ "صلوٰۃ" سے بے پروا ہو جائے گا کہ اصل مقصود تو حاصل ہو گیا۔

وہ "نظامِ ربوبیت" ہو یا "توازنِ معاشرہ" کا فلسفہ ہو، پرویز صاحب کے یہاں یہی فکر کام کرتی ہے کہ دین کے ارکان کی فرضیت کا احساس مسلمانوں کے دلوں سے رخصت ہو جائے، اور شریعت کی پابندیوں پر سے مسلمانوں کا ایمان و اعتقاد اُٹھ جائے

پرویز صاحب کا اصل مشن یہی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات اُتار دیں کہ تم جس اسلام پر قائم ہو، وہ دراصل "قرآنی اسلام" ہی نہیں ہے، یہ تو "زمانہ قبل قرآن کا مذہب" ہے، اصل دین اور حقیقی اسلام تو میرے پاس ہے، فرماتے ہیں :-

"..... لیکن اس تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا سارا زور اسی میں صرف ہوتا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے زمانے کے "مذہب" میں تبدیل کر دیا جائے، چنانچہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے، اور آج جو اسلام دُنیا میں مروج ہے وہ زمانۂ قبل قرآن کا مذہب ہو تو ہو، قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ....."

("سلیم کے نام پندرھواں خط" صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲)

پرویز صاحب کی اس عبارت سے اُن کے عزائم اور اصل مشن کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ چاہتے کیا ہیں اور کس مقصد کو لے کر اُٹھے ہیں ————— "زمانہ قبل قرآن کا مذہب" یا تو نصرانیت ہو گا یا یہودیت، یا کواکب پرستی اور بُت پرستی، یعنی کفر و شرک تو پرویز صاحب کے قول کے مطابق، جمہور اُمت یا تو نصرانی ہے، یا یہودی ہے یا کافر و مشرک ہے، بہرحال آج کے مسلمان "قرآنی اسلام" سے ناآشنا ہیں! مفتیوں اور عالموں پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں کہ وہ کفر کے فتوے صادر کرتے رہتے ہیں مگر اُن کے کفر کے فتووں کا تعلق چند افراد یا حد سے حد کسی ایک گروہ یا جماعت سے ہوتا ہے مگر پرویز صاحب نے تو تمام مسلمانوں کے اسلام کو غیر معتبر اور قرآن کے خلاف ٹھیرا دیا۔

کوئی شک نہیں اُمتِ مسلمہ میں عمل و اعتقاد کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں مگر ساتھ ہی اُن خرابیوں کی اصلاح کرنے والے اور ٹوکنے والے بھی تو ہر دور میں پائے گئے ہیں، مثلاً قبر پرستی اور دوسری مشرکانہ رسموں اور بدعتوں کے خلاف شدید احتجاج کیا جاتا رہا ہے اور آج بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ کام جاری ہے! پرویز صاحب کی اس دریدہ ذہنی کو دیکھئے کہ اس تیرہ سو سال کی مدت میں تابعین، تبع تابعین علوم قرآنی اور فقہ و حدیث کے امام اور کیسے کیسے صُلحا، اہل تقویٰ، غازی، مجاہد اور صاحبانِ یقین و عزیمت اکابر گزرے ہیں، مگر پرویز صاحب کی نگاہ میں یہ سب کے سب (معاذاللہ) "اسلام کو قرآن کے پہلے زمانہ کے مذہب میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ..."

————— اور —————

پرویز صاحب کے بقول :-

"..... وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے، اور آج جو اسلام دُنیا میں مروج ہے، وہ زمانۂ قبل قرآن کا مذہب ہو تو ہو، قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔"

تمام مسلمانوں کو بیک جُنبشِ قلم بے دین ٹھیرا دینا، پرویز صاحب کے اُس بغض و نفاق کو ظاہر کرتا ہے، جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے دل کے اندر رکھتے ہیں! جو کوئی امام جعفر صادق، ابوحنیفہ، مالک، احمد بن حنبل، شافعی، سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، اوزاعی، غزالی، عبدالقادر جیلانی، ابنِ تیمیہ، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اکابر مسلمین کے "اسلام" کو نامعتبر اور "زمانہ قبل قرآن کا مذہب" سمجھتا ہے، وہ یا تو فاتر العقل اور خبط الحواس ہے اور یہ نہیں ہے، بلکہ وہ بقید ہوش و حواس ایسی باتیں کرتا ہے تو پھر وہ نفس کے اُس فریب میں مبتلا ہے جو بڑھاوے دے دے کر آدمی کو گمراہی کا مستقل ایجنٹ بنا دیتا ہے۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا)

پرویز صاحب نے "نظامِ ربوبیت" پر سینکڑوں صفحے سیاہ کئے ہیں، یہ اُن کا محبوب ترین موضوع اور اُن کے تمام افکار و تخیلات کا مرکز بلکہ شاہکار ہے، جو لوگ "بزمِ طلوعِ اسلام" سے متاثر ہیں، اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ جب قرآن کریم کی شرح و تفسیر کے بارے میں کوئی اس سطح تک اُتر آئے کہ مجھے تو کوئی نہ کوئی نئی بات کہنی اور جدید فلسفہ پیش کرنا ہے تو پھر قرآن کریم سے ہر "فلسفہ" منسوب کیا جا سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ قرآن کریم تو "انسان کی صحتِ جسمانی" کا نظام پیش کرتا ہے تو وہ قرآن کریم سے اپنے اس خود ساختہ نظریہ کی تائید میں دلیلیں لا سکتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے "قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کا پتلا بنایا، پھر اُس میں رُوح پھونکی ———— تو اصل چیز "انسان کا جسم" ہے، طالوت و جالوت کے قصہ میں بھی "جسمانی قوت" کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے، جسم نہ ہوگا، تو تنہا رُوح کیا کام کر سکتی ہے، انسانی قالب میں داخل ہو کر، روح کی فعالیت ظاہر ہوتی ہے، طوفانِ نوح میں صحت مند اجسام بچا لئے گئے اور مریض اجسام غرق کر دیئے گئے ..... اور "عیشِ جنت" دراصل "صحتِ جسمانی" کا دوسرا نام ہے کہ صحت مند جسم ہی لذتوں سے لُطف اندوز ہو سکتا ہے، بیمار جسم کو تو نسیم صبح کے جھونکے بھی ناگوار گزرتے ہیں ...... اور "عذابِ دوزخ" جسم کی عدمِ صحت کو کہتے ہیں کہ جسم کے لئے مرض بجائے خود مستقل عذاب ہے.. پس قرآنی نقطۂ نگاہ سے "نظامِ جسمانی" ہی کائنات کا مقصود اور غایتِ قصویٰ ہے، مریض جسم کے افکار و تخیلات بھی مریض ہوتے ہیں، "تقویٰ" دراصل اجسام کو بے اعتدالی سے بچانے کا نام ہے، قرآن "صحت مند" انسان ہی کو "متقی" اور "صالح" کہتا ہے یہ مولوی اور مُلّا نے "انسانی جسم" کی معجز نمائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے، یہ صحت مند اجسام ہی تھے جنھوں نے قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت روند ڈالے، جو کوئی علم طب اور حفظانِ صحت کے اصول کو جانتا ہے، اور اُس پر عمل کرتا ہے وہی قرآن کا سب سے بڑا عامل ہے، ہر ڈسپنسری، ہسپتال اور ہر لیبارٹری دراصل قرآنی علوم کی اکیڈیمی ہے، یورپ نے قرآن کے اس راز کو پا لیا، اور وہ ترقی کی معراج پر جا پہونچا، مسلمانوں نے اس حقیقت کو پسِ پشت ڈال دیا، اور وہ ایک بیمار قوم بن کر رہ گئے ...... (وہلم جراً)

اس قسم کی منطق چھانٹنے اور فلسفہ بگھارنے کے بعد وہ شخص یورپ کے ڈاکٹروں کے اقوال پیش کرتا چلا جائے کہ صحت کا دل و دماغ سے کتنا قریبی تعلق ہے، اور صحتِ جسمانی اور صحتِ دماغی میں کس درجہ ربط ہے .... پرویز صاحب نے "نظامِ ربوبیت" کے فلسفہ میں اسی ٹیکنک سے کام لیا ہے، یہی اندازِ بیان ہے، یہی طرزِ فکر ہے، جو افسانوی قالب میں ڈھلتی چلی گئی ہے، اور اس شخص کے دل میں جو خیال آیا ہے، اُس کو وہ "قرآن" سے منسوب کرتا چلا گیا ہے! (اعوذ باللہ من ہذا الہفوات)

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

تحریف و تلبیس قرآن کریم میں جگہ جگہ اور بار بار لفظ "اللہ" آیا ہے، اور اس لفظ کا مفہوم متعین کرنے میں مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، پھر قرآن پاک کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہوا ہے، تو اُن ترجموں میں بھی ہر مترجم نے "اللہ" کا ایک ہی جیسا ترجمہ کیا ہے، ایک عامی سے عامی مسلمان بھی "اللہ" سے "اللہ" ہی مُراد لیتا ہے، وہ جو اس کائنات کا خالق اور سب کا معبود اور رب ہے اور جس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی جنبش نہیں کر سکتا۔

———— مگر ————

پرویز صاحب نے "اللہ" کا جو مفہوم سمجھا ہے، اور اُس کی جو شرح کی ہے، اُس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:-

"رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" (انھوں نے قانونِ خداوندی سے موافقت پیدا کر لی اور وہ قانون اُن کا رفیق و یاور بن گیا)

(قرآنی نظامِ ربوبیت صفحہ ۱۸۰)

اس آیت میں انھوں نے "اللہ" کا ترجمہ "قانونِ خداوندی" کیا ہے۔!

"ان اللہ ھو الرزاق ذوالقوۃ المتین" (اللہ کا نظام رزق دینے والا اور بڑی قوتوں والا ہے)

اس آیت میں بھی "اللہ" کا ترجمہ "اللہ کا نظام" کیا گیا ہے۔ (قرآنی نظامِ ربوبیت ص۱۸۵)

"قرآنی نظامِ ربوبیت" کے صفحہ ۱۴۶ پر ایک آیت (وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ) کی تشریح کی گئی ہے، اُس کے آخری جملے یہ ہیں:۔

"یہ ہے وہ اصول کلی جس کے تحت یہاں کاکاروبار چلتا ہے، باقی وہ رہ سکتا ہے، جو انفرادی مفادِ خویش کی بجائے، کُلی مفادِ انسانیت کا حامل ہو، یہاں ہر شے تغیر پذیر ہے، بجز اس قانونِ ربوبیت کے جو زندگی کی "فراوانیوں اور خوش حالیوں کا ضامن ہے"۔

اس تشریح کے بعد یہ آیت درج کی گئی ہے ——— "کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ" تو اس آیت میں بھی مسٹر پرویز نے "وجہ رب" (یعنی ذاتِ باری) سے "قانونِ ربوبیت" مُراد لیا ہے!

اسی کتاب (قرآنی نظامِ ربوبیت) کے صفحہ ۱۱۶ پر "لَوْکَانَ فِیْہِمَا اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا" میں بھی پرویز صاحب نے "اللہ" سے "معاشی زندگی کا قانون" مُراد لیا ہے، کہتے ہیں:۔

"کیا ان لوگوں نے اپنی معاشی زندگی (ارض) کے لئے الگ الگ قوانین تجویز کر رکھے ہیں جن کی یہ اطاعت کرتے ہیں، اور ان کے سہارے اپنے معاشی پروگرام کو عام کرنا چاہتے ہیں، اگر ان کی یہی روش ہے زندگی ہے، تو اُنہیں سن رکھنا چاہیے کہ اگر انسان کی معاشی زندگی میں کوئی اور قوانین نافذ ہوں اور کائناتی زندگی میں اور تو اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہ ہوگا"۔

——— اور سُنئے ———

"عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ" (....لیکن قانونِ خُداوندی ان محسوس نتائج کے علاوہ، ان نتائج کا حامل بھی ہوتا ہے، جو تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں، اور جو تمہاری مستقبل کی زندگی کو سنوارتے ہیں)

"عزیز" (پھر اس کا بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کا قانونِ ربوبیت بڑی قوتوں کا مالک ہے)، "حکیم" اس لئے یہ نہیں ہوسکتا کہ دُنیا کی کوئی قوت اس پر غالب آجائے اور اسے نتائج مرتب کرنے سے روک دے، نہ ہی وہ خود اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے"۔

(قرآنی نظامِ ربوبیت ص۱۰۳)

"الحمد للہ رب العٰلمین" کا مطلب قرآنِ کریم کے اس عجیب و غریب بلکہ نادر الوجود مفسر کی زبان سے سنیئے:۔

"جس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں وہی معاشرہ مستحقِ تعریف و ستائش ہوگا، جو رب العالمین" (تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم کیا جائے گا......"

(سلیم کے نام بارھواں خط، ص۱۹۴)

"اللہ" کس قدر معروف و مشہور نام ہے، اس میں ذرہ برابر ابہام اور پیچیدگی نہیں، ذو معنویت نہیں، کسی قسم کا تشابہ نہیں اور استعارہ نہیں، مگر پرویز صاحب نے اس مقدس نام (اللہ) کی جو کھلی ہوئی معنوی تحریف کی ہے، اُس کی چند مثالیں اوپر گزر چکی ہیں بے شک یہ حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے معنی اُس کے قانون اور احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ

کا قانون، اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح، نہ الٰہ ہے، نہ رب ہے اور نہ معبود ہے! قرآن کریم نور ہے، نسخۂ ہدایت ہے، ضابطۂ حیات ہے، سراپا حق ہے اور اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دستورِ زندگی ہے، اُس کے ایک لفظ کا بھی انکار کفر ہے، مگر قرآنِ کریم کو ان تمام خصوصیات کے باوجود نہ تو "اِلٰہ" کہہ سکتے ہیں اور نہ "رب"۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کا حکم و قانون (چاہے وہ قانونِ ربوبیت ہی کیوں نہ ہو) ذات و صفات کے اعتبار سے "ایک" نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ اور اُس کے قانونِ ربوبیت کو ایک سمجھنا کتنی بڑی گمراہی اور غلط اندیشی ہے، کائنات کا خالق ارض و سمٰوات کا پیدا کرنے والا، رازق، حی و قیوم، غفور و رحیم، حکیم و علیم اور عالم الغیب والشہادۃ، اللہ تعالیٰ ہے، اُس کا قانون نہیں ہے

سامنے کی بات یہ ہے کہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کی اطاعت میں کیا جاتا ہے، کسے؟ اللہ تعالیٰ کو، اللہ تعالیٰ کے "حکم اور قانون" کو نہیں کیا جاتا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلنا ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت ہے مگر معبود و رب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اُس کا "حکم و قانون" نہیں ہے! دو شخص ہیں ان میں سے ایک اللہ کے قانون کو "الٰہ" مانتا ہے اور دوسرا چاند سورج کو "الٰہ" سمجھتا ہے۔ ان دونوں کے موقف

عربی دانی اور قرآن فہمی تو بڑی چیز ہے، جو کوئی اُردو زبان و ادب کا بھی صحیح ذوق رکھتا ہے اور ساتھ ہی فہم صحیح بھی، وہ "عالم الغیب والشہادۃ" اور "حکیم" سے اللہ تعالیٰ کا "قانون" کیسے مراد لے سکتا ہے، کیا "عالم" و "حکیم" کسی قانون، دستور اور ضابطہ کی صفت ہو سکتی ہے، کیا کسی قانون کو، عالم، حکیم، سمیع، بصیر اور غفور و رحیم کہا جا سکتا ہے!

مثلاً یوں تو کہتے ہیں:

"وہ شاعر بہت ذہین ہے"

یا

"اُس شاعر کی شاعری میں بڑی ذہانت پائی جاتی ہے"

مگر

اس طرح کوئی نہیں کہتا:-

"اُس شاعر کی شاعری ذہین ہے"۔

کیا کیا جائے کہ گفتگو ہی اس نہج پر چل پڑی ہے کہ "فلسفہ و کلام" کا انداز تحریر میں آیا جا رہا ہے۔

وہ یہ کہ

اللہ تعالیٰ کی ذات "صاحبِ ارادہ و شعور" ہے، اُس کا قانون اور حکم نہیں ہے، اس لئے "عالم الغیب والشہادہ" اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اُس کے قانون اور حکم کو غیب و شہادت کا عالم ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

حد ہو گئی کج فہمی اور غلط اندیشی کی کہ پرویز صاحب نے "الحمد للہ رب العالمین" کے سیدھے سادے مفہوم کو بھی تحریف معنوی کا ہدف بنا کر چھوڑا، فرماتے ہیں:-

"جس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں وہی معاشرہ مستحقِ تعریف و ستائش ہوگا جو ربِ العالمینی
(تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم ہوگا"۔

(سلیم کے نام بارھواں خط صـ ۱۹۴)

سمجھ میں نہیں آتا کہ پرویز صاحب کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے کیوں کد ہے کہ قرآن کی جن غیر متشابہ، واضح اور محکم آیتوں میں "اللہ تعالیٰ" کی ذات کے سوا، اور کسی شے کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا، وہاں بھی وہ تحریف و تلبیس سے کام لیتے ہیں، اسی آیت (الحمد للہ رب العالمین)

میں انھوں نے "رب العالمین" سے "معاشرہ" مراد لیا ہے (توبہ! استغفر اللہ)

______ تو کیا ______

یہ "نوعِ انسانی کی ربوبیت کے محکم اصول پر قائم ہونے والا معاشرہ" "مالکِ یوم الدین" بھی ہے، اور اسی "معاشرہ" کی کیا اہلِ ایمان عبادت کرتے ہیں اور اُس سے مدد چاہتے ہیں (ایاک نعبد وایاک نستعین) ______ اور کیا اسی "معاشرہ" سے یہ دُعا کی جاتی ہے کہ ______

"اھدنا الصراط المستقیم" ______

اللہ تعالیٰ کی جگہ "معاشرہ" کو رب العالمین، مالک یوم الدین، معبود اور ہادی بنانے کا جو کارنامہ پرویز صاحب نے انجام دیا ہے اُس کی مثال اسلامی تاریخ وادب میں کہیں نہیں ملتی، یہ وہ گمراہی ہے جس کی خطرناکی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا! (توبہ! توبہ! توبہ)

جس شخص نے "اللہ" کے مفہوم کو بدل کر کچھ سے کچھ بنادیا ہو، وہ قرآنی آیات کے ترجمہ اور تشریح وتفسیر میں جو شگوفہ بھی چھوڑ دے اور جو گل بھی کھلادے، وہ تھوڑا ہے! یہ قرآن کی شرح وتفسیر کیا ہوئی قرآن کی معنوی تحریف ہوئی! اسے "تفسیر بالرائے" کہنا بھی اس لغویت اور خرافات کو وزن دینا ہے ______ یہ تو "تفسیر بالہوا" ہے! اس ذہن وفکر کی پرچھائیں بھی کسی پر پڑ جائے گی تو وہ دین کے معاملہ میں پرلے درجے کا غلط اندیش ہوکر رہ جائے گا ــ یہی وہ نادان مفسرین ہیں جو بقول علامہ اقبال قرآن کو تاویلات سے "پازند" بنادیتے ہیں۔

ختمِ نبوت کا انکار

اللہ تعالیٰ کے بعد "نبی" کے ساتھ پرویز صاحب کا یہ معاملہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "سُنّت" کو دین میں حجت نہیں سمجھتے اور اُسے ایک تاریخی نوشتہ سے زیادہ وزن نہیں دیتے، حالانکہ قرآنِ کریم میں بار بار "اللہ تعالیٰ کی اطاعت" کے ساتھ رسول اللہؐ کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ______ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ.....)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اطاعت" و "سُنّت" کی نفی کردینے کے بعد "ختمِ نبوت" پر انھوں نے اس طرح ہاتھ صاف کیا ہے: ______

> "لیکن اممِ سابقہ اور نزولِ قرآن کے بعد کے دور میں ایک فرق ان سب سے گہرا اور اہم تھا، میں نے تمہیں کسی گزشتہ خط میں بتایا تھا کہ ختمِ نبوت سے مراد یہ ہے کہ اب دُنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں، بلکہ تصورات (Ideologies) کے ذریعہ رونما ہوا کرے گا، اور انسانی معاشرہ کی باگ ڈور اشخاص کی بجائے، نظام کے ہاتھ میں ہوا کرے گی، اسی حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نزولِ قرآن (یعنی ختمِ نبوت) کے بعد اشخاص (Individuals) کا دور ختم ہوگیا، اور ان کی جگہ اُمتوں کا دور شروع ہوگیا، اسی لئے قرآن میں ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد فریضۂ رسالت اور قرآنی معاشرہ کے لئے ایک اُمت کی تشکیل کردی گئی (وکذالک جعلناکم اُمۃً وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس نیز کنتم خیر اُمۃٍ اخرجت للناس۔ (سلیم کے نام پندرھواں خط، صفحہ ۲۵)

بنی انسان ہوتا ہے اور اُمت بھی انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے ______ تو جب انسانوں کا یہ مجموعہ پرویز صاحب کے

بقول "فریضۂ رسالت" کو ادا کیا کرے گا (یا ادا کرتا رہے گا) تو پھر نبوت ختم کہاں ہوئی! رسالت کے فریضہ پر تو اُمّتِ مسلمہ فائز ہے۔
یہاں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ "فریضۂ رسالت اور قرآنی معاشرہ کے لئے جس اُمّت کی تشکیل کردی گئی تھی، وہ اُمّت آخر ہے کہاں؟ تاریخ کے کس دور میں یہ اُمّت وجود میں آئی؟ ——— جب کہ پرویز صاحب کے قول کے مطابق تیرہ سو سال سے مسلمان نزولِ قرآن کے قبل کے "مذہب" کو واپس لانے کی تگ ودو کرتے رہے ہیں، اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوگئے ہیں اور پوری امت کا اسلام "غیر قرآنی" اسلام ہے"۔

پرویز صاحب کی کتاب کا جو اقتباس ابھی ابھی پیش کیا گیا ہے اُس کے ابتدائی جملوں کو ایک بار پھر پڑھئے، اُن کی تحریر سے واضح طور پر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ شخصیتوں یعنی نبیوں کے ذریعہ جو انقلاب آیا کرتا تھا، وہ انقلاب اب بھی آیا کرے گا مگر وہ انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں تصورات کے ذریعہ رونما ہوا کرے گا، اس طرح وہ، حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے بعد "نبوت" کی ضرورت اور اس کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ ختمِ نبوت کے ساتھ ہی "نبوی انقلاب" کا دروازہ بند کردیا گیا، ہدایت وسعادت اور دین واخلاق کا جو انقلاب آنا تھا وہ آچکا، اس آخری انقلاب میں اب کوئی "تصور" نہ کمی کرسکتا ہے اور نہ اضافہ! اس انقلاب کی ہاں! تجدید ہوتی رہے گی ——

——— پھر ———

پرویز صاحب کا یہ فرمانا کہ "اب دُنیا میں انقلاب، شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ تصورات (IDEOLOGIES) کے ذریعہ رونما ہوا کرے گا" کس درجہ مضحکہ خیز اور واقعیت کے خلاف ہے، اُن دماغوں کو کیا کہیئے، جو اس قسم کی بے دانشی کی باتوں کو پڑھتے ہیں، اور اُن سے متنفر ہونے کی بجائے، اُن کا اثر قبول کرتے ہیں!

برایں عقل ودانش بباید گریست

سوال یہ ہے کہ یہ "تصورات" جن کے ذریعہ دُنیا میں انقلاب پیدا ہوا کرے گا، آخر کیا ہوا میں پلتے جائیں گے، یا پانی کی موجوں پر! یا پھر یہ "تصورات" (IDEOLOGIES) بادلوں کے ٹکڑوں، درختوں کی چھالوں اور پہاڑوں کی چٹانوں پر لکھے ہوئے ملا کریں گے! تصورات کا تعلق تو ہر حال میں انسانوں ہی کے ذہن وفکر اور دل ودماغ سے ہے،

——— تو پھر ———

انقلاب کے لئے "شخصیتوں (نبیوں) کا دور ختم کہاں ہوگیا، یہ "تصورات" تو بہر حال انسانی ذہن وفکر ہی میں پائے جائیں گے؟
جن فلسفیانہ نکتوں کے ساتھ پرویز صاحب نے اُمّتِ مسلمہ کے متفقہ عقیدہ "ختمِ نبوت" کی نفی اور تردید کی ہے، اُس سے اس شخص کے عقیدہ، فکر، عزائم اور مشن کا اندازہ ہوسکتا ہے! "نبوت" کے جاری اور باقی رکھنے کے لئے جو نکتے مسٹر غلام احمد پرویز کو سوجھے ہیں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کہاں سوجھے تھے!!

"الصّلوٰۃ" کی تحریف

قرآنِ کریم میں بار بار "قیامِ صلوٰۃ" کا حکم آیا ہے، اس حکم کی شرح وتفسیر پرویز صاحب کی زبان سے سُنیئے:—

"آج جبکہ مسلمانوں میں صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز، پرستش یا ہندی زبان میں پوجا پاٹ ہو کر رہ گیا ہے، یہ سمجھنا ذرا دشوار ہے کہ "قیامِ صلوٰۃ" کا صحیح مفہوم کیا ہے، ہمارے ہاں "قیامِ صلوٰۃ" کا ترجمہ کیا جاتا ہے "نماز قائم کرو" اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ نماز

پابندی کے ساتھ پڑھو، اور اس سے مقصود ہوتا ہے، خدا کی پرستش، اس لئے آج یہ بات بہ مشکل سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس "پرستش" کو "معاشی امور" سے کیا واسطہ! یہ شبہ کوئی نیا نہیں وحی کی طرف سے ہمیشہ دین (نظامِ زندگی) ملتا تھا، لیکن اسے انسان رفتہ رفتہ مذہب (دھرم) میں بدل دیتے تھے، اسی طرح دین کے وہ تمام عناصر جو نظامِ زندگی کے ستون تھے، رفتہ رفتہ پوجا پاٹ میں بدل جاتے تھے، اور ان کا انسانی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تھا، یہی کچھ سابقہ اقوام نے کیا، اور یہی کچھ مسلمانوں سے ہوا (قرآنی نظامِ ربوبیت صـ ۱۵۸)

کوئی شک نہیں مسلمانوں میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، کتنے ایسے مسلمان ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دین کو مکمل ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی سمجھنے کی بجائے اُسے چند ارکانِ عبادت کا صرف مجموعہ سمجھے ہوئے ہیں، اور وہ نماز میں تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں، لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل سے گریز اور پس و پیش کرتے ہیں ———— مگر مسلمانوں نے یہ نہیں کیا اور ہرگز نہیں کیا کہ "صلوٰۃ" حقیقت میں تھی تو کوئی اور چیز لیکن مسلمانوں نے اُسے "نماز" میں بدل دیا، قرآنِ پاک میں نماز کے اوقات کا اور وضو کا حکم آیا ہے، رکوع و سجود کا ذکر ہے، اس کا حکم ہے کہ "صلوٰۃ" (نماز) میں قرآنِ کریم کا کچھ حصہ تلاوت کیا جائے، تو وہ "صلوٰۃ" جس کے قیام کا قرآن میں حکم وارد ہوا ہے جس میں اقامت و قعود ہے، رکوع و سجود ہے، تلاوتِ قرآن اور تسبیح و تہلیل ہے، اسی صلوٰۃ کو مسلمان ادا کرتے ہیں، نماز کے ان ارکان پر جو قرآن سے ثابت ہیں "پوجا پاٹ" کی پھبتی خود قرآنِ کریم پر طنز ہے۔

قرآنِ کریم ہی میں "تبدیلِ قبلہ" کا حکم آیا ہے کہ بیت المقدس کی بجائے کعبۃ اللہ کو نماز ادا کرنے (اقامتِ صلوٰۃ) کی جہت مقرر کیا گیا ———— تو یہ "جہتِ قبلہ" نماز کے لئے تبدیل کی گئی تھی یا "معاشی نظام" کا رُخ بدلنے کے لئے اس جہت کو بدلا گیا تھا، قرآنِ کریم میں مسجد کا جو ذکر آیا ہے، تو یہ مسجد عہدِ رسالت میں نماز پڑھنے کے لئے بنائی جاتی تھیں یا اُن میں بازار لگتے تھے، اور خرید و فروخت ہوتی تھی ———— قرآنِ کریم حکم دیتا ہے:-

"یاایہا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع"

(اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے، تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو)

اسی حکم کی تعمیل میں نمازِ جمعہ کے لئے پابندی کے ساتھ اذان دی جاتی ہے اور مسلمان جمع ہوکر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے (یعنی نماز ادا کرتے) ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل پر کون صاحبِ ایمان اور ذی ہوش انسان "پوجا پاٹ" کی طنز کرسکتا ہے! پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ نماز (اللہ کی پرستش) کا تعلق معاشی امور سے ہے، مگر قرآن نماز ادا کرنے کے لئے "معاشی امور" (خرید و فروخت) کے چھوڑنے کا حکم دیتا ہے، اس قرآنی آیت سے کم از کم یہ تو ثابت ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "الصلوٰۃ" (نماز) کو "معاشی امور" پر ترجیح دی ہے ——— قرآنِ کریم کی اسی سورۃ میں آگے چل کر اُن مسلمانوں کو ٹوکا گیا ہے، جو جمعہ کا خطبہ چھوڑ کر کھیل تماشے اور معاشی امور (تجارت) میں منہمک ہوجاتے تھے

قرآنِ کریم کا وہ مفسر اور شارح جس کا دل خوفِ خدا سے لبریز ہوگا، اور جو قرآنی تعلیمات کو جانتا ہوگا "الصلوٰۃ" کی شرح کرتے ہوئے، مسلمانوں کو نصیحت کرے گا کہ "صلوٰۃ" دین کا بہت بڑا ستون ہے، لیکن مسلمانوں کی اکثریت ترکِ صلوٰۃ کرکے اس ستون کو ڈھا

دے رہی ہے، جو مسلمان نماز پڑھتے ہیں، اُن میں بہت سے ایسے ہیں کہ جو پورے خضوع و خشوع اور توجہ کے ساتھ نماز نہیں ادا کرتے وہ نماز کیا پڑھتے ہیں بیگار سی ٹالتے ہیں، پھر "صلوٰۃ" کی جو تعریف قرآن میں آئی ہے کہ وہ فحش و منکر سے روکتی ہے، یہ چیز بھی نمازیوں سے عام طور پر ظاہر نہیں ہو رہی ہے، نمازیوں کا عالم یہ ہے ؎

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

ایک نمازی کی عبادت ہی نہیں معاملات بھی درست ہونی چاہئیے، "حق اللہ" کی طرح "حق العباد" بھی اُس پر فرض ہے، اُس میں مالی ایثار کا جذبہ بھی ہونا ضروری ہے، مسجدوں کے زیر سایہ بھی لوگ بھوکے اور ننگے رہیں، تو نمازیوں سے آخرت میں اس غفلت کی سخت باز پُرس ہوگی۔ صرف نماز پڑھ کر لوگ اس بھُلاوے میں نہ رہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر دیا، مُسلمان کو اپنی پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہونا چاہیئے، آج کے مادہ پرست دور میں بعض مسلمان ناداری اور غریبی کے سبب دوسروں کے ہتھے چڑھ کر اپنے دین و ایمان کو گنوا بیٹھتے ہیں، مسلمانوں کو چاہیئے کہ ناداری اور محتاجی کو خوشحالی سے بدلنے کے لئے جدوجہد کریں کہ محتاجی (فقر) آدمی کو کفر کے قریب تک پہنچا دیا کرتی ہے۔!

اس انداز و اسلوب پر مُسلمانوں کو نصیحت کی جائے، تو اس کے اچھے اثرات ظاہر ہونگے، ایک طرف "اقامتِ صلوٰۃ" کی فرضیت اور اہمیت کا انہیں احساس ہوگا کہ دین کے جس پروگرام میں "نماز" شامل نہ ہو، وہ دین کا نہیں بے دینی کا پروگرام ہے، دوسری طرف نماز کے اوقات کے علاوہ، زندگی کے دوسرے کاروبار اور شعبوں میں بھی وہ احکام خداوندی کی تعمیل کی طرف مائل ہونگے۔ یعنی یہ کہ ایک مُسلمان کو چوبیس گھنٹے "مُصلّی" (نمازی) بن کر زندگی گزارنی چاہیئے، جس طرح وہ نماز میں طہارت کا خیال رکھتا ہے، اور اللہ کے حکم پر رکوع و سجود کرتا ہے، اسی طرح پوری زندگی میں اُس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرنی ضروری ہے، اور اُس کے فکر و خیال اور اعمال کو پاکیزہ و طاہر ہی ہونا چاہیئے۔

مگر

پرویز صاحب کی تحریروں کے جو اقتباسات اوپر پیش کئے گئے ہیں، اُنہیں پڑھ کر، ایک مسلمان کے دل سے "صلوٰۃ" کی اہمیت ہی جاتی رہے گی، وہ "صلوٰۃ" اور دوسرے ارکانِ دین کے مقابلہ میں "معاشی امور" کو زیادہ اہمیت اور ترجیح دے گا بلکہ "معاشی امور" ہی کو دین کی اساس سمجھے گا، پرویز صاحب نے معاشی امور کو دین کا محور قرار دے کر، درحقیقت کارل مارکس کے مشن کی تبلیغ کی ہے اور اس طرح دین کے ساتھ اور قرآنی تعلیمات کے ساتھ انھوں نے ظلم کیا ہے۔

سلیم کے نام تیرھویں خط میں (صہ۲۱۰) پرویز صاحب فرماتے ہیں:-

"سورۂ اعراف میں دیکھو، قانونِ خداوندی کے ساتھ کامل تمسک کا دوسرا نام اقامتِ صلوٰۃ رکھا گیا ہے۔

والذین یمسکون بالکتب واقاموا الصلوٰۃ ط انا لا نضیع اجر المصلحین۔

(متقی وہ ہیں) جو قانونِ خداوندی کے ساتھ پورا پورا تمسک رکھتے ہیں، یعنی صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں، یہی وہ ہمواریاں پیدا کرنے والے (مصلحین) ہیں جن کے اعمال ضرور نتیجہ خیز ہوتے ہیں)

"تمسک بالکتاب یعنی قانونِ خداوندی کا عملاً اتباع ناممکن ہے، جب تک کہ دین کا نظام عملاً جاری و ساری نہ ہو، اور چونکہ اقامتِ صلوٰۃ بھی اسی نظام ہی سے وابستہ ہے، اس لئے اقامتِ صلوٰۃ ناممکن ہے" بغیر تمکن فی الارض (یعنی کسی خطۂ زمین میں قرآنی حکومت قائم کئے بغیر) ناممکن ہے"

اقامتِ دین کے لئے تمکن فی الارض اور قرآنی حکومت کے قیام کی ضرورت بلکہ فرضیت سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے، یہ جدوجہد تو جاری ہی رہنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اسی کا قانون چلے، اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو، اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہو کر رہے، پورا معاشرہ قرآنی اخلاق کے قالب میں ڈھل جائے، قرآنی ضابطۂ حیات، اور اس منشورِ ہدایت و فلاح کے مقابلہ میں دنیا کے تمام دساتیر و قوانین پر خطِ تنسیخ پھیر دیا جائے ——— مگر یہ شرط قطعاً لغو و بے بنیاد ہے بلکہ صلوٰۃ کی فرضیت کو باطل کرنے والی ہے کہ قرآنی حکومت کے بغیر، اقامتِ صلوٰۃ ممکن ہی نہیں ہے۔

تاریخ و سیر اس کی شہادت دیتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کو تمکن فی الارض حاصل نہیں تھا۔ اور نہ وہاں قرآنی حکومت قائم تھی مگر اس تیرہ سال کی مدت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام برابر نماز پڑھتے رہے ہیں اس اقامتِ صلوٰۃ پر انھوں نے کافروں کی دی ہوئی طرح طرح کی اذیتیں برداشت کی ہیں، مگر کھل کر اور چھپ کر، نمازیں ضرور ادا کرتے رہے ہیں

پھر صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین ہندوستان، چین اور دوسرے ملکوں میں پہونچے ہیں جہاں قرآنی حکومت کی جگہ کافرانہ نظامِ حکومت غالب تھا، وہاں بھی انھوں نے اقامتِ صلوٰۃ کے فریضہ کو نہیں چھوڑا، انھوں نے زمین کے ایسے خطوں میں مسجدیں بنائی ہیں جہاں دین کو تمکن فی الارض حاصل نہیں تھا، جو لوگ تمکن فی الارض اور قرآنی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد میں "اقامتِ صلوٰۃ" کے فریضہ کو جان بوجھ کر پس پشت ڈال دیتے ہیں، وہ قرآنی حکومت تو کیا قائم کریں گے ہاں! مزدک اور کارل مارکس کی تعلیمات کی اساس پر حکومت اور سوسائٹی قائم کر سکتے ہیں۔ اور پرویز صاحب خیر سے یہی مشن لے کر اٹھے ہیں اور اسی اشتراکیت زدہ "نظامِ ربوبیت" کے لئے تگ و دو فرما رہے ہیں۔

سعودی عرب میں ملوکیت کے باوجود نظامِ شریعت کو البتہ غلبہ حاصل ہے ——— ورنہ آج کی دنیا میں قرآنی حکومت کسی خطہ میں بھی نہیں پائی جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمان اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود فریضۂ صلوٰۃ کی تعمیل سے غافل نہیں ہیں ——— لیکن پرویز صاحب کے نظریہ کے مطابق قرآنی حکومت کے بغیر "اقامتِ صلوٰۃ" ممکن ہی نہیں ہے تو اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ نمازیں "اقامتِ صلوٰۃ" کے علاوہ کچھ اور چیز ہیں، اور صدیوں سے مسلمان جو نمازیں پڑھ رہے ہیں، تو وہ معاذ اللہ کوئی ایسا کام کر رہے ہیں، جس پر[1] "اقامتِ صلوٰۃ" کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا ——— یہ کیا فکر ہے، یہ کیا ذہنیت ہے، سوچنے کا کیا طریقہ ہے؟ تمکن فی الارض اور قرآنی حکومت قائم کرنے کی آڑ میں "اقامتِ[1] صلوٰۃ"۔

[1] "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے ص ۸۷ کے حاشیہ میں پرویز صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ——— "وہ اجتماعات جو اس مقصد کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں (اور جنہیں موقت فریضہ نماز کہا جاتا ہے) ان کے لئے بھی قرآن نے یہی لفظ "الصلوٰۃ" استعمال کیا ہے وہ بھی اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہیں" ——— صفحہ کے صفحے پر پرویز صاحب نے یہ بات دلوں میں اتارنے کے لئے سیاہ کئے ہیں کہ "موقت فریضہ نماز" ـ "اقامتِ صلوٰۃ" کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، کتاب کے حاشیہ میں انھوں نے جو یہ ایک فقرہ لکھ دیا ہے، یہ اس تاثر کا ازالہ نہیں کر سکتا، جو وہ "موقت فریضہ نماز" کے خلاف دلوں میں پیدا کر چکے ہیں، زہر کے پیالوں پر

(بقیہ نوٹ: اگلے صفحہ پر)

کی فرضیت کا اس طرح انکار، جو مسلمان نماز پڑھتے ہیں، اُن کو یہ باور کرانے کی کوشش کہ تم ایک عبث فعل کر رہے ہو، اور جو بدبخت نماز سے غافل ہیں، اُن کے اس گناہِ عظیم (ترکِ صلوٰۃ) پر انہیں مطمئن کرنے کی سعی کہ تم سے کوتاہی نہیں ہو رہی ہے کہ تمکن فی الارض کے بغیر "اقامتِ صلوٰۃ" ممکن ہی کہاں ہے!! ——— گمراہی اور ضلالت کا یہ وہ مقام ہے، جہاں آدمی خود گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے،

چند قرآنی اصطلاحات

"اللہ" کی "ختم نبوت" کی "الصلوٰۃ" کی مسٹر پرویز نے شرح و تفسیر فرما کر جس تحریف و تلبیس کا ثبوت دیا ہے، اُس کی مثالیں اُوپر گزر چکی ہیں ——— اب ہم "چند قرآنی اصطلاحات" کو پیش کرتے ہیں، جو مسٹر پرویز کی کتاب "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے باب چہارم سے لی گئی ہیں۔

"حق" :۔ کسی عمل کا تعمیری (constructive) پہلو جو ٹھوس نتائج کی شکل میں سامنے آئے اور اپنی جگہ پر اٹل ہے

"باطل" :۔ کسی عمل کا تخریبی (destructive) پہلو، جو منفی نتائج پیدا کرے"۔

حق و باطل کی پرویز صاحب نے جو تعریف (definition) بیان کی ہے، وہ بڑے اُلجھاووں میں ڈالنے والی بات ہے۔ لُغات القرآن جلد دوم (مولفہ مولانا عبد الرشید نعمانی) میں "حق" کی جو تعریف کی گئی ہے وہ کس قدر واضح اور سُلجھی ہوئی ہے:۔

"حق کے اصلی معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں، اور" اس کا استعمال چار طرح پر ہوتا ہے

(۱) اس ذات کے لئے جو اپنی حکمت کے اقتضاء کی بنا پر کسی شے کی ایجاد فرمائے، اللہ تعالیٰ کو اسی لئے "حق" کہا جاتا ہے ارشاد باری ہے:۔

"وردوا الی اللہ مولٰہم الحق"

(پھیر دیں جائیں گے اللہ کی طرف جو اُن کا مالک حق ہے) اور فذالکم اللہ ربکم الحق (سو یہی ہے اللہ تمہارا پروردگار حق) (۲) "وہ چیز جو حکمت کے مقتضٰی کے مطابق ایجاد کی گئی ہو، اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کل فعل حق ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:۔ ھوالذی جعل الشمس ضیاءً والقمر نوراً وقدرہ منازل لتعلموعدد السنین والحساب ۵ ما خلق اللہ ذالک الا بالحق (وہی ہے جس نے بنایا سورج کو روشن اور چاند کو اُجالا، اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو، یہ سب اللہ نے نہیں بنایا مگر حق کے ساتھ) یعنی چونکہ سورج کی چمک، چاند کی دمک اور اُس کی منزلوں کا تقرر تاکہ برسوں کا حساب اور شمار ہو سکے۔ یہ سب حکمتِ الٰہی کے مقتضا کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس لئے سب حق ہے۔

(۳) کسی شے کے متعلق وہ اعتقاد رکھنا، جو نفس الامر کے مطابق ہو، چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ

(بقیہ نوٹ، صفحہ گزشتہ) پہلے پلا کر ایک، آدھ چٹکی سفوف سے بھلا اس زہر کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ پھر یہاں بھی انھوں نے گمراہ کن نکتہ شناسی سے کام لیا ہے۔ وہ یہ کہ "موقت فریضہ نماز" کو "اقامتِ صلوٰۃ" کا ایک جز ٹھیرایا ہے، حالانکہ رسول اللہ صلعم نے "موقت فریضہ نماز" ادا کر کے ہی "اقامتِ صلوٰۃ" کے فریضہ کی تعمیل فرمائی تھی، اور اقامتِ صلوٰۃ کا یہ تواتر، قرآنِ کریم کے تواتر کی طرح ثابت ہے! "اقامتِ صلوٰۃ" کے محاسن اور اُس کے نتائج پر البتہ گفتگو کی جا سکتی ہے مگر قرآنِ کریم میں جس "اقامتِ صلوٰۃ" کا حکم آیا ہے، وہ یہی "موقت فریضہ نماز" کی ادائگی ہے! اور "نفسِ اقامتِ صلوٰۃ" میں دوسری چیز شامل نہیں ہے!

فلاں اعتقاد حق ہے، ارشاد ہے فہدی اللہ الذین آمنو لما اختلفو فیہ من الحق باذنہ (پھر اللہ نے اپنے ارادہ سے ایمان والوں کو اس حق کی ہدایت فرمائی، جس میں وہ جھگڑ رہے تھے)

(۴) وہ قول یا فعل جو اسی طرح واقع ہو، جس طرح پر کہ اُس کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو کہ، جس مقدار اور جس وقت میں اس کا ہونا واجب ہے، چنانچہ قول حق اور فعل حق اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے، ارشاد ہے، "لکن حق القول منی لاملئن جہنم (لیکن یہ بات میری طرف سے ثابت ہو گئی کہ مجھ کو دوزخ بھرنی ہے)" آیت شریفہ "ولو اتبع الحق اھوا ءھم لفسدت السموات والارض ومن فیھن" (اور اگر پیروی کرے حق اُن کی خواہشوں کی، تو آسمان اور زمین اور جو کوئی انکے بیچ میں ہیں خراب ہو جائیں) میں "حق" سے ذات باری تعالیٰ بھی مراد لی جا سکتی ہے اور وہ حکم بھی جو حکمتِ الٰہی کے مقتضی کے مطابق ہو، یہ بھی واضح رہے کہ حق کا استعمال واجب، لازم اور جائز کے معنی میں بھی ہوتا ہے، جیسے، وکان حقا علینا نصر المومنین (اور ہم پر ایمان والوں کی مدد لازم ہے) اور کذالک حقا علینا ننج المومنین (اسی طرح ذمہ ہے ہمارا، ہم ایمان والوں کو بچا دیں گے)

باطل:- "غلط، ناحق، جھوٹ، حق کی نقیض اور ضد ہے، جستجو کرنے سے جس چیز کے متعلق یہ پتہ چلے کہ وہ بے ثبات ہے، اسی کو باطل کہتے ہیں، ارشاد ہے، ذالک بان اللہ ھو الحق وان ما یدعون من دونہ ھو الباطل (یہ سبب اس کا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے حق ثابت، اور اس کے سوائے جس کو پکارتے ہیں نابید ہو جانے والا ہے) اور اسی اعتبار سے ہر قول یا فعل جو بے ثبات ہو، باطل کہلاتا ہے، قول کی مثال، "لم تلبسون الحق بالباطل" (کیوں ملاتے ہیں صحیح میں غلط) اور فعل کی مثال "وحبط ما صنعوا فیھا وباطل ما کانوا یعملون" (اور ضائع ہو گیا، جو کیا تھا، اُس جگہ اور مٹ گیا، جو کچھ عمل کرتے تھے)

قرآنِ کریم کے مفسرین وشارحین اور قرآنی لغت جاننے والوں کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے قرآنی الفاظ کے لئے اصطلاحات نہیں گھڑتے اور سیدھی سادی عام فہم بات کو چیستاں نہیں بناتے، پرویز صاحب نے "حق وباطل" کی شرح، تعمیری نتائج اور تخریبی نتائج سے جو کی ہے، اُس نے حق و باطل کے مفہوم کو اُلجھا دیا ہے۔ انھوں نے جب "نتائج" کا ذکر کیا ہے تو یہاں "آخرت" کا ذکر کرنا ضروری تھا کہ حق و باطل کے تمام نتائج اس دُنیا ہی میں ظاہر نہیں ہو جاتے، اور اگر حق و باطل کے لئے دُنیوی نتائج کو معیار قرار دیا جائے تو حق و باطل مُلتبس ہو کر رہ جائیں گے، مثلاً کمیونزم کے بعض تعمیری نتائج آج سامنے آ رہے ہیں، تو کیا اُنہی کو "حق" سمجھ لیا جائے، جھوٹ کو اس دُنیا میں خاصہ فروغ حاصل ہوتا ہے، تو اس فروغ کے سبب جھوٹ کو کیا "تعمیری" کہہ سکتے ہیں؟

آج کی دُنیا میں عورتوں کے حسن کے نیم عُریاں مقابلے ہوتے ہیں، اور جس ملک کی عورت اس انتخاب میں آجاتی ہے، بین الاقوامی دُنیا میں اُس ملک کا بڑا پروپیگنڈہ ہوتا ہے ——— تو ملکوں اور حکومتوں کے "تعارف و شہرت" کے اعتبار سے حسن کے یہ مقابلے

۱؎ "حق" عربی زبان اور قرآنی لغت میں کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر "اللہ" کے معنی صرف اس خدا کے ہیں جو معبود ہی۔ رب ہی خالق ہے اور عالم الغیب والشہادہ ہے۔ (م۔ق)

"تعمیری نتائج" کے حامل ہوتے ہیں، مگر دینی نقطۂ نگاہ سے یہ "تعمیری نتائج" کھلے ہوئے فسق کی حیثیت رکھتے ہیں! "قرآن کریم اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے "بیانِ مبین" ہے، اس کی تفسیر و شرح بھی انتہائی سلجھی ہوئی اور واضح ہونی چاہیے ——— یہ کیا کہ "حق" و "باطل" جیسی محکم اصطلاحیں جن کا سادہ مفہوم ایک عامی سے عامی مسلمان بھی جانتا ہے، اُن کو بھی فلسفیانہ تشریح کر کے اُلجھا دیا جائے، اور اس شرح و تفسیر کو اس قدر گنجلک، مبہم، ذو معنی اور پہلو دار بنا دیا جائے کہ مشرکین و کفار اور فسق و فجور کرنے والے بھی اپنے نقطۂ نگاہ سے جن کو "تعمیری نتائج" سمجھتے ہیں، اُن کے لئے پرویز صاحب کی اس تفسیر سے دلیل لا سکیں۔

"فضل" :- معاشی سہولتیں، رزق کی فراوانی" (قرآنی نظامِ ربوبیت)

کوئی شک نہیں کہ "فضل" میں معاشی سہولتیں اور رزق کی فراوانی بھی شامل ہے، قرآنِ کریم میں متعدد آیتیں اس مضمون کی آئی ہیں، جہاں رزق و معاش کی فراوانی اور سہولتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے "فضل" سے تعبیر فرمایا ہے ——— مگر "فضل" کی جو تشریح پرویز صاحب نے کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ ادھوری اور یک رُخی ہے بلکہ اس سے بہت سی غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی راہیں کھلتی ہیں، کارل مارکس کے تمام افکار و تخیلات کا محور اور منبع "معاشی نظام" ہے، اُس کے نزدیک "اخلاق و مذہب" کی اصل بھی معاشیات ہی قرار پاتی ہے۔ پرویز صاحب کے دل و دماغ پر بھی کارل مارکس کا یہ معاشی فلسفہ چھایا ہوا ہے، اس لئے انھوں نے قرآنِ کریم کی تفسیر و تشریح میں بھی مارکسی فکر سے کام لیا ہے بلکہ اُس کی ترجمانی کی ہے، اور اس طرح اللہ کے کلام کو "ژندپاژند" بنا دیا ہے۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں "فضل" رزق کی فراوانی اور معاشی سہولتوں کے لئے بھی وارد ہوا ہے، مگر پرویز صاحب نے اس اصطلاح کی ترجمانی اور تشریح میں "جزء" کو "کل" اور "فرع" کو "عین" قرار دیا ہے، جو معانی و بیان کے نقطۂ نگاہ سے بھی غلط ہے۔

"فضل" کے معنی ہیں ——— بھلائی کرنا، بڑھنا، مہربانی کرنا، احسان، زیادتی (زائد ہونا) ترجیح دینا ......!
سامنے کی بات یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں وہ شخص "افضل" ہے، تو کیا اس سے صرف یہ مُراد ہوتی ہے کہ شخص مذکور مال و دولت اور رزق و معاش میں بڑھا ہوا ہے، علم و اخلاق اور سیرت و کردار کی فضیلت کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے! نیکی کی ہدایت اور ایمان و اخلاق کی دولت اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل ہے۔

قرآن کہتا ہے :- تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ط وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ط

(یہ سب) رسول ہیں کہ فضیلت دی ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر (ان میں) کوئی تو وہ ہے جس سے اللہ نے کلام فرمایا اور بلند کئے بعضوں کے درجے! اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلے ہوئے معجزے دیئے اور رُوح القدس کے ذریعہ اُس کو قوت دی)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی "فضیلت" (ان پر فضل فرمانے) کا بیان کرتے ہوئے، معاشی سہولتوں کا ذکر نہیں کیا، ایک اور آیت ہے :-

"وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا"

(اور اگر نہ ہوتا، اللہ کا فضل تم پر اور اُس کی رحمت، تو تم میں سے ایک شخص بھی نہ سنورتا)

اس آیت میں سیرت و کردار کی تقدیس اور نفس کے تزکیہ کو اللہ تعالیٰ کے "فضل" کا سبب بتایا گیا ہے ——— اور ———

"وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا" ط ـــــ

(اور مسلمانوں کو خوشخبری سُنا دے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑی بزرگی ہے)

اس آیت میں "فضل" سے مُراد دُنیا اور آخرت کی بزرگی اور برتری ہے اور اس میں جسم و روح اور معاش و اخلاق کی تمام اچھائیاں شامل ہیں۔

"طیبات" :۔ "زندگی کی خوشگواریاں" (قرآنی نظامِ ربوبیت)

"طیبات" میں زندگی کی خوشگواریاں بھی شامل ہیں، مگر اس قرآنی اصطلاح (طیبات) کا مسٹر پرویز نے جو ترجمہ کیا ہے، اُسے پڑھ کر انسان میں نیکی کا کوئی داعیہ یا جذبہ پیدا نہیں ہوتا! بلکہ اس ترجمہ میں غلط فہمیوں اور غلط کاریوں کے لئے رخنے اور گنجائشیں موجود ہیں، مثلاً یہ ـــــ کوئی شخص تھوڑی سی شراب پی کر جس سے سُکر پیدا نہ ہو اور ناچ گا کر زندگی کو خوشگوار بناتا ہے تو پرویز صاحب کے نقطہ نگاہ سے وہ قرآن کی اصطلاح ـــــ طیبات ـــــ سے صحیح فائدہ اُٹھاتا ہے، اور آج کی دُنیا میں "طیبون" مغرب اور روس کے رہنے والے ہیں، جو زندگی کی خوشگواریوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔۔۔! یہ اندازِ فکر قرآنی فکر کی نقیض اور ضد ہے ـــــ توبہ!

"طیبٰت" ستھری اور پاک چیزوں کو کہتے ہیں! مثلاً ایک عورت ناچ گا کر پیشہ کر کے اپنی زندگی کو خوشگوار بناتی ہے، تو پرویز صاحب نے اس قرآنی اصطلاح کا جو ترجمہ کیا ہے اُس کے لحاظ سے اُس عورت کا یہ فعل "طیبات" (زندگی کی خوشگواری) میں داخل ہے مگر قرآنی نقطہ نگاہ سے وہ "طیب" نہیں "خبیث" فعل ہے۔

"طیب" ۔ نعمتوں اور لذت و خوشگواری کی اشیاء کے ساتھ نیکیوں کو بھی کہتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو بھی! قرآنِ پاک میں "طیبون" (طیب کی جمع بحالت رفع) سے پاکیزہ اور مردانِ نیکوکار مُراد ہیں! "طیب" کے مفہوم میں "پاکیزگی" بہرحال شامل ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے:۔

"المومن اطیب من عملہ والکافر اخبث من عملہ"۔

(مومن اپنے عمل سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے، اور کافر اپنے عمل سے بھی زیادہ خبیث ہے)

عربی کا محاورہ ہے:۔

"ھٰذا طیبٌ لک"[1] (یعنی یہ تمہارے لئے حلال ہے)

تو "طیبٰت" سے زندگی کی وہ خوشگواریاں مُراد ہیں، جو اللہ اور رسول ؐ کے نزدیک حلال اور جائز ہیں، پرویز صاحب نے اس اصطلاح کا ترجمہ اپنی افتادِ طبع کی بنا پر خالص مادی نقطہ نگاہ سے کیا ہے، جس میں حلال و حرام کا اشارہ تک نہیں کیا۔ اس فکر و مزاج سے اللہ تعالیٰ کی پناہ!

"اعمالِ صالحہ" کا ترجمہ اور اس کی تشریح پرویز صاحب نے یُوں کی ہے۔

"انسانی ذات اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرنے والا پروگرام وہ اعمال جو انسان کی صلاحیتوں کو اُبھار کر نشوونما دیں"۔

نیکی، تقویٰ، صالحیت۔۔۔۔۔ اس قسم کے تمام لفظوں سے پرویز صاحب کو چڑ ہے، نیکوکاری کا کوئی تصور ہی وہ ذہن و قلب

---

[1] "طیب" خوشبو کو بھی کہتے ہیں، اس محاورہ میں "طیب" کی "ی" مشدد نہیں ساکن ہے۔

میں پیدا کرنا نہیں چاہتے! اور "خشیتِ الٰہی" کا کوئی خانہ اُن کے مرقعِ افکار میں سرے سے پایا ہی نہیں جاتا، انھوں نے "اعمالِ صالحہ" کی جو ترجمانی فرمائی ہے، اُس کے آخری جز کی رُو سے تو ایک بُت تراش، بُت بنا کر اور صنم تراش کر، "صالح" ہونے کا دعوےٰ کرسکتا ہے کہ اس طرح اُس نے اپنی "صلاحیتوں کو اُبھارا ہے"، یہ فلموں کے ایکٹر اور ایکٹرسیں اور کلب گھروں اور ڈانسنگ ہالوں کے رقاص، یہ سب کے سب "عمل صالح" ہی کے تحت اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے رہے ہیں، اور یہ "آرٹ سرکل" (Art Circle) عملِ صالح کے سب سے بڑے مراکز ہیں ..... ! (نعوذ باللّٰہ من ہذہ الفکر والھفوات)

"تقویٰ" کا ترجمہ اور مفہوم پرویز صاحب نے ان لفظوں میں کیا ہے:-

"معاشی پروگرام[1] کو مستقل اقدار (قانونِ خداوندی) کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا اور اس طرح فرد اور معاشرہ کو خوف اور حزن سے محفوظ کرلینا"۔

کوئی شخص نہ نماز پڑھے، نہ روزہ رکھے، نہ حج کرے، بس "معاشی پروگرام" کو مستقل اقدار کے ساتھ ہم آہنگ رکھ سکے تو پرویز صاحب کی نگاہ میں وہ "صاحب تقویٰ" ہے۔ "تقویٰ" کے لئے اُن کے یہاں فکروخیال کی طہارت اور سیرت وعمل کی پاکیزگی کی کوئی شرط اور پابندی نہیں ہے، کوئی شخص عورتوں سے پیشہ کراکے اور انہیں چکلے میں بٹھا کر، اگر معاشی پروگرام کو متوازن رکھ سکتا ہے تو اُسے صاحبِ تقویٰ کہا جائے گا۔ کسی حکومت کے ہر شعبہ میں سُود (ربا) کا کاروبار ہوتا ہو، شراب اور قمار بازی کا ٹیکس اُس کی آمدنی میں شامل ہو اور اس آمدنی سے معاشی پروگرام کو تقویت ملتی ہو، تو مسٹر پرویز کی زبان میں اسے تقویٰ کہہ سکتے ہیں، اُن کے نقطۂ نگاہ سے مُتقین کا سب سے بڑا امام اور پیشوا کارل مارکس گزرا ہے، جس نے معاشی پروگرام کے سوا اور کوئی چیز پیش ہی نہیں کی، ہم اس حقیقت کے مُنکر نہیں ہیں کہ ایک متقی انسان کو معاشرے کی معاشی فلاح کی بھی فکر کرنی چاہیئے مگر صرف "معاشرے کی معاشی فلاح" ہی تو "تقویٰ" نہیں ہے ایک شخص معاشی پروگرام کے ذریعہ معاشرے کو مُتوازن بنانے کی تگ ودو کرتا ہے مگر ساتھ ہی شراب پیتا، جوا کھیلتا اور بدکاری کرتا ہے ——— تو کیا ایسے شخص کو "صاحبِ تقویٰ" کہہ سکتے ہیں، پرویز صاحب کے نقطۂ نگاہ سے روس اور امریکہ کی حکومتیں "تقویٰ" کے تقاضوں کو پورا کررہی ہیں کہ وہاں فرد اور معاشرہ کو ہر قسم کی معاشی سہولتیں حاصل ہیں۔

عربی کی مشہور متداول لغت "المنجد" کا مولف (لوئس معلوف) عیسائی ہے، اُس تک نے "التقویٰ" کا ترجمہ:——

"مخافۃ اللّٰہ والعمل بطاعۃ"

(اللہ کا خوف اور اُس کی اطاعت وحکم کے مطابق عمل) کیا ہے۔

درصل قرآن میں "تقویٰ" اِن معنوں میں استعمال ہوا ہے:-

"نفس کو ہر اُس چیز سے بچانے کا نام ہے، جو گناہ کی طرف لے جائے، یہ بات ممنوعات کے اجتناب سے حاصل ہوتی ہے"۔ (لغات القرآن)

جو شخص "معاشرہ" کو "اللہ" اور "رب العٰلمین" سمجھتا ہو، اُس کی قطع وبرید، تاویل وتحریف اور تفسیر بالھوا سے قرآن کی دوسری اصطلاحات کس طرح محفوظ رہ سکتی ہیں۔

---

[1] پرویز صاحب نے معاشی پروگرام اور مستقل اقدار کی جس انداز میں اپنی کتابوں میں تشریح کی ہے وہ بہت کچھ اُن کے ذہن وفکر کی پیداوار ہے!

دعوت و اصلاح

معاشی مسائل کی ضرورت اور اہمیت کے ہم منکر نہیں ہیں۔

اور

یہ بھی درست ہے کہ معاشیات کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے، اور "دین" سے معاشیات کو "دُنیوی امور" کہہ کر خارج نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام "دین و دُنیا" کے مجموعہ کا نام ہے، "حق اللہ" اور "حق العباد" اسلام میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں "جسم اور رُوح" ان دونوں کے جائز تقاضے پورے ہونے چاہئیں!

جو کوئی اپنے اندر اللہ کا خوف، اُمت کی فلاح کا جذبہ، قرآن کی صحیح فہم اور دینی اقدار کا شعور رکھتا ہوگا، وہ مسلمانوں کو اس انداز میں نصیحت کرے گا کہ وہ "حق اللہ" کے ساتھ "حق العباد" کو بھی پہچانیں! خالص معاشی مسائل کی اہمیت جتاتے ہوئے بھی، قرآنی اخلاق اور دینی ارکان و فرائض کی ضرورت اور اُن کے وزن کو ہلکا نہ ہونے دے گا! مسلمانوں کو مال و دولت کے انفاق اور ایثار کے لئے یقیناً اُبھارا جائے گا کہ وہ اپنے نفس اور اپنے گھر بار والوں کی غور و پرداخت اور پرورش کے ساتھ مخلوقِ خدا کے انسانی حقوق بھی ادا کریں، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نماز، روزہ اور دوسرے ارکان کے ساتھ اس کی بھی باز پُرس کرے گا کہ تم نے اپنی زندگی کن کاموں میں صرف کی تھی، تمہارا مال کس کام آیا تھا اور دوسری توانائیوں سے تم نے کیا کام لیا تھا؟ مال کو سینت کر اور جوڑ جوڑ کر رکھنا اور انفاق فی سبیل اللہ سے جی چُرانا، بہت بڑا گناہ ہے، قارون اور شائیلاک کی ذہنیت، اسلام سے ہرگز میل نہیں کھاتی۔

اس کے ساتھ اسلام کی سادگی کو واضح کیا جائے گا کہ وہ شاہانہ کروفر اور دکھاوے کے ٹھاٹ باٹ کی زندگی کو پسند نہیں کرتا، زندگی میں سادگی آجانے سے معاش کے بعض مسائل آپ ہی آپ حل ہو جاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ زندگی کی بعض مصنوعی ضرورتیں غیر ضروری قرار پاتی ہیں!

عوام کے ساتھ اربابِ اقتدار سے یوں کہنا چاہیئے کہ وہ خلفاء راشدین کی مقدس زندگیوں کو اپنے سامنے رکھیں، یہ نفوسِ قدسیہ اپنی ذات پر کم سے کم خرچ کرتے تھے اور اپنے کو قوم کا خادم سمجھتے تھے، وہ جس اسلامی حکومت کی زمام سنبھالے ہوئے تھے، اُس حکومت کے مداخل (income) میں کوئی ایسی مد شامل نہ تھی جس میں اُن ذریعوں سے مال و دولت آتا ہو، جن کو اسلام ناجائز قرار دیتا ہے، اسی طرح اُن کی حکومت کے مخارج (expenditure) بھی نیک، حلال اور جائز امور میں صرف ہوتے تھے، رعایا کی زیادہ سے زیادہ معاشی فلاح اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے، معاشی امور کی تدبیر کے ساتھ اسلامی حکومت عوام کی اخلاقی تربیت کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔

اسی انداز پر اگر قوم اور اُس کے اکابر کو مخاطب کیا جاتے اور اللہ اور رسول کی اطاعت کی طرف بلایا جائے تو قوم کی پسندیدہ طور پر اصلاح ہو سکتی ہے! اسلام کے کسی ایک جزء یا ضرورت کو، تمام دوسرے اجزاء اور ضرورتوں پر اس طرح غالب کر دینا، کہ دوسرے فرائض کی اہمیت ہی دلوں سے نکل جائے اور یہ ایک جزء یا ضرورت ہی دین و دُنیا کی سب سے بڑی حقیقت اور ضرورت ٹھہر جائے، نہ عقلاً درست ہے اور نہ دینی نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ ہے ——— مثلاً کوئی شخص قرآن کی صرف اُن آیات ہی کو پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سُنایا کرے، جن میں مغفرت، شفاعت اور جنت کی بشارت دی گئی ہے اور صرف "تبشیر" ہی کو اپنا موضوع بنالے، تو اس مبالغہ اور یک رُخی تعلیم و تبلیغ کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا کا جذبہ سرد پڑتا چلا جائے گا، اسی طرح صرف اُن آیتوں کی تلاوت اور تعلیم سے جن کا تعلق "تنذیر" اور "وعید" سے ہے، مسلمانوں کے دلوں میں سخت مایوسی اور بددلی پیدا ہو جائیگی صحیح تدبیر اور ایمانی فراست یہ ہے کہ بشارت اور وعید دونوں کی اس حُسنِ تناسب اور اعتدال کے ساتھ تعلیم دی جائے کہ

قلب مومن "بیم و رجا" کے درمیان دھڑکتا ہے، اسی لئے تو خدا کے آخری نبی کو مُبشّر کے ساتھ مُنذر بھی بنا کر بھیجا گیا تھا۔
صرف صبر کی تعلیم دینے سے، دلوں سے عزیمت کے رُخصت ہو جانے کا امکان ہے، صرف تنہا دریا دلی پر لوگوں کو اُبھارنے سے اسراف و تبذیر کی طرف لوگوں کا میلان ہو جائے گا، صرف جسم کی صحت کو موضوع فکر و نظر بنانے سے رُوح کے تقاضے نظر انداز ہو جائیں گے، مقصد عرض کرنے کا یہ ہے کہ دین و دُنیا کی ہر ضرورت، نیکی، فریضہ اور اُس کے وظیفۂ عمل (function) کو حسنِ تناسب کے ساتھ پیش کرنا چاہیئے اور اُس کو اُس کے فطری اور جائز مقام پر رکھنا چاہیئے!

بے شک غزوۂ تبوک کے موقعہ پر حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے اپنا تمام مال و دولت اور حضرت عمر فاروق رضؓ نے اپنی نصف دولت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ اس ایثار کا ذکر کرتے ہوئے، یہ حقیقت بھی تو پیش نظر رکھنی بلکہ سامنے لانی چاہیئے کہ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی ایک وقت کی بھی نماز قضا نہ ہوتی تھی، راتوں کو وہ سجدوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور روتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کی ہو بہو نقل اُتارنے کا اپنے امکان کی حد تک اہتمام کرتے تھے! اُس دورِ سعید کا مقدس معاشرہ معاشی مسائل کی بنیاد پر نہیں کتاب و سُنّت اور اخلاق و تقویٰ کی بنیادوں پر استوار تھا اور کتاب و سُنّت کے اتباع نے اُن کے معاشی مسائل کو بھی دُرست کر دیا تھا۔ اُس قرآنی معاشرے میں نہ تو ناچ گانے کی محفلیں جمتی تھیں اور نہ عورتوں کے حسن کے مقابلے ہوتے تھے! اور نہ سُودی کاروبار ہوتا تھا، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کے لئے اس پاکیزہ معاشرے میں سرے سے کوئی گنجائش ہی نہ تھی

—— تو جو کوئی بھی ——

ملت کی اصلاح کا حقیقی جذبہ اپنے اندر رکھتا ہوگا، وہ ملت کو "معاشیات" کی طرف نہیں بلکہ عہدِ رسالت اور دورِ خلافت راشدہ کے پاکیزہ قرآنی معاشرے کی طرف بُلائے گا کہ یہ وہ مثالی معاشرہ تھا جس میں دین و دُنیا کا صحیح توازن پایا جاتا تھا، اس قرآنی معاشرے نے ایسے صاحبِ تقویٰ اور اہلِ عزیمت انسان پیدا کئے تھے، جنھوں نے دُنیا کی سب سے بڑی جاہلیت کی حکومتوں کو شکست دے کر اسلامی حکومت قائم کی تھی اور رُوم و ایران کی جگمگاتی تہذیب اپنی تمام دلچسپیوں اور رنگینیوں کے باوجود انہیں متاثر نہ کر سکی تھی یہ اُن فتحمندوں اور کشور کشاؤں کا معاشرہ تھا، جن کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان چمکتے تھے، جو اطاعتِ رسولؐ کے جذبے سے سرشار تھے اور زمانہ جن کی عفت و عصمت، پاسِ عہد، وفا، صدق و امانت اور اخلاص و بے نفسی کی قسم کھاتا تھا، اور دُنیا میں نیکی جن کے نام اور کام سے پہچانی جاتی تھی۔

—— مگر ——

جناب پرویز جس نام نہاد "قرآنی معاشرے" (؟؟؟) کی تشکیل کا نعرہ لگا رہے ہیں، وہ معاشرہ عہدِ رسالت اور خلافت کے معاشرے سے بالکل مختلف ہے، پرویز صاحب مُسلمانوں میں جس معاشرے کا قیام چاہتے ہیں، اُس کو تقویٰ سے، صالحیت سے، خشیتِ الٰہی اور آخرت کی ذمہ داری اور جواب دہی سے کوئی واسطہ نہیں، اُس کی رُوح اور مصدر و منبع صرف "معاشیات" اور مادی تقاضے ہیں، یہ وہی اندازِ فکر ہے جس نے مارکس، فرائڈ اور ڈاروِن کی عقل و فکر کو انسانیت کے لئے عذاب بنا دیا۔

"زر، زن، اور زمین" کی اشتراکیت کا فلسفہ سب سے پہلے مزدک نے پیش کیا تھا، جس میں کارل مارکس نے ہیگل کی جدلیات کا پیوند لگا کر ایک مستقل فلسفہ بنا لیا، یہ فلسفہ مجوسیت اور یہودیت کا مرکز اتصال اور سنگم ہے —— پرویز صاحب نے اسی مجوسی معاشی نظریۂ اشتراکیت اور یہودی "نظامِ ربوبیت" کو اپنی کتابوں میں پیش کیا ہے اور اس کے لئے انھوں نے قرآن کی مشہور معروف اور محکم اصطلاحات میں ایسی ایسی تحریفیں کی ہیں کہ ایمان لرز جاتا ہے، شاعروں کے شعروں کی شرح میں شارحین جس ذمہ داری

سے کام لیتے ہیں، پرویز صاحب نے قرآن کی شرح میں اتنی ذمہ داری کا بھی ثبوت نہیں دیا۔ قرآنِ کریم کو وہ اپنے تراشے ہوئے نظریوں کی خراد پر چڑھاتے چلے گئے ہیں، قرآنی آیات کی تاویل میں صاحبِ موصوف، باطنی ملاحدہ سے بھی منزلوں آگے نکل گئے ہیں!

زبان و قلم کی زیادہ سے زیادہ آزادی کے ہم قائل ہیں، مگر پرویز صاحب اس آزادی سے فائدہ اُٹھا کر قرآنِ کریم کی جو معنوی تحریف کر رہے ہیں اور قرآنی احکام کی "روح" کو بدلے دے رہے ہیں، اُس کے بارے میں ہم چند اجمالی اشارے کئے دیتے ہیں۔

"فوجی قانون" کی شرح اور اُس کی اصطلاحات کی ترجمانی کوئی شارح اس انداز پر کرنے لگے:-

"پریڈ (PARADE) نام ہے عسکری روح کو متحرک رکھنے کا! جسے لوگوں نے اپنی نادانی سے، ورزش، ڈرل اور صبح سویرے اُٹھ کر لفٹ رائٹ کرنے سے بدل دیا! عسکری رُوح کو متحرک رکھنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ فوجیوں کے اندر نشاط انگیز ولولہ موجزن رہے اور یہ نشاط چاہے اُنہیں پانی میں تیر کر، گھوڑے پر چڑھ کر، سبزے پر ٹہل کر، گا نا سُن کر یا خود گا نا گا کر اور ناچ کر یا تاش اور شطرنج کھیل کر حاصل ہو، بہرحال "نشاط" کا حصول ضروری ہے! عسکریت اور نشاط یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

ملٹری یونیفارم military-uniform کو کسی مخصوص لباس اور وردی میں محدود کر دینا، فوجیوں کے جذبہ آزادی کو طوق و زنجیر پہنا دینے کے مترادف ہے!

"ملٹری یونیفارم" کہتے ہیں۔" قومی انفرادیت کے امتیاز کو! یعنی فوجیوں کی تنظیم اور اُنکے اجتماعی کردار کو دیکھ کر، دیکھنے والے محسوس کر سکیں کہ یہ کردار فلاں قوم کا امتیازی کردار ہے! یہی اجتماعی کردار فوج کی یونیفارم ہے مخصوص قسم کے لباس کی یکسانی کا تصور عہدِ غلامی کی یادگار ہے ۔۔۔"

"فوجی اصطلاحات" کی اس قسم کی شرح و ترجمانی کو کیا کسی عنوان بھی برداشت کیا جاسکتا ہے؟؟ ہرگز نہیں، فوج کے ذمہ دار عہدیدار چیخ اُٹھیں گے کہ "نظامِ عسکریت ــــ اجتماعی کردار ــــ اور عسکری رُوح، جیسی دل کش اور پُر فریب اصطلاحات کی آڑ میں، یہ تو فوجی نظام کو تباہ کرنے کی چال چلی جا رہی ہے، فوج میں ڈسپلن ہی باقی نہ رہا تو فوجیوں کا اجتماعی کردار کس طرح تشکیل پا سکے گا ــــ یہی حال پرویز صاحب کا ہے کہ انھوں نے "قرآنی نظامِ ربوبیت" ــــ قرآنی معاشرہ ــــ مرکزِ ملت ــــ "جیسی نظر فریب اصطلاحات تراش کر، قرآن کی معنوی تحریف کا کام شروع کر دیا ہے، جس کے ہاتھوں دین کی کوئی قدر بھی محفوظ نہیں رہ سکتی اس شخص کی جُراَت کا یہ عالم ہے کہ "قرآن کی معنوی تحریف" کی غرض سے جو انجمن "بزمِ طلوعِ اسلام" کے وجود میں آئی ہے، اُس کے لئے وہ اپنی تحریروں میں اس کا مطالبہ کر چکا ہے کہ اس "بزم" کے علاوہ پاکستان میں کسی دینی جماعت کو باقی ہی نہ رکھا جائے، قرآنی حکومت اور قرآنی معاشرے کی کس طرح تشکیل ہو سکتی ہے؟ اس کے لئے "بزمِ طلوعِ اسلام" سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کی جائے! آہ! اس قدر کھلی ہوئی گمراہی اور اس قدر کھلے خزانے باقاعدہ تنظیم کے ساتھ!

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

آخری گذارش

اگر کوئی شخص اس نادانی پر جم جائے کہ میں قرآنِ کریم کو خود ہی سمجھوں گا یہاں تک کہ احادیث و آثار سے بھی قرآن کی تفہیم میں کوئی مدد نہ لوں گا اور جو کچھ سمجھوں گا اس کو قلم بند کرتا چلا جاؤں گا۔ اس شخص کے اندر خلوص بھی ہو تو

اُسے قرآن کریم کی شرح وتفسیر میں اگرچہ جابجا شدید ٹھوکریں لگیں گی، اور طرح طرح کی غلطیاں اُس سے سرزد ہوں گی مگر قرآن کی معنوی تحریف کی وہ شخص دانستہ جرأت نہ کرسکے گا — لیکن پرویز صاحب نے یہ کیا ہے کہ پہلے انھوں نے چند نظریئے وضع کیے ہیں، پھر قرآن کریم کو ان نظریوں کا تابع بناکر قرآن کی تفسیر فرمائی ہے، جس کا نتیجہ لازمی طور پر یہی نکلنا چاہیے تھا کہ قرآن کریم کی تعلیمات مجروح اور قرآن کی معنویت محرف ہوتی چلی جائے — وہ قرآنِ کریم کے پیچھے چلنے کی بجائے، قرآنِ کریم کو اپنے افکار وتصورات کے پیچھے چلانا چاہتے ہیں —

قرآنِ کریم سمجھنے میں سب سے زیادہ مستند ومعتبر چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہوسکتی ہے کہ خود قرآن کریم اس کی شہادت دیتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تلاوتِ قرآن کے علاوہ کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیۂ نفس کے لئے بھی مبعوث اور مامور فرمایا تھا، بالکل سامنے کی بات ہے کہ جس ذاتِ گرامی پر قرآن نازل ہوا تھا، قرآن کے منشاء اور مفہوم کو اُس سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے،

مگر

پرویز صاحب نے سب سے پہلے "کتاب وحکمت کی تعلیم" یعنی سُنّتِ نبوی ہی پر ہاتھ صاف کیا، اور احادیث کو یک قلم بے اعتبار ٹھیرایا، اور عجمی سازش سے تعبیر کیا، اب رہے صحابہ کرام جو خود حاملین قرآن بھی تھے اور وحیٔ الٰہی کے مخاطبین اولین بھی تھے اور خود مہبط وحی (علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم) کے تربیت یافتہ اور سنوارے ہوئے بھی تھے، اُن کے اقوال وآثار اور مسلکِ زندگی کا قرآنِ کریم کی تفہیم اور عملی تعلیم میں بہت کچھ دار ومدار سُنّتِ رسولؐ پر ہے، تو سُنّتِ رسولؐ اور ارشاداتِ نبویؐ کو بے اعتبار اور بے وزن ٹھیرا دینے کے بعد، صحابہ کرام کے اقوال وآثار آپ ہی آپ ساقط الاعتبار ہوجاتے ہیں (معاذاللہ)

اب رہ جاتے ہیں کتاب وسُنّت اور حدیث وفقہ کے جاننے والے ائمہ اور عُلماء، اُن کے بارے میں پرویز صاحب یہ رائے رکھتے ہیں کہ تیرہ سو سال سے مُسلمان اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ نزولِ قرآن سے قبل کے "مذہب" کو پھر واپس لے آئیں اور اس کوشش میں مُسلمانوں کو کامیابی بھی ہوگئی، اسی طرح مسٹر پرویز نے تیرہ سو سال کے تمام مفسرین، محدثین، فقہا اور اربابِ صلاح وتقویٰ کی تمام علمی اور دینی کوششوں پر خطِ تنسیخ کھینچکر، اُن کے مسلک کو قرآن کا مخالف اور معاند ٹھیرا دیا۔

احادیث رسولؐ، اقوالِ صحابہ اور وہ ائمہ اور علماء جن کو قرآن "اہل الذکر" کہتا ہے، ان تین ذریعوں سے قرآن کی تفہیم میں بہت کچھ مدد مل سکتی تھی، مگر پرویز صاحب نے ان تینوں ذریعوں ہی کو بے اعتبار اور ناقابل حجت واستدلال ٹھیرا کر اپنے لئے میدان صاف کرلیا! اسی طرح دُنیا کے پردے پر کسی کا قول اور عمل اُن کے لئے نہ حجت ہے اور نہ سند ہے! وہ اپنی ذات سے خود حجت وبرہان واقع ہوتے ہیں۔

اسلامی تاریخ بہت سے اہل تقویٰ اور صُلحاء اُمت کی نشاندہی کرتی ہے، ان کے قول وعمل کا دینی مسائل میں وزن مانا جاتا ہے — ان نیک نہاد بزرگوں کو پرویز صاحب نے اس طرح ناقابلِ اعتناء قرار دیا کہ "عمل صالح" اور "تقویٰ" کے معنیٰ ہی بدل ڈالے، اور چونکہ معاشی پروگرام کو مستقل اقدار سے ہم آہنگ کرنے کا فن اُنہیں نہیں آتا تھا، تو یہ بزرگ اہل تقویٰ ہی کب تھے، ان مُلاؤں اور قل اعوذی مولویوں نے ان لوگوں پر خواہ مخواہ صالحیت اور تقویٰ کو چپکا دیا ہے —

تو ——— اب لے دے کر

پرویز صاحب کی ذات ہی پر نگاہِ انتخاب جاکر ٹھیرتی ہے کہ نزولِ قرآن سے لے کر اب تک قرآن کو اُس کی حقیقی معنویت اور اصل

مفہوم و منشاء کے ساتھ صرف پرویز صاحب نے سمجھا ہے، قرآنِ کریم کے جس لفظ اور جس اصطلاح کا مفہوم وہ متعین کر دیں وہی عین حق ہے! ——— پس دریا برد کردو احادیث نبوی ؐ کے تمام مجموعوں کو اور آگ لگادو قرآن کی ساری تفسیروں کو اور لپیٹ کر رکھدو فقہ و اخلاق کے تمام دفتروں کو، قرآنِ کریم کی شرح و ترجمانی کا واقعی حق تو پرویز صاحب نے ادا کیا ہے، اسی لئے انہی کے افکار معتبر ہیں، مستند ہیں اور لائق اعتماد ہیں، تیرہ سو سال کی مدت میں بس یہی ایک ایسی شخصیت ظہور میں آئی ہے جو قرآنی اسلام اور "قرآنی" معاشرے کی داعی ہے اور جس نے قرآن کے صحیح منشاء کو پالیا ہے۔

انکار حدیث کا یہ فتنہ[1] جو قرآنِ کریم کی معنوی تحریف تک جا پہونچا ہے، جو دین کی مُسلّمہ اور متفقہ اقدار تک کو اُلٹے دے رہا ہے اور جس کے گمراہ ہونے میں کسی تاویل و شبہ کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے، اس سے اہل ایمان کو بچانا اہلِ علم اور اربابِ فکر کا فرض ہے، یہ آگ جو دین و ایمان کو خاکستر بنانے کے لئے بھڑکائی گئی ہے، اس کی فتنہ سامانی کو خاموش تماشائی بن کر نہیں دیکھا جاسکتا، ہم نے اللہ تعالیٰ کے حضور آخرت کی پوری ذمہ داری اور جواب دہی کے احساس کے ساتھ جس بات کو حق سمجھا اُسے ظاہر کر دیا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کہنے، حق پر چلنے اور ناحق کا مقابلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم!

---

[1] جو صاحبِ خیر اس مضمون کو مفید سمجھیں کہ اس کی اشاعت سے اچھے نتائج مرتب ہونگے، وہ چاہیں تو اس مضمون کو کتابی صورت میں شوق سے چھاپ سکتے ہیں، اس مضمون کے "نقل و اخذ" کی عام اجازت ہے۔

مرزا محمد یعقوب

مسئلہ توحید کی تاریخ

اس کائنات ہستی میں بے حدوشمار موجودات ایسی ہیں جن کی تاریخ پیدائش سائنس والوں اور ماہرین آثار قدیمہ کو معلوم نہیں ہو سکی اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔ بڑے بڑے مفکرین نے اس بحر بے کراں میں عقلی گھوڑے دوڑائے لیکن ساحل مقصود کا پتہ نہ ملا بقول سعدیؒ ؎

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار　　کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

مثلاً آجتک کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ سورج کی تاریخ کیا ہے اور نہ کوئی یہ بتا سکا کہ یہ خوب صورت چمکتا ہوا چاند کب عالم وجود میں آیا۔ یہ درخشندہ ستارے اور سیارے کسی دن افلاک پر نمودار ہوئے تھے۔ بارش کی ابتدا کب ہوئی بادل کس دن بنے تھے، اندھیرے دن اجالوں کا یوم آغاز کون سا ہے یہ سربفلک پہاڑ اور ٹیلے، زمین اور بے انتہا عمیق سمندر کب عالم شہود میں ظاہر ہوئے، الغرض جمادات، نباتات اور حیوانات کے مبداء، وآغاز کی حقیقت وکیفیت سے کوئی بشر آج تک آگاہ نہ ہو سکا۔ اس سوال کے متعین جواب میں کتب سماویہ بھی خاموش ہیں اور جدید وقدیم ارباب دانش بھی اس گتھی کو سلجھا نہ سکے۔ سب سے پیشتر انسان کا یوم پیدائش ہی پردہ خفا میں ہے۔ بعض مغربی مفکرین تخمین وقیاس کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے اور انسانی دماغوں میں مزید پریشانیاں اور حیرانیاں پیدا کر دیں۔ ڈاروِن نے اپنے مشہور نا قابل فہم وقبول نظریہ ارتقا کے تحت انسان کی موجودہ شکل وہیئت کو "ارتقائی عمل" کا نام دیا۔ آجکل ملحدین کی ایک جماعت اسی مذکورہ بالا غلط اور بے بنیاد عقیدہ ونظریئے کی بڑے فخر وناز کے ساتھ اشاعت کر رہی ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کے پاس نہ تو نقلی دلائل وبراہین کا کوئی ذخیرہ ہے اور نہ عقلی شواہد وبینات کے اسلحہ سے مسلح ہیں۔ محض مفروضہ افکار کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔

اسی طرح مسئلہ توحید کے متعلق بھی ایک عجیب وغریب تاریخی نظریہ بڑے شد ومد کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ بعض پڑھے لکھے "جاہل" ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان نے جب اس عالم شہادت میں قدم رکھا تو مناظر قدرت کی عظمت وجلالت کے نظاروں سے مرعوب ہو گیا۔ پہاڑوں کی بلندی۔ بادلوں کی گرج۔ بجلی کی چمک۔ آبی اور بادی طوفانوں کا زور دیکھ کر اس کے دل ودماغ پر خوف وہراس طاری ہوا جس کے نتیجے میں تصور عبودیت پیدا ہوا۔ کیوں کہ انسان نے ان اشیاء کے ضرر سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ان دیکھی خفیہ طاقتوں کی دہائی دینی اور ان سے پناہ طلب کرنی شروع کی اور ان خیالی طاقتوں کو دیوی دیوتاؤں کے مختلف فرضی نام دے کر ان کے ناموں کی نذر ونیاز اور منتیں ماننے لگا۔ انہیں متصرف اور کارساز سمجھتے ہوئے تدریجی طور پر شرک کے مختلف مراحل طے کرتا رہا۔ پھر جوں جوں ان اشیاء کی حقیقت سمجھتا اور ان کو استعمال میں لاتا گیا اس کا خوف دور ہوتا گیا اور دیوتاؤں کی تعداد میں کمی ہوتی گئی یہاں تک کہ آخرالامر سلیم الفطرت اور سلیم الوجدان محقق انسان بھی پیدا ہوئے جنھوں نے پورے سوچ بچار کے بعد ایک ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کا فطری تصور پیش کیا۔ چونکہ یہ تصور پیش کرنے والے عوام وخواص میں پاک سیرت، صحیح اور شائستہ اوصاف واخلاق کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے بنی نوع انسان نے انہیں رشی، گرو، نبی اور رسول کے معزز خطابات دیئے۔ یہ ارباب ارتقا کا نقطہ نظر ہے۔

صحائف آسمانی کی رُو سے جس طرح اللہ کی ذات قدیم ہے اسی طرح مسئلہ توحید بھی ازلی حیثیت رکھتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی واحد ویکتا ذات کے سوا کوئی اور چیز موجود نہ تھی تو سب سے پہلا اعلان جو خدائے تعالیٰ نے کیا وہ قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق شہد اللہ انہ لاالہ الا انا تھا یعنی یہ پہلا کلمہ "لا الٰہ الا انا" پھر جو جو اشیاء عالم وجود میں آتی گئیں بزبانِ حال یا بزبانِ قال توحید باری تعالیٰ کا اعتراف و اقرار کرتی گئیں۔ کروڑوں سال تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ زمین بنی نوع انسان کی رہائش کے قابل ہو گئی قبل از تخلیقِ انسان یہ زمین حیات کا مسکن تھی۔ جب جنات نے اجتماعی طور پر رب العالمین کی بغاوت کی توجنات کو باقاعدہ سزا دی گئی اور مسند خلافت سے الگ کر دیا گیا۔ پھر ذوالجلال والاکرام نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ملائکہ کے سامنے ارادہ ظاہر فرمایا۔ حضرت آدم کو پیدا کیا گیا۔ تمام مناسب صفات واخلاق بھی عطا فرمائے گئے۔ علم و نور دیا گیا اور مسئلہ توحید سے حضرت آدم کا ذہن مجلّی اور مزین کیا گیا۔ اس انتظام کے بعد محض مسئلہ توحید کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم الشان اجتماع منعقد فرمایا۔ اس اجتماع میں نسل انسانی کے قیامت تک پیدا ہونے والے جملہ افراد کی ارواح کو مثالی اشکال وصور میں متشکل کر کے اور قوت نطق و شعور عطا کر کے بلایا گیا۔ اس عالمگیر اجلاس میں انبیا ورسل علیہم السلام کی مقدس ارواح بھی ہیں اور اولیائے کرام اور مومنین و کفار بھی۔ ان کے الگ الگ گروپ بنائے گئے۔ انبیا الگ حلقوں میں تشریف فرما تھے اور دیگر بنی آدم کو علیٰ حسب مراتب و مناصب مقامات مناسب پر کھڑا کیا گیا۔ اس اہتمام کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک جامع خطاب فرمایا۔ یہ خطاب اولین قرآن مجید میں موجود ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ۔ یعنی یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو ان کے نفسوں پر گواہ ٹھہرایا اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ تمام ارواح نے متفق اللسان ہو کر جواب دیا کہ کیوں نہیں ہے اللہ تو ہی ہمارا رب ہے اور تو ہی ہمارا الٰہ ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی ہمارا الٰہ ہے نہ رب۔ یہ اقرار لینے کے بعد فرمایا کہ یہ میثاق وعہد تم سے اس لئے لیا جا رہا ہے کہ کہیں تم قیامت کے روز اپنی غفلت یا آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کا عذر نہ پیش کر سکو۔ آج میرے سامنے تم سب کے سب میری لاشریک لہٗ الوہیت اور ربوبیت کا اعتراف کر رہے ہو۔ باپ بیٹے سب موجود ہیں۔ میں سات آسمانوں اور زمینوں کو تم پر گواہ بنا رہا ہوں۔ اور تمہارے ابا جان حضرت آدم بھی موجود ہیں اور یہ ساری کارروائی اپنی آنکھوں اور کانوں سے دیکھ اور سن رہے ہیں لہٰذا اگر تم نے دُنیا میں جا کر اعتراض کیا اور یہ وعدہ بھلا دیا۔ سرکشی اختیار کی تو پھر تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا اور یہ بھی سن لو کہ اتمام حجت کے لئے نظامِ رسالت قائم کروں گا۔ تمہاری اس عہد و میثاق کی یاد دہانی کے لئے میرے منتخب شدہ پاکیزہ انسان کتب وصحائف لے کر آتے رہیں گے اور تمہیں غفلت و بدمستی سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرتے رہیں گے۔ سب ارواح نے اللہ تعالیٰ کے اس ازلی خطاب کو بڑی توجہ اور پورے انہماک سے سنا اور اطاعت وانقیاد کا عہد کیا۔ یہاں بعض ارباب عقل یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جناب ہمیں تو وہ عہد و پیمان یاد نہیں۔ ہمارے ذہن وقوت حافظہ کے کسی دور کے گوشے میں بھی اس کی صدائے بازگشت نہیں ملتی تو پھر ہم پر اس اتمام حجت کا کیا مطلب؟ اس سوال کا مسلم محققین نے دنداں شکن جواب دیا ہے کہ جب انسان ماں کے پیٹ میں تیار ہو رہا تھا اور جب پیدا ہوا اور ماں کی مشفقانہ گود میں باقاعدہ پرورش پاتا رہا۔ ماں کا دودھ پیتا رہا۔ بچپن کا نازک ترین زمانہ والدین کے زیر شفقت گذر گیا تو کیا کوئی بھی عاقل و بالغ آدمی اس زمانہ کی کوئی بات بیان کر سکتا ہے یا اپنے ماں باپ کے وجود کا انکار کر سکتا ہے؟ کہ مجھے تو یاد نہیں یہ میرے ماں باپ ہیں یا نہیں یا مجھ پر ان کا حق ہے یا نہیں۔ اگر کوئی ایسا کہے تو لوگ اس کی خرافات سن کر حیران ہونگے بلکہ مذاق اڑائیں گے۔ بہر صورت اس کا ماحول اس امر کے تسلیم کرنے پر اسے مجبور کرے گا۔ چاروں طرف سے اسے ماں باپ کے وجود پر شہادتیں مہیا ہو جائیں گی۔ اسی طرح عہد الست کا انکار بھی قطعاً نامناسب ہے انبیاء علیہم السلام بھی یاد دہانی کراتے رہے اور پھر وجود باری

پر دلائل عقلی و نقلی کا غیر مختتم سلسلہ موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روزِ الست کا اقرار انسان کی فطرت میں اس طرح پیوست اور ضوفگن ہے، جیسے موتی میں "آب"!

اس ساری تقریر کا ماحصل یہ ہوا کہ مسئلہ توحید کی تاریخ بہت قدیم نامعلوم الابتداء ہے۔ حضرت آدم سے دس صدیوں تک اس کائنات ارضی کے ساکنین کے دل و دماغ نظریۂ توحید پر قائم رہے۔ کان الناس امۃً واحدۃً شرک کے علاوہ اور سینکڑوں گناہوں کا انسان مرتکب ہوتا رہا تھا لیکن شرک سے بالکل محفوظ رہا۔ ابلیس ابن آدم کی گھات میں لگا رہتا تھا کہ کوئی ایسا موقع ملے کہ آدم کی اولاد سے انتقام لے سکوں۔ چونکہ شیطان نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں بڑی گستاخی کے ساتھ کہا تھا کہ میں انسان کو گمراہ کروں گا۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کے دائیں بائیں مکروفریب کے جال بچھاؤں گا اور راہِ حق سے اسے بھٹکانے کی کوشش کروں گا۔

چنانچہ کامل دس صدیوں کے بعد شیطان کو ایک موقع نصیب ہوا اور اس نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ واقعہ یوں ہے کہ حضرت شیث ؑ کے پانچ صاحبزادے۔ ود۔ سواع۔ یغوث۔ یعوق اور نسر بڑے پارسا، نیک، زاہد عابد اور محبوب خلائق تھے۔ بنی نوع انسان کی مختصر اور محدود آبادی ان بزرگوں کی معتقد تھی۔ جب یکے بعد دیگرے یہ حضرات جام مرگ نوش فرما گئے تو اولاد آدم کو ان کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ اب شیطان نے ان کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ لوگوں کے پاس انسانی شکل میں آیا اور کہنے لگا کہ اے صاحبو! مجھے بھی ان پنج تنوں سے گہری عقیدت و محبت تھی مجھے بھی ان کی وفات سے دلی صدمہ اور تکلیف پہنچی ہے۔ میں تمہیں ایک شاندار تجویز بتاتا ہوں اگر اس پر عمل کروگے تو تمہارا غم ہلکا ہو جائے گا اور یہ پنج تن بھی تم پر خوش ہو کر برکت و رحمت نازل کریں گے وہ محبوب خدا تھے۔ صاحب اختیار تھے وہ تمہیں بہت کچھ نفع دیں گے۔ لہٰذا ان کے مزارات پر جا کر خدا کی عبادت کرو اور خدا کی بارگاہ میں ان بزرگوں کا وسیلہ پیش کر کے اپنی حاجات طلب کرو۔ خدا تمہاری دعائیں سنے گا اور قبول فرمائے گا۔ بس پھر کیا تھا ان نیک لوگوں کی قبروں پر انسانوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر روز ان قبروں پر عوام و خواص کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ایک طویل عرصہ تک لوگ بدعت و بے اعتدالی اور مشرکانہ تصورات کی اس پہلی سیڑھی پر کھڑے رہے۔ جب اس کے عادی ہو گئے تو شیطان ان کو دوسری سیڑھی پر پہنچانے کے لئے روپ بدل کر آیا اور سبق دیا کہ ان بزرگوں کو براہِ راست پکارا کرو۔ خدا نے ان کو نفع و نقصان کا مالک و مختار بنا دیا ہے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ شیطان انسان کو اپنے پیچھے لگا چکا تھا اور وہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے جب اس طرح لوگ طریقہ مذکورہ کے بھی عادی ہو گئے تو اب شیطان نے ایک اور چال چلی۔ اس نے کہا اے صاحبو! قبریں تمہاری آبادیوں سے کافی دور ہو چکی ہیں اور تمہارے نئے نئے قریے دور دراز علاقوں میں بس رہے ہیں وہاں سے سال بہ سال آنا تمہارے لئے بہت مشکل ہے، آؤ میں تمہیں ان بزرگوں کے مجسمے بنا دیتا ہوں مجھے ان بزرگوں کی شکلیں اور صورتیں اچھی طرح یاد ہیں۔ جب تم ان مجسموں کے آگے جھکو گے تو گویا انہیں کے سامنے جھک رہے ہو گے۔ اور اس سے ان بزرگوں کی ارواح تم سے خوش ہوں گی۔

شیطان نے شرک کی اس آخری سیڑھی پر بھی انسان کو چڑھا لیا اور پتھر وغیرہ کے بت بنا کر ان کے حوالے کر دیئے اب بتوں کی پرستش باقاعدہ شروع ہو گئی۔ حضرت نوح ؑ کے دور تک بت پرستی کا اچھا خاصہ زور ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس عہد الست کی یاد دہانی کے لئے حضرت نوحؑ کی پرجوش آواز فضائے ارضی میں گونجی اور بت پرست اپنے پنج تنوں کے خلاف یہ صدائے حق سن کر مشتعل ہو گئے۔

ثابت ہوا کہ شرک بہت بعد میں آیا اور تدریجی طور پر آیا توحید پہلے موجود تھی۔ شیطان ابن آدم سے انتقام لے رہا تھا لیکن آدم کا بیٹا بڑا سادہ لوح ہے کہ مسٹر عزازیل کی گہری چالوں سے آگاہ نہ ہو سکا اور اب تو شیطان کی ہر ملک میں بڑی بڑی ایجنسیاں قائم ہو چکی ہیں جن سے لاکھوں کی تعداد میں ایجنٹ نکل کر دنیا میں شر و فساد پھیلانے میں مصروف ہیں۔

ماہر القادری

رجالِ اقبال

کلامِ اقبال میں ——— کردار نگاری

اقبال کے کلام، پیغام اور شخصیت پر اتنا لکھا گیا ہے کہ شاید ہی دُنیا کے کسی شاعر پر اتنی کم مدت میں کمیت ہی نہیں، کیفیت کے اعتبار سے بھی اس قدر لکھا گیا ہو۔ کتابوں پر کتابیں ہیں کہ اقبال پر چلی آرہی ہیں، مگر نہ پڑھنے والے سیر ہوتے ہیں اور نہ لکھنے والے اکتاتے ہیں! "اقبالیات" کی تکرار بھی لُطف سے خالی نہیں ہے کہ اس اعادہ و تکرار سے ذوق و وجدان پریشان اور متوحش ہونے کے بجائے، لذت اندوز ہوتے ہیں، اس تکرار میں اس قدر تازگی ہے کہ :—

سو بار بھی ہم کہہ کے مکرر نہیں کہتے

جس طرح ساحل پر بیٹھ کر کوئی بڑے سے بڑا نظر باز بھی دریا کی موجوں کو نہیں گن سکتا، یہی حال اقبال کے کلام کی خوبیوں کا ہے، فکر و تفلسف سے لے کر اظہار و بیان تک اور معانی سے لے کر الفاظ تک حسن و خوبی کے جواہر ہیں کہ معدن سے نکلتے چلے آرہے ہیں

اقبال کے کلام میں جہاں دوسری گوناگوں خصوصیات اور محاسن پائے جاتے ہیں، وہاں ایک قابل ذکر خصوصیت "کردار نگاری" ہے۔

کردار نگاری کا نام لیتے ہی لوگوں کا ذہن عام طور پر ناولوں اور افسانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ شاعری کی نہیں ناول و افسانہ کی خصوصیت ہے، یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، مگر اس موضوع پر بحث و گفتگو میں یہ حقیقت بھی تو نگاہوں سے اوجھل نہ رہنی چاہیئے کہ منظوم ڈراموں اور مثنویوں میں بھی کردار نگاری ملتی ہے، اور ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کی طرح شروع سے آخر تک کردار ساتھ ساتھ چلتے ہیں، مگر ان کرداروں کے جہاں تک برتنے کا تعلق ہے، نثری ڈراموں اور افسانوں کے کرداروں سے نظم کے کردار اپنی ٹیک نک کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔

ناول اور افسانہ کے کردار حقیقی شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں "افسانہ" کا لفظ ہی حقیقت سے اپنی دوری کا اعلان کرتا ہے، جہاں کہیں کرداروں میں حقیقت، اصلیت اور واقعیت ہوتی بھی ہے۔ تو افسانہ نگار اور ناول نویس اپنے پلاٹ کو مربوط رکھنے اور افسانہ و ناول کو زیادہ سے زیادہ دل چسپ بنانے کے لئے اس میں خاطر خواہ تصرف کرکے تخیل و بیان کا ایک طلسم کھڑا کر دیتے ہیں، مگر اقبال کے یہاں نہ صرف یہ کہ افسانوں اور ناولوں سے بلکہ بزمیہ اور رزمیہ مثنویوں سے بھی کردار نگاری مختلف ملتی ہے وہاں تفصیل ہے، یہاں ایجاز ہے۔ وہاں پھیلاؤ ہے، یہاں سمٹاؤ ہے، وہاں ایک قطرے کو، وسعت دے کر دریا بنایا جاتا ہے اور یہاں دریا کو ایک کوزے میں نہیں بلکہ ایک قطرے میں بند کیا جاتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں کردار نگاری حقیقت کی ترجمان ہوتی ہے، اقبال کو جس کسی نے بھی سب سے پہلے "ترجمان حقیقت" کہا اس نے بڑی حقیقت شناسی اور خوش ذوقی کا ثبوت دیا۔

ایشیائی شاعری میں قصیدہ شاعری کی مقبول و پسندیدہ بلکہ یوں کہنا چاہیئے معرکہ آرا صنف ہے، قصائد میں سب سے زیادہ موثر، پُرلطف اور کام کی چیز "تشبیب" ہوتی ہے، شاعر کے تخیل اور قوت بیان کے جوہر تشبیب ہی میں کھلتے ہیں، "گریز" کے بعد تو قصائد میں آورد کا رنگ آجاتا ہے، پھر یہ "آورد" بھی مبالغہ آمیزی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وجدان اس کے غیر واقعی ہونے پر تلملا کر

رہ جاتا ہے۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلاں کی مدح میں یہاں تک کہہ دیا ہے ؎

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے

تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دھد

کوئی شک نہیں یہ شعر بہت پر شکوہ ہے مگر یہ شکوہ واقعیت اور فطرت کے کس قدر خلاف ہے۔

قصائد میں "کردار نگاری" کی جھلک کہیں کہیں ملتی ہے، عام طور پر مدح و منقبت کی مبالغہ آمیزی سے اس بزم کو سجایا جاتا ہے شجاعت، سخاوت، دریادلی، رعایا پروری، عدل و انصاف اور علم دوستی یہی اوصاف ہیں جو قصائد میں پیش کئے گئے ہیں، اور ان قصائد کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام امراء و سلاطین ایک ہی قسم کے کردار رکھتے ہیں۔

بادشاہوں اور امیروں کی مدح و توصیف کے بعد ان کو دعائیں بھی دی جاتی ہیں، غالب نے سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے لئے دعا کی اور اس مضمون کو مبالغہ کی اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اس کے آگے تخیل کی پرواز کے لئے گنجائش ہی نہیں رہتی۔ فرماتے ہیں:۔

تا خدا باشد، بہادر شاہ باد

صنف قصیدہ میں کوئی شک نہیں کہ مصنوعی کردار نگاری ملتی ہے۔ مگر اس صنف نے زبان و ادب کو بہت کچھ دیا ہے، ابوتمام نے معتصم باللہ کے دربار میں جو قصیدہ پڑھا تھا۔ اس کے اس شعر کا زور بیان، تخیل کی پرواز اور الفاظ کی سحر کاری دیکھئے:۔

السیف اصدق انباء من الکتب — تلوار کتابوں سے زیادہ سچ بولتی ہے۔

فی حدہ الحد بین الجد واللعب — اس کی باڑھ سنجیدگی اور ٹھٹول کے مابین حد فاصل ہے۔

جاہلیت کے عرب شعراء کی یہ خصوصیت اُنہیں عجمی شعراء سے ممتاز کرتی ہے کہ وہ بادشاہوں اور امیروں کی مدح نہیں کرتے تھے، عرب شعراء میں غالباً سب سے پہلے نابغہ ذبیانی نے اس عار کو گوارا کیا، شعرائے جاہلیت خود اپنی اور اپنے خاندان اور اسلاف کی مدح و توصیف میں شعر کہتے تھے، یعنی وہ خود اپنے قصیدہ خواں اور منقبت نگار تھے، عمرو بن کلثوم کے قصیدہ کا ایک شعر سنیئے:۔

اذا بلغ الفطام لنا صبی!

تخرلہ الجبابر ساجدینا

"ہمارے قبیلے کا بچہ جب دودھ چھوڑتا ہے۔ تو بڑے بڑے صاحبان جبروت وجلال اس کے آگے سجدے میں گر پڑتے ہیں"۔

یہی وہ مشہور قصیدہ ہے جو سونے کے پانی سے لکھ کر حرم کعبہ کے دروازہ پر آویزاں کیا گیا تھا اور اس کو اسی بناء پر "معلقہ" کہا جاتا ہے۔ جاہلیت عرب کے ان قصائد میں قبیلوں اور خاندانوں کی سادہ اور فطری کردار نگاری بھی ملتی ہے مگر اس سادگی کو مبالغہ آرائی کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ خاص طور سے اس وقت جبکہ شاعر دوسرے قبیلہ اور خاندان کے مقابلہ میں اپنے قبیلہ کی برتری کا اظہار کر رہا ہو۔

جاہلیت کے عرب شعراء جب وصل و اختلاط کے مضامین نظم کرتے ہیں تو متانت و سنجیدگی اور تہذیب و غیرت کی تمام حدوں کو پھلانگ جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ عرب کا جاہلی ادب اپنے زمانہ کا "ترقی پسند ادب" ہے۔ یہ وہ کردار نگاری ہے، جس سے غیرت و حیا پناہ مانگتی ہے۔

شاعری کی شوخی اور رنگینی کے ہم منکر نہیں ہیں، وصل و اختلاط کی جھلکیاں بھی شعر میں آتی ہیں مگر یہ بڑا ہی نازک مقام ہوتا ہے یہاں شاعر کو تلوار کی باڑھ پر چلنا پڑتا ہے جس کے دونوں طرف نازک آبگینے چنے ہوتے ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی سے یہ آبگینے چور ہو جاتے

ہیں۔ جن ہوس پرست شاعروں نے وصل واختلاط کے عمل (Processes) کو شاعری میں نظم کردیا انھوں نے تہذیب و انسانیت اور خود شعروادب کے ساتھ مذاق بلکہ ظلم کیا، شاعر کتنا ہی رنگین اور آوارہ مزاج کیوں نہ ہو، وہ بہرحال انسان ہوتا ہے جانور نہیں ہوتا اور انسانیت وحیوانیت میں سب سے نمایاں فرق "امتیاز حدود" کا ہے اقبال کے کلام میں (Romance) کی شوخی و رنگینی کے ساتھ تہذیب وشرافت کا امتزاج دیکھنے کے قابل ہے۔

بخلوتش چو رسیدی نظر بادمکشا
کہ آں دمے ست کہ کار از نظارہ می گزرد

اور

دختر کے برہمنی، لالہ رخی سمن بری
چہرہ بروئے او کشا، باز بخویشتن نگر

طبیعت کا تقاضا ہے کہ اس بحث کو دراز تر کیا جائے مگر طبیعت کے اس تقاضے کو اگر پورا کیا گیا تو ہم اصل موضوع سے دور چلے جائیں گے ہاں! تو ذکر تھا شعروسخن میں "کردار نگاری" کا! سعدی کی نظم کا ایک مصرعہ ہے۔

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد

اس میں فردوسی کی تعریف تو بے شک کی گئی ہے مگر "پاک زاد" سے فردوسی کے کردار کی عکاسی اور ترجمانی نہیں ہوتی، "پاک زاد" ایک ایسی صفت ہے، یا مدح وتوصیف ہے جسے ہر شخص سے منسوب کیا جاسکتا ہے، اس شعر میں خود شاعر کی عظمت، شرافت نفس اور بے تعصبی کی جھلک ضرور ملتی ہے کہ اس نے مذہبی معتقدات کے اختلاف کے باوجود فردوسی کو "پاک زاد" کہا۔

کسی شخص کے کردار کا تجزیہ پوری تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ نثر اور نظم میں کیا جاسکتا ہے اور کیا ہی جاتا ہے مگر شاعری کا کمال اس میں ہے کہ کم سے کم لفظوں میں کردار بیان کیا جائے، لیکن یہ "کم سے کم لفظ" اگر مبہم اور گنجلک ہو کر رہ جائیں اور کردار کی تصویر دھندلی پڑ جائے، تو یہ شاعری کا نقص ہے۔

اقبال کا شاعرانہ کمال اور کردار نگاری کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ میں کردار کا جوہر اور شخصیت کا ست نکال کر رکھ دیا ہے، شاعری میں یہ کمال واعجاز اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جبکہ شاعر نفسیات کا ماہر ہو، ساتھ ہی کرداروں کی تہہ میں اتر کر اس کا پتہ لگایا ہو کہ فلاں کردار کا مرکزی نقطہ، مزاج غالب اور وہ ممتاز وصف کیا ہے جو پورے کردار پر چھایا ہوا ہے اور پوری شخصیت کو گھیرے ہوتے ہے۔ پھر اس کردار شناسی کے بعد شاعر کو جو گوہر مقصود ہاتھ آیا ہے اس کو پرونے کا سلیقہ بھی اسے آنا چاہیئے اگر کردار اور نفسیات کا یہ مشاہدہ اور مطالعہ موزوں الفاظ کے قالب میں نہ ڈھل سکے، تو شاعری اپنے حسن اور تاثیر کو کھو دیتی ہے! عروس جمیل، لباس حریر اور جامہ موزوں ہی میں بھلی لگتی ہے!

اقبال کی شاعری میں خیال واظہار کے درمیان جو معجزانہ ہم آہنگی نظر آتی ہے، اسی نے تو سب کے دل موہ لئے ہیں، فلسفہ کی کیسی کیسی سخت چٹانیں ہیں، جن کو اقبال نے تراش کر نازک وخوش رنگ پھول پتیاں بنائی ہیں اور تیشہ سے میناکاری کا کام لیا ہے۔

اقبال کی کردار نگاری کی چند مثالیں:۔ ؎

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق ومحبت ہے استوار

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ذات رسالت مآب سے جو والہانہ محبت تھی، وہی ان کے کردار و سیرت کا خلاصہ اور مرکزی نقطہ ہے! سب سے پہلے اقبال نے صدیق اکبر کو "رفیق نبوت" کہا کہ حضورؐ کی جوانی سے لے کر دم وصال تک صدیق کی رفاقت ثابت ہے، حرم کعبہ ہو، غار ثور ہو، ہجرت ہو، فتح مکہ ہو، بدر ہو، حدیبیہ ہو، ہر مقام پر وہ نبی کے رفیق رہے، یہاں تک کہ قبر میں بھی حضورؐ کے رفیق ہیں، صدیقؓ کی اسی رفاقت نے اردو زبان و ادب کو "یار غار" کی اصطلاح دی کہ "جس شخص کا کسی شخص سے حد درجہ کا دوستانہ، یارانہ اور اخلاص و محبت ہوتا ہے، اسے "یار غار" کہا جاتا ہے۔

عشق و محبت کی اولین شرط یہ ہے کہ محب اپنے محبوب کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلتا ہو، دوست کا رضا جو ہو، اس کی ہر بات اور ہر قول کی تصدیق کرتا ہو، اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کو دین و ایمان سمجھتا ہو، صدیق اکبر کے عشق و محبت کو جب اس کسوٹی پر جانچتے ہیں تو وہ کھرا ثابت ہوتا ہے!

مصر کے ادیب اور مایہ ناز سیرت نگار محمود العقاد نے بڑی دل نشیں بات کہی کہ ابو بکرؓ کے سامنے پہلے محمدؐ کی شخصیت تھی پھر نبوت تھی اور عمر بن الخطاب کے سامنے پہلے نبوت تھی، پھر محمدؐ کی شخصیت تھی، حضورؐ کی ذات گرامی سے اس بے پناہ محبت اور والہانہ عقیدت کا یہ اثر تھا کہ بالغ آزاد مردوں میں نبوت کی سب سے پہلے تصدیق حضرت ابو بکرؓ ہی نے کی! عشق و محبت میں چلنے والی کی مرضی محبوب کی مرضی میں فنا ہو جاتی ہے! صدیق اکبر کی پوری زندگی اسی بے چون و چرا اطاعت کی شہادت دیتی ہے، اعتماد و تصدیق اور یقین و اطمینان کا یہ کمال دیکھئے کہ ابو جہل کی زبان سے حضورؐ کے بیان کئے ہوئے واقعہ معراج کو سن کر صدیق اکبر اس کی تصدیق کرتے ہیں، اور ان کی عقل اس حیرت انگیز واقعہ کو درست و صحیح ماننے میں ایک لمحہ کے لئے بھی تامل نہیں کرتی، اس تشریح و وضاحت کے بعد ایک بار پھر اس شعر کو پڑھئے

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

حضرت ابو بکر کی ذات و شخصیت اور سیرت و کردار سے "بنائے عشق و محبت کا استوار" ہونا اگرچہ کمال عشق و محبت ہے، مگر اس میں مبالغہ نہیں ہے، عشق رسولؐ کا دعویٰ کرنے والوں کو ہر آن اپنے نفس اور اعمال کا جائزہ لیتا رہنا چاہیئے کہ "صدیقیت" سے مشابہت میں کہاں کہاں کمی پائی جاتی ہے۔

پوچھا حضور سرور عالم نے اے عمرؓ
اے وہ کہ جوش حق سے ترے دل کو ہے قرار

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مقدس کردار کو جو گوناگوں صفات کا مجموعہ ہے ایک مصرعہ میں بیان کر دینا خود اپنی جگہ۔

شاعری جزویست از پیغمبری

کا نمونہ بلکہ .... شاہکار ہے: اقبال کی شاعری سکون و قرار کی نفی کرتی ہے، اقبال تو حرکت و اضطراب کا داعی ہے، یہاں تک کہ سارا جہان وصل محبوب کی تمنا کرتا ہے۔ مگر اقبال محبوب کا وصال بھی نہیں چاہتا کیوں؟ اس لئے کہ:

عشق بمیرد ز وصل

زندگی نام ہے تڑپنے اور بے چین رہنے کا، قرب و وصل کے بعد تشنگی جاتی رہی اور تڑپ مٹ گئی تو عشق و محبت کا یہ بہت بڑا المیہ (ٹریجڈی) ہے، اقبال نے اس مصرعہ میں —

اے وہ کہ جوش حق سے ترے دل کو ہے قرار

اس چیز کو پیش کیا ہے کہ جس کے دل کو جوش حق سے قرار آئے گا، خود اس کا جوش حق کے سبب بیقراری کا کیا عالم ہوگا! - تو اقبال نے اس مصرعہ میں فاروق اعظم کے کمال اضطراب کو مصور کیا ہے -

یہی "جوش حق" ہے جس کے اردگرد عمر فاروق رضؓ کی پوری زندگی اور تمام کردار گردش کرتا ہے، ایمان لانے کے بعد وہ حرم کعبہ میں آگر کھلے خزانے نماز پڑھتے ہیں، ہہ مکہ سے مدینے کو ہجرت کرتے ہیں تو اعلان کر کے ناقہ پر سوار ہوتے ہیں، غزوۂ بدر کے بعد جب قیدیوں کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو یہی جوش حق ہے جو زبان حال سے یوں بولتا ہے کہ:-

"ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے"

غزوۂ بدر میں کفار قریش کی شکست فاش کے بعد جب عُمیر زہر میں تلوار بجھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاک بدہن گستاخ قتل کرنے کے لئے مدینہ آتے ہیں، تو یہی جوش حق کا پیکر عمر رضؓ اس شخص (عمیرؓ) کا دونوں ہاتھوں سے گلا دباتے ہوئے ملا سے لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور بات چیت کرتے اور ہاتھوں کو جنبش دیتے ہوئے، کسی کافر سے گستاخی یا سوء ادبی سرزد ہوتی ہے، تو عمر فاروق رضؓ کا یہی جوش حق ہے، جو ان کے ہاتھ میں تلوار کو گھما دیتا ہے - صلح حدیبیہ میں عمر فاروق رضؓ نے جس جوش کا اظہار کیا وہ کوئی نسب و خاندان کی عصبیت کا جوش نہیں تھا، بلکہ حق کا جوش تھا، وہ اپنی ظاہر بین نگاہ سے یہی دیکھ رہے تھے کہ صلح کی شرطوں سے باطل کے مقابلہ میں حق دب رہا ہے، ان کی رائے صحیح نہ تھی کہ یہی صلح "فتح مبین" ثابت ہوئی، مگر ان کی نیت بخیر تھی! حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ جوش حق ہی تھا کہ فوجی نقطۂ نگاہ سے عین نازک موقع پر وہ حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کو عساکر اسلامی کی سپہ سالاری سے برطرف کر دیتے ہیں، اور یہ کارنامہ وہی صاحب عزیمت شخص انجام دے سکتا ہے جسے اپنے جوش حق پر اعتماد ہو کہ کوئی سنگین واقعہ ظہور میں آگیا تو اس سے پوری طرح نمٹ لوں گا، ساتھ ہی وہ اپنی فوج کے سپہ سالار کا پوری طرح مزاج شناس ہو کہ اُدھر سے اطاعت ہی کا معاملہ کیا جائے گا - عمر فاروق رضؓ کا یہی جوش حق تھا، جس کی دھاک چاروں طرف بیٹھی ہوئی تھی اور اسلامی حکومت کے عمال اور احکام عمر رضؓ کے احتساب سے ڈرتے تھے -

عرب میں مشہور تھا کہ مرحب پہلوان اپنی جگہ سو پہلوانوں کے برابر تھا، ممکن ہے اس میں تھوڑا بہت مبالغہ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ جوش حق ہی کی بدولت عمر فاروق رضؓ کی تنہا ذات جرار لشکروں پر بھاری تھی - ہم آزاد پسندوں کو اور ہم کو اللہ کرے عمر فاروق رضؓ کے جوش حق کا ایک ہی ذرہ میسر آجائے! (آمین)

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ فقیر
فطرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی یہی فطرت جس کو اقبال نے "نور نبوت سے مستنیر" کیا ہے، بلال کا اصل کردار اور حقیقی سیرت ہے! سیاہ رنگت مگر دل روشن و مصفا، ایمان لانے کے بعد حضورؐ کی رحلت تک پوری زندگی حضورؐ ہی کی قدموں میں گزار دی اور مشکوٰۃ نبوت سے کسب نور کرتے رہے، فقر میں، زہد و قناعت میں، عبادت و اطاعت میں، معاملات اور معاشرت میں، حضرت بلالؓ کے یہاں انوار محبت ہی جھلکتے .... اور جھم جھم کرتے نظر آتے ہیں - بارگاہ نبوت کے اس تقرب کے سبب، بلالؓ حبشی کی قسمت پر نہ جانے انصار و قریش میں کون کون غبطہ کرتا ہوگا، حضرت بلال کی اسی نورانی فطرت اور روشن و تابناک سیرت کو دیکھ کر، ان کی وفات پر عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور جانشین رسولؐ کی زبان حق ترجمان یوں گویا ہوئی کہ:-

"آج ہمارا سردار مر گیا"

حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی مقدس و معصوم سیرت و کردار اور پاک و طاہر معاشرت پر اقبال کا یہ ایک مصرعہ

آسیا گردان و لب قرآں سرا

کس قدر جامع اور حقیقت کا ترجمان ہے، اس مصرعہ کے دو اجزا ہیں ایک "آسیا گرداں" اس سے حضرت سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شانِ معاشرت، جفاکشی اور ایثار پسندی کی تصویر کھنچتی ہے اور دوسرا جز "قرآں سرا" ہے، جو حضرت سیدہ کے کمال دینداری پر دلالت کرتا ہے، چکی پیستے میں قرآن کریم سے یہ شغف یقیناً اس معصوم و مقدس کردار کا پرتو اور ظل ہونا چاہیئے، جس کی شان میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے "کان خلقہ القرآن" فرمایا تھا۔

"آسیا گردانی" سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جو خاتون چکی پیستی ہو اس کو گھریلو زندگی سے کتنا لگاؤ اور تدبیر منزل سے کس قدر شغف ہوگا۔ امور خانہ داری میں دلچسپی لینا ہی عورت کی شرافت و عظمت کی دلیل ہے۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ چکی پیسنے میں عورتیں عموماً گیت گایا کرتی ہیں تاکہ دل بہلتا رہے اور چکی کی مشقت ہلکی ہوتی رہے۔

تو

وہ خاتون جس کا دل قرآن کریم کی تلاوت سے بہلتا ہو، اور یہی اس کا گیت، نشید اور حُدی ہو، اس کا کردار لازماً قرآنی اخلاق کے سانچے ہی میں ڈھلا ہوگا۔

تین کردار ہیں۔ مولانا رومی، امام رازی، اور بو علی سینا کے کردار! یہ تینوں شخصیتیں اپنی اپنی جگہ بلند ہیں، مگر اقبال جس کی فکر و نگاہ نے کتاب و سُنّت کے دامن میں پرورش پائی ہے اور جس کے مشاہدہ و تفکر کا زاویہ نگاہ قرآنی اور اسلامی ہے، وہ ان تینوں کرداروں میں فرق کرتا ہے ؎

اسی کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

"سوز و ساز" یہ مولانا رومی کی زندگی اور ان کا کردار ہے اور یہی اہل دل کا کردار ہوا کرتا ہے، "سوز و ساز" سے دل کی تڑپ اور ساتھ ہی دل کے کیف و نشاط کی ترجمانی ہوتی ہے، تصوف کی اصطلاح میں غالباً اسی کو "بسط" کہا جاتا ہے جو "انقباض" کی ضد ہے! صرف سوز ہی سوز ہو تو زندگی خشک و بے کیف بن کر رہ جائے گی اور ساز ہی ساز ہو تو زندگی پر کیف و نشاط کا غلبہ ہوگا، اور یہ دونوں انتہائیں فطرت سے بعد رکھتی ہیں، صحیح فطری تناسب یہ ہے کہ "سوز و ساز" ایک جگہ جمع ہو جائیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی میں یہی تناسب معراج کمال کو پہنچا ہوا تھا، ایک طرف حضورؐ کی یہ کیفیت کہ دو دو وقت کے فاقے ہوتے تھے اور رات رات بھر اللہ تعالیٰ کے حضور نماز میں کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے۔ اور دوسری طرف حضورؐ نے فرمایا کہ میں عورت اور خوشبو کو پسند کرتا ہوں اور سرکار نے تیر اندازی اور شہسواری کی امت کو ترغیب دی
مولانا روم کا "سوز و ساز" اقبال کا پسندیدہ کردار ہے، اپنے شعروں میں وہ اسے بار بار پیش کرتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی پر عقلیت کا غلبہ تھا مگر دینی اسپرٹ بھی انکے اندر خاصی ابھری ہوئی تھی، اس لئے اقبال اس کردار سے پیر رومی کے کردار کی طرح دلچسپی تو نہیں رکھتے مگر اس سے بیزار بھی نہیں ہیں، اس کردار کا وہ بہرحال احترام کرتے ہیں، تیسرا کردار بو علی سینا کا کردار ہے جس پر عقیدت اور عجمیت کا غلبہ ہے، اسی لئے :-

بوعلی اندر غبار ناقہ گم

کی اقبال نے طنز کی ہے! بوعلی سینا مسلمان فلسفی تھا، لیکن اس کے فکر و ذہن پر یونانی فلسفہ غالب تھا، اس لئے وہ اپنی عقل و ذہانت کے جوش میں اُن وادیوں میں بھی نکل جاتا تھا جہاں وحیٔ الٰہی سے بے نیاز ہو کر یا تو خود اس کی اپنی عقل رہنما ہوتی ہے یا یونانی فلسفہ کے افکار اس کے دلیل راہ ہوتے ہیں، اسی لئے وہ اقبال کی نگاہ میں "غبار ناقہ میں گم ہو کر رہ جاتا ہے" اور لیلائے مقصود تک نہیں پہنچ پاتا، اس کے برخلاف دوسرا کردار مولانا روم کا ہے، جن کی تمام دانش و عقل اور فہم و شعور وحی الٰہی کے پابند ہیں، اس لئے انکے ہاتھ لیلائے مقصود کے پردۂ محمل کو تھام لیتے ہیں اور وحیٔ الٰہی کی رہنمائی اور روشنی کے سبب اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں پاتے۔

تڑپ رہا ہے فلاطون میانِ غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

افلاطون پر کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، اور اس کا کردار اور افکار ایک ہزار سال سے موضوع فکر و بحث بنے ہوئے ہیں، مگر اقبال کا صرف یہ ایک شعر "فلاطونیات" کے دفتروں پر بھاری ہے! اس ایک شعر میں افلاطون کے کردار و افکار کی روح کھنچ کر آگئی ہے:

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اقبال خدانخواستہ "عقل" کا مخالف نہیں ہے اور نہ وہ بے عقلی کو کوئی اچھی چیز سمجھتا ہے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ وہ دل کو عقل پر ترجیح دیتا ہے اور اس کے نزدیک ارباب دل کا مقام اہل دانش سے بلند تر ہے، اس لئے کہ عقل طرح طرح کے حیلے تراشتی اور مصلحتوں کی باریکیاں سجھاتی ہے، اور کسی انقلاب آفریں اقدام کے لئے مشکل ہی سے تیار ہوتی ہے اور وہ تماشائے لب بام ہی میں محو رہتی ہے:-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یہ عقل ہی کی نکتہ آفرینی تھی، جس نے معلم الملکوت کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کی پاداش میں راندۂ درگاہ اور ابلیس لعین بنادیا، جس پر قیامت تک لعنت کی جائے گی (اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم)

افلاطون نہ تو ملحد تھا اور نہ منکر تھا مگر ساتھ ہی یقین و ایمان کی وہ متاع بھی اس کے دامن میں نہ تھی جو وحیٔ الٰہی کے واسطے سے ملتی ہے اور جہاں تذبذب و تامل کی جگہ یقین، سپردگی اور تسلیم و رضا پائی جاتی ہے اقبال نے افلاطون کو گمراہ نہیں کہا، گمراہی اور الحاد و انکار کے مقابلہ میں "غیب و شہود" کے درمیان تڑپتے رہنا ہی بسا غنیمت ہے، اور دوزخ کے مقابلہ میں اعراف ہی بہت بڑی نعمت ہے

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است　　(سعدی)

مگر ظاہر ہے کہ بہشت کے سامنے اعراف کی کیا حقیقت ہے۔ جس طرح دوزخی اعراف کو بہشت سمجھتے ہیں اسی طرح اہل جنت کے نزدیک اعراف دوزخ کا نمونہ ہے!

اقبال کی نگاہ میں ان تین کرداروں کا موقف یہ ہے۔

(۱) ارباب دل (یعنی اہل ایمان) ——— کا مقام جنت ہے۔
(۲) خیر پسند اہل عقل (جو منکر و ملحد نہیں ہیں) کا مقام اعراف ہے۔
(۳) منکر و ملحد اہل عقل ——— کا مقام دوزخ ہے۔

افلاطون چونکہ خیر پسند تھا اور انکار و الحاد کی طرف اس کا میلان نہ تھا، اس لئے بعض وقت اس کے افکار و تخیلات پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسائل اس کو "القا" کئے جارہے ہیں اور وحی الٰہی کی پرچھائیاں اس کے فکر و ذہن پر پڑ رہی ہیں، یہ وہ عالم ہے جب وہ "حقیقت الحقائق" سے قریب ہوتا ہے، غالباً اسی کو اقبال نے "شہود" سے تعبیر کیا ہے جہاں خود حقیقت برافگندہ نقاب ہوتی ہے مگر چونکہ انبیاء کرام کے ذریعہ وحی الٰہی کی رہنمائی افلاطون کو حاصل نہیں ہے، اس لئے جب ذہول طاری ہوتا ہے تو اس کے افکار اُلجھ جاتے ہیں، اس کی باتیں پیچیدہ ہوجاتی ہیں جیسے کوئی روشنی سے یکایک اندھیرے میں آجائے، یہی افلاطون کے لئے وہ عالمِ غیب ہے جہاں حقیقت سے بعد ہوجاتا ہے، تو اقبال کی نگاہ میں افلاطون کا یہ کردار ہے کہ کبھی حقیقت سے قرب اور کبھی حقیقت سے بعد، اور اسی قرب (شہود) اور بُعد (غیب) کے درمیان وہ مضطرب رہتا ہے!

آرنلڈ اقبال کا شفیق استاد تھا، علم دوست اور نیک نفس مستشرق! مسلمانوں کے علوم و فنون اور انکی تاریخ و تہذیب سے اس کو دلچسپی تھی، ساری زندگی علم و دانش ہی کی طلب و جستجو میں گزار دی! آرنلڈ کا اپنے شاگردوں سے ایسا سلوک تھا جیسے باپ کا بیٹے سے ہوتا ہے۔ کتابیں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور علم ہی اس کی زندگی کا مقصد تھا، اس کردار کو علامہ اقبال نے اس شعر میں کس عقیدت و محبت کے ساتھ پیش کیا ہے اور کتنی سچی بات کہی ہے ؎

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم
تھی تری موج نفس بادِ نشاط افزائے علم

یہ شعر کردار نگاری کے ساتھ آرنلڈ کی علمی عظمت کا اعتراف بھی ہے۔

اقبال ایک صاحب پیغام شاعر ہے اور داغ خالص غزل گو ہے، دونوں کے درمیان فکر و نظر کا کوئی اشتراک نہیں ہے، فکر و خیال کے اختلاف کے ساتھ دونوں کا اندازِ بیان اور اسلوب اظہار بھی مختلف ہے۔ اقبال نے جب ہوش سنبھالا تو سارے ہندوستان میں داغ کی غزلوں کی دھوم تھی اور شاعری میں داغ کی ذات مرجع خاص و عام بنی ہوئی تھی، اقبال نے بھی شاعری میں اسی "جہاں استاد" کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، داغ کی زبان میں جو لوچ تھا اور اظہار بیان پر جو حیرت انگیز قدرت تھی اس سے اقبال نے بھی فائدہ اٹھایا، اگر دُنیا کے احوال وفات پائے ہوؤں کی روحوں تک پہنچتے ہیں، تو داغ کی رُوح اپنے شاگرد اقبال کی عالمگیر شہرت اور بے پناہ قبولیت کو دیکھ کر فخر کرتی ہوگی۔

اقبال نے کئی مرثیے کہے ہیں مگر سب سے زیادہ اثر انگیز مرثیہ داغ کا ہے! اپنی ماں پر جو اقبال کا مرثیہ ہے، اس تک میں وہ سوز و درد اور تاثیر نہیں ہے، جو داغ کے مرثیہ میں ہے، داغ کے مرنے پر اقبال کے دل کو جو چوٹ لگی ہے وہ نظم کے قالب میں ڈھل کر بڑی درد انگیز بن گئی ہے ؎

لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا، لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن مارے کا دل پر تیر کون؟

"عشق کی ہو بہو تصویر کشی" ۔ اور "ناوک فگنی" یہی داغ کی شاعری کا مزاج ہے، داغ کا کمال ہے، داغ کا فن اور اس کا کردار ہے، حسن و عشق کی کیسی کیسی نزاکتیں ہیں جو داغ کی غزلوں میں فلم کی تصویروں کی طرح بولتی ہوئی نظر آتی ہیں اور اس کے

شعروں میں وہ سوز و اثر پایا جاتا ہے کہ اُس کے شعر دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں، داغ نے شعر نہیں کہے سچ مچ ناوک فگنی کی ہے اور دلوں پر تاک تاک کر تیر مارے ہیں! جو کوئی بھی داغ کے شعروں کو پڑھے گا، ان تیروں کی کسک محسوس کریگا داغ یوں ہی ناوک فگن نہیں بن گیا تھا، خود اس نے بھی اپنے دل پر تیر کھائے تھے، صیاد کبھی صید بھی رہ چکا تھا، اقبال نے داغ کو "ناوک فگن" کہہ کر اس کے فن اور کردار کو دو لفظوں میں بیان کر دیا۔

اقبال کا یہ شعر ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟

میں نے بار ہا پڑھا تھا مگر جب تک نطشہ کی کتاب "بقول زردشت" میری نظر سے نہ گزری تھی۔ "مجذوب فرنگی" کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا، "مجذوب فرنگی" کی ترکیب سے نطشے کے افکار و کردار کی جیسی صحیح ترجمانی ہوتی ہے کسی اور لفظ اور لقب سے نہیں ہو سکتی!

شرعی اصطلاحیں بالغ و نابالغ، عاقل و غیر عاقل، مکلف اور غیر مکلف ہیں، "مجذوب" کوئی شرعی اصطلاح نہیں ہے مگر یہ لفظ مسلمانوں میں عام ہے، اور "مجذوب" کے نام سے ایک عجیب کردار ذہن و فکر کے سامنے اُبھر آتا ہے، تصوف میں سالک کا مقام مجذوب سے بہر حال بلند تر ہے، مگر "مجذوب" سے بھی روحانی عقیدت وابستہ ہے!

"مجذوب" ایک ایسے آدمی کو کہتے ہیں کہ جو غیر مکلف ہو اور اس کے جذب و بے خودی حیرت و سراسیمگی اور فقدانِ شعور کے سبب اس پر شرعی حدود جاری نہ ہو سکیں: اس کا عالم یہ ہوتا ہے کہ کسی دن ترنگ آئی تو مسجد میں پہنچ گیا اور وہاں جا کر جو نماز پڑھنی شروع کی ہے۔ تو ایک ایک سجدہ آدھ آدھ گھنٹہ میں بھی پورا نہیں ہو رہا ہے، دوسرے دن ٹھیک مغرب کی نماز کے وقت گا نا سنا جا رہا ہے اور شراب پی جا رہی ہے۔ رات خانقاہ میں بسر کی اور دن چنڈو خانہ میں گزارا، باتیں زیادہ تر بے تکی، اُلجھی اور بہکی ہوئی۔

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی —

"مجذوب کی بڑ" اُردو کی معروف اصطلاح بن گئی ہے۔ مگر کبھی کبھی مجذوب کے مُنہ سے بڑے پتہ کی بات بھی نکل جاتی ہے۔ نہ صرف پتہ کی بات بلکہ بہت اونچی بات، جیسے اس شخص کے دل میں یہ نکتہ القا کیا گیا ہے اور اس کے ادراک پر روح القدس کی پرچھائیں پڑ گئی ہے۔

نطشہ المانوی کو اقبال نے "مجذوب فرنگی" کہا ہے۔ اس کے ملفوظات کا بھی یہی عالم ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھ جایئے، کچھ نہیں کھلتا کہ کہنے والے کا مفہوم کیا ہے، پیچیدگی میں پیچیدگی، راز اندر راز، اُلجھنیں ہی اُلجھنیں، سچ مچ "مجذوب کی بڑ!"۔ مگر کہیں کہیں وہ ایسی اونچی بات کہہ جاتا ہے، جیسے یہ بات اس نے خود اپنے ارادہ سے نہیں کہی، اس سے کہلوائی گئی ہے، نیطشے کے یہاں کہیں کہیں ایسے "نیم ربانی" اقوال بھی آ گئے ہیں۔

"تم نے جو میرے ساتھ برائی کی ہے، اسے میں تو معاف کر دوں گا، مگر تم نے جو اپنے ساتھ برائی کی ہے اسے کون معاف کرے گا۔"

نیطشے کا یہی "جذب" مافوق الانسان کی تلاش میں، مولانا روم کے اس خیال:

از دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

کا ہم آواز بن جاتا ہے۔

اقبال کے کلام میں جو تلمیحات پائی جاتی ہیں وہ مستقل پس منظر رکھتی ہیں، اور ان کا اقبال کے پیغام اور افکار سے بڑا گہرا تعلق ہے
ان "کرداروں" کو سمجھنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ان کرداروں کا پہلے کتابی مطالعہ کیا جائے اور نہ صرف مطالعہ بلکہ انہیں سمجھا جائے۔
جس کسی نے مولانا روم کو نہیں پڑھا وہ "سوز و ساز رومی" کی لذت کو کیا جانے، جس نے رازی کا مطالعہ نہیں کیا وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اقبال
نے "پیچ و تاب" رازی کہہ کر کس حقیقت کو بے نقاب کردیا، جو بو علی سینا کے افکار سے واقف نہیں ہے اس پر ؎

بو علی اندر غبار ناقہ گم

کی معنویت آشکار ہو ہی نہیں سکتی، جس نے زمخشری کے فن کو نہیں سمجھا، وہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

میں "صاحب کشاف" کی تلمیح کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکتا، جو کوئی اشتراکیت کے فلسفہ اور اشتراکیوں کی زندگی سے باخبر نہیں ہے، اُسے
پتہ نہیں چل سکتا کہ اشتراکیوں کو علامہ اقبال نے "کوچہ گرد" کہہ کر ایسے کردار کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔

مسلمانوں میں لیڈر اور قائد تو بہت گزرے ہیں مگر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی زندگی اس لئے ممتاز نظر آتی ہے کہ اس میں
دینی اخلاق سموئے ہوئے تھے۔ انگریز کے دورِ حکومت میں اول اول نظر بند کئے گئے تو قید خانہ سے اس طرح رہا ہوتے کہ چہرہ پر خوب
گھنی ڈاڑھی تھی اور قرآن پاک گردن میں حمائل تھا، اسلام کی کسی چھوٹی سے چھوٹی روایت اور شریعت کی ادنیٰ قدر کو بھی خطرے میں
دیکھتے تو تڑپ اٹھتے۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں جب شاردا بل پیش ہوا جس کی زد مسلمانوں کے دینی مسائل نکاح و ازدواج پر
پڑتی تھی، تو بے چین ہو گئے، اور ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ میں اس کی خلاف ورزی کروں گا، شریعت میں مداخلت برداشت نہیں
کی جا سکتی، خدا اور رسول ﷺ کی محبت مولانا محمد علیؒ کے دماغ میں رچ گئی تھی۔ کیا اسلامی جوش تھا، کیا دینی غیرت تھی (اللھم کثر
امثالھم) تو مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کی یہ زندگی جب تک سامنے نہ ہو گی، اس وقت تک اقبال کے اس شعر ؎

خاک قدس اورا بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

کی لذت سے شوق و وجدان محروم رہیں گے!

مولانا لطافت الرحمٰن

مقامِ رسالت اور شعر

قال اللہ تعالیٰ وما علّمناہ الشعر وما ینبغی لہٗ۔ برگزیدۂ کائنات فخرِ موجودات سرکارِ دوعالم نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ رسالت اور شعر و شاعری کا معاملہ قرآن مجید کے اُس اٹل اور دوٹوک فیصلہ کے بعد کسی مزید توضیح و تنقیح کا خواہاں نہیں مگر کچھ وقت اور حالات کے تقاضوں اور اپنے مکرم مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی مدظلہم اللہ العالی کی فرمائش پر یہ مضمون سپردِ قلم کر رہا ہوں ممکن ہے کہ کسی بندۂ خدا کو اس کے مطالعہ سے فائدہ ہو یا کم از کم بعض علمی ذوق رکھنے والے حضرات کو ہی سے علمی یا معلوماتی تسکین ہو اور میرے لئے تو تعمیلِ ارشاد ہی کافی ہے۔ واللہ ہو الموفق۔

تمہیدی طور پر موضوع مضمون میں درج ذیل چند امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ نبوت و رسالت خداوند قدوس کا ایک وہبی منصب ہے جس کسی بندہ میں اس عظیم الشان ذمہ داری سنبھالنے کی متعلقہ صلاحیت پائی گئی اُس کو حق تعالیٰ نے یہ منصب دے دیا۔ فرمایا گیا ہے۔ "اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ" اور یہ بھی ہے کہ یہ منصب کسی کسب و محنت یا سابقہ دنیوی جاہ و عزت سے تعلق نہیں رکھتا ؎ ایں سعادت بزورِ بازو نیست ۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

۲۔ خداوند قیوم نے جس قوم اور جس ماحول میں کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو ادیان و ملل اور اقوامِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ اُس نبی کی ذات میں وقت کے اُن موجودہ کمالات کا بوجہِ اتم موجود ہونا ضروری ہے جو کہ حقیقتاً شانِ رسالت کے مناسب اور خدا کے یہاں کمالات ہیں۔ اور اگر کسی قوم میں کچھ ناشائستہ اور غلط عادات کا چرچا ہے تو رسول کو ان امور کے مقابلہ اور استیصال کے لئے ایک زبردست قوت عطا ہو جاتی ہے جو اُسی نبی کا معجزہ ہوتی ہے مثال کے طور پر دیکھا جائے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بُت پرستی کا مقابلہ خداپرستی سے کر کے راہِ توحید کے میدان میں ایک ریکارڈ قائم فرمایا اور اپنی قوم کے بُت کدے کو شکست و ریخت سے آشنا کیا اور خود بُت پرستوں کو اپنے استدلال سے قابلِ الزام ٹھیرایا، جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی طاغوتی اور ساحرانہ قوتوں کا مقابلہ کیا اور زیر کیا ؎ اذا جاء موسیٰ والقی العصا فقد بطل السحر والساحر۔

۳۔ سلسلہ نبوت کا پورا مقصد و غایۃ نبی و رسولؑ کی آواز فطرت کی آواز حق کی آواز انسانی فطرت کی آواز ہوا کرتی ہے فرمایا گیا ہے۔ کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ ۔ یہ اس لئے کہ نبی کا کام ہی گویا انسان کو انسانیت کے تقاضوں پر لگا کر اپنے معبودِ حقیقی سے روشناس کرانا اور اخلاقِ انسانیت کی تکمیل ہے۔ فرمایا گیا ہے "بعثت لِاتمم مکارم الاخلاق"

اب تمہیدِ بالا کے دفعاتِ ثلاثہ کے بعد بتانا یہ ہے کہ افضل الانبیاء سرتاج اصفیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کس قوم و ملک اور کس ماحول میں مبعوث ہوئے۔ ملک عرب جو اُن کی بعثت گاہ ہے اس میں اس وقت سب سے بڑا مایۂ ناز کمال اور معیارِ قابلیت کیا چیز تھی تاریخ بتاتی ہے کہ عرب قوم میں اس جاہلی دور کے نقائص اور بعید از انسانیت قبائح و مصائب کے مقابلہ میں بعض امورِ انسانی معاشرہ کے کمالات بھی تھے مثلاً شجاعت۔ مہمان نوازی۔ ایفائے عہد۔ وغیرہ ان امور میں فصاحت و بلاغت کا وصف

وہ تھا جس کا عرب قوم میں بے حد چرچا تھا۔

ان کے فصحاء، بلغاء، خطباء، وشعراء قومی محافل اور اجتماعات میں فصاحت وبلاغت کا مظاہرہ کرتے تھے اور اپنا اپنا کلام مقابلہ کے لئے پیش کرتے تھے۔ اعشیٰ کا مایۂ ناز قصیدہ جس کا مطلع ہے۔ ودع ہریرۃ ان الرکب مرتحل۔ وہل تطیق وداعًا ایہا الرجل۔

(ہریرہ (محبوبہ کا نام) کو رخصت کرو، کیوں کہ قافلہ سفر کر رہا ہے، اور اے شخص! کیا تو "وداع" کہنے کو برداشت کر سکے گا)

اسی طرح امراءالقیس (ملک الضلیل) کا مشہور قصیدہ جس کا اول ہے ؎ قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل۔ بسقط اللوی بین الدخول فحومل

(محبوب اور دیارِ محبوب کی یاد پر آنسو بہانے کے لئے اے دونو دوستو! رُک جاؤ، اور یہ دیار حبیب دخول اور حومل نامی ٹیلوں کے درمیان واقع ہے)

اسی طرح زہیر۔ طرفہ وغیرہ کے قصائد جو بیت اللہ کے دروازہ پر مقابلہ کے لئے لٹکائے گئے تھے یہ تمام امور اس دور فصاحت اور عرب قوم کے اس رجحان کی ایک زندہ یادگار ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے عرب قوم کے اس روایتی اور قومی موجب ترفع وکمال وصف فصاحت کو تفصیل سے ذکر کر کے فرمایا ہے۔ حتی انتہوا الی المناغاۃ فی تعلیق اشعارہم بارکان البیت الحرام موضع حجہم وبیت ابراہیم کما فعل امراءالقیس ابن حجر والنابغ الذبیانی وزہیر ابن ابی سلمی وعنترۃ ابن شداد وطرفۃ ابن العبد وعلقمۃ ابن عبدہ وغیرہم من اصحاب المعلقات السبع۔ اب عین ان حالات میں حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی بعثت ہوئی قرآن نازل ہونے لگا اس کی آیات کو فصحاء عرب سننے لگے سن کر ماننا پڑا کہ ماہٰذا قول البشران ہوالا قول خالق القوی والقدر۔

(حضرت لبیدؓ کا واقعہ)

مثال کے طور پر حضرت لبید جو عرب شعراء وفصحاء میں چوٹی کے درجہ کے فصیح وبلیغ شاعر ہیں جب مسلمان ہو کر قرآن کی فصاحت وبلاغت پر غور کرنے کا موقع ملا تو صرف یہی نہیں کہ شعر کہنا چھوڑ دیا بلکہ شاعری ہی کو ترک کر دیا اور فرمایا میں فصیح وبلیغ شاعر تھا جب تک کہ قرآن سامنے نہ تھا اب قرآن سامنے ہے اس کو دیکھ کر اپنا زور کلام ظاہر کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ حضرت لبید سے اسلام لانے کے بعد کوئی شعر یا قصیدہ منقول نہیں البتہ صرف ایک شعر کے متعلق تاریخ میں ثبوت ملتا ہے اس میں بھی مورخین کا اختلاف ہے کہ یا تو یہ ہے کہ ؎ ماعاتب المراء الکریم کنفسہ۔ والمراء یصلحہ الجلیس الصالح　اور یا یہ ہے کہ ؎ الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی۔ حتی کسانی من الاسلام سربالا۔

علامہ ابن خلدون اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ　ثم انصرف العرب عن ذالک اول الاسلام بما شغلہم عن امر الدین والنبوۃ والوحی وما ادہشہم من اسلوب القرآن ونظمہ فاخرسوا عن ذالک وسکتوا عن الخوض فی النظم زمانًا۔

شریف انسان کو خود اس کا نفس ملامت کرتا ہے، اور اچھا ہم نشین انسان کی اصلاح کرتا ہے)

(یعنی اللہ کا شکر ہے میری موت آنے سے قبل، اللہ تعالیٰ نے مجھے خلعتِ اسلام سے سرفراز کیا)

سنہ پھر عرب شعر وشاعری سے آغازِ اسلام میں الگ ہو گئے۔ کیوں کہ وہ دین، نبوت اور وحی جیسے امور میں منہمک ہو گئے۔ اور اسلوب قرآن اور نظم قرآن کو سن کر حیران ہو گئے، اور ان کی زبان شاعری میں گنگ ہو گئی اور ایک عرصہ تک بزم شعر وشاعری پر سکوت طاری رہا) اگرچہ اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ

قرآنی فصاحت وبلاغت کے سامنے شاعرانہ فصاحت کی کوئی اہمیت اور وقعت تو نہیں رہی لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہو کہ نثر کلام کی بہ نسبت شعر ونظم ہی زیادہ تر زور فصاحت کا مرکز بن سکتے ہیں اور شعر ہی زیادہ تر تاثیر وجاذبیت کا کام کر سکتا ہے۔ عمرۃ القضاء کے موقع پر جب بنی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو عبداللہ ابن رواحہ فی یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔ ؎ خلوا بنی الکفار عن سبیلہ ۔ الیوم نضربکم علی تنزیلہ ۔ ضرباً یزیل الہام عن مقیلہ ویذہل الخلیل عن خلیلہ

(؎ اے کافرو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رستہ سے ہٹ جاؤ، اور ہم تمہیں قرآن کے نزول پر، ایسی ضرب لگائیں گے جس سے تمہارا سر تن سے جدا ہو جائے گا، اور دوست دوست کو بھول جائے گا)

حضرت عمرؓ نے روکا تو حضورؐ نے فرمایا۔ خل عنہ، فلھو اسرع فیھم من نضح النبل۔ اور چونکہ مقام رسالت وعظ وتبلیغ تعلیم و (؎ شعر کہنے دو، کیوں کہ یہ شعر ان کفار کے حق میں تیر سے بھی زیادہ کام کرتے ہیں)

اصلاح پند وپیغام کا مقام ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں جس قدر مؤثر ترین طریق پر حکم خداوندی کو لوگوں پر پیش کیا جائے ضروری اور مناسب ہے پھر کیا وجہ ہے کہ وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ، فرمایا گیا سو اس کی وجہ یہ ہے جیسا ہم نے اوپر بھی بتایا ہے کہ نبی کی آواز فطرت کی آواز ہوا کرتی ہے اس میں تکلف اور تصنع کی آمیزش ممکن نہیں ہوتی خاص طور سے یہاں پر کلام نبی سے ہمارا مقصد وحی متلو یعنی قرآن مجید ہے جو شعر یقیناً نہیں مگر انسانی نثر کلام کے تمام اسالیب وانداز سے اس کا انداز واسلوب ارفع واعلیٰ اور وراء الوراء ہے ؎ ابن خلدون فرماتے ہیں واما القرآن ۔ ان کان من المنثور الا انہ خارج عن الوصفین المنثور والنظم، ولیس یسمی مرسلاً مطلقاً ولا مسجعاً بل تفصیل ایات ینتہی الی مقاطع یشھد لہ الذوق بانتہاء الکلام عندہا ثم یعاد الکلام فی الآیۃ الاخری بعدہا ویثنی من غیر التزام حرف یکون مسجعاً ولا قافیۃ وھو معنی قولہ تعالیٰ۔ اللہ نزل احسن الحدیث کتاباً متشابہاً تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم۔

(؎ قرآن اگرچہ وہ نثر ہے لیکن وہ نظم ونثر کے دونوں وصف سے علیحدہ ہے، اور قرآن کو مطلقاً نثر مرسل بھی نہیں کہہ سکتے، اور نہ اسے مسجع کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس کی آیات کی تفسیر ایسے مقطع پر ختم ہوتی ہے، جہاں پہونچ کر خود ذوق بتا دیتا ہے کہ بات ختم ہو رہی ہے پھر دوسری بات دوسری آیت میں معاً شروع کی جاتی ہے، اور کسی ایک حرف کا التزام کئے بغیر دہرادی جاتی ہے، جہاں نہ کوئی سجع ہوتا ہے اور نہ قافیہ، اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کے یہی معنیٰ ہیں "اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے، ملتی جلتی ہوئی کتاب کی شکل میں، اس سے اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اتقان فی علوم القرآن میں قرآن کی وجہ اعجاز کی تعیین میں ایک مبسوط بیان کے ضمن میں امام فخرالدین رازی کا خیال یوں نقل کیا ہے۔ قال الامام فخرالدین۔ وجہ الاعجاز الفصاحۃ وغرابۃ الاسلوب والسلامۃ من ... جمیع العیوب۔

آگے چل کر سیوطیؒ کلام کے متعدد اور مختلف اقسام کی تفصیل کر کے آخر میں فرماتے ہیں ؎ فانواع الکلام لا تخرج من ہذہ ولکل من ذالک نظم مخصوص والقرآن جامع لمحاسن الجمیع علی نظم غیر نظم شئ منہا یدل علی ذالک انہ لا یصح ایقال لہ رسالۃ او خطابۃ او شعر او سجع کما یصح ایقال ہو کلام والبلیغ اذا قرع سمعہ فصل بینہ، وبین ما عداہ من النظم ولہذا قال تعالیٰ وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔

(ء) لہٰذا کلام کی قسمیں اُن سے باہر نہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی ایک مخصوص ترکیب ہے، اور قرآن میں ان تمام قسموں کے محاسن موجود ہیں، لیکن قرآن کی ترتیب، ان سب سے مختلف ہے، اس لئے نہ اسے رسالہ کہا جا سکتا ہے، نہ اسے خطابت کہہ سکتے ہیں، نہ اسے شعر کہہ سکتے ہیں اور نہ سجع، اور یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ایک "کلام ہے، اور بلیغ انسان کے کان میں جب اس کی آواز پہونچتی ہے، تو فوراً دوسرے کلام سے اُس کو ممتاز سمجھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسی بنا پر فرمایا ہے" یہ وہ کتاب عزیز ہے، جس کے سامنے اور پیچھے باطل کا گزر نہیں"۔

یہ تو قرآنی اسلوب کی وضاحت تھی جس کو کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لوگوں پر پیش کرنے والے ہیں جس کا طرز انتہائی سادہ بے تکلف پُر مغز و پُر معنی ہے حالات و واردات کے عین مطابق اور حقائق و واقعات پر مبنی ہے۔ دوسری طرف شعر اگرچہ فی حد ذاتہ ایک جاذب قلب اور دلچسپ قسم کا کلام ہے۔ بلاغت و سلامت زور کلام اور فصاحت کا مظہر اور مرکز ہے اور اسی وجہ سے فرمایا گیا ہے" ان من البیان السحر" وان من الشعر لحکما" نیز زبور کے بارہ میں وارد ہے کہ وہ اُن منظوم ترانوں کا مجموعہ تھی جن کو حضرت داؤد علیہ السلام اپنے مخصوص نغمہ داؤدی میں پڑھ کر کائنات عالم کو مبہوت اور مدہوش فرماتے تھے فتح الملہم شرح الصحیح مسلم ص ۲۴۷ ج ۱ میں ہے ۵؎ عن ابن عباس رضا ان داؤد علیہ السلام کان یقرء الزبور بسبعین لحنا ویقرأ قراءۃ یطرب منہا المحموم وکان اذا اراد ان یبکی نفسہ لم تبق دابۃ فی برۃ ولا بحر الا انصتت لہ واستمعت وبکت

(۵؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام زبور کو ستر لحن میں پڑھا کرتے تھے، اور اس انداز سے پڑھتے تھے کہ بخار میں مبتلا انسان پر بھی کیف طاری ہو جاتا تھا اور جب وہ خود گریہ کرنا چاہتے، تو اس طرح پڑھتے کہ بر و بحر کا کوئی جانور بغیر غور سے سنتے ہوئے نہ رہتا، اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں، ہو جاتے)

۔ مگر اس کا بھی انکار نہیں کہ شعر کے حسن اور قبیح ہونے کا مدار اس مضمون پر ہے جس کا ترجمان شعر کو بنایا جاتا ہے لہٰذا ان حسنا فحسن وان قبیحا فقبیح اور اسی وجہ سے کلی طور پر شعر کی قباحت کا دعویٰ بھی غلط ہے اور علی الاطلاق مقبول اور حسن ثابت کرنا بھی خطاء۔ بلکہ محاکمہ یہ ہے کہ حسنہ حسن وقبیحہ قبیح چنانچہ شاعرانہ کلام کے مذموم پہلو پر قرآن نے فرمایا" والشعراء یتبعہم الغاوون" اور اسی طرح سے علماء معقول و منطق نے بھی شعر کے تخیلاتی اور توہمی رخ پر نظر مرکوز کر کے قضایا شعریہ کو مظنونات اور موہومات قرار دیا چنانچہ علامہ محب اللہ بہاری رسالہ سلم العلوم میں کہتے ہیں ۶؎ الرابع الشعر وہو مؤلف من المخیلات وہی قضایا یخیل بہا فتتاثر النفس بہا قبضا وبسطا فانہا اطوع للتخییل من التصدیق سیما اذا کان علی وزن لطیف وانشد بصوت طیب۔

(۶؎ چوتھی قسم شعر ہے، شعر نام ہے اُس کلام کا جو مرکب ہوتا ہے خیالات سے، خیالات کیا ہیں، خیال نام ہے، اس قضیہ کا جس کا انسان تصور کرتا ہے اور نفس اُس سے کبھی قبض کے ساتھ کبھی بسط کے ساتھ متاثر ہوتا ہے، کیوں کہ نفس یقینی امور کے مقابلہ میں تخیل سے زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ خصوصاً جب کہ اُس کلام کا وزن لطیف ہو، اور دل کش آواز سے پڑھا جائے۔)

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے قرآن اور قرآن والے کی پوزیشن کو سحر و کہانت شعر و غوایت کے تمام متوہم بدنما داغوں سے بچانے کے سلسلہ میں قرآن کو شعر اور رسول کو شاعری سے بچایا اب اس تفصیل کے بعد یہاں پر اس کا اعتراض کا وارد ہونا ظاہر ہے کہ بعض آیات قرآنیہ باقاعدہ اشعار معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ وہ خاص اوزان اور خاص بحور پر نازل ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ جس کی تقطیع ہے۔ مفعولن مفعولن فاعلات۔ بحر سریع مقطوع مطوی موقوف۔

۲۔ ثم اقررتم وانتم تشہدون جس کی تقطیع ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔ بحر رمل مسدس مقصور۔
۳۔ ثم انتم ھولآء تقتلون۔ جس کی تقطیع ہے ۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔ بحر رمل مسدس مقصور
۴۔ لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا۔ جس کی تقطیع ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ بحر رمل مسدس محذوف۔
۵۔ انا اعطینٰک الکوثر۔ جس کی تقطیع ہے۔ فعلن فعلن فعلن فعلن۔ بحر متقارب مشطور اثلم الاجزاء کلہا۔
۶۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ جس کی تقطیع ہے۔ مفعولن مفاعیلن مفاعیلن فاع۔ مشطور بحر الہزج اخرب مکفوف۔ مگر اس کا اعتراض کا منشاء علم عروض کے ان قواعد وضوابط سے بے خبر ہونا ہے جن کا موضوع شعر ہے اور جس میں شعر کی حقیقت اور غرض وغایت اور تمام متعلقہ امور کا وضاحت سے بیان ہے۔

علامہ ابن صاحب ؒ علامہ سید دمنہوری نے صاحب شافی اور کافی فی علمی العروض والقوافی نے علامہ جاراللہ الزمخشری نے قسطاس میں۔ امام العربیہ ابویعقوب یوسف سکاکی نے مفتاح العلوم میں۔ یہاں تک کہ امریکی فاضل صاحب محیط الدائرۃ نے اپنی کتاب محیط الدائرۃ میں۔ ان سب اہل فن نے امام خلیل موجد فن عروض سے نقل کیا ہے کہ شعر صرف کلام موزوں یا موزون ومقفی کا نام نہیں بلکہ جب تک اس وزن کا تعمد اور قصد کہنے والے نے نہ کیا ہو اُس وقت تک وہ موزوں ومقفی کلام شعر نہیں ہو سکتا فاضل امریکی محیط الدائرۃ میں لکھتا ہے۔

الشعر کلام یقصد بہ الوزن والتقفیۃ ۔ آگے چل کر فوائد قیود میں لکھتا ہے وقولنا یقصد بہ الوزن مخرج لما کان وزنہ اتفاقیاً کبعض آیات القرآن منہما قولہ لن تنالوا البر حتیٰ تنفقو مما تحبون وقولہ یریدان یخرجکم من ارضکم بسحرہٖ

"اور ہماری بات کے وزن کا قصداً ارادہ کیا جائے، اس قید سے وہ کلام نکل جاتا ہے جس میں وزن اور قافیہ بلا ارادہ پیدا ہو جائیں، جیسا کہ بعض قرآن کی آیتیں......)

سکاکی ؒ نے

وزناً عن تعمد کی قید ہی کو شعر کا معیار قرار دے کر فرمایا ہے کہ اگر قصد و تعمد پر شعر ہونے کا مدار نہ ہو بلکہ صرف وزن کا پایا جانا ہی کافی ہو تو پھر تو "مامن لافظ الا وھو شاعر" یہ اس لئے کہ ہر خاص وعام کی روزمرہ معمولی اور معاملاتی باتوں میں ضرور کوئی نہ کوئی فقرہ اور جملہ اوزان شعریہ پر موزوں ہو سکتا ہے مثلاً کوئی شخص آیا اور سبزی فروش سے پوچھا بکم تبیع الف باذنجانہ اُس نے جواب دیا۔ ابیعھا بالف عدلیات۔ تقطیع مفاعلن مفاعلن مفعولن ۔ دوسری اور تیسری مثال ذکر کر کے فرمایا ہے کہ کسی شخص نے نجار سے پوچھا ہل تمم ذاک الکرسی۔ اُس نے جواب دیا۔ نعم فرغت عنہ یوم الجمعۃ۔ اول کی تقطیع مستفعلن مفعولن اور دوسرے کی مفاعلن مفاعلن مفتعلن۔ یا کسی نے ایک جماعت سے خطاب کر کے کہا من جاء کم یوم الاحد۔ انھوں نے جواب دیا زید ابن عمرو ابن الاسد۔ تقطیع مستفعلن اربع مرات۔ انصاف سے بتایا جائے کہ ان تمام کو شعر کہا جا سکتا ہے ہرگز نہیں۔ اب اس کے بعد قرآن کے مذکورہ آیات یا احادیث رسول ص کے بعض موزوں جملے اور فقرے مثلاً ؎ ہل انت الا اصبع دمیت وفی سبیل اللہ ما لقیت

؎ تو کیا ہے؟ ایک انگلی ہے، جو خون آلود ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں تجھے یہ بات پیش آئی

اسی طرح ہماری معمولی گفتگو کے وہ موزوں فقرے جو غیر شعوری طور پر کسی وزن و تقطیع پر اُترتے ہیں اُن کو اشعار کہنا اور ہر بولنے والے کو شاعر کہنا اُس کو عقل گوارا نہیں کر سکتی ہے؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ اُن اوزان وبحور۔ قافیہ وغیرہ ضروریات شعریہ پر کلام کے مطابق ہونے کے لئے شاعر کا ارادہ ہی کافی ہے علم عروض کے قواعد وضوابط کا سامنے رکھنا کوئی ضروری نہیں جیسا کہ قرآن ہی سے ۔صرف۔ نحو اشتقاق علم بلاغت وغیرہ تمام متعلقہ علوم کا استنباط کا ہو گیا ہے یہ

باقی مضمون ص۴۷ پر

گلہائے رنگ رنگ

منظر صدیقی اکبرآبادی

حسن کو دی تھی نزاکت سی جو رعنائی نے
اُسے کچھ اور سنوارا تری انگڑائی نے

تجھ سے اب شکوۂ بیگانگی کیا ہو اے دوست
تجھے بیگانہ کیا میری شناسائی نے

تا نہ ہو جائے شبِ غم کے تاثر میں کمی
شام سے شمع بجھا دی ترے سودائی نے

وحشتِ عشق رہی صرف مجھی تک محدود
عزمِ صحرا نہ کیا پھر کسی سودائی نے

عروج زیدی

کثرتِ جلوہ دکھائی تری یکتائی نے
ایک آئینہ سے پیدا ہیں ہزار آئینے

جب سے مری نظر میں وہ نازِ شباب ہے
پھولوں میں رنگ و بو ہے نہ موتی میں آب ہے

کب تک متاعِ غم کی حفاظت کریں گے ہم
اب صبر سے ضرور بغاوت کریں گے ہم

محبت کو بہت کچھ دخل ہے میری کہانی میں
ازل میں چوٹ جو کھائی تھی وہ اُبھری جوانی میں

نازش پرتاب گڑھی

لمحے یہ آ گئے ہیں ترے انتظار کے
میں خود جواب دیتا ہوں تجھ کو پکار کے

یہ احترامِ غم ہے کہ زنداں سے تھوڑی دور
جھونکے رُکے ہوئے ہیں نسیمِ بہار کے

کس رُخ سے زندگی نے دکھایا ہے آئینہ
آنسو نکل پڑے غمِ لیل و نہار کے

دل میں جراحتوں کا چمن زار کھل گیا
آنکھوں نے خواب دیکھ لئے تھے بہار کے

اے جرأتِ حیات ذرا کھل کے مسکرا
دیکھیں گے حوصلے غمِ ہمت شکار کے

ذوقی مظفر نگری

روشنی مُردہ چراغوں کو عطا کی ہم نے
بزمِ انجم میں ہمیں شعلہ نوا کہتے ہیں

غم کی راتوں میں یہ سُورج کا فسانہ کیا خوب
ڈھونڈیئے اُس کو جسے شمعِ وفا کہتے ہیں

جن کی قسمت میں نہیں مہرِ تمنا کی ضیا
آپ اُن سرد شراروں کو دیا کہتے ہیں

اب کہاں بزمِ گلستاں میں وہ تنویرِ بہار
جس کو غنچوں کے تبسّم کی ضیا کہتے ہیں

جب سرِ راہ بگولہ کوئی اُٹھتا ہے ندیم
اُس کو اربابِ جنُوں راہنما کہتے ہیں

آشنا ہیں جو گلستاں کے اصولوں سے وہی
اپنے منشور کو دستورِ خدا کہتے ہیں

یوگیندر پال صابر (ایم اے)

ظلم زندہ ہے اندھیرے میں بسر ہونے تک
شمع کی شعلہ مزاجی ہے سحر ہونے تک

دیکھنے والے نہ تحقیرِ صدف کر کہ گہر
اسی آغوش میں پلتا ہے گہر ہونے تک

دیکھنا ہے ہمیں انجامِ جفائے شبِ تار
زندہ رہنا ہے بہر حال سحر ہونے تک

عشق کی رسم تو زندہ ہی رہے گی صابر
ہم اگر مر بھی گئے زُلف کے سر ہونے تک

وارث القادری

یہ مانتے ہیں کسی کا کچھ آسرا بھی نہیں
کوئی نہیں ہے ہمارا تو کیا خدا بھی نہیں
کچھ ابتدائے غم عشق کا پتہ نہ چلا
ہوئی تلاش تو دیکھا کہ انتہا بھی نہیں
حریم ناز میں کیا حال ہے خدا جانے
یہاں تو ہونٹ تبسم سے آشنا بھی نہیں
جب تصور میں تو ضو فشاں ہو گیا
شام غم چاندنی کا سماں ہو گیا
جب مکاں کو حقیقت نے روشن کیا
اتنی رونق بڑھی لامکاں ہو گیا
خزاں در بغل ہیں چمن زار اکثر
ملے گل کی آغوش میں خار اکثر
ہوئی نبض دوراں کی اصلاح ان سے
مسیحا بنے تیرے بیمار اکثر
تری رحمتوں کے تصور میں گم ہیں
جھکائے ہوئے سر گنہ گار اکثر

بقیہ مضمون صفحہ ۴۵ سے آگے :-

نہیں کہ قرآن مجید ان قواعد کے لئے نازل ہوا بلکہ ان قواعد کو قرآن سے لیا گیا ہے۔ علم عروض کے اوزان و قواعد کو بھی امام العربیہ خلیل ابن احمد فراہیدی نے عرب شعراء کے اشعار سے استنباط کر کے اس عجیب و غریب فن کو ایجاد کیا ان شعراء کا قصد ضرور خاص اوزان کا ہوتا تھا مگر وزن کی درستی ان کا ذوق و وجدان کرتا تھا۔

حق یہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیتوں کو شعر شاعری سے منسوب کرنا۔ نہایت ہی غلط اور بے بنیاد نسبت ہے اور اس انداز سے سوچنا ہی ذہن و فکر کی کجی کی دلیل ہے۔

کوثر نیازی

موجِ کوثر

مجھ سیاہ کار کے دل میں بھی وہ ہوتے ہیں مکیں
شبِ اسریٰ میں جو پہنچے تھے سرِ عرشِ بریں

اس کی آغوش میں خوابیدہ ہیں محبوبِ خدا
لامکاں سے بھی بلندی میں کہاں کم ہے زمیں؟

الفتِ سرورِ کونین ہے میرا ایمان
یہ نہیں ہے تو مرے واسطے دنیا ہے نہ دیں

حشر میں سایۂ دامانِ نبی مل جائے
آرزو اس کے سوا اور کوئی دل میں نہیں

مغفرت کے لئے سامان یہی کیا کم ہے!
للّٰہ الحمد کہ ہے تیری رسالت کا یقیں،

بادشاہوں سے ترے در کے گدا اچھے ہیں
تخت والوں سے بھی اونچے ہیں ترے خاک نشیں

جب سے قرآن میں دیکھا ہے ترا عکسِ جمال
میری نظروں میں نہیں جچ سکا زمانے میں حسیں

دلِ کوثر میں ہے طیبہ کی تمنا کب سے
اس طرف بھی نظر اے گنبدِ خضرا کے مکیں

ماہر القادری

وہ آئے اور آئے بھی قرآں لئے ہوئے
تنظیمِ کائنات کا ساماں لئے ہوئے

نکلا حرا کے غار سے وہ نازشِ مسیح
انسانیت کے درد کا درماں لئے ہوئے

معراج میں یہ شوکت و اجلالِ مصطفےٰ
جبریل بھی ہیں دیدۂ حیراں لئے ہوئے

گزرے وہ ہر مقام سے طائف ہو یا حنین
اپنے جلو میں نصرتِ یزداں لئے ہوئے

اللہ رے! نطقِ احمدِ مرسل کی سادگی
ہر لفظ ہے حقیقتِ عریاں لئے ہوئے

اٹھے حضور، ان کی نوازش کی سن کے دھوم
آئی سحر بھی چاک گریباں لئے ہوئے

ماہر بھی بارگاہِ نبی میں بصد نیاز
حاضر ہے بہرِ نذرِ دل و جاں کے لئے

انسانی جسم کا تانا بانا مضبوط و مستحکم نہ ہو
تو
گرم ملبوسات بھی سردی سے بچاؤ
کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتے!
ماءُ اللحم طیوری
آپ کی یہ ضرورت کماحقہٗ پوری کرتا ہے
جو
صحت بخش دوا ہی نہیں
قوت بخش غذا بھی ہے
موسم سرما کا خیر مقدم کرتے وقت ماءُ اللحم طیوری ضرور استعمال کریں
AFP
ASHRAF UNANI LABORATORIES REGD.
اشرف یونانی لیبارٹریز پوسٹ بکس ۱۰۱ لائلپور
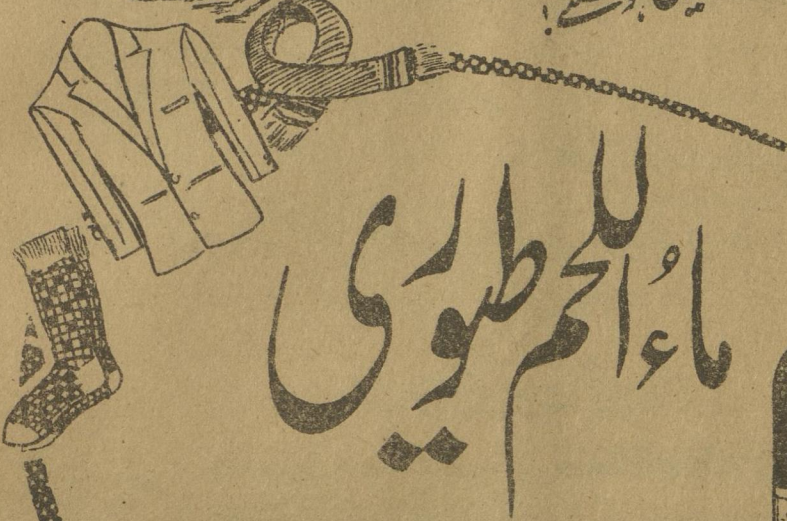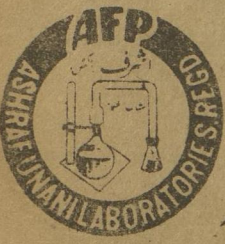
روحِ انتخاب

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہونچی ہے، ایک اللہ تعالیٰ کا کلام، دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں، جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ و تعلیم اور تفہیم کا واسطہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا، تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشاء پورا کرنے کے لئے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں!

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم و ملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا، اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا، کتاب کو نبی سے الگ کر دیجئے تو وہ ایک کشتی ہے ناخدا کے بغیر جسے لے کر اناڑی مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزلِ مقصود پر کبھی نہیں پہونچ سکتے۔ اور نبی کو کتاب سے الگ کر دیجئے تو خدا کا راستہ پانے کی بجائے، آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی ہیں، ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کیا۔ اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے، انجام یہ ہوا کہ کتابیں ان کے لئے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں، حتیٰ کہ آخرکار خود انہیں بھی وہ گم کر بیٹھے، عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے نبی کا دامن پکڑا، اور اس شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی چیز انہیں نبی اللہ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔

پرانے دور کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو نعمتِ اسلام میسر آنے کے وہی دو ذرائع ہیں، جو ازل سے چلے آ رہے ہیں، ایک خدا کا کلام جو اب صرف قرآن پاک کی صورت ہی میں مل سکتا ہے۔ دوسرے اسوۂ نبوت، جو اب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ہی میں محفوظ ہے، ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے، تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے سمجھے، ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا۔ اس نے اسلام کو سمجھا، ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا، اور نتیجتاً ہدایت سے بھی۔

پھر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں چونکہ ایک ہی مشن رکھتے ہیں، ایک مقصد و مدعا کو لئے ہوئے

آتے ہیں، اس لئے اُن کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و مدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں، اس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھئے تو قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرتِ پاک، واقعات و حوادث کا ایک مجموعہ ہے، آپ لغت اور روایات اور علمی تحقیق و کاوش کی مدد سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں، اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے عہد کے متعلق صحیح ترین معلومات کا ڈھیر لگا سکتے ہیں، مگر رُوحِ دین تک نہیں پہونچ سکتے، کیوں کہ وہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لئے قرآن اُتارا گیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی علمبرداری کے لئے کھڑا کیا گیا، اس مقصود کا تصور جتنا صحیح ہوگا، اُتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح، اور جتنا زیادہ ناقص ہوگا، اُتنا ہی دونوں کا فہم ناقص ہوگا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، دونوں ہی بحرِ ناپیدا کنار ہیں، کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرلے، تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا، البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے، وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی اُن کا زیادہ سے زیادہ صحیح فہم حاصل کرلے، اور اُن کی مدد سے روحِ دین تک رسائی پالے۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ——— "دیباچہ"
کتاب محسنِ انسانیت ﷺ ——— از: نعیم صدیقی)

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انلجین ٹکیاں
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیباریٹریز لمیٹڈ ۔ کراچی

یہ کتابیں آپ کے یہاں ضرور رہنی چاہئیں!

فردوس ماہر القادری کی غزلوں، رباعیات اور قطعات کا شاہکار مجموعہ، حقیقی ترقی پسند شاعری کا سدا بہار گلدستہ!

قیمت: تین روپے

کاروانِ حجاز مکہ مدینہ میں کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا۔ اس کی تفصیل اور ماہر القادری کا قلم۔ بس یوں سمجھئے کہ خدا اور رسول ﷺ کی محبت کاغذ پر مصور ہوتی چلی گئی ہے۔　　قیمت: چار روپے ۔ ۴/-

---

نقشِ توحید "فاران" کا توحید نمبر اب کسی قیمت پر نہیں ملتا مگر اس کا معرکہ آرا "نقشِ اول" کتابی صورت میں چھپوایا گیا ہے۔ "نقشِ توحید" کا ایک ایک حرف عقائد کو درست کرتا اور شرک و بدعت کی جڑ کاٹتا ہے۔

قیمت مجلد: ایک روپیہ چھ آنے ۔ غیر مجلد: ایک روپیہ۔

نوٹ:۔ ان تینوں کتابوں کی جو قیمتیں درج کی گئی ہیں وہ محصول ڈاک کے علاوہ ہیں!

مکتبہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

ہماری نظر میں

محسنِ انسانیت

از نعیم صدیقی، جلد اول ۴۸۰ صفحات، قیمت ۹ روپے جلد دوم، ۴۰۰ صفحات قیمت سات روپے (مجلد دیدہ زیب گرد پوش کے ساتھ) ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ رحمانیہ، سرگودھا۔

حضور فخرِ موجودات، سرورِ کائنات، محسنِ انسانیت سیدنا محمد عربی نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرت طیبہ، ملک کے مشہور اسلام پسند ادیب و شاعر جناب نعیم صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں مرتب کی ہے جس پر دیباچہ مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اور تقریظ ماہر القادری مدیر "فاران" نے لکھی ہے دیباچہ مختصر ہے مگر سیرت اور قرآن کے باہمی ربط پر چند صفحوں میں جس حقیقت کو مولانا مودودی نے پیش کیا ہے وہ اس قدر محکم، ایمان افروز اور دلکش ہے کہ بار بار پڑھیے اور ہر بار نیا لطف حاصل کیجئے۔!

اردو زبان میں سیرتِ طیبہ پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں علامہ شبلی نعمانی، مولینا سید سلیمان ندوی اور مولینا قاضی سلیمان منصور پوری کی تالیفات شہرت اور قبول عام حاصل کر چکی ہیں اور اردو میں جانے کتنی کتابیں اور تذکرے ان تالیفات کو سامنے رکھ کر ہی مرتب ہوئے ہیں، سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان بزرگوں نے عربی کے اصل ماخذ سے براہ راست استفادہ کیا ہے شبلی نعمانی اس قافلے کے سب سے پہلے حدی خواں اور نقیب ہیں ان کی شگفتہ نگاری کسی کو میسر نہیں آسکی یہاں تک کہ علامہ سید سلیمان ندوی تحقیق میں بڑھ جاتے ہیں مگر زبان و ادب میں اس شہسوار کے مقابلے میں پیادے نظر آتے ہیں۔

جناب نعیم صدیقی نے "سیرتِ طیبہ" جس انداز پر مرتب کی ہے اس کا اسلوب اردو کی تمام سیرت کی کتابوں سے جدا اور منفرد ہے انھوں نے ایک وقائع نگار کی طرح صرف واقعات کو جمع ہی نہیں کیا بلکہ ان کے پس منظر، داعیات، محرکات اور نتائج پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، موصوف نے اسلام کی ہمہ گیر جامعیت، انقلابی پروگرام اور دنیا میں ہلچل پیدا کر دینے والی مقدس تحریک کو سامنے رکھ کر "سیرت طیبہ" کو جس نہج پر ترتیب دیا ہے اسے پڑھ کر دل اعتراف کرتا ہے کہ اس کتاب (محسن انسانیت) کی واقعی ضرورت تھی۔!

"محسنِ انسانیت" پڑھ کر دل میں اقامتِ دین کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ کتاب اس حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ "سیرت طیبہ" تاریخی کتابوں کی طرح محض پڑھنے کے لئے نہیں ہے بلکہ برتنے کے لئے ہے، مکہ کی مظلومیت سے لیکر فتح مکہ تک بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دمِ واپسیں تک جبکہ اسلامی حکومت کو قائم ہوئے کئی سال ہو چکے تھے، آج بھی دعوتِ دین کی راہ میں انہی مراحل سے گزرنا ہوگا، اور ہر مرحلہ میں حضور کی سیرت ہی ہماری رہنمائی کرے گی۔!

جو حضرات صرف نماز روزے ہی پر ساری عمر قناعت کئے رہتے ہیں اور دعوتِ دین کے لئے ان کے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں چبھتا، اور اس اطمینان و آرام کی زندگی کو اللہ کی رحمت سمجھ کر کسی الجھن اور کشمکش میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے یہ کتاب اس زندگی کے خلاف ایک "زبردست احتجاج" ہے۔!

"محسن انسانیت" اپنی جگہ ایک ولولہ انگیز تحریک اور دعوتِ انقلاب ہے لکھنے والے کا خلوص اور اقامتِ دین کے لئے اس کے دل کی تڑپ ایک ایک سطر سے نمایاں ہے، سیاست، حکومت اور حکمت و تدبیر کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے دین کے غلبہ کے لئے ان امور کی ضرورت ناگزیر ہے اور دین اسی وقت غالب ہو سکتا ہے جب کہ اللہ تعالےٰ کے قانون اور حکم کی اطاعت کے لئے مسجدیں اور ایوانِ حکومت ایک سطح پر آجائیں۔ ایک اقتباس

> "لوگ جب یہ کہتے ہیں کہ دین کی اقامت اور اسلامی نظام کا برپا ہو جانا اصل مطلوب تھا اور یہ محض انعام خداوندی کے طور پر بیچ میں آنمودار ہوا تو وہ حضورؐ کے کارنامے اور آپ کی جد و جہد کی سخت ناقدری کرتے ہیں اور حضور کی قائدانہ بصیرت اور سیاسی عظمت پر غبار ڈال دیتے ہیں، ذرا غور کیجئے اس ہستی نے کتنی تگ و دو کر کے مدینہ کے

عناصر کو چند ماہ کے اندر اندر دستوری معاہدہ کے تحت جمع کیا، کس عرق ریزی سے اردگرد کے قبائل سے حلیفانہ تعلقات قائم کئے، کس مہارت سے مٹھی بھر مسلمانوں کے بل پر ایک مضبوط فوجی نظام اور طلایہ گردی کا سلسلہ قایم کیا، کس کاوش سے قریش کی تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی کرلی، کس جرأت کے ساتھ قریش کے خنجر براں کا مقابلہ کیا، کس زیرکی سے یہود اور منافقین کی سازشوں کی کاٹ کی، کس مہارت سے حدیبیہ کا معاہدہ باندھا، کس ہمت سے یہود کے مراکز فتنہ کی بیخ کنی کی، کس بیدار[1] مغزی کے ساتھ بے شمار شر پسند قبائل کی علاقائی شورشوں کی سرکوبی فرمائی اس سارے کام میں قائدانہ بصیرت، سیاسی مہارت اور مضبوط حکمت عملی کے جو حیرت ناک شواہد پھیلے ہوئے ہیں ان سے لوگ کس طرح صرف نظر کر لیتے ہیں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ خدا کا انعام تھا بالکل ٹھیک ہے لیکن اس معنی میں کہ ہر بھلائی خدا کا عطیہ و انعام ہوتی ہے تاہم انسانوں کو کوئی انعام جبھی ملتا ہے کہ وہ اس کے لئے ضروری محنت عقل و بصیرت کے ساتھ کر دکھائیں، اقامت دین کو خدا کا انعام ٹھہرا کر اگر کوئی شخص رسول خدا کی جد وجہد جانفشانی، حکمت و بصیرت اور سیاسی شعور کی نفی کرنا چاہتا ہے" تو وہ بڑا ظلم کرتا ہے"!

غزوۂ بدر کے سلسلہ میں قریش کے قافلۂ تجارت کی سیاسی نوعیت پر نعیم صدیقی کا یہ ایک جملہ فکر و نظر کے ایک دفتر کی برابر ہے۔

"یوں کہیئے کہ اسلامی تحریک کا گلا کاٹنے کے لئے یہ قافلہ سونے کا خنجر لیکے نکلا تھا"!

نعیم صدیقی کی تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے قلم میں کس قدر روانی شگفتگی دلکشی اور تازگی ہے :۔

پھر اسلامی تحریک نے زور استدلال سے یہ حقیقت بھی اجاگر کی کہ خدا کی طرف سے ہدایت کی احتیاج ہر ذرے کو ہے "وہی عناصر کی تقدیریں مقرر کرنے والا ہے وہی اجرام فلکی کے مدار اور ان کی رفتاریں طے کرتا ہے وہی اشیا کو مختلف خواص دیتا ہے وہی ہر قوت کو اس کے خاص فرائض میں لگاتا ہے اور وہی ہر مخلوق کی راہِ عمل متعین کرتا ہے، دوسرے موجودات کی طرح انسان بھی ہدایت کا اسی طرح محتاج ہے جیسے وہ روشنی ہوا اور پانی کا محتاج ہے خدا نے اپنی ہدایت سے مخلوق کو بہرہ مند کرنے کے لئے وحی کا نظام مقرر کیا ہے بیجان عناصر کے لئے طبعی جبریت، نباتات کے لئے قوت نمو، حیوانات کے لئے جبلت وحی کا ذریعہ ہے لیکن انسان چونکہ شعور سے بہرہ مند ہے اس لئے اس کے لئے وحی کی وہ تکمیلی صورت مقرر کی گئی ہے جس کے تحت شعور کو مخاطب کیا جاتا ہے۔"

اسلام کو بے شک تحریک بھی کہہ سکتے ہیں" لیکن اس کتاب میں یہ لفظ - تحریک - اس کثرت سے آیا ہے کہ دل کو کھٹکتا ہے، اور بعض مقامات پر "تحریک" کے بجائے صرف "دین" یا "اسلام" کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کہیں کہیں سیاست و حکومت اور حکمت و تدبیر کی اہمیت کی "لے" زیادہ تیز ہو گئی ہے اظہار بیان کی خوبی اسی میں ہے کہ عبادات و اخلاق اور حکومت و سیاست اور تدبیر و حکمت میں اس صحیح توازن اور تناسب کو قائم رکھا جائے جو اسلام کو مطلوب ہے -!

اس کتاب میں بعض مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سیاسی قائد و مدبر اور جنگی سپہ سالار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں مگر فاضل سیرت نگار نے اس کھٹک کے دور کرنے کے اسباب بھی مہیا کر دیئے ہیں، فرماتے ہیں :۔

"پھر ان جنگی کارروائیوں کے اندر خود اسلام کی دعوت کام کر رہی ہوتی تھی یہ لڑائیاں محض تلواروں اور تیروں کی لڑائیاں نہ تھیں، یہ عقیدوں اور نظریوں اور کرداروں کی لڑائیاں بھی تھیں ان لڑائیوں میں مسلم طاقت تکبیر کا نیا نعرہ لیکر آتی تھی وہ میدان جنگ میں ذوق رکوع و سجود اپنے ساتھ لائی تھی وہ دشمن کے خلاف اگر پورے

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ بیدار مغزی مہارت وغیرہ جیسی صفات بہت کچھ کھٹکتی ہیں۔

جوش و قوت سے حملہ آور ہوتی تھی تو دوسری طرف دشمن کے سامنے وہ اپنے خدا کے حضور عاجزی سے سر جھکی تھی..... پھر ان کا ایک درخشاں جنگی اخلاق تھا، دوسرے لوگ موسیقی کی تانوں پر حرکت کرتے تھے اور اسلامی تحریک کے جانباز نغمہ توحید کی تانوں سے تحریک لیتے تھے، دوسرے لوگ شراب پی کر شجاعت کا مظاہرہ کرتے اور اسلام کے سپاہی فقط احساس فرض کی مقدس صہبا سے سرشار ہوتے تھے ـــ"

"نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سر اب ایک کمانڈر کی ذمہ داریاں بھی آپڑی تھیں (صفحہ ۵۴ جلد دوم) ـــــــــــ "نبوت کیطے" ذمہ داریوں کا آپڑنا کھٹکتا ہے جنگ کی ذمہ داریاں بھی اللہ تعالیٰ ہی نے آپ سے متعلق کی تھیں ـــ "ادھر ابوسفیان نے ساحل کے کنارے پہونچنے کے بعد..... " (صفحہ ۵۹) یہ "ساحل کے کنارے" ـــ شب لیلۃ القدر کی رات والی بات ہوئی، ہمیں یاد پڑتا ہے کہ اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد تک کے قلم سے اس قسم کی لغزش ہوئی ہے ـــ "آپ کے ہم شبیہ مصعب بن عمیر کے شہید ہوجانے کی بنا پر" (صفحہ ۷۲- جلد دوم) "شبیہ یا ہم شباہت" لکھنا تھا۔ "ہم شبیہ" درست نہیں، اگرچہ عوام یوں ہی بولتے ہیں ـــ "انسانی فلاح کا مقدس مشن ان کے لئے جنون آمیز ولبر تھا" (صفحہ ۱۰۵) اس قدر مشاقی کے بعد یہ نا آموزوں کا سا انداز بیان کیوں؟

"ایسے لوگ جو ایک ہی فارمولا پلے باندھ کر ہر جگہ اس کو گھسیں" (صفحہ ۱۰۷) "فارمولے کا گھسنا" اس "طنز" کا اظہار دوسرے موزوں انداز میں ہوسکتا تھا ـــ "واضح رہے کہ مکہ کے قبضہ کرنے اور اسے زیر نظم لانے کے لیے چند روزہ مارشل لا نافذ رہا" (صفحہ ۱۳۷) "مارشل لا" کی مثال لانے سے اس مقدس واقعہ کی نوعیت کچھ اور ہی ہوجاتی ہے ـــ "نور اور حرارت کی روؤں کی زد پر آنیوالے" (صفحہ ۱۷۲) "رو" "ضو" "بو" "پرتو" وغیرہ الفاظ کی جمع نہیں آتی۔ "رعایا سے رحم و شفقت رکھنے والے" (صفحہ ۱۹۱) "رعایا پر رحم و شفقت کرنیوالے" یا "رعایا کیلئے رحم و شفقت سے لبریز دل رکھنے والے" اسی قسم کا کوئی جملہ لکھنا چاہیئے تھا ـــــ "محسن انسانیت" کی کاشت کردہ فصل کے جوبن پر آنے کا موسم تھا" (صفحہ ۲۹۱) یہ لفظ ـــ جوبن ـــ کئی بار اس کتاب میں آیا ہے "جوبن" کے استعمال کا بھی ایک محل ہے ـــ مگر شباب کے مقابلہ میں اس لفظ میں بازاری پن آجاتا ہے۔

"..... جیسے شام کو آسمان پر تارے ٹمٹماتے ہیں (صفحہ ۲۰۷) "ٹمٹمانے" سے روشنی کا ضعف اور دھیما پن ظاہر ہوتا ہے، یہاں "تارے جگمگاتے" ہیں لکھنا تھا کہ صحابہ کرام رضؓ کو تاروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

"آج اگر ہمارے سینوں میں تحریک اسلامی کے احیا کے ولولے کروٹ لے سکتے ہیں تو اسی محبوب شخصیت کی قربانیوں کے جذبہ انگیز اکساہٹ ہی سے لے سکتے ہیں۔ (صفحہ ۳۶۱) "قربانیوں کی جذبہ انگیز اکساہٹ" یہ انداز بیان آورد اور تکلف کے سوا اور کیا ہے ـــ "جھوٹے وقار میں بڑے بغیر" (صفحہ ۴۱۹) "وقار میں پڑنا" آخر کہاں کی زبان ہے ـــ؟

"گرم آب و ہوا کی لو کے تھپیڑے" (صفحہ ۱۳ جلد اول) "آب و ہوا کی لو" کیا ہوتی ہے ـــ؟ ـــ (سرمہ کی) "تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں ڈالتے" (صفحہ ۱۷۷) "سلائی لگاتے" لکھنا چاہیئے تھا ـــ ثرید یعنی گوشت کے شوربے میں روٹی ڈبوکر تناول فرمانا۔ (صفحہ ۱۸۴) "ثرید" کی یہ تعریف صحیح نہیں ہے، گوشت کے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو دیے جاتے ہیں یا شوربے میں پکائے جاتے ہیں اسکو ثرید کہتے ہیں "حبشیوں کا ناٹک اس انداز سے دکھایا" (صفحہ ۱۹۶) یہ لفظ (ناٹک) نہایت غیر محتاط انداز میں قلمبند ہوگیا ہے حضورؐ نے حضرت عائشہؓ کو حبشیوں کا "ناٹک" نہیں ورزش وغیرہ کے کرتب دکھائے تھے۔ "ان کو بالوں سے پکڑ پکڑ کر جھنجھوڑا" (صفحہ ۲۱۱) "ان کو بال پکڑ کر جھنجھوڑا" لکھنا چاہیئے تھا ـــ "ان کو رشوتیں چڑھائیں" (صفحہ ۲۳۳) "رشوتوں کے ساتھ چڑھانا نہیں بولتے، ان کو رشوتیں دیں یا پہونچائیں" صحیح روزمرہ ہے ـــ "خدا کا سندیس سنانے کے لئے

۱؎ ہاں خوشبو کی جمع آتی ہے۔

...مکہ" کے مختلف کوچوں میں گھومے پھرے (صفحہ ۲۵۰) "پیغام" کو چھوڑ کر آخر "سنسکرت" کا لفظ "سندیس" لانے کی یہاں کیا ضرورت تھی —
... اس سڑے ہوئے ذہن کے ساتھ" (صفحہ ۳۷۹) ذہن کو سڑا ہوا کہنا جدا ان کے لئے تکلیف دہ انداز بیان ہے — "انھوں نے اپنے آپ
... سنہرے کردار سے مالامال کیا" صفحہ ۴۴۶) یہ کیا انداز بیان ہے، ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے — "حضور نے بے ساختہ طور سے
رجز الاپا" (صفحہ ۳۰۳، جلد اول) "بے ساختہ" کے بعد "طور سے" زائد ہی لگتا ہے — پھر "رجز الاپا" اس پر مستزاد — تو بہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے "الاپنے" کی نسبت کسی عنوان درست نہیں، چاہے وہ وحدت کا راگ ہو یا "رجز" ہی کیوں نہ ہو۔

زبان و قلم ہی کی نہیں فکر و نظر کی بھول چوک کس ادیب اور مصنف سے نہیں ہوتی، اس قسم کی چند کوتاہیوں کا غبار جناب نعیم صدیقی کی اس
گراں قدر تالیف کے حسن و جمال کو بے آب و رنگ نہیں بنا سکتا، ان کی تحقیق اور دقیقہ رسی کا یہ عالم ہے کہ غزوۂ خندق کے سلسلہ میں حساب
لگا کر یہ تک بتا دیا ہے — کہ

"تقریباً تین لاکھ آٹھ ہزار مکعب گز مٹی کو کھودنا اور پلٹے منتقل کرنا کوئی کھیل نہ تھا۔"

جناب نعیم صدیقی نے اس کتاب کو مرتب فرما کر سیرت نگاروں کی بزم میں اپنے لئے ممتاز مقام مخصوص کر لیا ہے اس کتاب نے
اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے اپنی ذات کے لئے نجات و مغفرت کا سامان فراہم کر لیا ہے۔

جناب نعیم صدیقی کے ساتھ اس کتاب کے ناشر جناب چوہدری محمد یونس خان بھی علمی اور اسلامی دنیا کی طرف سے شکریہ
کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو خاصے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

ماہر القادری

رُکن : انجمن ادبی رسائل پاکستان

جلد :- ۱۲

شمارہ :- ۸

فاران
کراچی

ترتیب ماہ نومبر ۱۹۶۰ء

ایڈیٹر
ماہر القادری

سالانہ
چھ روپے

فی پرچہ
آٹھ آنے

مقام اشاعت :- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر : مسرور حسن

مطبوعہ مطبع سعیدی، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

گزشتہ اشاعت کے "نقشِ اوّل" میں "بزمِ طلوعِ اسلام" کا سرسری تعارف کرایا گیا تھا کہ اس ٹولی کے کیا عزائم ہیں، اور "قرآن کے نام پر" قرآن ہی کی تحریف و تلبیس کس کس عنوان سے کی جارہی ہے! ــــــــ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس مضمون کے اچھے اثرات ظاہر ہوئے، مسلمانوں کے ہر طبقہ میں اس مضمون کو پسند کیا گیا! زبانی بھی اور خطوں کے ذریعہ بھی حق پسندوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور دو اداروں نے اس مضمون کو کتابی صورت میں چھاپنے کے لئے ہمیں مُطلع فرمایا ہے اَلحمدُ للہِ علیٰ احسانہٖ۔

"فاران" میں شروع ہی سے ناظرین کے مدح آمیز خطوں کے چھاپنے کا چلن نہیں رہا ہے، نفس ہم بھی نہیں ہیں، دوسروں کی طرح نفس ہمارے ساتھ بھی لگا ہوا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ کو قابو میں رکھنے کی ہمیں توفیق عطا فرمادی ہے ــــــ ان تعریفی خطوط کے ساتھ ایک دھمکی کا خط بھی ہمیں وصول ہوا ہے، جس میں لکھا ہے کہ "تم نے ہمارے امامِ مسلک (پرویز) کے بارے میں جو کچھ کہا ہے تو تمھیں "کافر" بھی قرار دیا جاسکتا ہے! اور تم "توبہ نامہ" شائع کرو، ورنہ تمھیں جیل بھی بھجوایا جاسکتا ہے ـــــــ"!

اس خط سے مسٹر پرویز کے عقیدت مندوں کی ذہنیت، مزاج اور معتقدات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے "امامِ مسلک" پر تنقید و احتساب کو "کفر" سمجھتے ہیں، حالانکہ "نبی" کے سوا اور کسی انسان کا یہ منصب ہو ہی نہیں سکتا کہ اُس سے اختلاف کو کفر سمجھا جائے۔
مسٹر پرویز نے جس ملحدانہ ٹیکنک کے ساتھ سُنّتِ رسول اور اطاعتِ رسول کا انکار کر کے نہ صرف "ختمِ نبوت" بلکہ منصبِ نبوت کا انکار کیا ہے، اور نبی آخر (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کو (خاک بدہن گستاخ) صرف ایک "کتاب رساں" (Book Deliverer) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور نظام ربوبیت اور مرکزِ ملت کی گمراہ کن اصطلاحیں تراشی ہیں، اُن کا نتیجہ یہی نکلنا چاہیئے تھا کہ جو دماغ اس قسم کی تحریروں سے متاثر ہوں، وہ اُس کے لکھنے والے کو "نبی" کا مماثل اور ہم مقابل سمجھنے لگیں اور اس سے اختلاف کو کفر جانیں۔

اَب رَہیں

خط لکھنے والے کی دھمکیاں ـــــ تو اُس کے بارے میں خواص و عوام ہمارے موقف کو سمجھ لیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا، نہ کسی کو رازق سمجھتے ہیں اور نہ نفع و ضرر کا مالک جانتے ہیں! اللہ تعالیٰ کو اگر منظور نہ ہو، اور کسی کے خلاف ساری دُنیا کی فوجیں بھی اکٹھی ہو جائیں، تو اُس شخص کا بال بیکا بھی نہیں ہو سکتا، اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو فولاد کے بنے ہوئے قلعے بھی کسی کو گزند سے نہیں بچا سکتے! ہم ابتلا اور امتحان میں پڑنے کی تمنا نہیں رکھتے بلکہ اس سے پناہ مانگتے ہیں کہ آدمی کا نفس بڑا ہی حیلہ جو اور کمزور واقع ہوا ہے مگر ساتھ ہی اس کا بھی عزم رکھتے ہیں کہ اگر حق گوئی کی پاداش میں کسی سخت منزل سے گزرنا ہی پڑ گیا تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم ثبات و استقامت

ہی کی راہ اختیار کریں گے! دوسروں کی طرح ہمیں بھی اپنا آرام و راحت اور جان و مال عزیز ہیں اور ہم پریشانی میں پڑنا نہیں چاہتے لیکن کلمۂ حق کے لئے اگر شدائد سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا، تو انشاء اللہ العزیز ہماری طرف سے کوئی معذرت پیش نہیں کی جائے گی (بعون رب القوی المتین)

جو اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے فضل سے ختمِ نبوت کے قائل ہیں، کتاب اللہ کے ساتھ سُنّتِ رسول اللہ کو دین میں حُجّت سمجھتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے منصوص ہونے پر یقین رکھتے ہیں اُن سے ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے ہمارا روئے سخن اُن لوگوں سے ہے جو سُنّتِ رسول کو دین میں حُجّت نہیں سمجھتے یا پھر اس یقینی مسئلہ میں مذبذب ہیں اور "منکرینِ حدیث" کی تحریروں نے جن کے ذہن وفکر کو اُلجھا دیا ہے ـــــ ان حضرات کی خدمت میں ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے ہمارے معروضات کا مطالعہ فرمائیں اور عدل و انصاف اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ ہمارے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

کتابُ اللہ اور عقل کی روشنی میں!

ہم اپنی گفتگو میں نہ کسی حدیث کا حوالہ دیں گے اور نہ کسی مفسّر، محدّث اور فقیہ کے قول کو درمیان میں لائیں گے، ہم خالص قرآن ہی سے شواہد و دلائل مہیّا کریں گے، اور قرآنی آیات کے ترجمہ میں کسی قسم کی اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کریں گے، اور نہ ترجمہ میں کوئی ایسا لفظ لائیں گے، جس سے ہمارے مسلک کو فائدہ پہونچتا ہوگا! اس کے بعد ہم پڑھنے والوں کی "عقل عمومی" سے اپیل کریں گے کہ خود قرآن شریف میں جگہ جگہ

"لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ـــــ اور ـــــ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ"

کا حکم دیا گیا ہے!

پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا فرائض سُپرد کئے گئے ہیں، ہم عرض کرتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں ان "نبوی فرائض" کی صراحت نہ بھی فرماتا تو بھی "عقلِ انسانی" اور "فراستِ ایمانی" منصب رسالت سے انھی فرائض کو وابستہ، پیوستہ متعلق اور تفویض کیا ہوا مانتی، اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اُس نے ان فرائض کی دو ٹوک انداز میں صراحت فرما دی اور ذرا سا بھی تشابہ اور ابہام نہ رہنے دیا، ارشاد ہوتا ہے ـــــ

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (الجمعہ ـــ ۲)

وہی ہے جس نے اُمّیوں میں خود انھی میں ایک رسول کو مبعوث کیا، جو اُن کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے!

اس آیت سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف (۱) بلاغِ کتاب اور تلاوتِ آیات ہی کا فریضہ متعلق نہ تھا بلکہ اس فریضہ کے ماسوا (۲) تزکیہ اور (۳) تعلیم و کتاب و حکمت کے فرائض اور ذمّہ داریاں (بھی آپ کو تفویض کی گئی تھیں، قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ذمہ داریاں اور مناصب و فرائض (تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیم و کتاب و حکمت) جس محکم انداز میں بیان کئے گئے ہیں اُن میں لفظ و بیان اور اسلوب وادا کا کوئی ایسا قرینہ نہیں پایا جاتا، کہ "تلاوتِ آیات" کا فریضہ تو دین میں حُجت ہے مگر تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت دین میں حُجت نہیں ہے، اس کی حیثیت بس ایک تاریخی تذکرے کی ہے، اگر دین میں حُجت ہیں تو رسالت کے یہ تینوں مناصب و فرائض دین میں حُجت ہیں، اور اگر حجت نہیں ہیں تو ان میں سے کوئی فریضہ بھی دین میں حُجت نہیں ہے، اگر کوئی معاذ اللہ یہی عقیدہ رکھتا ہے، تو اس عقیدہ کی براہ راست ضرب قرآن کریم پر آکر پڑتی ہے کہ دین میں قرآن کی "حُجیت" بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ـــــ (اب دیکھی) ـــــ

نبی کے فرائض و مناصب میں تفریق کرنے کی بات، تو جب اللہ تعالیٰ نے ان فرائض میں کسی قسم کی تفریق نہیں فرمائی، تو پھر کسی مسلمان سے اس جُرأت کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی، یہاں تک کہ ایک کافر بھی اپنے کفر و الحاد کے باوجود ایسی خلافِ واقعہ بات بہ صحتِ ہوش و حواس زبان سے نہیں نکال سکتا۔

ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہئے اور اسی عقیدہ پر ہم بھی اپنا خاتمہ چاہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کامل ترین کتاب ہے، یہ کتاب اپنی شرح و بیان کے لئے کسی دوسرے سہارے کی محتاج نہیں ہے اور یہ بھی درست ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ بھی کرتا ہے اور قرآن ہر انسان کو دعوتِ غور و فکر بھی دیتا ہے ——— مگر اس کو کیا کیجئے کہ جس نے اپنی کتاب کو نازل فرمایا، اُسی نے "مہبطِ کتاب" کی ضرورت محسوس کی، کتاب کے ساتھ "صاحبِ کتاب" کو بھی بھیجا، اور اس کتاب کی تلاوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی نے تزکیہ اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے فرائض بھی اُس اپنے بھیجے ہوئے رسول سے متعلق کر دیئے! اور ایسا کرنے سے نہ قرآنِ کریم کی شانِ کمال پر کوئی حرف آیا اور نہ اللہ تعالیٰ کے اس انتظام و اہتمام پر یہ طنز کی جا سکتی ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم سے تو قرآن کے محتاج ہونے کا پہلو نکلتا ہے۔ سامنے کی بات یہ ہے جو ایک موٹی عقل کے آدمی کی سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ جس طرح نبی کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت اور کمالِ قدرت و حکمت پر ذرہ برابر حرف نہیں آتا، اسی طرح تزکیہ اور کتاب و حکمت کی تعلیم (یعنی سُنّتِ رسولؐ) سے قرآنِ کریم کی شانِ کمال پر نقص و احتیاج کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس لئے مبعوث نہیں فرمایا کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اقامتِ حق کے لئے نبی کا محتاج ہے، اس نے یہ اہتمام اپنے بندوں کے احتیاج و ضرورت کے تحت فرمایا ہے، اسی طرح قرآنِ کریم اپنی ذات سے کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں ہے بلکہ قرآن کی تفہیم اور اُس کے احکام پر عمل پیرا ہونے کے لئے بندے "صاحبِ کتاب" یعنی نبی کی تعلیم و تبئین کے محتاج ہیں، اس احتیاج کی نسبت قرآن کریم سے نہیں بندوں سے کرنی چاہئے ——— اس تشریح و وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص "تزکیہ اور کتاب و حکمت کی تعلیم" (یعنی سُنّت) کو قرآن کے احتیاج ہی سے تعبیر کرتا رہے، تو ایسے عجیب و غریب عقل والے کو اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنا چاہئے کہ اُس نے ایسا اہتمام فرما کر "قرآن" کے ساتھ احتیاج کی علت کیوں لگا دی؟

ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے، اُس میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے دماغی اُپج یا نکتہ سنجی سے تعبیر کیا جا سکے، اللہ تعالیٰ کا اُس پر غضب نازل ہو، جو کوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی عقل لڑا کر، اپنی خواہشوں کے مطابق نئے نئے نکتے پیدا کرے اور اس طرح آیاتِ اللہ کو اپنے زورِ قلم سے افسانہ بنا دے، ہم نے تو قرآن کی آیت (جس سے رسالت کے فرائض کا تعین ہوتا ہے) کی شرح و وضاحت میں قلم کو حرکت دی ہے، اور قرآن کے کسی لفظ سے کوئی نکتہ پیدا نہیں کیا۔

ہم کسی تفسیر یا کسی محدّث و فقیہ کا حوالہ دیئے بغیر خالص علمی اور عقلی طور پر اربابِ دانش سے دریافت کرتے ہیں کہ "تعلیم" کا لفظ سُنتے ہی کیا مفہوم ذہن میں آتا ہے ——— یہ کہ تعلیم سے مُراد ہے، کسی کتاب کے "متن" کو صرف دُہراتے رہنا اور مُعلّم کا اصل عبارت کے کسی لفظ کی کوئی شرح نہ کرنا اگر "تعلیم" سے یہی مُراد لی جائے تو یہ "تعلیم" کہاں ہوئی اسے تو تلاوت کہتے ہیں، "تعلیم" چاہے، وہ قدیم ہو یا جدید اُس کا ہر دور میں یہی مفہوم سمجھا گیا ہے بلکہ اُس پر عمل کیا گیا ہے کہ مُعلّم کتاب کے متن کی تلاوت کرتے ہوئے، جہاں ضرورت سمجھتا ہے یا شاگردوں کی طرف سے کوئی اشکال پیش ہوتا ہے، تو اُس کی شرح بھی کرتا جاتا ہے، لفظ "تعلیم" میں سکھانے، بتانے اور عمل کر کے دکھانے کا مفہوم اس طرح سمویا ہوا ہے، جیسے جسم میں جان، پھول میں خوشبو، موتی میں آب اور چاندنی میں اُجالا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اور اُس کے سونپے ہوئے فریضہ کی ادائیگی کے لئے صحابہ کرام کی جو

تربیت فرمائی، اُن کی زندگیوں کو سنوارا اور اُن کا تزکیہ کیا اور کتاب وحکمت کی جو تعلیم دی، اُسی کو "سُنت" کہا جاتا ہے اور وہ احادیث کے مجموعوں میں محفوظ ہے! اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے یہ اہتمام اور انتظام فرمایا کہ قرآن کریم کی حفاظت کا خود ذمّہ لیا، اور جن نفوس قدسیہ کے ذریعہ قرآن کی حفاظت کا کام لیا گیا، انھی نے "کتاب وحکمت کی تعلیم" ——— یعنی سُنت رسولؐ ——— کو سینوں میں اور سفینوں میں محفوظ رکھا!

اسکولوں اور کالجوں میں اساتذہ نصاب کی کتابوں پر جو (notes) لکھواتے ہیں، اُن کو شاگرد امتحان کے وقت تک کس قدر حفاظت کے ساتھ رکھتے ہیں اور اُن کا کس قدر وزن محسوس کرتے ہیں، یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی کتاب وحکمت کی تعلیم (سُنت) کو صحابہ بھلا دیتے اور اُس کے ضبط وحفاظت کا کوئی اہتمام نہ فرماتے، جبکہ اُن کو اس کا اچھی طرح علم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے منصب اور سونپی ہوئی ذمہ داری کے مطابق اس فریضہ کو انجام دے رہے ہیں۔

ایمانی عقیدت ہی نہیں، انسانی عقل عمومی بھی اس کو باور نہیں کر سکتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب وحکمت کی جو تعلیم دی تھی اور صحابہ کرام کی تربیت فرما کر، جس نہج پر اُن کی زندگیوں کو سنوارا تھا، اُس کی تفصیل کو حضور کی رحلت کے بعد یکسر فراموش کر دیا گیا، اور جن کو وہ تفصیل یاد بھی رہ گئی، اُس کی حیثیت بس تاریخی واقعات سے زیادہ نہ تھی، اور (معاذاللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی کتاب وحکمت کی تعلیم بیس بائیس سال سے زیادہ نہ چل سکی ——— اس فکر وعقیدہ کے تصور سے ایمان کانپ کانپ جاتا ہے۔

کتنی کھلی ہوئی حقیقت اور سامنے کی بات ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے "قرآن" نازل فرما کر، "تنزیل کتب" کا سلسلہ ہمیشہ کیلئے بند اور ختم فرما دیا کہ قیامت تک کے لئے یہی کتاب ضابطۂ حیات اور صحیفۂ اخلاق کا کام دے گی، اسی طرح "کتاب وحکمت" کی تعلیم (یعنی سنتِ رسول) بھی اصل کتاب کے ساتھ ساتھ قیامت تک کے لئے حُجت اور سند بن کر باقی و پائندہ رہے گی، اور اُسے عقلاً رہنا بھی چاہیئے کیونکہ نہ اب کوئی دوسری کتاب نازل ہوگی اور نہ خدا کی آخری کتاب کی تعلیم دینے کے لئے کوئی نبی مبعوث ہوگا، اور سب سے زیادہ وزنی اور محکم بات یہ ہے کہ جس زبان سے قرآن کی آیات کی تلاوت ہوتی تھی، اُسی زبان سے قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی، اسی لئے قرآن کے ساتھ اُس کی تعلیم (سنتِ رسولؐ) بھی دین میں حُجت ہے، اور اُس کو بھی دین میں حُجت کی حیثیت سے قرآن کریم کے دوش بدوش باقی رہنا چاہیئے جو کوئی بھی قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام تسلیم کرتا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اعتماد کی بنا پر تسلیم کرتا ہے، کیا حضور کی ذات پر یہ اعتماد "تلاوتِ آیات" کی حد تک تو باقی رہنا چاہیئے، مگر کتاب وحکمت کی تعلیم کے معاملہ میں ختم ہو جانا چاہیئے! کسی حق پسند انسان سے اس ناانصافی، ہٹ دھرمی اور غلط اندیشی کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی!

——— اور کیا ———

عقل اس کو تفریق کو تسلیم کر سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تلاوتِ آیات فرماتے ہوتے تھے، تو اُس وقت وہ نبی کی حیثیت سے اس فریضہ کو انجام دیتے تھے مگر جب آیاتِ قرآنی کی تعلیم دیتے اور اُس کی شرح فرماتے تھے، تو اُس وقت حضور کی ذات سے منصبِ نبوت جدا ہو جاتا تھا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلے پہل اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی، رسول اور مہبطِ وحی ہونے کا اعلان فرمایا، تو کیا آپ نے صرف قرآن کی آیات ہی تلاوت فرمائی تھیں، اُس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا تھا، اگر آپ قرآنِ کریم کی وہ آیات جو ابتدا میں نازل ہوئی تھیں، تنہا انھی کو تلاوت کر کے رہ جاتے، تو کیا آپ کے مخاطب نبوت کے منصب کو وحی کی حیثیت کو اور ایمان واسلام کو پوری

طرح سمجھ سکتے تھے، کیا آپ نے قریش کو بعثت کے آغاز میں ایک جامع تقریر کے ساتھ خطاب نہیں فرمایا تھا، یہ واقعہ اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ نزولِ قرآن کے آغاز ہی سے "حدیثِ رسولؐ" قرآن کے تعارف اور شرح و بیان کے کام آئی ہے؟ اور جس طرح قرآنِ کریم کے مخاطبینِ اوّلین قرآنِ کریم کی شرح و بیان اور عملی تفصیل کے لئے "تعلیماتِ رسولؐ" کے محتاج تھے، اسی طرح قیامت تک ہر دَور میں قرآن پر ایمان لانے والے، قرآن فہمی اور قرآنی احکام پر عمل کرنے کے لئے "تعلیماتِ رسولؐ" (یعنی احادیث) کے محتاج رہیں گے۔ جو کوئی تعلیماتِ رسولؐ سے بے نیاز رہ کر اور غیر متعلق بن کر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریگا، اُس کی فکر اور عقل غلطی کرنے اور ٹھوکر کھانے سے بچ نہیں سکتی، بلکہ تعلیماتِ رسولؐ سے اس بیگانگی اور عناد کا لازمی یہ نتیجہ نکلے گا کہ خود قرآن سے ہدایت کے بجائے، اس مزاج و ذہنیت کے آدمی کو گمراہی ملے گی!

روایت

کسی آدمی کی کہی ہوئی بات کو یاد رکھنا، دوسروں کے سامنے دُہرانا یا اُسے لکھ لینا، یہ ایک فطری صورتِ حال ہے، جو ہمیشہ پیش آتی رہی ہے، اور انسان کی عقل اور اُس کا وجدان "روایت" کے نام سے ذرّہ برابر توحش اور اجنبیت محسوس نہیں کرتا، عدالتوں میں مجسٹریٹوں اور ججوں کے سامنے جو شہادتیں پیش ہوتی ہیں، وہ بیان اور قلمبند ہو جانے کے بعد "روایت" ہی تو بن جاتی ہیں، اور انھی روایتوں کی بنیاد پر عدالت کے حکام اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔

اس حقیقت کا بھی ہر کوئی مشاہدہ اور تجربہ کرتا رہتا ہے کہ جو شخصیت جتنی زیادہ اہم اور عظیم ہوتی ہے، اُسی قدر اُس کے قول و عمل کو سُننے اور دیکھنے والے زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھتے ہیں، اُس کے محفلوں میں چرچے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اُس کی روایت کرتا ہے ـــــــ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ثابت ہے کہ جب کوئی واقعہ ظہور میں آتا ہے، تو عام طور پر وہ اُسی وقت قلمبند نہیں کیا جاتا، بلکہ ذہنوں میں روایتوں کے ذریعہ محفوظ اور تازہ رہتا ہے اور بعد میں جاکر پھر اُسے تحریر میں لے آتے ہیں، اور بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں، جو سفینوں کی بجائے سینوں ہی میں محفوظ رہتے ہیں، اور زبانی روایت "در روایت" کا سلسلہ اُنہیں فراموش نہیں ہونے دیتا۔

اہلِ عرب میں لکھنے کا رواج بہت ہی کم تھا، اُن کو اپنے حافظہ پر اعتماد تھا، جاہلیت کی شاعری کا بہت کچھ سرمایہ اُن کے سینوں ہی میں محفوظ تھا، اور خاندانوں اور قبیلوں کے لمبے چوڑے نسب نامے بھی اُنہیں زبانی ہی یاد تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھی لوگوں میں پیدا ہوئے، جو دُنیا کی قوموں میں سب سے زیادہ حافظہ کے قوی تھے اور جن میں لکھنے کی بجائے زبانی روایتوں کا رواج تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو زبانی یاد رکھنا ایک طبعی، قدرتی اور فطری بات تھی، جس قوم نے اپنے شاعروں کے قصیدوں کو زبانی یاد رکھا تھا، وہ اُس مقدّس انسان کے ارشادات کو کیسے بھول سکتی تھی یا اُس کے ساتھ بے اعتنائی برت سکتی تھی، جس کی اطاعت اُن کے نزدیک ایمان کی لازمی شرط تھی، اور جس کے نطق و کلام کے بارے میں اُن کا یہ عقیدہ اور ایمان تھا کہ ـــــــ

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ"

صحت مند عقل اس معاملہ میں اس کے سوا اور کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی کہ صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور عملی احادیث کے ضبط و حفظ کا اپنی امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ، احادیثِ رسولؐ کو بھی سینوں سے لگائے رہے! ـــــــ پھر اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے تدوینِ حدیث کا باقاعدہ کام شروع کیا اور "فنِ حدیث" کو منتہائے کمال تک پہونچا دیا ـــــــ کوئی شک نہیں اہلِ نفاق، غلط اندیش اور سادہ لوح افراد اقوالِ رسولؐ

کو ملتبس اور مشتبہ بنانے کی کوشش بھی کرتے رہے مگر ناقدینِ حدیث پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، اُنھوں نے چوریاں پکڑ کر بتادیا کہ یہ وضع وجعل ہے، یہ ضعف و نکارت ہے، یہاں اضطراب پایا جاتا ہے، اس میں فلاں کوتاہی رہ گئی ہے، موضوع حدیثوں پر کتابیں لکھی گئیں تاکہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا جاسکے، اور پھولوں کے چُننے والے، کانٹوں سے باخبر رہیں!

قرآنِ کریم کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی، اور سُنّتِ رسولؐ کی حفاظت اُن نفوسِ قدسیہ سے متعلق کردی، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بسر کی تھی! قرآن کے بعد بلکہ یوں کہئے قرآن کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ قیمتی اور حفاظت کے قابل چیز "کتاب وسنت" کی تعلیم تھی، جو رسول اللہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے دی تھی، اس کو ضائع اور فراموش ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا!

دُنیا میں کسی بھی انسان کے قول وعمل کو اس قدر سعئ بلیغ اور کمالِ اہتمام کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا گیا، جس طرح خدا کے آخری نبی (ارواحنا لہ الفدا) کے قول وعمل کو محفوظ رکھا گیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف قرآنِ کریم کو محفوظ ومصئون رہنے کا امتیاز حاصل ہے کہ یہ آخری کتاب ہے، اب اس کے بعد نہ کوئی صحیفہ نازل نہ ہوگا اور نہ کوئی کتاب آئے گی، کہ "الکتاب" (THE BOOK) کے بعد "تنزیلِ کتب" کا باب ہی بند کردیا گیا، اسی طرح "الرسول" (THE PROPHET) کے بعد اب کوئی رسول بھی نہیں آئے گا، اس لئے دنیا کے سامنے اس "آخری نمونہ" (اسوۂ حسنہ) کو پیش کرنے کے لئے اُس کی سیرت واخلاق اور قول وعمل کی حفاظت بھی ضروری تھی!

روایت کے سلسلہ میں ایک نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ کسی واقعہ کے عینی شاہد اُس واقعہ کو اس طرح بیان کریں کہ ایک لفظ کا بھی فرق واقع نہ ہو، تو وہ گواہ سکھائے پڑھائے ہوئے سمجھے جائیں گے، روایت وشہادت اور بیان وترجمانی کی یہی فطری صُورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی پیش آئی ہے کہ صحیح احادیث تک میں راوی ایک ہی واقعہ کو بیان کرتے ہیں مگر واقعہ کے بیان کرنے میں لفظوں کی کمی بیشی واقع ہوجاتی ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ واقعہ کا ایک جزایک راوی سے چھوٹ جاتا ہے، مگر دوسرا راوی اور شاہد اُسے بیان کردیتا ہے، اور راویوں کے اس لفظی اختلاف کے باوجود واقعہ کی "قدرِ مُشترک" محفوظ رہتی ہے، اور وہی قدرِ مُشترک واقعہ کی جان ہوتی ہے، اور اُسی کو بیان کرنا راویوں کا مقصود ہوتا ہے۔

تو احادیثِ رسُول ۲ میں

راویوں کا لفظی اختلاف، اُس فطری اختلاف کی دلیل ہے، جسے واقع ہونا چاہیئے تھا، روایات میں الفاظ کی یہ کمی بیشی احادیث کے کمزور نہیں پختہ ہونے کی دلیل ہے اور اس کی بھی کہ محدّثین نے احادیث کے ضبط وتدوین میں انتہائی دیانت سے کام لیا ہے اور اُنھوں نے کسی روایت کے کمزور اور مشتبہ ہوجانے کے ڈر سے اُسی روایت کے بارے میں لفظی اختلاف کو چھپایا نہیں ہے بلکہ جو الفاظ اُن تک پہونچے ہیں، اُن کو نقل کردیا ہے۔

روایت کے سلسلہ میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے، اُس کو جانچنے اور پرکھنے کی ہم "عقلِ عمومی (Common Sense) کو دعوت دیتے ہیں، ہم دین کے کسی معاملہ میں عقل کا سامنا کرتے ہوئے ذرّہ برابر بھی نہیں جھجکتے کہ دین عقل اور فطرت کے عین مطابق ہے؟

حرفِ آخر

ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے، اُس کا حوالہ یا تو قرآن سے دیا ہے، یا انسان کی عقلِ عمومی سے خطاب کیا ہے، اور "روایتِ حدیث" کے سلسلہ میں اُن باتوں کا ذکر کیا ہے، جن کو فہم ودانش قبول کرسکتی ہے یا جو باتیں عقل سے مطابقت کرتی ہیں!

قرآنِ کریم کی جس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ اور (۳) کتاب وحکمت کی تعلیم کے فرائض مقرر کئے گئے ہیں، اُس آیت پر ہم خاصی تفصیل سے گفتگو کرچکے ہیں! "کتاب وحکمت کی اس تعلیم" کو قرآن "شرح وبیان" کے عنوان سے بھی پیش کرتا ہے۔

"وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ" (آیت ۴۴)

اور (اے نبیؐ) یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے تم پر اس لئے نازل کیاہے، کہ تم لوگوں پر اُس تعلیم کو واضح کردو، جو اُن کے لئے اُتاری گئی ہے۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتاہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کے معلم بھی تھے اور شارح بھی تھے —— پھر فرمایا جاتاہے ——

"اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ۔"

(اے نبی) ہم نے تم پر (یا تمھاری طرف) حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو۔

اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منصب کھُل کر سامنے آتاہے کہ حضورؐ کی حیثیت "حاکم عدالت" (قاضی) کی بھی ہے، اور آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مقدمات کے فیصلے بھی کئے ہیں —— وہ فیصلے کہاں ہیں؟ اُس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ نزاعات اور مقدمات کے وہ نبوی فیصلے احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور انکی حیثیت "تاریخی واقعہ" کی نہیں بلکہ قانونی نظیر اور دینی حُجت کی ہے!

قرآنِ کریم ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیاہے، اور اس اطاعت کو منصوص قرار دیا گیاہے ——

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ

جو رسولؐ کی اطاعت کرے، اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اور —— یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ۔

اے لوگو! جو ایمان لاچکے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، اور اپنے اعمال کو باطل (ضائع) نہ کرو۔

پھر مجموعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو، اللہ تعالیٰ نے نمونۂ تقلید قرار دیا ——

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُو اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ

تمہارے لئے رسول اللہ (کی زندگی میں) نمونۂ تقلید ہے، ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ اور یومِ آخر کا اُمیدوار ہو۔

قرآنِ کریم کی کھُلی ہوئی آیتیں موجود ہیں جن میں کوئی تشابہ ذومعنویت، ابہام، کنایہ، نکتہ، تلمیح اور اشاریت و رمزیت نہیں، اللہ تعالیٰ نے دوٹوک لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مناصب و فرائض کی صراحت فرمائی ہو —— کہ یہ آخری نبی (۱) آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے ہیں (۲) زندگیوں کا تزکیہ فرماتے ہیں (۳) کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں (۴) کتاب اللہ کی شرح وتبیین کرتے ہیں (۵) نزاعات ومقدمات کا فیصلہ فرماتے ہیں (۶) اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکو تشریعی اختیارات بھی دیئے گئے ہیں (یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ) (۷) اس نبی کی اطاعت اللہ کی اطاعت کی طرح منصوص ہو اور (۸) رسولؐ کی زندگی تمھارے لئے نمونۂ تقلید ہے —— یہاں تک کہ (۹) اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے کا دعویٰ اُسوقت تک صحیح ثابت نہیں ہوسکتا، جبتک رسول اللہ کی پیروی نہ کرلی جائے، اور اللہ تعالیٰ بھی اُنھی لوگوں سے محبت کرتاہے اور اُسکی رضا اُنھی لوگوں کو حاصل ہوسکتی ہے جو رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (اے نبی) کہو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کریگا —— ! —— ایک شخص اُٹھتاہے جو اللہ تعالیٰ کی ان محکم اور واضح آیات کے ہوتے ہوئے، رسول اللہ کی "اطاعت" صرف حضور کی زندگی تک مشروط تھی پھر وہ "کتاب وحکمت کی تعلیم" کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے دی تھی، ایک تاریخی نوشتہ کی حیثیت دیتاہے، اور "اطاعتِ رسولؐ" کے منصب کے توڑ پر "مرکزِ ملت" کا عہدہ تراشتاہے، پھر وہ تمام دینی احکام وفرائض کو "معاشیات" کے محور پر گھماکر خشیتِ الٰہی، عبادتِ الٰہی اور اخلاق و نیکوکاری کی تمام قدروں کو اُلٹ ڈالتاہے، پھر وہ "اللہ" "صلوٰۃ" "آخرت" "تقویٰ" "صالحت" ...... ان تمام قرآنی ناموں اور اصطلاحوں کی تحریف کرتاہے، اور اس قدر کفر بکنے کے بعد، اُسکے زعم باطل اور بر خود غلط ہونے کی انتہا یہ ہو کہ نہ تمام اُمّتِ مسلمہ کے اسلام کو "غیر قرآنی اسلام" اور نزولِ قرآن سے قبل کا "مذہب" قرار دیتاہے!

"قرآن کے نام پر" قرآن کی اس قدر کھُلی ہوئی مخالفت —— توبہ! اللہ تعالیٰ کا نام لیکر اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ یہ ملحدانہ سلوک —— استغفر اللہ! وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے عالمین کے لئے رحمت بناکر بھیجاہے، وہ جن کی بعثت

کا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان جتایا ہے، اُن کی ذاتِ گرامی سے اس قدر کد، عناد اور بغض و عداوت کہ حضورؐ کی اطاعت کا انکار کرکے، منصبِ نبوت ہی کو ختم کر ڈالا؟ اس جہالت اور ضلالت کے ہوتے ہوئے قرآن فہمی کا کیا غرّہ ہے اور تنویرِ فکر کے کیا دعوے ہیں!

اللہ تعالیٰ اس فتنہ کی پرچھائیں سے بھی ہر صاحبِ ایمان کو بچائے رکھے، اور اربابِ فکر و دانش کی اس کی توفیق عطاء فرمائے کہ وہ اس فتنہ کے روکنے کے لئے زبان و قلم سے کام لیں اور عوام مسلمانوں کے دلوں میں اس حقیقت کو اُتار دیں ——— کہ

"یہ تو طلوعِ اسلام کے نام پر "غروبِ اسلام" کی کوششیں کی جارہی ہیں؟

آہ!

کسے خبر تھی لیکر چراغِ مصطفویؐ
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

ماہر القادری

۲۷ ستمبر سنہ ۶۰ء

مولانا ظفر احمد عثمانی

مُقتدی اور سُورۂ فاتحہ کی قراءت

حنفی مذہب کا موقف کتاب و سُنّت کی روشنی میں

(میرے پاس ایک دوست نے ایک رسالہ تکمیل البرہان فی قراءۃ ام القرآن ڈاک سے بھیجا جس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مصنف رسالہ نے امام کے پیچھے مقتدیوں پر سورۂ فاتحہ پڑھنے کو فرض لازم قرار دیا ہے اور اپنے نزدیک اس کو اجماعی مسئلہ فرض کیا ہے چونکہ اس سے مذہب حنفی کی تضعیف اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تخفیف مترشح ہوتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کے دلائل بیان کر دیئے جائیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کسی مسئلہ میں[1] بے دلیل کوئی بات نہیں کہتے بلکہ کتاب و سُنّت کی دلیل سے کہتے ہیں۔ دلائل حنفیہ بیان کرنے کے بعد اُن الزامات کا جواب بھی انشاء اللہ دیا جائے گا جو اس رسالہ میں حنفیہ پر وارد کئے گئے ہیں۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان حسبنا اللہ ونعم الوکیل)

دلیل اول، قال اللہ تعالیٰ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون ۰ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو دل لگا کر سنو اور خاموش رہو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ابوداؤد صاحب سنن نے امام احمد حنبل سے روایت کیا ہے کہ سب لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ سب لوگ اسی پر ہیں کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے سعید بن المسیب۔ حسن بصری۔ ابراہیم نخعی۔ محمد بن کعب اور زہری سب یہی فرماتے ہیں کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ زید بن اسلم اور ابوالعالیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ لوگ امام کے پیچھے قراءت کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا۔ پھر اس پر اجماع ہے کہ مقتدی پر امام کے پیچھے قراءت لازم نہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ جب امام جہر سے قراءت کرے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی نماز بغیر قراءت

---

[1] احقر نے حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا محمد اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ کے امر سے ایک ضخیم کتاب اعلاء السنن تالیف کی ہے جو بیس جلدوں میں تمام ہوئی ہے جس میں کتاب الطہارت سے لے کر کتاب المیراث تک تمام مسائل اختلافیہ میں حنفیہ کے دلائل جمع کئے گئے ہیں اور حاشیہ میں اُن دلائل کا جواب دیا گیا ہے جو دلائل حنفیہ کے معارض ہیں اس کتاب کے گیارہ حصے اور ایک مقدمہ طبع ہو گیا ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے مگر سات جلدوں کا ترجمہ بھی مختصر طور سے کر دیا گیا ہے تاکہ جن مسائل میں جماعت اہل حدیث کا زیادہ اختلاف ہے حنفی مسلمانوں کو ان مسائل میں حنفیہ کے دلائل معلوم ہو جائیں ضرورت ہے کوئی صاحب خیر اردو ترجمہ کو علیحدہ طبع کر دیں اور جو حصے ہنوز طبع نہیں ہوئے اُن کو بھی طبع کرنے کی ہمت کریں۔ حضرت حکیم الامۃ رح فرماتے تھے کہ اگر تالیف اعلاء السنن کے سوا اور کوئی کام بھی خانقاہ امدادیہ میں نہ ہوتا تو یہی اتنا بڑا کارنامہ ہے جس کی نظیر دوسری جگہ نہ ملے گی علامہ محمد زاہد کوثری رح محقق مصر نے بھی اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے۔ وذالک من فضل اللہ علینا ۱۲ ظ۔

کے صحیح نہ ہوگی - چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ وتابعین اور اہل حجاز میں امام مالک - اہل عراق میں سفیان ثوری اہل شام میں اوزاعی - اہل مصر میں لیث بن سعد - ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب امام قرارت کر رہا ہو اور مقتدی قرارت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے (ملاحظہ ہو مغنی ابن قدامہ ج ۱ ص ۶۰۶)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ جن احادیث سے مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے قرارت کو فرض بتایا جارہا ہے وہ امام احمد کے نزدیک صحیح نہیں اور جو صحیح ہیں وہ منفرد اور امام کے حق میں ہیں مقتدی کے بارے میں نہیں ہیں جیسا آئندہ واضح ہو جائے گا۔

۱- مفسر ابن جریر طبری نے مسیب بن رافع سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ہم نماز کے اندر ایک دوسرے کو سلام کیا کرتے تھے سلام علی فلان سلام علی فلان پھر قرآن میں یہ آیت نازل ہوئی - واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا - جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ اور خاموش رہو۔

۲- ابن جریر نے ابوعیاض سے روایت کیا ہے کہ ابوہریرہ رضؓ نے فرمایا لوگ نماز میں کلام کیا کرتے تھے تو جب یہ آیت نازل ہوئی - واذا قرئ القرآن اور دوسری آیت (قوموا للہ قانتین) تو خاموش رہنے کا حکم کیا گیا دونوں روایتوں کے راوی ثقہ ہیں

۳- یسیر بن جابر سے روایت ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی اور بعض لوگوں کو امام کے ساتھ قرارت کرتے ہوئے سُنا تو نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کیا تمہارے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ سمجھ لو کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ جان لو کہ جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگاؤ اور خاموش رہو جیسا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا - اس کو بھی امام طبری نے روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور سند صحیح ہے۔

۴- امام بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرارت کر رہے تھے تو آپ نے ایک انصاری نوجوان کی قرارت سُنی تو یہ آیت نازل ہوئی واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا - بیہقی نے اس کی سند پر کوئی جرح نہیں کی صرف اتنا کہا کہ یہ مُرسل ہے، اور یہ مُرسل ہمارے یہاں حجت ہے اور جب اُس کی تائید دوسرے مراسیل وغیرہ سے ہو جائے تو سب کے نزدیک حجت ہے۔

مفسر طبری نے اسی کے موافق زہری سے بھی مرسلاً روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ پڑھتے ایک انصاری نوجوان بھی ساتھ ساتھ پڑھتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

۵- حافظ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں معاویہ بن قرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے بعض صحابہ سے دریافت کیا عبدالرحمٰن مسروقی (راوی) کہتا ہے میرا گمان یہ ہے کہ وہ عبداللہ بن مغفل ہیں - اُن سے میں نے کہا کیا ہر شخص پر جو قرآن سنے اس کا سُننا اور خاموش رہنا واجب ہے؟ فرمایا کہ یہ آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا قرارت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جب امام قرارت کرے تو سنو اور خاموش رہو۔

اس کے تمام راوی ثقہ ہیں صرف ابوالمقدام ضعیف ہے مگر اس سے وکیع اور زید بن الحباب و نضر بن شمیل و یزید بن ہارون جیسے ائمہ حدیث روایت کرتے ہیں (تو وہ ایسا ضعیف نہیں جس کی روایت رد کر دی جائے خصوصاً جب کہ اس کی تائید میں بہت سے آثار موجود ہیں) امام بیہقی نے ابوالعالیہ سے مُرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب

ملہ ان تمام آثار و احادیث کی جو اس مضمون میں مذکور ہیں سندوں کی مفصل تحقیق اعلاء السنن میں مذکور ہے جس کو شوق ہو اس میں دیکھ لے ۱۲ ظ۔

نماز میں قرارت کرتے صحابہ بھی قرارت کرتے تھے تو آیت نازل ہوئی فاستمعوالہ وانصتوا (حضور کی قرارت کو سنو اور خاموش رہو) پھر لوگ خاموش رہتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأت کرتے (خیرء القراءۃ صہ ۷۳) بیہقی نے اس کے راویوں پر کوئی جرح نہیں کی صرف اتنا کہا کہ یہ منقطع (یعنی مرسل) ہے اور مرسل ہمارے یہاں حجت ہے۔

۶۔ امام بیہقی نے جزء القراءۃ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ مومن قرآن کی طرف کان لگانے سے وسعت میں ہے (چاہے سنے یا نہ سنے) مگر نماز فرض میں اور جمعہ وعید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن (یعنی ان نمازوں میں) جب قرآن پڑھا جائے تو قرآن کو سنو اور خاموش رہو صہ ۷۳۔

ف ابن عباس کا مذہب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے علاوہ قرارت کا سننا واجب نہیں اس میں فقہاء کا اختلاف ہے ایک قول حنفیہ کا بھی اس کے موافق ہے دوسرا قول یہ ہے کہ خارج صلوٰۃ میں بھی قرارت قرآن کے لئے خاموش رہنا اور سننا واجب ہے اس میں احتیاط ہے کیوں کہ آیت قرآن کا شان نزول اگرچہ قرارت خلف الامام ہے مگر الفاظ مطلق نہیں۔

۷۔ محمد بن کعب قرظی (امام تفسیر وحدیث) سے روایت ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ سورۂ اعراف کی آیت نازل ہوئی واذا قرئ القرآن فاستمعوالہ وانصتوا (جزء القراۃ صہ ۷۴) بیہقی نے اس کی سند میں کوئی علت بیان نہیں کی بلکہ سکوت کیا ہے۔

ف مفسر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے متعلق متعدد آثار بیان کرکے فرمایا ہے کہ سب اقوال میں صحت و صواب کے زیادہ قریب اُن لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ مقتدیوں کو نماز میں قرآن سننے کا حکم دیا گیا ہے جب امام قرات کرے اور لوگ اُس کے پیچھے اقتدا کر رہے ہوں اور خطبہ سننے کا امر کیا گیا ہے۔ ہم نے اس قول کو زیادہ صحیح اس لئے کہا ہے کہ حدیث صحیح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا اذا قرأ الامام فانصتوا جب امام قرارت کرے تو خاموش رہو۔ اور سب (علماء) کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص جمعہ کا خطبہ امام سے سنے اس پر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ اجماع کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث میں بھی بتواتر اس کا امر وارد ہے۔ اور ان دو حالتوں کے سوا اور کسی حالت میں قرآن کا سننا اور قرارت کے لئے خاموش رہنا واجب نہیں اگرچہ ایک صورت میں اختلاف ہے کہ جبکہ مقتدی امام کے پیچھے ہو (بعض علماء اس خاموش رہنے کو واجب نہیں کرتے بلکہ قرأت فاتحہ کو واجب کہتے ہیں) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح میں ثابت ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا جب امام قرارت کرے خاموش رہو۔ پس امام کے پیچھے اُس کی قرارت کے لئے خاموش رہنا اُن لوگوں پر واجب ہے جو اس کے مقتدی ہوں اور قرارت سُن رہے ہوں۔ بوجہ ظاہر قرآن کے عموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مذکور کے صہ ۱۱۳ ج ۹۔ اس تقریر سے یہ امر واضح ہے کہ امام ابن جریر طبری جن کو شافعی المذہب کہا جاتا ہے نماز جہری میں مقتدی کے ذمہ قرآن سننے اور خاموش رہنے کو واجب سمجھتے ہیں نماز سری میں قرارت مقتدی کو جائز سمجھتے ہیں اور زیادہ اختلاف نماز جہری میں ہے نماز سری میں زیادہ اختلاف نہیں جیسا آئندہ واضح ہو جائے گا اگرچہ حنفیہ کے پاس اس کے بھی دلائل موجود ہیں کہ سری نماز میں بھی مقتدی کو امام کے پیچھے قرارت نہ کرنا چاہئیے کیوں کہ قرآن میں دو حکم ہیں ایک استمعوا (کہ امام کی قرارت کو سنو) یہ تو جہری نماز کے ساتھ خاص ہے دوسرا حکم ہے انصتوا (کہ قرارت امام کے وقت خاموش رہو) یہ جہری اور سری دونوں نمازوں کو شامل ہے پس اگر مقتدی سری نماز میں حکم استماع پر عمل نہیں کر سکتا تو حکم انصات پر تو عمل کر سکتا ہے اس کو کس لئے ترک کرتا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث و آثار بھی آئندہ بیان کئے جائیں گے جن سے مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے مطلقاً خاموش رہنے کا وجوب ثابت ہے

خواہ جہری نماز ہو یا سری۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ جن صحابہ یا تابعین نے آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کے شان نزول میں خطبہ جمعہ کا ذکر کیا ہے اُن کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں خطبہ جمعہ کو بھی اس آیت کے تحت داخل کر لیا گیا ہے کیوں کہ جملہ مفسرین و قراء محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ اعراف مکی ہے اس میں کوئی آیت بھی مدنی نہیں اور مکہ میں جمعہ قائم نہیں ہوا تھا نہ وہاں جمعہ کا خطبہ ہوا تو اُس کو شان نزول میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے پس صحیح آیت یہی ہے کہ یہ آیت قرارت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور خطبہ کا حکم بھی نماز کی طرح ہے اس کے بعد امام بیہقی کا یہ فرمانا کہ اس آیت میں مقتدیوں کو امام کے پیچھے دنیوی باتیں کرنے یا جہر کے ساتھ قرارت کرنے سے منع کیا گیا ہے سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھنے سے منع نہیں کیا گیا دُرست نہیں ہے ورنہ ظاہر ہے کہ آیت کے الفاظ فاتحہ وغیرہ سب کو شامل ہیں کیوں کہ آیت میں انصات کا حکم ہے جس کے معنی بالکل خاموش رہنے کے ہیں جو فاتحہ سے بھی خاموش رہنے کو مقتضی ہے پھر ہم پوچھتے ہیں کیا امام بیہقی خطبہ کی حالت میں آہستہ آہستہ ذکر اللہ اور تسبیح وغیرہ پڑھنے کی اجازت دیدیں گے اگر نہیں تو یہاں اس آیت سے مطلقاً خاموشی واجب ہونے پر استدلال کیوں کر صحیح ہو گیا؟ اور اگر اجازت دیں گے تو یہ اُن کے مذہب کے بھی خلاف ہے اور اجماع کے بھی خلاف ہے خطبۂ جمعہ میں کسی کے نزدیک بھی خطبہ سننے والے کو ذکر اللہ اور تسبیح پڑھنا جائز نہیں نہ آہستہ نہ زور سے پس حیرت ہے کہ خطبہ میں تو مطلقاً ذکر و تلاوت وغیرہ کو منع کیا جائے سراً بھی اور جہراً بھی اور نماز میں قرارت سریہ کو جائز کہا جائے حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ آیت اعراف واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کا نزول قرارت خلف الامام کے بارے میں ہوا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خطبہ کے لئے احادیث میں انصات کی تاکید ہے تو ہم کہیں گے نماز کے اندر مقتدی کو انصات کی تاکید قرآن میں بھی ہے اور حدیثوں میں بھی جیسا آئندہ معلوم ہو جائے گا۔

۸۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا قرا۔ (ای الامام) فانصتوا۔ جب امام قرارت کرے تو خاموش رہو اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے فرمایا حدیث صحیح ہے امام احمد نے بھی اس کو صحیح کہا ہے جیسا حافظ ابن عبدالبر نے تمہید میں بیان کیا اور امام ابو جعفر طبری کا قول گذر چکا ہے وقد صح الخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قولہ اذا قرا۔ الامام فانصتوا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا جب امام قرارت کرے تو خاموش رہو اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے بھی اپنی مسند میں امام مسلم کی سند سے ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تعلیم دی ہے کہ جب تم نماز کو کھڑے ہو تو ایک آدمی امام بناؤ جب امام قرارت کرے تو خاموش رہو۔ صحیح ابو عوانہ میں اس حدیث کو عبداللہ بن رشید سے ابو عبیدہ (مجاعۃ بن زبیر عتکی) سے قتادہ سے یونس بن جبیر سے حطان بن عبداللہ رقاشی سے ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام قرارت کرے خاموش رہو اور جب غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو آمین کہو۔ اس میں سلیمان تیمی کی متابعت ابو عبیدہ نے کی ہے وہ بھی قتادہ سے سلیمان تیمی کی طرح اذا قرأ الامام فانصتوا روایت کر رہا ہے اور ابو عبیدہ ثقہ ہے انساب سمعانی میں عبداللہ بن رشید اور ابو عبیدہ دونوں کو مستقیم الحدیث کہا ہے۔ دار قطنی نے بھی اپنی سنن میں اس حدیث کو روایت کیا ہے اُن کی سند میں عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروبہ نے قتادہ سے سلیمان تیمی کی طرح واذا قرا۔ فانصتوا روایت کیا ہے۔ عمر بن عامر امام مسلم کے راویوں میں سے ہے اسی طرح اُس کا شاگرد سالم بن نوح بھی رجال مسلم میں سے ہے امام مسلم اور امام ابن خزیمہ اور ابن حبان اپنی صحیح میں اُس سے روایت کرتے ہیں پس بعض محدثین کا یہ کہنا کہ قتادہ کے شاگردوں میں سے صرف سلیمان تیمی نے اس حدیث میں اذا قرء الامام فانصتوا زیادہ

کیا ہے۔ غلط ہے قتادہ کے تین شاگردوں نے جو ثقہ ہیں سلیمان تیمی کی موافقت کی ہے۔ پھر امام مسلم سے جب اُن کے شاگردوں نے سوال کیا کہ اس حدیث میں اذا قرأ فانصتوا صحیح ہے؟ امام مسلم نے جواب دیا تریدا حفظ من سلیمان کیا تم سلیمان سے بڑھ کر حدیث کا حافظ چاہتے ہو؟ یعنی وہ کامل الحفظ تام الحفظ تام الضبط ہے اُس کا تفرد مضر نہیں (اگرچہ وہ منفرد بھی ہوتا حالاں کہ وہ اس زیادت میں منفرد نہیں اُس کے متابعت و موافقت کرنے والے دوسرے حفاظ ثقات بھی ہیں) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اُس کی اقتدا کی جائے سو جب وہ اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرارت کرے خاموش رہو اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو اللھم ربنا لک الحمد کہو۔ اس کو نسائی نے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس کو صحیح کہا ہے اور امام احمد بن حنبل اور ابن حزم نے بھی اس کو صحیح کہا ہے (جوہر نقی)

ف۔ پس امام ابوداؤد کا یہ فرمانا کہ اس حدیث میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت محفوظ نہیں۔ ہمارے نزدیک ابوخالد نے وہم کیا ہے۔ صحیح نہیں کیوں کہ ابوخالد الاحمر مسلم و بخاری کے رجال میں سے ہیں دونوں اس سے احتجاج کرتے ہیں۔ پھر ابوخالد الاحمر کی متابعت بھی موجود ہے محمد بن سعد انصاری نے بھی ابن عجلان سے اس حدیث کو ابوخالد احمر کی طرح اذا قرأ فانصتوا کی ساتھ روایت کیا ہے سنن نسائی میں یہ متابعت موجود ہے اور امام نسائی نے محمد بن سعد کی توثیق کی ہے۔ امام ابن جریر طبری نے بھی اس کو صحیح کہا ہے پس انصاف یہ ہے کہ اس حدیث میں بجز اُن لوگوں کے جو قرارت فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں کسی نے جرح نہیں کی۔ اور اصول حدیث کے لحاظ سے اُن کی جرح صحیح نہیں کیوں کہ اول تو اصولی طور پر زیادت ثقہ مقبول ہے دوسرے جس راوی کو زیادت میں منفرد کہا جا رہا ہے اُس کی متابعت دوسرے ثقات نے بھی کی ہے۔ اب سمجھنا چاہئیے حدیث سے معلوم ہوا کہ امام اس لئے بنایا جاتا ہے کہ اُس کی اتباع کی جائے اور قرآن پڑھنے والے کا اتباع یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ اُس کو سنا جائے یہی سورۂ اعراف کی آیت اذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کا مدلول ہے یہی دوسری آیت [1] واذ صرفنا الیک نفرا من الجن یستمعون القرآن فلما حضروہ قالوا انصتوا (سورۃ الجن) یہی تیسری آیت [2] لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قراناہ فاتبع قرآنہ (قال ابن عباس فی تفسیر فاستمع لہ وانصت کما فی البخاری) کا مدلول ہے۔ اسی مفہوم کو ابوموسیٰ اشعری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی حدیثوں میں واضح کہا گیا ہے جب امام قرارت کرے تو خاموش رہو اور جو حدیث نص قرآن کے موافق نہ ہوں ایسی احادیث میں تاویل لازم ہے اگر سند صحیح ہو ورنہ رد کر دیا جائے گا اگر سند ضعیف ہو۔

چنانچہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جتنا حصہ صحیح ہے یعنی لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب "اُس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے"۔ اس میں مقتدی یا امام کا کوئی ذکر نہیں اور اس کو سفیان بن عیینہ اور زہری

---

[1] (ترجمہ) اور جب ہم نے آپ کے پاس جنوں کی ایک جماعت کو متوجہ کیا کہ قرآن سنیں قرآن (سننے) کے لئے حاضر ہوئے تو آپس میں کہنے لگے خاموش رہو۔

[2] (نزول وحی کے وقت) اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے تاکہ جلدی یاد کرلیں ہمارے ذمہ ہے اس کا (آپ کے دل میں) جما دینا اور اس کا پڑھا دینا تو جب ہم (بزبان جبریل) قرآن پڑھیں تو اُس کے پڑھنے کا اتباع کیجئے عبداللہ ابن عباس نے اتباع کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ سنیئے اور خاموش رہیئے (بخاری) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کا اور قرآن پڑھنے والے کا اتباع یہی ہے کہ اُس کی طرف کان لگائے اور خاموش رہے۔

راوی حدیث اور امام احمد بن حنبل وغیرہ نے امام اور منفرد پر محمول کیا ہے ۔ کیوں کہ امام مالک نے مؤطا میں اور ترمذی نے جامع میں حضرت جابر بن عبداللہ صحابی سے موقوفاً اور امام طحاوی نے مرفوعاً روایت کیا ہے من صلی رکعۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام جس نے کوئی نماز بغیر سورۂ فاتحہ کے پڑھی اُس نے نماز نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے ہو تو نماز ہو جائے گی) پہلی روایت کی سند صحیح ہے اور دوسری کی حسن ہے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ دیکھو جابر بن عبداللہ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ۔ "جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اُس کی نماز نہیں" کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ حکم اُس کے لئے ہے جو تنہا نماز پڑھتا ہو ۔ (ترمذی) مقتدی کے واسطے یہ حکم نہیں ہے اور حدیث عبادہ کے جس حصہ سے امام کے پیچھے قرارت ثابت کی جاتی ہے ۔ اُس کی صحت میں محدثین کو کلام ہے جیسا آئندہ واضح ہوگا تو اُس کو رد کیا جائے گا کیوں کہ وہ نص قرآن اور حدیث صحیح کے خلاف ہے ۔

۱۰۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھی تو ایک شخص آپ کے پیچھے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھنے لگا جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا تم میں سے کس نے قرأت کی یا فرمایا تم میں قرأت کرنے والا کون تھا؟ ایک شخص نے کہا میں نے (قرأت کی ہے) فرمایا میں خیال کر رہا تھا کہ کوئی مجھ سے قرارت میں منازعت کر رہا ہے امام مسلم نے اس کو روایت کیا ہے ۔ ف ۔ اس سے واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک یہی معلوم تھا کہ صحابہ آپ کے پیچھے قرارت نہیں کرتے کیوں کہ سورۂ اعراف میں قرأت خلف الامام سے منع کر دیا تھا جب کسی نے قرارت کی تو آپ نے دریافت کیا یہ قرارت کرنے والا کون تھا؟ اگر قرأت خلف الامام جائز ہوتی تو اس سوال کی کوئی وجہ نہ تھی رہا یہ کہ اس شخص نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھی تھی سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تھی اس لئے تنبیہ کی گئی تو جواب یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہ سمجھتے تھے ورنہ یہ صحابی سورۂ فاتحہ کی جگہ دوسری سورت کیوں پڑھتا؟ اُن کے نزدیک فاتحہ اور غیر فاتحہ سب برابر تھیں اگر فاتحہ کا پڑھنا مقتدی پر واجب ہوتا تو آپ صرف اتنی بات پر کفایت نہ فرماتے کہ میں خیال کر رہا تھا کہ کوئی مجھ سے قرأت میں منازعت کر رہا ہے بلکہ صاف فرما دیتے کہ سبح اسم ربک الاعلیٰ نہ پڑھنا چاہیے بلکہ سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہیے ۔ اور امام بیہقی نے حضرت عمران کی جس روایت سے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا وجوب ثابت کیا ہے وہ موقوف ہے اور اس کی سند میں زیاد بن ابی زیاد جصاص ہے جس کو اکثر محدثین نے ضعیف اور متروک قرار دیا ہے اس کی روایت سے حجت لانا انصاف سے بعید ہے ۔

۱۱۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرارت کرتے تھے تو آپ نے فرمایا تم نے مجھ پر قرآن کو مخلوط کر دیا (یعنی میری قرارت میں خلط ملط کر دیا) اس کی سند بزار کے یہاں عمدہ ہے اور مسند احمد میں اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں ۔ ف ۔ اس میں بھی مقتدیوں کی قرارت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار فرمانا صریح ہے اور امام بیہقی کی یہ تاویل کہ لوگ زور سے قرارت کرتے ہونگے کیوں کہ امام کی قرارت میں خلط اسی وقت ہو سکتا ہے صحیح نہیں کیوں کہ اول تو صحابہ کا حضور صلعم کے پیچھے زور سے قرأت کرنا بہت بعید ہے ۔ دوسرے یہ بھی مسلّم نہیں کہ آہستہ قرارت سے امام کو خلجان نہیں ہوتا یقیناً اصحاب قلوب کو آہستہ قرارت سے بھی خلجان ہوتا ہے پھر آیت واذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا اور حدیث اذا قرأ الامام فانصتوا سے مقتدی کے ذمہ سکوت کا واجب ہونا واضح ہے کہ اُس کو نہ زور سے پڑھنے کی اجازت ہے نہ آہستہ کیوں کہ ایسی آیت اور احادیث الانصات للخطبہ سے تمام فقہائ نے خطبہ کے اندر مقتدیوں کو قرارت اور ذکر سے مطلقاً منع کیا ہے کہ نہ آہستہ قرأت کریں نہ زور سے پھر اس کی کوئی وجہ نہیں کہ خطبہ میں تو مطلقاً سکوت کو واجب کہا جائے اور نماز میں زور سے قرارت کو منع کیا جائے آہستہ قرأت کی اجازت دی جائے حالاں کہ بالاتفاق یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارہ میں نازل

ہوئی جیسا اوپر گذر چکا ہے۔

۱۲- حسن بن صالح ابوالزبیر سے حضرت جابر بن عبداللہ (صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کل من کان لہ امام فقراءتہ لہ قراءۃ۔ جس کسی کا کوئی امام ہو تو امام کی قراءت اُس کے لئے بھی قراءت ہے اس کو امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے (مصنف میں) روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ اس حدیث کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد بن الہاد سے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرات اُس کے لئے قرات ہے اس کو امام محمد نے مؤطا میں روایت کیا ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ سند صحیح ہے اور امام ابن الہمام اور محمد بن منیع نے کہا ہے کہ یہ سند شرط شیخین پر صحیح ہے۔ اور کتاب الآثار میں امام محمد نے اس کو مفصلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے تو آپ کے پیچھے ایک شخص نے قرات کی اُس کے پاس والے نمازی نے اُس کو دبایا نماز کے بعد اُس نے پوچھا تو نے مجھے کیوں دبایا؟ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے آگے تھے تو میں نے اس کو مکروہ سمجھا کہ تو حضورؐ کے پیچھے قرات کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن لی تو فرمایا من کان لہ امام فان قراءتہ لہ قراءۃ جس کے لئے کوئی امام ہو تو اُس کی قرات یقیناً اُس کے لئے قرات ہے۔ اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔ اس حدیث کو حافظ احمد بن منیع نے بھی اپنی مسند میں امام سفیان ثوری اور شریک (بن عبداللہ نخعی) سے موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد سے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے لئے امام ہو تو امام کی قرات اس کے لئے بھی قرات ہے اور بزار کی طرح عبد بن حمید نے بھی اپنی مسند میں اس حدیث کو حسن بن صالح کے واسطہ سے ابوالزبیر سے حضرت جابر سے مرفوعاً روایت کیا ہے (فتح القدیر) اور حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ حضرت جابر سے یہ حدیث مشہور ہے (التلخیص الجبیر ص۸۷) پس دارقطنی کا یہ کہنا کہ اس حدیث کو دیگر ثقات نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ صرف (امام) ابوحنیفہ اور حسن بن عمارہ نے موصولاً روایت کیا ہے اور مرسل ہی صواب ہے" غلط ہے کیوں کہ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ اس حدیث کو امام سفیان ثوری اور شریک بن عبداللہ نخعی نے بھی امام ابوحنیفہ کی طرح موصولاً روایت کیا ہے امام سفیان ثوری بالاتفاق ثقہ اور حجت ہیں اور شریک بن عبداللہ مسلم کے رجال میں سے ہیں اور حسن بن عمارہ محمد بن اسحٰق سے کسی طرح کم نہیں پس تین راویوں کی متابعت کے بعد یہ کہنا کہ یہ روایت موصولاً صحیح نہیں اصول کے خلاف ہے۔ پھر امام ابوحنیفہ تنہا بھی کسی حدیث کو مرفوعاً روایت کریں تو حجت ہے کیوں کہ اُن کا جو درجہ علماء امت میں ہے کسی پر مخفی نہیں۔ رہا بعض اہل حدیث کا یہ کہنا کہ اس حدیث سے اتنا معلوم ہوا کہ مقتدی کو امام کی قرات کافی ہے یہ تو معلوم نہ ہوا کہ مقتدی کو قرات کرنا منع ہے تو جواب یہ ہے کہ اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ مقتدی پر امام کے پیچھے قرات کرنا واجب نہیں اور یہی ہمارا مقصود ہے۔ ممانعت کے لئے سورہ اعراف کی یہ آیت اور حدیث صحیح اذا قرأ الامام فانصتوا۔ اوپر گذر چکی جس میں مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم ہے۔

اور علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں۔ کہ جب اس حدیث سے مقتدی کے لئے امام کی قرأت کی وجہ سے ایک قرات شرعاً ثابت ہوگئی اگر وہ خود بھی قرات کرے گا تو اس کی دو قرآتیں ایک نماز میں ہو جائیں گی اور یہ مشروع نہیں۔

۱۳- حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یارسول اللہ کیا ہر نماز میں قرات ہے فرمایا ہاں تو جماعت میں سے ایک شخص نے کہا یہ واجب ہو گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں میرے نزدیک جب امام قرات کرے تو وہ (سب کے لئے) کافی ہے اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے (مجمع الزوائد)

مطلب یہ ہے کہ ہر شخص پر قرارت واجب نہیں بلکہ جس کا کوئی امام نہ ہو اس پر واجب ہے کیوں کہ امام کی قرارت مقتدی کو کافی ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کو نسائی نے بھی سند صحیح کی ساتھ سنن مجتبیٰ میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً درست نہیں بلکہ یہ ابوالدرداء کا قول ہے (یعنی حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں) دارقطنی نے کہا کہ اس حدیث کو زید بن حباب اور ابوصالح کاتب اللیث نے مرفوعاً روایت کیا ہے اور یہ خطا ہے۔ صواب یہ ہے کہ ابوالدرداء کا قول ہے۔ میں کہتا ہوں کہ زید بن الحباب سے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے اور احمد بن حنبل اور ابن المدینی وعجلی وغیرہ نے ثقہ کہا ہے اور ابوصالح کاتب اللیث سے امام بخاری نے اپنی صحیح میں تعلیقاً روایت کی ہے ابوحاتم نے اس کو ثقہ مامون اور ابن القطان نے صدوق حسن الحدیث کہا ہے (کہ بہت سچا ہے اس کی حدیث حسن ہے) تو جس حدیث کو ایسے راوی مرفوع کریں محققین کے نزدیک اُس کو مرفوع ہی کہا جائے گا پھر ہمارے نزدیک حدیث موقوف بھی حجت ہے کم از کم اس سے اُن صحابہ کا عدد تو زیادہ ہو گیا جو قرارت خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔

۱۴۔ عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ انھوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے امام کے ساتھ قرارت (کرنے) کو دریافت کیا تو فرمایا امام کے ساتھ کسی حالت میں قرارت نہیں اس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں سجود تلاوت کے باب میں روایت کیا اور طحاوی نے بھی صحیح سند کے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں بھی قرارت نہ کرو۔ (ف) حضرت زید بن ثابت صحابی کا فتویٰ صراحتہً امام ابوحنیفہؒ کا مؤید ہے کہ کسی نماز میں امام کے پیچھے قرارت نہ کرنا چاہیئے جو سورۂ فاتحہ وغیر فاتحہ سب کو عام ہے۔

۱۵۔ امام مالک نے مؤطا میں وہب بن کیسان سے روایت کی ہے کہ اُنھوں نے حضرت جابر بن عبداللہ صحابی رضی اللہ عنہما سے سنا وہ فرماتے تھے کہ جو شخص کوئی رکعت بغیر سورۂ فاتحہ کے پڑھے اُس نے نماز نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے (بغیر سورۂ فاتحہ کے پڑھے ہوئے نماز ہو جاتی ہے) اس کی سند صحیح ہے ترمذی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور طحاوی نے مرفوعاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی حدیث کو انہی الفاظ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا مقتدی کے ذمہ واجب نہیں اور اس میں بیہقی کی یہ تاویل نہیں چل سکتی کہ قرارت سے مراد جہر ہے کیوں کہ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص کوئی رکعت پڑھے اور اُس میں سورۂ فاتحہ جہر سے نہ پڑھے اُس نے نماز نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے زور سے نہ پڑھے تو لازم آئے گا کہ تنہائی میں نماز پڑھنے والے پر سورۂ فاتحہ زور سے پڑھنا واجب ہے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے کتاب التمہید میں فرمایا ہے ثبت عن علی وسعد و زید بن ثابت انہ لاقراءۃ مع الامام لافیما اسر ولافیما جہر (الجوہر النقی ص۱۵۶ و ص۱۵۷ ج ۱)

حضرت علی اور سعد (بن ابی وقاص) اور زید بن ثابت سے ثابت ہو چکا ہے کہ (ان کے نزدیک) امام کے ساتھ قرارت نہیں نہ سری نماز میں نہ جہری نماز میں۔

۱۶۔ امام مالک نے نافع سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اُن سے جب پوچھا جاتا کیا امام کے پیچھے قرارت کی جائے تو فرماتے جب کوئی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرارت اُسے کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرارت کرنا چاہیئے نافع کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ امام کے پیچھے قرارت نہ کرتے تھے (مؤطا)
اور اس کی سند اصح الاسانید ہے (یعنی بہت صحیح ہے)

۱۷- ابو وائل سے روایت ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن مسعود کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ میں امام کے پیچھے قرارت کر لیا کروں؟ فرمایا قرآن کے لئے خاموش رہو کیوں کہ نماز میں دوسرا شغل ہے (یعنی قرآن کے اوامر و نواہی اور وعدو وعید پر غور کرنا) اور تم کو (قرارت کے بارے میں) امام کافی ہے اس کو طبرانی نے کبیر و اوسط میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں اور طحاوی نے بھی سند صحیح سے روایت کیا ہے اور امام محمد نے بھی اپنی موطا میں سند صحیح سے روایت کیا ہے اور بیہقی نے جزو القراءۃ میں علقمہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا امام کے پیچھے قرارت نہ کرو کیوں کہ اس کی قرأت تمہارے لئے بھی قرارت ہے اور امام محمد نے کتاب الآثار میں ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے کہ علقمہ امام کے پیچھے کسی نماز میں خواہ جہری ہو یا سری نہ سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے نہ اور کوئی سورت اور نہ عبداللہ بن مسعود کے دوسرے اصحاب۔ عبداللہ بن مسعود کا یہ مذہب مشہور ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرارت نہ کرتے تھے اور اس سے منع کرتے تھے یہی مذہب اُن کے اصحاب علقمہ و اسود وغیرہ کا ہے اسی پر ابراہیم نخعی کا عمل تھا۔ (حوالۂ روایات کے لئے اعلاء السنن ملاحظہ ہو)

۱۸- عبید اللہ بن مقسم کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت اور جابر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہم) سے (امام کے پیچھے قرارت کرنے کو) دریافت کیا سب نے فرمایا کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں بھی قرارت نہیں کی جاتی اس کو امام طحاوی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔

۱۹- ابو جمرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے پوچھا کہ جب امام میرے آگے (قرارت کرتا) ہو تو کیا میں بھی قرارت کروں فرمایا نہیں۔ اس کو بھی امام طحاوی نے سند حسن سے روایت کیا ہے۔

۲۰- علقمہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کاش اس شخص کا منہ مٹی سے بھر جائے جو امام کے پیچھے قرارت کرتا ہے۔ اس کو بھی امام طحاوی نے سند صحیح سے روایت کیا ہے۔

۲۱- عون (ابن عبداللہ) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا تم کو امام کی قرارت کافی ہے خواہ اخفا کرے یا جہر کرے۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کہا (اس کی سند میں) عاصم قوی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں اُس سے علی بن المدینی شیخ البخاری جیسے ائمہ حدیث روایت کرتے ہیں اور معن بن عیسٰی نے اُس کو ثقہ کہا ہے اور اُس کی بہت تعریف کی ہے اور ایسے راوی کا روایت کو مرفوع کرنا اصول حدیث کے موافق مقبول ہے۔

۲۲- امام شعبی نے مُرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امام کے پیچھے قرارت نہیں ہے۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا پھر شعبی سے حارث سے حضرت علی رضؓ سے (موصولاً) روایت کیا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا میں امام کے پیچھے قرارت کروں یا خاموش رہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا بلکہ خاموش رہو۔ کیوں کہ امام تم کو کافی ہو جائے گا۔ پھر موصول کو ضعیف بتا کر کہا کہ مرسل جو اس سے پہلے مذکور ہوا ہے زیادہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں مرسل حنفیہ کے یہاں حجت ہے خصوصاً شعبی کا مرسل کہ وہ تو محدثین کے نزدیک بھی صحیح ہے اور جب مرسل کی تائید موصول سے ہو جائے پھر تو بالاتفاق حجت ہے اگرچہ موصول ضعیف بھی ہو جیسا کہ مقدمۂ اعلاء السنن میں بحوالہ شرح النخبہ و تدریب الراوی وغیرہ بیان کر دیا گیا ہے۔

۲۳- عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں موسیٰ بن عقبہ (امام المغازی سے) مُرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر (صدیق) اور حضرت عمر و عثمان (رضی اللہ عنہم) امام کے پیچھے قرارت کرنے سے منع کرتے تھے (عمدۃ القاری) علامہ عینی فرماتے ہیں کہ یہ مرسل صحیح ہے۔

۲۴- عبداللہ بن وہب نے یحیٰی بن عبداللہ بن سالم عمری اور یزید بن عیاض سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا جس کے لئے کوئی امام ہو اور یہ اس کی اقتدار کر رہا ہو تو اس کے ساتھ قرات نہ کرے کیوں کہ امام کی قرات اس کے لئے بھی قرآت ہیں۔ اس کو امام بیہقی نے جزء القرات میں روایت کیا اور فرمایا یحیی ابن عبداللہ میں نظر ہے اور یزید بن عیاض پر جملہ محدثین نے جرح کی ہے۔ میں کہتا ہوں حدیث کا مدار یزید بن عیاض پر نہیں اس کے ساتھ یحیی بن عبداللہ بھی ہے۔ اور وہ صحیح مسلم کے رجال میں سے ہے نسائی اور دار قطنی نے اس کو ثقہ کہا ہے پس یحیی کا مرسل صحیح ہے۔ یزید بن عیاض کے مجروح ہونے سے اس کو کوئی ضرر نہیں اور مرسل ہمارے یہاں حجت ہے۔

۲۵۔ امام مالک نے ابن شہاب (زہری) سے ابن اکیمہ لیثی سے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز سے فارغ ہو کر جس میں آپ نے قرات جہر سے کی تھی فرمایا کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ اس وقت قرات کی ہے ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ میں نے قرات کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بھی تو کہوں یہ کون مجھ سے قرآن کو چھین رہا ہے (یعنی قرات میں منازعت کر رہا ہے) جب لوگوں نے یہ بات سنی تو اس نماز میں قرات کرنے سے رک گئے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہر سے قرات کرتے تھے۔ اس کو امام مالک نے مؤطا میں امام شافعی نے مسند میں اور ائمہ اربعہ نے سنن میں روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس کو حسن کہا اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔ امام مالک کا اس کو سند موصول سے روایت کرنا صحت کے لئے کافی ہے۔ اس پر بعض محدثین کا یہ جرح کرنا کہ فانتہی الناس عن القراءۃ فیما جہر فیہ الخ کہ لوگ جہری نماز میں قرات کرنے سے رک گئے الخ زہری کا قول ہے صحابی کا قول نہیں۔ قابل تسلیم نہیں کیوں کہ سنن ابی داؤد میں اس حدیث کو معمر نے زہری سے روایت کیا ہے اور صاف کہا۔ قال ابوہریرہ فانتہی الناس عن القراءۃ الخ یعنی کہ ابوہریرہ نے فرمایا کہ سب لوگ حضور کے پیچھے قرات کرنے سے رک گئے الخ۔ اور معمر ثقہ متقن ہے اس سے روایت کرنے والا احمد بن السرح بھی ثقات اثبات میں سے ہے پس اصول حدیث کے موافق معمر کے قول کو ترجیح دی جائے گی پھر اگر زہری ہی کا قول مان لیا جائے تو وہ سیر و مغازی کا امام اور اخبار زمانۂ رسالت کا خوب جاننے والا ہے اس باب میں اس کا قول حجت ہے اس سے قطعاً معلوم ہو گیا کہ اس واقعہ کے بعد تمام صحابہ نے حضور کے پیچھے جہری نماز میں قرات کرنا ترک کر دیا تھا۔ ف۔ اس حدیث سے امور ذیل مستفاد ہوئے (۱) جو لوگ امام کے پیچھے قرات کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے نہ کرتے تھے نہ آپ کو اس کا علم تھا ورنہ حضور کو اس سوال کی ضرورت نہ ہوتی کہ کیا کسی نے میرے پیچھے اس وقت قرات کی ہے (۲) سب صحابہ امام کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرات نہ کرتے تھے کیوں کہ حضور کے دریافت کرنے پر صرف ایک شخص نے جواب دیا کہ میں نے قرات کی ہے (۳) حضور نے اس شخص کی قرات پر انکار فرمایا جس سے سب لوگ جہری نمازوں میں قرات سے باز آگئے۔ (۴) سری نمازوں میں اس کے بعد بھی کچھ لوگ قرات کرتے ہوں گے بعد میں حضور نے اس سے بھی منع فرما دیا جیسا عبداللہ بن شداد کی روایت میں گزر چکا ہے کہ ایک شخص نے عصر کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرات کی ایک صحابی نے اس کو اشارہ سے روکا نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے سامنے امام ہو اس کے واسطے امام کی قرات کافی ہے۔

۲۶۔ انس بن سیرین کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ میں امام کے پیچھے قرات کیا کروں؟ فرمایا تو تو بڑے پیٹ کا معلوم ہوتا ہے (یعنی بیوقوف) تجھے امام کی قرات کافی ہے۔ اس کو عبدالرزاق نے مصنف میں روایت کیا ہے میں کہتا ہوں اس کی سند صحیح ہے جس کے راوی صحیحین کے راوی ہیں۔

۲۷۔ زید بن اسلم سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امام کے پیچھے قرات کرنے سے منع فرماتے تھے اس کو بھی عبدالرزاق

نے روایت کیا ہے (جوہر نقی) میں کہتا ہوں اس کی سند بھی صحیح ہے۔

۲۸- موسیٰ بن سعد بن زید ثابت اپنے دادا (زید بن ثابت صحابی رض) سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے قرارت کرے اُس کی نماز (درست) نہیں۔ اس کو امام محمد نے موطا میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح نسخہ میں جس طرح ہے امام بیہقی نے اسی طرح امام بخاری سے روایت کرکے نقل کی ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور موسیٰ بن سعد کا اپنے دادا زید بن ثابت سے روایت کرنا ابن حبان اور امام بخاری نے ذکر کیا ہے (تہذیب)

ف- ان تمام آثار سے ثابت ہو گیا کہ اجلہ صحابہ کا اس باب میں وہی قول ہے جو امام ابو حنیفہ رح کا قول ہے۔ غرض امام ابو حنیفہ کا مذہب اس مسئلہ میں کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرارت نہ کرنا چاہیئے قرآن سے بھی ثابت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی اور صحابہ کرام کے اقوال و عمل سے بھی تو یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ بعض لوگ اب بھی اس مسئلہ میں حنفیہ پر زبان درازی کرتے ہیں اب ہم بتلائیں گے کہ تابعین میں بھی بہت حضرات اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رح کے موافق ہیں۔

فضل (ابن دکین) زہیر (ابن معاویہ) سے وہ ولید بن قیس سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا میں نے سوید بن غفلہ سے (جو تابعی کبیر ہیں اور بعض نے اُن کو صحابی بھی کہا ہے) دریافت کیا کہ میں ظہر و عصر میں امام کے پیچھے قرارت کر لیا کروں؟ فرمایا نہیں اس کو ابو بکر بن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے اور اس کی سند بالکل صحیح ہے۔

۳۰- ہشیم ابو بشر جعفر بن ایاس سے وہ سعید بن جبیر سے روایت کرتے ہیں کہ اُن سے قرارت خلف الامام کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا امام کے پیچھے قرارت نہیں ہے اس کو بھی ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں صحیحین کے راویوں میں سے ہیں اور سعید بن جبیر تابعی جلیل ہیں۔

۳۱- محمد بن سیرین سے (جو تابعی جلیل ہیں) روایت ہے انھوں نے فرمایا میں امام کے پیچھے قرارت کرنے کو سنت نہیں جانتا اس کو بھی ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

۳۲- ابراہیم نخعی اسود (تابعی کبیر) سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے قرارت کرے میں چاہتا ہوں کہ اُس کا منہ مٹی سے بھر جائے اس کو عبدالرزاق نے مصنف میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے جس کے راوی صحیحین کے راوی ہیں۔

۳۳- اعمش ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے جو اول بدعت ایجاد کی ہے وہ امام کے پیچھے قرارت کرنا ہے اس کو بھی عبدالرزاق نے مصنف میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیحین کی شرط پر صحیح ہے۔ (جوہر نقی)

۳۴- منصور ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے امام کے پیچھے سب سے پہلے قرارت کی ہے وہ (دین میں) متہم تھا اس کو امام محمد نے موطا میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

ف- ابراہیم نخعی فقہاء کوفہ میں سے ہیں۔ بظاہر مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے جس شخص نے قرارت خلف الامام شروع کی وہ متہم تھا۔ ممکن ہے کوئی خارجی یا قدری ہو اس سے پہلے اہل کوفہ کا عمل عبداللہ بن مسعود کے موافق تھا کہ وہ امام کے پیچھے قرارت نہ کرتے تھے ابراہیم نخعی کا یہ مطلب نہیں کہ مکہ اور حجاز میں بھی قرارت خلف الامام کرنے والے مبتدع یا متہم تھے

۳۵- امام ابو حنیفہ نے حماد سے انھوں نے ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے کہ علقمہ بن قیس نے امام کے پیچھے کسی نماز میں قرأت نہیں کی نہ جہری میں نہ سری میں نہ سورۂ فاتحہ پڑھتے نہ اور کوئی سورت اس کو امام محمد نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے

اور اس کی سند صحیح ہے۔ جامع مسانید الامام میں بھی اسی سند سے اس کو ذکر کیا گیا ہے۔ اور ولا اصحاب عبداللہ زیادہ کہا ہے۔ یعنی عبداللہ بن مسعود کے اور تمام اصحاب بھی امام کے پیچھے قرارت نہ کرتے تھے اس کو مسند حافظ ابن خسرو اور آثار محمد کی طرف منسوب کیا ہے

ف۔ یہ حضرات اجلہ تابعین ہیں۔ جن کی امامت پر علماء امت کا اتفاق ہے۔ ان آثار سے معلوم ہو گیا کہ یہ حضرات امام کے پیچھے قرارت نہ کرتے تھے بلکہ اس سے منع فرماتے اور بعضے اس کو بدعت اور بعضے اس کو خلاف سُنّت تک کہتے تھے۔ کیا اب بھی کسی کا یہ منہ ہے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ پر زبان درازی کرے؟ جبکہ قرآن سے صحیح حدیثوں سے اقوال صحابہ و اقوال تابعین سے اُن کے قول کی پوری تائید اور تقویت ہو رہی ہے اور جن احادیث سے حضرات شافعیہ یا ظاہریہ نے استدلال کیا ہے ان سب کا جواب اعلاء السنن میں مفصل دیدیا گیا ہے اور بتلا دیا گیا ہے کہ جن احادیث میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے کی تاکید ہے وہ امام اور منفرد پر محمول ہیں مقتدی پر محمول نہیں چنانچہ خود راوی حدیث امام احمد اور سفیان بن عینیہ نے بھی اسی پر حدیث کو محمول کیا ہے اور امام و منفرد کے حق میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہمارے نزدیک بھی واجب ہے اور جن احادیث میں امام کے پیچھے قرارت فاتحہ کا ذکر ہے وہ مرفوعاً صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہیں۔ البتہ بعض صحابہ سے امام کے پیچھے قرارت کرنا ثابت ہے مگر انکے خلاف اجلۂ صحابہ و اجلۂ تابعین سے اس کی ممانعت اور نفی بھی ثابت ہے جیسا ہم نے مفصل بیان کر دیا ہے پس اختلاف صحابہ کی صورت میں اُن صحابہ کا قول مقدم اور راجح ہو گا جو آیت قرآن اذا قرأ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا۔ اور حدیث صحیح اذا قرأ الامام فانصتوا کے موافق ہو۔ اور جن صحابہ کا قول نص قرآن اور حدیث صحیح کے خلاف ہو اُس میں تاویل کی جائے گی کہ وہ جہری نمازوں میں امام کے سکتات میں قرارت کرتے ہونگے اور سکتات امام میں مقتدی کو قرارت فاتحہ کرنا ہمارے نزدیک بھی جائز ہے گو واجب نہیں کیوں کہ خود امام کے ذمہ سکتات واجب نہیں اور گو ہمارے نزدیک سری نمازوں میں مقتدی کو قرارت نہ کرنا بہتر ہے لیکن اگر قرارت کرے تو جائز ہے کچھ مضائقہ نہیں۔ جن صحابہ سے امام کے پیچھے قرارت ثابت ہے وہ سری نمازوں میں قرارت کرتے ہونگے۔ جہری نمازوں میں امام کے ساتھ قرارت کرنا امام شافعی کا بھی مذہب نہیں وہ صرف اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کو امام کے سکتات میں فاتحہ پڑھنا ضروری ہے اُن کے نزدیک امام کو سورۂ فاتحہ کے بعد اتنا طویل سکتہ کرنا چاہیئے کہ مقتدی سُورۂ فاتحہ پڑھ لیں ہمارے نزدیک ضروری تو نہیں کیوں کہ امام کے ذمہ کسی دلیل سے اس سکتہ کا وجوب ثابت نہیں۔ لیکن اگر امام سکتہ طویلہ کرے تو مقتدی کو سُورۂ فاتحہ پڑھنا جائز ہے واللہ اعلم

امام طحاوی اور موفق ابن قدامہ حنبلی نے دلائل کتاب و سنّت و اقوال و آثار صحابہ و تابعین بیان کر کے اجماع سے بھی اس کا ثبوت دیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی پر قرارت فاتحہ واجب نہیں کیوں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا کہ جو شخص رکوع کی حالت میں امام کو پائے اور تکبیر تحریمہ (اللہ اکبر) کہہ کر رکوع میں شریک ہو جائے تو وہ رکعت اس نے پالی ہے حالانکہ اُس نے قرأت نہیں کی ہے موفق ابن قدامہ فرماتے ہیں ولانہا قراءۃ لاتجب علی المسبوق فلم تجب علی غیرہ کالسورۃ الخ اور (اجماعی دلیل یہ ہے کہ) مقتدی مسبوق پر قرارت فاتحہ واجب نہیں (وہ رکوع پالینے سے رکعت پالیتا ہے) تو اُس کے سوا اور کسی مقتدی پر بھی یہ قرارت واجب نہ ہو گی جیسے سورت کا پڑھنا واجب نہیں (حالانکہ دلائل حدیث سے ضم سورت کا وجوب بھی ثابت ہے) اگر مقتدی کے ذمہ قرارت واجب ہوتی تو بقیہ ارکان کی طرح مسبوق سے بھی ساقط نہ ہوتی ج ۱ ص ۶۰۹۔ حافظ ابن عبدالبر نے شرح الاستذکار میں فرمایا ہے کہ تمام فقہاء کا قول یہ ہے کہ جو شخص امام کو رکوع میں پائے اور تکبیر کہہ کر رکوع میں شامل ہو جائے اور ہاتھ گھٹنوں پر جمالے اس سے پہلے کہ امام سر اٹھائے تو اس نے رکعت پالی ہے۔ یہی مذہب ہے امام مالک کا اور امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور انکے اصحاب کا اور سفیان ثوری و اوزاعی و ابو ثور و احمد و اسحٰق کا۔ یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت

اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے ہم نے کتاب التمہید میں سند کے ساتھ ان سب کے اقوال بیان کردیئے ہیں۔ غرض اس کے فقہاء کا اتفاق ہے حافظ ابن عبدالبر امام نووی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے ابن الامیر یمانی نے بھی سبل السلام میں عامۂ فقہاء کے قول کو ترجیح دی ہے مگر ظاہریہ نے صرف اس لئے کہ اسی صورت میں مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا وجوب باقی رہتا اجماع کے خلاف یہ دعویٰ کردیا کہ رکوع پانے سے مسبوق رکعت کو نہیں پاسکتا کیوں کہ اس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ایک قول سے سہارا لے لیا کہ جو امام بخاری نے جزء القراءۃ میں ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی امام کو رکوع میں پائے تو اس رکعت کو شمار نہ کیا جائے گا، حالانکہ مؤطا مالک میں حضرت ابوہریرہ رض سے اس کے خلاف روایت موجود ہے جو جمہور امت کے موافق ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے شرح مؤطا میں فرمایا ہے کہ فقہاء انصار میں سے کسی کا بھی یہ قول نہیں ہے اور اس کی سند میں نظر ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ قول خلاف اجماع ہے اور ابوہریرہ کی حدیث صحیح نہیں ہر زمانہ کے فقہاء نے بالاتفاق اس کو رد کردیا ہے تو اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور اس کے خلاف ابوداؤد نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کو آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو سجدہ کرلو اور اس کو کچھ شمار نہ کرو اور جس نے رکوع پالیا اس نے نماز (کی رکعت) پالی۔ ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے اور منذری نے بھی اور حاکم نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے ذہبی نے بھی تلخیص مستدرک میں حاکم کی تائید کی ہے۔

ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو ان الفاظ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، من ادرک رکعۃ من الصلوۃ فقد ادرکہا قبل ان یقیم الامام صلبہ جس نے نماز میں رکوع پالیا اس سے پہلے کہ امام اپنی کمر سیدھی کرے اُس نے رکعت کو پالیا ابن خزیمہ نے اس حدیث کو حجت قرار دیا ہے (التلخیص الحبیر) اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اس کو صحیح کہا ہے (المرقاۃ) پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی روایت کردہ حدیث مرفوع کے خلاف کوئی قول بیان کریں پس اُن کا وہی قول صحیح ہے جو مؤطا مالک میں حدیث مرفوع کے موافق ہے اگر مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے قرارت واجب ہوتی تو رکوع پانے سے وہ رکعت نہ پاسکتا کیوں کہ خود اس نے تو قرارت نہیں کی پس ثابت ہوا کہ امام کی قرارت مقتدی کے لئے کافی ہو جاتی ہے اسی لئے وہ رکوع پانے سے رکعت پالیتا ہے۔ اب میں مؤلف تکمیل البرہان کے دلائل کی حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں سب سے پہلے انھوں نے وہی حدیث عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کی ہے۔ لاصلوۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب (بخاری ومسلم) اُس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد اور سفیان بن عیینہ رض اور زہری جیسے ائمہ راویان حدیث نے امام اور منفرد کے حق میں قرار دیا ہے مقتدی کو اس حکم میں شامل نہیں کیا کیوں کہ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی سے مرفوعاً اور موقوفاً ثابت ہے۔ من صلی رکعۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام (مؤطا مالک ترمذی طحاوی) جس نے کوئی رکعت پڑھی جس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اُس نے نماز نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے (ہو تو نماز ہو جائے گی) امام ترمذی کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لاصلوۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب کا مطلب یہ ہے کہ جب تنہا نماز پڑھے تو سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہ ہوگی دیکھو جابر بن عبداللہ صحابی اس حدیث کا یہی مطلب بیان فرماتے ہیں دوسرے جب حدیث صحیح سے ثابت ہوچکا ہے من کان لہ امام فقراءۃ لہ قراءۃ جو کسی امام کے پیچھے نماز پڑھے اُس کی قرارت اس کے لئے بھی قرارت ہے۔ تو اب یہ کہنا صحیح نہیں کہ مقتدی نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی جب امام نے پڑھ لی ہے تو اس نے بھی حکماً پڑھ لی ہے گو زبان سے نہیں پڑھی کیوں کہ مقتدی کو حدیث صحیح میں قرارت امام کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے اذا قرأ الامام فانصتوا یعنی

قرآن میں حکم ہے واذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا۔

دوسری دلیل لا تفعلوا الا بام القرآن فانہ لا صلوٰۃ لمن یقرأ بہا (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) نہ معلوم مؤلف تکمیل البرہان نے اس حدیث کو پورا کیوں نہیں لکھا پوری حدیث یہ ہے کہ محمود بن الربیع کہتے ہیں میں نے عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کو امام کے پیچھے قرارت کرتے ہوئے سنا تو میں نے کہا میں آپ کو امام کے پیچھے قرارت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں نہ معلوم آپ نے قصداً ایسا کیا ہے یا سہو ہوگیا ہے فرمایا میں نے سہو نہیں کیا بلکہ قصداً قرارت کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو ایک نماز پڑھائی جس میں جہر کیا جاتا ہے تو آپ کو قرارت میں الجھن ہوئی نماز کے بعد فرمایا کیا تم لوگ میرے ساتھ قرارت کرتے ہو؟ لوگوں نے کہا ہاں فرمایا لا تفعلوا الا بام القرآن فانہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بہا۔ ایسا مت کرو مگر ام القرآن (پڑھ سکتے ہو) جو اس کو نہ پڑھے اس کی نماز نہیں اس حدیث کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر قرارت کرتے تھے۔ جبھی تو آپ کو دریافت کرنا پڑا کہ تم میرے ساتھ قرارت کرتے ہو؟ اگر حضورؐ نے امام کے پیچھے قرارت کا حکم دیا ہوتا تو اس سوال کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اس کے بعد جب معلوم ہوا کہ وہ امام کے پیچھے قرارت کرتے ہیں فرمایا ایسا نہ کرو مگر فاتحہ (پڑھ سکتے ہو) اس سے وجوب ثابت نہیں ہو سکتا صرف اباحت مفہوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اصول فقہ میں ثابت کر دیا گیا ہے ان الاستثناء بعد الحظر اباحۃ واطلاق۔ کہ نہی کے بعد جو استثناء وارد ہوتا ہے وہ اباحت کے لئے ہوتا ہے وجوب کے لئے نہیں ہوتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ سکتات امام کے وقت نماز جہری میں ہم مقتدی کی قرارت کو جائز کہتے ہیں۔ اور خصم کو مضر ہے کیونکہ وہ اباحت کا قائل نہیں بلکہ وجوب کا مدعی ہے اور ہماری تاویل کی تائید طبرانی کی روایت سے ہوتی ہے جو مجمع الزوائد میں حضرت عبادۃ بن الصامت ہی سے مروی ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من قرأ خلف الامام فلیقرأ بفاتحۃ الکتاب اور اس کے راویوں کو ثقہ کہا گیا ہے ص ۱۸۶ ج ۲ جو کوئی امام کے پیچھے قرارت کرنا چاہے وہ سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرے۔ اور مجمع الزوائد ہی میں امام احمد کے حوالہ سے ایک صحابی سے یہ روایت بھی ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلکم تقرأون والامام یقرأ قالہا ثلثا قالوا انا لنفعل ذالک قال فلا تفعلوا الا ان یقرأ احدکم بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح ص ۱۸۶ ج ۲ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا شاید تم امام کے ساتھ ساتھ قرارت کرتے ہو تین بار دریافت فرمایا صحابہ نے کہا بے شک ہم ایسا کرتے ہیں فرمایا ایسا نہ کرو مگر یہ کہ کوئی سورۃ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لے اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ بھی زبان سے پڑھنے کی اجازت نہیں صرف دل دل میں پڑھنے کی اجازت ہے اور اس کو کوئی بھی منع نہیں کرتا اور یہ دعویٰ غلط ہے کہ دل کی قرارت کو قرارت نہیں کہا جاتا کیونکہ عرفاً اس کو بھی قرارت کہا جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی قسم کھالے کہ میں زید کا خط نہیں پڑھونگا پھر اس کے خط کو دیکھ لے اور مضمون سمجھ لے۔ مگر زبان سے نہ پڑھے حانث ہو جائے گا اور قسم کا کفارہ دینا پڑے گا البتہ جہاں شریعت نے قرارت فرض کی ہے وہاں بغیر زبان سے پڑھے فرض ادا نہ ہوگا اور حدیث عبادہ سے مقتدی کے ذمہ قرارت فاتحہ کا وجوب ثابت نہیں ہوتا صرف اباحت ثابت ہوتی ہے اور وہ دل میں پڑھنے سے بھی ادا ہو جائے گی۔ دوسرے اس پوری حدیث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود بن ربیع نے حضرت عبادہ کے سوا کسی صحابی کو امام کے پیچھے قرارت کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا [illegible] حضرت عبادہ کو دیکھا تو شبہ ہوا کہ یہ قصداً ایسا کر رہے ہیں یا سہواً اور محمود بن ربیع خود بھی صحابی صغیر ہیں اجلہ صحابہ کے دیکھنے والے ہیں اُن کا قرارت خلف الامام پر انکار اور تعجب کرنا خود اس کی دلیل ہے کہ امام کے پیچھے قرارت فاتحہ لازم نہیں۔ اور حضرت عبادہ کی حدیث سے بھی وہ قرارت فاتحہ کا وجوب نہیں سمجھتے ورنہ اپنی گزشتہ نمازوں کا اعادہ کرتے مگر نہ انھوں نے اعادہ کیا نہ حضرت عبادہ

نے اعادہ کا امر کیا پس یہ حدیث مقتدی کو امام کے پیچھے قرارت کی اجازت دے رہی ہے وجوب کو بیان نہیں کر رہی اور ہم بھی سکتات امام میں مقتدی کے لئے قرارت فاتحہ کی اجازت کے قائل ہیں اور سکتات امام کی شرط اپنی طرف سے ہم نہیں لگا رہے بلکہ بعض احادیث میں یہ قید صراحۃً موجود ہے جو گو ہمارے نزدیک سند کے لحاظ سے صحیح نہیں مگر امام بیہقی نے جزء القرارت میں بطور حجت کے بیان کیا ہے کہ عبداللہ رضؓ بن عمرو بن العاص روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم امام کے ساتھ ہو تو اس کی (قرارت) سے پہلے یا جب وہ سکتہ کرے ام القرآن پڑھ لیا کرو بیہقی نے فرمایا کہ یہ مرفوعاً صحیح نہیں موقوفاً صحیح ہے یعنی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں بلکہ عبداللہ بن عمرو صحابی کا قول ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو صحابہ امام کے پیچھے قرارت فاتحہ کرتے تھے امام کے ساتھ قرارت نہ کرتے تھے بلکہ اس کی قرارت سے پہلے یا سکتہ کی حالت میں کرتے تھے۔ پھر یہ ساری گفتگو اس صورت میں ہے کہ حدیث عبادہ رضؓ میں الا بام القرآن فانہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرا بہا کی زیادت کو صحیح مان لیا جائے مگر محدثین کو اسی میں کلام ہے چنانچہ موفق ابن قدامہ کتاب المغنی میں فرماتے ہیں۔ فاما حدیث عبادۃ الصحیح فہو محمول علی غیر الماموم وقد روی ایضاً موقوفاً عن جابر و حدیث عبادۃ الآخر فلم یروہ غیر ابن اسحق کذالک قال الامام احمد وقد رواہ ابو داؤد عن مکحول عن نافع بن محمود بن ربیع الانصاری وھو ادنیٰ حالاً من ابن اسحٰق فانہ غیر معروف بین اہل الحدیث ص ۶۰۶ ج ۱ یعنی حضرت عبادہ کی جو حدیث صحیح ہے وہ تو مقتدی کے سوا دوسروں پر محمول ہے چنانچہ حضرت جابر رضؓ نے یہی فرمایا ہے اور عبادہ کی دوسری حدیث (جس سے امام کے پیچھے قرارت ثابت کی جاتی ہے) اس کو محمد بن اسحق کے سوا کوئی روایت نہیں کرتا امام احمد نے ایسا ہی فرمایا ہے اور ابو داؤد نے اس حدیث کو مکحول سے نافع بن محمود سے روایت کیا ہے اور وہ ابن اسحق سے بھی ادنیٰ ہے کیوں کہ وہ محدثین کے نزدیک معروف نہیں (بلکہ مجہول ہے) اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے رسالہ تنوع العبادات میں فرمایا ہے کہ نماز میں (سکتہ کے متعلق) لوگوں کے تین قول ہیں ایک یہ کہ نماز میں کوئی سکتہ نہیں ہے جیسے امام مالک کا مذہب ہے ان کے نزدیک ثناء اور تعوذ نہیں ہے اور قرارت امام میں بھی سکتہ نہیں ہے دوسرا قول یہ ہے کہ نماز میں صرف ایک سکتہ ثناء و تعوذ کے لئے ہے جیسے امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کیوں کہ یہ حدیث (جس کو شیخین نے حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ یا رسول اللہ آپ جو تکبیر اور قرارت کے درمیان سکتہ کرتے ہیں اس میں آپ کیا کہا کرتے ہیں؟) اس سکتہ پر دلالت کرتی ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ نماز میں دو سکتے ہیں جیسا سنن کی روایات میں ہے مگر یہ سکتہ قرارت سے فارغ ہونے کے بعد (رکوع سے پہلے) ہے اور یہی صحیح ہے — ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ سورہ فاتحہ سے فارغ ہو کر سکتہ کرتے تھے امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں بعض لوگوں کا قول (اس روایت کی بنا پر) یہ ہے کہ نماز میں تین سکتے مستحب ہیں۔ سورۂ فاتحہ کے (بعد والے) سکتہ کو امام شافعی کے اصحاب اور بعض اصحاب احمدؒ نے مقتدی کی قرارت فاتحہ کے لئے قرار دیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ صرف دو سکتے مستحب ہیں حدیث (صحیح) میں اس کے سوا کچھ نہیں اور ایک روایت دو میں سے غلط ہے ورنہ تین سکتے ہو جائیں گے اور امام احمد سے یہی منصوص ہے کہ صرف دو سکتے مستحب ہیں اور دوسرا قرارت سے فارغ ہونے کے بعد راحت کے لئے اور قرارت اور رکوع میں فصل کرنے کے لئے ہے اور سورۂ فاتحہ کے بعد سکتہ کرنے کو امام احمد اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ مستحب نہیں سمجھتے اور جمہور بھی اس کو مستحب نہیں سمجھتے کہ امام اس غرض سے سکتہ (طویلہ) کرے کہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لے۔ کیوں کہ جب امام جہر سے قرارت کرے اس وقت مقتدی کے ذمہ جمہور کے نزدیک قرارت واجب یا مستحب نہیں۔ بلکہ قرارت کرنا مقتدی کو منع ہے۔ اور اگر امام کے ساتھ اس حالت میں مقتدی قرارت کرے تو اس کی نماز فاسد ہے یا نہیں؟ امام احمد کے مذہب میں اس کے متعلق دو قول ہیں اور عامہ سلف صالحین جو امام کے پیچھے قرارت کو مکروہ کہتے ہیں یہ کراہت اس صورت میں ہے جبکہ امام جہر سے قرارت کر رہا ہو اور اکثر ائمہ سورۂ فاتحہ کے بعد سکوت طویل نہیں کرتے تھے اور جہری نماز میں امام کے پیچھے قرارت کرنے والے بہت کم لوگ تھے اس سے تو کتاب اللہ (قرآن) میں بھی منع کیا گیا ہے اور حدیث میں بھی اس کا

جمہور سلف وخلف اسی پر ہیں کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں قرأت مکروہ ہے بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ جس وقت امام جہر سے قرأت کر رہا ہو مقتدی فاتحہ پڑھے اگر نہ پڑھے گا تو اس کی نماز باطل ہونے میں اختلاف ہے غرض نزاع طرفین سے ہے لیکن جو لوگ امام کے ساتھ قرأت کرنے سے مقتدی کو منع کرتے ہیں ان کے ساتھ جمہور سلف وخلف بھی ہیں اور کتاب اللہ اور سنت صحیحہ بھی ہے اور جو لوگ اس حالت میں مقتدی پر قرأت کو واجب کہتے ہیں ان کی حدیث کو ائمہ نے ضعیف کہا ہے ابو داؤد نے اس کو روایت کیا ہے اور (ابو موسیٰ اشعری کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اذا قرأ فانصتوا کہ جب امام قرأت کرے خاموش رہو امام احمد بن حنبل اور اسحق (بن راہویہ) اور مسلم بن الحجاج وغیرہم کے نزدیک صحیح ہے ان سب نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ بخلاف اس حدیث کے (جس سے مقتدی پر امام کے ساتھ قرأت کو واجب کہا جاتا ہے) کیوں کہ وہ صحیح میں شامل نہیں کی گئی اور بہت وجوہ سے اس کا ضعیف ہونا ثابت ہے اور حقیقت میں وہ عبادہ رضؓ بن الصامت کا قول ہے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں) ص۸۵ و ص۸۶

علامہ ابن تیمیہ کا درجہ علم اسناد وحدیث میں جتنا بلند ہے ظاہر یہ اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ کیا مؤلف تکمیل البرہان نے علامہ کی کتابوں کا بھی مطالعہ نہیں کیا کہ حدیث عبادہ کو بروایت محمد بن اسحٰق صحیح کہنے لگے حالانکہ اس کی سند میں اس قدر اضطراب ہے کہ اگر حنفیہ میں سے کوئی عالم بھی ایسی مضطرب حدیث کو اپنی حجت میں پیش کرتا تو ظاہر یہ آسمان سر پر اٹھا لیتے کہ حنفیہ کو علم اسناد وعلل سے مس نہیں اسی لئے ایسی حدیثیں حجت میں لاتے ہیں۔ جوہر نقی میں ہے کہ حافظ عبدالحق (اشبیلی) نے اپنی کتاب الاحکام میں فرمایا ہے کہ اس حدیث کو اوزاعی نے مکحول سے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے اور (حافظ ابن عبدالبر کی کتاب) التمہید میں ہے کہ اس حدیث (کی سند) میں محمد بن اسحٰق کی مخالفت کی گئی ہے اس کو اوزاعی نے مکحول سے رجاء بن حیوہ سے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے پھر حدیث بیان کی (اور امام اوزاعی کا درجہ محمد بن اسحٰق سے بہت زیادہ بلند ہے وہ حدیث وفقہ میں اہل شام کے امام ہیں) اور امام طحاوی نے اس حدیث کو رجاء بن حیوہ کے واسطے سے محمود بن ربیع سے روایت کیا ہے اور حضرت عبادہ پر موقوف کر دیا (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا) اور دار قطنی نے اپنی سنن میں اس کو مکحول سے عبادہ بن الصامت سے مرسلاً روایت کیا ہے (یعنی سند منقطع ہے مکحول اور حضرت عبادہ کے درمیان واسطہ حذف ہے) جزء القرأۃ بیہقی ص۴۴ میں بھی اسی طرح ہے۔ پھر امام بیہقی نے دوبارہ اس کو مکحول سے نافع بن محمود سے عبادہ سے روایت کیا ہے ابو داؤد میں بھی اسی طرح (نافع بن محمود کے واسطہ سے) اس کو روایت کیا ہے (اور نافع بن محمود مجہول ہے) اور ایک طریق میں جس کو حاکم نے مستدرک میں ذکر کیا ہے اس حدیث کو مکحول نے محمود سے ابو نعیم سے حضرت عبادہ سے روایت کیا ہے اور یہ ابو نعیم معلوم نہیں کون ہے حاکم نے کہا وہ وہب بن کیسان ہے اور ابن صاعد نے کہا کہ وہ مؤذن (جامع دمشق ہے) دار قطنی نے اپنی سنن میں ایسا ہی بیان کیا ہے اور حافظ نے اصابہ میں اس حدیث کو دوسرے طریق سے نقل کیا ہے اس میں مکحول نے نافع سے محمود بن الربیع سے عبادہ بن الصامت سے روایت کیا ہے۔ جس حدیث کی سند میں اتنے اختلافات ہوں اس کے اضطراب میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت عبادہ کی صحیح حدیث وہی ہے جس کو صاحب تکمیل نے سب سے پہلے بیان کیا ہے اس میں مقتدی

مؤلف تکمیل نے اس مقام پر حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے الدلیل القوی میں لکھا ہے کہ عبادہ رضؓ بن الصامت کی روایت نسائی وابو داؤد کی سند میں نافع بن محمود واقع ہے اور اس کو تقریب میں مستور الحال لکھا ہے الخ حالانکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مستور الحال کی روایت مقبول ہے۔ جواب یہ ہے کہ مستور کی روایت اس وقت مقبول ہے جب ثقات معروفین کے خلاف نہ ہو اور یہاں نافع نے جو زیادتی کی ہے وہ ثقات کے خلاف ہے دوسرے اس کی سند میں اضطراب ہے اور حدیث مضطرب بالاتفاق ضعیف ہے۔

اور امام کا کوئی ذکر نہیں اور جس حدیث میں یہ مضمون ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ کے سوا قرارت نہ کرے وہ صحیح نہیں اُس کو محمد بن اسحٰق کے سوا کوئی روایت نہیں کرتا اور ابن اسحٰق کے بارے میں علامہ ذہبی نے میزان میں فرمایا ہے ماانفرد بہ ففیہ نکارۃ فان فی حفظہ شیئاً ص۲۴ ج۳۔ جس حدیث کو وہ تنہا روایت کرے اُس میں نکارت ہے (یعنی ضعف ہے) کیوں کہ اس کے حفظ میں کچھ (کسر) ہے اور حافظ ابن حجر نے درایہ کتاب الحج میں فرمایا ہے وابن اسحٰق لا یحتج بما انفرد بہ من الاحکام فضلا عما اذا خالفہ من ہو اثبت منہ اھ ابن اسحٰق احادیث احکام میں جس حدیث کو تنہا بیان کرے حجت نہیں چہ جائیکہ اپنے سے زیادہ مضبوط راوی کی مخالفت کرے (تو اس صورت میں اصلاً حجت نہیں) اور ظاہر ہے کہ اس حدیث کا صحیح حصہ وہی ہے جو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ محمد بن اسحٰق نے جو زیادت اس میں کی ہے وہ ثقات کی روایت کے خلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ حضرت عبادہ بن الصامت کا قول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے جیسا علامہ ابن تیمیہؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ پھر امام بیہقی نے جزو القرارت میں اور امام طحاوی نے معانی الآثار میں اس حدیث کو یوسف بن عدی سے عبید اللہ بن عمرو (رقی) سے ایوب سے ابو قلابہ سے حضرت انسؓ سے بایں الفاظ روایت کیا ہے قال صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم اقبل بوجہہ فقال اتقرأون والامام یقرأ فسکتوا فسألہم ثلثا فقالوا انا لنفعل قال فلا تفعلوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر پوچھا کیا تم امام کی قرارت کے ساتھ قرارت کرتے ہو؟ سب خاموش رہے آپ نے تین بار سوال کیا صحابہ نے کہا بے شک ہم ایسا کرتے ہیں فرمایا ایسا مت کرو اس میں یہ نہیں ہے کہ مگر سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو۔ اس پر بیہقیؒ کا یہ فرمانا کہ یوسف بن عدی نے وہم کیا ہے کہ (سورۂ فاتحہ کے) استثنار کو چھوڑ دیا قابل تسلیم نہیں کیوں کہ یوسف بن عدی امام بخاری کے اُستاد اور صحیح کے راویوں میں سے ہیں کسی نے بھی اس کو صاحب وہم نہیں کہا وہ محمد بن اسحٰق سے زیادہ صاحب حفظ و اتقان ہے علامہ ذہبی کا قول اوپر گذر چکا ہے کہ محمد بن اسحٰق کے حافظہ میں کمی ہے پس محمد بن اسحٰق کی طرف وہم کی نسبت کرنا زیادہ مناسب ہے نہ کہ یوسف بن عدی کی طرف۔ امام الفن یحییٰ ابن معین نے فرمایا ہے کہ (حدیثِ عبادہ) میں جملہ استثنائیہ (الا بام القرآن) کی سند ایسی (قابل اعتبار نہیں (الدلیل القوی) اور اس کو امام احمد اور ایک جماعت نے ضعیف کہا ہے (زیلعی)

فاران سامنے کی بات یہ ہے کہ امام کی اقتدار میں جماعت کے ساتھ جو نماز پڑھی جاتی ہے۔ وہ "سورۂ فاتحہ" سے خالی (عاری) کہاں ہوتی ہے، امام سورۂ فاتحہ کی لازمی طور پر قرأت کرتا ہے چاہے وہ سری قرأت ہو یا جہری! احادیث سے احناف نے یہ سمجھا ہے کہ امام کی سورۂ فاتحہ کی قرأت کافی ہے! بہرحال مجموعی طور پر احناف کی با نماز جماعت سورۂ فاتحہ کی قرارت سے خالی نہیں ہوتی۔

(م ـ ق)

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

جگر مرادآبادی مرحوم

حضرت جگر مرادآبادی ہی کی غزل کا مطلع ہے :-

دُور جا کر دیکھتے نزدیک آکر دیکھتے
ہم سے ہو سکتا تو ہم اُن کو برابر دیکھتے

جگر مرحوم کو تو اپنے محبوب کو دور و نزدیک سے مسلسل دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی ، مگر میں نے جگر کو دور سے بھی دیکھا ہے اور نزدیک سے بھی دیکھا ہے ، میں ان کی جلوتوں ہی میں نہیں ، خلوتوں میں بھی شریک رہا ہوں ، مجھے سفر اور حضر میں اُن کی طویل معیت کا شرف حاصل رہا ہے ، میں نے اُن کے ساتھ رمی اور برج بھی کھیلا ہے ، گانا بھی سُنا ہے اور نمازیں بھی پڑھی ہیں ، میں نے جتنا انہیں دیکھا ہے ، سمجھا ہے ، جانا ہے ، پڑھا اور ہوتا ہے ، کم لوگوں کو اس کا موقع ملا ہوگا ۔ اور شاید نہ بھی ملا ہو ، اور کسی کو یہ موقع مل بھی گیا ہو تو سیرتوں کو پڑھنے اور کرداروں کو مطالعہ کرنے کی صلاحیت ہر شخص میں کہاں ہوتی ہے ، بہت سے لوگ شخصیتوں اور سیرتوں کے قریب سے سرسری گزر جاتے ہیں کوئی ایک جیسی عقیدت کے جذبات میں گم ہو کر رہ جاتا ہے ، کسی کی نگاہ میں صرف "محاسن نگر" ہوتی ہے اور کوئی عیب بیں ہوتا ہے ، کرداروں کا مطالعہ کرنے کی یہ دونوں انتہائیں غلط ہیں ! نگاہ وہ معتبر ہے جو تصویر کے دونوں رُخ دیکھ سکے ——— آئینہ کی طرح ، جو وہی بتاتا ہے ، جو کچھ وہ دیکھتا ہے ، اسی لئے تو کسی آزمودہ کار شاعر نے نصیحت کی ہے :-

؎ آنکھ آئینہ کی پیدا کر ، دہن تصویر کا

میں نے ہوش سنبھالا تو اقبال ، اکبرالہ آبادی ، عزیز لکھنوی اور فانی بدایونی کے نام اور کلام سے آشنا ہوا ، یہ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے ، حضرت جگر اس وقت تک زیادہ مشہور نہ ہوئے تھے ، یا یوں سمجھئے کہ اُن کی شہرت کا یہ دور آغاز تھا ۔ کچھ دن کے بعد جگر کے نام کی بھی کانوں میں بھنک پڑی ، پھر رسالوں میں اُن کی چند غزلیں بھی نگاہ سے گزریں ! میں آٹھویں یا نویں کلاس میں پڑھتا تھا ، ان دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کوئی مشاعرہ ہوا ، ایک صاحب جو میرے گاؤں کے قریب قصبہ ڈبائی کے رہنے والے تھے ، وہ مجھے ریلوے اسٹیشن پر مل گئے ، انہوں نے کہا کہ میں اس مشاعرے میں شریک ہوا تھا ، جگر مرادآبادی نے بڑے معرکہ کی غزل سنائی ، ان کی غزل کا مطلع تھا :-

نالہ پابندِ نفس اے دلِ ناشاد نہیں

یہ تو فریاد کی توہین ہے، فریاد نہیں

اس شعر کو سن کر میں بے اختیار جھومنے لگا اور کئی دن تک اسی شعر کو گنگناتا رہا، کبھی تصورِ شاعر کی خیالی تصویر مرتب کرتا اور کبھی دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی کہ کاش! ایسے شعر ہم بھی کہہ سکتے!

اُس دن کے بعد سے حضرت جگرؔ کی غزلیں رسالوں میں تلاش کر کے بڑے شوق سے پڑھتا، اور اُن کے کلام کے واسطہ سے اُن سے قریب ہوتا چلا گیا، ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد دکن جانا ہوا تو وہاں ایک صاحب کی بیاض میں جگرؔ صاحب کی متعدد غزلیں درج تھیں، انہوں نے لاہور میں بارہا جگر صاحب کو سُنا تھا۔ وہ انہی کی دُھن میں غزلیں سُناتے اور ساتھ ہی جگر صاحب کے عالمِ سرخوشی کے قصّے بلکہ آنکھوں دیکھا حال بھی بیان کرتے! اس طرح جگر صاحب کی ذات سے اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔

حیدر آباد دکن میں میرے "پہلے قیام" کی مدت پانچ سال کے قریب ہے، ۱۹۳۲ء کے آخر میں حیدر آباد کو خیر باد کہہ کر، بجنور چلا آیا، اور یہاں روزنامہ "مدینہ" کی ادارت سے وابستہ ہو گیا، بجنور سے اپنے وطن دکھیر کلاں (ضلع بلند شہر) آتے جاتے مراد آباد پر گاڑی ضرور تبدیل کرنی پڑتی، ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی مسلم مسافر خانہ تھا، اس میں دو چار گھنٹہ قیام رہتا اور بڑا آرام ملتا، ایک بار جو میں وطن سے واپس ہوا اور اس مسافر خانے میں پہونچا، تو مسافر خانہ کے مہتمم مقبول احمد صاحب سیوہاروی کا آمنا سامنا ہو گیا پوری طرح علیک سلیک بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ فر فر بولنے لگے:۔

"بھائی ماہر! ابھی ابھی یہاں جگر صاحب تشریف فرما تھے، اپنی کئی غزلیں لہک لہک کر سناتے رہے! تم ذرا پہلے آجاتے تو جگر صاحب سے تمہاری ملاقات ہو جاتی......"

میں نے اس پر کہا کہ:۔

"بجنور کے لئے ریل گاڑی تو کئی گھنٹہ بعد جائے گی، چلئے شہر میں چل کر جگر صاحب کو تلاش کریں، وہ مل گئے تو انہیں دیکھنے کی تمنا پوری ہو جائے گی....."

مقبول احمد صاحب نے مسکرا کر جواب دیا کہ جگر صاحب کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں، کوئی خاص قیام گاہ نہیں، انہیں تلاش آخر کہاں کیا جائے؟ شام کہیں ہوتے ہیں، رات کہیں بسر فرماتے ہیں اور صبح کسی نئی جگہ عقیدت مندوں کے ہجوم میں شعر پڑھتے ہوتے ہیں، وہ جو اس مسافر خانہ سے اُٹھ کر گئے ہیں، تو اس ہیئت سے گئے ہیں کہ اُن کی ٹوپی کسی کے ہاتھ میں تھی اور شیروانی دوسرا آدمی اپنے ہاتھ پر ڈالے ہوا تھا، دو تین ٹکٹ چیکر جگر صاحب کو سنبھالے ہوئے تھے.....!

مجھے حضرت جگر سے نہ ملنے کا بڑا ملال رہا اور دل ہی دل میں غریب اور بے گناہ ریل گاڑی کو کوستا رہا کہ یہ ظالم ذرا پہلے مراد آباد پہونچ جاتی تو حضرت جگر سے ملنے کی تمنا پوری ہو جاتی، مقبول احمد صاحب نے میری طبیعت کے اس ملال کو دیکھ کر کہا کہ جگر صاحب سے ملانے کا میں ذمہ لیتا ہوں، نشاطِ خاطر رکھو، تمہاری یہ آرزو پوری ہو کر رہے گی!

میں مراد آباد سے بجنور چلا آیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا، میری صحافتی زندگی کا آغاز تھا، روزنامہ "مدینہ" نیا نیا نکلنا شروع ہوا تھا، کم سے کم دس گھنٹہ مسلسل کام کرنا پڑتا، جوانی کا زمانہ تھا کام کرنے اور آگے بڑھنے کا شوق تھا، محنت

کر کے طبیعت اور خوش ہوتی تھی! ایک دن شام کے وقت میں اپنے گھر میں لیٹا تھا کہ دفتر کے ملازم نے دروازے پر دستک دے کر، چلّا کر کہا:۔

"علی سکندر اور مقبول احمد آئے ہیں، آپ کو بُلا رہے ہیں"

میں پلنگ سے اُٹھا یہ سمجھ کر کے کہ شہر کے کوئی صاحب ملنے کے لئے آئے ہیں، اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ مقبول احمد سیوہاروی اپنا وعدہ وفا کرنے کے لئے حضرت علی سکندر جگر کو مرادآباد سے ہمراہ لے کر تشریف لائے ہیں، اور پیاسا کنوئیں کے پاس نہیں گیا بلکہ کنواں خود چل کر پیاسے کے پاس آیا ہے!

دفتر مدینہ کے بالاخانہ پر پہلے مقبول احمد سیوہاروی پر نگاہ پڑی اور پھر جگر صاحب پر! ان کے حلیہ اور وضع قطع کو دیکھ کر ہی پہچان گیا کہ یہ وہی صاحب ہونے چاہئیں، جن کی غزل کا یہ مقطع ہے:۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

وہ ان کے بالوں کی بکھری ہوتی لٹیں، اُن پر ٹوپی عجیب انداز سے رکھی ہوئی "شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے" ململی قمیص جس کے دامن پر پان کے ہلکے ہلکے دھبے بھی تھے، تنگ مُہری کا پاجامہ، سیاہ پمپ جس کی پالش اور خاص طور سے فیتہ اپنے پہننے والے کے الھڑپن اور بے نیازی کی زبانِ حال سے شکایت کر رہا تھا! جگر صاحب بڑی گرمجوشی سے ملے، میں اُن کی محبت، تواضع اور التفات کو دیکھ کر، احساسِ فخر و محبت کے بار سے جھکا جا رہا تھا۔

جگر مرحوم تین دن بجنور میں رہے، شعر خوانی کی مُسلسل صحبتیں رہیں، یہ تینوں دن جگر صاحب کے لئے خشک گزرے، اُن کی تواضع دہی کی لسی اور دودھ کے شربت سے کی جاتی، ایک دن گھٹا چھائی ہوئی تھی، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، جگر صاحب کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے آگئے تھے، مگر ملک نصراللہ خان عزیز، مولانا حامد الانصاری غازی (مدیران "مدینہ") اور میں، ہم میں سے کسی نے بھی جگر صاحب کی تشنہ لبی پر ترس نہیں کھایا، اور اُنہیں اپنی طبیعت پر جبر کر کے دودھ کا شربت ہی پینا پڑا، وہ بھی سوچتے ہوں اور شاید پچھتاتے بھی ہوں کہ کن مُلّاؤں میں آن کر پھنس گیا ہوں کہ بھری برسات میں بھی "تر" نہیں ہونے دیتے۔

ایک رات دفتر مدینہ میں چھوٹا سا مشاعرہ بھی ہوا، سو کے قریب سننے والوں کی تعداد ہو گی، ۱۹۳۳ء میں جگر صاحب کی خاصی شہرت ہو گئی تھی مگر ابھی وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ اُن کی شعر خوانی کی خبر سُن کر سارا شہر امنڈ آتے! ہر باکمال اور فن کار کو مشہور اور مقبول ہوتے ہوتے زمانہ لگتا ہے! میرے کہنے پر جگر صاحب مرحوم نے اپنی تازہ غزل لکھ کر دی، مطلع تھا:۔

جواب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
تو پھر ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا

میں غزل کو پڑھنے لگا، تو نیم طنز آمیز لہجہ میں بولے:۔

"آپ چاہیں تو بھرتی کے شعر چھانٹ دیں"

میں نے عرض کیا کہ حضرت : جتنے شعر آپ نے لکھ دئے ہیں ، وہ سب کے سب اخبار میں چھپیں گے ، میری یہ مجال کہاں ! کہ آپ کی غزل سے شعر نکال دوں !

حضرت جگرؔ سے اس پہلی ملاقات میں بے تکلفی تو نہیں ہوئی مگر اجنبیت باقی نہیں رہی ، اُن کے دل کا جو حال ہوا ہو ، یہ تو وہ جانیں ، میں نے اپنے کو اُن سے بہت زیادہ قریب پایا !

اس کے بعد پھر کوئی چار پانچ سال تک حضرت جگرؔ سے کہیں ملاقات نہیں ہوئی پہلی ملاقات کے بعد اتنا طویل خلاء ، ایسا تھا کہ وہ مجھے بھول جاتے تو اُن سے کوئی شکایت نہ رہتی ، میری ملاقات نے حضرت جگرؔ کے دل و دماغ پہ کوئی نقش چھوڑ دیا ہو ، اس کی میں اُمید رکھتا تو بہت بڑی غلط فہمی اور خود فریبی کا ثبوت دیتا ، مگر جے پور کے آل انڈیا مشاعرے میں (غالباً ۱۹۳۷ء تھا) جو ملنا ہوا تو اس محبت سے ملے ، جیسے میں انہیں اچھی طرح یاد ہوں اور وہ اپنی طبیعت کی بے نیازی اور عالم بیخودی و سرشاری کے باوجود مجھ خاک نشین کو بھول نہیں سکے !

جے پور کا یہ مشاعرہ اتنے بڑے پیمانے پر ہوا کہ اس سے پہلے شاید ہی کہیں ہندوستان میں ایسا مشاعرہ ہوا ہو ، مشاہیر شعراء میں شاید ہی کوئی شاعر چھوٹا ہو مجھ جیسے چھٹ بھیا شاعر تک وہاں موجود تھے ، باسط بسوانی مرحوم کا آج کوئی نام تک نہیں جانتا وہ تک اس مشاعرے میں شریک تھے ! حکیم الشعراء حضرت امجد حیدر آبادی دکن سے باہر کسی مشاعرے میں نہیں گئے ، مگر اس مشاعرے میں انہیں دیکھا گیا ، یادگار ہوٹل میں شاعروں کے قیام و طعام کا انتظام تھا ، حضرت جگرؔ بار بار میرے کمرے میں تشریف لاتے تھے اور چلے جاتے تھے ، ایک صاحب سے میں التعارف ان لفظوں میں کرایا —

" کریٹک (CRITIC) ہیں کریٹک — "

بات کرنے میں جگرؔ صاحب کی زبان اُلجھ رہی تھی مگر میں اسی میں خوش ہو گیا کہ جگرؔ صاحب کا مجھ ہیچمداں کو " کریٹک " فرما دینا ہی بہت بڑی بات ہے !

ایک شاعر نے میرے پاس آ کر بڑے رازدارانہ انداز میں کہا کہ یہ جگرؔ صاحب جو تمہارے کمرے میں بار بار آتے ہیں ، اس کا سبب تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا ، پھر اُن کی تشنہ لبی کی طرف اشارہ کیا ، مگر میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ پیش نہیں آیا ! سر تیج بہادر سپرو کے داماد رائے بہادر امرناتھ اٹل ریاست جے پور میں وزیر تھے ، وہی مشاعرے کے صدر تھے بلکہ اس کے محرک ، بانی اور روحِ رواں بھی تھے ، اُن کی شاندار کوٹھی میں شب میں شعراء کی نشست تھی ، جام و مینا کا بھی اہتمام تھا ، جگرؔ صاحب وہاں آئے اور آئے کیا یُوں کہئے لائے گئے ، مگر اس حال میں کہ اُنہیں سر پیر کا ہوش نہ تھا ۔ پوری طرح مست و سرشار ، اس عالم میں ایک ہی بات اُس کی زبان سے بار بار نکلتی تھی —— وہ یہ کہ :—

" اُن کے لئے چُندری چاہیئے ..... "

یہ وہ زمانہ ہے جب جے پور میں اُن کا زیادہ تر قیام رہتا تھا ، اُن کے مجموعۂ کلام " شعلہ طور " کی بہت سی غزلیں اُسی دورِ محبت و سرشاری کی یادگار ہیں ، جس نے بھی " مجاز " کو " قنطرۃ الحقیقت " کہا ہے ، اُس نے تجربہ کے بعد ہی کہا ہے ۔

اس مشاعرے کے سال ڈیڑھ سال بعد ریاست ٹونک میں جگر مرحوم سے ملاقات ہوئی، احسان مرادآبادی اور راز مرادآبادی اُن کے ساتھ تھے اور وہ راز صاحب ہی کے کسی عزیز کے مکان میں قیام فرما تھے، باقی شعراء سرکاری مہمان تھے، دن میں نواب صاحب کے خاص محل میں طرحی مشاعرے کی نشست ہوئی، فرشی نشست تمام درباری اور سامعین قرینہ سے چاندنی پہ بیٹھے ہوئے، نواب صاحب کی مسند وسط میں تھی، ابھی وہ آئے نہیں تھے، اُن کا انتظار ہو رہا تھا، اُن کی مسند کے آس پاس زیادہ جگہ نہ تھی مگر حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی وہاں گھس کر اور بھینچ کر بیٹھے، ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں مرحوم والی ٹونک کے آنے پہ مشاعرہ کا آغاز ہوا، حضرت جگر نواب صاحب سے خاصی دور پہ تشریف فرما تھے، مشاعرے کے بعد نواب صاحب تیر کی طرح تیز قدموں کے ساتھ سیدھے جگر صاحب کے پاس پہونچے اور بڑی محبت کیساتھ فرمایا ——

"جگر صاحب ہاتھ تو ملا لیجئے"

ایک والئی ریاست اور شہنشاہ تغزل کے مصافحہ کا یہ منظر دیدنی تھا، پھر نواب صاحب مجھ سے مُلاقی ہوئے اور تحسین آمیز الفاظ فرمائے!

ایک دن شب میں نواب صاحب کے ولی عہد کے یہاں ڈنر تھا، سب لوگ کھانا کھا چکے تو ہز ہائی نس تشریف لائے، آتے ہی جگر صاحب کو دریافت کیا، اُنہیں بتایا گیا کہ جگر صاحب دوسرے عالم میں ہیں، یہاں آنے کے قابل ہی نہیں ہیں، اس پر وہ بولے۔

"جگر کی شراب میں چھڑا دوں گا ...... میں ......"

حالانکہ وہ خود نشہ میں دھت تھے، ہاتھوں میں رعشہ تھا اور پاؤں لڑکھڑا رہے تھے!

مقصود گزارش یہ ہے کہ اُس تہی دستی کے زمانے میں بھی جگر مرحوم کو یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ ایک اسٹیٹ کا فرمانروا اُن سے متاثر ہے اور اُس کی ذات سے مالی منفعت اٹھانے کا یہ بہترین موقع ہے ایسے "زرین مواقع" کی جگر نے کبھی پروا نہیں کی، وہ ہر دور میں خود اپنی طبیعت کے بادشاہ رہے۔

جس دن میں ٹونک سے روانہ ہو رہا ہوں، اُس دن ڈاک بنگلہ میں تشریف لائے، شام کا وقت تھا، مجھ سے کہا، اپنی کوئی غزل سناؤ، میں نے غزل سُنائی اور یہ شعر سُن کر ——

اُلجھیں تیرے رخسار سے گستاخ نگاہیں	تو اور ہو مجروح تماشا مرے آگے
دیکھی ہے مری آنکھ نے کلیوں کی تباہی	اُٹھا ہے تبسم کا جنازہ مرے آگے

اتنے روئے، اتنے روئے کہ ہچکی بندھ گئی! گریہ وزاری کے اس عالم میں کلیجہ پکڑ کر آہ کرتے اور "اللہ" منہ سے نکلتا!

حضرت جگر کا یہ دورِ سرشاری خاصہ طویل رہا ہے، اُن کی مئےکشی کسی ضابطہ اور حد کی پابند نہ تھی، بلّور کے پیمانے میں قیمتی سے قیمتی شراب ہو یا مٹی کے کورے سکورے میں دیسی کھچی ہوئی، سچ مچ بلا نوش اور دوام آشام! کئی کئی دن تک مسلسل یہی شغل، دُنیا جہان کیا خود اپنے سے بے خبر، اُن کے کپڑوں کی کھانے پینے اور رہنے سہنے کی دوسروں کو فکر رہتی تھی، اُنہیں کچھ ہوش نہ رہتا، یہ واقعات بھی شاید شعر و ادب کی تاریخ میں یادگار رہیں گے کہ وہ

زاہدانِ متقشف جو جام شراب کو چھونے تک کو معصیت سمجھتے تھے، اُن تک نے جگرؔ کی خاطر شراب کا اہتمام کیا، ہی لالچ یہ کہ اس عالم میں جگرؔ کے تغزل اور نغمگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں گے، ایک تو جگر کی شاعری، پھر اس پہ قیامت اُن کی آواز، وہ جہاں بھی بیٹھ جاتے، ذرا سی دیر میں وہاں اچھی خاصی محفل جم جاتی، "انجمن ساز شاعر" اور خود اپنی ذات سے انجمن بھی!

اُس دورِ سرشاری میں مشاعروں میں اس ہیئت سے پہنچتے ——— بال بکھرے ہوئے، تیوری چڑھی ہوئی، پاؤں میں لغزش، اُن کو دیکھتے ہی مشاعرے میں دھوم مچ جاتی، انگلیاں اٹھنے لگتیں اور اشارے ہوتے، کسی کسی کی تو جوشِ مسرت سے چیخ نکل جاتی، مشاعرے میں بیٹھ کر جگرؔ صاحب اچھے شعر پہ داد بھی دیتے اور بُرے شعر پہ سرِ محفل ٹوک بھی دیتے، گھٹیا شعر سُن کر وہ اپنے وجدان کی ناگواری کو ظاہر کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے، اُن کی اس بے جھجک کھلی ہوئی تنقید سے اچھے اچھے شاعر گھبراتے تھے! کسی دن نشہ زیادہ ہوتا تو دو تین آدمیوں کے سہارے اسٹیج تک پہنچتے، جھوم جھوم کر شعر پڑھتے، سارے مشاعرے پہ وجد کا عالم طاری ہو جاتا، کبھی کبھی یہ عالم بھی دیکھا گیا کہ انہوں نے۔

"اے محتسب نہ پھینک"

ترنم سے پڑھا اور تھوڑی دیر کیلئے غافل ہو گئے۔ مصرع کا باقی حصہ مشاعرے والوں نے دُہرایا ——— کہ

"مرے محتسب نہ پھینک"

اس کے بعد ذرا سے چونکے، اور مصرع ثانی :-

ع ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

اسی والہانہ انداز میں پڑھا اور مشاعرے پہ شراب سی برسا دی، کئی منٹ تک یہی شعر مشاعرے میں گونجتا رہا، بڑے بڑے خشک مولویوں کی زبان سے "ارے ظالم شراب ہے" کی تکرار سُنی گئی۔

ایک بار کوئی صاحب انہیں دلی کے کسی بڑے رئیس کے یہاں لے کر گئے، وہ صاحب بڑے ہی کروفر سے مسند پہ متمکن تھے اور انداز امیرانہ بلکہ متکبرانہ سا تھا، جگرؔ صاحب مرحوم اس تبختر کو بھلا کہاں برداشت کرنے والے تھے، بلیاختہ بولے۔

"میاں چلو! یہ کس مرغِ زریں کے پاس تم مجھے لے آئے"

وہ رئیس اور اُن کے حالی موالی بس دیکھتے ہی رہ گئے اور جگرؔ صاحب یہ جا وہ جا! اُس عالم میں ان کا سمندِ ناز کسی کے روکے رُکتا کب تھا!

حضرت جگرؔ کے دن سیدھے تھے اور اُن کی عاقبت کو بخیر ہونا تھا کہ وہ تو کسی نہ کسی طرح اس غمِ مستی کو تباہ کر اس چکر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گئے، مگر جو کوئی شاعر جگرؔ کی زندگی کے اس دور کی تقلید کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا! کمزوریاں چاہے وہ کتنے ہی بڑے آدمی کی کمزوریاں کیوں نہ ہوں، لائقِ تقلید نہیں بلکہ مستحقِ ترک و گریز ہوتی ہیں۔

۱۹۴۳ء میں بنگلور میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا، اس میں دوسرے شعراء کے علاوہ جگرؔ اور اخترؔ شیرانی مرحوم بھی تھے، یہ شخص شراب نوش نہیں، بلانوش تھا، دن رات یہی شغل! مشاعرے میں اُن کی باری آئی تو نشہ کی تیزی

کے سبب شعر تک ٹھیک سے نہ پڑھے جاتے تھے، اختر شیرانی نے احسان دانش[1] سے اپنے شعر پڑھنے کے لئے کہا وہ انجان ہوگئے، روش صدیقی سے التماس کیا تو انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا، مجھ سے کہا تو میں نے اُن کی کئی غزلیں پوری قوت سے پڑھیں، شاید اپنی غزلیں بھی اس اہتمام سے نہ سُناتا، مشاعرے میں اختر شیرانی کو خاصی داد ملی، مشاعرے کے بعد وہ آبدیدہ ہو کر بولے کہ :-

"جگر خود تو نکل گئے مگر مجھے اس دلدل میں پھنسا گئے"

جگر صاحب کے کانوں تک یہ بات پہونچی تو بولے :-

"وہ خود شراب کا رسیا ہے، میں اسے اس راہ پر کاہے کو ڈالتا"

یہ واقعہ ہے کہ جگر صاحب نے کسی دوسرے کو شراب کا چسکا نہیں لگایا، یہ دوسری بات ہے کہ کسی نے اُن کی دیکھا دیکھی خود ہی اپنے شوق سے شراب شروع کر دی ہو! وہ دوسرے شعراء ہیں جنہوں نے دانستہ نوخیز شاعروں کے کردار کو لگاڑا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو تباہ کیا ہے۔

حضرت جگر نے اپنی رندی و میکشی پر کبھی فخر نہیں کیا بلکہ اس پر ہمیشہ ندامت ہی محسوس کی، اُن کا ضمیر ہر آن چٹکیاں لیتا رہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟؟ انہوں نے اس عادت کو اپنے نفس کی کمزوری ہی سے سدا تعبیر کیا، یہی احساسِ ندامت اُنہیں گھنٹوں رلاتا تھا اور وہ اپنے اللہ سے عفو و مغفرت طلب کرتے تھے، اُنہوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ میں شعر گوئی کو بہت مقدس سمجھتا ہوں، اس لئے پیٔ شراب پی کر کبھی شعر نہیں کہا! یہی احساسِ ندامت تھا، جو انہیں توبہ و انابت تک لے گیا، یہاں تک کہ جس کی جیب میں شراب کی بوتل رہتی تھی، وہ اب نماز پڑھنے کے لئے مُصلّا ساتھ رکھتا تھا، اور میکدوں کے چکر لگانے والے کو طوافِ کعبہ اور زیارتِ روضۂ رسول ؐ کی سعادت نصیب ہوئی۔

میں نے حضرت جگر کی سرشاری کا تھوڑا سا زمانہ دیکھا ہے، میرے اور اُن کے درمیان روابط کا آغاز اُن کی ترکِ مےنوشی کے بعد ہوا ہے، اگر اُن کا خدانخواستہ وہی عالم رہتا تو یہ رفاقت دیر تک نہ چل سکتی، دوستی اور روابط کے لئے طبیعتوں کی مناسبت اور مشرب کی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔

جو کہتا ہے غلط کہتا ہے کہ ترکِ میکشی کے بعد جگر مرحوم کی شاعری میں کیف نہیں رہا۔ خشکی پیدا ہوگئی، جو کوئی بھی جگر کی شاعری کے بارے میں ایسا خیال رکھتا ہے وہ بے ذوق ہے، جگر کی شاعری کا یہی دور تو بہترین دور ہے، پہلے کے مقابلہ میں اُن کی فکر کس قدر نکھر گئی ہے، ان کے کلام میں کس قدر پختگی پیدا ہوگئی ہے کتنے نازک مسائل انہوں نے غزل کی زبان میں ادا کئے ہیں، تغزل کا کتنا رچاؤ ہے، زبان کا کیا چٹخارہ ہے، واردات و محاکات کی کسقدر صحیح عکاسی ہے، جو کوئی جگر کے اس قسم کے شعروں کے سبب :-

~~~ توبہ کو توڑ تاڑ کے لہرا کے پی گیا

جگر سے متاثر ہے، اس نے جگر کو سمجھا ہی نہیں، جگر کی اصل شاعری تو یہ ہے :-

جو کوئی سُن سکے تو نکہتِ گل ؎ شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

---

[1] حافظہ کو اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید کوئی دوسرے صاحب ہوں مگر گمانِ غالب یہی ہے (م - ق)
~~~

جمال اُس کا چھپائے گی کیا بہارِ چمن ؎ گلوں سے دب نہ سکی جس کی بوئے پیراہن

اب لفظ و بیاں سب ختم ہوئے، اب دیدہ و دل کا کام نہیں ؎ اب عشق ہے خود پیغام اپنا، اب عشق کا کچھ پیغام نہیں

یہ میخانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے ؎ یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے
شکستِ دل، شکستِ غم نہیں ہے ؎ مجھے یہ بھی سہارا کم نہیں ہے

تغزل کا یہ وہ کیف ہے، جس پر ہزاروں میخانے بے دریغ قربان کئے جا سکتے ہیں، "شعلۂ طور" کی گرمیٔ جلوہ اپنی جگہ مسلّم مگر آتشِ گل کی دہک نے تو اردو غزل کو نئی زندگی عطا کی ہے! لوگ وہسکی اور شمپین کی مستی سے شاعری کے کیف کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں، اس سے بڑھ کر شاعری کی اور توہین کیا ہو سکتی ہے! شاعری خود اپنی جگہ بوئے گُل بھی ہے اور موجِ صہبا بھی ہے، اسے کسی "مصنوعی مستی" کے سہارے کی کیا ضرورت ہے!

جگرؔ مرحوم سے عقیدت و محبت کے ساتھ، جو بے تکلفی اس نیاز مند کو حاصل تھی، اُس کا دور کے لوگوں کو شاید یقین بھی نہ آئے ——— میں اُن کی شاعری اور ان کی زندگی پر جس آزادی کے ساتھ خود اُنہی کے سامنے جلسی تنقید کرتا رہا ہوں، کسی دوسرے کو اس کی ہمت ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ اُن کی نوازش اور عالی ظرفی تھی کہ میری کسی بات کا وہ بُرا نہیں مانتے تھے، میں بعض وقت اُن پر تنقید کر کے خود سوچتا تھا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا؟ اس بات کو اس طرح کہنا نہیں چاہئے تھا! میرے اور اُن کے درمیان کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی، حضرت جگرؔ حقیقی شاعر، غزل گو کو سمجھتے تھے، وہ شاعری میں تفصیل کے نہیں اجمال و اشاریت کے قائل تھے، نظم کہنے والے کو وہ "ناظم" کہتے تھے، اس موضوع پر میری اُن کی نہ جانے کتنی بار شدید بحثیں ہوئی ہیں، علامہ اقبال کی شاعری بھی بارہا معرضِ بحث میں آئی ہے، اس معاملہ میں اُن کے اور میرے نقطۂ نگاہ میں خاصہ اختلاف تھا لیکن ہماری کوئی بحث ناگواری پر ختم نہیں ہوئی، وہ اپنے موقف پر جمے رہے، میں اپنی بات پر قائم رہا!

میرے سوا حضرت جگرؔ مرحوم کے کسی دوسرے دوست اور شناسا کی کب مجال ہو سکتی تھی کہ وہ اُن کے ہاتھ سے رمی کھیلتے میں تاش کے پتے چھین کر کہے کہ اس خرافات کو اب بند کیجئے، اس پر اُن کی پیشانی پر تھوڑی دیر کیلئے شکنیں تو ضرور اُبھریں مگر ذرا سی دیر میں یہ سطح ہموار ہو گئی، اور وہ مسکرا کر پاس بیٹھنے والوں سے کہنے لگے ——

"ان ماہر صاحب کو ہمارے دوست فانیؔ بدایونی "ماہرو" کہا کرتے تھے، ان کے ناز ہمیں بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں ......"

میں نے اُن کی غزل سُن کر یہ تک کہا ہے کہ فلاں شعر غزل میں نہ رہے تو زیادہ اچھا ہے اس طرح تمام اشعار ہموار ہو جائینگے

اب سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے کہ جگرؔ صاحب اور میں کلکتہ کی سیر کرتے ہوئے کھڑگ پور کے مشاعرے سے واپس ہو رہے تھے، اس زمانہ میں وہ یہ غزل کہہ رہے تھے۔

جہاں سے گزریں گے سرفروشانہ کارنامے سُنا کریں گے

وہ اپنے دل کو ہزار روکیں مری محبت کو کیا کریں گے

اُن کی نئی غزل کا یہ مطلع سُن کر میں نے عرض کیا مصرعہ اولیٰ کو بدلیے، یہ مصرعہ ثانی کے جوڑ کا نہیں ہے، اس پر قدرے طنز آمیز انداز میں فرمایا:۔

"پہلا مصرعہ آپ فرما دیجئے، خدا کی قسم میں قبول کر لوں گا"

میں نے ایک بار ان کا شعر یوں گنگنایا:۔

ترکِ الفت بجا سہی ناصح
اور[1] اُن تک اگر یہ بات گئی

اس پر جگرؔ مرحوم نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا، میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں کیا کروں مجھے دوسرے شاعروں کے بعض اشعار ترقی یافتہ صورت میں یاد رہتے ہیں!

اب سے تقریباً تین سال پہلے کی بات ہے، ملتان کے ایک مشاعرے میں اُن کا ساتھ ہو گیا، صابر صاحب دہلوی کے یہاں قیام تھا، وہاں انہوں نے اپنی تازہ غزل سنائی، جس کے دو تین شعر ملتان ہی میں کہے تھے، میں نے عرض کیا اس غزل کے دو تین شعر کمزور ہیں، یہ نہ رہیں تو اچھا ہے، میری اس مشورت پر چہرے کا رنگ ذرا سا متغیر ہوا، مگر میری بات مان لی، اور وہ شعر قلمزد کر دئیے۔

کراچی ہی میں کسی صاحب کے یہاں دعوت تھی، کھانے کے بعد شعر شاعری ہوئی، حضرت جگرؔ مرحوم نے ایک خاصی طویل غزل سُنائی، میں نے کہا کہ "حضرت! آپ غزل سناتے ہیں، تو اپنی غزل کا ایک شعر بھی نہیں چھوڑتے" جگرؔ مرحوم "اضطراب" کی "ط" اور "التفات" کی "ت" کو فتحہ کے اعلان کیساتھ پڑھا کرتے تھے، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے ٹوکا کہ یا تو "ط" اور "ت" کو بالکسر پڑھنا چاہیئے —— یا پھر اس طرح کہ زیر اور زبر دونوں کا اظہار نہ ہو۔

حضرت جگرؔ مرحوم نے زیارتِ حرمین سے واپس آکر، نہایت اثر انگیز اور پرجوش فارسی نعت کہی، جس کا مطلع ہے

اے از لبِ صادقت شنیدہ ؎ نادیدہ خدا، خدائے دیدہ

اس نعتیہ غزل کا ایک شعر یوں تھا:۔

رحمت بہ اشارۂ تو رقصاں ؎ جنت بہ نگاہت آرمیدہ

میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے پر "رقصاں" ہونا بہت کچھ کھٹکتا ہے، اس سے تو "جُنباں" اچھا ہے، کئی دن کے بعد یہ نعت انہوں نے سُنائی تو "رقصاں" کی جگہ "جوشاں" پڑھا۔

ایک بار مجھ سے بولے، نہ جانے کیوں حرمِ کعبہ میں میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے تھے، میں

---

[1] جگرؔ مرحوم کا مصرعہ ہے ؎ لیکن اُن تک اگر یہ بات گئی

نے برجستہ جواب دیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شیطان کو جس مقام پر نیکی کے جس کام میں اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ بندہ کو خیر و ثواب کا زیادہ سے زیادہ حصہ ملے گا، وہاں اس کا حملہ بھی شدید تر ہوا کرتا ہے۔

حضرت جگر مرحوم کا ایک شعر اُن کی زبان سے سُن کر میں نے کہا کہ مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوا، اس میں کچھ الجھاؤ رہ گیا ہے، اس پر وہ بولے، تو میں کیا،

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے تیری گائے بنائی

جیسے سپاٹ شعر کہا کروں!

ایک دن مجھ سے شکایت کے انداز میں فرمانے لگے کہ دعوتوں کی وہ بھرمار ہے کہ آرام کرنے کو ترس گیا ہوں۔ پھر اُس پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی طبیعت کا بھی عجب رنگ ہے، لوگ نہ ہوں تو آپ کو تنہائی کھلتی ہے، اور عقیدت مندوں کا جمگھٹ ہو تو وہ گراں گزرتا ہے ——!

ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ جنت میں جب ہر طرح کا عیش و آرام ملے گا اور کوئی طلب و جستجو ہی نہ ہوگی تو آدمی بے عمل اور نکما ہو کر رہ جائے گا، میں نے اس کے جواب میں طویل تقریر کر ڈالی، بہت توجہ سے سنتے رہے، میں نے آخر میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی تمنا جنت میں بھی رہے گی اور تسبیح و تہلیل سے جوا ہلِ جنت کی زبانیں تر رہا کریں گی، یہ خود اپنی جگہ ایک "شغل" ہے! پھر دوزخیوں کے عذاب کو دیکھ کر جنت والوں پر حمد و شکر کی جو کیفیت طاری ہوگی، اس کی ہما ہمی اور ولولہ انگیزی کا کیا پوچھنا!

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حضرت جگر مرحوم کو "ڈاکٹریٹ" کا اعزاز ملنے کی خبر جب اخباروں میں چھپی، تو میں نے اُن کو خط لکھا:-

"اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی، مگر میں آپ کو "ڈاکٹر جگر"
لکھ کر، اپنی بدمذاقی کا ثبوت نہیں دوں گا ——"

کھڑک پور کے مشاعرے کا ابھی ابھی ذکر آچکا ہے، اُس کے بعد میں نے جگر صاحب سے کہا کہ یہاں سے کلکتہ بہت قریب ہے، جب یہاں آنا ہوا ہے تو کلکتہ کی بھی سیر کیوں نہ کی جائے، جگر صاحب کئی بار کلکتہ دیکھ چکے تھے مگر صرف میری دلدہی کیلئے تیار ہو گئے، طے یہ پایا کہ کلکتہ میں کسی جاننے والے سے ملیں گے جلیں گے نہیں، اجنبیوں کی طرح کلکتہ کی سیر کریں گے! مدرسہ عالیہ کے قریب ایک گمنام شاعر کے یہاں ٹھیرے اور تین چار دن تک کلکتہ کی سیر کرتے رہے، جس دن وہاں سے روانہ ہو رہے ہیں، اُس دن اتفاق سے راستہ میں حضرت وحشت مرحوم سے ملاقات ہو گئی!

جگر صاحب کو لکھنؤ جانا تھا اور مجھے دہلی، راستہ میں بنارس پڑتا تھا، میں نے جگر صاحب سے عرض کیا کہ ایک دو دن کے لئے بنارس اتروں گا، وہاں کی "صبح" کی بچپن سے تعریف سن رکھی ہے، بولے بنارس میں میرے ایک مخلص دوست ہیں، میں انہیں خط لکھے دیتا ہوں، تم اُن کے یہاں ٹھہرنا وہ تمہیں سیر بھی کرا دیں گے اور اُن کے یہاں

قیام میں تمہیں ہر طرح کا آرام بھی ملے گا ——— میں بنارس میں حضرت جگرؔ کی معیت کا متمنی تھا اللہ تعالیٰ نے ایک بات سُجھا دی، تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے عرض کیا۔

"حضرت! میں اس طرح اجنبی لوگوں کے یہاں تعارفی خطے کر مہمان بننے اور ٹھہرنے کا عادی نہیں ہوں، میں تو وہاں کے کسی ہوٹل میں قیام کروں گا ...... مگر میں نے سُنا ہے کہ بنارس کے ہوٹلوں میں بڑے عیش ہوتے ہیں، مجھ سے کوئی لغزش ہوگئی، تو ....؟"

اس پر جگرؔ صاحب نے اپنے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے قدرے تامل فرمایا اور پھر بولے، اچھا بھئی! میں بھی تمہارے ساتھ بنارس اُتروں گا، مگر تمہیں میرے ساتھ ہی ٹھیرنا ہوگا!

بنارس میں نذیر بنارسی کے بڑے بھائی کے یہاں، جو طبابت کا پیشہ کرتے تھے، ہم نے کئی دن قیام کیا، وہاں دعوتیں بھی رہیں، شعر و سخن کی محفلیں بھی جمیں، کشتی میں سوار ہو کر بنارس کی صبح بھی دیکھی اور شام کا بھی نظارہ کیا،

کراچی میں ایک صاحب کے یہاں کھانے کے بعد شعر خوانی کا سلسلہ شروع ہوا، عورتیں پردے میں بیٹھی تھیں، میں غزل پڑھ چکا، تو میں نے حضرت جگرؔ سے کہا آپ کوئی صوفیانہ قسم کی غزل سُنا دیجئے، اس پر انہوں نے مزاحاً فرمایا:-

"جی نہیں! میں آپ سے کم بدمعاش نہیں ہوں"

میرے یہاں جگرؔ صاحب کے اعزاز میں دعوت تھی، بے تکلف احباب کا جمگھٹا تھا، انہوں نے اپنی تازہ غزل سُنائی، جس کا مطلع ہے:-

آدمی آدمی سے ملتا ہے ؎ دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

جب وہ غزل سنا چکے، تو میں نے کہا کہ اس غزل کا ایک شعر تو چھوٹ ہی گیا، میں نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:-

جو جگرؔ سے کبھی نہیں ملتا
ماہرالقادری سے ملتا ہے

اس پر بڑا قہقہہ پڑا، اور جگرؔ صاحب نے خاص طور سے لُطف لیا، دوسرے دن صبح کو جب میں اُن سے ملنے کے لئے گیا، تو چندے سے پچاس روپیہ نکالے، اور مجھے دینے لگے

"یہ کیا ہے؟ ——— میں نے دریافت کیا

"یہ تمہارے رسالہ "فاران" کا چندہ ہے" ——— بڑی سادگی سے فرمایا،

میں سمجھ گیا کہ رات جو اُن کی دعوت میرے یہاں تھی، اُس کے مصارف کا بار ہلکا کرنے کیلئے یہ مہربانی فرما رہی ہے، میں نے تند لہجہ میں کہا:-

"یہ نوازشیں آپ دوسروں پر ہی کیا کیجئے، میرے اور آپ کے درمیان ایسی باتوں کا ذکر تک نہ آنا چاہیئے، بس ... بس! ان نوٹوں کو آپ اپنے

بٹوے ہی میں رہنے دیجئے"

انہوں نے نوٹ تو بٹوے میں رکھ لیئے مگر شرما سے گئے، ہونٹوں پر مضمحل سی مسکراہٹ اور تیور پر ہلکی سی شکن بھی!

بمبئی میں ایک دن شام کو میں نے کہا کہ فلاں صاحب نے موٹر کار بھیجدی ہے، چلئے میرن ڈرائیو چلیں، اس پر جگر صاحب بولے :۔

"ماہر! تم بڑے مناظر پرست واقع ہوگئے ہو، سیر سپاٹے کا بہت شوق ہے میاں! شاعر تو وہ ہے کہ خود مناظر اُس کا طواف کرنے کے لیئے آتے ہیں، وہ مناظر کے پیچھے نہیں دوڑتا"

اُن کے اس کہنے پر میں اُٹھ بیٹھا اور جاتے ہوئے بولا :۔

"میں تو چلا، آپ شوق سے یہیں رہئے، اب کوئی دم میں مناظر آپ کا طواف کرنے کے لیئے آیا ہی چاہتے ہیں ——"

مجھے جاتا دیکھ کر رُک لیا، خاص انداز میں فرمایا :۔

"میرا یہ مقصد نہیں تھا —— وہ ایک تاثر ہوتا ہے —— زندگی کی نفسیاتی کیفیت ..... (پاس بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے) جی ہاں! یہی کیفیت ..... میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، مگر تم ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو ......"

پھر وہ کپڑے پہن کر تیار ہوگئے اور ہم کار میں بہت دیر تک بمبئی کے ساحل کی سیر کرتے رہے!

ایک بار جگر صاحب سے دلی میں ملاقات ہوگئی، وہ کسی مشاعرے سے آئے تھے، اور محلہ بلیماران میں ٹھہرے ہوئے تھے، اُن کے دو تین عقیدت مند بھی اُن کے ساتھ تھے، وہ پیدل کہیں جا رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی بولے "بھئی! تم خوب مل گئے، تمہارے ساتھ کسی ہوٹل میں ناشتہ کرنے کو جی چاہتا ہے، اس کا بار تمہاری جیب پر پڑے گا" میں نے عرض کیا میں اس خدمت کے لیئے حاضر ہوں! اب انہوں نے یہ کیا کہ جو کوئی جاننے والا راہ میں ملا، اسے اپنے ساتھ لے لیا، یہاں تک کہ ہوٹل پہونچتے پہونچتے ساتھیوں کی یا یوں کہیئے "ناگہانی مہمانوں" کی تعداد دس بارہ کے قریب ہوگئی، ہر آدمی کے اضافہ پر وہ میرے چہرے کی رنگت کو دیکھ دیکھ کر لطف لیتے جا رہے تھے، فراش خانہ کے قریب ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا، اس میں یہ قافلہ داخل ہوا، جس کے امیر حضرت جگر مرادآبادی تھے اور مجھ سے اس کی رسد کی فراہمی کا انتظام متعلق تھا! جگر صاحب نے سب سے پوچھا کہ کیا منگایا جائے؟ اس پر آرڈر دینے شروع ہوئے، بسکٹ چلے آرہے ہیں، شامی کبابوں کی پلیٹ آئی اور ذرا سی دیر میں صاف ہوگئی، کوئی صاحب فیرنی انگلی سے چاٹ رہے ہیں کسی کے ایک ہاتھ میں سنبوسہ ہے اور اس نے دوسرے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑ رکھی ہے، جگر صاحب بار بار مجھے دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ کبھی ہنس بھی دیتے ہیں، آخر میں "بل" آیا، بارہ تیرہ روپے کے قریب! میں نے بل کی رقم چکائی، وہاں سے اُٹھتے ہوئے بولے :۔

"ماہر صاحب! آج آپ کو ستانے کو جی چاہتا تھا، چھیڑ مقصود تھی،

اور اس چھیڑ نے بڑا لطف دیا ...."

میں نے بھی ایک بار جگر صاحب کے ساتھ چھیڑ کی "فاران" کا خاص نمبر نکل رہا تھا، اس کے لئے نظم دینے کا وہ کراچی میں زبانی وعدہ فرما چکے تھے، میں نے گونڈے کے پتے پر انہیں دو تین خط لکھے مگر جواب نہیں آیا، آخر جھنجلا کر میں نے انہیں ایک اور خط لکھا کہ یہاں کراچی میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہو رہا ہے، اتنی رقم آپ کی خدمت میں پیش کی جائے گی، کیا آپ آسکیں گے! میرے اس خط کا جواب انہوں نے بر وقت دیا اس پر میں نے جگر صاحب مرحوم کو لکھا کہ یہاں کوئی مشاعرہ وشاعرہ نہیں ہو رہا ہے آپ کا اس طرح امتحان لینا اور چھیڑ مقصود تھی، مخلص احباب کے خطوں کے جواب دینے میں اب سے تساہل نہ برتا کیجئے!

حضرت جگر وضع کے بہت پابند تھے، جس سے جیسے تعلقات تھے اُن کو اسی طرح نباہتے! کسی دوست کے یہاں بچوں کو انہوں نے ایک بار دس روپیہ دیدئے، تو اب جب بھی اُس دوست کے یہاں جاتے یہ رقم بچوں کو ضرور دیتے! نہ جانے اُن کا کتنا روپیہ اس وضعداری کی نذر ہو جاتا۔

یار لوگ اُن کے بٹوے سے، جیب سے اور صندوق سے روپے چرا لیتے، فاؤنٹن پن غائب کر دیتے، دعوتوں میں بڑے آدمیوں اور افسروں کو بلا کر جگر صاحب کی شخصیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے، اس چیز نے اُن کی طبیعت میں بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا کر دی تھی، اس لئے بعض وقت اُن کی بدگمانی "وہم" بھی ثابت ہو جاتی اور طبیعتوں کو کھٹکتی، مگر آزمائے ہوئے دوستوں اور شناساؤں سے بدگمان نہیں ہوتے تھے،

جگر مرحوم کی ذات اور شخصیت میں بڑی محبوبیت اور دلکشی پائی جاتی تھی، یہی سبب تھا کہ جس شہر میں بھی جاتے لوگ انہیں سچ مچ آنکھوں پہ بٹھاتے اور ان کی قیام گاہ پر میلہ سا لگا رہتا، کراچی میں انہوں نے مہینوں قیام کیا ہے۔ مگر دعوتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، کسی کے یہاں شام کو چائے، کہیں ڈنر، کسی جگہ صبح کا ناشتہ، کسی کے گھر پہ نہاری کی دعوت، کہیں کباب اور پوری کا پروگرام! اُن کی طبیعت کا یہ رنگ تھا کہ ملنے والوں سے اُکتا بھی جاتے اور جب اتفاق سے کوئی ملنے کو نہ آتا اور تنہائی ہوتی تو بھی اُن کا جی گھبراتا! جگر صاحب کے مشتاقانِ دید کے شوقِ دید کا یہ عالم تھا کہ جگر صاحب تاش کھیل رہے ہیں، دو دو گھنٹہ تک کسی آنے جانے والے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، مگر یار لوگ ہیں کہ انہیں گھیرے بیٹھے ہیں، اور اس طرح گھنٹوں بیٹھے رہنے کے بعد بھی نہیں اُکتاتے اور جگر صاحب سے بددل نہیں ہوتے۔

میں نے ایک بار اپنی نظم سنائی جس کا مطلع ہے۔

قصرِ استبداد کی بنیاد ڈھا سکتا ہوں میں
ظلم کے شعلوں کو پھونکوں سے بجھا سکتا ہوں میں

اس پر جگر صاحب مرحوم بولے:-

"یہ "سکتا ہوں میں" کیا بات ہوئی، جب ایسا کر سکتے ہو تو کر کیوں نہیں دیتے، آج کل شاعری میں عجیب رواج چل گیا ہے، کوئی صاحب فرماتے ہیں "...... کر کے چھوڑوں گا" کوئی صاحب کہتے ہیں "...... یہ کر کے رہونگا ——— میں کہتا ہوں کہ

جو تمہارے امکان میں ہے، اُسے کر کیوں نہیں گزرتے :۔"

جناب جوش ملیح آبادی نے ایک محفل میں نظم بڑے طمطراق سے پڑھی، طویل نظم تھی، اور بھاری بھرکم ترکیبیں، محفل ختم ہونے کے بعد جگر صاحب نے فرمایا :۔

"یہ شاعری کیا ہوئی، مگدر ہلانا ہوا"

عورتوں کی شعر گوئی کے مخالف تھے، کہا کرتے تھے کہ "عورت" تو خود شعر کا موضوع ہے، اُس پر شعر کہا جاتا ہے نہ کہ وہ دوسروں پر شعر کہے ......!

اُن کی غزل کا مطلع ہے :۔

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی، کہاں گزرے

کسی مشاعرے یا دعوت میں پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ ہوتیں تو اس شعر میں "زہرہ جبینوں" کی جگہ "ماہ جبینوں" پڑھتے۔

حضرت جگر ذائقہ دار کھانوں کا شوق رکھتے تھے، سُنا ہے کہ اپنے گھر پر خاصے اہتمام سے کھانا کھاتے تھے، مجھ سے بارہا فرمایا کہ کبھی گونڈے آؤ گے تو "ماش کی دال" خاص طور سے تمہیں کھلاؤں گا، مگر اس سعادت کا مجھے موقعہ ہی نہیں مل سکا!

حضرت جگر ایسی دعوتوں میں جا کر خوش نہیں ہوتے تھے جہاں شعر خوانی لازمی ہو کہ اس سے کسی طرح مفر ہی نہ ہو سکے، خاص طور سے ایسی صحبتوں کو وہ بہت زیادہ ناپسند کرتے تھے، جہاں شاعروں کو چائے کی ایک ایک پیالی پلا کر، گھنٹوں اُن کا کلام سُنا جائے! ایک دعوت میں صاحبِ خانہ نے شعر خوانی کا مطالبہ ہی نہیں کیا، اس پر جگر صاحب خوش ہو کر بولے :۔

"آپ (میزبان سے مخاطب ہو کر) بڑے اچھے آدمی ہیں، نہایت اچھے! شاعروں کے صحیح قدر دان ...... آپ نے شعر خوانی کا اپنی طرف سے مطالبہ نہیں کیا، مگر اب ہم اپنی خوشی سے شعر سنائیں گے"

چنانچہ جگر صاحب اور دوسرے شاعروں نے اپنا کلام سُنایا اور جگر صاحب اُس محفل سے خوش ہو کر اُٹھے!

اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا، بڑے قرینہ سے لباس تبدیل کرتے، مگر دو چار گھنٹہ کے بعد لباس ملگجا سا ہو جاتا، یہی میری حالت ہے کہ دوپہر کو بدلے ہوئے کپڑے شام ہوتے ہوتے میلے ہو جاتے ہیں! جگر صاحب کپڑا اور جوتا مول لینے کی بڑی پرکھ رکھتے تھے، موزوں کا خاص طور سے شوق تھا، بعض وقت ایک ایک درجن موزے جمع ہو جاتے! رومالوں کی یہ کثرت کہ ایک ہفتہ میں کئی کئی رومال کھو دیتے،

مجھے سفر میں سب سے زیادہ اُلجھن بستر کھولنے اور باندھنے میں ہوتی ہے، ایک سفر میں جگر صاحب نے دیکھا کہ مجھ سے ٹھیک طرح بستر سنبھل نہیں رہا ہے، وہ مسکرا کر بڑھے اور اپنے ہاتھ سے میرے بستر کو باندھا۔

حضرت جگر کے سہو و نسیان کا یہ منظر بھی بارہا دیکھا ہے کہ کنجیوں کے گچھے کیلئے پریشان ہیں، ڈھونڈ رہے ہیں

جھنجلا رہے ہیں ...... مگر وہ ان کے پاجامہ کے ازار بندہی میں نکل آیا یا تکیہ کے نیچے سے برآمد ہوا۔
شعرخوانی ہو، برج ہو، رمی ہو، شطرنج یا فنگر بلیرڈ ہو، وہ کسی بات میں کسی دوسرے سے پیچھے رہنا گوارا نہ کرتے، ان میں مسابقت کا خاصہ شدید جذبہ پایا جاتا تھا، تاش کھیلنے میں ہارنے لگتے تو جھنجلا جاتے، کسی نے غلط پتا پھینکا اور اس پہ خفا ہونے لگے، تاش کے پتوں کو بار بار شفل (SHUFFLE) کرتے ساتھیوں کی نشستیں بدلواتے اور تاش کے پتے بانٹنے میں ایک آدھ پتا ادھر اُدھر کر دیتے! ہر کھیل بڑے انہماک سے کھیلتے پوری طرح ڈوب کر!
پچھلے شاعروں میں سنا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی قدرے لحن سے شعر پڑھتے تھے، ڈاکٹر اقبال جب اپنی نظمیں حمایت الاسلام کے جلسوں میں سنایا کرتے تھے، تو اُن کی شعرخوانی بھی نیم مترنم ہوتی تھی، اردو شاعری میں بھرپور ترنم کا آغاز غالباً سائل دہلوی سے ہوا ہے مگر حضرت جگر کے ترنم نے تو شعرخوانی کی "دنیا ہی بدل دی" اُن کی آواز میں کس قدر رس اور اُن کے گلے میں کتنا نور تھا، اُن کی شعرخوانی کی یہ خصوصیت تھی کہ ترنم اور موسیقی کے فرق کو باقی رکھا اور شعر پڑھنے کو "گانا" نہیں بننے دیا، شعر پڑھنے میں کہیں کہیں ایسا کھٹکا بھی لگا دیتے کہ سننے والے دل پکڑ کر رہ جاتے، وہ شاعر نہ ہوتے تو اسحٰق موصلی کی طرح بہت بڑے موسیقار اور نغمہ ساز ہوتے۔

تیرا تصور شب ــــ ہمہ شب

اپنی اس غزل کو جگر صاحب جب پڑھتے تو "شب" کے "ش" اور "ب" کے درمیان لہجہ کو نیم افقی اور نیم عمودی بنا دیتے۔ جس سے نغمگی کا حسن دوبالا ہو جاتا! پاکستان اور ہندوستان کے نوے فیصدی شعراء ترنم میں جگر کی تقلید کرتے ہیں، اسی لئے جگر صاحب دھنیں بدلتے رہتے تھے، مگر بعض غزلیں وہ دوسروں کی دھنوں میں بھی کچھ دن سے پڑھنے لگے تھے ــــ مثلاً وہ اپنی یہ غزل ــــ

مگر بننا ہے اب خنجر بکف، ساغر شکن ساقی

اپنی نکالی ہوئی دھن میں نہیں پڑھتے تھے ــــ
جگر صاحب ناک نقشہ اور رنگ کے اعتبار سے خوب صورت کیا قبول صورت بھی نہیں تھے، مگر شعر پڑھتے میں حسین نظر آتے، ہائے! شعریت و نغمگی کا یہ حسین امتزاج اب کہاں دیکھنے میں آئے گا۔
حضرت جگر کو جو قبول عام، شہرت، محبوبیت اور عام پسندیدگی حاصل تھی، اس کی مثال دنیائے شاعری میں بہت کم ملے گی، طوائفوں کے بالاخانوں اور رائیگرٹیسوں کے شبستانوں سے لے کر قصر و ایوان اور مدرسہ و خانقاہ تک اُن کے کلام کی دھوم مچی ہوئی ہے، اُن کی شاعری ہر طبقہ میں پسند کی جاتی ہے! اُن کے شعروں کو لوگ تبرک کی طرح ایک دوسرے کے پاس لے جاتے ہیں!
اُن کی غزلوں کا یہ عالم رہا ہے کہ :-

جواب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
تو پھر ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا

سال دو سال ہندوستان میں گونجتی رہی، اور اس پر سینکڑوں غزلیں کہی گئیں اس کے بعد :-

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی

ہر نقش ماسوا کا مٹاتی چلی گئی

اس غزل نے دھوم مچا دی اور اس پر سینکڑوں شاعروں نے طبع آزمائی کی، اس طرح اُن کی ایک ایک غزل شہر شہر اور قصبہ قصبہ مہینوں موضوعِ گفتگو اور عنوانِ لطف و کیف بنی رہی ہے۔

میں نے بڑے درجہ کے قومی لیڈروں، صوفیوں، عالموں، گورنروں، وزیروں، ہائی کورٹ کے ججوں، نوابوں، رئیسوں اور اعلیٰ عہدیداروں کو جگر صاحب مرحوم سے عقیدت کیساتھ پیش آتے دیکھا ہے، مشاعروں کی تو وہ جان اور رونق و آبرو تھے' تین سال ہوئے جب وہ کوئٹہ کے مشاعرے سے کراچی واپس ہو رہے تھے، تو نہ جانے ریلوے جنکشنوں پر اُن کے وہاں سے گزرنے کی کیسے خبر پہونچ گئی کہ اُن کے دیکھنے کے لئے لوگوں کا خاصہ جمگھٹا ہو گیا۔

اُن کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بمبئی کے ایک بہت بڑے ودوان سادھو اور مہنت (غالباً دکشت جی نام تھا) نے، حضرت جگر مرحوم کو اپنی پاٹھ شالہ میں بلایا، اور اُن کی خدمت میں "مان پتر" (سپاسنامہ) اور کیسہ زر پیش کیا۔

خواجہ ناظم الدین صاحب جن دنوں پاکستان کے گورنر جنرل تھے، تو گورنر جنرل ہاؤس میں دوبار محفلِ مشاعرہ حضرت جگر کے اعزاز میں منعقد ہوئی، گورنر جنرل سے لیکر وزیروں، سکریٹریوں اور دوسرے اعلیٰ عہدیداروں تک، سب کے سب جگر ہی کی طرف کھنچے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب کی تمنا تھی کہ جگر صاحب پاکستان میں مستقل طور پر اقامت اختیار کریں، ایک ہزار روپیہ ماہوار کی آمدنی اور ساز و سامان سے لیس مکان (Furnished House) کی پیشکش بھی کی گئی مگر حضرتِ جگر ترکِ وطن کیلئے آمادہ نہیں ہوئے، لیکن ساتھ ہی ارضِ پاک سے اُن کی دلچسپی کا یہ عالم بھی تھا کہ آٹھ آٹھ مہینے مسلسل یہاں قیام کیا ہے۔

بمبئی میں فلم کمپنی کے ایک ڈائرکٹر نے جگر صاحب سے فلمی گانے لکھنے کیلئے بہت اصرار کیا تو نیم راضی ہو گئے، اس نے پانچ ہزار روپیہ بھی پیشگی دیدئے، جگر مرحوم اور میں رام پور نمائش کے مشاعرے سے فارغ ہو کر رانی پور جا رہے تھے، مراد آباد میں رام گنگا کے پل پر بس جو ٹھیری، تو ہم دونوں بس سے نیچے اتر گئے، مجھ سے بولے میں فلمی گانوں کے لئے پیشگی رقم لے چکا ہوں، تمہاری کیا رائے ہے! میں نے عرض کیا کہ میرے خیالات سے تو آپ واقف ہیں کہ ہر قسم کے عیش و تفریح اور مالی منفعت کے باوجود فلمی ماحول سے بھاگ کھڑا ہوا، بولے میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میں غلاظت کرید رہا ہوں' اس طرح مجھے تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ میں اس کام میں ہاتھ نہ ڈالوں، پھر انہوں نے بمبئی جا کر پانچ ہزار کی رقم واپس کر دی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس ردِ منکر کا یہ بدلہ دیا کہ نواب معظم جاہ بہادر کے مجموعۂ کلام پر نظر ثانی کا اُنہیں بمبئی ہی میں خاصہ معقول معاوضہ مل گیا۔

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم خود شاعر تھے، فلسفی تھے، اچھی خاصی علمی شہرت رکھتے تھے، علامہ اقبال کی ہم نشینی کا بھی اُنہیں شرف حاصل تھا، اس لئے شاعروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ایک بار انہوں نے اپنی تقریر میں شاعروں پر طنز کی۔ دورانِ تقریر میں اُن کی نظر جگر صاحب پر پڑ گئی تو چونک کر بولے :-

"میں مشاعرہ باز شاعروں کا ذکر کر رہا تھا، جگر صاحب تو ایسے شاعر ہیں کہ جو بات کئی کئی صفحوں میں کہی جاتی ہے، اُسے یہ ایک مصرعہ میں کہہ دیتے ہیں"

انجمن ترقی اردو پاکستان کے ایک مشاعرے میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا۔

"یہ مشاعرہ جگر صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ ہر مشاعرہ جگر صاحب ہی کا مشاعرہ ہوتا ہے، میں جب دلی میں تھا تو جگر صاحب انجمن کے دفتر میں تشریف لاتے، ادھر اُدھر دیکھتے اور چپکے سے ایک رقم انجمن کیلئے مجھے دے دیتے۔"

اتنی بڑی شخصیت اور اس شہرت کے باوجود مشاعرے میں کسی خوش الحان شاعر کو داد مل جاتی، تو جگر صاحب اُس شاعر سے متاثر بھی ہو جاتے ایک بار کراچی کے مشاعرے میں ایک شاعر کو بہت داد ملی، جگر صاحب نے دوسرے دن اُن شاعر صاحب کی تعریف کی اور ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا، میں نے کہا۔

"جگر صاحب! آپ بھی مشاعرے کی داد کا اثر قبول فرماتے ہیں، اسی شاعر نے یہی غزلیں علی پور کے مشاعرے میں سُنائی تھیں،" وہاں اس کو داد نہیں ملی، تو آپ نے ان غزلوں کا ذرہ برابر نوٹس تک نہیں لیا، پھر یہی شاعر صاحب گھنٹوں آپ کے پاس بیٹھے رہے مگر آپ نے کوئی توجہ نہیں فرمائی...."

اس پر جگر صاحب نیم فلسفیانہ انداز میں دو تین جملے فرما کر، آئے ہوئے لوگوں سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

مجھ ناچیز کیساتھ اُن کی محبت و شفقت کا یہ معاملہ رہا ہے کہ میں اُن سے ملنے کے لئے پہونچا، خوش ہو کر مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔

"بھئی خوب وقت پر آئے، ہاں! آج شب میں ایک نہایت اچھے شخص کے یہاں دعوت ہے (دعوتوں کے آپ بادشاہ نہیں شہنشاہ ہیں، روز ہی آپ کی دعوت رہتی ہے ــــــ میں بیچ میں بول پڑا) میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو بھی اس میں چلنا ہوگا (دیکھئے جگر صاحب میں اس دعوت میں ہرگز نہیں جاؤں گا، آپ نے اُن سے میرے لئے کہا ہوگا، وہ خود میرے پاس کیوں نہیں آئے ــــــ میں نے جواب میں کہا) میں بھلا تمہاری ذرا سی بھی سُبکی گوارا کر سکتا ہوں، ایک چیز ہوتی ہے اخلاص، دلی تعلق، شرافت و مروت کا احساس، وہاں چند دوست ہوں گے، مخلص اور بے تکلف ......"

بہرحال اُن کے اصرار کرنے پر میں نے دعوت میں چلنے کی حامی بھر لی، اور اُن کو اور زیادہ شگفتہ بنانے کے لئے مزاحاً اُن سے پوچھا۔

"یہ تو فرمائیے، کچھ جلوے بھی ہوں گے، وہاں......"

اس پر جگر صاحب پاس بیٹھے ہوؤں کی طرف مخاطب ہو کر بولے:۔

"ان مولنا ماہر کی قدامت مصنوعی ہے، اصل مزاج رنگین اور رندانہ ہے"

کراچی کے بعض مشاعروں میں لوگ اُن کو دعوت دینے کے لئے گئے، تو سب سے پہلے یہ دریافت کیا۔ کہ

"کیا ماہر ...... بھی اس مشاعرے میں شریک ہو رہے ہیں"
میری شرکت کا حال سن کر وہ نیم راضی تو اُسی وقت ہو گئے!
ایک بار غریب خانہ پر دن کے ایک بجے سے رات کے نو بجے تک رہے، دوپہر کا کھانا، اُن کی فرمائش کے مطابق بالکل سادہ تھا، شب میں چند احباب کی دعوت تھی، ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں میرے ساتھ پڑھیں شب میں بولے ——

"آج کا دن بہت ہی خوب گزرا"

سفر میں مصلّا جگر مرحوم کیساتھ رہتا تھا، جب بھی اللہ تعالیٰ توفیق دیتا نماز پڑھتے تو بڑی توجہ اور یکسوئی کیساتھ پڑھتے، رکوع و سجود اور قعود و قیام میں خشیت جھلکتی ہوئی!
حضرت جگر (اعلی اللہ مقامہ) شروع شروع میں شیعہ تھے، پھر اپنی ذاتی تحقیق سے اس مسلک کو ترک کیا، اپنے اس چھوڑے ہوئے مسلک سے بیزاری میں وہ بہت شدید تھے!
شخصیتوں کے بارے میں، حضرت جگر مرحوم اور میرے درمیان اکثر اتفاق رائے، اتحاد خیال بلکہ یوں کہیے "توارد" ہو جاتا، اب سے چند سال قبل میں نے فاران میں جو مضمون (پردہ اٹھتا ہے) لکھا تھا، اُسے بہت زیادہ پسند کیا اور بہت سوں کو پڑھنے کے لئے دیا، زمانہ ساز صوفیوں اور پیروں سے وہ سخت بیزار تھے، حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے علمائے حق سے جگر صاحب کو بڑی عقیدت تھی، آپ کی فارسی غزل پر، جس کا مطلع ہے:-

به سر تو ساقی مست من، به سرور بے طلبی خوشم
اگرم شراب نمی دہی به خمار تشنہ لبی خوشم

مولانا تھانوی نے ایک یا دو شعر کہہ دئے تھے، اس کا اظہار بڑے فخر و مسرت کیساتھ کیا کرتے تھے۔
لاہور میں جگر مرحوم کا قیام تھا، میں بھی کسی مشاعرے سے ہوتا ہوا اُدھر آ نکلا، مجھ سے بولے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملنا چاہتا ہوں! میں نے کہا، مولانا موصوف سے ملاقات بڑی آسانی سے ہو سکتی ہے، میں ٹیلیفون کر کے اُن سے وقت لئے لیتا ہوں، دن اور وقت مقرر ہوا، جگر صاحب اور میں مولانا کی قیام گاہ پر پہونچے، آدھ گھنٹہ تک ملاقات رہی، چائے کا دور بھی چلا، جگر مرحوم مولانا کی متانت و سنجیدگی اور عالمانہ وقار سے خاصے متاثر ہوئے۔

مجھ سے آخری ملاقات بمبئی کے "جشن میر تقی میر" کے مشاعرے میں ہوئی تھی، بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملے، نخشب صاحب جارچوی اس جشن کے بانی تھے، انہی نے سمندر کے کنارے جُوہو کے ایک شاندار بنگلہ میں رہنے کا انتظام کیا تھا، ایک شب وہاں گزاری، یہ رات بہت دنوں تک یاد رہے گی، پھر ایک ایسی رات بھی دیکھی کہ خلافت ہاؤس کے ڈنر کے بعد موسیقی کی ایک محفل میں جگر مرحوم پر دل کا دورہ پڑا، اور حالت بہت زیادہ غیر ہو گئی، اُن کی ناسازیٔ طبع کے سبب ساری محفل ہی درہم برہم ہو گئی برف کی مانند سرد بدن سے بے تحاشا پسینہ چھوٹ رہا تھا، ڈاکٹر آئے، انجکشن لگے، دوا پلائی گئی، تب جا کر انہیں افاقہ ہوا، تیسرے دن طبیعت سنبھل چکی تھی، مجھ سے بولے، دو چار دن کے لئے بمبئی رُک جاؤ، جُوہو کے اُسی بنگلہ میں جا کر رہیں گے، یہ شام کا وقت تھا دفاتر بند ہو چکے تھے

میرے ویزا کی میعاد میں صرف ایک دن رہ گیا تھا، دوسرے دن گیارہ بجے ہوائی جہاز سے میری روانگی تھی، صبح سویرے میری قیام گاہ پر اپنا آدمی دوڑایا اور پیغام بھجوایا کہ جس طرح ہو سکے تم ضرور رک جاؤ! مگر ویزا میں توسیع کا اتنے تنگ وقت میں انتظام ممکن ہی نہ تھا، میں تلملاتا ہوا بمبئی سے روانہ ہو گیا۔

حضرت جگر مرحوم نے "آتش گل" (ہندوستانی ایڈیشن) کا انتساب اپنے جن چند بزرگوں اور مخلص دوستوں کے نام کیا ہے، اُن میں ایک نام اس نیازمند کا بھی ہے، یہ کتاب گونڈہ سے بھجوائی، اپنے قلم خاص سے یہ عبارت لکھی۔

"ہدیہ مخلصانہ، اپنے دیرینہ عزیز و مخلص دوست
الحاج..... ماہر القادری صاحب کے لئے"

جگر مراد آبادی، گونڈہ، ۱۶ مارچ ۱۹۵۹ء

پھر کتاب کی پُشت پر انگریزی میں تحریر فرمایا:۔

Presented to
Mahirul Qadri Saheb
By
Jigar Moradabadi 15-3-59.

بیماری کے زمانہ میں کئی خط مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجے، افسوس ہے کہ مجھ کم بخت نے جگر صاحب ہی کے نہیں دوسرے اکابر اور مشاہیر کے خط بھی ضائع کر دئے، مجھے اپنی طبیعت کے اس لاابالی پن پر بعض وقت خود غصہ آتا ہے! جب لکھنے کی سکت نہ رہی تو یہ کرتے کہ خط تو دوسروں سے لکھواتے اور آخر میں دستخط ثبت فرما دیتے! جب حالت اور زیادہ غیر ہو گئی تو اُن کے بعض احباب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے "خیریت نامے" آنے لگے، حضرت جگر مرحوم کے عزیز ترین دوست جناب تسکین قریشی، میرٹھ سے اُن کی بیماری کی کیفیت لکھ کر بھیجتے رہتے!

جگر مرحوم کو شہرت، قبول عام اور عزت و اکرام کی تمام بلندیاں میسّر تھیں، مالی طور پر بھی اُن کو کوئی فکر نہ تھی، مگر اک اندرونی خلش تھی جو اُنہیں بے چین رکھتی تھی اور ایک ذہنی اضطراب تھا جو اُن کی آسودگی کا حریف تھا، ان کا یہ شعر:۔

صد آرزوئے خوشگوار و سر گراں لئے ہوئے
پھرا کرے گی زندگی کہاں کہاں لئے ہوئے

اُن کے حالات کی تھوڑی بہت ترجمانی کرتا تھا؟

خانگی زندگی کی اُلجھنوں سے دور رہ کر، اگر وہ کسی دوسرے مقام پر رہتے تو کیا عجب تھا، دو چار برس اور

ے حضرت جگر مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ، پختہ، دلکش اور جاذب نظر تھا، قلم ہاتھ میں ہوتا تو کاغذ پر پھول پتیاں بنا کر ذرا سی دیر میں ایک مرقع تیار کر دیتے۔

کھینچ جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے جس جان کے لئے جو آخری ساعت مقرر فرما دی ہے، وہ بال برابر بھی ادھر سے اُدھر نہیں ہو سکتی، آخر کار وہ اپنے لاکھوں عقیدت مندوں اور چاہنے والوں کو غمزدہ اور سوگوار چھوڑ کر دُنیا سے چل بسے، اُن کی موت کا کسے پُرسا دیجئے کہ ہم خود اپنے کو پُرسے کا مستحق سمجھتے ہیں!

جگرؔ کی موت پر پاکستان اور ہندوستان میں جو کہرام برپا ہوا ہے، اُس کی نظیر کسی ادیب و شاعر کے سانحہ رحلت میں نہیں ملتی، چند دن کے اندر سینکڑوں نظمیں اور مضامین ان پر لکھے جا چکے ہیں اور شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں اُن کے لئے تعزیتی جلسے منعقد ہوئے ہیں، ان کے احباب کا یہ عالم ہے کہ جناب فضل کریم فضلی جو اپنے چھوٹے بھائی کی موت کے غم کو سہار گئے تھے، حضرت جگرؔ کے تعزیتی جلسوں میں ہونٹوں کو دانتوں سے دبانے پر بھی آنسوؤں کو نہ روک سکے۔

جس نے لاکھوں دلوں میں جگرؔ کی محبت ڈال دی ہے، اُسی کی رحمت۔ مرنے والے کو اپنی آغوش میں لے کر قبر سے لیکر یوم الحساب تک کی ہر منزل کو آسان بنا دے گی! (آمین)

؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

روحِ انتخاب

ابوالدرداءؓ نے ایک بار لقمانؑ کے حالات و فضائل بیان کرتے کرتے کہا ——— "اُن میں جتنی خوبیاں تھیں، وہ اُن کو گھر والوں سے ملی تھیں، نہ حسب نسب سے، بلکہ وہ ایک شمشیر بُرّاں، دُھن کے پورے، خاموش، ہر امر میں غور و فکر کرنے والے اور گہری نظر ڈالنے والے بزرگ تھے!

اُن کی شادی بھی ہوئی تھی، اور ایک صاحبزادے تھے جن کا نام "ثاران" تھا، ایک اور بیٹا بھی ہوا تھا، جو اُن کے سامنے دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ اپنے عہد کے امراء و سلاطین کے درباروں میں بھی وہ کبھی کبھی جایا کرتے تھے، مگر وہاں بھی کوئی غرض لے کے نہیں گئے بلکہ صرف عبرت حاصل کرنے کے لئے اور حکمت و دانائی کی تلاش میں جایا کرتے تھے۔

اپنے فرزند کو مخاطب کر کے (لقمان) فرماتے ہیں:۔

"بیٹا جب کسی کی صحبت میں جاؤ تو سلام کر کے بیٹھ جاؤ، اگر وہ خدا کے ذکر میں مشغول ہوں تو ٹھیرو، اور اگر کسی اور کے ذکر میں مصروف ہوں تو اُن کی صحبت چھوڑ دو اور دامن جھاڑ کے اُٹھ کھڑے ہو، بیٹا! بُرے لوگوں سے پناہ مانگتے رہو، اور جو اچھے ہیں، اُن سے بھی ڈرتے رہو، دُنیا میں نہ پھنسو، اور اپنے دل کو اُس میں نہ لگاؤ، کیوں کہ تم دُنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہو، اور خدا کی ساری مخلوق میں اُس کے نزدیک اس دُنیا سے زیادہ ذلیل کوئی چیز نہیں ہے!

بیٹا! کسی بات پر جب تک مجبور نہ ہو جاؤ نہ ہنسو نہ بے مطلب کسی طرف قدم اُٹھاؤ، اور نہ اُس بات کو پوچھو جس سے تمہیں واسطہ نہیں، اپنا مال ضائع نہ کرو، اور دوسرے کے مال کی اصلاح نہ کرو، تمہارا مال وہ ہے جو تم نے خدا کی راہ میں دیا، اور دوسرے کا وہ ہے جسے تم نے اوروں کے لئے چھوڑ دیا، بیٹا! جو کوئی اوروں پر رحم کرتا ہے، خود اُس پر بھی رحم کیا جاتا ہے، جو خاموش رہتا ہے، امن میں رہتا ہے، جو اچھی بات کہتا ہے، اُس سے فائدہ اُٹھاتا ہے، جو جھوٹ بولتا ہے، گنہگار ہوتا ہے، اور جو زبان قابو میں نہیں رکھتا، ندامت اُٹھاتا ہے بیٹا! علماء کی صحبت میں گھٹنوں کے بل جاؤ، اور اُن کے سامنے خاموش بیٹھ کے کان لگاؤ، اس لئے کہ علماء کے نور سے دل اُسی طرح زندہ ہو جاتا ہے، جس طرح کہ مردہ زمین آسمان کے مینہ سے زندہ ہو جاتی ہے۔

نحو و صرف یعنی قواعدِ زبان کے منضبط کرنے کا خیال ابوالاسود کو اس سے پیشتر اور حضرت علیؓ کی زندگی میں آیا تھا، مگر اس خیال کا ظہور بھی زیاد ہی کے زمانہ میں ہوا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک دن گھر میں آئے تو بیٹی نے کہا "یا ابۃ ما اشدُّ الحرُّ" بولے "فلاں مہینے میں سخت گرمی ہوتی ہے"۔ اُس نے کہا ابا جان! میں نہیں پوچھتی کہ کب سخت گرمی ہوتی ہے، بلکہ تعجب سے کہتی ہوں کہ "کیسی سخت گرمی ہے" اس موقعہ پر "ما اشدَّ الحرَّ" کہنا چاہیے تھا۔ دال کو زبر اور "رے" کو زیر دینے سے وہی مطلب ہو گیا، جو ابوالاسود سمجھتے تھے، بیٹی کی اس غلطی سے ایسے پریشان ہوئے کہ سیدھے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا امیر المومنین! عجمیوں کے خلط ملط سے زبان بگڑی جاتی ہے، چند روز یہی حالت رہی تو ہماری زبان تشریف لے جائے گی" حضرت علیؓ نے اس خیال کے آنے کا

باعث پوچھا تو اپنی بیٹی کا واقعہ بیان کر دیا، آپ نے کہا "اچھا تھوڑا کاغذ لے آؤ" ابوالاسود ایک درہم کا کاغذ لے کر حاضر ہوئے تو حضرت علی رضؓ نے فرمایا لکھو اور نحو کا پہلا قاعدہ بتایا کہ "سارا کلام اس سے خالی نہیں کہ یا تو اسم ہوگا، یا فعل حرف" اس کے سوا اور کسی قاعدے کا بتانا حضرت علی رضؓ سے مروی نہیں ہے، لیکن ابوالاسود کو اقرار ہے کہ اصول نحو اور ضروری اُمہات قواعد مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتائے تھے۔

(مضامین عبدالحلیم شرر)
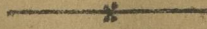
عاصی کرنالی ایم۔ اے

جگر مرحوم

چشم را از شورشِ غم ہمچو قلزم کردہ ایم
ما دل از کف دادہ ایم و ما جگر گم کردہ ایم

ما و یادِ رفتگاں و گریہ ہای پی بہ پی
جان و دل را خالی از ذوقِ تبسم کردہ ایم

شعلہ از آہی بہ دامانِ فلک پیچیدہ است
برہم از غوغا بساطِ ماہ و انجم کردہ ایم

میکدہ برباد بہ ای دل! چو آں ساقی نماند
حشر برپا از شکستِ ساغر و خم کردہ ایم

تیرِ غم از دل گذشت و زندہ ایم ایں حیرت است
بر تو ای جانِ حزیں گویا ترحّم کردہ ایم

آسماں گرد د بسی ہمثلش نخواہد شد کسی
آں بشر، آں شاعر، آں صاحب نظر گم کردہ ایم

چوں جگر رفت از جہاں، از غیب بشنیدم صدا
بعد ازیں نطقِ غزل را بی تکلم کردہ ایم

نفیرِ غم

۱۳۸۰ھ

بروفات شکر مقال — شیریں کلام نازک خیال
۱۳۸۰ھ — ۱۳۸۰ھ

بے مثال شاعر صاحب فہم
۱۳۸۰ھ

جناب حاجی علی سکندر صاحب المقصو جگر مرادآبادی
۱۳۸۰ھ

بہرِ تاریخ رحلتش ہاتف
گفت۔ جنت نشیں جگر مرحوم
۱۳۸۰

از:۔ فکر حقیر تمنا بجنوری ۱۳۸۰ھ

جگر کی موت

وہی چمن ہے جسے نکہتِ چمن نہ رہی
ادب وہی ہے مگر حیف روحِ فن نہ رہی

"جگر" کی موت ہے فکر و نظر کی موت کہ اب
عروجِ فن نہ رہا عظمتِ سخن نہ رہی

جگر کے بعد

رُخِ عروسِ سخن کا نکھارنے والا
نقوشِ عظمتِ فن کا ابھارنے والا

یہ الجھنیں ہیں کہ اب کون ہے جگر کے بعد
ادب کی زلفِ پریشاں سنوارنے والا

فردوسِ تغزل

عروج زیدی

قیدِ ایماں ہے نہ اس میں کافری کی شرط ہے
ان کی قربت کے لئے خود رفتگی کی شرط ہے

شیوۂ لطف و کرم بھی منصفی کی شرط ہے
بندہ پرور ہو تو بندہ پروری کی شرط ہے

جوہرِ ذاتی نہ ہو تو کیا جلا، کیسی نمود
پھول بننے کے لئے نورس کلی کی شرط ہے

حسنِ بے پروا کی پھر شانِ توجہ دیکھنا
شرط ہے تو بس شکستہ خاطری کی شرط ہے

ہر قدم پر ہم سجا سکتے ہیں دامانِ نظر
اس تماشا گاہ میں دیدہ وری کی شرط ہے

یہ سوال اکثر اٹھا ہے جستجوئے دوست میں
آگہی کی شرط ہے یا بے خودی کی شرط ہے

خلعتِ ناموس کو ہونا ہے اک دن تار تار
عشق کہتا ہے یہاں جامہ دری کی شرط ہے

مہر و مہ کی تابشیں کرتی تھیں جن کا احترام
ان چراغوں کے لئے اب روشنی کی شرط ہے

رہبرو! تم راستہ میں بے تکلف لوٹ لو
ہم سمجھ لیں گے کہ یہ بھی رہبری کی شرط ہے

مائلِ قدرِ وفا ہونا ہے ان کو اے عروج
اور اس دعوے پہ میری زندگی کی شرط ہے

شفقت کاظمی

مجھ پر یہ کرم یہ مہربانی		شاداب رہے تری جوانی
کہدی بزبانِ بے زبانی		ہر چند طویل تھی کہانی
آئی تھی بصد خروش لیکن		راس نہ آسکی ہمیں جوانی
ناکام چلے ترے مسافر		فریاد ہے اے سرائے فانی
افسانہ مرے خلوص کا تھا		کچھ اور نہ تھی مری کہانی
محروم سہی ترے کرم سے		کٹ جائیگی یوں بھی زندگانی
پردیس میں جا بسے ہو یارو		کیا تم نے یہ اپنے جی میں ٹھانی

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں
شفقتؔ یہ ہوئے شادمانی

عیش ٹونکی

جفائیں کر کے یہ احساں جتائے جاتے ہیں۔
تمہیں وفا کے سلیقے سکھائے جاتے ہیں

معاملاتِ محبت ہیں کتنے پیچیدہ
وہ مطمئن ہیں مگر آزمائے جاتے ہیں

غرورِ حسن کرے بڑھ کے احترامِ نظر
کہیں ہر اک کو یہ جلوے دکھائے جاتے ہیں

یہ اہتمامِ بہاراں جنوں نواز بھی ہے
چمن میں روز نئے گل کھلائے جاتے ہیں

زہے یہ سلسلۂ انتقامِ اہلِ وفا
ستم کے بعد کرم سے مٹائے جاتے ہیں

ہمیں خدا کا بھروسہ ہے ناخدا کا نہیں
سفینے کس لئے ساحل پہ لائے جاتے ہیں

وہی مذاقِ محبت سے باخبر ہیں عیشؔ
ہر ایک حال میں جو مسکرائے جاتے ہیں

صدا لکھنوی

پھر اُسی شعلہ خو کی چاہت ہے
آگ سے کھیلنے کی حسرت ہے
وائے غفلت یقیں نہیں آتا
موت حالانکہ اک حقیقت ہے
ان کو بادِ خزاں بچائے ہوئے
جن گلوں سے چمن کی زینت ہے

محسن انصاری

نہ ننگ و نام کی پروا نہ اپنی وضع کا ہوش
دیارِ دوست میں دیوانہ وار آئے ہیں
سوائے دیدہ و دل کچھ بھی اپنے پاس نہیں
یہ نذر لائے ہیں اور شرمسار آئے ہیں

ماہر القادری

دل تو جائے کسی عنواں ہی سہی
عبرتِ شہرِ خموشاں ہی سہی
خانقاہوں میں تو سناٹا ہے
صحبتِ بادہ گساراں ہی سہی
اب میں ہر شے کی طلب چھوڑ چکا
تیرے ملنے کا وہ امکاں ہی سہی
عشق کو پست نہ ہونے دیں گے
وصل اس درد کا درماں ہی سہی
دلِ وحشی کے بہلنے کے لئے
منظرِ چاکِ گریباں ہی سہی
اک عجب طرح کی بے چینی ہے
نام اس کا غمِ جاناں ہی سہی
کہیں دوری کی خلش جاتی ہے
چاہے وہ قربِ رگِ جاں ہی سہی
عشق کو لوگ ہوس کہتے ہیں
زہد پر تہمتِ عصیاں ہی سہی
خونِ دل اور ٹپک مژگاں سے
آج گل کاریٔ داماں ہی سہی
شبِ وعدہ کوئی آیا تو ضرور
تم نہیں گردشِ دوراں ہی سہی
زندگی کا کوئی عنوان تو ہو
آپ کے وعدہ و پیماں ہی سہی
وہ تو آرام سے ہیں اے ماہرؔ
میرا کیا ہے میں پریشاں ہی سہی

نخشب جارچوی

ایک رشتہ کسی عنواں ہی سہی
میرا ہاتھ ان کا گریباں ہی سہی

سید احمد میرٹھی

آپ کا قول ہمارا ایماں
آپ غارت گرِ ایماں ہی سہی

حبیب جالب

مجھ کو نظروں سے گرانے والے
ڈھونڈ اب ناز اٹھانے والے

نظر حیدرآبادی

بدلی جو چشمِ ساقی پیمانہ چھوڑ آیا
کس تشنگی میں کیسا میخانہ چھوڑ آیا

ہم نفسانِ رفتہ از :- رشید احمد صدیقی، ضخامت ۱۷۱ صفحات، قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ :-
دار المصنفین اعظم گڑھ (انڈیا)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نام ہی خود اپنی جگہ تعارف ہے، اُن کی تحریروں نے اُردو زبان و ادب کے سرمایہ میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے! اس کتاب میں وفات پائی ہوئی سات شخصیتوں پر مضامین ہیں، جن میں شفیق الرحمٰن قدوائی، مولانا سید سلیمان ندوی، افضل العلماء، ڈاکٹر عبدالحق، نواب محمد اسمٰعیل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک چپراسی کُندن بھی شامل ہے، یہ مضامین زبان، ادب، طرزِ نگارش اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کردار نگاری کے اعتبار سے دلچسپ ہیں، بلند ہیں اور پُر تاثیر ہیں۔

شفیق الرحمٰن قدوائی کی زندگی آخر میں جا کر کتنی اچھی ہو گئی تھی، اس پر ایک ہی جملہ میں کس قدر بھر پور تبصرہ فرمایا ہے :-

"آخر آخر میں تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے شفیق صاحب کے نفس نے شفیق صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہو ——"

اقبال سہیل کی "خود شناسی" کا کتنا خوب تجزیہ کیا ہے ——

"سہیل صاحب کو علامہ شبلی مرحوم سے بڑا شغف ہے، شبلی کے سامنے وہ سب کو بے حقیقت سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی! "کبھی کبھی" یوں کہ اس بارۂ خاص میں مولانا کے بیانات میں اکثر تضاد رہا ہے۔"

شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کا یہ قول :-

"پُرانی چال کا آدمی ہو تو اس کے دل میں سب سے زیادہ احترام باپ کا ہوتا ہے، اور نئی چال کا ہو تو سب سے زیادہ بیوی سے کور دبتی ہے۔"

نقل کر کے "قدیم و جدید اخلاق" کی کتنی صحیح ترجمانی کی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے قلم سے، جب بھی ایسے جملے :-

"علم نہایت ہی خطرناک چیز ہے، کم ذی علم پائے گئے ہیں جنھوں نے علم سے لوگوں کو فائدہ پہونچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہونچایا ہو"

نکل جاتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کی جھلک پیدا ہو گئی۔

اور

• —— تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے اور سید صاحب کا مغربی، دونوں کی ادبی شخصیت میں یہ انداز نمایاں ہے

بہ حیثیت طالب علم میں شبلی سے متاثر ہوا، اور بہ حیثیت خادم سید صاحب (سلیمان ندوی) سے!"

- "بعض دوستوں، عزیزوں کی وفات ایسی ہوتی ہے کہ خود اپنا جیتا رہنا بے غیرتی معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب کی رحلت کی خبر سُنکر اسی طرح کی بے غیرتی کا علم ہوا"
- "اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنی بخشش کی بشارت، اس محبت سے بھی دیتا ہے، جو وہ اپنے نیک بندوں کی طرف سے اپنے بعض گنہگار بندوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے"
- "مولانا ابوالکلام عوام کے آدمی نہ تھے، کتنے خواص کو بھی اُن کے ہاں عوام کے درجہ پر اکتفا کرنا پڑتا تھا، شاید انہوں نے اقبال کے عُقاب کی طرح چٹانوں کی بلند دویران تنہائیوں میں اپنی دُنیا بنا رکھی تھی"
- "مولانا (آزاد) کی رہبری میں پیغمبرانہ طریق دعوت کے بجائے، آمرانہ شان اور کبریائی کی ادا تھی، وہ اتنے پبلک کے نہیں، جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے ——— مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہ ملے گی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھی جتنی خدائی کے رول سے!"
- "یہ بے مثل اسلوب جس میں عجم کا حُسنِ طبیعت اور عرب کے سوزِ دروں کے ساتھ شکوہِ ترکمانی ذہن ہندی، نطق اعرابی بھی ملتا ہے، مولانا پر ختم ہو گیا"
- "مولانا (ابوالکلام آزاد) کے یہاں انشاپردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں، الہلال میں دعوت دار ورسن ہے، تذکرے میں دعوت دید و شنید، غبارِ خاطر میں دعوتِ نوش و نشید، تفسیر قرآن کا لہجہ علمی اور عالمانہ ہے"
- "بخاری (پطرس) بڑے بُت شکن تھے، جینیس کا تقاضا بھی یہی ہے، لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قایل تھے، وہاں بتوں میں صرف اپنے بُت کے!"
- "آج کی دُنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی، جتنی جلد پُرانی ہو جاتی ہے"

دوسرا رخ :- "آج یہ خیال آیا ذرا وزارت کی کرسی پر آپ کی چھپ تختی دیکھ آؤں" (صفحہ ۴) ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو، ورنہ "چھپ تختی"، آج تک سُننے اور پڑھنے میں نہیں آیا ——— "اور مولانا کسی اور سے بخشنے کسی اور طرف چلے گئے" (صفحہ ۱۹) "بحث" سے "بخشنا"، شاید قبول عام نہ پاسکے کہ وجدان اس کی پذیرائی میں جھجک سی محسوس کرتا ہے ——— "شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے، تخئیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تلملاہٹ ملتی ہے" (صفحہ ۲۷) "تلملاہٹ" کا لفظ "جذبہ" کی کیفیت کے اعتبار سے غلط نہیں ہے مگر تفصیل پیش کی جارہی ہے شبلی کے اندازِ نگارش کی، اس لئے "تلملاہٹ" یہاں کھٹکتا ہے "سید صاحب سے مبادلہ خیال کرنے میں ——" (صفحہ ۲۹) کوئی شک نہیں گرامر کے اعتبار سے "مبادلہ" ہی صحیح ہے مگر "تبادلہ خیال" زبان میں جس طرح گھُل مل گیا ہے، اس کے لحاظ سے "مبادلہ خیال" کی اجنبیت اُسی وقت دُور ہو سکتی ہے، جب یہ ترکیب روزمرہ بن جائے ——— "اب تک طالب علم کو عالم کی ناموس کا سب سے بڑا محافظ خیال کرتا تھا" (صفحہ ۵۳) "ناموس" کو عام طور پر مذکر بولتے ہیں ——— "یادوں کے سلسلہ میں باتیں بھی کہاں کہاں پہونچیں" (صفحہ ۸۵) "یاد" کی جمع "یادوں" رشید احمد صدیقی کے زبان وقلم کے شایانِ شان نہیں ہے ——— "اور اُس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے" (صفحہ ۱۶۸) یہ ترجمہ سا لگتا ہے!

"ہم نفسانِ رفتہ" جیسی بلند پایہ کتابیں کم ہی چھپتی ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر وجدان شگفتگی محسوس کرتا ہے۔

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

رکن: انجمن ادبی رسائل، پاکستان

فاران
کراچی

جلد: ۱۲
شمارہ: ۹

ترتیب، ماہ دسمبر ۱۹۶۰ء

ایڈیٹر
ماہر القادری

★

سالانہ
چھ روپے
فی پرچہ
آٹھ آنے

مقام اشاعت: دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

کتابت: محمد ساجد

مطبوعہ: مطبع سعیدی، کراچی

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقشِ اوّل

کوئی فرد یا ادارہ، اچھے مقاصد کے اعلان کے ساتھ کسی کام کا آغاز کرتا ہے، تو اُس میں بدگمانیاں پیدا کرنا اور بدفالی کے کلمات زبان سے نکالنا، شریف آدمیوں کا شیوہ نہیں ہے، جو کوئی بھی زبان و ادب، علم و اخلاق اور تہذیب و انسانیت کی جتنی اور جیسی بھی خدمت کر رہا ہے، وہ تعاون و تائید کا مستحق ہے، اب رہیں کوتاہیاں تو انسانوں کے کاموں میں تھوڑی بہت کور کسر اور کسی نہ کسی حد تک کوتاہیاں رہ ہی جاتی ہیں، نقص و کوتاہی سے پاک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کا کام ہے!

جو حضرات باقاعدگی کے ساتھ "فاران" پڑھتے رہے ہیں، اُن کو اچھی طرح اس کا علم ہے کہ تنقید و احتساب کے معاملہ میں ہم نے کسی خطرے اور اندیشہ کی پروا نہیں کی، جس بات کو ہم نے اپنے نزدیک حق سمجھا، اُس کا اظہار کیا اور کھُل کر کیا، استعارہ و کنایہ سے جہاں کام لینا پڑا ہے، وہاں بھی "حق" مُشتبہ اور دھُندلا ہونے نہیں پایا۔

ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی، فلاح و بہبود، تنظیم اور علم و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے "پاکستان رائٹرز گلڈ" کا قیام جن مقاصد کے اعلان و اظہار کے ساتھ عمل میں آیا ہے، اُن کی افادیت اور ضرورت سے کوئی صاحبِ ہوش خرد انکار نہیں کر سکتا، ہم اس سلسلہ میں چند ضروری گزارشیں کرنا چاہتے ہیں، یقین ہے کہ "رائٹرز گلڈ" کے اربابِ حل و عقد اور دوسرے اہلِ قلم اور اہلِ فکر ہماری تحریر کو غور و توجہ کے ساتھ مُلاحظہ فرمائیں گے۔

ایک "ادارہ" اس سادہ تصور کی بنیاد پر بھی وجود میں آسکتا ہے، کہ اُس کے سامنے شعر و ادب میں کسی خاص نظریہ کی حمایت اور کسی متعین مقصد کی تائید نہ ہو، کوئی لکھنے والا اپنی تحریروں میں چاہے مورتی پُوجا کا پرچار کرے یا توحید کی تبلیغ کرے، کسی ادیب و شاعر کا موضوع "اخلاقی قدریں" ہوں یا ہوسناک جذبات کی ترجمانی، کسی کے قلم سے مادیت کی تراوش ہو یا روحانیت کی کوئی قلم کار دُنیا کی نجات و فلاح اسلام میں سمجھتا ہو یا کمیونزم میں، —— اُس "ادارہ" کو نظریوں کے اس اختلاف سے کوئی سروکار ہی نہ ہو، وہ تو ہر تحریر کو خالص "زبان و ادب" کے معیار پر جانچے اور پرکھے گا —— یہ کہ لکھنے والے کا اندازِ نگارش کیسا ہے؟ جو خیال وہ پیش کرنا چاہتا تھا کیا وہ لفظوں میں ٹھیک طرح سے ظاہر ہو گیا؟ تحریر میں سادگی، تکلف، آمد، آورد، شگفتگی، خشکی، ان میں سے کیا چیز کس تناسب کے ساتھ پائی جاتی ہے؟ جو زبان استعمال کی ہے، اُس میں صحت کے ساتھ کتنا لوچ ملتا ہے؟ لفظوں کا دروبست کیسا ہے؟ خیال (IDEA) اور اظہار (EXPRESSION) میں کس قدر ربط اور ہم آہنگی ہے؟؟

"ادب" کے بارے میں اس معیار و تصور کے خُوب و ناخوب ہونے کی بحث چھیڑنے کا یہ موقع نہیں ہے —— ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ "ادب" کا یہ تصور کوئی شک نہیں بہت وسیع ہے۔

—— مگر ——

افسوس ہے کہ ادب کے اس وسیع تصور کے ساتھ بہت زیادہ تنگی کا سلوک کیا جا رہا ہے، اور "ادب" کا عام طور پر اطلاق افسانہ، ڈرامہ، شاعری اور انہی اصناف سے متعلق تنقیدی مضامین پر کیا جاتا ہے، تاریخ، فلسفہ، سیرت نگاری، اور دین و اخلاق کے بارے میں ہمارے ناقدین نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی ہے، جیسے یہ علوم ادب کا موضوع ہی نہیں بن سکتے، اور ان موضوعات پر لکھنے والے کو عالم، مُصنّف اور مُفکر تو کہہ سکتے ہیں، مگر "ادب" کی محفل میں اُس کو وہ مقام نہیں دیا جا سکتا، جو مقام ایک افسانہ نویس، ناول نگار اور ڈرامہ لکھنے والے کو دیا جاتا ہے۔

حالانکہ

جو حضرات "ادب" کے بارے میں وسیع تصور رکھنے کے دعویدار ہیں، اُن کو لکھنے والوں کی تحریروں میں، کسی خاص نظریہ اور عقیدہ سے متاثر ہوئے بغیر یہ دیکھنا چاہئے کہ کس کے یہاں کس درجہ کی "ادبیت" پائی جاتی ہے، اور اسی "ادبیت" کے اعتبار سے کتابوں، مضمونوں، مقالوں اور شاعری کے مجموعوں پر پست و بلند ہونے کا حکم لگانا چاہیئے، ہو سکتا ہے کہ ایک افسانہ نگار نے اپنے افسانہ میں عورتوں کی بے باکی اور بے حجابی کی مزے لے لے کر چٹخارہ دار تفصیل پیش کی ہو، مگر اُس میں اتنی "ادبیت" نہ پائی جائے جتنی "ادبیت" ایک ایسی تحریر میں ملتی ہو، جس میں لکھنے والے نے حجاب و عصمت اور اخلاق و غیرت کی عورت کو تلقین کی ہے۔

رنگین کاغذ اور کپڑے سے پھول پتیوں کا تراش دینا آسان ہے مگر سنگِ مرمر کو تراش کر، اُس سے پھول پتے بنانا بڑی محنت، کاوش اور چابک دستی کا کام ہے، یہی فرق ہے ایک افسانہ اور ناول لکھنے والی کی تحریر اور ایک اُس ادیب و قلم کار کی تحریر میں جس نے تاریخ و فلسفہ اور دین و اخلاق کو موضوعِ نگارش بنایا ہو!

قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" میں زبان و ادب کا جو چٹخارہ پایا جاتا ہے، مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب (پاکستانی عورت دوراہہ پر) میں اُس سے کم ادبی لذت نہیں ملتی، مگر اس قدر ناشناسی، تنقید نگاروں کی بے خبری بلکہ ناانصافی کو کیا کہیئے کہ مولانا موصوف کا نام ادیبوں کی فہرست اور تذکروں میں کہیں نظر نہیں آتا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے "خطباتِ مدراس" میں ادب کی کتنی لطیف چاشنی پائی جاتی ہے، مگر اُردو زبان و ادب کے تذکروں اور تنقیدی مقالوں میں ان خطبات کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ ——— علامہ شبلی نعمانی کی "شعر العجم" اور "موازنہ انیس و دبیر" کا تو بہت شہرہ ہے اور ان کتابوں کو "ادبِ عالیہ" میں شمار کیا جاتا ہے، اور کوئی شک نہیں یہ کتابیں اس کی مستحق بھی ہیں۔ لیکن سیرت النبی، الفاروق اور الغزالی کو ادبی اعتبار سے شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کے مقابلہ میں نہیں رکھا جاتا، شبلی اُردو زبان و ادب میں تاریخ کا "مُعلّمِ اول" ہے، اُس کے قلم نے شعر و ادب کی تنقید ہی میں نہیں بلکہ تاریخ و فلسفہ کے میدان میں بھی پھول بکھیرے ہیں اور علم کلام کے نازک ترین مسائل کو زبان و ادب کے سلیس و شگفتہ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں اُردو زبان و ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں، اُن کا قلم گل فشاں ہی نہیں گہر بار بھی ہے! کتنا دل نشین انداز بیان ہے، کس قدر جاذبِ توجہ طرزِ استدلال ہے، کیسے کیسے مشکل اور اُلجھے ہوئے مسائل ہیں، جنہیں مولانا مودودی نے کتنی سادگی اور سُلجھاؤ کے ساتھ اُردو زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے، اُن کی مشہور و مقبول کتاب "پردہ" میں زبان کا کیسا چٹخارہ اور کتنی "ادبیت" پائی جاتی ہے، جہاں تک لُطفِ بیان اور طرزِ ادا کا تعلق ہے، بڑے سے بڑے دلچسپ ناول اس کے آگے پھیکے اور بے رنگ نظر آتے ہیں ——— مگر زبان و ادب کی کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ اُردو ادب کے تذکرے اتنے بڑے ادیب اور عظیم قلمکار کے نام اور کام سے خالی نظر آتے ہیں۔

اس گزارش سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ادب پر مولویوں اور مولاناؤں کو مسلط کر دینا چاہتے ہیں، جہاں تک خالص ادبی نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے، ہم نہ "مولاناؤں" کے حامی ہیں اور نہ "مسٹروں" کے طرفدار ہیں! اس قسم کی جانب داری اور دھڑے بندی ادب کی توہین ہے ہم تو یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چاہے کوئی "مولانا" ہو یا "مسٹر" ہو، اُس کی تحریر کو زبان و ادب کے معیار پر جانچنا اور پرکھنا چاہیئے اگر کسی "مولانا" کی تحریر اس معیار پر پوری اترتی ہے، تو پھر اُس کی خوبی کے اعتراف سے اس لئے گریز کرنا نہیں چاہیئے کہ لکھنے والا "مولانا" ہے اور دینی فکر رکھتا ہے۔

اگر اربابِ نقد و نظر کا مطالعہ وسیع اور ہمہ گیر ہو، اور اس کے ساتھ ہی وہ کسی مخصوص نظریہ سے متاثر نہ ہوں، تو قدیم اُردو کا ذکر کرتے ہوئے، انہیں شاہ عبدالقادر دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے ترجمہ قرآن کے اُردو اقتباسات اور شاہ اسمٰعیل شہید کی اُردو تحریر کے نمونے بھی ضرور پیش کرنے چاہئیں، ان بزرگوں نے صنعت و تکلف سے پاک اور انتہائی سادہ اُردو اُس زمانہ میں لکھی ہے، جبکہ اُردو زبان سچ مچ گھٹنوں چل رہی تھی، اور اُن کے سامنے اس قدر بے تکلف اور سادہ زبان کا کوئی نمونہ بھی موجود نہ تھا۔

کنایہ و استعارہ کے تکلفات کو ہم زیادہ دیر تک نہیں نباہ سکتے، جب یہ بحث چھڑ ہی گئی ہے تو حقائق سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ تقریباً پچیس سال سے "تنقید و ادب" پر جن اہل قلم کا غلبہ ہے وہ نہ صرف یہ کہ دین و اخلاق سے کوئی ہمدردی اور دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اپنے دل میں ایک طرح کی کد رکھتے ہیں، اُن کا یہ نظریہ ہے کہ تجارتی منڈیوں کے بھاؤ کی طرح اخلاقی قدریں بھی بدلتی اور اُترتی چڑھتی رہتی ہیں ———— اس دُنیا کا کوئی خالق نہیں، یہ کائنات آپ ہی آپ وجود میں آگئی ہے ———— انسانی حیات کی تمام قدروں کا منبع اور فیصلہ کن عامل "معاشیات" ہے ———— کھاؤ پیو، مزے کرو، عیش اُڑاؤ اور مر جاؤ، مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، کسی عمل پر کوئی محاسبہ نہیں!

اسی مزاج اور ذہنیت کے اہل قلم نے کچھ اس قسم کی فضا پیدا کر دی ہے کہ کوئی شخص کارل مارکس کی "قدرِ زائد" کو موضوع قرار دے کر، کوئی مقالہ لکھتا ہے تو اُسے روشن خیال اور متنور الفکر سمجھا جاتا ہے، مگر دوسرا شخص زکوٰۃ کا فلسفہ اپنے مضمون میں پیش کرتا ہے، تو اُس پر قدامت پرستی اور مُلّائیت کی طنز کی جاتی ہے! شوپن ہار اور ہیگل کے فلسفہ کا شارح "ترقی پسند" لیکن غزالی اور شاہ ولی اللہ کے افکار کا ترجمان "قدامت زدہ"!!

کسی ناول میں پاکبازی، خدا ترسی اور عفت و تقویٰ کی جھلکیاں ہوں، تو اُس ناول نگار کو دانستہ نظر انداز کیا جاتا ہے مگر اسکے برخلاف کوئی ناول بے حیائی، ہوا و ہوس اور سفلی جذبات کا ترجمان ہو، تو اُس کا لکھنے والا بہت بڑا فنکار قرار پاتا ہے، کتنی ناانصافی ہے کہ نسیم حجازی جیسے عظیم ناول نگار کو .... صرف اس جرم کی پاداش میں نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ اس فنکار نے اپنے ناول میں شرافت و عصمت اور اخلاق و نیکوکاری کی ترجمانی کی ہے، اور وہ اسلامی فکر رکھتا ہے!

کرشن چندر کا ایک افسانہ حال ہی میں نظر سے گزرا، اُس میں انھوں نے موہنجو داڑو کے آثارِ قدیمہ کو پس منظر قرار دے کر ایک افسانہ لکھا ہے، ان آثار کو کھودتے میں ایک "روٹی" نکلتی ہے، جسے افسانہ نگار نے "خدا" ٹھیرایا ہے،

———— تو جو لکھنے والے ————

روٹی کو "خدا" ٹھیرا دیں، اُن کے فن کی تعریف کرتے کرتے زبانیں خشک ہو جائیں مگر جو افسانہ نگار "حقیقی خدا" کا اپنی تحریروں میں ذکر کر دیں، تو اُن بیچاروں پر طرح طرح کی پھبتیاں چُست کی جائیں ———— یہ کہاں کا انصاف ہے، یہ کیا ذہنیت ہے، یہ کس طرح کی عصبیت ہے؟ علم و ادب کی دُنیا میں بھی ایسی دھاندلی ہونے لگے ———— تو

———— پھر کسے رہنما کرے کوئی!

یہ "لے" یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ کوئی ادیب، شاعر اور افسانہ نگار "کمیونزم" کو پیش کرتا ہے، تو اُسے کوئی کچھ نہیں کہتا، گویا کہ یہ طے کر لیا گیا ہے کہ کمیونزم ادب کے ذریعہ پیش ہونے کا حق رکھتا ہے مگر کوئی قلم کار اور ادیب "اسلام" کی ترجمانی کر دے، تو لوگ چونکنے لگتے ہیں کہ جیسے اسلام کا ادب سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اعتراض کی کمانیں حرکت میں آجاتی ہیں۔

اسی جانب داری، عصبیت اور دھڑے بندی کا یہ نتیجہ ہے کہ بعض ایسے شعراء اور ادیب، جن کے یہاں زبان و بیان کی بیشمار غلطیاں ہوتی ہیں، اور جو لفظوں کے ٹھیک طرح برتنے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتے، جن کی تحریروں میں جگہ جگہ جھول رہ جاتا ہے، اُن کو پروپیگنڈے کے ذریعہ "عظیم و شہیر" بنا دیا گیا ہے! نوخیز نسل انھی "عظیم و شہیر" (؟) شاعروں اور ادیبوں کا اثر قبول کر رہی ہے، اور اس طرح غلطیوں کے انبار پر انبار لگتے چلے جا رہے ہیں! اور سب سے زیادہ دُکھ کی بات یہ ہے کہ "شعر و ادب" کی اس ٹریجڈی کا بہت سوں کو تو احساس تک نہیں ہے!

دُوسرا رُخ

ہم نے ابھی ابھی جو کچھ عرض کیا ہے، اُس کا تعلق خالص "ادبی نقطۂ نگاہ" سے ہے، یہ تصویر کا ایک رُخ تھا اگر یہ رُخ بھی "پاکستان رائٹرز گلڈ" کی کوششوں سے روشن و تابناک ہو جائے تو علم و ادب کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا ——— اس کے بعد ہم جو کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں اُس کا تعلق نظریہ اور آئیڈیالوجی سے ہے!

اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ پاکستان کو فوجوں نے فتح نہیں کیا اور نہ وطن، نسل، رنگ اور معاش و اقتصاد کے عقائد اور نظریوں نے اس ملک کو جنم دیا ہے، پاکستان "اسلام اور صرف اسلام" کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے، برعظیم ہند کے مسلمانوں نے پاکستان کے لئے ہر دکھ درد، پریشانی، خانہ ویرانی، تاراجی اور بربادی کو صرف اس اُمید پر گوارا کیا کہ اس ملک میں اللہ اور رسولؐ کا قانون چلے گا اور یہاں کا معاشرہ اخلاق و تقویٰ کی بنیادوں پر استوار ہوگا، مسلم لیگ "اسلام" ہی کے نعرے کو لے کر اُٹھی تھی اور اسی مقدس نعرے کے طفیل اُسے کامیابی ہوئی اور "اسلام" ہی کے نام اور فیض نے اُس کے رہنماؤں کی قیادت کو چمکایا۔

پاکستان ایک "نظریاتی مملکت" (Ideological - state) ہے، اور اُس کا وجود اسی نظریہ (اسلام) کی کامیابی سے وابستہ ہے، اگر پاکستان میں خدانخواستہ "اسلام" کو اُبھرنے، پھیلنے اور غالب ہونے کا موقعہ نہیں ملتا، تو پھر پاکستان اپنے مقصدِ وجود کے اعتبار سے "لاشے" بن جاتا ہے!

قوموں اور ملکوں کی تعمیر اور افراد کے ذہن و فکر کی تربیت میں علم و ادب موثر پارٹ ادا کرتے ہیں، روس کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں کے تمام ادیب، افسانہ نگار، فلسفی، مورخ اور شاعر "کمیونزم" کی نئے نئے انداز اور طرح طرح کے پیرایوں میں ترجمانی کر رہے ہیں، سوویت روس کا تمام لٹریچر، اشتراکیت کا مظہر بلکہ داعی اور مُبلغ بنا ہوا ہے، اس میں ذرہ برابر مُبالغہ نہیں ہے کہ روس کے بچوں کو اشتراکیت گھُٹی میں پلائی جاتی ہے، روس کے اہلِ فکر اور اربابِ حل و عقد کے اس جذبہ کو ہم قدر و ستائش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ جس عقیدہ کو وہ مانتے ہیں، اُس کے اظہار میں وہ کسی قسم کا عار یا انفعالیت اور حجاب محسوس نہیں کرتے! روس اور چین سے باہر غیر اشتراکی مُلکوں میں جہاں بھی کمیونسٹ یا نیم کمیونسٹ شاعر اور ادیب پائے جاتے ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی عُنوان سے "کمیونزم" ہی کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں، کہیں کھُل کر، کہیں اشاروں اور کنایوں میں!

جب "ادب" کو کمیونزم کے پرچار کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، اور کمیونزم کے ترجمان ——— ادیبوں اور شاعروں پر نہ تو "فرقہ واریت" کی طنز کی جاتی ہے اور نہ انہیں تنگ نظر کہا جاتا ہے، تو پھر اُن مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی اس کمزوری بے خبری اور غفلت و بے حسی کو کیا کہیئے جو ادب کے ذریعہ اسلام کی ترجمانی کی سرے سے ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، انھوں نے اسلام کو ایک

پرائیویٹ عقیدہ شاید سمجھ رکھا ہے جس کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ "مذہبی فکر" ہی دراصل اپنی جگہ غیر اسلامی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے صرف "اسلام" کو پسند فرمایا ہے۔ یہی وہ نظام حق ہے جو آفاق گیر ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے!

کتنے افسوس کا مقام اور کس قدر بے غیرتی اور ناانصافی کی بات ہے کہ کارل مارکس اور لینن کا پلپش کیا ہوا نظام تو ادب کے ذریعہ پھیلنے اور عام ہونے کا حق رکھتا ہے مگر محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے لائے ہوئے دین کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ ادب کے ذریعہ اس کی ترجمانی کی جاسکے! کمیونزم کے وہ "مومنین صادقین" جو کمیونزم کو دنیا پر غالب کر دینے کا عزم رکھتے ہیں اور اسلام کے یہ "مذبذبین اور منافقین" جو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ انھوں نے ادب میں کہیں اسلام کی جھلک پیدا کردی، تو ناقدین اُن کو تنگ نظر، قدامت پرست، مُلّا اور نہ جانے کیا کیا کہیں گے!!

اس ذہنیت اور مزاج کے یہ نتائج دیکھنے میں آرہے ہیں کہ پاکستان کی نئی نسل اُس "ادب" کا اثر قبول کررہی ہے جو یا تو کمیونسٹ ہے یا نیم کمیونسٹ ہے، یا پھر اُس لٹریچر سے متاثر ہے، جسے پڑھ کر اسلام کی حقانیت، صداقت اور عظمت و افادیت کا کوئی نقش دل و دماغ کی لوح پر قائم نہیں ہوتا۔

جس "ادارہ" کے نام میں لفظ "پاکستان" شامل ہے، وہ پاکستان کے مقصد وجود کو کس طرح نظر انداز کرسکتا ہے اور یہ بات سارے زمانہ پر روشن اور عیاں ہے کہ پاکستان "اسلام" کے نام اور "اسلام" کے لئے وجود میں آیا ہے، اس لئے یہاں اسلام ہی کی سربلندی کے لئے جدوجہد ہونی چاہیئے اور اسلام ہی پاکستان کی قوت، وحدت، سالمیت اور شیرازہ بندی کا ضامن ہے اس لئے "پاکستان رائٹرز گلڈ" کا فرض ہے کہ وہ ادب کے ذریعہ اسلام کی عکاسی اور ترجمانی کے لئے ایسی سازگار فضا پیدا کردے، جہاں کے ادیب و شاعر فخر و مسرت کے ساتھ "اسلام" کو اپنے فکر و اظہار کا موضوع بنائیں! اور پوری جرأت اور بے خوفی کے ساتھ اپنے عقیدہ کی تبلیغ کریں۔

"پاکستان رائٹرز گلڈ" کا یہ اقدام کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں پر بےشک گراں گزرے گا مگر اُن کی دلدہی کے لئے ہم یہ تو نہیں کرسکتے کہ کمیونسٹ لٹریچر کو تو پھیلنے دیں مگر اسلام کو ادب میں "اچھوت" بنا کر رکھدیں اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے، "ادب" کو اسلام کا عکاس اور ترجمان نہ بننے دیں۔

کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کو اپنے مشن سے اس قدر عقیدت و محبت اور ایسی چاہت اور لگن کہ وہ اُس کے لئے ادب میں نئے نئے پیرائے تلاش کریں اور مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی اسلام سے بےگانگی اور بےنیازی کا یہ عالم کہ ادب میں اسلام کا ذکر کرتے ہوئے شرمائیں ——— توبہ!

"پاکستان رائٹرز گلڈ" نے اپنے فرض کو پہچان کر، اگر ملک میں ایسی ادبی فضا پیدا کردی، جس میں اسلامی افکار کو نشو و نما پانے پھیلنے اور اثر و نفوذ حاصل کرنے کے مواقع میسر آگئے، تو اس ادارے کو اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوگی۔ پاکستان کے لئے علم و ادب کے لئے اور تہذیب و اخلاق کے لئے یہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہوگا جس کی افادیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا!

آخر میں، ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ اسلام اور ادب کا نام آتے ہی بعض دماغ عجیب اجنبیت اور اُلجھن سی محسوس کرتے ہیں، اگر اس سلسلہ میں "گلڈ" کے کسی رُکن یا عہدیدار کو کوئی اُلجھن محسوس ہو، یا ادب کی کسی صنف کا اسلامی فکر و عقیدہ کے ساتھ ربط و تعلق ناقابل عمل یا دُشوار نظر آئے ——— تو ——— اس کے لئے ہم اپنی ناچیز خدمات پیش کرتے

ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر اعتماد اور اسلام کی عالمگیر صداقت پر ایمان رکھتے ہوئے، ہم اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ افہام و تفہیم کے ذریعہ اس قسم کے تمام شبہات دور کئے جاسکتے ہیں۔ طبیعت میں ضد اور ہٹ نہ ہو اور دل میں حق معلوم کرنے کی تڑپ ہو تو خالص عقل کی روشنی میں بھی دین و اخلاق کے مسائل میں یکسوئی ہوسکتی ہے!

ماہر القادری
یکم دسمبر ۱۹۶۰ء

مولانا ظفر احمد عثمانی

مقتدی اور سورۂ فاتحہ کی قرات

حنفی مذہب کا موقف کتاب و سنّت کی روشنی میں!

[فقہی مسائل کے اختلافات، فروعی اختلافات ہیں، ان کی نوعیت راجح اور مرجوح کی ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک یا چند فقہی مسائل میں کسی فقہی مذہب کا مسلک درست نہ ہو، مگر اس قسم کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو "ضلالت" نہیں کہہ سکتے، چاروں فقہی مذاہب حق ہیں اور اہل حدیث کا مسلک بھی حق ہے —— مگر افسوس ہے کہ حضرات اہل حدیث فقہی مسائل کے اختلافات کو اس شدت کے ساتھ اُبھارتے ہیں، جیسے ان فروعی مسائل پر ایمان و نجات کا دار و مدار ہے، ہمارے پاس اس قسم کی کتابیں تبصرے کے لئے آتی رہتی ہیں، جن میں حنفی مذہب پر درشت انداز بلکہ تحقیر آمیز لہجہ میں تنقید کی جاتی ہے! ہم سے بعض اہل حدیث حضرات کی زبانی بھی گفتگو ہوئی ہے، ان میں سے بعض کو اس جہالت و بے خبری میں مُبتلا پایا کہ حنفی فقہ (معاذ اللہ) احادیث کی مخالفت پر قائم ہے اور اُس میں نری قیاس و رائے کی گرم بازاری ہے —— اور جمعہ کے خطبہ میں ایک اہلِ حدیث عالم کی زبان سے یہ بات سُن کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا ہی نہیں رہی کہ "اہلِ حدیث کی جماعت ہی "ما انا علیہ واصحابی" کی مصداق ہے، اس لئے وُہ "ناجی" ہے، باقی تمام فرقے ناری ہیں!" اس "عصبیت" سے اللہ تعالیٰ ہر کسی کو محفوظ رکھے۔

"فاران" میں فقہی اختلافات کو موضوعِ گفتگو عام طور پر نہیں بنایا گیا، یہ طویل مقالہ صرف اس لئے شائع کیا گیا ہے کہ ناواقف لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فقہی حنفی کا تمام تر دار و مدار "کتاب و سُنت" پر ہے، امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے ائمہ احناف فقہ نے اختلافی مسائل میں کسی نہ کسی حدیث ہی کی بُنیاد پر کوئی حکم لگایا ہے اور اپنی دانست میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت "کتاب و سُنت" کے مفہوم و منشاء اور صحابہ کرام کے اسوہ کو پُوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق نگری، حق شناسی، حق طلبی اور اتباع حق کی توفیق عطا فرمائے، اور اس کی توفیق بھی کہ اختلاف کی حالت میں بھی ہم دیانت و شرافت کے حدود کا لحاظ رکھیں اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔] (م - ق)

بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اہل ظاہر حدیث عبادہ میں الا بام القرآن کی زیادت پر تو اتنا زور دیتے ہیں حالانکہ محمد بن اسحٰق کے سوا اس کا کوئی راوی نہیں اور ایسی حدیث میں فصاعدا کی زیادت کو نہیں مانتے حالانکہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس کو روایت کیا اور صحیح قرار دیا ہے اور ابوداؤد نے بھی اس کو صحیح سند سے روایت کیا ہے حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں:-

عن عبادة بن الصامت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا صلٰوة لمن لم یقرأ بام القرآن فصاعدا

عبادۃ بن الصامت کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص سورۂ فاتحہ اور کچھ زیادہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔ اب اگر اس سے مقتدی کے ذمہ فاتحہ پڑھنے کو واجب کہا جائے گا تو کچھ زیادہ پڑھنے کو بھی واجب کہنا پڑے گا کیونکہ حدیث میں زیادہ پڑھنے کا بھی حکم موجود ہے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ اس پر بعض محدثین کا یہ کہنا کہ لفظ فصاعدا کو صرف

معمر نے تنہا زیادہ کیا ہے درست نہیں کیوں کہ ابوداؤد کی سند میں سفیان بن عینیہ نے بھی معمر کی موافقت کی ہے وہ بھی زہری سے معمر کی طرح روایت کرتے اور فصاعدا بڑھاتے ہیں پھر صالح (بن کیسان) اور امام اوزاعی اور عبدالرحمن بن اسحٰق وغیرہ جیسے ثقات نے بھی زہری سے اسی طرح روایت کیا ہے جیسا معمر نے بیان کیا ہے اور اس کی تائید ابوسعید خدری کی حدیث بھی کر رہی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :-

امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نقرأ بفاتحۃ الکتاب وما تیسر والسادۃ صحیح عند ابی داود۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سورۂ فاتحہ پڑھنے اور اس کے ساتھ) جو آسان ہے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اس کو ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے اور ترمذی و ابن ماجہ نے اسی حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے۔ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بالحمد وسورۃ۔ اس شخص کی نماز نہیں جو الحمد اور ایک سورۃ نہ پڑھے۔ اس کی سند حسن ہے پس یہ دعویٰ قابل تسلیم نہیں کہ معمر نے تنہا زیادتی کی ہے پھر معمر کا درجہ حفظ و اتقان میں محمد بن اسحٰق سے بہت بلند ہے یہ امر انصاف سے بعید ہے کہ ابن اسحٰق کی زیادت کو قبول کیا جائے اور معمر کی زیادت کو رد کیا جائے۔ تو اب اہل ظاہر کو اس کا قائل ہونا چاہیئے کہ امام کے ساتھ مقتدی کے ذمہ سورۂ فاتحہ اور ایک سورت یا دو تین آیتیں پڑھنا بھی واجب ہے۔ حالانکہ وہ اس کے قائل نہیں۔ پس ہمارا مدعا ثابت ہو گیا کہ حضرت عبادہ کی حدیث مقتدی کے بارے میں نہیں بلکہ امام اور منفرد کے حق میں ہے کہ ان پر سورۂ فاتحہ اور ایک سورت یا دو تین آیتیں پڑھنا واجب ہے مقتدی کے ذمہ امام کے ساتھ قرأت واجب نہیں اور اگر کسی لفظ سے وجوب کا شبہ بھی ہوتا تھا تو حدیث عبادہ میں ابوداؤد کے اس لفظ سے ہر شبہ دور ہو گیا (ان کنتم لابد فاعلین فلا تفعلوا الا بام القرآن (فیض ص ۲۷۳ ج ۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ضرور ہی امام کے پیچھے قرارت کرنا چاہتے ہو تو سورۂ فاتحہ کے سوا نہ پڑھو۔ اس سے ہر شخص خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ عنوان وجوب کا ہے یا محض جواز کا۔ پھر جواز کو بھی سکتہ امام کے ساتھ مقید کرنا ضروری ہے کیونکہ جہری نماز میں ساتھ ساتھ قرارت کرنا نص قرآن اور حدیث انصات کے خلاف ہو گا۔ تیسری دلیل صاحب تکمیل نے یہ بیان کی ہے۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من صلی صلوٰۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فہی خداج ثلاثا غیر تمام فقیل لابی ہریرۃ انا نکون وراء الامام فقال اقرأ بہا فی نفسک (مسلم شریف)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی ایسی نماز پڑھے جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے وہ نماز ناقص ہے (تین بار فرمایا) کامل نہیں۔ ابوہریرہ کے شاگرد نے کہا کہ ہم (کبھی) امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو ابوہریرہؓ نے جواب دیا کہ (ایسی حالت میں) سورۂ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرو۔ اس کے بعد مؤلف نے لفظ خداج اور تمام کے معنی میں بحث کی ہے مگر ہر سمجھدار آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حدیث کا جتنا حصہ مرفوع ہے اس میں مقتدی کا کوئی ذکر نہیں۔ اور حضرت ابوہریرہ کے شاگرد کا سوال بتلاتا ہے کہ مقتدی کے ذمہ قرارت کا واجب ہونا اس کے نزدیک بھی حدیث سے مفہوم نہیں ہوا اور نہ قرارت خلف الامام اس کے نزدیک معروف تھی اسی لئے تو سوال کی ضرورت ہوئی پھر حضرت ابوہریرہ رضہ کے جواب کو مؤلف نے اس پر محمول کیا ہے کہ امام کے پیچھے آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے۔ مگر اقرأ بہا فی نفسک اس مفہوم میں صریح نہیں ہمارے نزدیک مطلب یہ ہے کہ دل دل میں پڑھ لیا کرو۔ اور ہم بتلا چکے ہیں کہ عرفاً قرارت قلبی کو بھی قرارت کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے سورۂ فاتحہ کی رکنیت ثابت کرنا اور مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے اس کو واجب کرنا زبردستی ہے۔

غنیہ وغیرہ کی عبارتیں پیش کرنا اور شاہ ولی اللہ رحمہ کے قول سے استدلال کرنا ظاہریہ کو زیب نہیں دیتا اگر ان حضرات کے اقوال

(نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

حجت ہیں تو دوسرے علماء کے اقوال بھی حجت ہونا چاہئیں۔ جو فرماتے ہیں کہ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز ناقص ہوتی ہے فاتحہ کی رکنیت پر کوئی دلالت نہیں بغیر فاتحہ کے نماز کو باطل کہنا حدیث کے خلاف ہے اس سے صرف فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور حنفیہ قرأت فاتحہ کو امام اور منفرد پر واجب کہتے ہیں۔ اور مقتدی کے لئے امام کی قرارت کافی ہے وہ امام کی قرارت کے ذریعہ سے حکماً قاری ہے جیسا مفصل گذر چکا ہے حدیث مسلم ابوداؤد میں صراحۃً مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم ہے اذا قرأ فانصتوا۔ یہی قرآن میں حکم ہے واذا قرا القران فاستمعوا لہ وانصتوا پس جواب ابوہریرہ کا یہ مطلب نہیں کہ امام کے ساتھ قرارت کرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ دل دل میں پڑھتے رہو یا امام سے پہلے اور اس کے سکتات میں تنہا پڑھ لو ساتھ ساتھ نہ پڑھو۔ اور فی نفسک کے معنی تنہا کے بھی آتے ہیں جیسا حدیث صحیح قدسی میں وارد ہے۔ من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی ومن ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملاء خیر من ملاۂ۔ جو مجھے تنہا یاد کرے میں اس کو تنہا یاد کرتا ہوں اور جو مجھے جماعت میں یاد کرے میں اس کو جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں اس حدیث میں فی نفسہ کے معنی تنہا ہیں جیسا جماعت کے مقابلہ سے واضح ہے پس ابوہریرہ کے جواب کا بھی یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ امام کے پیچھے تم تنہا سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو اس کے ساتھ ساتھ نہ پڑھو اور اس کو کوئی منع نہیں کرتا اور اس تاویل کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو امام بیہقی نے جزء القرارت ص۴۵ میں اور حاکم نے مستدرک ص۲۳۶ ج۲ میں حضرت ابوہریرہ ہی سے بایں الفاظ روایت کی ہے۔

من صلی صلوٰۃ مکتوبۃ مع الامام فلیقرأ بفاتحۃ الکتاب فی سکتاتہ اھ

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کرنے والا خوب جانتا ہے کہ شاہ صاحب فرض اور واجب دونوں کو رکن کہدیتے ہیں ملاحظہ ہو ص۹۵ ج۱ جس میں ضم سورت کو بھی رکن قرار دیا ہے حالانکہ ضم سورت کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں صرف حنفیہ کے نزدیک واجب ہے شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ ص۷ ج۲ میں فرمایا ہے وان کان ماموما وجب علیہ الانصات والاستماع فان جھر الامام لم یقرأ الا عند الاسکاتۃ وان خافت فلہ الخیرۃ فان قرأ فلیقرأ الفاتحۃ قراءۃ۔ لایشوش علی الامام وھذا اولی الاقوال عندی وبہ یجمع بین ابواب الباب والسرفیہ مانص علیہ من ان القراءۃ مع الامام تشوش علیہ وتفوت التدبر وتخالف تعظیم القرآن ولم یعزم علیھم ان یقرأ وسرالاان العامۃ متی الادوان یصححوا الحروف باجمعھم کانت لھم لجۃ مشوشۃ اھ۔

(ترجمہ) اگر نمازی مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور سننا واجب ہے اگر امام (قرارت) جہر سے کر رہا ہے تو مقتدی قرأت نہ کرے مگر سکتہ کے وقت اور اگر قرأت سری کر رہا ہے تو مقتدی کو اختیار ہے اگر قرارت کرنا چاہے تو سورۂ فاتحہ اس طرح پڑھے کہ اس کی قرارت سے امام کو تشویش نہ ہو۔ میرے نزدیک سب اقوال میں یہ سب سے بہتر ہے کہ جہری نماز میں مقتدی سکتۂ امام میں قرارت کرے اور سری میں تشویش سے بچ کر قرارت کرے۔

اسی طرح اس باب کی تمام حدیثوں کو جمع کیا جاسکتا ہے اور اس میں راز یہ ہے جس کی تصریح بھی حدیث میں ہے کہ امام کے ساتھ قرات کرنا اس کو مشوش کرتا ہے اور اس سے تدبر فی القرآن فوت ہوتا ہے اور یہ صورت تعظیم قرآن کے بھی خلاف ہے اور سری نماز میں بھی مقتدیوں پر لازم نہیں کی گئی کیوں کہ عوام جب سب مل کر صحیح طور سے حروف کو ادا کرتے ہیں تو اس سے بھی ایک تشویشناک گونج پیدا ہوتی ہے اھ۔ یہ ہے شاہ ولی اللہ صاحب کا مسلک قرارت خلف الامام کے بارے میں اگر ان کا قول حجت ہے تو صاحب تکمیل کو آگے کچھ بولنے کا حق نہیں ۱۲ ظ

جو کوئی فرض نماز امام کے ساتھ پڑھے وہ اس کے سکتات میں سورۂ فاتحہ پڑھ لے بیہقی نے تسلیم کیا ہے کہ مرفوعاً یہ حدیث صحیح نہیں موقوفاً صحیح ہے یعنی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں بلکہ حضرت ابوہریرہ رضہ کا قول ہے جس سے یہ امر واضح ہوگیا کہ حضرت ابوہریرہ رضہ امام کے ساتھ قرارت مقتدی کو جائز نہیں سمجھتے سکتات میں جائز کہتے ہیں یہی ہمارا قول ہے۔

(تنبیہ) مؤلف تکمیل البرہان نے حدیث ابوہریرہ کی بحث میں بلاوجہ حدیث عبادہ رضہ کے متعلق ایک بحث چھیڑ دی ہے کہ مولانا احمد علی صاحب حنفی (محدث) سہارنپوری نے حدیث عبادہ رضہ کی سند میں نافع بن محمود کی وجہ سے کلام کیا ہے کہ وہ مستور الحال ہے حالانکہ مستور کی روایت امام ابوحنیفہ کے نزدیک مقبول ہے پھر عبادہ کی روایت کو امام ابوداؤد چار طرق سے لائے ہیں ان چاروں میں سے صرف ایک سند میں نافع بن محمود ہے پھر نافع بن محمود کو امام ذہبی نے کاشف میں ثقہ کہا ہے اور دارقطنی نے اس کی سند کو حسن اور راویوں کو ثقہ کہا ہے (جس سے نافع کا ثقہ ہونا ہی لازم آگیا) اور ابن حبان نے بھی اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے الخ اس طویل کلام کا جواب یہ ہے کہ مولانا احمد علی صاحب نے وہی کیا ہے جو موفق ابن قدامہ حنبلی نے کتاب المغنی میں فرمایا ہے کہ حدیث عبادہ رضہ میں یہ زیادت کہ "مگر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھ لیا کرو" الخ صرف ابن اسحٰق روایت کرتا ہے اور ابوداؤد نے اس کو نافع بن محمود سے بھی روایت کیا ہے اور ابن اسحٰق سے بھی ادنیٰ ہے کیونکہ اہل حدیث کے نزدیک غیر معروف ہے۔ جیسا ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ پھر امام احمد اور یحییٰ بن معین نے بھی اس زیادت کو ضعیف کہا ہے اور ابن حبان نے اگرچہ نافع کو کتاب الثقات میں داخل کیا ہے مگر اس کی حدیث کو معلل کہا ہے اور اس ایک حدیث کے سوا نافع سے اور کوئی روایت نہیں ان حضرات کے سامنے دارقطنی کی توثیق و تحسین کا جو درجہ ہے اہل علم خود سمجھ سکتے ہیں علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس کو ضعیف کہہ کر فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ حضرت عبادہ رضہ کا قول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے۔ .... پھر ہم بتلا چکے ہیں کہ اس حدیث کے تمام طرق کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی سند میں بہت اضطراب ہے اور حدیث مضطرب بغیر رفع اضطراب کے کسی کے نزدیک بھی حجت نہیں بن سکتی اور علت اضطراب کے رفع کرنے کی وہی صورت ہے جو امام بخاری اور مسلم نے اختیار کی ہے کہ اس حدیث کا وہی حصہ صحیح میں داخل کیا جس کو ثقات نے روایت کیا ہے۔ جس میں امام اور مقتدی کا کوئی ذکر نہیں اور جس حصہ کے راوی محمد بن اسحٰق اور نافع بن محمود جیسے ہیں اس کو صحیح میں شامل نہیں کیا۔ اور اصول حدیث میں طے ہو چکا ہے کہ جب حدیث مضطرب کے چند طرق میں سے ایک طریق راجح ہو جائے وہی مقبول ہوگا بقیہ طرق مردود ہونگے پس مولانا احمد علی صاحب حنفی محدث سہارنپوری نے کوئی مغالطہ نہیں دیا خود صاحب تکمیل البرہان ہی جاہلوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

چوتھی دلیل صاحب تکمیل کی وہ ہے جس کو ہم مجمع الزوائد کے حوالہ سے اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ایک صحابی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا شاید تم امام کے ساتھ ساتھ قرارت کرتے ہو تین بار دریافت فرمایا صحابہ نے کہا بے شک ہم ایسا کرتے ہیں فرمایا ایسا نہ کرو مگر یہ کہ کوئی سورۂ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لے الخ جاہلوں کو دھوکہ دینے کے لئے صاحب تکمیل نے اس حدیث کو اپنی دلیلوں میں شامل کر لیا حالانکہ یہ حنفیہ کی دلیل ہے کیونکہ حضورؐ کا صحابہ سے یہ دریافت کرنا کیا تم امام کے ساتھ قرارت کرتے ہو؟ خود بتلا رہا ہے کہ امام کے ساتھ مقتدی کا پڑھنا حضورؐ کو گوارا نہ تھا اور صحابہ کا بحالت اقتداء قرارت کرنا حضورؐ کی اجازت سے نہ تھا جبھی تو سوال کی نوبت آئی اس پر بعض اہل حدیث کا یہ کہنا کہ یہ سوال قرارت فاتحہ سے نہ تھا بلکہ سورۂ فاتحہ سے زیادہ قرارت کے متعلق تھا غلط ہے۔ کیونکہ دارقطنی کے الفاظ ہیں:۔

هل منكم من احد يقرأ شيئًا من القرآن وحسنه (فیض الباری ص۲۷۳ ج ۲)

کیا تم میں سے کسی نے قرآن میں سے کچھ پڑھا ہے؟ دارقطنی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے"۔ اور اس لفظ کا فاتحہ و غیر فاتحہ کو عام ہونا

ظاہر ہے۔ اس کے بعد آپ کا ارشاد الا ان یقرأ احدکم بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ بھی ہماری دلیل ہے کیوں کہ اس میں فی نفسہ کی قید موجود ہے کہ سورۂ فاتحہ دل دل میں پڑھ لیا کرو۔ یا اس کے معنی منفرد کے ہیں یعنی امام کے ساتھ نہ پڑھو اس سے پہلے یا اس کے سکتہ میں پڑھ لیا کرو۔ اور ہم حدیث قدسی سے فی نفسہ کا بمعنی منفرد آنا بتلا چکے ہیں۔ مؤلف تکمیل کا یہ دعویٰ کہ فی نفسہ کے معنی آہستہ پڑھنے کے ہیں قابل قبول نہیں علماء مالکیہ میں سے بعض اجلۂ علمائے نے حدیث ابوہریرہ رضؓ اقرأ بھا فی نفسک کی تفسیر میں یہی کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ دل دل میں پڑھ لیا کرو (شرح مسلم للنووی و فتح الملہم) پھر ہم بتلا چکے ہیں کہ نہی کے بعد استثناء وجوب کے لئے نہیں ہوتا صرف اباحت کے لئے ہوتا ہے تو اس حدیث سے مقتدی کے لئے قرارت فاتحہ کا صرف جواز ثابت ہوگا نہ کہ وجوب اور یہ صاحب تکمیل کے لئے مضر ہے کیوں کہ وہ تو فرضیت اور رکنیت کے مدعی ہیں اور اس حدیث سے مقتدی کے حق میں رکنیت تو کجا وجوب بھی ثابت نہیں ہوتا۔

پانچویں دلیل حضرت انس رضؓ کی حدیث ہے جس کا مضمون وہی ہے جو اس سے پہلی حدیث میں صحابی مجہول کی حدیث کا ہے اس میں بھی وہی فی نفسہ کا لفظ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تین بار دریافت فرمانا بھی کیا تم نماز میں امام کے ساتھ ساتھ قرارت کرتے ہو؟ تم بتلا چکے ہیں کہ یہ حدیث اصل میں حنفیہ کی دلیل ہے جس کو بطور مغالطہ کے اہل ظاہر اپنی دلیل بنانا چاہتے ہیں۔ پھر ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں ابن سالم کے واسطہ سے حضرت انس رضؓ سے روایت کیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأت الامام لہ قراءۃ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے لئے کوئی امام ہو (اور یہ اس کا مقتدی ہو) تو امام کی قرارت اس کے لئے بھی قرارت ہے ابن حبان نے ابن سالم میں کلام کیا ہے مگر تقریب میں اس کو ثقہ کہا ہے۔ اور تہذیب التہذیب میں ہے قال ابوحاتم لاباس بہ ص ۱۲۲ ج ۹ ابوحاتم نے کہا اس میں کوئی بات نہیں ہے۔ اور یہ لفظ توثیق کے لئے مستعمل ہے اگر نافع بن محمود کو ذہبی کے قول سے ثقہ کہا جاسکتا ہے تو ابن سالم کو ابوحاتم کے قول سے بدرجۂ اولیٰ ثقہ کہا جائے گا پس دونوں حدیثوں کے ملانے سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے کہ اس حدیث سے مقتدی کے لئے صرف جواز قرارت ثابت ہوتا ہے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ اور جواز بھی اس طرح کہ دل دل میں پڑھے یا امام سے پہلے یا سکتۂ امام میں پڑھے ساتھ ساتھ نہ پڑھے۔

چھٹی حدیث صاحب تکمیل نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میرے پیچھے قرارت کرتے ہو؟ صحابہ نے کہا ہاں ہم جلدی جلدی پڑھتے جاتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا ایسا نہ کرو مگر سورۂ فاتحہ (پڑھ لیا کرو) پھر عون المعبود سے نقل کر دیا کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند امام بخاری وغیرہ کے نزدیک حجت ہے۔ مغالطہ اور دھوکہ دینا اسی کا نام ہے ان کو عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا حجت ہونا بعد میں ثابت کرنا تھا پہلے یہ بتلانا ضروری تھا کہ امام بخاری یا بیہقی سے عمرو بن شعیب تک راویوں کا کیا حال ہے؟ اگر جزء القرارت بخاری اور بیہقی کو اچھی طرح دیکھ لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ عمرو بن شعیب سے روایت کرنے والا ضعیف ہے قال البیہقی ومحمد بن عبید اللہ بن عمیر وان کان غیر محتج بہ وکذالک بعض من تقدم ممن رواہ عن عمرو بن شعیب فلقراءت الماموم فاتحۃ الکتاب فی سکتۃ الامام شواھد صحیحۃ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ خبراً عن فعلھم۔ وعن ابی ھریرۃ وغیرہ من فتواھم (ص ۵۲)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اگرچہ محمد بن عبید اللہ بن عمیر سے حجت نہیں قائم ہوسکتی (کیوں کہ وہ ضعیف متروک ہے بعض محدثین نے اس کو کاذب بھی کہا ہے (لسان ص ۲۱۶ ج ۵) اسی طرح بعض اور لوگ بھی جو اس کو عمرو بن شعیب سے روایت کرتے ہیں (ان سے بھی حجت قائم

نہیں ہو سکتی) مگر امام کے سکتہ میں مقتدی کی قرارت فاتحہ کے لئے عبداللہ بن عمرو اور ابو ہریرہ وغیرہ سے صحیح روایات میں ان کے فعل اور فتویٰ کا بیان موجود ہے اھ۔

اس میں امام بیہقی نے فیصلہ فرمادیا کہ عبداللہ بن عمرو اور حضرت ابو ہریرہ وغیرہ سے اس باب میں حدیث مرفوع ثابت نہیں صرف ان کا فعل اور فتویٰ کا ثابت ہے اور وہ بھی مطلقاً نہیں بلکہ امام کے سکتہ میں مقتدی کی قرارت کو جائز فرماتے ہیں اور اس سے حنفیہ بھی منع نہیں کرتے وجوب پر کوئی دلیل نہیں۔ جیسا مفصل بیان گزر چکا۔ پس یہ بھی ہماری دلیل ہے۔

ساتویں دلیل میں عبادۃ بن الصامت رض کی حدیث ہی کو پھر بیان کر دیا ہے حالانکہ حدیث پڑھنے پڑھانے والے جانتے ہیں کہ جب صحابی ایک ہے تو حدیث ایک ہو گی اس کو چند احادیث قرار دینا صحیح نہیں ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث عبادہ رض مضطرب ہے اس کے طرق میں سے اگر کسی طریق کو ترجیح نہ ہوتی تو وہ قابل قبول ہی نہ ہوتی مگر جب ایک طریق کو ترجیح دیدی گئی تو یہی طریق حجت ہے بقیہ طرق حجت نہیں ہو سکتے اور ان طرق میں سے وہی طریق راجح ہے جس کو امام مسلم و بخاری نے صحیح میں اختیار کیا ہے اور اس میں مقتدی یا امام کا کچھ ذکر نہیں صرف اتنا مضمون ہے کہ جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں اور اس سے کسی کو انکار نہیں امام اور منفرد پر ہمارے نزدیک بھی قرارت فاتحہ واجب ہے اور اس معنی پر اس حدیث کو امام احمد بن حنبل اور سفیان بن عیینہ اور امام زہری جیسے ائمہ حدیث سے محمول کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی اور دوسرے صحابہ نے بھی اس کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ اس طریق صحیح کے علاوہ حدیث عبادہ رض کے جتنے بھی طرق ہیں سب مرجوح اور ناقابل قبول ہیں پھر جس کتاب سے حدیث کے یہ الفاظ تکمیل البرہان میں نقل کئے گئے ہیں وہاں سے تصحیح اور تضعیف کچھ نقل نہیں کی گئی اور جس کتاب سے حدیث کی توثیق نقل کی گئی ہے اُس سے حدیث کے الفاظ نہیں لئے گئے۔ کیوں کہ اس کے الفاظ مؤلف تکمیل کے خلاف اور حنفیہ کے لئے مفید تھے۔ مجمع الزوائد کے الفاظ یہ ہیں:-

من قرأ خلف الامام فلیقرأ بفاتحة الکتاب (ص۱۸۶ ج۱) یعنی جو شخص امام کے پیچھے قرارت کرے وہ سورۂ فاتحہ پڑھ لے اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام کے پیچھے قرارت فاتحہ لازم نہیں جو پڑھنا چاہے وہ پڑھ سکتا ہے اور ہم حضرت ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں سے ثابت کر چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی اپنے دل میں سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرے یا امام کے سکتہ میں پڑھ لے اور اس کو کوئی بھی منع نہیں کرتا۔

حدیث نویں اور دسویں۔

اس کے بعد نویں اور دسویں حدیث بھی حضرت عبادہ رض ہی کی حدیث ہے اور دونوں جزء القرارت بیہقی سے نقل کی گئی ہیں۔ میں بتلا چکا ہوں کہ حدیث عبادہ حدیث مضطرب ہے اور حدیث مضطرب کے جس طریق کو ترجیح ہو جائے وہی مقبول، باقی ناقابل قبول ہیں اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس حدیث کا وہی طریق راجح ہے جس کو امام بخاری و مسلم نے اختیار کیا ہے۔ پھر صاحب تکمیل نے اس حدیث کو جزء القرارت بیہقی سے نقل تو کر دیا مگر یہ نہ دیکھا کہ جس وقت محمد بن سلیمان بن فارس نے اس حدیث کو ان الفاظ سے بیان کیا ہے لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب خلف الامام اسی وقت ابو الطیب محمد بن احمد ذہلی نے ان کو ٹوکا قال قلت لمحمد بن سلیمان خلف الامام قال خلف الامام ص۴۷ کیا اس حدیث میں خلف الامام بھی ہے؟ کہا ہاں۔ اور محمد بن احمد ذہلی ثقہ ہے اس کا اس لفظ پر انکار کرنا خود بتلاتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ زیادت منکر ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں امام زہری بھی ہیں اور زہری کا مذہب موطا امام مالک وغیرہ سے معلوم ہو چکا ہے

کہ انکے نزدیک جہری نماز میں مقتدی کو امام کے ساتھ قرارت جائز نہیں۔ تفسیر طبری میں بھی بروایت ثقات زہری کا یہ قول مروی ہے کہ جس نماز میں امام جہر کرتا ہے مقتدی قرارت نہ کرے اگرچہ امام کی قرارت نہ سنے ہاں جس نماز میں امام جہر نہ کرے مقتدی اپنے دل میں آہستہ قرارت کرے جس نماز میں امام جہر کرے اس میں کسی کو قرارت جائز نہیں نہ زور سے نہ آہستہ ص۱۱۱ ج۱۔ اگر اس حدیث میں انھوں نے لفظ خلف الامام روایت کیا ہوتا تو جہری نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے سے کیوں منع کرتے؟ پس یا تو یہ زیادت شاذ ہے جیسا ابوالطیب ذہلی کے سوال سے مفہوم ہو رہا ہے یا یہ حدیث مسبوق کے متعلق ہے جو امام کے بعد اپنی بقیہ رکعتیں پوری کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ مسبوق اگر امام کے بعد بقیہ رکعتیں ادا کرتے ہوئے سورۂ فاتحہ نہ پڑھے گا تو اس کی نماز نہ ہوگی اور مسبوق پر ہم بھی سورۂ فاتحہ کی قرارت کو واجب کہتے ہیں اور لفظ خلف کا معنی بعد میں مستعمل ہونا قرآن سے ثابت ہے ملاحظہ ہو تفسیر آیت فجعلناھا نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا۔ (ہم نے اس واقعہ کو عبرت بنا دیا ان لوگوں کے لئے جو اس کے سامنے تھے اور ان لوگوں کے لئے جو اس کے بعد آنے والے تھے۔ تفسیر طبری ص۲۶۵ ج۱) رہا امام بیہقی کا یہ فرمانا کا اس کی سند صحیح ہے تو اس سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا کیوں کہ حدیث شاذ وہی ہے جس کے راوی سب ثقہ ہوں مگر کسی ثقہ نے جماعت ثقات کے خلاف کیا ہو۔ پھر امام بیہقی کا یہ فرمانا کہ اس حدیث میں خلف الامام کی زیادتی ویسی ہی ہے جیسی مکحول کی روایت میں (لا تقرؤا والامام القرآن کی) زیادتی ہے تو مکحول کی اس زیادت کا حال ہم بتلا چکے ہیں کہ امام احمد اور یحییٰ ابن معین وغیرہ ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ پھر یہ فرمانا کہ یہ حضرت عبادہ رض سے بوجوہ چند صحیح مشہور ہے تو یہ وہی بات ہے جو علامہ ابن تیمیہؒ نے فرمائی ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت عبادہ رض کا قول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں سو اس کا ہم نے کب انکار کیا ہے کہ بعض صحابہ قرارت خلف الامام کے قائل تھے مگر چونکہ ان کا قول خلاف نص قرآن اور خلاف حدیث صحیح ہے اس میں تاویل کی جائے گی کہ وہ دل دل میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہونگے یا سکتۂ امام میں، اور ترجیح ان صحابہ کے قول کو دی جائے گی جو نص قرآن اور حدیث صحیح کے موافق ہے اور دسویں حدیث عبادہ رض میں بھی امام اور غیر امام کی زیادت صحیح نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے خواہ امام ہو یا غیر امام ہو۔ کیوں کہ اس کی سند میں احمد بن عمیر دمشقی معروف بابن جوصا ہے جس کی بابت حافظ ابن مندہ نے حمزہ کنانی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس سے روایت کرنا چھوڑ دیا تھا اور فرمایا میرے پاس ابن جوصا کی روایات کے دو سو جزو ہیں کاش وہ سفید ہی ہوتے اور حاکم نے زبیر بن عبدالواحد اسدی سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابو علی کی کوئی لغزش نہیں دیکھی بجز اس کے کہ وہ عبداللہ بن وہب دینوری اور ابن جوصا سے روایت کرتے ہیں اھ۔ اس کی سند میں محمد بن ابی السری بھی ہے جو غالباً عسقلانی ہے وہ باوجود حفظ کے بہت غلطی کرتا اور منکرات روایت کرتا ہے ذہبی نے میزان میں اس کی ایک حدیث منکر بیان کر کے فرمایا ہے کہ اس کی اور بھی منکر احادیث ہیں پس اس روایت میں امام اور غیر امام کا لفظ یا ابن ابی السری کے مناکیر میں سے ہے یا ابن جوصا کے غرائب میں سے ہے اس سے حجت قائم نہیں ہو سکتی پھر اس میں مقتدی کا ذکر نہیں صرف امام اور غیر امام کا ذکر ہے تو غیر امام سے مراد منفرد ہے۔ مقتدی مراد نہیں کیوں کہ مقتدی کے بارے میں صحیح حدیث اذا قرأ الامام فانصتوا (جب امام قرارت کرے خاموش رہو) میں خاموش رہنے کا صریح حکم وارد ہو چکا ہے اور یہی قرآن میں حکم ہے واذا قریٔ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا اور ہم بتلا چکے ہیں کہ بالاتفاق یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اب صاحب تکمیل البرہان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ حکم خداوندی اور صحیح حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون رد کر رہا ہے وہ یا ہم؟ پھر اس پر یہ لن ترانیاں کہ اپنے کو محقق و مبصر اور شریعت محمدیہ

ھ یہ شخص متہم بالوضع ہے یعنی حدیثیں گھڑا کرتا تھا ۱۲ ظ

کا محکوم و فرمانبردار قرار دے کر حنفیہ کے عوام و خواص کو مذہب پرست فرقہ بند اور استخوان فروش کہتے ہوئے نہیں شرماتے۔

مسائل اختلافیہ میں جب کہ ہر فریق کے پاس دلائل موجود ہیں یہ دریدہ دہنی اور خلاف تہذیب باتیں لکھنا آپ ہی کو مبارک ہو ہم کسی کو بُرا نہیں کہتے صرف اپنے مسلک کی تائید و تقویت پر اکتفا کرتے ہیں۔

آٹھویں حدیث حضرت عائشہؓ کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے۔ (مؤلف تکمیل نے اس کے ترجمہ میں بیکار کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے) اس کے متعلق عرض ہے کہ اس حدیث کا حاصل وہی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضؓ کی حدیث ۳ کا حاصل ہے اس سے مقتدی کے ذمہ قرات فاتحہ کو لازم کرنا زبردستی ہے۔ کیوں کہ مقتدی کو امام کی قرات کافی ہے جس کا ثبوت احادیث صحیحہ سے ہم دے چکے ہیں مقتدی کے علاوہ امام اور منفرد کی نماز کو ہم بھی بغیر فاتحہ کے ناقص سمجھتے ہیں کیوں کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ان پر واجب ہے۔ مقتدی کے لئے قرآن اور صحیح حدیث میں انصات (خاموش رہنے) کا حکم ہے وہ امام کی قرات کی وجہ سے حکماً قرات کر رہا ہے۔ حدیث صحیح میں صاف حکم ہے۔ انما جعل الامام لیؤتم بہ امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے اور ساتھ ساتھ قرات کرنا اتباع نہیں ہے بلکہ اتباع امام یہ ہے کہ مقتدی خاموش رہے اور اس کی قرات کو سنے امام کے ساتھ مقتدی کا قرات کرنا بقول شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تعظیم قرآن کے خلاف ہے۔

یہ دس حدیثیں بیان کر کے صاحب تکمیل نے تلک عشرۃ کاملۃ کا تاج سر پر رکھ کر بڑی فخر سے فرمایا ہے کہ الحمد للہ قرات فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان دس حدیثوں سے باحسن وجوہ حل ہو گیا" گویا حنفیہ کے پاس نہ قرآن سے کوئی دلیل ہے نہ حدیث سے" صاحب علم کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرمانا چاہیئے کیا ان کو معلوم نہیں کہ حنفیہ بھی اس مسئلہ میں قرآن و حدیث ہی سے استدلال کرتے ہیں۔

اس کے بعد صاحب تکمیل البرہان نے صحابہ کے آثار بیان کئے ہیں میں بتلا چکا ہوں کہ جن احادیث سے انھوں نے استدلال کیا ہے وہ یا تو صحیح نہیں اور اگر صحیح ہیں تو قرات فاتحہ خلف الامام میں صریح نہیں اب آثار کو دیکھئے۔

پہلا اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے کہ ان سے یزید بن شریک نے قرات خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو۔ میں نے کہا اگرچہ آپ (امام) ہوں فرمایا اگرچہ میں (امام) ہوں۔ میں نے کہا اگرچہ آپ جہر کر رہے ہوں تو فرمایا اگرچہ میں جہر کر رہا ہوں اس کو دارقطنی نے روایت کیا اور کہا اس کے راوی ثقہ ہیں۔ اور دوسری سند سے روایت کر کے کہا کہ یہ سند صحیح ہے اور طحاوی نے بھی اس کو روایت کیا ہے" جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ سے روایتیں مختلف ہیں عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں موسیٰ بن عقبہ امام المغازی والسیر سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما قرات خلف الامام سے منع فرماتے تھے اور یہ حدیث مرسلاً صحیح ہے اور امام محمدؒ نے اپنی مؤطا میں داؤد بن قیس فراء سے محمد بن عجلان سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کاش اس شخص کے منہ میں پتھر پڑ جائیں جو امام کے پیچھے قرات کرتا ہے اس کے سب راوی ثقہ ہیں مگر روایت مرسل ہے کیوں کہ غالباً محمد بن عجلان کا سماع حضرت عمرؓ سے نہیں ہے مگر مرسل اور منقطع ہمارے یہاں حجت ہے اور علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں تصریح کی ہے کہ دو مرسل صحیح اگر ایک حدیث موصول صحیح کے معارض ہوں تو دو مرسل پر عمل کرنا اولیٰ ہے صہ ۸۸۵ اور شاہ ولی اللہ صاحب

؎ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تکمیل کے سامنے طحاوی بھی ہے اور ممکن ہے مؤطا محمد اور نصب الرایہ زیلعی بھی ہو اور عمدۃ القاری شرح بخاری للعینی بھی ہو تو کیا ان کو حنفیہ کے دلائل حدیثوں میں نظر نہیں آئے؟ اگر نظر نہیں آئے تو معلوم ہوتا ہے وہ عربی نہیں سمجھتے اور اگر نظر آئے تو پھر کس منہ سے حنفیہ کے مسلک کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بتلاتے ہیں؟ ۱۲ ظ

نے ازالۃ الخفا میں ایک مستقل باب تدوین مذہب عمر بن الخطاب کے لئے منعقد کیا ہے اس میں فرماتے ہیں :

قلت روی اهل الكوفة من اصحاب عمر انه يرى ان المأموم لا يقرأ شيئاً" اھ حضرت عمرؓ کے جو اصحاب کوفی ہیں انکی روایت یہ ہے کہ (حضرت عمرؓ کے نزدیک) مقتدی کچھ قرآت نہیں کرے گا۔" اس صورت میں اصول ترجیح کے موافق روایت تحریم کو ترجیح ہوگی۔ فقد ثبت فی الاصول ترجيح المحرم على المبيح اذا تعارضا کیوں کہ اصول میں دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ جب محرم اور مبیح میں تعارض ہو محرم کو ترجیح دی جائے گی) خصوصاً جبکہ روایت تحریم نص قرآن اور حدیث صحیح کے موافق ہے۔ یا دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کیا جائے کہ ممانعت کی روایت اس صورت پر محمول ہے جب امام کے ساتھ ساتھ قرارت کرے اور قرارت کا امر یا اجازت اس صورت میں ہے جب امام سے پہلے یا اس کے سکتہ میں یا سری نماز میں قرارت کرے جیسا حضرت ابن عمر اور عبداللہ بن عمرو اور حضرت عبادہ سے بروایت بیہقی ہم اس کا ثبوت دے چکے ہیں اور ظاہر ہے کہ امام کے ذمہ سکتہ واجب ہونے کی کوئی دلیل نہیں پس امر کو وجوب پر محمول نہیں کر سکتے جواز ہی پر محمول کیا جائے گا۔

دوسرا اثر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہے وہ فرماتے تھے پڑھو امام کے پیچھے ظہر و عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت۔ دارقطنی نے فرمایا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں تو کیا صاحب تکمیل البرہان مقتدی کے ذمہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ ایک اور سورت پڑھنا بھی واجب کریں گے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ خلاف اجماع ہے۔ جو لوگ قرارت خلف الامام کے قائل ہیں ان میں کوئی بھی مقتدی کے ذمہ فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت پڑھنے کو واجب نہیں کہتا، خود اہل حدیث بھی اس کے قائل ہیں۔ اور اگر جواب نفی میں ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر کا جواب دیں کیوں کہ اس میں فاتحہ اور سورت دونوں کے پڑھنے کا مقتدی کو حکم ہے۔ اور ہمارا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضؓ سے بھی مختلف روایات ہیں۔ عبدالرزاق اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حضرت علی رضؓ سے یوں روایت کیا ہے۔

قال من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة۔ جو امام کے پیچھے قرارت کرے وہ فطرت (یعنی سُنّت) کے خلاف کرتا ہے۔ دارقطنی نے بھی اپنی سنن میں اس کو روایت کیا ہے جس کو مرسل شعبی کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں اور اس کی سند میں کلام کیا ہے کہ قیس اور محمد بن سالم ضعیف ہیں مگر ان دونوں کو دوسروں نے ثقہ بھی کہا ہے اس لئے روایت کو رد نہیں کیا جا سکتا اور ابن ابی شیبہ کی سند میں یہ ضعیف راوی نہیں ہیں اس کی سند شرط صحیح کے موافق ہے بجز محمد بن الاصبہانی کے مگر اس کو علامہ ذہبی اور ابن حبان نے ثقہ کہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت علی رضؓ کے فتاویٰ اور قضایا کو اہل کوفہ دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں کیوں کہ ان کا زمانہ خلافت زیادہ تر کوفہ میں گذرا ہے اس لئے ان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ خصوصاً جب کہ یہ روایت کتاب اللہ اور حدیث صحیح کے موافق بھی ہے۔ اور امام عبداللہ بن یعقوب سندمونی نے اپنی کتاب کشف الاسرار میں عبداللہ بن زید بن اسلم سے روایت کیا ہے وہ اپنے باپ (زید بن اسلم مولی عمر بن الخطاب) سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ میں سے دس حضرات قرارت خلف الامام سے بہت سختی کے ساتھ منع کرتے تھے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر بن الخطاب اور عثمان بن عفان اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (عمدۃ القاری) جتنی سند مذکور ہے اس کے سب راوی ثقہ ہیں عبداللہ بن زید کو امام بخاری اور امام احمد نے ثقہ کہا ہے۔ اور محدثین سند کا جو حصہ حذف کرتے ہیں اس میں کلام نہیں ہوا کرتا۔"

پس اثر عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اثر علی رضی اللہ عنہ میں بھی محرم کو مبیح پر ترجیح دی جائے گی۔ یا ممانعت کو جہری نماز پر اور اجازت کو سری نماز پر محمول کیا جائے گا جس کی تائید جزء القراءت بیہقی کے اس اثر سے ہوتی ہے:۔

عن علی رض قال من السنۃ ان یقرأ الامام فی الرکعتین الاولیین من صلوۃ الظھر بام الکتاب وسورۃ سرا فی نفسہ وینصتون من خلفہ ویقرأون فی انفسھم۔ حضرت علی رض نے فرمایا نماز کی سنت یہ ہے کہ امام ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت آہستہ پڑھے اور اس کے پیچھے والے خاموش رہیں دل دل میں پڑھیں امام بیہقی نے اس سے احتجاج کیا ہے اور اس میں صاف تصریح ہے کہ مقتدی خاموش رہیں پھر اس سے سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملانے کا وجوب بھی ثابت ہے جس کے اہل حدیث قائل نہیں حنفیہ قائل ہیں۔ تیسرا اثر ابو العالیہ کہتے ہیں کہ میں نے مکہ میں عبد اللہ بن عمر رض سے دریافت کیا کہ میں نماز میں پڑھوں؟ فرمایا کہ اس گھر کے (بیت اللہ کے) رب سے مجھے شرم آتی ہے کہ میں نماز پڑھوں اور اس میں قراءت نہ کروں اگرچہ سورہ فاتحہ ہی ہو۔ اس کو امام بخاری نے جزء القراءت میں روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس میں قراءت خلف الامام کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قراءت کا ذکر ہے کہ نماز میں قراءت ضرور ہونا چاہیے اگرچہ سورہ فاتحہ ہی ہو۔ اس کو غیر مقتدی پر محمول کیا جائے گا کیوں کہ ابو العالیہ نے ہی مرسلاً روایت کیا ہے کہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا۔ نازل ہوئی۔ فسکت القوم وقرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پھر لوگ خاموش رہتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قراءت کرتے تھے۔ اور موطا مالک سے اصح الاسانید کے ساتھ عبد اللہ بن عمر کا مذہب مذکور ہو چکا ہے کہ جب ان سے سوال کیا جاتا کیا امام کے پیچھے قراءت کی جائے؟ تو فرماتے کہ امام کے پیچھے جو شخص نماز پڑھے اس کو امام کی قراءت کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو قراءت کرنا چاہیے اس کے بعد نافع نے کہا کہ عبد اللہ بن عمر رض امام کے پیچھے قراءت نہ کرتے تھے اور بیہقی نے بھی جزء القراءت میں سند صحیح کے ساتھ قاسم بن محمد سے یہی روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن عمر رض امام کے پیچھے قراءت نہ کرتے تھے خواہ وہ جہر کرتا یا نہ کرتا۔

پس ابو العالیہ کی یہ روایت ان کے معارض نہیں ہو سکتی اس کو امام اور منفرد پر محمول کرنا ضروری ہے۔ پھر اس کا یہ لفظ کہ اگرچہ سورۂ فاتحہ ہی ہو بتلا رہا ہے کہ عبد اللہ بن عمر کے نزدیک قراءت کے لئے سورہ فاتحہ متعین نہیں اور یہ صاحب تکمیل البرہان کو مضر ہے کیوں کہ وہ تعیین فاتحہ اور اس کی رکنیت کے قائل ہیں۔ اس کے بعد کنز العمال سے جو اثر عبد اللہ بن عمر کا نقل کیا ہے اس میں کاتب نے غلطی کی ہے وہ در اصل عبد اللہ بن عمرو بن العاص کا اثر ہے ملاحظہ ہو۔ (جزء القراءت الامام البیہقی ص۴۵) اور اس کی سند میں مثنیٰ بن صباح ضعیف ہے (تقریب ص۱) پھر اس میں امام کے پیچھے مطلقاً قراءت کا ذکر نہیں بلکہ امام سے پہلے یا سکتہ کی حالت میں پڑھنے کا ذکر ہے اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ نیز اس میں یہ لفظ بھی ہے من صلی مکتوبۃ او سبحۃ فلیقرأ بام القرآن وقرآنا معھا۔ جو شخص فرض نماز پڑھے یا نفل وہ سورۂ فاتحہ بھی پڑھے اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی قرآن (سے) پڑھے۔ جس سے فاتحہ کے ساتھ ضم سورت کا وجوب صاف معلوم ہو رہا ہے مگر اہل حدیث اس کے قائل نہیں اگر اس اثر سے مقتدی کے ذمہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب کیا جائے گا تو ایک سورت یا چند آیات کا پڑھنا بھی واجب ہوگا اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ پس یہ اثر اتفاقاً متروک العمل ہے۔

چوتھا اثر حضرت ابی بن کعب کا ہے کہ وہ امام کے پیچھے قراءت کرتے تھے مگر ظاہر یہ ہے کہ وہ امام سے پہلے یا اس کے سکتات میں قراءت کرتے تھے اور اس کو ہم بھی منع نہیں کرتے جیسا آئندہ اثر میں اس کی صاف تصریح ہے پانچواں اثر عبد اللہ بن عمرو بن العاص کا ہے کہ قراءت خلف الامام کرتے تھے مگر صاحب تکمیل نے خود ہی کنز العمال کے حوالہ سے اس کی تشریح بھی نقل کر دی ہے کہ وہ فرماتے تھے جب تو امام کے ساتھ

ہو تو سورۂ فاتحہ اس سے پہلے یا اس کے سکتات میں پڑھ لیا کرو۔ اور اس کو ہم بھی جائز کہتے ہیں اور وجوب کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ امام کے ذمہ کسی دلیل سے بھی سکوت واجب نہیں۔

چھٹا اثر حضرت ابوہریرہ رضؓ کا ہے (کہ جس نماز میں فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ خداج ہے ناقص ہے تو) ابوالسائب نے کہا کہ جب میں امام کے ساتھ ہوں اور وہ جہر کے ساتھ قرارت کر رہا ہو تو کیا کروں؟ حضرت ابوہریرہ رضؓ نے جواب میں فرمایا ویلک یا فارسی اقرأ بہا فی نفسک الخ اس کا ترجمہ صاحب تکمیل نے یوں کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھ لیا کرو۔ اور ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہے کہ دل دل میں پڑھ لیا کرو کیونکہ ابوداؤد و نسائی وغیرہ میں بسند صحیح ابوہریرہ ہی سے روایت ہے اذا قرأ الامام فانصتوا کہ جب امام قرارت کرے تو خاموش رہو اور قرارت قلبی کا قرارت ہونا لغۃً وعرفاً ثابت ہے جیسا ہم پہلے بتلا چکے ہیں پس دونوں روایتوں پر عمل کی صورت یہی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ مقتدی کے لئے وجوب انصات کے بھی قائل ہیں کہ مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنا واجب ہے اور دل دل میں قرارت کو جائز سمجھتے ہیں یہی ہمارا مذہب ہے۔

ساتواں اثر عبداللہ بن مغفل کا ہے کہ وہ امام کے پیچھے ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت بھی پڑھا کرتے تھے اور پچھلی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ ابن مندہ نے اپنی تفسیر میں عبداللہ بن مغفل سے اس کے خلاف روایت کیا ہے کہ میں نے صحابہ میں سے ایک بزرگ سے سوال کیا (راوی کہتا ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ انھوں نے عبداللہ بن مغفل کا نام لیا تھا) کیا ہر شخص پر جو قرآن سنے اس کا سننا اور خاموش رہنا واجب ہے؟ فرمایا یہ آیت واذا قرأ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا (جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور خاموش رہو) قرارت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جب امام قرارت کرے تو اس کو سنو اور خاموش رہو (زیلعی صـ۳۳۲ جـ۲) پس اگر جزء القرارت بخاری کی روایت میں لفظ خلف الامام کی زیادتی شاذ و منکر نہیں ہے تو کہا جائے گا عبداللہ بن مغفل امام کے ساتھ ساتھ قرارت نہ کرتے تھے اس سے پہلے یا درمیانی سکتہ میں قرارت کرتے ہونگے پھر اس روایت میں سورہ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت ملانے کا بھی ذکر ہے کیا صاحب تکمیل اس کو امام یا مقتدی کے ذمہ واجب کہیں گے؟ اگر نہیں تو ایسا اثر بیان کرنے سے کیا فائدہ جس پر خود بھی عمل نہیں کرتے۔

آٹھواں اثر ابونضرہ کا ہے کہ میں نے ابوسعید رضؓ خدری سے قرارت خلف الامام کے بارے میں سوال کیا انھوں نے فرمایا سورۂ فاتحہ (پڑھ لیا کرو) میں کہتا ہوں اس حدیث کو ابوداؤد نے ابونضرہ ہی سے روایت کیا ہے جیسا خود صاحب تکمیل نے نقل کیا ہے اس میں خلف الامام کا ذکر نہیں بلکہ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ قال امرنا ان نقرأ بفاتحۃ الکتاب وما تیسر۔ ہم کو امر کیا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھیں اور جو آسان ہو۔ اور اہل حدیث سورۂ فاتحہ کے بعد اور کچھ پڑھنے کو واجب نہیں کہتے۔ ترمذی و ابن ماجہ میں بھی حضرت ابوسعید خدری کی یہ روایت موجود ہے اس میں بھی لفظ خلف الامام موجود نہیں ابن عدی نے کامل میں اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اسحق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اور طبرانی نے مسند اہل شام میں اسی حدیث کو روایت کیا ہے ان حضرات کی روایتوں میں بھی خلف الامام کا نشان نہیں۔ طبرانی نے اس کو ابونضرہ سے ابوسعید سے بایں الفاظ روایت کیا ہے لاصلوٰۃ الا بام القرآن ومعہا غیرہا۔ (نماز نہیں ہوتی مگر سورہ فاتحہ سے اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہو) اور کامل کے الفاظ یہ ہیں:۔ لاصلوٰۃ بفاتحۃ الکتاب وسورۃ معہا (نماز نہیں ہوتی مگر سورۂ فاتحہ سے اور اس کے ساتھ ایک اور سورت ہو) ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ فی کل رکعۃ بالحمد وسورۃ فی فریضۃ وغیرہا نماز نہیں ہے اس شخص کی جو ہر رکعۃ میں الحمد اور ایک سورت نہ پڑھے فرض ہو یا نفل (اعلاء صـ۱۸۲ جـ۲) اب اگر اس کو قرارت خلف الامام پر محمول کیا گیا تو صاحب تکمیل کو قائل ہونا چاہیئے

کہ امام اور مقتدی کے ذمہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد ایک اور سورت پڑھنا بھی واجب ہے حالانکہ وہ اس کے قائل نہیں پھر ایسے آثار کے نقل کرنے سے کیا فائدہ جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے؟ اس کے بعد صاحب تکمیل نے حنفیہ کی طرف ایک مغالطہ منسوب کیا ہے کہ بوقت تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیئ[1] الصلوٰۃ کو فاقرأ ماتیسر معک من القرآن فرمایا تھا کہ قرآن سے تجھے جو آسان ہو وہ پڑھ لیا کر (خاص سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا اس سے معلوم ہوا کہ فرض قرارت ادا کرنے کے لئے فاتحہ کی خصوصیت نہیں ایک دو آیت کسی سورت کی پڑھنے سے بھی فرض ادا ہو جائے گا اس کے جواب میں صاحب تکمیل کہتے ہیں کہ) حافظ صاحب (یعنی حافظ ابن حجر عسقلانی) نے فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے ای بعد الفاتحۃ یعنی فاتحہ کے بعد جو سورت تجھے یاد ہو اور آسان ہو وہ پڑھ لیا کر جیسا کہ ابوداؤد میں رفاعۃ بن رافع کی حدیث میں ثم اقرأ بام القرآن صاف موجود ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیئ الصلوٰۃ کو فرمایا کہ سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد جو سورت ہو پڑھ لیا کر" میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو قرارت خلف الامام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق منفرد کی نماز سے ہے اور منفرد کے ذمہ ہمارے نزدیک بھی سورۂ فاتحہ اور ایک سورت یا دو تین آیتیں پڑھنا واجب ہے مگر صاحب تکمیل کے نزدیک فاتحہ کے علاوہ اور کچھ پڑھنا واجب نہیں اگر اس کو حدیث کو قرأت خلف الامام سے متعلق کہا جائے گا تو ان کو قائل ہونا چاہیئے کہ امام اور مقتدی دونوں پر سورہ فاتحہ کے بعد اور بھی کچھ پڑھنا واجب ہے"۔ رہا حنفیہ کا یہ کہنا کہ حدیث مسیئ الصلوٰۃ میں سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں صرف اتنا ہے کہ قرآن میں سے جو تم کو آسان ہو پڑھو یہ مغالطہ ہرگز نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث کے راوی دو صحابی ہیں۔ ایک ابوہریرہ رض دوسرے رفاعہ بن رافع۔ حضرت ابوہریرہ کی تمام روایتوں میں یہی ہے۔

ثم اقرأ ماتیسر معک من القرآن　　　پھر قرآن میں سے جو تم کو آسان ہو پڑھو۔

کسی روایت میں بھی ام القرآن یا سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں اور رفاعہ بن رافع کی حدیث میں بھی اکثر راویوں نے یہی کہا ہے صرف ایک راوی محمد بن عمرو نے ثم اقرأ بام القرآن + وبما شاء اللہ کہا ہے۔ (پھر سورۂ فاتحہ پڑھو اور اس کے بعد جو اللہ چاہے پڑھو) یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں اور اسی محمد بن عمرو کی روایت میں امام احمد اور ابن حبان کے یہ الفاظ ہیں۔

ثم اقرأ بام القرآن وبما شئت ۔ پھر سورۂ فاتحہ پڑھو اور جو تمہارا جی چاہے پڑھو۔ خود حافظ ابن حجرؒ نے (فتح الباری ص۲۱۳ ج۲) میں ۔ اس کی تصریح کی ہے۔ قولہ ثم اقرأ ماتیسر معک من القرآن لم تختلف الرواۃ فی ھذا عن ابی ھریرۃ واما رفاعۃ ففی روایۃ اسحٰق المذکورۃ یقرأ ماتیسر من القرآن مما علمہ اللہ وفی روایت یحیی بن علی فان کان معک قرآن فاقرأ والا فاحمد اللہ وکبرہ وھللہ وفی روایۃ محمد بن عمرو وعند ابی داؤد ثم اقرأ بام القرآن وبما شاء اللہ ولاحمد وابن حبان من ھذا الوجہ ثم اقرأ بام القرآن ثم اقرأ بما شئت اھ پس محمد بن عمرو کی یہ زیادت شاذ ہے اور حدیث شاذ اصول حدیث پر صحیح نہیں ہو سکتی خصوصاً جب کہ محمد بن عمرو ثقہ متفق علیہ بھی نہیں یحییٰ ابن معین۔ جوزجانی اور یعقوب بن شیبہ اور ابن سعد نے اس کی تضعیف کی ہے اور جن لوگوں نے توثیق کی ہے وہ بھی اس کو خطا اور قلت حفظ سے مجروح کرتے ہیں ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب (ص۳۷۵، ۳۷۶ ج۹) ایسے راوی کا تفرد محدثین کے اصول پر قابل قبول نہیں پھر یہ زیادت نص قرآن کے خلاف ہے قرآن میں

---

[1] یعنی نماز کو بری طرح پڑھنے والا یہ حدیث اسی عنوان سے بیان کی جاتی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ کے سامنے بے ڈھنگے طریقہ سے نماز پڑھی تھی آپ نے بار بار نماز لوٹانے کا حکم دیا۔ پھر خود نماز کا طریقہ بتلایا اور سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا کہ قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھو۔ ۱۲ ظ

فاقرؤا ما تیسر من القرآن وارد ہے کہ قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھو سورۂ فاتحہ کی قید نہیں پس جو روایت نص قرآن کے موافق ہوگی اور جو نص قرآن پر زیادت کو ثابت کرے گی اس کو نص قرآنی کے برابر نہیں کیا جاسکتا اس لئے ہم کہتے ہیں کہ فرض تو اتنی ہی قرات ہے جو آسان ہو (یعنی کم از کم ایک آیت) اور خبر واحد میں جو زیادت مذکور ہے وہ فرض نہیں بلکہ واجب ہے اس صورت میں نص قرآن پر بھی عمل ہوگیا اور حدیث پر بھی۔ اور قرارت فاتحہ کو فرض قرار دینے کی صورت میں نص کا ابطال لازم آئے گا اور یہ گوارا نہیں کیا جاسکتا کہ خبر واحد کو نص قرآن کے برابر کیا جائے اب صاحب تکمیل البرہان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ مغالطہ دینے والا اور خبر واحد کی بنا پر نص قرآن کو باطل کرنے والا کون ہے وہ یا ہم؟ رہا یہ دعویٰ کہ قرآن اور حدیث میں ما تیسر (جو آسان ہو) سے مراد سورۂ فاتحہ ہے محض زبردستی ہے سورہ والعصر اور انا اعطیناک الکوثر اور قل ھو اللہ احد سے زیادہ آسان سورۂ فاتحہ کیوں کر ہوسکتی ہے جس میں دو جگہ حرف ضاد ہے جس کا صحیح پڑھنا عوام کو عوام خواص کو بھی دشوار ہے اور اس کی وجہ سے اب تک ہنگامہ برپا ہے کہ ضاد مشابہ ظاء ہے یا مشابہ دال علامہ شعرانی شافعی میزان میں فرماتے ہیں:۔

فرحم اللہ ابا حنیفۃ حیث غیر بین لفظ الفرض والواجب وبین معناھما فجعل ما فرضہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ مما فرضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وان کان لا ینطق عن الھویٰ ادبا مع اللہ تعالیٰ ونفس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحب رفع رتبۃ تشریع ربہ علی تشریعہ ھو ولو کان ذالک باذنہ تعالیٰ ولم ینظر الی ذالک من جعل الفرض والواجب مترادفین وقال الخلف لفظی والحق انھما عند الامام ابی حنیفۃ متفاضلان والخلف معنوی کما ھو لفظی اھ

(من فتح الملھم ص ۱۹ ج ۲)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے کہ انھوں نے فرض اور واجب میں فرق کیا اور دونوں کے معنی الگ الگ بیان کردیئے، کہ جس عمل کو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرض کئے ہوئے عمل سے اعلیٰ قرار دیا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے امام ابوحنیفہ نے اللہ تعالیٰ کا ادب ملحوظ رکھا اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بھی امام ابوحنیفہ کی تعریف کرتا ہے کیوں کہ آپ کو بھی یہی پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تشریع کو آپ کی تشریع سے بلند رتبہ میں رکھا جائے اگرچہ آپ کی تشریع بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہے اس نکتہ کی طرف ان لوگوں کی نظر نہیں پہونچی جو فرض و واجب کو برابر سمجھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فرض و واجب کا درجہ ایک دوسرے سے کم ہے دونوں میں لفظی فرق کے ساتھ معنوی فرق بھی ہے اھ۔ صاحب تکمیل البرہان نے علامہ شعرانی کا ایک قول نقل کیا ہے اس کے ساتھ اس قول کو بھی ملا کر دیکھیں تو حقیقت واضح ہوجائے گی کہ قرآن و حدیث کے احکام کو برابر کرنا صحیح نہیں جو حکم قرآن سے ثابت ہو اُس کو فرض اور جو حدیث سے ثابت ہو اُسے واجب کہنا چاہیے۔"

نواں اثر حضرت عائشہ رضؓ کا ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرآت کا امر کرتی تھیں۔ اس میں سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں۔ نہ یہ تصریح ہے کہ امام کے ساتھ ساتھ نماز جہری میں قرارت کا امر کرتی تھیں یا نماز سری میں اور جہری نماز میں امام کے سکتات میں۔ پس اس میں اہل حدیث کے لئے کوئی حجت نہیں، ہم بتلا چکے ہیں کہ دس صحابہ جن میں خلفاء اربعہ بھی شامل ہیں قرارت خلف الامام سے بہت سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے۔ ان صحابہ کا قول نص قرآن واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا۔ اور حدیث صحیح اذا قرأ الامام فانصتوا کے موافق ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے اس کو سنو اور خاموش رہو اور جب امام قرارت کرے تم خاموش رہو، پس ترجیح اسی کو ہوگی حضرت عائشہ رضؓ کے قول مجمل سے قرآن و حدیث صحیح کو ترک نہیں کیا جائے گا۔ اس میں تاویل کی جائے گی کہ سری نماز

میں یا جہری کے سکتات میں قراءت کرتی ہوں گی ۔

دسواں اثر حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ہے کہ ہم امام کے پیچھے ظہر و عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت پڑھتے تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ ۔

....

تو کیا صاحب تکمیل اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کے ذمہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ بھی ایک سورت پڑھنا واجب ہے ؟ اگر وہ اس کے قائل نہیں تو ایسا اثر خود ان پر حجت ہے جس پر وہ عمل نہیں کرتے ۔ پھر یہ حدیث مضطرب ہے کیوں کہ ابن ماجہ نے اس کو یزید فقیر کے واسطہ سے حضرت جابر سے روایت کیا ہے اور بیہقی نے جزء القراءت میں یزید فقیر ہی کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے مگر اس میں خلف الامام کا ذکر نہیں صرف اتنا ہے کہ وہ پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور پڑھتے تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھتے تھے ۔ پھر بیہقی نے عبیداللہ بن مقسم سے حضرت جابر سے روایت کیا اس میں بھی خلف الامام کا ذکر نہیں اس کا مضمون یہ ہے کہ نماز میں قراءت کی سنت یہ ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت پڑھے اور پچھلی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ ۔ پھر اعمش کے واسطہ سے یزید فقیر سے حضرت جابر سے ان لفظوں کے ساتھ روایت کیا ۔ اقرأ فی الاولیین بالحمد وسورة وفی الاخریین بالحمد ۔ کہ پہلی دونوں رکعتوں میں الحمد اور ایک سورت پڑھو اور پچھلی دو میں الحمد پڑھو پس ایسی مضطرب روایت سے اس حدیث کا معارضہ نہیں ہو سکتا جس کو امام مالک نے موطا میں بسند صحیح اور امام ترمذی نے جامع میں بسند حسن صحیح روایت کیا ہے کہ حضرت جابر رض فرماتے ہیں جس نے کسی رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو (تو اس کی نماز بغیر قراءت کے درست ہے) اور حافظ ابن حجر نے اس کو مشہور بتلایا ہے پھر ابن ماجہ کی روایت سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت کرتے تھے اور اس کو ہم بھی جائز کہتے ہیں یہ کہاں معلوم ہوا کہ وہ جہری نمازوں میں بھی امام کے ساتھ ساتھ قراءت کرتے تھے اور محل نزاع یہی صورت ہے ۔

گیارھواں اثر حضرت عبادة الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے جس کو ابو داؤد نے نافع بن محمود سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبادہ رض نے صبح کی نماز میں دیر کی تو ابو نعیم نے نماز پڑھائی اتنے میں عبادہ رض آگئے اور میں ان کے ساتھ تھا ہم ابو نعیم کے پیچھے صف میں کھڑے ہو گئے ابو نعیم اس وقت جہر سے قراءت کر رہے تھے عبادہ رض نے سورہ فاتحہ پڑھنی شروع کر دی نماز سے فارغ ہو کر میں نے کہا کہ میں نے آپ کو سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے سنا حالانکہ ابو نعیم جہر سے قراءت کر رہے تھے حضرت عبادہ نے کہا ہاں ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی الخ پھر اس کو تمہید ابن عبدالبر اور مستدرک حاکم سے نقل کیا گیا ہے اُس میں محمود بن ربیع کی طرف اس سوال و جواب کو منسوب کیا گیا ہے میں کہہ چکا ہوں کہ یہ حدیث مضطرب ہے اور اس کے اضطراب کی تفصیل بھی بیان کر چکا ہوں اور یہ کہ اس کے تمام طرق میں راجح وہی طریق ہے جس کو امام بخاری و مسلم نے اختیار کیا ہے اس میں صرف اتنا مضمون ہے کہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز نہیں ہے امام یا مقتدی کا اس میں اصلاً ذکر نہیں ہے اور سفیان بن عیینہ اور زہری اور امام احمد نے اس کو منفرد پر محمول کیا ہے ۔ اور جس طریق میں نافع یا محمود کا سوال و جواب مذکور ہے اس کو امام احمد اور یحییٰ بن معین اور ایک جماعت ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے ۔ پھر صاحب تکمیل البرہان کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ محمود بن ربیع صحابی صغیر ہے اور نافع تابعی متوسط ہے ۔

(کما فی التقریب مستور من الثالثة) ان دونوں کا حضرت عبادہ کی قراءت خلف الامام پر انکار کرنا کیا بتلاتا ہے ؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نے حضرت عبادہ کے سوا کسی صحابی کو قراءت خلف الامام کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا ۔ اور نہ ان دونوں

کے نزدیک مقتدی کو قرارت خلف الامام جائز تھی۔ اور نہ وہ اب تک قرارت خلف الامام کے عادی تھے جبھی تو حضرت عبادہ کی قرارت پر انکار کیا۔ تو اگر ایک صحابی سے قرارت خلف الامام کا ثبوت ہو بھی گیا تو اس سے اہل حدیث کا مدعی کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ جب کہ اسی اثر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس صحابی کے سوا دوسرے صحابہ قرارت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔

بارہواں اثر عبداللہ بن عباس کا ہے۔ کہ انھوں نے فرمایا امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرو۔ پھر اسی کو عیزار بن حریث کے واسطہ سے نقل کیا گیا ہے، اس کی سند میں ابو بکر بر بہاری ہے جس پر دارقطنی اور محمد بن ابی الفوارس نے جرح کی ہے۔ اور ابوالبرقانی اور ابن السرخسی نے کذاب کہا ہے۔ ابوالحسن بن الفرات نے اس کو مخلط کہا ہے یعنی روایت میں گڑبڑ کرتا ہے۔ اس پر غفلت غالب تھی۔ ہم ابوجمرہ کے واسطے عبداللہ بن عباس کی روایت نقل کر چکے ہیں کہ ان سے سوال کیا گیا جب امام میرے آگے ہو تو میں بھی قرأت کر لیا کروں؟ فرمایا نہیں۔ اس کی سند حسن ہے۔ نیز ابن عباس ہی نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کو امام کی قرارت کافی ہے خواہ وہ آہستہ پڑھے یا جہر کرے۔ اور اس کی سند بھی حسن ہے۔ پس یا تو ایک روایت کو رد کیا جائے اور دوسری کو قبول کیا جائے جو بھی نص قرآن اذا قرأ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا اور حدیث صحیح اذا قرأ الامام فانصتوا کے موافق ہے۔ یا دونوں کو اس طرح جمع کیا جائے کہ عبداللہ بن عباس مقتدی کے حق میں قرأت کو فرض نہیں سمجھتے تھے۔ امام کی قرارت کو اس کیلئے کافی سمجھتے تھے اور نماز جہری میں امام سے پہلے یا سکتہ کے وقت قرأت کو مستحب جانتے تھے اسی طرح نماز سری میں بھی۔ اور اس سے حنفیہ بھی منع نہیں کرتے جیسا مفصل بار بار گزر چکا ہے۔

تیرہواں اثر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔ ابو مریم کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مسعودؓ کو امام کے پیچھے پڑھتے ہوئے سنا۔ صاحب تکمیل کو یہ اثر نقل کرتے ہوئے شرمانا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں نہ سورۃ فاتحہ کا ذکر ہے نہ کسی اور سورۃ کا۔ ممکن ہے وہ ثناء یعنی سبحانک اللھم وبحمدک الخ اور انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین پڑھ رہے ہوں جو مقتدی امام کی قرأت سے پہلے پڑھا کرتا ہے۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ وہ امام کی قرأت کے ساتھ کچھ پڑھتے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب کا مذہب مشہور ہے کہ وہ قرارت خلف الامام سے بہت سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔ چنانچہ ہم پہلے اچھی طرح واضح کر چکے ہیں۔ ہاں اگر امام لحّان (غلط خواں جاہل) ہو تو اس کے پیچھے مقتدی کو قرارت کی اجازت دیتے تھے۔ اور اس کے بعض فقہا رحنفیہ بھی قائل ہیں۔

روی الطبرانی فی الکبیر بسند رجالہ ثقات عن ابی مسعود انہ قال یا فلان لا تقرأ خلف الامام الا ان یکون اماما لا یقرأ (مجمع الزوائد) ای الا ان یکون الامام لحانا فحینئذ یجوز للمقتدی ان یقرأ خلفہ وھذا وجہ ذھب الیہ بعض اصحابنا۔ (عمدۃ القاری)

طبرانی نے بہ روایت ثقات عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے انھوں نے فرمایا۔ اے فلاں امام کے پیچھے قرأت نہ کرنا۔ مگر یہ کہ امام قاری نہ ہو (اُمّی ہو تو قرأت کر لیا کرو) مجمع الزوائد۔

اس کے بعد صاحب تکمیل نے ترمذی کی ایک عبارت نقل کر دی ہے کہ حدیث عبادہ حدیث حسن صحیح ہے اور اصحاب رسول وغیرہ اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے ان ہی میں سے حضرت عمر فاروق رضؓ وجابر بن عبداللہ وعمران بن حصین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ ان سب کا قول اور فتویٰ یہی ہے کہ بغیر سورۃ فاتحہ کے نماز کام^(ع) ہی کی نہیں بالکل بیکار ہے۔ اھ مگر حدیث عبادہ کے الفاظ نقل نہیں کئے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ع لا تجزئ صلوٰۃ کا یہ ترجمہ ایجاد بندہ ہے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز کافی نہیں۔

لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔

تو اس سے کس کو انکار ہے حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ گفتگو قرأت خلف الامام میں ہے کہ مقتدی پر بھی قرأت واجب ہے یا نہیں کہ حدیث عبادہ میں اس کا ذکر نہیں اور دوسری احادیث صحیحہ سے ہم بتلا چکے ہیں کہ مقتدی کے لئے امام کی قرأت کافی ہے۔ مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم ہے۔ اور جس جگہ امام ترمذی نے قرأت خلف الامام کا ذکر کیا ہے۔ وہاں محمد بن اسحٰق کے واسطہ سے محمود بن ربیع کی حدیث حضرت عبادہ سے نقل کرکے جس میں لاتفعلوا الا بام القرآن آیا ہے۔ (کہ امام کے پیچھے نہ پڑھو مگر سورۂ فاتحہ) یہ تصریح بھی کردی ہے کہ اس حدیث کو زہری نے محمود بن ربیع سے حضرت عبادہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں روایت کیا ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ وھذا اصح اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ جس میں اشارہ کردیا کہ محمد بن اسحٰق کا لاصلوٰۃ الا بام القرآن زیادہ کرنا صحیح نہیں۔ پس گفتگو قرأت فاتحہ میں نہیں ہے کہ اس کا وجوب امام و منفرد پر متفق علیہ ہے۔ بلکہ قرأت خلف الامام میں گفتگو ہے۔ اور ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث عبادہ سے مقتدی پر قرأت خلف الامام کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ امام ترمذی نے باب ترک القرأت خلف الامام منعقد کرکے امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:۔ واما الامام احمد بن حنبل فقال معنی قولہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اذا کان وحدہٗ واحتج بحدیث جابر بن عبداللہ حیث قال من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام قال احمد فھذا رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ تاول قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ان ھذا اذا کان وحدہ اھ ص۴۲ اھ۔

لیکن احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ حدیث عبادہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس شخص کے لئے ہے جو تنہا نماز پڑھے اور حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز کی کسی رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں، مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو۔

امام احمدؒ نے فرمایا کہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صحابی نے حدیث کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ جو شخص تنہا نماز پڑھے اس کی نماز بغیر قرأت فاتحہ کے نہیں ہوتی۔ مقتدی کے لئے اس کو عام نہیں سمجھا۔ تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بیہقی وغیرہ کا قول تو حجت ہو اور امام احمدؒ کا قول حجت نہ ہو۔ اس کے بعد صاحب تکمیل البرہان نے جزو القرأت بیہقی سے حضرت عمران بن حصین کا قول نقل کیا ہے کہ کسی مسلمان کی نماز بغیر وضو اور بغیر رکوع اور بغیر سجود اور بغیر فاتحہ کے پاک نہیں ہوتی، امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔ اس اثر کے جملہ اجزاء متفق علیہ ہیں۔ بجز وراء الامام وغیر الامام کے جس سے امام کے پیچھے قرأت فاتحہ کا ثبوت دیا گیا ہے۔

صاحب تکمیل کو لازم تھا کہ اس جزو کی صحت کو ثابت کرے کیونکہ اس کی سند میں زیاد بن ابی زیاد الجصاص ہے۔ جس کو امام احمدؒ اور یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی اور ابوزرعہ اور ابو حاتم اور نسائی اور فضل غلابی اور دارقطنی اور ابن عدی نے ضعیف، متروک، مذموم، منکر الحدیث کہا ہے اور اس کے معارض وہ حدیث ہے جو امام بیہقی نے ہی سلمۃ بن فضل سے حجاج بن ارطاۃ سے قتادہ سے زرارۃ بن اوفی سے حضرت عمران بن حصین رضؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ اور ایک شخص آپ کے پیچھے قرأت کر رہا تھا۔۔ جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا مجھ سے میری سورۃ میں کون منازعت کر رہا تھا؟ پھر آپ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کردیا۔ امام بیہقی نے اس میں یہ کلام کیا ہے کہ فنھی عن القرآت خلف الامام تنہا حجاج بن ارطاۃ نے اس حدیث میں زیادہ کیا ہے (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد قرأت خلف الامام سے منع کردیا) میں کہتا ہوں حجاج بن ارطاۃ محمد بن اسحٰق سے زیادہ قوی ہے

جس کی روایت کو بیہقی اور اہل حدیث بار بار حجت میں پیش کرتے ہیں حجاج بن ارطاۃ سے امام مسلم نے مقروناً روایت کی ہے امام بخاری نے تعلیقاً اس سے استشہاد کیا ہے شعبہ اس کی بہت تعریف کرتے تھے اسی طرح حماد بن زید اور سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری نے اس کے تیقظ اور حفظ حدیث کی تعریف کی ہے جملہ ائمہ حدیث اس سے روایت کرتے ہیں ترمذی نے اس کی بعض احادیث کی تصحیح کی ہے اور اکثر کی تحسین کی ہے اور اس سے روایت کرنے والا سلمۃ بن الفضل بھی ثقہ ہے یحییٰ ابن معین نے اس کی توثیق کی اسی طرح ابو داؤد اور ابن سعد اور امام احمد نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ پس جصاص کی روایت سے احتجاج کرنا اور حجاج بن ارطاۃ کی روایت سے اعراض کرنا انصاف سے بعید ہے اور اپنے مذہب کی حمایت کے سوا کچھ نہیں ہے" اس کے بعد صاحب تکمیل نے تابعین کے فتاویٰ بھی نقل کئے ہیں گو اہل ظاہر کو تابعین کے اقوال سے احتجاج کرنا زیب نہیں دیتا جن کے نزدیک حدیث مرفوع کے سوا قول صحابی بھی حجت نہیں ہے۔

سب سے پہلے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ نقل کیا ہے مگر ترجمہ نہیں کیا کیوں کہ وہ مؤلف کے خلاف تھا حاصل اس کا یہ ہے کہ ان سے عبداللہ بن عثمان بن خثیم نے سوال کیا کہ کیا میں امام کے پیچھے قرارت کروں؟

فرمایا ہاں اگرچہ اس کی قرارت کو سنتے بھی ہو لوگوں نے آجکل نیا طریقہ نکالا ہے جو سلف نہیں کرتے تھے۔ سلف کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی امام بنتا تھا وہ تکبیر (تحریمہ) کہہ کر خاموش رہتا تھا یہاں تک کہ اس کے خیال میں مقتدی اس کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھ چکے ہوں پھر وہ قرارت شروع کرتا اور لوگ خاموش رہتے۔

میں کہتا ہوں اس اثر میں سلف کا جو طریقہ بیان کیا ہے اس میں تصریح ہے کہ وہ امام کے ساتھ قرارت نہ کرتے تھے بلکہ سکتہ امام میں قرارت کرتے اور امام کی قرارت کے وقت خاموش رہتے تھے" اور اس صورت میں کوئی اختلاف نہیں سکتہ امام میں قرارت کو ہم بھی جائز کہتے ہیں اور وجوب کی کوئی دلیل نہیں کیوں کہ امام پر سکتۂ طویلہ کا واجب ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ علامہ ابن تیمیہ کے حوالہ سے اس کا ذکر گزر چکا ہے اور خود سعید بن جبیر کا جو قول بیان کیا گیا ہے اس کے خلاف مصنف ابن ابی شیبہ میں بواسطہ ہشیم کے سعید بن جبیر کا یہ فتویٰ مذکور ہے کہ ان سے قرارت خلف الامام کی بابت سوال کیا گیا تو فرمایا امام کے پیچھے قرارت نہیں ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں جن سے اصحاب صحاح نے احتجاج کیا ہے۔ پس ان کا جو فتویٰ نص قرآن اور حدیث صحیح اذا قرأ الامام فانصتوا کا موافق ہوگا وہی راجح اور صحیح ہوگا اس کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے استاد حماد بن ابی سلیمان کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ ان سے نماز ظہر اور عصر میں (صاحب تکمیل نے یہ جملہ حذف کر دیا ہے مغالطہ دینا اس کو کہتے ہیں) قرارت خلف الامام کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا سعید بن جبیر پڑھتے تھے میں نے کہا آپ کا فتویٰ کیا ہے؟

فرمایا میں بھی اس کو پسند کرتا ہوں کہ قرارت کرو۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعید بن جبیر صرف ظہر و عصر میں قرارت خلف الامام کے قائل تھے اسی کو حماد نے پسند کیا اور ایک روایت میں جس کو صاحب ہدایہ نے امام محمد سے نقل کیا ہے امام ابو حنیفہ نے بھی اس کو پسند کیا ہے گفتگو صرف اس صورت میں ہے کہ امام قرارت جہر سے کر رہا ہو اس کے متعلق صاحب تکمیل کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ اس حالت میں بھی مقتدی پر قرارت واجب ہے۔

اس کے بعد مکحول شامی کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ مکحول نے صرف دو تین صحابہ کو دیکھا ہے ان کے فتوے کی محمد بن سیرین کے فتوے کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ جو فرماتے ہیں کہ میں امام کے پیچھے قرارت کرنے کو سُنّت نہیں سمجھتا جیسا بسند صحیح ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے ہم بیان کر چکے ہیں۔ رہا امام بخاری کا جزو القرارت میں یہ فرمانا کہ تابعین میں سے

فلاں فلاں (گیارہ حضرات) قرارت خلف الامام کے قائل وعامل تھے" اس کے متعلق سند اور الفاظ کا سامنے ہونا ضروری ہے کیوں کہ ممکن ہے وہ حضرات نماز سری میں یا جہری کے سکتات امام میں قرارت کے قائل ہوں اور اس کو ہم بھی منع نہیں کرتے امام بخاری نے بہت سے صحابہ اور تابعین کا نام قرارت خلف الامام کے قائلین میں شمار کر دیا ہے حالانکہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مطلقاً اس کے قائل نہ تھے بلکہ نماز سری میں یا جہری کے سکتات میں قرارت خلف الامام کے قائل تھے اور ہم بار بار بتلا چکے ہیں کہ اس صورت میں نزاع نہیں۔ چنانچہ صاحب تکمیل نے حضرت سعید بن جبیر اور ابو سلمہ[2] اور حسن بصری[3] کا فتویٰ اپنی تائید میں نقل کر دیا حالانکہ اول و دوم سکتۂ امام میں قرارت کے قائل ہیں اور امام حسن بصری فی نفسک کی قید بڑھاتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرو اور اس کو کوئی منع نہیں کرتا۔ صاحب تکمیل کا یہ ترجمہ کہ "آہستہ پڑھ لیا کرو" ہم پر حجت نہیں پھر جزء القرارت امام بخاری کے حوالہ سے یہ بھی لکھ دیا کہ حسن بصری وسعید بن جبیر اور میمون بن مہران وغیرہ بے شمار تابعین نے امام کے پیچھے قرارت کرنے کو کہا ہے" حالانکہ حسن بصری اور سعید بن جبیر کے الفاظ سے سکتۂ امام کے وقت یا دل میں پڑھنے کی قید صاف مذکور ہے عطار بن ابی رباح کا فتویٰ حنفیہ کے موافق ہے اہل حدیث کے موافق نہیں وہ فرماتے ہیں کہ جب امام جہر سے قرارت کرے تو مقتدی جلدی کرے اور امام کے سکوت میں سورہ فاتحہ پڑھ لے اور جب امام قرارت کرے تو خاموش رہے جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عطار بن ابی رباح کے نزدیک آیت واذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا قرارت خلف الامام کے متعلق نازل ہوئی ہے اور مقتدی پر امام کی قرارت کے وقت خاموش رہنا واجب ہے۔ رہا مجاہد کا فتویٰ کہ جو شخص امام کے پیچھے قرارت نہ کرے اس کو نماز کا اعادہ کرنا چاہیئے اسی طرح عبداللہ بن زبیر نے فرمایا ہے" تو اس میں سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں نہ اس کا ذکر ہے کہ امام کے ساتھ ساتھ قرارت کرے یا اس کے سکوت کے وقت۔ اس لئے اس سے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں امام احمد کا قول کتاب المغنی سے نقل کر دیا ہے کہ مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے قرارت کا واجب نہ ہونا اجماعی مسئلہ ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سُنا کہ جب امام قرارت جہر کرے اور اس کے پیچھے مقتدی قرارت نہ کرے تو اس کی نماز صحیح نہ ہوگی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین اور اہل حجاز میں امام مالک اور اہل عراق میں سفیان ثوری اور اہل شام میں اوزاعی اور اہل مصر میں لیث (بن سعد) ان میں سے کوئی نہیں کہتا کہ جس نے امام کے پیچھے قرارت نہ کی ہو اور امام نے قرارت کی ہو تو نماز باطل ہے اھ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد کے نزدیک یا تو مجاہد اور عبداللہ بن زبیر کا فتویٰ مذکورہ بسند صحیح ثابت نہیں یا اس کا وہ مطلب صحیح نہیں جو اہل حدیث نے سمجھا ہے۔ اسی طرح

صاحب تکمیل نے تمہید ابن عبدالبر سے امام اوزاعی اور لیث بن سعد کا جو فتویٰ نقل کیا ہے کہ وہ مقتدی کے ذمہ قرارت خلف الامام کو ضروری سمجھتے تھے قابل قبول نہیں۔ کیوں کہ امام احمد بن حنبل اقوال علمار کو ان سے زیادہ جانتے ہیں

امام لیث بن سعد مصری کے متعلق تاریخ ابن خلکان میں ہے کہ وہ حنفی تھے معانی الآثار طحاوی میں باب قرارت خلف الامام میں لیث بن سعد کی روایت امام یوسف رح سے امام ابوحنیفہ رح سے موسیٰ بن ابی عائشہ رض سے عبداللہ بن شداد سے حضرت جابر بن عبداللہ سے موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من کان له امام فقرأت الامام له قرأت جو شخص امام کے ساتھ (نماز پڑھتا) ہو تو امام کی قرارت اس کے لئے قرارت ہے۔

لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنتا تھا اور ان سے ملنے کا مشتاق تھا پھر ان سے ملنے مکہ میں

ان کو اس حال میں پایا کہ لوگ ان پر ہجوم کئے ہوتے تھے اور (مسائل شرعیہ میں) فتویٰ طلب کر رہے تھے اسی حالت میں ایک شخص نے اپنی کسی خاص حاجت میں فتویٰ پوچھا تو مجھے انکے فی البدیہ جواب سے بڑا تعجب ہوا (فیض ص۱۷۸ ج۱) اس سے بھی ان کا حنفی ہونا ثابت ہو تا ہے تو ممکن ہے امام ابوحنیفہ کی روایت کردہ حدیث سننے سے پہلے وہ قرارت خلف الامام کے قائل ہوں جب یہ حدیث سنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھے اس کے لئے امام کی قرارت کافی ہے، اس کے بعد قرارت خلف الامام کے قائل نہیں رہے۔ ترمذی سے عبداللہ بن مبارک کا جو قول نقل کیا گیا ہے کہ میں امام کے پیچھے قرارت کرتا ہوں اور لوگ بھی قرارت کرتے ہیں مگر کوفہ والوں میں سے ایک قوم۔ تو یہ بھی عبداللہ بن مبارک کا ارشاد دلائل اہل عراق سننے سے پہلے ہوگا کیوں کہ بعد میں ان کا حنفی مذہب اختیار کرنا دنیا کو معلوم ہے۔

مؤرخین اور اصحاب طبقات نے ان کو حنفیہ میں شمار کیا ہے بعض لوگوں نے صرف اس لئے کہ وہ امام مالک سے روایت کرتے ہیں مالکیہ میں شمار کر دیا ہے مگر ان کی فقہی کتابیں اقوال ابوحنیفہ سے مزین و مملو ہیں امام مالک کا قول شاذ و نادر ہی بیان کرتے ہیں۔ ان کے اس قول سے الاقوم من الکوفیین (مگر کوفہ والوں میں سے ایک قوم) یہ سمجھنا کہ کوفہ والوں میں سے صرف ایک جماعت قرارت خلف الامام نہیں کرتی تھی باقی سب کرتے تھے۔ صاحب تکمیل کی خوش فہمی ہے۔ اہل کوفہ عبداللہ بن مسعود اور انکے اصحاب اور اصحاب علی رضؓ کے مسلک پر تھے اور ان حضرات کا مذہب ترک قرارت خلف الامام مشہور و معروف ہے صاحب تکمیل کو علامہ ابن تیمیہ کا قول پھر یاد کر لینا چاہیئے جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ "جو لوگ امام کے ساتھ قرارت سے (مقتدی کو) منع کرتے ہیں ان کے ساتھ جمہور سلف و خلف ہیں اور ان کی تائید میں کتاب اللہ اور سنت صحیحہ بھی ہے اور جو لوگ مقتدی پر امام کے ساتھ قرارت کو واجب کہتے ہیں ان کی حدیث کو ائمہ (حدیث) نے ضعیف قرار دیا ہے اور حدیث ابوموسیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد واذا قرا فانصتوا (جب امام) قرارت کرے تو خاموش رہو امام احمد و اسحٰق (بن راھویہ) اور امام مسلم وغیرہ کے نزدیک صحیح ہے بخلاف اس حدیث کے (جس سے قرارت فاتحہ خلف الامام کا وجوب ثابت کیا جاتا ہے اس کو صحیح میں شامل نہیں کیا گیا اور چند وجوہ سے اس کا ضعیف ہونا ثابت ہو چکا ہے اور وہ صرف عبادۃ بن الصامت کا قول ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں) اس کے بعد صاحب تکمیل نے قرارت فاتحہ خلف الامام کا ثبوت ائمہ کرام کے اقوال سے دینا چاہا ہے جن میں امام مالک اور امام احمد کو بھی شامل کر لیا ہے حالانکہ کتاب المغنی کے حوالہ سے ہم بتلا چکے ہیں کہ امام احمد کا قول وجوب قرارت فاتحہ خلف الامام ہرگز نہیں وہ تو اس بات پر اجماع نقل کرتے ہیں کہ مقتدی کے ذمہ قرارت فاتحہ کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں اور جہری نماز میں تو امام مالک اور احمد بن حنبل امام کے پیچھے قرارت کو ناجائز کہتے اور مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم دیتے ہیں البتہ سری نماز میں قرارت خلف الامام کی اجازت دیتے ہیں۔ بقیہ ائمہ کرام کا مذہب بھی آپ نے ایسا ہی نقل کیا ہوگا جیسا امام احمد اور مالک کا مذہب نقل کیا ہے اس لئے جب تک انکے الفاظ سامنے نہ ہوں اس وقت تک فیصلہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ صاحب تکمیل نے امام زہری کا نام بھی اسی فہرست میں شمار کر دیا ہے حالانکہ ہم مؤطا مالک اور جزء القرأت بیہقی کے حوالہ سے دکھلا چکے ہیں کہ زہری نماز جہری ہی میں قرارت خلف الامام کو سختی سے منع کرتے تھے امام مسلم کا اپنی جامع صحیح میں اذا قرأ الامام فانصتوا کی روایت کو داخل کرنا اور حدیث ابی موسیٰ و ابی ہریرہ میں اس زیادت کو صحیح قرار دینا بتلا رہا ہے کہ امام مسلم کے نزدیک قرارت خلف الامام نہیں ہے بلکہ مقتدی کو خاموش رہنا ضروری ہے اس کے خلاف جب تک ان کے صاف الفاظ نہ ہوں اس وقت تک ان کو قرارت فاتحہ خلف الامام کرنے والوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ امام نووی کی جو عبارت صاحب تکمیل نے

نقل کی ہے کہ جمہور علماء سلف وخلف کے نزدیک ہر رکعت میں فاتحہ پڑھنا واجب ہے اس میں قرارت خلف الامام کا ذکر نہیں صرف قرارت فاتحہ کا ذکر ہے اور اس کو ہم بھی امام اور منفرد کے حق میں واجب کہتے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب کا مسلک حجۃ اللہ البالغہ سے ہم نقل کر چکے ہیں کہ نماز جہری میں ان کے نزدیک مقتدی کو خاموش رہنا واجب ہے وہ صرف سری نمازوں میں یا جہری کے سکتات میں قرارت خلف الامام کی اجازت دیتے ہیں اور اس میں کسی کو خلاف نہیں اسی طرح تفسیر خازن سے جو عبارت نقل کی گئی ہے اس میں بھی قرارت خلف الامام کا ذکر نہیں صرف قرارت فاتحہ کا وجوب مذکور ہے اور اس میں گفتگو نہیں محل نزاع قرارت فاتحہ خلف الامام ہے غرض امام نووی ہوں یا بغوی ان سب نے فقط سورۃ فاتحہ کا واجب ہونا بیان کیا ہے اس کو حنفیہ بھی مانتے ہیں گفتگو اس میں ہے کہ امام کی قرارت سے یہ واجب مقتدی کے ذمہ سے ادا ہوتا ہے یا نہیں؟ سو امام احمد کے قول سے معلوم ہو چکا ہے کہ اہل اسلام میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ امام کے ساتھ اگر مقتدی قرارت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے پس صاحب تکمیل کا وجوب فاتحہ کے اقوال سے قرارت فاتحہ خلف الامام پر استدلال کرنا محض مغالطہ ہے امام رازی کا حدیث قسمت الصلوٰۃ بینی بین عبدی سے رکنیت فاتحہ پر استدلال کرنا جو وزن رکھتا ہے اہل علم اس کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیوں کہ خبر واحد سے رکنیت ثابت کرنا ان ہی لوگوں کا کام ہے جو رکن اور واجب کے فرق سے ناواقف ہیں پھر اس حدیث سے یہ بھی تو ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں جو امام رازی اور جملہ اہل حدیث کے خلاف ہے جو جواب وہ اس کا دیں گے وہی ہماری طرف سے جواب ہوگا۔ رہا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفائے راشدین نے نماز میں قرارت فاتحہ پر مواظبت اور مداومت کی ہے سو اس سے صرف امام اور منفرد پر قرارت فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور حنفیہ اس کے قائل ہیں قرارت فاتحہ خلف الامام کا وجوب اس سے کیوں کر معلوم ہوا؟ جبکہ حدیث صحیح میں مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم ہے۔ اذا قرأ الامام فانصتوا۔ اور نص قرآن سے بھی مقتدی پر استماع وانصات کا وجوب ثابت ہے واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔ اور ہم بار بار بتلا چکے ہیں کہ بالاجماع یہ آیت قرارت خلف الامام سے منع کرنے میں نازل ہوئی ہے۔

نیز ہم نے کتاب کشف الاسرار کے حوالہ سے گزشتہ اوراق میں بتلا دیا ہے کہ حضرات صحابہ میں سے دس حضرات نے سختی کے ساتھ قرارت خلف الامام سے منع کیا ہے جن میں خلفاء اربعہ بھی داخل ہیں۔ اس کے بعد صاحب تکمیل نے قرارت خلف الامام کا ثبوت مشائخ کرام وصوفیہ عظام کے اقوال سے دینا چاہا ہے مگر یہاں بھی وہی مغالطہ دیا ہے کہ بعض حضرات نے قرارت سورۂ فاتحہ کو ضروری فرمایا تھا۔ آپ نے اس سے قرارت فاتحہ خلف الامام پر دلیل قائم کر دی حالانکہ قرارت فاتحہ کے واجب ہونے میں کسی کو کلام نہیں گفتگو قرارت خلف الامام میں ہے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے اسی طرح خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی اور خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ شہاب الدین سہروردی کے اقوال سے صرف قرارت فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے نہ کہ قرارت خلف الامام کا۔ سلطان نظام الدین اولیاء کے تذکرہ سے نقل کیا گیا ہے۔ لکنه یجوز القرأة بالفاتحة خلف الامام فی الصلوٰۃ وکان یقرأها فی نفسه کہ وہ حنفی تھے لیکن قرارت فاتحہ خلف الامام کو جائز کہتے تھے اور فی نفسہ قرارت کرتے تھے صاحب تکمیل کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آہستہ پڑھتے تھے ہمارے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ دل میں پڑھتے یا امام کی قرارت سے پہلے یا اس کے سکتہ میں تنہا قرارت کرتے تھے ساتھ ساتھ قرارت نہ کرتے تھے اگر وہ نماز جہری میں امام کے ساتھ قرارت کرتے تھے تو اس کا واضح ثبوت پیش کرنا چاہئیے اور یہ بھی

بتلانا چاہیئے کہ حضرات صحابہ وتابعین وائمۂ مجتہدین اور جمہور سلف وخلف کے مقابلہ میں ان حضرات کی رائے کیا وزن رکھتی ہے؟

اس کے بعد صاحب تکمیل نے قرارت خلف الامام کا ثبوت امام ابوحنیفہ اور علماء احناف کے اقوال سے دینا چاہا ہے سب سے پہلے علامہ شعرانی کی میزان کبریٰ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ قرارت فاتحہ خلف الامام کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے دو قول ہیں ایک یہ کہ مقتدی کو الحمد پڑھنا واجب ہے نہ سنت یہ انکا پرانا قول ہے اور یہی مشہور ہوگیا دوسرا قول یہ ہے کہ بر سبیل احتیاط سری نماز میں قرأت فاتحہ مستحسن ہے مکروہ نہیں الخ اس پر صاحب تکمیل کا یہ حاشیہ کہ "یار لوگوں نے اس رجوع کو (یعنی دوسرے قول کو) مشہور نہ ہونے دیا جس کے باعث مسلمانوں میں فرقہ بازی دھڑا بندی قائم ہوگئی" سراسر لغو ہے کیوں کہ اول تو دونوں قولوں میں کچھ تعارض نہیں پچھلے قول میں وجوب اور سنیت کی نفی تھی دوسرے میں استحباب کا ذکر ہے کوئی بتلائے کہ ان میں تعارض کیا ہوا؟ پھر ہدایہ میں جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب اور داخل درس ہے یہ دوسرا قول مذکور ہے کہ امام محمد نے احتیاطاً سری نمازوں میں قرارت فاتحہ کو مستحسن قرار دیا ہے۔ ہدایہ سے زیادہ کونسی کتاب فقہ حنفی میں مشہور ہے؟........ تو یہ کہنا غلط ہے کہ یار لوگوں نے دوسرے قول کو مشہور نہ ہونے دیا۔

پھر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور حضرت فقیہ الامت رشید الملت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب سبیل الرشاد میں اس کی تصریح کی ہے کہ جہری کے سکتات میں قرارت فاتحہ خلف الامام جائز ہے۔ امام کے ساتھ ساتھ جہری نماز میں قرارت کرنا مقتدی کو منع ہے۔ صاحب تکمیل کا یہ کہنا کہ جب امام صاحب اپنے ایک قول کو غلط سمجھکر اس سے رجوع کر چکے پھر ان کے ذمہ اس کو لگانا اور اس پر مباحثے اور مناظرے کرکے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا کہانتک دیانت وانصاف ہے الخ سراسر لغو ہے امام صاحب نے اپنے پہلے قول سے رجوع نہیں فرمایا رجوع کی ضرورت تھی کیونکہ امام احمد بن حنبل کے قول سے ظاہر ہو چکا ہے کہ "اہل اسلام میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ جب امام قرارت کر رہا ہو اس وقت مقتدی کے ذمہ قرارت واجب ہے اور اگر وہ قرارت نہ کرے تو اس کی نماز فاسد ہے"

امام صاحب نے دوسرے قول سے صرف سری نمازوں میں احتیاطاً قرارت فاتحہ کو مستحسن اور مستحب فرمایا ہے جیسا صاحب ہدایہ نے امام محمد سے نقل کیا ہے اور یہ پہلے قول کے معارض نہیں اور جملہ کتب شروح میں یہ قول مذکور ہے رہا اس مسئلہ میں مناظرے اور مباحثے کرنا تو اس کی ابتدا جماعت اہل حدیث سے کی طرف سے ہوئی ہے انھوں نے صاحب تکمیل البرہان کی طرح حنفیوں کی نمازوں کو فاسد۔ باطل۔ بیکار کہہ کر آسمان سر پر اٹھالیا محض اس لئے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے تو علماء احناف کو اس کا جواب دینے کی ضرورت پیش آئی جیسا اس وقت اس ناچیز کو تکمیل البرہان کے جواب میں قلم اٹھانا پڑا اگر جماعت اہل حدیث مسائل خلافیہ میں اس قدر شدت کے ساتھ نزاع نہ کرتی تو حنفیہ کو مناظرہ ومباحثہ کی اصلاً ضرورت نہ تھی۔ آخر مکہ و مدینہ میں بھی تو شافعیہ موجود ہیں جو قرارت فاتحہ خلف الامام کو فرض جانتے ہیں مگر حنفیہ کی نمازوں کو باطل وفاسد نہیں کہتے وہ جانتے ہیں کہ مسئلہ اختلافی ہے حنفیہ کے پاس بھی قرآن وحدیث اور عمل سلف وخلف سے دلائل موجود ہیں اس لئے کسی کو حق نہیں کہ ایک دوسرے کے مسلک کو باطل اور نمازوں کو فاسد قرار دے اس لئے وہاں ان مسائل میں مناظرہ ومباحثہ کی کبھی نوبت نہ آئی۔ پاکستان یا ہندوستان میں اس کی نوبت جماعت اہل حدیث کی دریدہ دہنی کی وجہ سے پیش آئی والبادی اظلم غیث الغمام کے حوالہ سے علامہ عینی کا جو قول شرح بخاری سے نقل کیا گیا ہے اس میں یہ لفظ تو ہے علی ان بعض اصحابنا استحسنوا ذالک علی سبیل الاحتیاط فی جمیع الصلوات ومنھم من استحسنھا فی غیر الجہریۃ ومنھم من رأی ذالک اذا کان الامام لیحانا (ص ۱۳۱ ج ۲) پھر ہمارے بعض صحاب

(حنفیہ) نے اس (قرارت خلف الامام) کو بر سبیل احتیاط تمام نمازوں میں اور بعض نے سری نمازوں میں اور بعض نے امام محمد (علیہ الرحمن)
کے پیچھے مستحسن سمجھا ہے اھ ۔ مگر واجب نہیں سمجھا اور جہری نمازوں میں امام کی قرارت کے ساتھ مقتدی کو قرارت کی اجازت نہیں دی
بلکہ اس کی قرارت سے پہلے یا پیچھے اجازت دی ہے تاکہ فرض انصات فوت نہ ہو کیوں کہ مقتدی کے ذمہ قرارت امام کے وقت سننا اور
خاموش رہنا واجب ہے جس کی علامہ عینی نے اسی مقام پر تصریح کر دی ہے ۔ مگر علامہ عینی کی عبارت میں اس جگہ لفظ علیہ
فقہاء الحجاز والشام نہیں ہے (کہ فقہاء حجاز و شام بھی اسی پر ہیں) اگر غیث الغمام میں اس جگہ یہ لفظ موجود ہے تو علامہ عینی کی
طرف نسبت صحیح نہیں اور اگر اس میں بھی یہ لفظ نہیں ہے تو یہ صاحب تکمیل کی ایجاد ہے علامہ عینی کی عبارت میں جس جگہ فقہاء
حجاز و شام کا ذکر ہے وہ صاحب تکمیل کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہے ۔ ان کی عبارت ملاحظہ ہو ۔ وقال الثوری والاوزاعی
فی روایۃ وابو حنیفۃ وابو یوسف ومحمد واحمد فی روایۃ وعبد اللہ بن وہب والاشہب لایقرأ المؤتم شیئاً من القرآن
ولا بفاتحۃ الکتاب فی شیئ من الصلوات وھو قول ابن المسیب ۔ وجماعۃ من التابعین وفقہاء الحجاز والشام علی
انہ لا یقرأ معہ فیما یجھر بہ وان لم یسمعہ ویقرأ فیما یسر فیہ والامام اھ ص ۱۱ ج ۲ ۔۔۔ امام سفیان ثوری کا اور
امام اوزاعی کا ایک روایت میں اور امام ابو حنیفہ و ابو یوسف اور محمد کا اور امام احمد کا ایک روایت میں اور عبد اللہ بن وہب اور
اشہب کا قول یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے کچھ قرارت نہ کرے سورۃ فاتحہ بھی کسی نماز میں نہ پڑھے اور یہی قول سعید بن المسیب
اور تابعین کی ایک جماعت کا ہے ۔ اور فقہاء حجاز و شام کا مسلک یہ ہے کہ مقتدی جہری نمازوں میں (امام کے پیچھے) قرارت
نہ کرے اگرچہ اس کی قرارت کو سنتا بھی نہ ہو اور سری نمازوں میں قرارت کرے ۔ اس کے بعد مولانا عبد الحئی لکھنوی اور
شیخ التسلیم وغیرہ کے حوالہ سے جو کچھ لکھا گیا ہے سب کے اقوال میں صرف سری نمازوں میں قرارت خلف الامام کا استحسان
ہے سب کے اقوال میں صرف سری نمازوں میں قرارت خلف الامام کا استحسان ہے چنانچہ مولانا عبد الحئی رح ملا جیون رح استاد
عالمگیر رح کی عبارتوں میں امام محمد کے قول کا حوالہ صراحتاً موجود ہے اور امام محمد کے قول میں سری نمازوں کی قید صراحتاً مذکور ہے اور اس
میں کسی کو نزاع نہیں بلکہ ہم تو جہری نمازوں میں بھی امام کی قرارت سے پہلے یا پیچھے مقتدی کو قرارت فاتحہ کی اجازت دیتے ہیں
البتہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کو منع کرتے ہیں ۔ کہ اس صورت میں فرض انصات فوت ہوتا ہے جس کی قرآن و حدیث میں
تاکید ہے ۔ امام رازی کا یہ قول کہ امام ابو حنیفہ رح نے اس امر میں ہماری موافقت کی ہے کہ امام کے پیچھے الحمد پڑھنے سے نماز
باطل نہیں ہوتی اھ ۔ صاحب تکمیل کے لئے مفید نہیں کیوں کہ الحمد پڑھنے کی صورت میں نماز کے باطل نہ ہونے سے
قرارت خلف الامام کا استحباب یا وجوب کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا اس کے بعد دفع دخل مقدر کے طور پر صاحب تکمیل نے ملا علی
قاری اور امام ابن الہمام کے اقوال کو مولانا عبد الحئی لکھنوی کی عبارت سے رد کیا ہے اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ امام ابن الہمام اور
ملا علی قاری کے سامنے مولانا عبد الحئی کا کیا درجہ ہے ؟ اس پر صاحب تکمیل کا خوش ہونا اور علماء حنفیہ کو الزام دینا ۔۔۔
بجز الغریق یتشبث بالحشیش کے اور کیا ہے ؟ اس کے بعد ان کا یہ کہنا کہ " زیادہ افسوس تو ان علماء حنفیہ پر آتا ہے جو
احادیث صحاح ستہ پر متوجہ نہیں ہوتے بلکہ حمیت مذہبی کی وجہ سے روایات موضوعہ و مکذوبہ و آثار مختلفہ و باطلہ کو اپنی تصنیفات
و تحریرات و حواشی میں درج کر کے اپنے عوام و جہلاء کو فتنے میں ڈالتے ہیں اھ ۔

یہ ہے وہ طرز کلام جو جماعت اہل حدیث کے اکثر افراد کا شیوہ ہے یہی لوگ ۔ فروعی مسائل میں شدت کے ساتھ نزاع
کرنے والے ہیں ۔ ۔ ۔ کیا صاحب تکمیل کو نظر نہیں آیا کہ علماء حنفیہ قرارت خلف الامام سے منع کرنے کے لئے سب سے پہلے

قرآن کریم کی آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا پیش کرتے ہیں اور ہم بتلا چکے ہیں کہ بالاجماع اور بالاتفاق یہ آیت قرات خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس کے بعد حدیث صحیح انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امام اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے تو جب وہ تکبیر کہے تکبیر کہو اور جب قرات کرے خاموش رہو) جس کو امام مسلم نے صحیح قرار دیا اور ابو داؤد نے سند صحیح سے روایت کیا ہے تو کیا مسلم و ابو داؤد وصحاح ستہ سے خارج ہیں؟ پھر وہ حدیث صحیح من کان له امام فقراءت له قراءة ـ سے استدلال کرتے ہیں اس حدیث کو ابن ماجہ نے سنن میں، احمد بن منیع نے اپنی مسند میں امام محمد نے مؤطا اور کتاب الآثار میں روایت کیا ہے ۔ پھر مؤطا امام مالک اور ترمذی اور مصنف ابن ابی شیبہ و مصنف عبدالرزاق وغیرہ سے صحابہ وتابعین کے آثار بیان کرکے سلف وخلف کے تعامل سے اپنے مذہب کی تائید بیان کرتے ہیں تو کیا صاحب تکمیل کے نزدیک مؤطا امام مالک اور ترمذی وغیرہ کی یہ حدیثیں موضوع ومکذوب اور باطل ہیں؟ کچھ تو خدا کا خوف اور شرم وحیا کا پاس کرکے بات کرنا چاہیئے اور یہ ساری دلیری اور ریدہ دہنی اس بر تہ پر ہے کہ خود صاحب تکمیل نے اپنے دلائل میں جزء القرات بیہقی سے بہت سی احادیث و آثار ایسے نقل کئے ہیں جن کی سند ضعیف اور واہی ہے جیسا گذشتہ اوراق میں مفصل گذر چکا ہے ۔ اس کے بعد مولانا عبدالحئی لکھنوی کا یہ قول نقل کرکے کہ بعض فقہاء نے جو یہ کہا ہے کہ قرات خلف الامام سے مقتدی کی نماز باطل ہوجاتی ہے یہ قول شاذ و مردود ہے امام محمد سے مروی ہے کہ انھوں نے مقتدی کے لئے سری نمازوں میں قرات فاتحہ کو مستحسن سمجھا ہے الخ عوام کو یہ دھوکہ دیا گیا ہے کہ مولانا عبدالحئی رح اور امام محمد رح مقتدی کے ذمہ قرات فاتحہ کو واجب سمجھتے ہیں حالانکہ مولانا عبدالحئی رح کی عبارت میں سری نمازوں کی تصریح موجود ہے اور جہری نمازوں میں سکتات امام کی قید بھی مذکور ہے تاکہ استماع وانصات میں خلل واقع نہ ہو اس کے بعد جن علماء احناف سے قرات خلف الامام کا جواز نقل کیا گیا ہے وہ سب سری نمازوں میں اور جہری نمازوں میں سکتات امام کے ساتھ مقید ہے علماء حنفیہ میں امام کے ساتھ ساتھ فرض انصات کو ترک کرکے جوازِ قرات کا کوئی بھی قائل نہیں ۔

اس کے بعد صاحب تکمیل نے مانعین قرات فاتحہ خلف الامام کے دلائل سے بھی تعرض کیا ہے اور سب سے پہلے آیت قرآن واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا[1] کو پیش کرکے اپنی طرف سے ایک جواب دیا ہے مگر یہ کیا ضروری ہے کہ صاحب تکمیل کے جواب سے استدلال کرنے والے کی تشفی بھی ہوجائے ۔ جواب تو ہر شخص ہر دلیل کا دے سکتا ہے یہ کیا ضروری ہے کہ صاحب تکمیل کے جواب سے استدلال کرنے والے کی تشفی بھی ہوجائے ۔ جواب تو ہر شخص ہر دلیل کا دے سکتا ہے یہ کیا ضروری ہے کہ ہر جواب صحیح بھی ہو ۔ پھر ان لوگوں کو جو قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں دریدہ دہنی کے ساتھ مذہب پرست استخوان فروش وغیرہ وغیرہ کلمات واہیہ سے یاد کرنا اور ان کے دلائل کو روایات موضوعہ ومکذوبہ پر مبنی کہنا کہاں کی تہذیب اور دیانت وانصاف ہے؟ ہم بتلا چکے ہیں کہ بالاتفاق یہ آیت قرأت خلف الامام سے منع کرنے کے متعلق نازل ہوئی ہے امام احمد بن حنبل نے اس کی تصریح کی ہے اور تفسیر طبری وغیرہ سے بھی بہت آثار ہم نے گزشتہ اوراق میں بسند صحیح وحسن نقل کر دیئے ہیں ۔

عہ تفوہ کا ترجمہ صاحب تکمیل نے سخت بکواس کیا ہے یہ بے ادبی گستاخی انہی کو مبارک ہو لفظ تفوہ کے معنی تکلم اور نطق سے زیادہ نہیں ۱۲

[1] اور جب قرآن پڑھا جائے اس کو سنو اور خاموش رہو ۱۲

جن سے یہ بات واضح ہے کہ لوگ پہلے قرارت خلف الامام کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی صاحب تکمیل کا یہ کہنا کہ "برادران احناف فاتحہ خلف الامام پڑھنے کی احادیث کو آیت ہذا کا معارض سمجھ کران احادیث کو نہیں مانتے الخ بالکل غلط ہے بلکہ ہم ان احادیث کو امام یا منفرد پر محمول کرتے ہیں اور مقتدی کو امام کی قرارت کی وجہ سے قاری شمار کرتے ہیں تارک قرارت نہیں مانتے کیوں کہ مسلم اور ابو داؤد کی صحیح حدیث میں اذا قرأ الامام فانصتوا صاف موجود ہے کہ جب امام قرارت کرے تم خاموش رہو۔ اور ابن ماجہ و موطا محمد و مسند احمد بن منیع میں صحیح حدیث موجود ہے۔

من کان له امام فقراءته له قراءة جو شخص امام کے ساتھ ہو امام کی قرارت اس کے لئے قرارت ہے۔ حنفیہ حضرت عبادہ کی حدیث صحیح کو ہرگز نہیں چھوڑتے بلکہ اس کو بھی مانتے ہیں اور قران کریم کی آیت اور حدیث صحیح اذ قرأ فانصتوا اور من کان له امام فقراءته له قراءة — سب کو جمع کرکے یہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں امام کی قرارت کے ساتھ قرارت کرنا منع ہے اس سے پہلے یا پیچھے سکتۂ امام میں اور سری نمازوں میں قرارت خلف الامام جائز یا مستحسن ہے۔..........

مگر صاحب تکمیل اور اس کی جماعت ہے جو جہری نمازوں میں امام کے ساتھ ساتھ قرارت کو واجب کہتے اور حدیث صحیح اذا قرأ فانصتوا اور حکم خداوندی اذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔

حنفیہ کی اس دلیل کا ایک جواب تو آپ نے یہ دیا ہے کہ قرارت فاتحہ خلف الامام کی احادیث اس آیت کے معارض نہیں بلکہ مخصص ہیں اور تخصیص الکتاب بالسنۃ جائز ہے جبکہ حدیث متواتر ہو اور حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب یقیناً متواتر ہے جیسا امام بخاری نے جزءالقرارت میں فرمایا ہے۔ تواتر الخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ الابقرأت ام القرآن اھ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خبر متواتر ہے کہ نماز نہیں مگر سورۂ فاتحہ کی قرارت کے ساتھ۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان اسی کا نام ہے گفتگو قرارت فاتحہ خلف الامام میں اور تواتر قرارت فاتحہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ قرارت سورۂ فاتحہ کے وجوب میں کسی کو نزاع نہیں۔ گفتگو اس میں ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی پر سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے یا نہیں ؟ اور امام کی قرارت اس کے لئے کافی ہے یا نہیں ؟ ہم کہتے ہیں کہ قرارت فاتحہ نماز میں واجب ہے مگر امام کی قرارت مقتدی کے لئے کافی ہے وہ اس حالت میں کہ تارک قرارت نہیں بلکہ بمنزلہ قاری کے ہے اور ان دونوں مقدمات کا ثبوت صحیح حدیث سے بار بار گزر چکا ہے پس اگر صاحب تکمیل کو ہمت ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرارت فاتحہ خلف الامام کا تواتر ثابت کریں۔ محض قرارت فاتحہ کا تواتر بیان کرکے عوام کو قرارت خلف الامام کا دھوکہ دینا محض مغالطہ ہے۔

پھر حنفیہ کے نزدیک مشہور و متواتر وہ حدیث ہے جس کو تابعین نے بالاتفاق قبول کیا ہو اور اس مسئلہ میں تابعین کا اختلاف ہے تو اس حدیث کو متواتر یا مشہور نہیں کہا جا سکتا علامہ عینی شرح بخاری میں فرماتے ہیں۔

فان قلت هذا الحدیث مشهور فتجوز الزیادة بمثله قلت لانسلم انه مشهور لان المشهور ما تلقاه التابعون بالقبول وقد اختلف التابعون فی هذه المسئلة ولئن سلمنا انه مشهور فالزیادة بالخبر المشهور انما تجوز اذا کان محکما اما اذا کان محتملا فلا وهذا الحدیث محتمل لان مثله یستعمل لنفی الجواز ویستعمل لنفی الفضیلة کقوله صلی الله علیه وسلم لاصلوٰة لجار المسجد الافی المسجد - ولاصلوٰة بحضرة طعام رواه مسلم الج ۲ ص ۱۱۔ ۶۲۔

(ترجمہ) اگر تم کہو کہ یہ حدیث مشہور ہے اور اس سے زیادت کتاب اللہ پر جائز ہے تو میں کہوں گا ہم

اس کا مشہور ہونا تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ مشہور وہ ہے جس کو تابعین نے قبول کیا ہے اور اس مسئلہ میں تابعین کے درمیان اختلاف ہے اور اگر مان لیا جائے کہ یہ مشہور ہے تو حدیث مشہور سے کتاب اللہ پر زیادت اس وقت جائز ہے کہ وہ (اپنے مدلول و مفہوم میں) محکم ہو اور اگر محتمل ہو تو (اس سے زیادت کتاب اللہ پر جائز) نہیں اور یہ حدیث (لاصلوٰۃ الابقراءۃ ام القرآن) محتمل ہے کیوں کہ اس قسم کا لفظ کبھی نفی جواز (و عدم صحت) کے لئے مستعمل ہوتا ہے .... اور ....

کبھی نفی فضیلت کے لئے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسجد کے ہمسایہ کی نماز بغیر مسجد کے نہیں (اس کا مطلب بالاتفاق یہ ہے کہ بغیر مسجد میں ادا کئے اس کی نماز کامل نہ ہوگی یہ معنی نہیں کہ بالکل صحیح نہ ہوگی) اور (نیز آپ کا ارشاد ہے) کہ کھانے کے سامنے نماز نہیں اس کو مسلم نے روایت کیا ہے اھ (اس کا بھی بالاجماع یہی مطلب ہے کہ جب بھوک کے سامنے کھانا آجائے اس وقت کھانا چھوڑ کر نماز پڑھے گا تو نماز کامل نہ ہوگی یہ مراد ہرگز نہیں کہ نماز صحیح نہ ہوگی پس ایسے ہی لاصلوٰۃ الابقراءۃ ام القرآن ۔ میں بھی احتمال ہے کہ اس کا یہ مطلب ہو کہ بغیر قراءت فاتحہ کے نماز کامل نہ ہوگی ۔ پھر اس حدیث کو قراءت خلف الامام سے کوئی تعلق نہیں اس میں صرف قراءت فاتحہ کا ذکر ہے اور اس کو ہم بھی واجب کہتے ہیں مگر مقتدی پر واجب نہیں کہتے ۔ کیوں کہ آیت قرآن اور صحیح حدیثوں میں مقتدی کو خاموش رہنے کا صریح حکم ہے اس کی خلاف ورزی جائز نہیں اس تقریر سے صاحب تکمیل کی اس بات کا بھی جواب ہوگیا کہ یہ آیت مکی ہے اور قراءت فاتحہ کا حکم مقتدی کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ طیبہ میں دیا ہے پس کیا مقدم النزول آیت کسی مؤخر الافتراض کے لئے ناسخ ہو سکتی ہے ؟ ان سے کوئی پوچھے کہ مدینہ طیبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی حدیث میں مقتدی کو قراءت فاتحہ کا حکم دیا ہے ؟ اگر حضرت عبادہ کی حدیث لاتفعلوا الابام القرآن ۔ مراد ہے تو ہم بتلا چکے ہیں کہ اس سے وجوب وہی ثابت کر سکتا ہے جس کو اصول و قواعد عربیہ سے واقفیت نہ ہو ورنہ ہر سمجھدار فقیہ جانتا ہے کہ نہی کے بعد استثناء سے اباحت مستفاد ہوتی ہے وجوب ثابت نہیں ہوتا پھر اسی حدیث کے الفاظ ابوداؤد میں اس طرح پر ہیں ان کنتم لابد فاعلین فلا تفعلوا الابام الکتاب ۔ اگر تم امام کے پیچھے ضرور ہی قراءت کرنا چاہتے ہو تو سورۂ فاتحہ کے سوا نہ کیا کرو ۔ اس سے ہر عامی بھی اباحت ہی سمجھ سکتا ہے وجوب نہیں سمجھ سکتا اور تفسیر فتح البیان سے جو نقل کیا گیا ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ کی حدیثوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم موجود ہے الخ ——————— بڑی جرأت ہے ———————

کہ .... بخاری و مسلم کی کسی حدیث میں قراءت خلف الامام کا حکم نہیں ہے صاحب تکمیل البرہان کو خدا کا خوف کر کے بات کرنا چاہئے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک حدیث میں بھی ہرگز یہ نہیں فرمایا کہ مقتدیوں کو امام کے پیچھے قراءت کرنا چاہتا ہے بلکہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں یہ حکم دیا ہے اذا قرا الامام فانصتوا جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو اور اس حدیث کو امام احمد اور مسلم اور مفسر طبری اور علامہ ابن تیمیہ وغیرہم نے صحیح فرمایا ہے اور حدیث عبادہ میں لاتفعلوا الابام القرآن کی زیادت کو امام احمد اور یحییٰ بن معین اور ایک جماعت محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے جیسا کتاب المغنی اور علامہ ابن تیمیہ کے رسالہ تنوع العبادات کے حوالہ سے اوپر گذر چکا ہے ۔ اور حدیث عبادہ کا جو حصہ صحیح ہے اس کو قراءت خلف الامام سے کچھ واسطہ نہیں وہ منفرد اور امام کے متعلق ہے جیسا خود راوی حدیث سفیان بن عیینہ نے فرما دیا ہے قال ھذا اذا کان وحدہ ۔ یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جو اکیلا نماز پڑھتا ہو ۔ اس کے بعد صاحب تکمیل نے آیت

اذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا اور آیت فاقرأ وا ما تیسر من القرآن میں تعارض ثابت کرکے دونوں کو ساقط کرنا چاہا ہے اور نور الانوار و توضیح و تلویح کا حوالہ بھی دیدیا ہے حالانکہ تعارض کے لئے اتحاد محل شرط ہے جو یہاں مفقود ہے کیوں کہ آیت واذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا بالاتفاق قرأت خلف الامام کے متعلق ہے اور فاقرأوا ما تیسر من القرآن صلوٰۃ منفرد کے متعلق ہے کیوں کہ یہ آیت قیام اللیل کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور قیام اللیل جماعت سے نہیں ہوتا منفرداً ہوتا ہے طلبہ کو تعارض کا مطلب سمجھانے کے لئے مثال کے طور پر نور الانوار وغیرہ میں ان آیتوں کو پیش کردیا گیا کہ شان نزول کو نہ دیکھا جائے تو ظاہر میں تعارض معلوم ہوگا ورنہ حقیقتاً تعارض ثابت کرنا مقصود نہیں جیسا فقہاء کے طرز عمل سے واضح ہے کہ وہ برابر دونوں آیتوں سے استدلال کرتے چلے آ رہے ہیں ملاحظہ ہو۔۔۔۔۔۔۔

عینی شرح البخاری ص۱۱ ج۱ پھر حنفیہ پر صاحب تکمیل نے یہ الزام قائم کیا ہے کہ اس آیت اذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا سے حنفیہ نے خطبۂ جمعہ کے وقت خاموش رہنے کو واجب کہا ہے لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ جب خطیب آیت یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما پڑھے تو سننے والا آہستہ درود پڑھ لے۔ تو فاتحہ خلف الامام آہستہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ آیت کا نزول بالاتفاق قرأت خلف الامام کے بارے میں ہے خطبہ جمعہ کو نماز کے ساتھ بعد میں ملحق کرلیا گیا ہے ورنہ مکہ میں جمعہ کی نماز اور خطبہ کہاں تھا؟ پس جس قدر استماع و انصات کی تاکید نماز میں ہے خطبہ میں نہیں ہے اس لئے بعض فقہاء نے یہ سمجھ کر درود پڑھنے کی اجازت دے دی کہ خطبہ میں امام سے کسی ضرورت کے وقت بات کرنا یا دعا کی درخواست کرنا جائز ہے اور امام کو بھی مقتدیوں سے بات کرنا اور کوئی ضروری بات پوچھنا یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا جائز ہے اور اس وقت مقتدی امام کی بات کا جواب بھی دے سکتا ہے جیسا واقعہ سفیک عطفانی سے کہ حضورؐ نے خطبہ کے وقت اُن سے بات کی اور ایک دفعہ خطبہ میں حضورؐ سے بارش کی دعا کو کہا گیا تھا۔ کہ خطبہ میں حضرت عثمان کو دیر آنے پر تنبیہ کی تھی اور انھوں نے جواب میں اپنا عذر بیان کیا تھا دیکھو ظاہر ہے کہ اس کو خطبہ کے منافی نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح جب خطیب خطبہ کے اندر حکم کر رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو تو اس حکم کی تعمیل بھی خطبہ کے منافی نہیں آہستہ درود پڑھ سکتے ہیں بلند آواز سے نہیں اور بعض فقہاء حنفیہ نے اس صورت میں بھی زبان سے درود پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے صرف دل سے پڑھنے کی اجازت دی ہے فلا اشکال

ایک الزام یہ دیا ہے کہ نماز فجر شروع ہونے کی حالت میں امام کی قرأت کے وقت صف کے پیچھے سُنتیں پڑھنا حنفیہ کے نزدیک جائز ہے اور آیت اذا قرأ القرآن سے اس کو ممنوع قرار نہیں دیتے تو اس آیت سے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا کیوں ممنوع ہے؟ جواب یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مغفل کی روایت اوپر گذر چکی ہے جس میں تصریح ہے کہ یہ آیت صرف مقتدی کے حق میں ہے کہ وہ قرأت خلف الامام نہ کرے بلکہ خاموش رہے۔ اس کے سوا دوسرے موقعہ پر قرآن پڑھا جائے تو سننا اور خاموش رہنا فرض نہیں بعض فقہاء حنفیہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے انکے نزدیک نماز فجر کے وقت مسجد میں ایک طرف سُنّت فجر پڑھنا جائز ہے کیوں کہ یہ شخص مقتدی نہیں ہے اور بعض فقہاء نے عموم لفظ کی بنا پر ایسی جگہ سُنّت فجر پڑھنے کو منع کیا ہے جہاں امام کی قرأت سننے میں آتی ہو وہ فرماتے ہیں کہ مسجد کے دروازہ پر یا مسجد سے باہر سنتیں پڑھ کر جماعت میں شریک ہونا چاہیئے رہا مقتدی کا سبحانک اللّٰھم پڑھنا سو اس میں حنفیہ کا صحیح قول یہ ہے کہ جہری نماز میں امام کی قرأت کے وقت مقتدی کو سبحانک اللّٰھم پڑھنا جائز نہیں۔ بلکہ تکبیر تحریمہ کہہ کر

خاموش رہے اور موقعہ ملے تو سکتات امام میں سبحانک اللہم پڑھ لے اور سکتات امام میں سورہ فاتحہ بھی پڑھ سکتا ہے جیسا بار بار گذر چکا ہے۔ رہا یہ کہ جب امام جہر کر رہا ہو اس وقت اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع بھی نہ کرنا چاہیئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ شرط صلوٰۃ ہے رکن صلوٰۃ نہیں تو تکبیر تحریمہ کے وقت یہ شخص مقتدی نہیں تکبیر کے بعد مقتدی بنے گا اور اسی وقت قرآن کا سننا اور خاموش رہنا واجب ہوگا اس سے پہلے نہیں دوسرے اس پر سب کا اجماع بھی ہے کہ امام کی قرارت سنتے ہوئے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں شریک ہونا درست ہے۔ بس صاحب تکمیل کو اپنی ہی فہم و دانش کا ماتم کرنا چاہیئے۔ اور امام بخاری کی جزء القرارت سے جو الزام نقل کیا گیا ہے کہ مدارس و مکاتب میں استاد ایک بچہ کو سبق دیتا ہے اور باقی بچے بھی برابر قرارت کرتے ہیں وہاں آیت واذا قرا القرآن فاستمعوا له وانصتوا کی بنا پر بچوں کو خاموش نہیں کیا جاتا الخ اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو اوپر گذر چکا ہے کہ یہ آیت مقتدی کے حق میں ہے غیر مقتدی کے حق میں نہیں ہے دوسرے بچوں کو بڑوں پر قیاس کرنا ہی غلط ہے بچے تو بے وضو بھی قرآن پڑھتے ہیں ان کو مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ انصات کے معنی مطلقاً چپ رہنے کے نہیں بلکہ سکوت مع الاستماع کے ہیں۔ تو اس سے بھی حنفیہ کا مطلب حاصل نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس سے نماز جہری میں صرف امام کی قرارت کے وقت ممانعت ہوگی سکتات امام میں قرارت کرنے کی ممانعت آیت ہذا سے ہرگز ثابت نہیں ہوتی حالانکہ حنفیہ کا دعویٰ ہے کہ جہری نماز میں سکتات امام کے وقت بھی قرارت ناجائز و حرام ہے۔ یہ حنفیہ پر افترا ہے جو لوگ سکتات امام کی رعایت کر کے سورۂ فاتحہ خلف الامام پڑھ سکیں اس کو کسی نے ناجائز و حرام نہیں کہا اسی طرح سری نمازوں میں بھی قرارت فاتحہ خلف الامام آہستہ آہستہ جائز ہے جب کہ امام سے منازعت اور تشویش نہ ہو جیسا بار بار ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ جب امام جہر سے قرارت کرے اور مقتدی آہستہ آہستہ انہی الفاظ کو پڑھتے جائیں تو اس میں بہت اچھی طرح استماع و انصات بھی پایا جائے گا الخ یہ محض دعوے ہے کہ جو قابل قبول نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے وقت اپنے لبوں کو حرکت دے کر ساتھ ساتھ پڑھتے تھے جہر نہ کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمایا اور ارشاد ہوا:۔

لاتحرک به لسانک لتعجل به ان علینا جمعه وقرآنه - فاذا قرأناه فاتبع قرآنه

(قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے تاکہ جلدی یاد ہو جائے ہمارے ذمہ ہے اس کو آپ کے دل میں) جما دینا اور پڑھوا دینا تو جب ہم (بواسطہ جبریل کے) اس کو پڑھیں تو اس کی قرارت کا اتباع کیجئے۔ اس کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں فاستمع له وانصت کہ جب وحی نازل ہو تو اس کو سنتے رہیئے اور خاموش رہیئے (اس کے بعد آپ زبان کو حرکت نہ دیتے اور خاموش رہتے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف صـ۳ ج ۱

معلوم ہوا کہ قرارت قرآن کے وقت زبان کو حرکت دینا اتباع نہیں ہے اور مقتدی کو امام کے اتباع کا امر کیا گیا ہے انما جعل الامام لیؤتم به کہ امام بنایا اسی لئے گیا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے اور حدیث ابن عباس سے معلوم ہو گیا کہ اتباع قرارت یہ ہے کہ بالکل خاموش رہے زبان کو حرکت نہ دے اور لغت میں بھی انصات کے معنی سکوت ہی کے ہیں البتہ اگر انصت له بولا جائے تو اس کے دو معنی ہیں ایک خاموش رہنا دوسرے کان لگا کر سننا اور جب انصات مطلق ہو اس کے معنی سکوت ہی کے ہیں ملاحظہ ہو قاموس صـ۹۸ ج ۱

پس امام کے ساتھ ساتھ قرارت کرنا اتباع امام کے بھی خلاف ہے اور انصات کے بھی خلاف ہے۔ اس کے بعد یہ الزام دیا گیا

ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام سے نماز میں کئی سکتے ثابت ہیں اگر مقتدی سکتات مذکورہ میں سورۂ فاتحہ پڑھ لے تو آیت واذا قرئ القرآن کا مخالف نہ ہوگا جواب ظاہر ہے کہ اس صورت کو ناجائز کس نے کہا؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ سکتات امام پر واجب نہیں کیوں کہ وجوب کی کوئی دلیل نہیں اگر امام سکتہ نہ کرے تو مقتدی قرارت فاتحہ نہیں کر سکے گا نہ وہ گنہگار ہوگا نہ اس کی نماز باطل ہوگی۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ آیت امام کے پیچھے چلا کر پڑھنے کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے اور امام رازی سے نقل کیا گیا ہے کہ یہی قول امام ابوحنیفہ ہے اور ان کے اصحاب کا ہے جواب یہ ہے کہ جیسے اس عبارت میں امام صاحب اور انکے اصحاب کی طرف بلا سند ایک غلط قول کی نسبت کی گئی ہے ایسے ہی یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ یہ آیت امام کے پیچھے چلا کر پڑھنے کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے بھلا صحابہ کے متعلق کون یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلا کر شور کریں گے کیا ان کو نماز کی حقیقت اور اس میں خشوع وخضوع کی ضرورت کی بھی خبر نہ تھی؟ اہل حدیث جو اس قسم کی لغو تاویلیں کر کے صحیح حدیثوں کو رد کرتے رہیں اور آیت قرآنی میں غلط تاویلیں کرتے رہیں وہ تو عامل بالحدیث ہوں اور حنفیہ نصوص کے صحیح معنی بیان کریں اور صحیح طریقہ پر عمل کریں وہ مذہب پرست اور استخوان فروش قرار پائیں سبحان اللہ کیا انصاف ہے؟ ان حضرات سے کوئی پوچھے۔ کہ اگر یہ آیت امام کے پیچھے چلا کر پڑھنے کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے اور آہستہ قرارت جائز ہے تو خطبہ جمعہ میں بھی چلا کر بولنا ہی منع ہوگا کسی قدر آواز سے بولنا باتیں کرنا تسبیح وتکبیر وتہلیل کرنا ممنوع نہ ہونا چاہیے کیوں کہ تمام علمانے اسی آیت سے خطبہ میں کلام کو منع کیا ہے اور خود صاحب تکمیل نے بھی اس آیت کا شان نزول خطبہ کو قرار دیا ہے تو کیا وہ اس کے قائل ہونگے کہ خطبہ جمعہ میں امام کا خطبہ سنتے ہوئے لوگوں کو بغیر چلائے باتیں کرنا یا ذکر اللہ اور تکبیر وتسبیح وتہلیل کرنا جائز ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو خلاف اجماع ہے اہل حدیث بھی اس کے قائل نہیں اور اگر نفی میں ہے تو کیا خطبہ کا درجہ نماز سے بھی زیادہ ہے؟ کہ نماز میں تو آہستہ آہستہ پڑھنا جائز اور خطبہ میں حرام ہے۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ عدم فرضیت فاتحہ پر حنفیہ کا آیت ہذا سے استدلال کرنا تمام محدثین ومفسرین کے خلاف ہے یہ وہی مغالطہ ہے جو شروع سے آخر تک صاحب تکمیل کا شیوہ ہے حنفیہ نے اس آیت سے عدم فرضیت فاتحہ پر کب استدلال کیا ہے؟ اس سے تو وہ قرارت خلف الامام کی عدم فرضیت پر استدلال کرتے ہیں اور اس میں جمہور سلف وخلف ان کے ساتھ ہیں۔ جیسا علامہ ابن تیمیہ کے قول سے معلوم ہو چکا ہے عدم فرضیت فاتحہ پر تو وہ آیت فاقرؤا ما تیسر من القرآن سے استدلال کرتے ہیں اور حدیث اعرابی سے ان کے استدلال کی تائید ہوتی ہے جیسا پہلے مفصل گزر چکا۔

اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ آیت نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے اور بعض تابعین کا قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے خطبہ کے وقت لوگوں کو استماع کا حکم دیا گیا ہے الخ اس کا جواب گزر چکا ہے کہ مکہ میں نہ جمعہ قائم ہوا تھا نہ خطبہ تھا اس لئے جن حضرات نے اس آیت کو خطبہ کے متعلق کہا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ خطبہ کو بھی نماز کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے یہ مطلب نہیں کہ اس کا شان نزول فقط خطبہ جمعہ ہے کیوں کہ یہ آیت بالاتفاق مکی ہے اور مکہ میں نہ جمعہ تھا نہ خطبہ اور خطبہ میں آہستہ بات کرنا یا آہستہ ذکر وتسبیح پڑھنا بالاتفاق جائز نہیں تو نماز میں امام کے ساتھ آہستہ قرارت کس طرح جائز ہوگی؟ نماز میں باتیں کرنا ہجرت کے بعد بھی جائز تھا جب سورۂ بقرہ کی آیت وقوموا للہ قانتین نازل ہوئی تو باتیں کرنے سے منع کیا گیا (صحیح مسلم) اور آیت اذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا۔ بالاتفاق مکی ہے اس کو نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت پر محمول کرنا صحیح نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ صحابہ ممانعت کے بعد بھی عام طور سے نماز میں باتیں کرتے تھے اور یہ ان کی شان سے بعید ہے اور قرارت خلف الامام مدینہ میں عام طور پر صحابہ کرتے تھے کسی ایک دو ناواقف نے ایسا کیا ہے جیسا حدیث پڑھنے والوں پر مخفی

نہیں ہے کہ جب حضورؐ نے پوچھا تم میں سے کس نے قراءت کی تو صرف ایک آدمی کہتا تھا میں نے قراءت کی ہے۔ اُس کو آپ نے منع کر دیا۔ پھر امام رازی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اس آیت میں کفار کو خطاب ہے اور اگر آیت کو قراءت خلف الامام کی ممانعت پر محمول کیا جائے تو قرآن کا سیاق و سباق ہی بگڑ جائے گا اور ترتیب مختل ہو جائے گی الخ میں کہتا ہوں امام احمد بن حنبل کا قول گذر چکا ہے کہ بالاتفاق یہ آیت نماز کے متعلق (قراءت خلف الامام سے منع کرتے ہیں) نازل ہوئی ہے تو کیا احمد بن حنبل اور دوسرے علمائے سلف سے بھی زیادہ کوئی قرآن کے سیاق و سباق کا سمجھنے والا ہو سکتا ہے؟ پھر اس آیت سے پہلے حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ھٰذا بصائر للناس وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون۔ یہ قرآن (بجائے خود) گویا بہت سی دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ جس میں اہل ایمان کا اور قرآن کا ذکر ہے اس کے بعد واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون ہے اس کے بعد واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخیفۃ ودون الجھر من القول بالغدو والآصال ولا تکن من الغافلین ہے جس میں ہر مسلمان کو ذکر کی تاکید اور غفلت سے ممانعت ہے غرض آیت واذا قرئ القرآن سے پہلے بھی اہل ایمان کا ذکر ہے اور بعد میں بھی اہل ایمان کو خطاب ہے تو درمیان میں قراءت قرآن کے متعلق مسلمانوں کو خطاب کرنے سے قرآن کا سیاق و سباق کیسے مختل ہو گیا؟ اس آیت سے پہلے قرآن کی عظمت کا بیان ہے کہ وہ اہل ایمان کے لئے بصائر و ہدایت و رحمت ہے اس کے بعد یہ امر یقیناً اس کی عظمت کے مناسب ہے کہ جب قرآن (نماز میں) پڑھا جائے اس کو سنو اور خاموش رہو (تاکہ اچھی طرح بصیرت و ہدایت و رحمت سے حصہ حاصل کر سکو) اس کے بعد حکم ہے کہ اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ یاد کیا کرو صبح اور شام اور غافلوں میں شمار نہ ہوگا۔

بتلایئے کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس صورت میں نظم قرآن مختل ہو گیا۔ ....

بلکہ انصاف سے دیکھا جائے تو جہاں قرآن نے کفار کے شور و غل اور چلانے کا ذکر کیا ہے وہاں رحمت کا ذکر نہیں کیا وہاں ان کو سخت عذاب کی دھمکی دی ہے۔

وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھٰذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون ۝ ....

فلنذیقن الذین کفروا عذابا شدیدا ولنجزینھم اسوأ الذی کانوا یعملون۔ یعنی کافر لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور شور و غل مچاؤ شاید (اس طرح) تم غالب آجاؤ، ہم ان کو سخت عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے اور ان کی اس بری حرکت کی جو وہ کرتے ہیں سزا دیں گے"۔

پس آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون کا عنوان ہی بتلا رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو خطاب ہے وہی قرآن کو سننا اور خاموش رہنے پر رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہیں کفار تنہا اس عمل پر رحمت کے امیدوار کیوں کر ہو سکتے ہیں جب تک ایمان نہ لے آئیں؟ پس تفسیر فتح البیان کا یہ قول ہرگز صحیح نہیں .... صرف کفار کو خطاب ہے اور مسلمانوں کو خطاب ماننے سے قرآن کی آیت میں ارتباط نہ رہے گا" بلکہ سیاق و سباق اور آیت کے عنوان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں ہی کو خطاب ہے تمام علماء مفسرین نے اس کو قراءت خلف الامام سے ممانعت پر محمول کیا ہے جیسا علامہ طبری کے حوالہ سے ہم نے تفصیل کے ساتھ شروع ہی میں لکھ دیا ہے غالباً ناظرین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ صاحب تکمیل البرہان کس قدر ہٹ دھرمی اور عصبیت مذہبی سے حنفیہ کے دلائل پر تنقید کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی جس آیت سے جمہور سلف و خلف نے قراءت خلف الامام کی ممانعت پر استدلال کیا تھا اس کو تفسیر فتح البیان اور رازی کے قول سے رد کرنا چاہتے ہیں الغریق یتشبث بالحشیش۔ اسی کو کہتے ہیں کہ

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت نظر آتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے حنفیہ کے دلائل حدیثیہ پر تنقید شروع کی ہے۔

پہلی دلیل یہ بیان فرمائی ہے کہ صحیح بخاری میں جو روایت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حالت رکوع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا تو صف میں ملنے سے پہلے رکوع کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کرنے پر آپ نے اس رکعت کو لوٹانے کا حکم نہیں فرمایا اس سے حنفیہ قرارت فاتحہ خلف الامام کے فرض نہ ہونے پر دلیل لاتے ہیں کہ جب رکوع میں ملنے سے (بغیر فاتحہ کے) رکعت ہو گئی تو حالت قیام میں بھی سورۂ فاتحہ بغیر ہو جائے گی الخ اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ صرف حنفیہ کی دلیل نہیں بلکہ مالکیہ وحنابلہ نے بھی مسبوق کے اس مسئلہ سے مقتدی پر قرارت خلف الامام کے واجب نہ ہونے کے لئے استدلال کیا ہے جیسا کتاب المغنی کے حوالہ سے گذر چکا ہے اور صرف حدیث ابی بکرہ ہی سے استدلال نہیں کیا گیا بلکہ اجماع سے استدلال کیا گیا ہے امام طحاوی نے تصریح کی ہے کہ اس میں فقہاء کا اختلاف نہیں کہ مسبوق رکوع پالینے سے رکعت پالیتا ہے اور مغنی ابن قدامہ میں ہے ولانها قراءة لاتجب علی المسبوق فلم تجب علی غیره کالسورة ۔ پھر قرارت فاتحہ خلف الامام مسبوق پر واجب نہیں تو غیر مسبوق پر بھی واجب نہ ہوگی جیسے (ضم) سورت اھ

اس دلیل کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرارت کا وجوب حالت قیام میں ہے جب حالت بدل گئی حکم بھی بدل گیا۔ میں کہتا ہوں اہل حدیث کی زبان وقلم سے ایسی باتیں نکلنا جائے تعجب ہے کیوں کہ یہ تو سراسر قیاس ہے جس کے متعلق یہ لوگ بڑے زور سے اول من قاس ابلیس علیہ کا نعرہ لگایا کرتے ہیں۔ ان کو کسی حدیث سے اس کا ثبوت دینا چاہیئے کہ قرارت کا وجوب حالت قیام کے ساتھ مخصوص ہے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث لاصلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب۔ میں تو قیام کی شرط مذکور نہیں۔ اگر اور کسی حدیث میں یہ قید مذکور ہے تو معلوم ہوا کہ آپ ایک حدیث سے دوسری حدیث کو مقید کر سکتے ہیں۔ پھر حنفیہ نے کیا جرم کیا جو وہ دوسری حدیث من کان له امام فقراءة له قراءة سے حدیث عبادہ کو منفرد اور امام کے ساتھ خاص کرتے ہیں؟ پھر یہ بھی خوب رہی کہ جب حالت بدل گئی حکم بھی بدل گیا۔ اول اس کو تو ثابت کیجئے کہ رکوع کرنے سے حالت کیا بدل گئی؟ کیا نماز ختم ہوگئی یا نمازی بدل گیا؟ آخر یہ مسئلہ کس حدیث سے آپ نے معلوم کیا کہ رکوع کرنے سے نماز یا نمازی کی حالت بدل جاتی ہے؟ حدیث ابو بکرہ اور ان جملہ احادیث سے جو رکوع پالینے سے رکعت کے پانے پر دلالت کرتی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام کی نظر میں رکوع قیام کے حکم میں ہے جبھی تو رکوع پالینے سے رکعت مل جاتی ہے البتہ سجدہ قیام کے حکم میں نہیں ہے کہ سجدہ پانے سے رکعت نہیں ملتی اور جب رکوع بحکم قیام ہے تو رکوع سے حالت نہیں بدلی پس رکوع پانے والے پر رکوع میں قرارت فاتحہ فرض ہونی چاہیئے چنانچہ بعض صحابہ اس طرف گئے بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو جزء القراءت بیہقی صہ ۶۸

عن حسان بن عطیة عن ابی الدرداء قال لاتترك الفاتحة خلف الامام زاد ابن ابی الحواری وان تقرأ وانت راکع وفی روایة اُخری عن ابی الدرداء قال لو ادرکت الامام وهو راکع لاحببت ان اقرأ بفاتحة الکتاب۔

حسان بن عطیہ حضرت ابو الدرداء سے روایت کرتے ہیں انھوں نے فرمایا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ چھوڑو چاہے رکوع میں ہی پڑھو دوسری روایت میں ہے کہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں امام کو رکوع میں پاؤں تو اس کو پسند کہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا تھا۔ آگے بیان کی بلا جانے کہ قیاس ابلیس کس قسم کا تھا اور قیاس مجتہد کسے کہتے ہیں ۱۲

کروں گا کہ سورۂ فاتحہ (رکوع میں بھی) پڑھ لوں۔ اس اثر سے صاحب تکمیل کی ساری بنی بنائی عمارت منہدم ہوگئی۔ معلوم ہوگیا کہ رکوع سے حالت کچھ نہیں بدلی بلکہ رکوع میں بھی قیام کی طرح قرأت فاتحہ ہوسکتی ہے اور اس اثر کو ضعیف نہیں کہہ سکتے کیوں کہ امام بیہقی نے بطور حجت کے اس کو پیش کیا ہے۔ پس صاحب تکمیل کا یہ نتیجہ نکالنا کہ جیسے شریعت کا یہ حکم ہے کہ کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی ویسے ہی شریعت کا یہ بھی حکم ہے کہ رکوع میں ملنے سے (رکعت) ہوجاتی ہے۔ حنفیہ وحنابلہ کے استدلال کے وزنی ہونے کا اقرار ہے کہ جب رکوع میں ملنے سے رکعت مل جاتی ہے اور رکوع میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں حالانکہ رکوع بحکم قیام ہے تو معلوم ہوا کہ حالت قیام میں بھی مقتدی پر فاتحہ پڑھنا فرض نہیں امام کی قرارت کافی ہے صاحب تکمیل کا یہ کہنا کہ رکوع میں جانے سے حالت بدل گئی اور مثال میں مسافر و مقیم کا مسئلہ بیان کرنا ان کی جس بدحواسی کو ظاہر کر رہا ہے ناظرین نے اندازہ کرلیا ہوگا۔

حق یہ ہے کہ جو لوگ مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو فرض کہتے ہیں ان کو یا تو یہ ظاہریہ کی طرح اس کا قائل ہونا چاہیئے کہ رکوع پانے سے رکعت نہیں مل سکتی یا پھر حضرت ابوالدرداء کی طرح اس کے قائل ہوجائیں کہ امام کو رکوع میں پائے تو رکوع میں ہی سورۂ فاتحہ پڑھ لے اگر وہ جمہور کی طرح اس کے قائل ہونگے کہ رکوع پانے سے رکعت مل جاتی ہے اور رکوع میں فاتحہ پڑھنا فرض نہیں تو پھر وہ کسی طرح بھی مقتدی پر قرارت فاتحہ کو فرض نہیں کہہ سکتے۔ رہا یہ کہ حنفیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ میں قیام فرض ہے اور اس حالت میں ابوبکرہ صحابی کو قیام بھی نہیں ملا اور بغیر قیام کے ان کی وہ رکعت ہوگئی پس معلوم ہوا کہ قیام بھی فرض نہ رہا الخ اس سے صاحب تکمیل کی بدحواسی ظاہر ہے میں پوچھتا ہوں کہ حضرت ابوبکرہ نے تکبیر تحریمہ بھی کہی تھی یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو حدیث میں اس کا ذکر کہاں ہے؟ اگر کہا جائے کہ تکبیر کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ معلوم ہے کہ بغیر تکبیر تحریمہ کے نماز نہیں ہوسکتی تو ہم کہتے ہیں قیام کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں کیوں کہ معلوم ہے کہ تکبیر تحریمہ بغیر قیام کے صحیح نہیں ہوتی علامہ شوکانی اور امام طحاوی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ بغیر قیام کے صحیح نہیں ہوسکتی اور اگر جواب نفی میں ہے تو یہ ساری امت کے خلاف ہے تکبیر تحریمہ کے بغیر کسی کے نزدیک بھی نماز صحیح نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد دوسری دلیل حضرت ابوہریرہ کی حدیث ابوداؤد کے حوالہ سے مختصر نقل کی گئی ہے ہم نے اس کو اپنے دلائل میں مفصل بیان کردیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رض فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز سے فارغ ہوکر جس میں جہر کیا تھا فرمایا کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ اس وقت قرارت کی ہے ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہؐ میں نے قرارت کی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بھی کہوں یہ کون مجھ سے قرآن چھین رہا ہے؟ جب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی تو صحابہ اس نماز میں قرارت کرنے سے رک گئے جس میں حضورؐ جہر کے ساتھ قرارت کرتے تھے اس کو امام مالک نے موطا میں امام شافعی نے مسند میں ائمہ اربعہ نے سنن میں روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کی تحسین کی اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔ اس دلیل کا جواب صاحب تکمیل نے یہ دیا ہے کہ "صحابہ قرارت کرنے سے رک گئے" یہ لفظ مدرج ہے مرفوع نہیں ہے یہ زہری تابعی کا قول ہے۔

میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ ابوداؤد نے اس کو معمر کے واسطہ بھی روایت کیا ہے اور اس میں تصریح ہے کہ حضرت ابوہریرہ

؎ یعنی راوی نے بڑھا دیا ہے۔ صحابی کا قول نہیں۔ ۱۲

نے فرمایا "لوگ جہری نماز میں قراءت سے رک گئے" اور معمر ثقہ متقن ہے ان سے روایت کرنے والا احمد بن السرح بھی ثقہ ثبت ہے پس یہ دعویٰ غلط ہے کہ یہ زہری کا قول ہے۔ پھر اگر زہری کا قول بھی ہو تو یہ زہری کا فتویٰ تو نہیں بلکہ ایک واقعہ کی خبر ہے اور زہری مغازی و سیر و اخبار رسول صلی اللہ علیہ وسلم امام وقت ہے۔ زمانۂ رسول کے واقعات بیان کرتے ہیں اس کا قول حجت ہے۔ صاحب تکمیل کا یہ کہنا کہ اس سے نماز سری میں قراءت کی ممانعت نہیں پائی جاتی" تو سری نمازوں میں قراءت سے ہم بھی منع نہیں کرتے۔ مگر جہری میں تو قراءت کی ممانعت ثابت ہو گئی اور یہی ہمارا مدعا ہے۔ اس کے بعد صاحب تکمیل فرماتے ہیں کہ مطلب حدیث کا صاف ہے کہ سورہ فاتحہ کے بعد جب امام جہری نمازوں میں کوئی سورت پڑھے تو مقتدی خاموش ہو کر سنے الخ مگر وہ یہ تو بتلائیں کہ یہ مطلب اس حدیث کے کس لفظ سے معلوم ہوا؟ ظاہر ہے کہ فانتہی الناس عن القراءت فی ماجھر فیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالقرآت (پس لوگ قراءت کرنے سے رک گئے ان نمازوں میں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قراءت جہر سے کرتے تھے) ان الفاظ میں فاتحہ یا غیر فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ مطلقاً قراءت سے رک جانا مفہوم ہو رہا ہے۔ اگر کہا جائے کہ دوسری حدیث سے یہ قید بڑھائی گئی ہے جس میں ابوہریرہ کا اپنے شاگرد کو حکم ہے اقرا بھا فی نفسک۔ کہ سورۂ فاتحہ اپنے نفس میں پڑھ لیا کرو تو اس کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ دل میں پڑھ لیا کرو۔ اور اگر ایک حدیث میں دوسری حدیث سے تم ایک قید بڑھا سکتے ہو تو حنفیہ نے کیا جرم کیا جو وہ حدیث عبادہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ میں دوسری احادیث کی وجہ سے ھذا اذا کان وحدہ کی قید بڑھاتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کی قرآت کے بغیر نماز نہ ہونا اس وقت ہے کہ تنہا نماز پڑھ رہا ہے اور یہ قید خود راوی حدیث سفیان بن عینیہ نے بڑھائی ہے اور امام احمد بن حنبل نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس کی تائید کی ہے اور حدیث صحیح اذا قرا فانصتوا بھی اس کی مؤید ہے۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا صاحب تکمیل کا ترمذی کے قول کو نقل کرنا اور امام احمد کے قول کے چھوڑ دینا اور امام الکلام سے سہارا ڈھونڈنا ان کی جس بیچارگی کو ظاہر کر رہا ہے اہل علم خوب سمجھ سکتے ہیں۔

تیسری دلیل کے جواب میں تو صاحب تکمیل نے کمال کر دیا ایک تو حضرت جابر کی حدیث من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام (جس نے کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے پڑھی اس نے نماز نہیں پڑھی مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو) اس کا مطلب آپ نے یہ نکالا کہ مقتدی کی وہ رکعت جس میں اس نے امام کو حالت رکوع میں پا لیا ہو صرف یہ رکعت اس کی بلا فاتحہ درست ہے" بھلا موطا مالک اور ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جو الفاظ نقل کئے ہیں۔ ان سے کسی کا ذہن بھی اس مطلب کی طرف پہونچ سکتا ہے جو صاحب تکمیل نے گھڑا ہے لفظ الا وراء الامام کو مسبوق کی اس رکعت سے کیا واسطہ جو بحالت رکوع پائی گئی ہے" عاروں گھٹنا پھوٹے آنکھ اسی کو کہتے ہیں اگر ایسے ہی دور دراز مطالب بیان کر دینے سے دوسرے کے دلائل کا جواب دیا جا سکتا ہے تو بخدا آپ ایک دلیل سے بھی اپنا مدعی ثابت نہ کر سکیں گے۔

یہ تو حدیث کے معنی میں بے تکی تاویل تھی اب صاحب تکمیل کی دیانت سند کی بحث میں ملاحظہ ہو۔ اول تو آپ نے اثر جابر کو موقوف قرار دے کر یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ قول صحابی حدیث مرفوع کے خلاف ہے تو وہ عند الحنفیہ مقبول نہیں مگر وہ پہلے تو یہ ثابت کریں کہ حضرت جابر کا یہ قول حدیث مرفوع کے خلاف کیوں کر ہے؟ حدیث اذا قرأ فانصتوا کے وہ خلاف نہیں اور حدیث من کان لہ امام فقراءت الامام لہ قرأۃ۔ کے بھی موافق ہے رہی حدیث حدیث عبادہ تو ترمذی نے امام احمد بن حنبل کا قول نقل کر دیا ہے کہ وہ حضرت جابر کے اس قول ہی کی وجہ سے حدیث عبادہ کو منفرد پر

محمول کرتے ہیں۔ کیوں کہ حدیث عبادہ میں امام یا مقتدی سے کچھ بھی تعرض نہیں۔ پھر آپ نے ترمذی کے محشی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کو ناواقف قرار دیتے ہوتے یہ گل کھلائے ہیں کہ ان لوگوں نے اس اثر کو طحاوی کے حوالہ سے مرفوع لکھا ہے حالانکہ خود امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس کی پُرزور الفاظ میں تردید کی ہے پھر طحاوی سے ایک عبارت نقل کردی من ذالک حدیث یحیٰی بن السلام من شعبۃ فھو منکر الخ منجملہ ان کے حدیث یحیٰی بن سلام کی شعبہ سے ہے سو وہ حدیث منکر ہے جس سے ہر دیکھنے سننے والا یہی سمجھے گا کہ امام طحاوی نے یحیٰی بن سلام کی اس حدیث کو منکر کہا ہوگا جو حضرت جابر سے مروی ہے حالانکہ طحاوی کا یہ قول حدیث جابر کے متعلق اصلاً نہیں بلکہ مناسک حج کی اس حدیث کے متعلق ہے جو یحیٰی بن سلام نے شعبہ سے ابن ابی لیلی سے زہری سے سالم سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ تمتع کرنے والا اگر ہدی نہ پائے تو ایام تشریق میں روزہ رکھ لے اور محدثین کے اصول پر اس حدیث کے مرفوع ہونے کو منکر قرار دیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ عبداللہ بن عمر کا قول ہے کیوں کہ یحیٰی بن سلام اور ابن ابی لیلی کے حفظ میں محدثین کو کلام ہے اس کے بعد طحاوی نے یہ بھی فرمادیا ہے مع انی لا احب ان اطعن علی احد من العلماء بشئی ولکن ذکرت ما یقول اھل الروایۃ فی ذالک اھ ص۳۶۵ ج۱ یعنی اگرچہ میں علماء میں سے کسی پر بھی طعن کرنا پسند نہیں کرتا لیکن اہل روایت نے جو کچھ کہا ہے وہ میں نے ذکر کردیا ہے۔ اس جگہ صاحب تکمیل نے چند خیانتیں کی ہیں ایک یہ کہ طحاوی نے یحیٰی بن سلام کی اُس حدیث کو منکر کہا تھا جو وہ شعبہ کے واسطہ سے جواز صوم ایام تشریق میں روایت کرتا ہے اس حدیث کو ہرگز منکر نہیں کہا جس کو ص۱۰۷ ج۱ امام مالک کے واسطہ سے وہب بن کیسان سے حضرت جابر رضہ سے قرات خلف الامام کے متعلق مرفوعاً روایت کیا گیا ہے۔

دوسرے جس حدیث کو طحاوی نے یحیٰی بن سلام وابن ابی لیلی کے ضعف کی وجہ سے منکر کہا تھا وہاں بھی پرزور تردید نہیں کی تھی بلکہ صاف کہدیا تھا کہ میں خود کسی عالم پر طعن کرنا نہیں چاہتا صرف اہل روایت کا قول نقل کر رہا ہوں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود طحاوی کے نزدیک یحیٰی بن سلام اور ابن ابی لیلی ضعیف یا مطعون نہیں ہیں اس پر یہ دلیری اور بیباکی کہ خود تو خیانت کا ارتکاب کریں اور محشی ترمذی اور مولانا احمد علی صاحب پر خدا سے نہ ڈرنے کا الزام لگائیں۔ تیسرے کتب رجال سے یحیٰی بن سلام کا ترجمہ بھی نہ دیکھ لیا۔ جس سے معلوم ہوجاتا کہ بعض محدثین نے اس کو ثقہ بھی کہا ہے اور ایسا راوی حسن الحدیث ہوتا ہے اور صحیح اور حسن کا راوی اگر ایسی زیادتی کرے جو جماعت کے خلاف نہ ہو تو اس کی زیادت مقبول ہے ملاحظہ ہو شرح نخبہ ص۱۲ اور ظاہر ہے کہ موقوف کو مرفوع کرنا ایسی زیادت نہیں جس کو مخالفت پر محمول کیا جاسکے کیوں کہ حضرات صحابہ کبھی حدیث رسول ؐ کو بطور فتوے اپنی طرف سے بیان کیا کرتے تھے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر حدیث کو مرفوع کرتے تھے۔ اب یحیٰی بن سلام کا ترجمہ لسان المیزان ص۲۶۰ ج۱ سے ملاحظہ ہو۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ باوجود ضعف کے اس کی حدیث لکھی جائے۔ ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور کہا کبھی خطا بھی کرجاتا ہے۔ ابو زرعہ رازی نے کہا لا باس بہ ربما وھم اس میں کوئی بات نہیں کبھی وہم بھی کرجاتا ہے۔ ابو حاتم نے کہا شیخ بصری صدوق بزرگ ہے اور بہت سچا۔ ابوالعرب نے طبقات قیروان میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور کہا:

کان من الحفاظ ومن خیار خلق اللہ ــ حفاظ حدیث میں سے اور بہترین لوگوں میں سے تھا صرف دارقطنی نے اس کو ضعیف کہا ہے ابن عدی نے اس کی منکرات میں حدیث جابر کو ذکر نہیں کیا جو اس وقت زیر بحث ہے نہ طحاوی نے اس کو منکر کہا اور اکثر محدثین نے یحیٰی بن سلام کی توثیق کی ہے تو اگر اس کی حدیث کو مولانا احمد علی صاحب نے حَسَن کہدیا تو کیا جرم کیا؟ رہا یہ کہ طحاوی نے

اس کے بعد اسماعیل بن موسیٰ سُدّی کا اثر بیان کیا ہے جس میں یہ مضمون ہے کہ اسماعیل نے امام مالک سے پوچھا میں جابر کی اس حدیث کو مرفوع کر دوں؟ امام مالک نے فرمایا خذ وا...... اس میں سب سے پہلے تو اسمٰعیل سدی کا حال معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کس درجہ کا ہے؟ سو اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے مگر ابن حبان نے ثقات میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عبدان (شیخ بخاری) نے فرمایا کہ ابو بکر بن ابی شیبہ اور نہاد بن السری نے (کہ یہ بھی امام بخاری کے مشائخ میں سے ہیں) ہمارے اس کے پاس جانے پر انکار کیا اور یہ کہا یہ شخص فاسق ہے سلف کو برا کہتا ہے ابن عدی کہتے ہیں کہ اس نے امام مالک کی دو حدیثوں کو موصول کر دیا اور شریک سے بھی چند احادیث میں منفرد ہے (کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں) لوگوں نے اس کے غلو فی التشیع کی بنا پر اس کو منکر کہا ہے (یعنی غالی شیعہ ہے اس لئے محدثین نے اس پر انکار کیا ہے) ص۳۳۶ ۱۷ تہذیب " ایسے غالی شیعہ کی روایت سے یحییٰ بن سلام جیسے بہترین حافظ کی روایت کو مجروح قرار دینا صاحب تکمیل ہی کی جرأت ہے پھر اس غالی شیعہ نے امام مالک کا جو قول نقل کیا ہے اس سے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ امام مالک نے اس حدیث کے رفع پر انکار کیا ہے یا اس شخص کے شریک درس ہونے پر ان کے الفاظ یہ ہیں کہ "اس کے پیر پکڑ لو" جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو قید کر لو تاکہ حدیث بیان کرنے پائے اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ پیر پکڑ کے یہاں سے نکال دو یہ شیعہ غالی ہمارے درس میں بیٹھنے کے لائق نہیں اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ امام مالک نے حدیث کے مرفوع ہونے پر انکار کیا ہے اور اگر انکار بھی ہو تو اس کا رفع صحیح نہ ہو گا مگر حسن تو ہو سکتا ہے اور مولانا احمد علی صاحب نے رفع کو حسن ہی کہا ہے صحیح نہیں کہا۔

حنفیہ کی طرف سے چوتھی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ صحیح مسلم میں قتادہ رضی اللہ عنہ سے واذا قرأ فانصتوا وارد ہے (صاحب تکمیل کے الفاظ سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ وہ قتادہ کو صحابی سمجھتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ حدیث کے راوی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضہ صحابی ہیں) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام اور مقتدی کے فرائض کا بیان فرمایا ہے کہ "امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے جب وہ تکبیر کہے تکبیر کہو جب وہ قرأت کرے خاموش رہو جب وہ رکوع کرے رکوع کرو الخ

اس سے ہر شخص جو بھی سنے گا یہی سمجھے گا کہ مقتدی کو امام کی قرأت کے وقت خاموش رہنا چاہیئے۔ ہم نے اس حدیث کو حدیث عبادہ کے معارض یا اس کا ناسخ ہرگز نہیں کہا ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ حدیث عبادہ میں امام یا مقتدی کا کوئی ذکر نہیں اس میں صرف یہ مضمون ہے کہ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں اس کو مقتدی کے متعلق کہنا صحیح نہیں وہ غیر مقتدی کے حق میں ہے اور حدیث ابو موسیٰ صاف طور سے مقتدی کے حق میں ہے۔ اور ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث عبادہ کے راوی سفیان بن عیینہ اور زہری نے بھی اس کو غیر مقتدی کے متعلق سمجھا ہے۔ اب اس کے بعد اہل حدیث کی تاویلات ملاحظہ ہوں وہ کہتے ہیں اذا قرأ فانصتوا کا مطلب یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے سوا اور سورت پڑھنے سے خاموش رہو۔ کوئی ان سے پوچھے کہ حدیث اذا قرأ فانصتوا میں فاتحہ یا غیر فاتحہ کا کہاں ذکر ہے جو یہ قید بڑھائی جا رہی ہے؟ حدیث میں تو مطلقاً خاموش رہنے کا ذکر ہے اگر یہ کہا جائے کہ حدیث عبادہ کی وجہ سے یہ قید بڑھائی جا رہی ہے تو اس کی کیا دلیل ہے کہ حدیث عبادہ سے اذا قرأ فانصتوا کو مقید کرنا ضروری ہے؟ تطبیق اور توفیق کی یہ صورت بھی تو ہو سکتی ہے کہ حدیث عبادہ کو اس حدیث کی وجہ سے منفرد پر محمول کیا جائے جیسا سفیان بن عیینہ اور امام احمد بن حنبل اور امام زہری نے کیا ہے اور یہی حنفیہ نے اختیار کیا ہے اب صاحب تکمیل اس کی وجہ بتلائیں کہ وجہ تطبیق وہ بیان کرتے ہیں؟ وہی صحیح ہے اور جو وجہ ہم نے بیان کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اہل حدیث کو جو منکر تقلید ہیں یہ حق نہیں ہے کہ وہ حدیث اذا قرأ فانصتوا کے ظاہر مطلب کو کسی کی تقلید سے

بدل دیں اور اگر ان کو بیہقی وغیرہ کی تقلید میں اس حدیث کا ایک مطلب بیان کرنے کا حق ہے تو ہم کو بھی امام ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل وسفیان بن عیینہ وزہری کی تقلید میں اس کا وہ مطلب بیان کرنے کا حق ہے جو حدیث کے الفاظ سے بلا تاویل مفہوم ہو رہا ہے۔ رہا یہ کہ اس حدیث اذا قرأ فانصتوا کے دوسرے راوی حضرت ابوہریرہ رضؓ نے اپنے شاگرد سے فرمایا تھا اقرأ بہا فی نفسک یا فارسی کہ حالت اقتداء میں سورۂ فاتحہ کو اپنے نفس میں پڑھو اس کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ دل دل میں پڑھو کیونکہ موطا مالک میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی یہ حدیث موجود ہے فانتہی الناس عن القراءۃ فیما جہر فیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ لوگ جہری نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قراءت کرنے سے رک گئے جیسا پہلے گذر چکا ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ جہری نمازوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ قراءت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ قال فی غیث الغمام قولہ اقرأ بہا المراد من القراءۃ ھھنا القراءۃ فی النفس ای الاخطار بالبال من دون ان یتلفظ بہا ای احضر معانیہا فی نفسک وتدبر فیہا حین یقرأ ہا الامام کذا نقلہ الزرقانی فی معناہ عن عیسی وابن نافع اھ۔ یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ اپنے نفس میں سورۂ فاتحہ پڑھ لو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں پڑھو اور دل سے سوچتے رہو زبان سے تلفظ نہ کرو۔ بلکہ اس کے معانی کو دل میں حاضر کرتے اور سوچتے رہو جب کہ امام سورۂ فاتحہ پڑھے زرقانی نے اسی طرح اس کا مطلب عیسیٰ اور ابن نافع سے نقل کیا ہے اھ ابن نافع امام مالک کے شاگرد ہیں (غیث الغمام) وقال الطحاوی رحمہ اللہ وکان من الحجۃ علیہم فی ذالک ان حدیثی ابی ھریرۃ وعائشۃ الذین رووھما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کل صلوۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فھی خداج لیس فی ذالک دلیل علی انہ اراد بذالک الصلوۃ التی تکون وراء الامام فقد یجوز ان یکون عنی بذالک الصلوٰۃ التی لا امام فیہا للمصلی واخرج من ذالک الماموم بقولہ من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ فجعل الامام فی حکم من یقرأ بقراءۃ امامہ فکان الماموم بذالک خارجا من قولہ من صلوۃ لم یقرأ فیہا بفاتحۃ الکتاب فصلوتہ خداج اھ ص۱۰۶ ج ۱۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ قراءت خلف الامام کے قائل نہیں ہیں ان کی حجت مخالفوں پر یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت عائشہؓ کی اس حدیث میں کہ جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے اس پر کوئی دلیل نہیں کہ اس سے وہ نماز مراد ہے جو امام کے پیچھے ہو۔ جائز ہے کہ اس سے وہ نماز مراد ہے جس میں مصلی امام کے پیچھے نہ ہو۔ اس حکم سے آپ نے مقتدی کو اپنے دوسرے قول سے کہ جس کا کوئی امام ہو اس کی قراءت مقتدی کے لئے قراءت ہے مستثنیٰ کر دیا ہے جس میں مقتدی کو امام کی قراءت کی وجہ سے حکماً قاری قرار دیا گیا ہے پس مقتدی اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ جو نماز بغیر سورۂ فاتحہ کے پڑھی جائے وہ ناقص ہے۔

اب صاحب تکمیل انصاف سے بتلائیں کہ حدیث اذا قرأ فانصتوا کی جو تاویل وہ کر رہے ہیں اس کے صحیح اور حق ہونے کی کیا دلیل ہے؟ جب کہ حدیث میں صاف حکم ہے کہ امام جس وقت قراءت کرے مقتدی خاموش رہیں۔ رہا یہ کہ دارقطنی کی روایت میں ہے اذا قال الامام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فانصتوا کہ جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرے خاموش رہو جس سے معلوم ہوا کہ خاموش رہنے کا حکم سورۂ فاتحہ کے بعد ہے تو اہل حدیث کو یہ روایت پیش کرتے ہوئے شرمانا چاہیے یہ منکر روایت ہے تمام ثقات نے اس کو یوں روایت کیا ہے اذا قال الامام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین۔ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تم آمین کہو کسی محدث نے فقولوا آمین کو مختصر الفاظ میں فامنوا

کے لفظ سے بیان کر دیا ہوگا۔ اس کو کسی عقلمند نے تصحیف اور تبدیل کر کے فانصتوا کہدیا۔ ایسی مہمل باتوں سے صاحب تکمیل اپنا دل خوش کرلیں مگر سمجھنے والے ان کی بے بسی کو خوب سمجھ چکے ہیں اور اگر ان کو صحیح مان جائے تو ولاالضالین کے بعد جہر سے آمین کہنا بھی ممنوع ہوگا کیوں کہ حدیث میں ولاالضالین کے بعد خاموش ہونے کا امر ہے فما ہو جوابکم فہو جوابنا۔

پانچویں دلیل حنفیہ کی طرف سے یہ بیان کرتے ہوتے من کان لہ امام فقراءت لہ قراءۃ (جس کا کوئی امام ہو امام کی قرارت اس کے لئے قرارت ہے) صاحب تکمیل نے علامہ سندی حنفی کا سہارا ڈھونڈا ہے کہ اس کی سند میں جابر جعفی ہے جو کذاب ہے اور یہ حدیث صحاح ستہ کی حدیث (عبادہ کے خلاف ہے) اللہ اللہ! تقلید کا انکار کرنے والے بھی سندی حنفی کی تقلید کرتے ہیں یا للعجب!......اگر وہ سچے اہل حدیث ہوتے تو اس حدیث کے طرق کی تلاش کرتے، تاکہ معلوم ہوجاتا کہ ابن ماجہ کی سند میں جابر جعفی کے ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سند میں وہی موجود ہو اب سنئے اس حدیث کو حضرات صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔

جابر بن عبداللہ، وعبداللہ ابن عمر وابوسعید خدری۔ وابو ہریرہ۔ وابن عباس۔ وانس بن مالک۔ رضی اللہ عنہم اجمعین حدیث جابر کو جس سند سے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اس میں جابر جعفی ہے مگر اس کی دوسری سند بالکل صحیح ہے جس کو امام محمد نے مؤطا میں امام ابوحنیفہ سے موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد سے حضرت جابر رض سے بایں الفاظ روایت کیا ہے من صلی خلف الامام فان قراءۃ الامام لہ قراءۃ جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کی قرارت اس کے لئے بھی قرارت ہے۔

اس پر دارقطنی کا یہ فرمانا کہ اس حدیث کو سفیان ثوری اور ابوالاحوص۔ شعبہ۔ اسرائیل۔ شریک۔ ابوخالد دالانی سفیان بن عیینہ وغیرہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے عبداللہ بن شداد سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مرسلاً روایت کیا ہے (صحابی کا نام حذف کر دیا) اور وہی درست ہے ہم پر حجت نہیں کیوں کہ مسند احمد بن منیع میں اس حدیث کو سفیان ثوری اور شریک القاضی کے واسطہ سے مرفوعاً موصولاً روایت کیا گیا ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ امام ابوحنیفہ نے تنہا اس کو موصول کیا ہے اور اگر مان لیا جائے تو ابوحنیفہ ہزاروں محدثین سے بڑھ کر ثقہ ہیں ان کا کسی حدیث کو تنہا موصول کرنا بھی اصول محدثین کی بناپر واجب القبول ہے۔ یحیٰ ابن معین کے زمانہ تک امام ابوحنیفہ پر کسی نے بھی جرح نہیں کی تھی مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ رونما ہونے کے بعد بعض محدثین حشویہ نے ان پر جرح شروع کردی کیوں کہ اس فتنہ میں علماء محدثین پر سختی کرنے والے قاضی عقیدۃً معتزلی اور فروعاً حنفی تھے حشویہ نے ان قاضیوں سے اس طرح انتقام لیا کہ امام ابوحنیفہ رح امام ابویوسف رح اور امام محمد بن حسن شیبانی پر جرح کرنے لگے جو مذہب حنفی کے ستون ہیں۔ ولما سئل ابن معین عنہ قال ثقۃ ماموں ما سمعت احدا ضعفہ ھذا شعبۃ بن الحجاج یکتب الیہ ان یحدث وشعبۃ شعبۃ۔ جب یحیٰ ابن معین سے امام صاحب کی نسبت سوال کیا گیا فرمایا ثقہ مامون ہیں میں نے کسی کو نہیں سنا کہ ان کو ضعیف کہتا ہے شعبۃ بن الحجاج ان کو حدیث بیان کرنے کی تاکید خط کے ذریعہ کرتے ہیں اور شعبہ شعبہ ہی ہے۔

بڑے بڑے ائمہ نے امام صاحب کی تعریف کی ہے جیسے عبداللہ بن المبارک اور ان کا شمار تو امام صاحب کے شاگردوں میں ہے اور سفیان بن عیینہ۔ سفیان ثوری۔ حماد بن زید۔ عبدالرزاق۔ وکیع بن الجراح اور یہ تو امام صاحب کے فقہ پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ نیز ائمہ ثلثہ امام مالک وشافعی واحمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے بھی امام صاحب کی تکمیل بہت مدح وثنا کی

ہے عینی شرح بخاری ص ۱۲ ج ۶۲۔ اور تاریخ خطیب بغدادی میں جو بعض بڑے لوگوں سے امام صاحب کی تضعیف و تنقیص منقول ہے یہ سب فتنۂ خلق قرآن کے بعد جماعت حشویہ کی گھڑت ہے کیوں کہ یہ تمام خرافات عموماً مجہولین، مجروحین، کذابین کے ذریعہ سے روایت کی گئی ہیں اور خطیب کی وفات کے بہت بعد اس کی تاریخ میں ملحق کی گئی ہیں۔ خطیب نے ثقات کے ذریعہ سے بجز مناقب و فضائل کے کچھ ذکر نہیں کیا جس کی تفصیل کا شوق ہے۔ میرا مستقل مضمون "خطیب بغدادی اور منکرین حدیث" مطبوعہ رسالہ ماہ واری الصدیق ملتان شہر بابت ۱۹۵۷ء و ۵۸ء مطالعہ کریں۔ رہے دوسرے طرق جو حضرت عبداللہ بن عمر و ابو سعید خدری و ابو ہریرہ و ابن عباس و انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں انکے بعض راویوں پر اگرچہ دار قطنی رح نے کلام کیا ہے مگر ان میں اکثر ایسے ہیں جو بعض محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں پھر اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ چند ضعیف مل کر حسن اور کبھی صحیح کے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ حنفیہ کے گھر کا فیصلہ ہے کہ یہ حدیث قابل تسلیم نہیں اگر صاحب تکمیل عینی شرح بخاری کا مطالعہ کر لیتے تو معلوم ہو جاتا کہ حنفیہ کے نزدیک یہ حدیث بالکل صحیح بلکہ صحیح سے بھی اوپر ہے کیوں کہ اس کو خود امام محمد نے امام ابو حنیفہ سے مؤطا اور کتاب الآثار میں بسند صحیح روایت کیا ہے پھر امام دار قطنی نے جو اس کو مرسلاً صحیح کہا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ عبداللہ بن شداد صحابی صغیر ہیں اور جب امام شافعی کے نزدیک سعید بن المسیب جیسے تابعی کبیر کا مرسل قابل قبول ہے تو صحابی صغیر کا مرسل بدرجۂ اولی مقبول ہوگا کیوں کہ مراسیل صحابہ کو بالاتفاق سب نے قبول کیا ہے۔ اس کے بعد صاحب تکمیل نے امام بخاری کا ایک فیصلہ نقل کیا اور دعوی کیا ہے کہ یہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ عام ہے اور حدیث عبادہ میں الا بام القرآن سے سورۂ فاتحہ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے ایک حدیث میں ہے کہ میرے لئے ساری زمین نماز کی جگہ بنائی گئی ہے پھر دوسری حدیث میں الا المقبرۃ والحمام کہہ کر قبرستان وغیرہ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ امام طحاوی نے بھی تو یہی فرمایا ہے کہ حدیث ابو ہریرہ کل صلوٰۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج (جس نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھی جائے وہ خداج ہے) عام ہے جس میں سے حدیث من کان لہ امام فقراءۃ لہ قراءۃ نے مقتدی کو مستثنیٰ کر دیا ہے اور اس کو امام کی قراءت کی وجہ سے قاری قرار دیا گیا ہے تو اس کی کیا وجہ کہ امام بخاری کا قول تو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور امام طحاوی کا قول آب زر سے لکھنے کے قابل نہ ہو یہ محض زبردستی اور عصبیت ہے اور کچھ نہیں۔ حالانکہ لفظ قراءت کو عام کہنا غلط ہے اور حدیث ابو ہریرہ میں کل صلوٰۃ کا عام ہونا صحیح اور واضح ہے پھر ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث عبادہ میں جملہ استثنائیہ الا بام القرآن کو امام فن یحیی بن معین نے ضعیف کہا ہے اس کی وجہ سے حدیث من کان لہ امام الخ میں تاویل کرنا صحیح نہیں اور حدیث لمن کان لہ امام صحیح حدیث ہے نیز حدیث مسلم اذا قرأ فانصتوا اور نص قرآن واذا قرأ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کے موافق ہے اس کو حدیث عبادہ رض اور حدیث ابو ہریرہ رض کے لئے مخصص قرار دینا درست ہے۔ پس امام طحاوی کا قول بہت وزنی ہے جس کے سامنے امام بیہقی وغیرہ کی تاویل کی کوئی حقیقت نہیں۔ رہا یہ کہ دار قطنی (اور بیہقی) نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ظہر یا عصر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سبح اسم ربک الاعلی پڑھی تھی آپ نے نماز کے بعد دریافت کیا یہ کون میرے پیچھے قراءت کر رہا تھا؟ تین بار دریافت فرمایا ایک شخص نے کہا میں نے قراءت کی تھی فرمایا میں دیکھ رہا تھا کہ تم قرآن میں مجھ سے منازعت کر رہے تھے جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرے اس کو امام کی قراءت

کافی ہے الخ تو یہ حدیث تو حنفیہ کی دلیل تھی جس کو مغالطہ کے طور پر صاحب تکمیل اپنی دلیل بنا رہے ہیں۔ حدیث سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس شخص نے آہستہ قرارت کی تھی اگر جہر سے قرارت کی ہوتی تو حضورؐ کو تین بار دریافت کرنے کی نوبت نہ آتی صحابہ پہلے ہی سوال پر کہہ دیتے کہ فلاں نے قرارت کی تھی پھر آپ کا یہ فرمانا کہ جو امام کے پیچھے نماز پڑھے امام کی قرارت اس کے لئے قرارت ہے صاف بتلا رہا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرارت نہ کرنا چاہیئے اس سے یہ سمجھنا کہ سورۃ فاتحہ کے سوا اور کوئی سورت نہ پڑھے زبردستی کی تاویل ہے جو ہرگز حضورؐ کے ارشاد سے مفہوم نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ سری نمازوں میں بھی آپ کو مقتدی کی قرارت گوارا نہ تھی۔ اور یہ کہ عام طور سے صحابہ حضورؐ کے پیچھے قرارت نہ کرتے تھے ایک دو ناواقف ایسا کرتے تو حضورؐ ان کو قرارت سے روک دیتے تھے اگر سب صحابہ قرارت کرتے ہوتے تو بقیہ مقتدی یہ ضرور کہتے کہ ہم نے تو صرف سورۃ فاتحہ پڑھی تھی مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ سب خاموش رہے پھر قرارت کرنے والے نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں نے سورۃ فاتحہ اور سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھی تھی اس نے بھی صرف سبح اسم ربک الاعلیٰ کی قرارت کا اقرار کیا جس سے معلوم ہوا کہ قرارت فاتحہ خلف الامام کا صحابہ کو اہتمام نہ تھا پھر اگر قرارت فاتحہ خلف الامام لازمی تھی تو اس شخص کو آپ مطلقاً قرأت سے منع نہ کرتے بلکہ صاف فرما دیتے کہ فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھا کرو حضرت جابر کی حدیث کے کسی طریق میں بھی قرارت فاتحہ کا استثناء مذکور نہیں اور حدیث عبادہ کے جملہ استثنائیہ کا حال اوپر گذر چکا ہے کہ ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے پس حنفیہ کی دلیل کو اپنی دلیل بنانے والا خود جہالت کا ارتکاب کر رہا ہے وہ اس خطاب کا جو دوسروں کو دے رہا ہے خود ہی مستحق ہے ۔

اس کے بعد چھٹی دلیل عبداللہ بن مسعود کی حدیث کنز العمال کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے اذا صلی احدکم خلف الامام فلیصمت فان قراءته له قراءة وصلوٰته له صلوٰة (جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے خاموش رہے کیونکہ اس کی قرارت اس کے لئے قرارت ہے اور اس کی نماز اس کی نماز ہے) اس حدیث کو اول تو ضعیف کہا گیا ہے مگر ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ حدیث چند صحابہ کی روایت سے ہے جن میں عبداللہ بن مسعود صحابی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اور حدیث ضعیف کا تعدد طرق سے حسن یا صحیح کے درجہ پر پہنچ جانا اصول حدیث میں مصرح ہے پھر اس حدیث کے بعض طرق یقیناً صحیح ہیں اور بعض حسن ہیں جیسا پہلے اپنے دلائل میں ہم بیان کر چکے ہیں اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو حضرت جابر کی روایت سے مشہور قرار دیا ہے اور حدیث مشہور کا جو درجہ ہے اہل حدیث اس سے ناواقف نہیں ہے پھر اس میں بھی وہی بے تکی تاویل کی گئی ہے کہ لفظ قرارت عام ہے جس سے بوجہ حدیث عبادہ کے سورۃ فاتحہ مستثنیٰ ہے الخ اس تاویل کا لغو ہونا ابھی بیان ہو چکا ہے پھر ایک عجیب الزام دیا گیا ہے کہ اگر جملہ فان قراءته له قراءة سے یہ مطلب لیا گیا کہ امام کی قرارت مقتدی کو کافی ہے اس کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کی ضرورت نہیں تو جملہ وصلوٰته له صلوٰة کا بھی یہی مطلب ہو گا کہ امام کی نماز مقتدی کو کافی ہے تو اقتداء کے بعد ارکان نماز مثلاً رکوع وسجود وغیرہ کی بھی مقتدی کو ضرورت نہ ہو گی ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صاحب تکمیل کے نزدیک صلوٰۃ نام ہی سورۃ فاتحہ کا ہے جیسا حدیث قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی کی تفسیر میں ص۴۵ پر امام رازی سے نقل کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث میں سورۃ فاتحہ کو صلوٰۃ فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اگر فاتحہ نہ ہو تو نماز ہی نہیں الخ جب آپ کے نزدیک سورۃ فاتحہ ہی کا نام صلوٰۃ ہے تو حدیث ابن مسعود کا حاصل یہ ہو گا کہ امام کی قرارت مقتدی کی قرارت ہے اور اس کی سورۃ فاتحہ مقتدی

کی سورۂ فاتحہ ہے اس کو خود پڑھنے کی ضرورت نہیں اور قرارت کے بعد خاص سورۂ فاتحہ کا ذکر اس لئے فرمایا گیا کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ قرارت سے مراد ماسوائے فاتحہ ہے اس لئے اس شبہ کو رفع کر دیا گیا یہ تو الزامی جواب تھا دیکھیں صاحب تکمیل اس الزام کو کس طرح اپنے اوپر سے دفع کرتے ہیں۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ جملہ "وصلوٰۃ لہ صلوٰۃ" کا وہی مطلب ہے جو حدیث الامام ضامن کا مطلب ہے کہ امام کی نماز صحۃً وفساداً متضمن صلوٰت مقتدی ہے یعنی اگر امام کی نماز صحیح ہوگی اس کی بھی صحیح ہوگی اس کی فاسد ہوگی تو اس کی بھی فاسد ہوگی چنانچہ ابو داؤد کی ایک روایت میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے قال وحدثنا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لقد اعجبنی ان تکون صلوٰۃ المسلمین اوالمومنین واحدۃ اھ۔ حضرت معاذ بن جبل نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نماز ایک نماز ہو اھ۔ جماعت کی نماز کو آپ نے ایک نماز قرار دیا ہے الگ الگ بہت سی نمازیں قرار دی نہیں اور عرفاً وعادتاً بھی جماعت کی نماز کو ایک ہی نماز شمار کیا جاتا ہے اور اسی لئے کہ جماعت کی نماز ایک نماز ہے سترہ صرف امام کے سامنے کافی ہے ہر مقتدی کے آگے الگ الگ سترہ کی ضرورت نہیں تو ایک نماز کے لئے ایک قرارت اور ایک ہی فاتحہ کافی ہے ہر ایک کو قرارت کی ضرورت نہیں بقیہ ارکان کو قرارت پر قیاس کرنا غلط ہے کیوں کہ امام کی قرارت کے لئے تو استماع و انصات کا قرآن و حدیث میں صاف حکم ہے اور رکوع وسجدے کے لئے نیابت کافی نہیں سمجھی گئی بلکہ مقتدیوں کو صاف حکم ہے اذا رکع فارکعوا واذا سجد فاسجدوا جب امام رکوع کرے تم بھی رکوع کرو جب وہ سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو اور یہی عام عادت بھی ہے کہ جب دربار شاہی میں بہت سے لوگ ایک درخواست لے کر پہنچتے ہیں تو افعال تعظیمی تو ہر شخص بجالاتا ہے مگر گفتگو رئیس وفد کرتا ہے ہر شخص الگ الگ گفتگو نہیں کرتا اور درخواست قبول ہونے کے بعد پھر ہر شخص شکریہ الگ الگ ادا کرتا اور آداب تعظیمی بجالاتا ہے یہی صورت شریعت نے نماز میں رکھی ہے کہ اول سب تکبیر کہیں آداب شاہی بجالائیں اس کے بعد درخواست پیش کرنا امام کا کام ہے جب وہ سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت پڑھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمنزلہ جواب کے ہے تو ہر شخص آداب تعظیمی بجالاتا ہے اور رکوع وسجدہ میں شکریہ اور تعظیم کے الفاظ ادا کرتا ہے اگر اہل حدیث انصاف سے کام لیں تو ان کے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ جس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام اور مقتدی دونوں کے فرائض بیان فرماتے ہیں یعنی حدیث انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا رکع فارکعوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا اللھم ربنا لک الحمد واذا سجد فاسجدوا الخ امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے جب وہ تکبیر کہے تکبیر کہو جب رکوع کرے رکوع کرو جب سمع اللہ لمن حمدہ کہے اللھم ربنا لک الحمد کہو جب سجدہ کرے سجدہ کرو۔ اس کی کسی روایت میں بھی یہ نہیں ہے واذا قرأ فاقرؤا کہ جب امام قرارت کرے تم بھی قرارت کرو اگر مقتدی کے ذمہ امام کی قرارت کے ساتھ قرارت فرض یا واجب ہوتی تو اس کا بیان اس حدیث میں ضروری تھا جس میں امام اور مقتدی دونوں کے فرائض بیان کئے جا رہے ہیں اس حدیث میں اگر ہے تو اذا قرأ فانصتوا ہے کہ جب امام قرارت کرے تم خاموش رہو ملاحظہ ہو صحیح مسلم اور ابو داؤد پس جس کو قرارت فاتحہ خلف الامام کے فرض ہونے کا دعویٰ ہے وہ اس حدیث کے کسی طریق میں اذا قرأ فاقرؤا دکھلائے کیوں کہ یہی حدیث میں امام اور مقتدی دونوں کے فرائض کا بیان ہے حدیث عبادہ پیش کرنا کافی نہیں کیوں کہ اس میں امام اور مقتدی کے فرائض کا بیان نہیں بلکہ راوی حدیث سفیان بن عیینہ اور زہری وغیرہ نے خود کہدیا ہے کہ وہ تنہا نماز پڑھنے والے کے متعلق ہے اور اسی کو امام احمد نے بیان فرمایا ہے۔

ساتویں دلیل صحیح مسلم سے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا گیا ہے لا قرأۃ مع الامام فی شئی من الصلوٰۃ کہ امام کے ساتھ کسی نماز

میں بھی قرارت نہیں ہے (امام طحاوی کے الفاظ یہ ہیں لا تقرأ مع الامام فی شیٔ من الصلوات ورجالہ ثقات امام کے ساتھ کسی نماز میں قرارت نہ کرو اور اس کے راوی سب ثقہ ہیں) اس کے بعد وہی بے تکی تاویل اس میں بھی کی گئی ہے کہ یہ اثر ماسوا فاتحہ پر محمول ہے اور ——— دیدہ دلیری کے ساتھ فرماتے ہیں کہ یہ جواب صحیح مسلم کے اسی صفحہ پر موجود ہے الخ کوئی ان سے پوچھے کہ امام نووی کی تقلید کس دن سے واجب ہو گئی جو ان کے جواب کو ماننا حنفیہ پر لازم ہو گیا اور نہ مانیں تو شپرہ چشم کہلائیں۔ مگر جو لوگ امام طحاوی کے جواب کو نہ دیکھیں نہ مانیں ان کے لئے کیا لقب تجویز کیا جائے گا؟ یہ ہے اہل حدیث کی دیانت اور تہذیب کہ اپنے مطلب کی بات کسی جگہ سے مل جائے تو فوراً مقلد بنجاتے ہیں اور اس کے ماننے پر ایسا زور دیتے ہیں کہ گویا آسمان سے وحی نازل ہو گئی ہے کہ اثر زید بن ثابت کا وہی مطلب ہے جو امام نووی نے بیان کیا یا امام بیہقی نے اپنے مذہب کی رعایت وحمایت میں کچھ لکھدیا ہے میں پوچھتا ہوں کہ زید بن ثابت کے اثر میں فاتحہ یا غیر فاتحہ کا ذکر ہی کہاں ہے اور اگر اسی طرح کی تاویلوں سے کام لیا جائے گا تو آپ کی ایک دلیل بھی قائم نہ رہ سکیگی ہر شخص کو اختیار ہو گا کہ آپ کے تمام دلائل کو منفرد پر محمول کر دے اور تائید میں حدیث اذا قرأ فانصتوا اور نص قرآنی اذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کو پیش کر دے پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ کی تاویل اور امام نووی اور بیہقی کا قول تو حجت ہے اور دوسرے کی تاویل اور امام احمد و سفیان بن عیینہ اور زہری اور طحاوی اور علامہ عینی کے اقوال حجت نہ ہوں؟ اگر آپ سچے اہل حدیث ہیں تو صرف حدیث کے الفاظ سے استدلال کیجئے اِدھر اُدھر سے اس میں قیدیں نہ بڑھایئے اس راستہ سے آپ چلیں گے تو انشاء اللہ حنفیہ کے مسلک کی قوت کھلی آنکھوں نظر آجائے گی آپ نے حنفیہ کے جتنے دلائل پر کلام کیا ہے وہ صاف الفاظ میں قرارت فاتحہ خلف الامام کے ممنوع ہونے یا فرض وواجب نہ ہونے کو ظاہر کر رہے ہیں مگر آپ امام نووی یا بیہقی یا امام رازی وغیرہ کی تقلید کا سہارا لے کر ان میں وہ تاویلیں کرتے ہیں جس کا آپ کو کوئی حق نہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اسی کا نام ہے اخیر میں امام احمد بن حنبل اور علامہ ابن تیمیہ کا قول پھر یاد دلاتا ہوں امام احمد فرماتے ہیں "ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ جب امام قرارت جہر سے کر رہا ہو اور اس کے پیچھے مقتدی قرارت نہ کرے تو ان کی نماز صحیح نہ ہوگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور تابعین اور اہل حجاز میں امام مالک اہل عراق میں امام سفیان ثوری اہل شام میں امام اوزاعی اہل مصر میں امام لیث بن سعد ان میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ جو شخص مقتدی ہو اور اس کا امام قرارت کر رہا ہو وہ قرارت نہ کرتا ہو تو اس کی نماز باطل ہے اھ موفق ابن قدامہ نے امام احمدؒ کا یہ قول نقل کر کے اس مسئلہ میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے صـ ۶۰۶ ج ۱۔ علامہ عینی نے شرح بخاری میں فرمایا ہے کہ قرارت خلف الامام کی ممانعت بڑے بڑے اسی صحابہ سے منقول ہے جن میں حضرت علی رضؓ اور عبادلہ ثلثہ (عبداللہ بن مسعودؓ عبداللہ بن عمرؓ۔ عبداللہ بن عباس رضؓ) بھی ہیں محدثین کو ان کے صحابہ کے نام معلوم ہیں ان حضرات کا اس پر اتفاق کرنا بمنزلہ اجماع کے ہے اسی لئے صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ ترک قرارت خلف الامام پر صحابہ کا اجماع ہے اکثر کے اتفاق کو اجماع کہدیا گیا کیوں کہ ہمارے نزدیک اس کو بھی اجماع کہا جاتا ہے اور شیخ امام عبداللہ بن یعقوب حارثی نے اپنی کتاب کشف الاسرار میں فرمایا ہے کہ عبداللہ بن زید بن اسلم نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دس حضرات قرارت خلف الامام سے بہت سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے (جن کے نام یہ ہیں) ابوبکر صدیق رضؓ۔ عمر بن الخطابؓ، عثمان بن عفان علی ابن طالبؓ، عبدالرحمان بن عوف رضؓ۔ سعد بن ابی وقاص رضؓ، عبداللہ بن مسعود رضؓ، زید بن ثابت رضؓ۔ عبداللہ بن عمر رضؓ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اھ۔ اس کے بعد علامہ عینی نے متعدد صحابہ کے اقوال بحوالہ کتب واسانید بیان کئے ہیں جن کو ہم نے اپنے دلائل میں پہلے ہی بیان کر دیا ہے علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب تنوع العبادات میں فرمایا ہے کہ "سلف نے

عام طور پر قرارت خلف الامام کو مکروہ سمجھا ہے جب کہ امام قرارت جہر سے کر رہا ہو اور اکثر ائمہ سورۂ فاتحہ کے بعد سکوت طویل نہ کرتے تھے (تاکہ مقتدی فاتحہ پڑھ لیں) جہری نمازوں میں (امام کے پیچھے) قرارت کرنے والے بہت کم تھے اور اس سے کتاب اللہ نے بھی منع کیا ہے اھ۔ اور سنتِ رسول صلعم نے بھی اور جمہور سلف وخلف بھی اس سے منع کرتے ہیں اور قرارت خلف الامام کی صورت میں نماز کے باطل ہونے میں اختلاف ہے بعض علماء کے جہری نماز میں بھی مقتدی پر قرارت فاتحہ خلف الامام کو واجب کرتے ہیں اور اگر قرارت نہ کرے تو نماز کے باطل ہونے میں اختلاف ہے پس نزاع دونوں طرف ہے لیکن جو لوگ قرارت خلف الامام سے منع کرتے ہیں ان کے ساتھ جمہور سلف وخلف ہیں اور کتاب اللہ بھی اور سنتِ صحیحہ بھی۔ اور جو لوگ اس حالت میں مقتدی پر قرارت کو واجب کرتے ہیں ان کی حدیث کو ائمہ نے ضعیف کہا ہے ابو داؤد نے اس کو روایت کیا ہے اور حدیث ابو موسیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو واذا قرأ فانصتوا (جب امام قرارت کرے خاموش رہو) امام احمد اور اسحٰق اور امام مسلم وغیرہم نے صحیح بتلایا ہے بخلاف اس حدیث کے جو حضرت عبادہ سے روایت کی گئی ہے لاتفعلوا الابام القرآن کہ امام کے پیچھے نہ پڑھے مگر سورۂ فاتحہ وہ صحیح میں شامل نہیں کی گئی اور اس کا ضعیف ہونا چند وجوہات سے ثابت ہو چکا ہے در اصل وہ حضرت عبادہ کا قول ہے اھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے۔

الحمد للہ کہ آج بروز چہار شنبہ ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ رسالہ تکمیل البرہان کا جواب تمام ہوا جس سے ناظرین کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مسئلہ قرارت خلف الامام میں امام ابو حنیفہ کا مسلک کتاب اللہ اور سنتِ صحیحہ اور اجماع جمہور سلف وخلف سے مؤید ہے اور جاہل حدیث مقتدی کی نماز کو بوجہ ترک قرارت فاتحہ خلف الامام کے باطل کہتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل صریح نہیں بلکہ امام کے پیچھے قرارت کرنے والوں کی نماز درست ہی ہو جائے تو غنیمت ہے کیوں کہ قرآن میں اور سنتِ صحیحہ میں مقتدی کو قرآت قرآن کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے قرأت سے منع کیا گیا ہے اور اہل حدیث کے اصول پر نہی کی مخالفت سے عمل باطل ہو جاتا ہے اگرچہ حنفیہ کے نزدیک باطل نہیں ہوتا پس ان کو امام ابو حنیفہ کا احسان مند ہو جانا چاہیئے کہ وہ قرارت خلف الامام کیوجہ سے ان کی نمازوں کو باطل نہیں کہتے ورنہ خود اصول اہل حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ آیت اذا قرأ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کی مخالفت سے جس کا نزول بالاجماع قرارت خلف الامام کے بارے میں ہوا ہے جیسا امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے نیز حدیث صحیح اذا قرأ القرآن فانصتوا کی خلاف ورزی سے جو صاف طور سے مقتدیوں کے متعلق وارد ہے کہ جب امام قرارت کرے خاموش رہو اہل حدیث کی نمازیں باطل ہو جانی چاہئیں جیسا صوم یوم النحر کو اسی بنا پر باطل کہتے ہیں کہ شارع کی نہی موجب بطلان عمل ہے امید ہے کہ اہل فہم اس نکتہ کو سمجھ گئے ہونگے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عصبیت جاہلیہ سے بچائے اور ائمہ سلف کی عظمت وادب کا پاس کرنے کی توفیق دے اور اس رسالہ کو مقبول عام وخاص بنائے۔

جو صاحب اس کو مستقل چھاپنا چاہیں وہ لوح پر اس کا نام فاتحۃ الکلام فی القراۃ خلف الامام تحریر فرما دیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ الذی بنعمتہ وبعزتہ وجلالہ تتم الصلحت۔

اعتراف

ماہ نومبر کے فاران میں جناب رشید احمد صدیقی کی کتاب "ہم نفسان رفتہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا تھا "چھب تختی آج تک سننے اور پڑھنے میں نہیں آیا ...اس لفظ کے بارے میں ہم نے بعض دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے بھی دریافت کیا۔ سب نے یہی کہا کہ یہ لفظ ہم نے سنا ہی نہیں۔ ایک صاحب نے البتہ یہ فرمایا کہ یہ لفظ کسی کتاب میں ضرور نظر سے گزرا تھا مگر اس کے معنی اور مفہوم کا مجھے علم نہیں ہے۔ ہفتہ وار دور جدید کے ہم شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری اس بے خبری

ہماری نظر میں

تفسیر ایوبی
تفسیر سورۃ فاتحہ

از:- علامہ محمد ایوب دہلوی، ضخامت ۲۷۷ صفحات، خوب صورت جلد، سنہری ڈائی کے ساتھ، کتابت جلی اور دیدہ زیب، طباعت صاف و مجلّٰی، کاغذ سفید اور چکنا (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- شیخ شجاع الحق دہلوی، ۵۷ گارڈن روڈ کراچی

حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی ایک حق پسند عالم دین ہیں اور ساتھ ہی عالم باعمل بھی ہیں، تجارت کے ذریعہ اپنی روزی مہیا کرتے ہیں، اس لئے حق کے معاملہ میں کسی سے دب کر اور جھجک کر بات نہیں کرتے، تقسیم ہند سے قبل مولانا موصوف نے دلی میں کم و بیش بتیس سال تک طالبانِ حق کے سامنے وعظ کو تبلیغ دین کا ذریعہ بنایا تھا، اور پاکستان بننے کے بعد تیرہ سال سے مہینہ میں دو بار پابندی کے ساتھ حقائق و معارف کے دریا بہا رہے ہیں، اُن کی محفل میں شروع شروع میں دس بارہ آدمی ہوتے تھے، مگر اب اس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، کسی کسی دن تو حاضرین کی تعداد سو سے بھی بڑھ جاتی ہے، ہم نے متعدد بار مولانا موصوف کے درس میں شریک ہو کر استفادہ کیا ہے۔

مسٹر پرویز کے پاس علامہ محمد ایوب دہلوی نے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ اُن سے "حدیث" کے مسئلہ میں گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں، پرویز صاحب اپنے تمام شبہات پیش کر سکتے ہیں، اُن کے جوابات عقل و نقل اور درایت و روایت کے دلائل کے ساتھ دیئے جائیں گے، مگر پرویز صاحب صاف کنی کاٹ گئے، اور مولانا موصوف سے گفتگو کرنے کی پرویز کو ہمت ہی نہیں ہوئی!

مولانا محمد ایوب دہلوی (متعنا اللہ بطول حیاتہ) وعظ و بیان کے مردِ میدان کیا، یوں کہئے اس حکومت کے بادشاہ ہیں، مگر انھوں نے تصنیفی کام زندگی بھر نہیں کیا اور ضرورتاً کیا بھی ہے تو وہ اُن کی تقریر کے مقابلہ میں قابلِ ذکر نہیں ہے! مہینہ میں دو بار مولانا موصوف جو تقریر فرماتے ہیں اُسے ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر لیا جاتا ہے، یا بعض حضرات لکھتے بھی جاتے ہیں، "تفسیر ایوبی" انہی نوشتوں اور ٹیپ ریکارڈوں سے مُرتب کی گئی ہے، اس لئے اس کتاب میں تصنیفی اندازِ کلام اور تقریری انداز بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

"تفسیر ایوبی" پر مختصر سا پیش لفظ مولانا حکیم سید عبدالجبار صاحب نے لکھا ہے، جو برسوں سے ریڈیو پاکستان پر درسِ قرآن دے رہے ہیں اور جن کو بجا طور پر "مفسر قرآن" کہا جا سکتا ہے! کتاب کے شروع کے پچہتر صفحات میں "اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم" کی شرح کی گئی ہے۔ "استعاذہ واجب ہے یا مستحب؟" اس بحث کو فاضل مفسر نے چھیڑ کر، آخر میں بیان کیا ہے:-

> "بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ کے نزدیک استعاذہ واجب ہے اور دوسرے گروہ کے نزدیک مستحب! پہلے گروہ نے وجوبِ استعاذہ پر جو دلائل بیان کئے ہیں، وہ سب ناقص ہیں لہٰذا دوسرے گروہ (یعنی جمہور علماء) کا مذہب ہی صحیح ہے، یعنی استعاذہ

واجب نہیں بلکہ مستحب ہے "۔

مولانا موصوف کی "تفسیر" کا ایک مختصر سا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتنی نازک بات کو کس قدر ایجاز کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں :۔

"اب اگر کوئی یہ کہے کہ "کن" کا خطاب موجود کو ہے یا معدوم کو، اگر موجود کو ہے تو جو موجود ہے وہ اور کیا موجود ہوگا، اگر معدوم کو ہے تو معدوم کی طرف خطاب جائز نہیں، تو میں کہوں گا یہ خطاب تکوینی ہے، یعنی اسی خطاب سے وجود ہوا ہے، یعنی معدوم اسی خطاب سے موجود ہوا ہے، اور خطاب تکلیفی میں مخاطب کو موجود ہونا چاہیئے، خطاب تکوینی میں اسی خطاب تکوینی سے مخاطب موجود ہوتا ہے "۔

علامہ محمد ایوب دہلوی کی تقریر کا انداز "کلامی" ہوتا ہے، فلسفہ وکلام کے بڑے غامض نکات وہ اپنی تقریر میں بیان کر جاتے ہیں۔ "کلامی مباحث" میں وہ غیر معمولی درک وبصیرت رکھتے ہیں "کلامی استدلال" کے ذریعہ کتاب وسنت کی شرح اور تفسیر میں وہ ممتاز و منفرد شخصیت کے حامل ہیں، اس کتاب میں بھی یہی "کلامی رنگ" غالب ہے، اس لئے "تفسیر ایوبی" سے عوام مسلمان تو کم ہی فائدہ اٹھا سکیں گے ہاں اہل علم کو اس سے نفع ہوگا!

"میں کہتا ہوں اس کا حل یہ ہے کہ قدرت چونکہ لامتناہی ہے، اور ظرف لامتناہی میں ہے، اور وہ ظرف قادر ہے، اور مقدور ظرف متناہی میں ہے اور وہ ظرفِ متناہی تعلق قدرت ہے، اور تعلق چونکہ اس کے لئے اول ہے، تو ظرف تعلق عالم نہایت ہو گیا اور قدرت عالم لامتناہی ہے، وہ عالمِ متناہی یعنی ظرفِ مقدور میں سما نہیں سکتی ... " (ص ۱۴۸)

اس قسم کے مباحث میں عوام کے کیا پلے پڑ سکتا ہے؟

صفحہ ۵۷ پر جو "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کو "حدیث رسول" کہا گیا ہے یہ بہت کمزور بات ہے، اسی طرح ص ۱۹۰ پر جو روایت "انگوٹھی" پر "لا الٰہ الا اللہ" نقش کرانے کی حکایت کے ساتھ درج کی گئی ہے، وہ بھی اُن ضعیف روایتوں میں شامل ہے جسے واعظ صاحبان گرمئ محفل کے لئے بیان کیا کرتے ہیں، قرآن کی تفسیر میں صحیح احادیث درج کرنی چاہئیں!

ص۲۱۱ پر فاضل مفسر نے "شریعت، طریقت اور حقیقت" کے تین درجوں کی جو صوفیانہ تشریح فرمائی ہے، اُس کی آخر اصل و سند کیا ہے؟ "کتاب و سنت" میں ان "مدارج" کا ذکر نہیں ملتا، حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین ہی سب کچھ ہے یہی شریعت ہے، یہی طریقت ہے، یہی حقیقت ہے!

"تفسیر ایوبی" کی افادیت اور اہمیت بہرحال اپنی جگہ مسلّم ہے "کلامی مباحث" کے باوجود، اس میں یقین و ایمان کی جو روح ملتی ہے، وہ قدر و ستائش کی مستحق ہے، مولانا محمد ایوب دہلوی کی یہ خصوصیت ہے کہ اُن کے فلسفہ وکلام کی ساری قوت شبہات و شکوک دور کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اُن کی تقریریں ایمان و یقین کو جِلا دیتی ہیں۔

آتشِ خنداں

از: لبیب تیموری، ضخامت ۲۰۴ صفحات (خوب صورت جلد) کتابت، طباعت اور کاغذ، ہر چیز دیدہ زیب (بڑا سائز) قیمت چھ روپے۔

ملنے کا پتہ :۔ صنم کدہ، ۸۶ کیو۔ بی، ای، سی، ایچ سوسائٹی، کراچی

مرزا نظام شاہ لبیب، سراج الدین شاہ ظفر کے پڑپوتے تھے، وہ بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ دکن چلے گئے، وہیں نشو ونما اور تعلیم و تربیت پائی اور دکن ہی میں اُن کی جوانی اور بڑھاپا بسر ہوا، لبیب تیموری مرحوم ایک خوش گو اور پرگو شاعر تھے، انھوں نے غزلیں ہی نہیں نظمیں اور گیت بھی کہے ہیں، اُن کے کلام میں تصوف اور فلسفہ کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں، انھوں نے قوم کو پیغام بھی دیا ہے اور مناظرِ فطرت کی عکاسی بھی کی ہے ۔ ہمہ گیر طبیعت پائی تھی اور زبان و ادب میں ناقدانہ نگاہ رکھتے تھے! اُن کا نام اور کام گمنامی ہی میں رہتا اگر اُنکے سعادت مند فرزند عرش تیموری اُن کے کلام کے چھپوانے کا اہتمام نہ فرماتے!

"آتشِ خزاں" پر "تعارف" جناب سید ہاشمی فرید آبادی نے تحریر کیا ہے مرزا لبیب تیموری کے حالاتِ زندگی جناب عرش تیموری نے قلمبند کئے ہیں کہ بیٹے سے زیادہ باپ کی زندگی کو اور کون جان سکتا ہے!

کتاب کو بڑے سلیقہ سے مُرتب کیا گیا ہے، ترتیب اس انداز پر ہے :-

نظمیں	روشنی ہفت پیکر
غزلیں	رقصِ بے سُرود
بچوں کی نظمیں	گلبنِ تمنّا
گیت اور نغمے	غسل آتشیں
متفرقات	صدائے ناشنیدہ

منتخب اشعار :-

نفس نفس رواں دواں ہے، عمر، مست و بے خبر
نہ سمت ہے نہ رہگذر، مگر ہے بر سرِ سفر
خرام اک خیال ہے، قیام ایک انتظار

یکایک عالمِ بے لفظ کے چشمے اُبلتے ہیں!
نہ جانے کس طرح لفظوں کے سانچے میں یہ ڈھلتے ہیں

برستے ہیں جو خطرے دل پہ قدرت کی پھواروں سے

غفلت میں سب کے ہوش سموئے ہوئے سے ہیں — بیدار ہیں کچھ ایسے کہ سوتے ہوئے سے ہیں
یاں شکلِ رنگ و بو سے نہیں ایک دم فراغ — واں ہر نفس حضوریٔ دل کا پیام ہے
شرح کیا کیجئے دلِ بیتاب کی — کھینچیے سیماب کی تصویر کیا
اپنے اس مجموعۂ اوراق پہ اے گل نہ پھول — نخل سے اک روز گرنا اور بکھر جانا بھی ہے
آنکھ میں اشکِ ندامت، دل میں حیرانی کی آگ — سو جہنم سے زیادہ ہے پشیمانی کی آگ

ایک پاداشِ عمل مجرم کا پچھتانا بھی ہے

اک عالم خاموشی چھا جاتا ہے جنگل میں — سناٹا غزالوں کو آجاتا ہے جنگل میں

۱؎ غالب کہتے ہیں ۔ ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است

ٹپکی بزمِ فلک سے جو شبنم
آرسی بن کے پھول پر آئی

لوٹ پوٹ نسیم پھولوں میں
اور ہر سو بکھر بکھر آئی

پہلے نماز کے لئے دامِ وضو بچھے
نیت کے ساتھ فرشِ نظر رُو بروبچھے

پامالِ ناز ہونے کو ہر آرزو بچھے
رسمِ قلندری ہے مگر یہ کہ تو بچھے

دل سے نگہ میں اور نگہ سے درونِ دل
ہر آنے جانے والے کی تو دیکھ بھال رکھ

گویا وہ چل رہے ہیں تِرے ہر قدم کیساتھ
کچھ ایسی ملی جُلتی ہوئی چال ڈھال رکھ!

آنسو ڈھلکا، ٹپ سے گرا، پھر جیسے وہ تو کچھ بھی نہ تھا
شعلہ بھڑکا، سرد ہوا، پھر جیسے وہ تو کچھ بھی نہ تھا

ایک پرندے کا سایہ، جو سطحِ زمیں پہ چلتا تھا
جب تک کہ پرندہ بیٹھ گیا، پھر جیسے وہ تو کچھ بھی نہ تھا

اپنا علم ناقص ہی ترکِ نقص بہتر کہ
جتنا خاک کو چھانا اتنا کرکرا پایا

گزر جاتی ہیں درسِ ناظرہ میں سینکڑوں عمریں
کسی سے عشق کا اک حرف ازبر ہو نہیں سکتا

نکلا تھا گھر سے منزلِ جاناں کو ڈھونڈتا
اب پھر رہا ہوں اپنا پتا پوچھتا ہوا

بلبل کے بال و پر بھی نہیں برگِ گل سے کم
یہ بھی ہے ایک پھول مگر بولتا ہوا

کبھی تو رنگ لے آئے گی اہلِ دل کی نقالی
دیا سے ہی سہی کچھ عشق کے آثار پیدا کر

ہم سے بے دیکھے رہا جائے نہ تم سے بے چھپے
اک طرف مجبور تم اور اک طرف مجبور ہم

مُغنّی چاہیے آتش نفس نے کے بچانے کو
بہت نغمے ہیں مستِ خواب اب تک نیستانوں میں

دل کو روک لگا کر دیکھا آخر کیا انجام ہوا
جان لبوں پر آئی ہوئی ہے، صبح نہیں یا شام نہیں

یوں کیجئے زندگی کہ کسی کو خبر نہ ہو
یوں جان دیجئے کہ کوئی نوحہ گر نہ ہو

وہ عقدہ کھولئے کہ ہو آزادگی نصیب
وہ نکتہ ڈھونڈیئے کہ محلِّ نظر نہ ہو!

خواہش ہی سلجھنے کی الجھتے رہے دن رات
آخر نہ کھلی کوئی گرہ تارِ نظر کی

تیرا دیدار نہ ہوتا تو نہ ہوتا، لیکن
ہم ترے دیکھنے والوں ہی کو دیکھا کرتے

خود بن کے نظر نکلے، وہ دیدۂ حیراں سے
خود درد لئے دل میں وہ برق کی چال آئے

ہے تو سہی نظر کو رُخ و زلف سے لگاؤ
اتنا مگر کہاں کہ نظارا کہیں جسے

زلفِ برہم کے مزے لیتے ہیں ہم ہر حال میں
ہم کو اُلجھانے سے مطلب ہے نہ سُلجھانے سے ہے

بہت چاہا کہ مل جائے کہیں سرِ رشتہ ہستی
نہ اس کی ابتدا نکلی، نہ اس کی انتہا نکلی

اہلِ کرم ہمیشہ سائل کو ڈھونڈتے ہیں
اُن کے حضور کوئی بے مُدعا نہ جائے

نہ صرف لذتِ ذوقِ نگاہ بھول گئے
وہ آ بنی ہے کہ سب رسم و راہ بھول گئے

ہے جُدا آئینے سے صیقلِ دل کی تدبیر
کہ شکستوں سے یہاں اور جِلا ہوتی ہے

یاد تازہ ہے گل و لالہ سے اُن کی لیکن
یہ بھی اوراق ہیں دو دن میں بکھرنے والے

خوشی ناخوشی دن گزر جائیں گے — تری رہگذر ہی میں مر جائیں گے
بلا سے لگے داغ دریوزگی — تجھے ڈھونڈنے در بدر جائینگے
شکایت نہیں کوچۂ یار کی — یہی آسماں ہے جدھر جائیں گے
محبت کے دریا کا ساحل کہاں — جو ڈوبینگے وہ پار اتر جائینگے!

مکھ پر ڈارے گھونگھٹ سجنی! سورج کو شرمائے — آپ چھپے نینن کے جل میں موکو آگ لگائے

ہر فغاں پر واہ واہ ہونے لگی — پڑ گیا یوں شعر خوانی کا مزہ
کبھی تو رنگ لے آئے گی اہل دل کی نقالی — ریا ہی سہی کچھ عشق کے آثار پیدا کر

دوسرا رخ :- زبان کیا ہے نفس کی اونچ نیچ اور اسکا پیچ و خم — وگرنہ تھا جہان اسم و جسم اک کاکل برہم (صفحہ ۱۴۱)

مفہوم خاصہ گنجلک ہے، "جہانِ اسم و جسم" کیا بات ہوئی؟

نہ حسرت ہم نشیں کی حس کر، کہیں نہ رہ جائے قلب پس کر — اچھوتا رکھا ہے دسترس سے خود اپنا عہد شباب تو نے (صفحہ ۵۲)

"حسرت کی حس کرنا" یہ کیا زبان ہے؟ مصرعہ ثانی میں "دسترس" سے آخر کس کی "دسترس" مراد ہے؟

وہ صبر کا ان داتا، وہ شاہ شکیبائی — وہ ہمدم خاموشی، وہ مونس تنہائی (صفحہ ۷۶)

یوں تو بول سکتے ہیں کہ وہ "صبر کا بادشاہ" اور "سکون کا خداوند" ہے۔ مگر "صبر کا ان داتا" کہنا درست نہیں!

پرچھائیوں میں بہتے ہیں دھارے گداز کے — کیا خوشگوار آگ لگائے ہوئے ہو تم
دل میں سمٹ کے پھیل گئی جسم و جان پر — دورانِ خوں میں برق گھلائے ہوئے ہو تم (صفحہ ۱۱۹)

اس قسم کے شعروں سے مفہوم تو کچھ نہ کچھ پیدا کیا جا سکتا ہے، مگر وجدان کس قدر ضیق اور گھٹن محسوس کرتا ہے۔

یا درد پیچ عشق ہے یا عشق پیچ درد — اگلا ابل پڑا، کہیں پچھلا ابل پڑا (صفحہ ۱۲۷)

"شعریت" کا اس شعر میں دور دور پتا نہیں!

آنکھیں بھی ڈبڈبانے نہ پائیں ابھی لبیب — کیا دیکھتا ہوں عشق کا سودا ابل پڑا

اول تو "سودے کا ابل پڑنا" ہی محلِ نظر ہے، پھر شعر میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آنکھیں ڈبڈبانے سے پہلے عشق کا سودا آخر کس طرح ابل پڑا؟

بیعت دستِ سبو کی تھی کہ کافر رام ہو — کفر بھی جو کچھ کیا سب جزوِ ایمان ہو گیا (صفحہ ۱۳۰)

اسے کہتے ہیں "المعنیٰ فی بطن الشاعر"! خدا جانے "دستِ سبو" سے کیا مراد ہے، اگر پیمانہ شراب مراد ہے تو عاشق کے شراب پینے سے محبوب رام کیوں ہونے لگا! پھر "کفر و ایمان" کی بحث یہاں غیر متعلق سی لگتی ہے۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ خالی غیرت کاشانہ تھا — شمع کی برہم تھی کاکل نزع میں پروانہ تھا (صفحہ [illegible])

"شمع کی کاکل" کتنی غریب اور [illegible] ترکیب ہے!!

اس قسم کے گنجلک اور مبہم اشعار اس کتاب میں خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں!

وہ بلبل کر سکے پرواز کیوں کر اپنے گلشن تک — جو اک آواز کے صدمے سے جانبر ہو نہ سکا (صفحہ [illegible])

کس کی آواز کا صدمہ؟ اس کی صراحت ضروری تھی! شاید خود باغبان، یا باغبان کی گوپھن کی، یا شکاری کی بندوق کی گولی کی "آواز" مراد ہو، مگر اس میں بیحد مبالغہ پایا جاتا ہے۔

شرمِ حضور بزم میں بھی التفات سوز ؛ وہ ہم سے جان بوجھ کے انجان ہی رہا (صفحہ ۱۳۹)

مصرعہ ثانی جتنا سادہ اور رواں ہے، اتنا ہی پہلا مصرعہ پر تکلف اور پیچیدہ ہے!

غضب کی بے چینیاں ہیں پیدا ارادہ ہائے جنوں فزا میں ؛ کہ لغزشِ پائے نفس میں ہے بھرا ہوا اضطراب تیرا (صفحہ ۱۴۱)

"ارادہ" کی جمع "ارادہ ہائے" نے ہی اوّل تو شعریت کا خون کر دیا، پھر "ارادوں میں بے چینیوں کا پیدا ہونا" اور "لغزشِ پائے نفس میں اضطراب کا بھرا ہونا" اس پر مستزاد!!

تری ایک ٹھوکر کا ارماں ہے باقی ؛ لڑھکتا ہوا میرا سر دیکھتا جا (صفحہ ۱۴۲)

مصرعہ ثانی، غزل کے ساتھ ایک طرح کا مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

ربابِ صوتِ سرمد چھیڑ دے تو چاہے جس دھن میں ؛ لہو سے جھاگ اٹھا اور جھاگ میں سے تار پیدا کر (صفحہ ۱۵۱)

یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟؟؟

صوت ہی صوت ہے بے نام و نشاں کی آواز ؛ دل میں گھر کر جاتی ہے غارت گرِ جاں کی آواز (صفحہ ۱۵۵)

"آواز" کو "صوت ہی صوت" کہنا، شبِ لیلۃ القدر والی بات ہے۔ "بے نام و نشاں کی آواز" نے اس شعر کو "مجاز" کی جگہ حقیقت کا ترجمان بنا دیا۔ اس لئے "غارت گرِ جاں" بہت کچھ کھٹکتا ہے۔ حقیقت کی ترجمانی میں بھی "غارت گرِ جاں" آسکتا ہے مگر اس کے لئے کوئی قرینہ چاہیئے۔

آنکھوں میں نالہائے دل، دل میں جہانِ آرزو ؛ حلق کا کانٹا بن گئیں، ان کی گراں نیوشیاں (صفحہ ۱۷۳)

"حلق کا کانٹا بن گئیں" سن کر اور پڑھ کر، وجدان کس قدر اذیت محسوس کرتا ہے ـــــ توبہ!!

چلا ہوں کوچۂ عشق میں دل کو لئے ہوئے ؛ وحدت ہے مجھ میں اور مرے ہم رکاب میں (صفحہ ۱۸۵)

شاعری کیا ہے، لفظوں کی نری جوڑ جاڑ ہے!

ذکر آتا ہے وفا کا تو مری آنکھوں سے ؛ دل نکلتا ہے لئے اشکِ پشیمانی کو (صفحہ ۱۹۲)

"آنکھوں سے دل کا نکلنا" ـــــ مضحکہ خیز اندازِ بیان ہے۔

خار کی طرح حلق ہی میں رہی ؛ آہ بھی ایسی بے اثر آئی (صفحہ ۲۰۰)

غزل کا شعر اور اس قدر بے مزہ اور کرخت!

پھول کھلے ہوئے سے ہیں ان کے شہیدِ ناز کے ؛ عاشق یا دفا تو ہے بندۂ بے ادب سہی (صفحہ ۲۰۵)

شعر مبہم نہیں مہمل ہے!!

دل پھیرنا سہی، مگر آنکھیں نہ پھیرنا ؛ تم ہم کو دیکھتے رہو، ہم تم کو دیکھتے (صفحہ ۲۱۹)

"ہم تم کو دیکھتے رہیں" کہنا چاہیئے تھا۔ پھر "دل پھیرنا سہی" عجیب طرزِ ادا ہے۔

ہر چند تڑپتا ہے اذیت کی نشانی ؛ بسمل کو بہر حال تڑپنے میں مزا ہے (صفحہ ۲۲۱)

"اذیت کی نشانی" مصرعہ اولیٰ میں جو نظم کیا گیا ہے تو ممکن ہے یہ شعر لبیب صاحب کی تو مشقی کے زمانہ کا ہو۔

وہ بت ہی کیا کہ حسن سراپا کہیں جسے ؛ بت وہ کہ اپنی آن کا پورا کہیں جسے (صفحہ ۲۲۶)

"حسن سراپا" کو آخر بت کیوں نہیں کہہ سکتے؟ جو خیال ذہن میں آیا جھٹ سے نظم کر دیا!!

شکوۂ محبت پر تم نہ یوں خفا ہوتے ؛ آج بھی وہی ہیں ہم، تم بھی تو ذرا ہوتے (صفحہ ۲۲۸)

مصرعہ ثانی بچکانہ ہے۔

نہ ستے فسانے کوئی تو کیا! مرے دل کے حال تباہ کے ؛ کہ امیر سر پہ لئے ہوئے ہے نقوش نالہ و آہ کے

دم جلوہ سجدوں سے اڑ رہے تھے پرخچے قرش نگاہ کے ؛ کہ ہزار پردے پڑے ہوئے تھے دلوں پہ زلف سیاہ کے (صفحہ ۲۳۰)

نرا اہمال ہی اہمال —!!!

مثال موج ساقی جانب میخانہ آتا ہے ؛ وہ اشک شمع لیکر پیکر پروانہ آتا ہے (صفحہ ۲۳۱)

ساقی سے کون مراد ہے؟ یہ "پیکر پروانہ" کیا ترکیب ہے؟ پھر "پیکر پروانہ" "اشک شمع" لیکر کیسے آتا ہے؟ یہ کیا آخر چیستاں کیا ہے؟ اس غزل کے کئی شعر اسی "صنعت اہمال" میں کہے گئے ہیں۔

طلسم زندگی میں ہر اسیر عادت و آئین ؛ سنبھالے اپنی زنجیروں کو آزادانہ آتا ہے (صفحہ ۲۳۳)

"اسیر عادت و آئین" کی ترکیب کس قدر غیر شاعرانہ ہے! دوسرا مصرعہ بہت خوب ہے!

آیا نہ بزم میں بھی نظر آشنا مجھے ؛ ڈھانکے ہوئے نہ ہو، کہیں دست دعا مجھے (صفحہ ۲۳۷)

کچھ نہیں کھلتا کہ شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے؟

درد دل بڑھ کے حریف غم پنہاں ہو جائے ؛ دھار دریائے نوا کی رہ جاناں ہو جائے (صفحہ ۲۴۸)

"دریائے نوا کی دھار" —— توبہ! یوں بھی شعر انمل بے جوڑ سا ہے۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ جلووں کیلئے بیتاب تھے ؛ اب مرے جاتے ہیں حال دل سنانے کے لئے (صفحہ ۲۵۰)

دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں!

یہی دل کا دھواں جو زدبان عرش و کرسی ہے ؛ کہیں کروبیوں کے وعظ کا منبر نہ بن جائے (صفحہ ۲۵۱)

—— اور ——

فروغ روح آدم لطف پنہاں ہونیوالا ہے ؛ شکار بسملان خویش یزداں ہونے والا ہے (صفحہ ۲۵۲)

اس قسم کے بے معنی اشعار شاعر کا "تعارف" ہیں!

رخ پرنور سے جس دم نقاب فہم و وہم اٹھی ؛ نظر آنے لگا میں آپ اپنا داور عالم (صفحہ ۲۹۶)

وہی "صنعت اہمال" کی تکرار!!

کسی کو وہ خلوت میں آنے نہ دیں گے ؛ جو آجائے پھر اس کو جانے نہ دیں گے (صفحہ ۳۰۰)

یہ شعر اگر "مجاز" نہیں حقیقت کا ہے، تو بھی واقعیت کے اعتبار سے غلط ہے اور "مجاز" میں ہے، تو اس سے محبوب کی انتہائی بوالہوسی کا اظہار ہوتا ہے۔

"آتش خنداں" کے مرتب کو یہ چاہیئے تھا کہ وہ شاعر کے کلام پر سختی کے ساتھ ناقدانہ نظر ڈالتے، اور بھرتی کے اشعار نکال دیتے مگر انھوں نے انتخاب کی سرے سے زحمت ہی گوارا نہیں کی، اور مسوّدوں میں جو بھی لکھا ہوا مل گیا، اسے چھاپ دیا ⁕

فاران

تبّت کی طرف سے قومی نمائش کراچی میں
۱۵ قیمتی انعامات کی عظیم پیشکش
پہلا انعام
نئی اوپل ریکارڈ کار
۱۹۶۰ ماڈل (چار دروازوں والی)
آپ کی خدمت کیلئے اس نمائش میں
تبّت کے ۲ دو اسٹال ہیں
ہمارے کسی ایک اسٹال سے حسب ذیل ۳ چیزیں رعایتی قیمتوں پر اکٹھی
خرید کر ایک تبت انعامی کوپن مفت حاصل کیجئے۔
تبت ٹوتھ پیسٹ (سادہ یا کلوروفل)..... ۱ عدد
تبّت ٹالکم پاوڈر (کسی قسم کا) .... ۱ عدد
ان دونوں کے علاوہ تبت کی کوئی چیز اپنی حسب پسند ۱ عدد
نمائش کے اختتام کے قریب کوپنوں کے لکی نمبروں پر مندرجہ ذیل ۱۵ بیش قیمت انعامات دیئے
جائیں گے۔ تفصیلات و شرائط ہر کوپن کی پشت پر درج ہیں۔
فہرست انعامات
پہلا - اوپل ریکارڈ کار ۱۹۶۰ ماڈل
دوسرا - گبسن (Gibson) ریفریجریٹر ۸ء۹ کیوبک فیٹ
تیسرا - سولیکس (Solex) آٹو سائیکل
چوتھا - سنگر سیونگ مشین معہ ڈھکنا
پانچواں - مرفی ریڈیو
چھٹا - ٹیبل فین
ساتواں - وال کلاک
آٹھواں - بجلی کی استری
نواں تا پندرھواں - ایک ایک تبّت سنگھار بکس
مشرقی اور مغربی پاکستان سے اس انعامی پیشکش میں شرکت کرنے والے
اپنے کوپن کسی کے ذریعے ہمارے اسٹال پر رکھے ہوئے ڈرم میں ڈلوا سکتے ہیں
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی۔ ڈھاکہ۔ آرائشِ جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانیوالے
UNITED
TCK-3/5M

ترتیب ماہِ جنوری ۱۹۶۱ء

سالانہ چندہ : چھ روپے — فی پرچہ : ۵۰ پیسے

مقامِ اشاعت :- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

مطبوعہ :- مطبع سعیدی کراچی

پرنٹر پبلشر : مسرور حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

نقش اوّل

آج کی صحبت میں ہم جس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں، وہ شدید ناخوشگوار موضوع ہے، کاش! اس موضوع پر قلم اٹھانے، ان مباحث کو چھیڑنے اور واقعات کے اس تجزیہ و تحلیل اور اُن پر نقد و محاکمہ کی نوبت ہی نہ آتی، اب سے چند سال پہلے یہ بات ہمارے حاشیہ خیال میں ایک مفروضہ اور وہم بن کر بھی نہیں آسکتی تھی کہ جن شخصیتوں سے ہم انتہائی حسنِ ظن رکھتے ہیں، اُن پر نقد و جرح کا ناخوشگوار فریضہ بھی دل پر جبر کر کے کبھی ادا کرنا پڑے گا۔ اس "قضیہ نامرضیہ" کے مطالعہ سے زندگی میں پہلی بار اس کا تجربہ ہوا کہ سیرت و کردار کی سب سے بڑی آزمائش دوستی سے زیادہ مخالفت میں ہوتی ہے، اور اختلاف و نزاع کی حالت میں صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس نے شرافت و دیانت کے حدود کا کہاں تک لحاظ رکھا؟ کس کے برتاؤ میں خود اُس کا اپنا نفس کہاں تک شریک تھا کس نے کس پر کیا زیادتی کی؟ اور یہ اختلاف "دشمنی" میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟

—— یہ داستان بڑی دل خراش

ہے، مگر کیا کیا جائے اُسے دُہرانا پڑ رہا ہے۔ "فاران" پڑھنے والوں کے لئے یہ داستان اجنبی نہیں ہے، وہ کسی نہ کسی حد تک اس قضیہ سے باخبر ہیں، ہاں! اس کی بعض تفصیلات اُن کے سامنے پہلی بار آ رہی ہیں اور آ گیا رہی ہیں، ہم اس مقصد کے ساتھ انھیں منظرِ عام پر لا رہے ہیں کہ اس تصویر کا کوئی رُخ دھندلا اور مُشتبہ نہ رہے، اور جن واقعات کو مسخ کیا جا رہا ہے، وہ واقعات اپنے اصلی رُوپ میں سامنے آ جائیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات سے ہم اُن کی دینی خدمات کے سبب بے شک دلچسپی اور محبت رکھتے ہیں، آخرت کی مسئولیت کے پُورے احساس کے ساتھ ہمارا یہ خیال ہی نہیں یقین ہے کہ اُن کے قلم نے اللہ تعالیٰ کے دین کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے، اُن کے دینی افکار نے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہے، وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے اسلامی مفکر ہیں۔

—— مگر ——

اس "حزنیہ" کو کن لفظوں میں بیان کیجئے کہ اُن کی "روشنیٔ طبع" سچ مچ اُن کے لئے "بلا" بن گئی ہے، جن دینی حلقوں میں اُن کے کام کی زیادہ سے زیادہ قدر ہونی چاہیے تھی، اُنھی حلقوں میں اُن کے خلاف محاذ قائم ہوئے ہیں، اور اُن کی شخصیت کو ہدفِ مطاعن بنایا گیا ہے، اُن کے نام (ابوالاعلیٰ) پر اعتراض، اُن کی عبارتوں میں تحریف، اُن کی تحریروں سے غلط مفاہیم کا استنباط، اُن پر یہ الزام کہ وہ "مجدد" ہونے کے مُدعی ہیں، جب اس الزام کی تردید کی گئی، تو یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ مودودی صاحب کے تردید کر دینے سے کیا ہوتا ہے، مرنے کے بعد اُن کے عقیدت مند اُن کو "مُجدّد" ہی کہا کریں گے، غضب خدا کا جس کی زندگی "اقامتِ دین" کی جد و جہد میں بسر ہوئی ہے، اُس کو "دین کے ستونوں کا ڈھانے والا" کہا گیا۔ مکہ اور مدینہ میں مولانا مودودی کے خلاف پوسٹر بانٹے گئے، اور یہ تہمت تک جوڑی گئی کہ یہ شخص تو "نبوت" کا دعویٰ کرنے والا تھا: ہم نے اُسے ایسا کرنے سے جیسے تیسے روکا ہے!

مودودی صاحب کی تحقیر و تذلیل کے لئے اُن کے نام کے ساتھ "منشی" لکھا گیا! کسی نے اُن کے "پان کھانے" کو عجیب رنگ میں پیش کیا اور کسی نے اُن کو "جماعت ساز" کہہ کر مطعون کیا۔

کسی نے مولانا مودودی پر "خارجی" کی پھبتی چسُت کی، کسی نے اُنھیں مرزا غلام احمد قادیانی کا مماثل ٹھیرایا، کوئی بولا کہ پرویز اور مودودی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، کسی نے "انکار حدیث" کا الزام لگایا، کسی نے یہ ہوائی چھوڑی کہ مودودی کی جماعت کو امریکہ سے روپیہ ملتا ہے......... غرض بیچارے مودودی کو جس انداز سے ہدفِ طعن و طنز بنایا گیا ہے اور خدا کے اس بندے کو جیسے جیسے چرکے لگائے گئے ہیں، اُس کی مثالیں دین و اخلاق کی تاریخ میں کم ہی ملیں گی، مظلومیت کے اس دل شکن ماحول میں اس شخص نے خون کے گھونٹ پی پی کر، دعوتِ حق کے مشن کو جاری رکھا ہے، یہاں تک کہ مولانا مودودی نے پھانسی کی کوٹھری کی وہ تاریکی اور تنہائی بھی دیکھ لی جہاں در و دیوار پر موت کی خوفناک پرچھائیوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا، اور اس طرح عزیمت و استقامت کی تاریخ کو استوار کر دیا گیا اور اس سلسلۃ الذہب کی کڑیاں اوپر تک ملتی چلی گئیں

مولانا مودودی کو ابتلا کے جن مرحلوں سے گزرنا پڑا، وہ مرحلے اس کی شہادت دیتے ہیں کہ ایسے مرحلے خدا کے اُن صاحبِ عزیمت بندوں کو پیش آتے ہیں، جن کی تمام جد و جہد اور تگ و تاز کا موضوع "اعلاء کلمۃ الحق" ہوتا ہے، اور انسانی کمزوریوں اور بشری غلطیوں کے باوجود، مجموعی طور پر جن کی زندگی اقامتِ حق ہی کے کام آتی ہے۔

یہ تمام زیادتیاں ہوتی رہیں

اور اُن کی طرف سے ہوتی رہیں، جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ساحل کے تماشائی تھے، بعض طوفان کا جنھیں اندازہ نہ تھا، یا کچھ حضرات دین کے بارے میں محدود نظر رکھتے تھے، اور اُن حُدود سے آگے جانے کے لئے کسی طرح آمادہ نہ تھے بلکہ اس کوشش ہی کو غلط سمجھتے تھے، اور کچھ بزرگ ایک خاص مسلک کے پابند تھے اور اس شدت نے اُن کو گروہی عصبیت میں مُبتلا کر دیا تھا۔ بعض لوگ دینی قیادت کے میدان میں کسی اُبھرتی ہوئی شخصیت کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے —— ان حضرات کو بہر حال کسی نہ کسی حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے کہ اُن میں سے بعض بزرگ تو اپنے حاشیہ نشینوں کی کہی ہوئی باتوں پر اعتماد کر کے، مولانا مودودی کی ذات کو دین کے لئے فتنہ سمجھتے تھے مگر وہ اربابِ علم و فکر جو اقامتِ دین کی اس تحریک کے پس منظر اور پیش منظر سے اچھی طرح باخبر ہیں، جنھوں نے برسوں مولانا مودودی کی رفاقت میں کام کیا ہے اور اُن کی ایک ایک تحریر کو پڑھا ہے، اور پھر مودودی صاحب کے دینی افکار کو بہت کچھ سراہا ہے، اور جو مخالفین کی تہمت طرازیوں اور الزام تراشیوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہیں، اُن کو مولانا مودودی کی مخالفت میں سرگرمِ کار دیکھ کر، جس قدر اچنبھا اور دُکھ ہوتا ہے، اُس کا اظہار لفظوں میں نہیں کیا جا سکتا ہفتہ وار "چٹان" سے گلہ نہیں ہے کہ اُس نے مولانا مودودی کی مخالفت میں جو شورش برپا کر رکھی ہے، وہ توقع کے خلاف نہیں ہے، مگر "میثاق" (لاہور) اور "المنبر" (لائل پور) بھی جب "چٹان" کی سطح پر آجائیں بلکہ اس سطح سے بھی نیچے اُتر آئیں تو اس اذیت پر صبر و تحمل کے لئے فولاد کے قلب و جگر کوئی کہاں سے لائے، دوسروں کے پتھروں سے وہ اذیت نہیں ہوتی، جو اپنوں کے پھُول لگنے سے ہوتی ہے اور جب اپنے بھی پتھر برسانے لگیں، تو......

از دُشمناں برند شکایت بہ دوستاں
گر دوست دُشمن است شکایت کجا برند

اختلاف —— تضاد سعید ملک صاحب نے جماعت سے علیحدہ ہو کر، جب پریس کانفرنس کی تھی، اور جماعت

کی تاریخ میں، اس انداز کی علیحدگی کا پہلا حادثہ رونما ہوا تھا، تو اس وقت مولانا امین احسن اصلاحی اور حکیم محمد اشرف صاحب کے بارے میں بعض باتیں ہم تک پہونچی تھیں، مگر ہم نے ان کو محض "افواہ" سمجھا تھا، اور ہمارا ذہن کسی طرح بھی ان افواہوں کو ایک فیصد بھی درست اور صحیح ماننے کو تیار نہ تھا، ہم ان دونوں بزرگوں سے بڑی خوش فہمی اور حسنِ ظن رکھتے تھے، دل یہی کہتا تھا کہ یہ بیچ کے لوگوں کے محض "توہمات" اور "بدگمانیاں" ہیں، یہ حضرات اختلاف کی حالت میں بھی پست نہیں ہو سکتے، مگر افسوس اور ہزار افسوس ہے کہ جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت میں ان دونوں صاحبوں کی جو روش رہی ہے، اُس نے ہمارے حسنِ ظن کو نہ صرف یہ کہ مجروح کیا بلکہ اس کے پرخچے اُڑا ڈالے، جب مولانا اصلاحی صاحب نے سب سے پہلے اپنے اختلاف کا اظہار فرمایا ہے اور مولانا مودودی کی دینی فکر اور عربی دانی پر چوٹیں کی ہیں۔ تو ہمارا خیال تھا کہ تازہ تازہ معاملہ ہے، تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، اختلافات کے سلسلہ میں مولانا اصلاحی کے دل و دماغ نے بھی خراشیں برداشت کی ہیں، غم و غصہ کی حالت میں وہ دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بھڑک اٹھتے ہیں بلکہ بے اعتدال ہو جاتے ہیں، اُنھوں نے زود مشتعل طبیعت پائی ہے، رفتہ رفتہ اُن کا مزاج اعتدال پر آ جائیگا اور مخالفت کی یہ بے چین سطح ہموار ہو جائے گی۔

مگر

اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اُن کی آتش غضب و انتقام ٹھنڈی ہونے کی بجائے اور زیادہ بھڑکنے لگی ہے، مولانا مودودی کی شخصیت اُن کے دل و دماغ پر کابوس بن کر مسلّط ہے، دشمنی کی حد ہوگئی کہ وہ قرآنِ کریم کی شرح و تفسیر میں بھی مولانا مودودی پر چوٹیں کرنے سے باز نہیں رہ سکتے، اشتراکیت، مغرب زدگی، شرک و بدعت، فتنۂ انکارِ حدیث، ان میں سے کوئی چیز بھی اُن کے نزدیک ـــــ ان دنوں ـــــ مودودی صاحب کی شخصیت سے زیادہ مبغوض، فتنہ انگیز اور خطرناک نہیں ہے وہ اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح مودودی لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت اور ذلیل ہو جائے! اب وہ اور انکے رفقاء اختلاف کی اس سطح تک اُتر آئے ہیں، کہ "حق و باطل" میں فرق اور اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت بھی مودودی صاحب کی شخصیت کو سامنے رکھتے ہیں، اس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ محمود عباسی کی رسوائے عالم کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کو جمہور اُمت نے رَد کر دیا ہے اور ماہنامہ "تجلی" کے علاوہ، علماء کے ہر طبقہ نے اس کتاب کی مذمت کی ہے، مگر چوں کہ مولانا مودودی نے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" میں حضرت حسینؓ، اور اُن کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ اور یزید کے موقف کے فرق کو اس طرح واضح کیا ہو کہ محمود عباسی کی کتاب کی آپ ہی آپ تردید ہو جاتی ہے ـــ اس لئے ماہنامہ "میثاق" میں اس کتاب کو سراہا گیا ہے:-

> "امام ابن تیمیہ کے بعد اب الحمد للہ اُردو میں بھی محمود احمد عباسی صاحب کی کوششوں سے ایک ایسی محققانہ کتاب آگئی ہے، جو اس سلسلہ کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دینے والی ہے۔　　(ماہنامہ "میثاق" ماہِ نومبر ۱۹۶۰ء)

حالانکہ اس کتاب میں محمود احمد عباسی نے کتابوں کے اقتباسات، حوالوں اور ترجموں میں کھلی ہوئی تحریف اور دجل و تلبیس سے کام لیا ہے، یہ کتاب "خارجیت" کا مکروہ نمونہ ہے، اس کے مطالعہ سے یا تو "رفض" میں شدت پیدا ہوتی ہے یا ذہن "خارجیت" کی طرف مائل ہوتا ہے..... مگر اس کو کیا کیجئے کہ مولانا اصلاحی صاحب کو مودودی صاحب کی مخالفت کا کمزور سے کمزور سہارا اور موقعہ بھی مل جائے، تو وہ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ـــ! جو کتاب بے دریغ نفرین و ملامت کی مستحق تھی، اُس کی اشاعت پر میثاق کے تنقید نگار کا اللہ کا شکر ادا کرنا.......! کس قدر حیرت انگیز سانحہ اور کس درجہ تکلیف دہ واقعہ ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب کی یہ عادت بھی بڑی عجیب ہے کہ وہ جس سے خفا ہو جاتے ہیں، پھر اُس کے تمام محاسن اُن کی نگاہ میں معائب سے بدل جاتے ہیں، اور شخصِ مبغوض میں سرے سے کوئی خوبی ہی باقی نہیں رہتی، وہ اُن کی دوستی کے زمانہ میں اگر عالم تھا تو مخالفت کی حالت میں جاہل اور کندہ ناتراش بن کر رہ جاتا ہے، وہ اگر پہلے عربی جانتا تھا، تو مولانا اصلاحی سے اختلاف ہونے کے بعد عربی بھول جاتا ہے اور ہر حیثیت سے کورا اور نکما ہو کر رہ جاتا ہے، ہم اپنے مضمون (جائزہ) میں اصلاحی صاحب قبلہ کے اس "متضاد" کو اُن کی عبارتوں کے اصل اقتباسات کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں، مولانا اصلاحی اس مقالہ پر راقم الحروف سے بھی سخت خفا ہیں، اور اُن کی خفگی کے یہ معنیٰ ہیں کہ جس شخص سے وہ خفا ہو گئے ہیں، اُن کی خفگی سے پہلے اگر وہ لکھنے پڑھنے میں کچھ شد بد رکھتا تھا تو اب وہ ایکا ایکی جاہل ابجد ناشناس اور گاؤدی بن کر رہ گیا، ہمارے بارے میں انھوں نے خفا ہو کر تحریر فرمایا:-

> "مولانا (آزاد) کی عربی دانی کی بحث بھی ایک غیر ضروری اور غیر مفید بحث ہے، اور اگر یہ بحث کچھ مفید بھی ہے، تو بہر حال ان لوگوں کے اٹھانے کے لئے نہیں ہے، جو خود عربی، فارسی انگریزی ہر چیز سے بے بہرہ ہیں"

یہ جملہ "ہر چیز کے بغیر" یوں بھی ——— "جو عربی، فارسی اور انگریزی سے بے بہرہ ہیں" ——— لکھا جا سکتا تھا، مگر مولانا اصلاحی جب غصہ میں آتے ہیں تو حدود کی کب پروا کرتے ہیں! جب مولانا موصوف ہم سے خوش تھے، اُس وقت ہمارے بارے میں اُن کی یہ رائے تھی:-

> "آپ کی کتاب (کاروانِ حجاز) کا بیشتر حصہ میں نے "فاران" میں پڑھ لیا تھا میں ایک مدت سے ارادتاً حج میں ہوں، اس وجہ سے جب کوئی چیز حج اور مشاہداتِ حرمین شریفین سے متعلق میری نظر سے گزرتی ہے، تو اس کو ضرور پڑھتا ہوں **اور لکھنے والا اچھا ہوتا ہے، جیسے کہ آپ ہیں** تو گو میرا جسم پاکستان میں قید ہے، لیکن میرا دل لکھنے والے کے ساتھ ہوتا ہے...... بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کے سفر حج کے سلسلہ میں مضامین پڑھتے ہوتے میں اکثر اپنے جذبات کو ضبط میں نہیں رکھ سکا ہوں۔
> **مجھے آپ کی وہ غزل کبھی نہیں بھولتی۔ جس کا ایک مصرع ہے ع**
> بعد مکہ کے مدینہ کا سفر کیا کہنا
> میں اس مصرعہ کو تنہائی میں، عالمِ شوق میں اکثر گنگناتا رہتا ہوں، اور جب گنگناتا ہوں تو اپنے آپ کو عالمِ تصور میں، مکہ اور مدینہ کے درمیان کی منزلوں میں سفر کرتا ہوا پاتا ہوں (مولانا امین احسن اصلاحی کا مکتوب، مدیر "فاران" کے نام —
> ماہنامہ "فاران"، جولائی ۱۹۵۵ء)

یہ اُس شخص کی انشاء پردازی اور شاعری کے بارے میں مولانا اصلاحی کی رائے ہے، جس سے وہ اب خفا ہو گئے ہیں، تو اُس کو وہ ہر چیز سے بے بہرہ سمجھتے ہیں، یہ تو مولانا موصوف کی تضاد بیانی اور اختلاف وغضب کی حالت میں غیر متوازن ہونے کا ایک معمولی سا نمونہ پیش کیا گیا ہے، ورنہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت کے بارے میں انھوں نے جس "تضاد" کا مظاہرہ کیا ہے، وہ علم و ادب کی دنیا کا ایک "اعجوبہ" ہے، قدر و ستائش کے جذبہ سے مغلوب ہو کر، فرطِ محبت کے عالم میں جس مودودی کے مولانا اصلاحی

نے کبھی ہاتھ چوم لئے تھے، آج وہ اُسی مودودی کی شخصیت کو ٹھکرانے اور پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں، —— کیا خوفِ خدا اور تقویٰ کی فراوانی آدمی پر اس قدر ذہول طاری کر دیتی ہے کہ اُسے یہ تک یاد نہیں رہتا کہ میں نے فلاں شخص کے بارے میں پہلے کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہا ہوں اور وہ اس سے بے پرواہ ہو جاتا ہے کہ میری اس کھلی ہوئی تضاد بیانی کو دیکھ کر لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟

؟ ؟ ؟

(سابق) جماعت اسلامی مارشل لا کے بعد ختم ہو گئی، اُس کی تنظیم ٹوٹ گئی، اس حادثہ کے بعد مولانا اصلاحی اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو "جماعت" کے اختلاف و نزاع کی بحث کو بند کر دینا چاہیئے تھا کہ جس "جماعت" کو وہ "گمراہ قافلہ" سمجھ رہے تھے، سرے سے اُس کا وجود ہی باقی نہیں رہا ؎

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

مگر وہ عنوان بدل بدل کر "جماعت" کے مسلک اور نظریوں کی تردید کر رہے ہیں اور اُسے خالص دُنیادار، سیاست باز، موقعہ شناس اور اپنے اصل مشن سے منحرف جماعت قرار دے رہے ہیں اور جماعت کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی ان کے کلیجوں میں ٹھنڈک نہیں پڑی، جماعت کے خلاف غیظ و غضب کا لاوا برابر نکل رہا ہے!

حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب مدیر "المنبر" (لائل پور) کا رول جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت میں اور زیادہ سفاکانہ ہے، جماعت اور مودودی صاحب پر تبرا بازی کرنے سے پہلے یہ حضرت انتہائی معصومیت کے ساتھ نہ جانے کتنی بار "خوفِ خدا" کو درمیان میں لاتے ہیں، اور پھر جماعت اور مولانا مودودی کو لوگوں کی نگاہ میں مشتبہ، مبغوض اور بے وقار بنانے کے جتنے حربے اُن کے ذہن میں آ سکتے ہیں وہ سب کے سب استعمال کر جاتے ہیں، اور اس ستم ظریفی، زیادتی بلکہ سفاکی کے بعد بھی وہ "مظلوم" ہی بنے رہتے ہیں!

جماعت کی تنظیم کے ٹوٹ جانے کا جو حادثہ پیش آیا، اس کو حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے "جماعت کی ناکامی" سے تعبیر کیا، حالانکہ مارشل لا کے نفاذ سے ایک منٹ پہلے تک پاکستان میں جماعتِ اسلامی اُسی جوشِ خلوص، ولولۂ حق اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کام کر رہی تھی جس طرح وہ مولانا اصلاحی، حکیم صاحب اور دوسرے چند ارکان کی جماعت میں شمولیت کے زمانہ میں کام کر رہی تھی، ان چند حضرات کے نکل جانے کا ارکان کو صدمہ تو ضرور ہوا، مگر جماعت کی صفوں میں کوئی انتشار نمایاں نہیں ہوا، جماعت کی متعدد شاخوں نے تو اس حادثہ کو ذرہ برابر اہمیت نہیں دی، یہاں تک کہ انتشار تو بڑی چیز ہے، جماعت کی مشینری میں ڈھیل تک پیدا نہیں ہوئی

جماعت کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ گمراہ اور اپنے اصل مقصد سے منحرف ہو گئی تھی، حقیقت و واقعیت کی غلط ترجمانی ہے!

جماعت "اقامتِ دین" کی اساس پر قائم ہوئی تھی، اور اس مقصد کے حصول کے لئے "سیاست و حکومت" کو جماعت نے کبھی شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھا، متحدہ ہندوستان میں، انگریزی راج میں "اقامتِ دین" کے لئے یہی طریق کار مناسب اور موزوں تھا کہ تمام تر قوتِ اصلاح معاشرہ پر صرف کی جاتی اور اسمبلی کے انتخابات میں حصہ نہ لیا جاتا! انگریز نے اچانک اور غیر متوقع طور پر ہندوستان کو خیرباد کہا اور ملک بڑی عجلت میں تقسیم ہو گیا، پاکستان بننے کے بعد جماعت کو بالکل نئی صورتِ حال سے سابقہ پڑا، یہاں ہندوستان کے برخلاف مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی اور یہ مسئلہ سامنے تھا کہ یہ نوزائیدہ حکومت "دینی" ہو یا "لادینی" یا قوم پرستی اور وطنیت اس کی اساس قرار پائے! یہاں کے دستور و قانون کا ماخذ و منبع کیا ہو، کتاب و سنت یا کوئی اور قانون اور کانسٹی ٹیوشن!

ان حالات میں ——

گیا جماعت اپنے سابق متحدہ ہندوستان کے طریقہ پر جمی رہتی، اور آئین وسیاست سے کوئی واسطہ نہ رکھتی کہ اصل چیز اصلاحِ معاشرہ ہے بس تنہا یہی کام ہوتے رہنا چاہیئے، جب معاشرہ پوری طرح اسلامی بن جائے گا تو حکومت آپ ہی آپ دینی بن جائے گی، جماعت کو صرف اصلاحِ معاشرہ کا کام کرنا ہے، حکومت چاہے دینی بنے یا لادینی، یہاں اللہ اور رسول کا قانون چلے یا انگریز کا، اس سے کوئی سروکار ہی نہ رکھنا چاہیئے اگر "جماعت" یہ روش اختیار کرتی تو بہت بڑی بے دانشی اور ایمانی فراست اور دینی بصیرت کے افلاس کا ثبوت دیتی! اس لئے وہی کیا جو ایمانی فراست اور دینی حکمت وبصیرت کا تقاضا تھا

ہم بلا تشبیہ عرض کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی مکی زندگی مظلومیت کی زندگی تھی، وہاں یہ نفوسِ قدسیہ پتھر کھاتے تھے اور صبر کرتے تھے مگر مدینہ میں پہنچ کر جن حالات سے سابقہ پڑا، تو طریقِ کار کو بدل دینا پڑا، مدنی زندگی میں تلوار کا جواب تلوار سے دیا گیا، اب شعبِ ابی طالب اور دارِ ارقم کی جگہ بدر واحد نے لے لی تھی، یہاں صلح وجنگ کے معاہدے تھے، سفارتیں تھیں، وفود کی باریابیاں تھیں، بادشاہوں اور حکمرانوں سے براہِ راست خطاب تھا، غزوات کے لئے روپیہ پیسہ، اسلحہ اور رسد کی اپیلیں تھیں، فصلِ قضایا اور حکم وولاۃ کا تقرر تھا، توقیعات وفرامین تھے، محاصل ومخارج تھے جاگیروں اور افتادہ زمینوں کی آبادی تھی —!!

مدینہ کی زندگی، مکہ کی زندگی کے مقابلہ میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی تھی، جن شعبوں کی مکہ کی زندگی میں پرچھائیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ مدنی زندگی میں وہ شعبے عامل ومتحرک تھے، اس لئے صداقت وحقانیت اور اخلاص وللٰہیت کے اس مبارک و مقدس ماحول میں کبھی کبھار بشری کمزوریاں بھی ظاہر ہو جاتی تھیں، مدنی زندگی میں تیر اندازوں کا غزوۂ احد میں درۂ کوہ سے ہٹ جانا بھی ملتا ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے :—

مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ (آل عمران) تم میں سے کچھ دُنیا کے طلبگار تھے اور کچھ آخرت کے ——

اس چیز نے مسلمانوں کی فتح کو شکست سے بدل دیا، حضرت حاطب بن ابی بلتعہ قریش کو مخفی طور پر خط بھیجتے نظر آتے ہیں، غزوۂ حنین کی کیفیت صحیح بخاری میں یوں ملتی ہے :—

ما قبل المسلمون علی الغنائم	تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور کافروں نے ہم کو
واستقبلونا باسھامہم	تیروں پر رکھ لیا۔

اسلامی تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بنو خذیمہ کے مقابلہ میں تلوار سے کام لیتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رُو کھڑے ہو کر فرماتے ہیں :—

"اے خدا! خالد نے جو کچھ کیا اُس سے میں بری ہوں" ——

مدنی زندگی میں "متخلفین" بھی ملتے ہیں اور واقعہ "افک" میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگانے والے بھی

—— لیکن ——

کون مُسلمان یہ رائے زنی کر کے اپنے ایمان کو ضائع کر سکتا ہے کہ (معاذ اللہ) مکہ اور مدینہ کی زندگیوں میں "تضاد" پایا جاتا ہے" حق یہ ہے کہ مکہ کی خاموشی اور مظلومیت کی زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کے لئے اختیار کی گئی تھی اور وہ بھی "اقامتِ دین" ہی کے کام آ رہی تھی اور مدینہ کی معرکہ آرا اور فاتحانہ زندگی کا مقصد بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور اقامتِ دین ہی تھا! مکہ اور مدینہ کی زندگی کے یہ دونوں دور مُبارک تھے، اور ان میں اُمّت کے لئے نمونہ ہے، کوئی ملحد مستشرق ہی اس انداز پر سوچ

سکتا ہے کہ مکہ کی زندگی .... مرنجان و مرنج تھی، خاموش تھی، اُس میں تمام و کمال ذکر و عبادت ہی کا دور دورہ تھا سیاست و حکومت کے بکھیڑے نہ تھے، اس لئے مدنی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ پاکیزہ تھی، اور (خاک بدہن گستاخ) مدینہ کی زندگی میں دُنیا اور اس کی مصلحتیں آگئی تھیں —— حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کے سب سے بڑے انسان، اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور ہمارے آقا سید الاولین والآخرین محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سُنّتِ مطہرہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اُمت کو جب بھی اللہ تعالیٰ کے دین کو تشریعی طور پر نافذ و غالب کرنے کا موقعہ ملے، اُس موقعہ کو ضائع کرنا نہیں چاہیئے! اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے حصول اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لئے تدبیر اور طریقِ کار کی تبدیلی کو "انحراف" نہیں کہتے!

اور یہ سامنے کی حقیقت

کسی زاہد اور صالح کو اگر نظر نہیں آتی کہ دین کو کامل غلبہ "مدنی زندگی" میں میسر آتا ہے، تو اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی آنکھوں کا علاج کرائے!

ہم نے مدنی زندگی کے چند واقعات جو اُوپر بیان کئے ہیں، اُن کے بارے میں اندیشہ ہے کہ کچھ لوگ کسی غلط فہمی میں مُبتلا نہ ہو جائیں، یا ہمارے عیب جُو کرمفرما اُن سے کچھ نکتے پیدا کر کے ہمیں مطعون نہ کر دیں! اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتوں کی اُس پر پھٹکار ہو، جو کسی ادنیٰ درجہ کے صحابی کی ذات کو بھی ہلکا ثابت کرنے کا ذرہ برابر داعیہ اپنے دل میں رکھتا ہو، اکابر اور اجلِ صحابہ تو پوری اُمت کے مخدوم ہیں ہی، ہم تو حضرت ماعز اور حضرت وحشی (رضی اللہ عنہما) کی خاکِ پا کو بھی سرمۂ چشمِ بصیرت سمجھتے ہیں کہ ان قابلِ احترام نفوس کی کمزوریاں بھی، ہم ناہنجاروں کی نیکی اور تقویٰ سے فضل ہیں، اُن کے اندر جو کمال درجہ کا اخلاص پایا جاتا تھا، اُس کے اعتبار سے ہمارا پہاڑ کی برابر سونا خرچ کرنا، اُن کے ایک درہم کی برابری نہیں کر سکتا! بے شک اللہ تعالیٰ اُن سے راضی تھا، اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی تھے، اور وہ نفوسِ قدسیہ:—

اولٰئک علیٰ ھُدیً من ربھم واولٰئک ھم المفلحون ——

کے صحیح مصداق ہیں، اُن کی پرچھائیں بھی ہم پر پڑ جائے، تو ہم خاک سے پاک ہو جائیں!

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ثابت ہے کہ کسی کی کمزوریاں دوسروں کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتیں۔ اُمت کو کفر و باطل کے مقابلہ میں یرموک اور قادسیہ کی تاریخ کو تو بے شک دُہرانا چاہیئے مگر جمل و صفین سے گریز ہی لازم ہے —— پھر جماعت کے ساتھ صحابہ کرام کا جو ذکر درمیان میں آگیا ہے، اس سے خدا جانتا ہے تشابہ اور مماثلت مقصود نہیں ہے۔

(سابق) جماعت اسلامی کے ارکان فرشتے نہیں تھے، انسان تھے، اُن سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور کوتاہیاں بھی ظہور میں آئی ہیں۔ مگر غلطیوں اور کوتاہیوں کے مقابلہ میں اچھائیوں اور بھلائیوں کا پلّہ بہرحال بھاری ہی رہا ہے، جماعت کے کام سے اللہ تعالیٰ کے دین اور مُسلمانوں کو فائدہ ہی پہنچا ہے نقصان نہیں پہنچا، جماعت کے لٹریچر اور ارکان کی سیرت و کردار سے متاثر ہو کر لاکھوں نوجوانوں نے اپنی زندگیوں کو دین کے قالب میں ڈھالا ہے، جماعت کی طرف سے کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی، جسے "دین سے انحراف" کہا جا سکے، یعنی یہ کہ "پردہ" کے مقابلہ میں "بے پردگی" کی حمایت کی گئی ہو، یا بنک کے سود اور گھوڑ دوڑ کی شرطوں کے جواز کے لئے دلائل تراشے گئے ہوں، شروع ہی سے، جماعت نے جن کو "منکر" سمجھا ہے، آخر وقت تک اُن "منکرات" کی فہرست میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اور ایسا بھی سننے اور دیکھنے میں نہیں آیا کہ جماعت کے کام کرنے والے ارکانِ دین کے معاملہ میں بے پروا اور تساہل واقع ہو گئے ہوں، بعض نے نمازیں چھوڑ دی ہوں، بعض ناچ رنگ میں مبتلا ہو گئے

ہوں، کچھ لوگوں نے سودی کاروبار شروع کر دیا ہو، مگر اُن کی احتیاط کا تو یہ عالم رہا ہے کہ اسمبلیوں کے الیکشن کے زمانہ میں اُنھوں نے اپنے اُمیدواروں کے فوٹو نہیں چھپوائے اور باجے گاجے کو استعمال نہیں کیا ـــــــ اور یہ بھی نہیں ہوا کہ ارکانِ جماعت کی زندگیوں کو دیکھ کر، بعض لوگ دین کے بارے میں مشتبہ اور بدگمان ہو گئے ہوں، جماعت کے ارکان اپنی ذات سے صالح معاشرے کے باعمل داعی تھے، اور اُن کے حلقہ اثر میں معاشرے کی تطہیر بھی ہوتی جا رہی تھی، اس حقیقت کا آج بھی اس قدر تو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ شہروں کے جن محلّوں میں جماعت کا اثر تھا، وہاں کی مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد، دوسری مسجدوں سے زیادہ ہے۔

جماعت کے دواخانوں، ڈسپنسریوں اور طبی مراکز نے جس خلوص، ایثار اور محنت کے ساتھ خلقِ خدا کی خدمت انجام دی ہے کیا اُس میں تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی جھلک نہیں ملتی تھی۔ مذہبی لوگوں کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ جو یہ تصور رکھتے ہیں کہ "یہ حضرات اللہ میاں کی گائیں ہوتے ہیں"۔ اس تصور کو جماعت نے باطل ثابت کر دیا، جماعت کے دفتروں میں، جلسوں اور جلوسوں میں تربیت کے کیمپوں میں کس قدر سلیقہ، خوش ذوقی اور انتظام و اہتمام کی خوبیاں پائی جاتی تھیں، جن کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا تھا کہ دیندار، دُنیا کے کاموں کو دُنیا داروں سے بہت زیادہ سلیقہ اور اہتمام کے ساتھ چلا سکتے ہیں، اور جو خدا کے بندے نمازیں ترتیل و تعدیل کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی سنوار سکتے ہیں اور دین روح اور جسم کے تقاضوں میں صحیح تناسب قائم رکھتا ہے۔

انگریز کے زمانہ ہی سے "الیکشن" مُرغ بازی، پتنگ بازی بلکہ "قمار بازی" سے ملتی جُلتی "بازی" بن کر رہ گیا تھا، ووٹ حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈا بے دریغ استعمال کیا جاتا تھا، اور ایسے ایسے کھیل کھیلے جاتے تھے کہ پناہ بخدا! جماعتِ اسلامی کو ہزار آفریں کہ اُس نے مکروہات کی اس دلدل کو بھی کمال احتیاط و خدا خوفی کے ساتھ طے کر کے طہارت و نیکی کی مثال قائم کر دی، اُس نے اپنے کسی اُمیدوار کا فوٹو تک نہیں چھاپا، ووٹروں کی کشش کے لئے یا مکروہات کا استعمال نہیں کیا، شام کا وقت ایلیکشنوں کے لئے بڑے توڑ کا وقت بلکہ یوں کہیئے انتہائی نازک وقت ہوتا ہے، ایسے نازک اور معرکہ کی ساعتوں میں بھی جماعت کے کارکنوں نے فریضۂ صلوٰۃ سے غفلت نہیں برتی!

(سابق) جماعت اسلامی فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت تھی، اس کے ارکان سے کمزوریاں اور غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر جماعت کا وجود اور اُس کی سرگرمیاں دین کے لئے مُفید تھیں اور یقین و عمل کے اس ضعف کے زمانہ میں تو غنیمت نہیں نعمت اور رحمت تھیں! خدا دلوں کا حال جانتا ہے کہ ہم جیسے گنہگاروں نے جماعت کے متاثرین کی "پک نک پارٹیوں" میں دینی رنگ کو غالب دیکھ کر، روحانی مسرت محسوس کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے کہ یہ تفریحی ساعتیں ثوابِ عبادت میں بسر ہوئیں، اور اس صحبت میں ہمارے آئینۂ قلب کی بھی تھوڑی بہت صیقل ہو گئی......

وہ حضرات چاہے جماعت میں رہے ہوں، یا جماعت کے باہر کے ہوں، حقیقتِ حال کو بالکل مسخ کر کے پیش کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جماعت اپنے نصب العین سے ہٹ کر گمراہ ہو گئی تھی! جماعت سے باہر آنے والوں میں مولانا اصلاحی اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحبان نے جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت کو اپنا مشن بنا لیا ہے اور یہ دونوں بزرگ اپنی علیحدگی کو اس انداز میں پیش فرما رہے ہیں، جیسے اُن کی علیحدگی نے ملتِ اسلامیہ کو کسی بہت بڑے خطرے سے بچا لیا، وہ ایسا نہ کرتے تو تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی اس دور میں بساط ہی اُلٹ جاتی، جماعت کو چھوڑ کر انھوں نے بہت بڑا مجاہدانہ کارنامہ انجام دیا ہے، اپنی پوزیشن کی صفائی اور نیکی و تقویٰ کے اثبات میں، یہ دونوں حضرات طنز و "تشنیع" تضاد بیانی، غلط اندیشی اور اختلاف و عداوت کی جن حدوں

تک پہونچ گئے ہیں، اُس کی اُنہیں ایک دن اُس حاکم کے حضور جواب دہی کرنی پڑے گی، جو قلب و نفس کی ہر چھپی ہوئی چوری اور کمزوری سے واقف ہے اور جہاں نیکی اور تقویٰ کی دُھائی دینے سے کسی کا کیس مضبوط نہیں ہو سکتا!

جہانتک جماعت کی تنظیم، ارکان اور عہدیداروں کے عزل و نصب اور اس قسم کے دوسرے تنظیمی معاملات کا تعلق ہے، اس میں جماعت کے امیر سے بھی غلطی ہو سکتی ہے اور اُس کے مُشیروں سے بھی! مگر اس قسم کی غلطیوں کو یہ رنگ نہیں دیا جا سکتا کہ جماعت صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گئی یا اُس کا مزاج "غیر دینی" بن گیا، اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے اور نہ لینے کا معاملہ بھی ایسا نہیں ہے کہ اس کے اثبات و نفی پر "حق و باطل" کا اطلاق کیا جا سکے! اس طرح کے جزئی اختلافات سے کوئی تنظیم محفوظ نہیں رہ سکتی، اگر ان اختلافات میں "امیر" کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا "نفس" شریک ہو گیا تھا، تو اختلاف کرنے والے مامورین ــــــ کے "بے نفس" ہونے کی کون تصدیق کر سکتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے ۱۳؍ جنوری ۱۹۵۸ء کو جماعت سے جو استعفیٰ دیا تھا، اُس میں جماعت کی پالیسی اور اُس وقت کے موجودہ نظام و دستور سے اختلاف کرتے ہوئے، یہ بھی تحریر فرمایا تھا:-

> "اس موقعہ پر میں یہ ظاہر کرنے میں اطمینان اور خوشی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے جماعتِ اسلامی سے جو محبت رہی ہے، انشاء اللہ بہ حیثیت مجموعی وہ اب بھی قائم رہے گی، اس جماعت کے اندر میرے بہترین احباب ہیں، جن کے دینی جذبات و احساسات کی میرے دل میں بڑی قدر و عزت ہے"۔

وہی جماعت، جس سے علیحدگی کے وقت بھی مولانا کو محبت تھی، اور آئندہ اس محبت کے باقی رکھنے کا موصوف نے اعلان بھی کیا تھا۔ غالباً مولانا اصلاحی کی اس تحریر کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ اُس جماعت کے "گمراہ قافلہ" ہونے کا ڈنکے کی چوٹ اعلان فرمایا گیا۔

ع یہ دوستی ہے تو پھر دشمنی میں کچھ بھی نہیں۔

اور سُنیئے:-

> "..... یہ رسالہ دین کی ہر اس خدمت کی تائید اور حوصلہ افزائی کرے گا جس سے مسلمانوں کو کوئی نفع پہنچ رہا ہو، یہ اگر ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرے گا، تو صرف اُن لوگوں کی جو دین کی خدمت کے نام سے دین کی تخریب کے درپے ہوں، اسلام کا جو خادم کسی منہدم مسجد کی دیوار کی دو اینٹیں بھی جوڑ دیں، ہمارے نزدیک اُن لوگوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں، جو دعویٰ تو لے کر اُٹھیں پوری مسجد کی تعمیر کا، لیکن اپنی نادانی سے اُس کی بچی کھچی اینٹیں بھی اکھاڑنی شروع کر دیں...." (میثاق - جون ۱۹۵۹ء)

یہ ہے جماعت اور اُس کے ارکان سے مولانا اصلاحی کی "محبت" کا ثبوت!!

اسی مضمون میں مولانا اصلاحی صاحب مدظلہ ارشاد فرماتے ہیں:-

> "..... غلط عقائد اور غلط نظریات خواہ کسی کی طرف سے بھی ظاہر ہوں، اگر وہ اسلام پر غلط اثر ڈالنے والے محسوس ہوتے تو اُن پر ضرور تنقید ہو گی اور اس کا بھی امکان ہے کہ بعض صورتوں میں یہ تنقید بے رحمانہ ہو جاتے"۔

مولانا موصوف نے "جماعت" کے ساتھ جس محبت کا اظہار بلکہ عہد فرمایا تھا، اُسے تو وہ اپنے "تقویٰ" کے تقاضوں کے سبب نہ نباہ سکے، مگر "بے رحمانہ تنقید" کی جو پیش گوئی فرمائی تھی، اُسے حرف بہ حرف پورا کر کے دکھا دیا، مارشل لا کے بعد جماعت کی جو تنظیم ٹوٹ گئی تھی، اس پر انھوں نے جماعت کے ارکان پر "بلوں میں گھس جانے والے چوہوں" کی رکیک پھبتی چست کی، اور جس جماعت سے محبت رکھنے کا انھوں نے اعلان فرمایا تھا، اُس کے بارے میں یہ تک کہہ دیا:—

" لیکن اب جماعت، وقت کے اللہ کے آگے اوندھے منہ گری ہوئی جو پڑی ہے
تو اُس کو اُٹھائے گا کون؟"

یہ الفاظ جماعت کے بارے میں لکھنے والے کی محبت کا پتہ دیتے ہیں، یا بُغض و عداوت کا! مولانا اصلاحی کے قول و عمل کو اس کھلے ہوئے تضاد کو دکھایا جاتا ہے تو وہ اور غصہ ہو جاتے ہیں اور اُن کا قلم غصہ کی حالت میں بالکل بے قابو ہو جاتا ہے! مولانا صاحب موصوف سے کس نے درخواست کی تھی کہ آپ جماعت سے علیحدہ ہوتے وقت اپنے استعفا میں جماعت اور اُس کے ارکان سے "محبت" کا بھی اظہار فرما دیں، اور وہ بات کاغذ پر لے آئیں جو آپ کے دل میں نہ تھی!

مولانا اصلاحی صاحب اور مولانا حکیم اشرف صاحب دونوں کا یہی طرزِ عمل رہا ہے کہ انھوں نے بڑی معصومیت کے ساتھ اس قسم کے اعلانات کئے ہیں کہ ہم اس بات کے کہنے یا ان اختلافات کو منظرِ عام پر لانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے تھے، مگر فلاں اسباب کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا........! یہ نفس کا وہ مغالطہ ہے، جو زیادتی کرنے والے کو منفعل ہی نہیں ہونے دیتا اور آدمی بڑی سے بڑی زیادتی کرنے کے بعد بھی اپنے کو مظلوم یا بہت سے بہت "مدافعت کرنے والا" سمجھتا رہتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف نے اپنی دانست میں کچھ نہ کہہ کر بھی "المنبر" میں "جماعتِ اسلامی کی کہانی" کے پردے میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا! مولانا اصلاحی نے آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جواب کو اپنے رسالہ (میثاق) میں اس اعلانِ معصومیت کے ساتھ شائع فرمایا:—

"یہ آئین کمیشن کے سوالنامہ کا جواب ہے، یہ جواب میں میثاق یا کسی دوسرے اخبار یا رسالہ میں شائع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا، میرا ارادہ تھا کہ مرتب کر لینے کے بعد یہ جواب میں براہِ راست کمیشن کے صدر صاحب کی خدمت میں بھیج دوں گا، لیکن ایک خاص ضرورت کی وجہ سے میں اس کو ان صفحات میں دے رہا ہوں۔" (جون ۱۹۶۰ء)

جماعت سے علیحدگی کے بعد جب مولانا اصلاحی اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے تھے تو جو حضرات جماعت سے دلچسپی اور ہمدردی رکھتے تھے، انھوں نے ان دونوں صاحبوں سے جماعت کی علیحدگی اور اختلافات کے بارے میں سوالات کئے تھے، مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے سفرنامہ میں خود لکھا ہے کہ ایک صاحب اُن سے مکہ معظمہ میں ملے، اور وہ یہ کہہ کر "کہ آپ بھی جماعت سے علیحدہ ہو گئے" مسلسل روتے رہے!

ایک صاحب "حبیب الرحمٰن" ہیں جھانسی دیو۔ پی کے رہنے والے، جدہ کی ایم ایم ناہد فرم میں ملازم ہیں، انھوں نے حرم کعبہ میں مولانا اصلاحی کی خدمت میں انتہائی سوز و دردمندی کے ساتھ یہ التجا کی کہ آپ جماعت کے اختلافات کو خدا کے لئے منظرِ عام پر نہ لائیں مولانا اصلاحی صاحب نے فرمایا ہم ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اس گفتگو میں موجود تھے...! حرمِ کعبہ کی یہ گفتگو ذہن میں رکھئے، اور پھر ان دونوں بزرگوں کے اس طرزِ عمل کو دیکھئے کہ انھوں نے کس شد و مد کے ساتھ ان اختلافات کو چھیڑا اور جماعت کو غلط کار ثابت کرنے اور اسے ملت کی نگاہ میں بے وقار اور ذلیل بنا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی!

تضاد اور غلط بیانیاں

جناب حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب مدیر "المنبر" (لائل پور) تو مولانا مودودی کی دشمنی میں اخلاق و شرافت اور دیانت و تقویٰ کی اس حد تک پہونچ چکے ہیں کہ مولانا سے وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جو انھوں نے نہیں کہیں، اور ایسا کرتے ہوئے وہ کسی قسم کی اخلاقی جھجک تک محسوس نہیں فرماتے ۔

حکیم صاحب مدظلہ نے مولانا مودودی پر یہ تہمت لگائی کہ مولانا موصوف نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ماہنامہ "طلوع اسلام" کے کسی کارکن کی تالیف قلب کر کے، اُس کے ذریعہ پتے حاصل کئے جائیں، تاکہ "فتنۂ انکارِ حدیث" کے رد میں جو لٹریچر تیار ہوا ہے، وہ اِن خریداروں تک پہنچایا جاسکے　　حالاں کہ مولانا مودودی نے یہ بات نہیں کہی تھی، اور ہم عرض کرتے ہیں کہ بر فرضِ محال ایسی کوئی گفتگو ہوئی بھی ہوتی، تو کیا رفاقت کا، مروت کا، شرافت کا اور سب سے بڑھ کر مقصد کی نزاکت کا کیا یہ تقاضا تھا کہ اُسے ظاہر کر دیا جاتا ...... کہ جس سے "فتنۂ انکار حدیث" کے اربابِ حل و عقد کے ہاتھ مضبوط ہوں اور حامیانِ سُنّتِ نبویؐ کو بدنام کرنے کا موقعہ ملے!

دوسرا الزام مولانا مودودی پر حکیم صاحب نے یہ لگایا مولانا موصوف روپیہ دے کر ووٹ خریدنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

چودھری غلام محمد صاحب نے حکیم صاحب سے اس سلسلہ میں مراسلت کی، اور اُن پر واضح دلائل و براہین سے یہ ثابت کر دیا، کہ حکیم صاحب نے جو باتیں مولانا مودودی سے منسوب کی ہیں وہ بالکل غلط ہیں بلکہ بہتان ہیں، چودھری صاحب نے "المنبر" میں اشاعت کے لئے ایک خط بھیجا تھا تاکہ "المنبر" پڑھنے والوں کے سامنے حقیقت اپنی اصل صورت میں آجائے! حکیم اشرف صاحب کے حافظہ سے اگر بھول چوک ہوگئی تھی، تو چودھری صاحب کے جتانے پر انھیں اپنی غلطی کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ مگر انھوں نے سیاست بازوں کی طرح چودھری صاحب کے خط کا صرف ایک پیراگراف چھاپا، پورے خط کو "المنبر" میں آنے ہی نہیں دیا کہ ایسا کرنے سے اُن کی تہمت طرازیوں اور غلط بیانیوں کی قلعی کھلتی تھی۔ ہم ذیل میں وہ مکتوب شائع کرتے ہیں، جو چودھری غلام محمد صاحب نے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو ۱۱ نومبر ۱۹۵۸ء کو لکھا تھا، اس سے ان دونوں حضرات کے موقف کے سمجھنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے :

"مکرمی و محترمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

تعلقِ خاطر کی بناء پر آپ نے میرے خط کا ایک پیراگراف شائع فرما کر، جو احسان کیا ہے، اس کا اگرچہ میں ممنون ہوں، لیکن اگر آپ یہ احسان نہ فرماتے تو احسان ہوتا، اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ آپ نے اسی طرح میرے خط کا صرف چند جملے شائع کئے تھے جس سے آپ کی مطلب برآری ہوتی تھی۔

آپ نے مولانا مودودی صاحب پر ایک کھلا کھلا بہتان لگایا تھا اُن کے صاف انکار کے بعد آپ نے محض اپنی بات کی پچ میں ایک اور بہتان کے اضافے کے ساتھ اسے دو آتشہ کر کے شائع کیا، تو میں مجبور ہوا تھا کہ آپ کی خدمت میں وہ خط لکھوں، اُس خط کی اشاعت سے مجھے ایک طرف تو "المنبر" کے قارئین کے سامنے، ان دونوں باتوں کا دوسرا پہلو بھی رکھنا تھا، دوسری طرف یہ خیال بھی تھا کہ اگرچہ بہت مدھم اُمید کے ساتھ کہ شاید میرا خط آپ کے ضمیر کے کسی گوشہ میں پڑی ہوئی دیانت کی کسی رمق کو متوجہ کر دے، تازہ پرچہ دیکھ کر

وہ اُمید بھی ختم ہوگئی۔

مولانا مودودی کے واضح انکار اور میرے اس مراسلے کے بعد آپ کے لئے دیانتاً صرف یہی راستے تھے، یا تو آپ کھلے دل سے اقرار کرتے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے متعلقہ شخص سے معافی مانگتے، یا پھر آپ یہ ثابت کرتے کہ "مولانا مودودی اور میں جھوٹ بول رہے ہیں" ان دونوں راستوں کو چھوڑکر یہ لکھنا کہ :-

"اگر مولانا مودودی صاحب اس سے انکار کرتے ہیں، اور اعلان کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کے لئے ووٹروں کو روپے دے کر، ووٹ حاصل کرنا، ان کے نزدیک حرام ہے، تو چشمِ ماروشن دلِ ماشاد، آپ یہ اعلان ان سے لے کر بھجوادیں گے، میں اسے "المنیر" میں من وعن شائع کردوں گا، اس میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا"

یہ صریحاً مغالطہ ہے

دو ہزار سے زائد کارکنوں کے مجمع میں ان سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا آپ نے کبھی ایسی بات کہی جو "المنیر" میں شائع ہوئی، انھوں نے اس سے انکار کیا، آپ کو اطلاع دی گئی آپ اس کو تسلیم نہیں کرتے، مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ کے پاس اعلان بھیجا جائے۔

پھر اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ مودودی صاحب ووٹ کی خرید وفروخت کو کیسا سمجھتے ہیں، اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ بات مولانا محترم نے کہی ہے یا نہیں، جو آپ نے اُن کی طرف منسوب کی ہے، اصل بات سے انکار ہے، اور میں پوری ذمہ داری سے کہنے کو تیار ہوں کہ انھوں نے یہ بات کبھی نہیں کہی تھی، آپ نے ان پر صریحاً بہتان لگایا ہے، اور اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے تو لائیے، شریف انسان پر بہتان لگانے کے بعد آپ یہ فرماتے ہیں کہ آپ کو اس مسئلہ سے کوئی دل چسپی نہیں، بس آپ کو صرف اتنی دل چسپی تھی کہ مولانا مودودی صاحب پر ایک الزام لگادیا جائے اور ان کی اخلاقی حیثیت پر حملہ کردیا جائے۔

آپ نے میرا پورا خط شائع نہیں کیا اس لئے کہ اس سے آپ کے اصل خدوخال سامنے آتے تھے، اور آپ کی اخلاقی حیثیت مجروح ہوتی تھی، اور "المنیر" کے قارئین کو معلوم ہوجاتا کہ آپ کے اخلاق کا پائے چوبیں کتنا مضبوط ہے، پھر اس خط میں آپ نے میرے استفسار کو "فتویٰ" بنادیا ہے، اس عیاری اور ہوشیاری کی داد دیتا ہوں۔

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے"

ہم نے کوئی کچی یا مشتبہ بات نہیں کہی "المنیر" کے فائل موجود ہیں، چوہدری صاحب اور حکیم صاحب کی مراسلت موجود ہے ان واقعات پر جرح وتعدیل کے لئے زندہ شاہد موجود ہیں آج بھی "حکم" (JUDGES) کے ذریعہ اس قضیہ کا فیصلہ کرایا جاسکتا ہے، ہم پر کسی غلط بیانی، مبالغہ آرائی یا اصل واقعہ کو کسی دوسرے رنگ میں پیش کرنے کا الزام آجائے، تو ہم ہر سزا بھگتنے

کے لئے تیار ہیں اور اگر حکیم اشرف صاحب کا وہی موقف ثابت ہو، جو موقف اُن کا ہے اور جس کو ہم نے ثابت کیا ہے، تو پھر وہ نرم سے نرم لفظوں میں آپنی اس تہمت تراشی کا اعتراف ہی فرمالیں!

حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے جماعت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت میں "تقویٰ" کی کمی اور دُنیاداری کا رنگ دیکھ کر ہی وہ جماعت سے پیچھا چھڑا کر بھاگ گئے تھے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ جتنے دن وہ جماعت سے وابستہ رہے، جماعت کے "تقویٰ" کا یہ اثر تھا کہ اُن کی ذہنیت اتنے دن تک خشیت و تقویٰ کے احساس سے دبی رہی، اور اس دباؤ کے ہٹتے اور اس بند کے کھلتے ہی، اُن کی ذہنیت نے جو کھیل کھیلا ہے، اُس کی مثال اُوپر پیش کی جاچکی ہے۔

حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے ۱۶/۲۳ فروری ۱۹۵۹ء کے "المنیر" میں استاذ شریف کامل کا ایک طویل انٹرویو شائع فرمایا ہے، جس میں کامل شریف صاحب کی زبان سے سُنتے ہوئے یہ کلمات بھی انھوں نے درج کئے ہیں:-

> "لیکن اخوان سے ایک فاش غلطی ہوئی، اور وہ تھی معرکۂ سیاسیات میں پُوری طرح سرگرم عمل ہوجانا، درآں حالیکہ نہ یہ وقت اس کے لئے موزوں تھا، اور نہ ہی اخوان اس معرکہ کے لئے تیار تھے، سیاست میں قبل از وقت مداخلت نے اخوان کو تباہ کیا اور جمال ناصر کو اس پر بھرپور وار کرنے کا موقعہ ملا......... ہماری خطا ہم پر واضح ہوگئی کہ ہم نے سیاسیات میں غیر صحیح وقت میں اور اپنی تیاری سے پہلے دخل دیا، اب ہمیں اگر کام کرنا ہے تو اس غلطی سے بچ کر، اصلی دعوت کو بنیاد بناکر ہی کام کرنا ہے...."

کامل شریف اخوان المسلمون کے اُن رضاکاروں کے کمانڈر رہ چکے ہیں جنھوں نے فلسطین میں یہودیوں کے خلاف جہاد بالسیف کیا تھا، اُن کی کتاب "اخوان المسلمون فی حرب فلسطین" چار جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، کامل شریف صاحب انگریزی اچھی خاصی جانتے ہیں، چوہدری غلام محمد صاحب نے بیت المقدس میں اُن سے اخوان کے سیاسیات میں حصہ لینے کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ:-

> "اخوان کے سیاسیات میں حصہ لینے کو میں غلط نہیں سمجھتا، ہم تو سیاسیات کو دین کا پورا جُز سمجھتے ہیں، اور اب بھی میں خود سیاسیات میں اُترا ہوا ہوں...... مجھے کسی شخص کا انٹرویو دینا یاد نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ "اخوان" کے مسائل پر گفتگو ہوئی ہو، مگر مجھے وہ گفتگو یاد نہیں...."

حکیم عبدالرحیم اشرف چوہدری غلام محمد اور استاد کامل شریف ان میں کون سچا ہے، اس کا فیصلہ کرنے کے موقف میں ہم نہیں ہیں مگر مولانا مودودی صاحب سے جو غلط باتیں حکیم صاحب موصوف نے منسوب کی ہیں، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ باتیں جب سامنے آتی ہیں، تو.......

تیوروں سے باطن کا کچھ سُراغ ملتا ہے
چال پہ تو ظالم کے سادگی برستی ہے

حکیم صاحب اس انٹرویو میں "اخوان" کے سیاسیات میں حصہ لینے کو غلط ثابت کرکے، دراصل جماعت اسلامی کی غلطی پر ایک نظیر اور دلیل لانا چاہتے ہیں!

اس کے بعد

جناب محمد عاصم صاحب کے "ارض القرآن" کے سفر کا ایک اقتباس بھی لگے ہاتھوں پڑھ لیجئے :-

"مغرب کے بعد ہوٹل واپس پہونچے تو وہاں ملاقات کے لئے آئے ہوئے حضرات کا ایک ہجوم موجود تھا، جس نے رات گئے تک ہمیں یہ موقع ہی نہیں دیا کہ ہم کسی اور جگہ جا سکتے آنے والے حضرات میں ایک صاحب (جو دراصل ہندوستانی تھے، لیکن اب آٹھ دس سال سے سعودی مملکت ہی میں رہ رہے ہیں) مکہ معظمہ کے روزنامہ "الندوہ" کے نمائندہ بھی تھے بہت عمدہ اردو بول رہے تھے، انھوں نے مولانا (مودودی صاحب) سے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیتے ہوئے مقصدِ سفر کے متعلق چند سوالات کئے ان سوالات میں ان کا ایک سوال "حدیث اور فقہ کے متعلق مولانا کی رائے" کے بارے میں تھا، اس سوال کی جو وجہ انھوں نے بتائی وہ بڑی ہی تکلیف دہ تھی، شاید قارئین کو اس کے سننے پر یقین نہ آئے، جیسا کہ پہلی بار سننے پر ہمیں بھی یقین نہ آیا تھا، لیکن جب نمائندہ "الندوہ" نے بار بار یقین دلایا کہ تو کم از کم ہم ان کے اس بیان کو غلط قرار نہ دے سکے، انھوں نے بتایا ۱۹۵۵ء کے حج سے پیشتر مصر کے ایک پرچے میں یہ شائع ہوا کہ مولانا مودودی حدیث اور فقہ کے منکر ہیں، اس کے بعد جب اسی سال لائل پور اور لاہور کے دو عالم —— جن کا پہلے جماعت اسلامی سے تعلق تھا —— حج کے لئے تشریف لائے اور ان سے اس کے متعلق سوال کیا گیا، تو ان دونوں نے اس کی تائید کی لائل پور ہی کے ایک اور صاحب کے متعلق (جو پہلے ریاض کے کلیۃ الشریعہ میں طالب علم تھے اور ہماری ریاض میں موجودگی سے پیشتر پاکستان واپس آگئے تھے) بتایا کہ انھوں نے مولانا مودودی کو بدنام کرنے کے لئے ریاض میں باقاعدہ مہم شروع کر رکھی تھی ......"

سوچئے تو سہی کہ یہ کڑیاں کس طرح ملتی اور یہ جال کس نہج پر بُنتا اور بچھتا چلا جا رہا ہے !!

آج مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب مولانا مودودی کے "علم و فکر" کو جتنا چاہے سطحی اور غیر مُفید ثابت کر دیں، مگر ۱۹۵۶ء میں ان کی یہ رائے تھی :-

"تقریباً سوا فیصد (۱۲۵) کے قریب کتب و رسائل کا یہ مجموعہ ملک اور بیرون ملک میں کروروں تک پہونچ چکا ہے ؛ اور اس کے اثرات اتنے گہرے اور وسیع ہیں کہ اپنے اور پرائے دونوں اس کی اہمیت کو یکساں محسوس کر رہے ہیں۔"

(کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟ ص ۳۳)

اس حقیقت پر کسی دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے کہ دوسرے ملکوں میں زیادہ تر کتابیں جو ترجمہ ہو کر پہنچی ہیں، یا بعض بیرونی ملکوں میں شائع ہوئی ہیں وہ قریب قریب تمام تر مولانا مودودی کی کتابیں ہیں، جس کے اثرات کے گہرے اور وسیع ہونے کا حکیم صاحب نے ۱۹۵۶ء میں اعتراف فرمایا ہے، مولانا مودودی نے ظاہر ہے ناول اور افسانے تو نہیں لکھے، ان کی تمام کتابوں اور رسالوں کا موضوع

"دین" ہی رہا ہے، یہی وہ مرکز ہے جس کے اردگرد اُن کا قلم گردش کرتا رہتا ہے......مگر اب اختلاف کے بعد حکیم صاحب کو مولانا مودودی کی کتابوں میں افادیت ہی نظر نہیں آتی اور مولانا کی ان کتابوں کی اشاعت کے لئے کوئی ادارہ قائم ہوتا ہے تو وہ اُن کو بُری طرح کھٹکتا ہے۔

"کیا جماعتِ اسلامی حق پر ہے؟" اس کے صفحہ ۱۰۳ پر حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے جماعت کے دستور کی اصل عبارت کا ایک اقتباس نقل کیا ہے:۔

"جماعتِ اسلامی کا نصب العین اور اُس کی تمام سعی وجدوجہد کا مقصود دُنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے"۔

اور اب

حکیم صاحب اور مولانا اصلاحی پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ انبیاء کرام کا یہ طریقِ کار ہی نہ تھا، مولانا اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔ "اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان (انبیاء کرام) کی جدوجہد کی کامیابی سے اللہ کے دین اور دین کے لئے کام کرنے والوں کو دُنیا میں بھی غلبہ اور تفوق حاصل ہوتا ہے، لیکن وہ اس بات کی دعوت کبھی نہیں دیتے کہ آؤ حکومتِ الٰہیہ قائم کرو، یا اقتدار حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرو"۔ (میثاق نومبر ۱۹۶۰ء)

جب "حکومتِ الٰہیہ" کا قیام جماعت کا شروع ہی سے نصب العین رہا ہے، تو وہ اپنے مقصد اور نصب العین سے منحرف کہاں ہوئی! اس کو منحرف اور گمراہ کہنا، کس قدر خلافِ واقعہ ہے، ان دونوں بزرگوں کو دراصل کہنا یوں چاہیئے تھا کہ جماعت کا نصب العین شروع ہی سے غلط تھا اور ہم برسوں اس غلطی میں مبتلا رہے ہیں، اور ہم نے انبیاء کرام کے طریقِ کار کی خلاف ورزی کی ہے، اور اب جماعت سے الگ ہوکر تائب ہو گئے ہیں اور اب سے ہم "دین" کے ساتھ سیاست، حکومت اور نظام و اقتدار کا نام بھی زبان پر نہ لائیں گے.....!!

۱۹۵۶ء میں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کا یہ نظریہ تھا:۔

"ائمہ حدیث، فقہا اور متکلمین نے اسلامی نظام قائم کرنے کی جدوجہد کو دین کے اساسی اور بنیادی تقاضوں میں شمار کیا ہے، علم، عقائد اور کلام کی معتمد علیہ کتب میں "نصبِ امام عادل" کو ضروریاتِ دین میں بیان کیا گیا ہے..." (ص ۱۱۰ - کیا جماعتِ اسلامی حق پر ہے؟)

جس چیز کو حکیم صاحب نے "دین کا بنیادی تقاضا" اور "من جملہ ضروریات دین" کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اب وہ کتاب و سُنّت کی کس دلیل سے اُس کی تردید فرما رہے ہیں؟

"......علاوہ ازیں گزشتہ آٹھ سال میں پاکستان میں جماعتِ اسلامی نے اسلامی نظام کی جدوجہد میں جو تفصیلی تصورِ اسلام پیش کیا ہے بعینہ وہی ہے

جس کی تائید کتاب و سنّت سے ہوتی ہے، اور جس پر پاکستان کے تمام فرقوں کے علماء متفق و متحد ہو چکے ہیں (کیا جماعت حق پر ہے؟ صفحہ ۱۲۹)

۱۹۵۶ء تک "جماعت" کی جدوجہد کو حکیم صاحب بعینہ تصور اسلام کے مطابق بتاتے ہیں، انھیں اس جدوجہد میں خیر ہی خیر اور دین ہی دین نظر آتا ہے۔ مگر ڈیڑھ دو سال کے بعد جب وہ جماعت سے خفا ہو کر، علیحدہ ہو جاتے ہیں، تو جماعت کا یہ خیر ان کی نگاہ میں شر سے بدل جاتا ہے! آخر ڈیڑھ دو سال کی مدت میں وہ کونسا انقلاب جماعت میں رونما ہو گیا جس کو شر، گمراہی اور "انحراف" کہا جا سکے؟ ۱۹۵۶ء کے بعد بھی جماعت کا وہی نصب العین رہا، جو آغاز میں تھا، امیرِ جماعت نے تقسیمِ ہند سے پہلے بھی ارکان جماعت کے اجتماعِ عام میں اس کا اعلان کر دیا تھا:۔

> "اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا، ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا، اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا، پہلے حصہ میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔"

اور پھر

جب جماعت کے خلاف مسکوٹیں ہونے لگیں، اور بڑی معصومیت کے ساتھ ہمدردی کے لہجہ میں "جماعت" کو طنز و اعتراض کا نشانہ بنایا جانے لگا، تو اس وقت "مجلسِ شوریٰ" نے یہ تجویز منظور کی کہ "جماعت" اپنے اصول و مقصد سے منحرف نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعت کی جدوجہد اور پروگرام اور تنظیم میں اصل نصب العین سے کوئی "انحراف" واقع نہیں ہوا، یہ "انحراف" جماعت سے بعض روٹھ جانے والوں کے دماغ کی پیداوار ہے! سعید ملک صاحب نے جماعت سے علیحدگی کے وقت پریس کانفرنس کے ذریعہ جس "ذہنیت" کا مظاہرہ فرمایا تھا، اس کی بازگشت "میثاق" اور "المنبر" سے سنائی دے رہی ہے! اور ہم جیسے خوش فہموں کے "حسنِ ظن" پر ایک قیامت برپا ہے۔

پہلے اور اب!

مولانا اصلاحی صاحب کی تحریروں کے اگر صرف "تضاد" ہی کو پیش کیا جائے، تو ایک اچھی خاصی کتاب مرتب ہو سکتی ہے، یہ ان کی اتنی بڑی کمزوری ہے، جس کی وہ جتنی بھی تاویل کریں گے، اسی قدر اور الجھتے اور اس مخمصے میں پھنستے چلے جائیں گے .... اکتوبر کے میثاق میں مولانا لکھتے ہیں:۔

> "دوسری چیز جو حضرات انبیاء کرام کے طریقہ کو دوسروں کے طریقہ سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ انبیاء سیاسی اقتدار کے حصول پر اصلاحِ معاشرہ کے کام کو منحصر قرار نہیں دیتے بلکہ معاشرہ کی اصلاح کو نظامِ سیاسی کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں ....." (ص ۳۲)

اور

> "تیسرا مغالطہ یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر اقتدار پر قبضہ کر کے برائی پھیلانے والے طاقتور ہاتھوں کو معطل نہ کر دیا جائے، تو بھلائی کے پھیلانے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ ہمارے نزدیک یہ بات بھی صحیح نہیں ہے، کسی معاشرے میں برائی پھیلنے کی اصلی وجہ یہ نہیں ہوتی

ہے کہ برائی پھیلانے والے ہاتھ بڑے زوردار اور مؤثر ہیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہوا کرتی ہے
کہ ان برائیوں سے آگاہ کرنے والے یا تو موجود ہی نہیں ہوتے، یا موجود تو ہوتے ہیں لیکن
ان میں اخلاص، دل سوزی، دردمندی اور عزیمت نہیں ہوتی..... (ص ک)

اس کے بعد

مولانا اصلاحی نے ماہ دسمبر ۶۵ء کے "میثاق" میں جو اداریہ تحریر فرمایا ہے، اُس کا ہدف "جماعت" ہی کو بنایا گیا ہے، اور طنز و تشنیع کے ترکش کے ترکش خالی کر دیئے ہیں۔ ع

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

مولانا موصوف کے اس نئے "دینی موقف" اور اس قسم کی تحریروں کی "داد" قادیانیوں کے مشہور اخبار "الفضل" نے جو دی ہے اُس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

"ایک وقت تک مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، مودودی صاحب کے نظریہ اسلام کے پُرزور حامی رہے، اور قول و فعل سے اسی نظریہ کی تائید کرتے رہے، تا آنکہ ان کی طبیعت میں ایک عظیم انقلاب آیا، جس کی وجوہات میں ہمیں جانے کی ضرورت نہیں، بہرحال یہ نیا انقلاب جو آپ کی طبیعت میں پیدا ہوا ہے، بہتر انقلاب ہے، اور آپ مودودی صاحب کے سیاسی نظریہ کے جہاں بڑے موید تھے، اب اس کے بالکل متضاد، آپ اُس کے ہادم بن گئے ہیں، ہم اُن کا ایک تازہ مضمون جو انہوں نے اپنے رسالہ میثاق میں شائع کیا ہے، اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ نقل کرتے ہیں، بہت خفیف تغیر کے ساتھ یہ مضمون اسی تصور اسلام کو پیش کرتا ہے، جو تصور احمدیت نے پیش کیا ہے۔

آپ الفضل کی اسی اشاعت میں مولانا امین احسن کا مکمل مضمون ملاحظہ فرمائیں ذرا سے تغیر سے یہ ایک ایسا مضمون ہے، جو محسوس ہوگا کہ کسی احمدی کا لکھا ہوا ہے، اس مضمون میں قریب قریب وہی تصور پیش کیا گیا ہے، جس کو سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے شروع ہی سے مسلمانوں کے سامنے پیش فرمایا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے احمدیت کے تصور ہی کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے، یہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے، جو مولانا کی طبیعت میں پیدا ہوا ہے، اور ہمیں خوشی ہے کہ آپ اس سحر کے دام سے نکل آئے، جو سیاسی اسلام کی صورت میں مودودی صاحب نے پھیلایا تھا

"..... ہمیں صرف اس رائے سے غرض ہے، جو انقلاب طبعی کے بعد آپ نے تصورِ اسلام کے متعلق ظاہر کی ہے، چوں کہ یہ رائے احمدیت کے تصورِ اسلام سے قریب ہے۔"

— فاعتبروا یا اولی الابصار —

اب ہم مولانا امین احسن اصلاحی کی گزشتہ تحریروں کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں کہ حضرات والا کے جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت سے پہلے کیا تصورات، خیالات اور معتقدات تھے:-

"اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک کی حکومت اسلامی حکومت نہیں بن سکتی، جب تک اس ملک کے جمہور کی زندگیاں اسلامی سانچے میں نہ ڈھلیں گی، لیکن اس ملک کے جمہور کو مسلمان بنانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ تنہا جمہور ہی پر ہے، یا اس میں اس ملک کی حکومت کا بھی کچھ حصہ ہے، جو اس کو ادا کرنا ہے (تنقیدات، ص ۱۱۳)

"ڈاکٹر صاحب اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوسکتے کہ عوام کو یہ مشورہ دینا کہ وہ مسلمان نہیں، درآنحالیکہ اقتدار کی پوری مشینری ان کو مسلمان بننے میں مدد دینے کے بجائے ان کو کسی اور سمت ہانک رہی ہو، کوئی نتیجہ خیز مشورہ نہیں ہے۔" (تنقیدات... ص ۱۱۴)

"اخوان المسلمون کا تصورِ اسلام، خدا کے فضل سے مولویانہ و صوفیانہ نہیں ہے، وہ اسلام کو بہ حیثیت ایک ہمہ گیر نظامِ حیات کے پیش رکھتے ہیں۔...... وہ اپنے ملک کے تمام سیاسی مطالبات میں بھی پیش پیش ہیں...... نہایت ہی غلط بتایا ہے جس نے مولانا (محمد منظور نعمانی) کو یہ بتایا ہے کہ اخوان المسلمون کلمہ کے ہجے اور اکرامِ مسلم کا وعظ کرتے پھر رہے ہیں..." (تنقیدات — ص ۲۸۷)

"...... "محمد غوث" جیسے نالوں پر مورچے قائم کرنے والوں اور مُردہ خداؤں کی نذروں اور منتوں پر تکفیر کرنے والوں کی تو کمی نہیں تھی، البتہ زندہ خداؤں اور با اقتدار طاغوتوں اور آکی بندگی کو شرک قرار دینے کی نہ صرف یہ کہ جرأت لوگوں میں مفقود تھی، بلکہ اس کے شرک ہونے کا تصور بھی مسلمانوں میں مُردہ ہوچکا تھا ہم اس وقت یہی کام کر رہے ہیں، اور اس کی تفہیم کے لئے ہم جو چیز مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس کا اثر انشاء اللہ یہ ہوگا کہ شرک اپنی تمام جلی و خفی قسموں اور اپنے تمام اشباہ و قوالب کے ساتھ ختم ہوجائے گا۔
(توضیحات ص ۲۶۴)

یہ چند اقتباسات تو "مشتے از خروارے" ہیں، ورنہ مولانا امین احسن اصلاحی کی پچھلی تحریروں سے صفحے کے صفحے اس مضمون کے پیش کئے

علہ مولانا اصلاحی کی دونوں کتابیں (تنقیدات اور توضیحات) ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء کی چھپی ہوئی ہیں۔

جاسکتے ہیں کہ انھوں نے سیاست کو، حکومت کو، اسلامی نظام کے قیام کو، دین کی بہت بڑی ضرورت سمجھا ہے، ان اپنے گزشتہ معتقدات کی بناہی پر، مولانا موصوف نے "اخوان المسلمون" کی سیاسی جدوجہد کو سراہا ہے اور مولانا محمد منظور نعمانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اخوان المسلمون کا تصور اسلام خدا کے فضل سے مولویانہ وصوفیانہ نہیں ہے۔"

"دوسری عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے شاید مسیحی مشنریوں کی دیکھا دیکھی ہمیشہ تبلیغ کے لئے پست حال طبقوں ہی پر نظر رکھی، حالانکہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ تبلیغ میں اول خطاب ان طبقات سے ہونا چاہیئے۔ جن کے افکار و نظریات کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہے، یہی لوگ دراصل کسی قوم کو بناتے یا بگاڑتے ہیں، اگر یہ راہ راست پر آجائیں تو سارا نظام آپ سے آپ راہ راست پر آجاتا ہے (دعوتِ دین ۔ ص۳۳)

"ہنگامی اور انقلابی تحریکیں تو نیچے سے چل کر اوپر کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتی ہیں لیکن ٹھوس اصلاحی اور عقلی دعوتیں اسی وقت جڑ پکڑا کرتی ہیں، جب اوپر سے نیچے کی طرف اثر انداز ہوں..... حضرات انبیاء کرام نے جیسا آگے چل کر تفصیل سے معلوم ہوگا کبھی عام لوگوں کو پہلے خطاب نہیں فرمایا بلکہ سوسائٹی کے کارفرما عناصر کی ذہنیتوں کو تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی۔ (دعوتِ دین ۔ ص۲۳، ص۲۴)

اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبک دوش ہونے کے لئے دو ہی راہیں ہیں مسلمانوں کے لئے باقی رہ گئی ہیں، یا تو اس ادارہ (خلافت) کو قائم کریں، یا کم از کم اس کو قائم کرنے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگادیں۔" (دعوتِ دین ص۵)

"انبیاء کرام (علیہم السلام) سب سے پہلے قوم کے ارباب اثر کو مخاطب کرتے ہیں، اور اُن کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں..... (دعوتِ دین، ص۵۳)

"انبیاء کرام نے تبلیغ کے جو طریقے اختیار کئے ہیں، وہ ان کے زمانوں کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ اور ترقی یافتہ طریقے تھے، اور یہ طریقے حالات کے تغیر اور تمدنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے بھی رہے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملہ میں کسی ایک ہی طریق پر اصرار صحیح نہیں ہے بلکہ داعیانِ حق کو چاہیئے کہ وہ ہر زمانہ میں تبلیغ و تعلیم کے لئے وہ طریقے اختیار کریں، جو اُن کے زمانوں میں پیدا ہو چکے ہیں۔" (دعوتِ دین ۔ ص۹۶)

"پہلا مرحلہ دعوت کا مرحلہ ہے، ابتدا میں دعوت کا خطاب جس طبقہ کی طرف ہوتا ہے، وہ اربابِ اقتدار کا طبقہ ہے..." (دعوتِ دین ۔ ص۲۵۸)

جماعت سے جب مولانا موصوف ۱۹۵۸ء میں علیحدہ ہوئے ہیں، تو انھوں نے جماعت کی اُس وقت کی پالیسی، دستور اور نظام

(آرگنائزیشن) اور مولانا مودودی کے چند اقدامات سے عدم اتفاق کے سبب اپنا استعفا پیش فرمایا تھا۔ انھوں نے جماعت سے علیحدہ ہوتے وقت بھی اس کا اظہار نہیں فرمایا کہ جماعت جو حکومت وسیاست کو دین میں شامل سمجھتی ہے، یہ نصب العین ہی سرے سے غلط ہے۔۔۔۔۔۔تین سال پہلے مولانا اصلاحی اسی طرح عالمِ دین تھے، جس طرح آج ہیں، کتاب و سنّت اور فقہ وتاریخ سے بھی وہ اُس وقت باخبر تھے، حیرت ہے کہ اُس وقت تک اُن کی نگاہ میں "حکومتِ الٰہیہ" کا قیام انبیاء کرام کے طریق کار سے مختلف نظر نہیں آیا، اُن کی نگاہ سے آخر یہ پردہ کس نے اُٹھادیا، جو وہ اب کہہ رہے ہیں کہ انبیاء کرام "حکومتِ الٰہیہ" کی سرے سے دعوت ہی نہیں دیتے! مولانا موصوف نے جماعت اور مولانا مودودی کی جس تدریج کے ساتھ مخالفت کی ہے اور غصہ کا پارہ درجہ بدرجہ جس طرح اونچا ہوتا چلا گیا ہے، اُسی کا یہ ظہور ہے کہ مولانا اصلاحی مخالفت کی اس سطح پر آگئے ہیں، جہاں وہ اپنے گزشتہ موقف اور پچھلی کہی ہوئی باتوں کی "مجسم تردید" "سراپا نفی" اور ضد بن کر رہ گئے ہیں، یہاں تک کہ دین، معاشرہ اور حکومت واقتدار کے بارے میں مولانا اصلاحی صاحب کے جدید ترین موقف کو دیکھ کر، قادیانیوں کا آرگن "الفضل" فرطِ مسرت سے بے اختیار ہوکر پکار اُٹھا کہ جس سیاسی نظریہ کے مولانا اصلاحی مؤید تھے، اب اُسی کو مُنہدم فرمارہے ہیں، اور اُن کے اندر جو یہ انقلاب پیدا ہوا ہے، وہ بہتر انقلاب ہے، اور اب اسلام کے بارے میں مولانا اصلاحی صاحب جو تصور رکھتے ہیں، وہ احمدیت کے تصورِ اسلام سے قریب ہے! کیا کسی کی ضد اور مخالفت میں اتنے اونچے درجہ کے آدمی بھی اتنے نادان بن جایا کرتے ہیں کہ اپنے برسوں کے سوچے سمجھے ہوئے معتقدات اور نظریوں کو ڈھا کر رکھ دیں حریفوں کو خوش ہونے اور بغلیں بجانے کا موقعہ مہیا کردیں اور دوستوں اور ساتھیوں کے دلوں پر آرے چلادیں۔

خفگی سے پہلے اور خفگی کے بعد

مولانا مودودی کو جو سپاسنامے دیئے جاتے تھے، اُن کا استقبال ہوتا تھا۔ اور اُس کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی تھیں، اسی قسم کی اور دوسری باتوں پر مولانا اصلاحی صاحب آج طنز فرمارہے ہیں، حالانکہ اب سے چند سال پہلے راقم الحروف ہی نے اُن سے سپاسناموں اور خیر مقدم کے گلدستوں اور ہاروں کے بارے میں دریافت فرمایا تھا، تو اس وقت انھوں نے جواب دیا تھا، وہ جولائی ۱۹۵۵ء کے "فاران" میں موجود ہے، مولانا موصوف لکھتے ہیں :—

"اسلامی نقطۂ نظر سے کسی شخص کی خدمت میں پھولوں اور خوشبو کا تحفہ ایک بہترین تحفہ ہے۔ اس بات میں بھی خرابی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا کہ کسی شخص کی خدمت میں یہ تحفے (گلدستے اور ہار) اس کے استقبال کے موقعہ پر پیش کئے جائیں۔ آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں کسی کے استقبال کے موقعہ پر پھولوں کے ہار نثار کرنے یا ہار پہنانے کے رواج کا ہمیں علم نہیں ہے، لیکن اس وجہ سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ چیز شریعت میں ناجائز یا ناپسندیدہ تھی۔"

دوسرا سوال

"آپ نے سپاسنامے سے متعلق کیا ہے، اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اگر اس سے مقصود محض کسی امیر کبیر کی مداحی ہو تو شریعت میں اس کے جواز کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اگر مقصود یہ ہو کہ کسی کے سامنے اپنے مطالبات یا اپنے مقاصد یا اپنے خدمات اجتماعی طور پر پیش کئے جائیں

اور اس کا ردِ عمل بھی پبلک طور پر معلوم کیا جائے، تو یہ ایک تمدنی اجتماعی سیاسی ضرورت ہے، اور میں اس کو جائز سمجھتا ہوں .... عالی ظرف اور اولو العزم لوگوں کی واقعی خدمات کے اعتراف میں کوئی ہرج نہیں ہے، اس سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ وہ فتنہ میں پڑ جائیں گے ...."

یہ ہے مولانا اصلاحی صاحب کی طبیعت کا رنگ کہ جب وہ مولانا مودودی سے خوش تھے، تو مولانا موصوف کے خیر مقدم کی تقریبیں، سپاسنامے، ہار پھول، گلدستے: یہ سب باتیں اُن کی نگاہ میں جائز و مستحسن تھیں اور اُن میں نفس کے لئے فتنہ کا کوئی پہلو بھی اُنہیں محسوس نہ ہوتا تھا، مگر اب جب وہ مودودی صاحب سے خفا ہو گئے ہیں، مولانا مودودی کی تقریروں میں بھی انھیں "نفس کا چٹخارہ" دکھائی دیتا ہے۔

جماعت کے بعض اہلِ قلم اور خاص طور سے مولانا مودودی دین کے لئے "تحریک"[1] کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں، اس پر بھی مولانا اصلاحی صاحب نے نومبر ۱۹۶۰ء کے "میثاق" میں طنز کی ہے، لکھتے ہیں :-

"اس کے بالکل برعکس معاملہ اہلِ سیاست کا ہے، اہلِ سیاست خدا کا دین قائم نہیں کرتے بلکہ تحریک چلاتے ہیں، اگر وہ دین کا نام لیتے بھی ہیں، وہ دین بھی ان کی تحریک کا ایک جزو ہوتا ہے، اس وجہ سے جس جس وادی میں ان کی ان تحریک کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ ان ساری وادیوں میں ان کا دین بھی بھٹکتا پھرتا ہے ---   (ص ۳)

لیکن

یکم دسمبر ۱۹۵۵ء کے "المنیر" لائل پور میں انھی مولانا اصلاحی صاحب کا ایک مقالہ "تحریکِ اسلامی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

"دُنیا میں تحریک اسلامی کی تاریخ اُتنی ہی قدیم ہے، جتنی قدیم خود بنی نوع انسان کی تاریخ ہے جب سے انسان اس سرزمین پر موجود ہے، اس وقت سے یہ تحریک بھی موجود ہے، اور جب تک اس کرۂ ارضی پر موجود رہے گا، اس وقت تک یہ تحریک بھی موجود رہے گی، قرآنِ مجید نے اس تحریک کی جو تاریخ بیان کی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے پہلے قائد خود حضرت آدم علیہ السلام تھے، جن سے نسلِ انسانی کا سلسلہ چلا ہے، پھر قرآن ہی سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ انسانی کے ہر دور میں نسلِ آدم کے اندر ایسے انبیاء و مصلحین اُٹھتے رہے ہیں جو اس تحریک کی قیادت کرتے رہے ہیں ....."

[1] اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت کا اجتماع ہوا تھا، اُس میں مقصدِ سعی یہ بیان کیا گیا تھا .... "دین کو ایک تحریک کی صورت میں جاری کیا جائے اور اُس کی تشریح یہ کی گئی تھی ——— "ہماری زندگی میں دینداری محض ایک انفرادی رویے کی صورت میں جامد و ساکن ہو کر نہ رہ جائے، بلکہ ہم اجتماعی صورت میں نظامِ دینی کو عملاً نافذ و قائم کرنے اور مانع و مزاحم طاقتوں کو اس کے راستے سے ہٹانے کے لئے بھی جد و جہد کریں   (تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل ص ۴۳)

ان چند سطروں میں مولانا اصلاحی صاحب نے دین اور اسلام کی جگہ "تحریک" کا لفظ چھ بار استعمال کیا ہے...... یہ مضمون اس جملہ پر ختم ہوتا ہے :-

"......... اور انشاء اللہ تحریکِ اسلامی ان منازل کو عبور کرتی ہوئی، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہے گی۔"

اب سے چند سال پہلے "تحریک" کا لفظ مولانا اصلاحی صاحب کی نگاہ میں پسندیدہ تھا، اس میں انھیں ذرہ برابر کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہ آتی تھی، مگر اب جماعت اور مولانا مودودی کے خفا ہونے کے بعد، یہ لفظ (تحریک) اُن کی نگاہ میں انتہائی ناپسندیدہ ہو گیا ہے اور اس لفظ (تحریک) کی آڑ لے کر، انھوں نے مولانا مودودی پر "اہلِ سیاست" کی پھبتی چست کی ہے، اور ان کی دینی جدوجہد کو "بھٹکنے" اور "ٹھوکریں" کھانے سے تشبیہ دی ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب نے نومبر ۱۹۶۰ء کے "میثاق" میں "جماعت" اور مولانا مودودی کا نام نہیں لیا، مگر ان کے طنز و تشنیع کا ہدف جماعت اور مودودی صاحب کی ذات ہی ہے، انھوں نے اس پر خوب خوب طنز کی ہے کہ جماعت اپنے جلسہ جلوسوں اور رہنماؤں کے استقبال وغیرہ کی خبریں مبالغہ کے ساتھ شائع کرتی تھی۔

اس احتساب و گرفت کو

ذہن میں رکھ کر، مولانا اصلاحی صاحب کی لکھی ہوئی یہ عبارت پڑھیے :-

"کیا اس کا یہ اثر نہیں ہو سکتا کہ نئی نسل کے ہزاروں لاکھوں تعلیم یافتہ جو مولانا مودودی کی مذہبی و علمی عظمت کے معترف ہیں، اس فتنہ کے زمانہ میں مودودی صاحب سے بدگمان ہو جانے کے بجائے خود حدیث ہی سے بدگمان ہو جائیں کہ جب اتنا بڑا عالم جس کی عرب و عجم میں دھوم ہے"

(توضیحات، ص ۱۱۲)

یہ عبارت یہ دکھلانے کے لئے نقل کی گئی ہے کہ جماعت میں اگر کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے تھے، جو جماعت اور اس کے قائدین کے معاملہ میں مبالغہ سے کام لیتے تھے، تو اس "مبالغہ آمیزی" کی طرح مولانا اصلاحی کی ڈالی ہوئی ہے!

فرض کر لیجئے مولانا اصلاحی صاحب جب تک جماعت میں رہے ارکانِ جماعت کی بعض کمزوریوں کی پرچھائیں اُن پر بھی پڑتی رہی، "خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلا ہی کرتا ہے"، مگر جماعت سے باہر آجانے کے بعد، تو انھیں اپنی کمزوریوں کا احساس ہونا چاہیئے تھا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی اُن کی طبیعت کا وہی رنگ ہے! یہ بات ہم نے یوں ہی نہیں کہہ دی، اس کے لئے قابلِ اعتماد ثبوت ہمارے پاس موجود ہے!

ماہ اپریل ۱۹۶۰ء میں آئین کمیشن کے سوالنامہ کا جواب مرتب کرنے کے لئے لاہور میں علماء کا ایک کنونشن منعقد ہوا تھا جس میں مولانا اصلاحی صاحب بھی شریک ہوئے تھے، مولانا موصوف کے کہنے کے مطابق اس کنونشن کے مرتبہ "جواب نامہ" کے بیشتر حصہ سے انہیں اتفاق نہیں تھا، اس لئے انھوں نے اُس پر دستخط نہیں کئے اور آئین کمیشن کے سوالات کے جوابات خود مرتب فرما کر، کمیشن کو بھیج دیئے، اور جون ۱۹۶۰ء کے "میثاق" میں اُن کو اپنے نوٹ کے ساتھ شائع بھی فرما دیا، اُن کے اس "نوٹ" کے آخری جملے یہ تھے :-

"اور اس قسم کے عدمِ اتفاق کا اظہار کرنے والا تنہا میں ہی نہیں تھا۔ بلکہ اور بھی ذی فہم اور ذی علم حضرات تھے، لیکن شہرت صرف میرے اختلاف کو دی گئی، تاکہ اس خانہ ساز اجماع سے

اختلاف کرنے کے جرم میں قوم کے سامنے مجھے گردن زدنی ٹھیرایا جائے"۔

جس طرح "سیاست باز" اپنے مخالف جلسوں، کمیٹیوں اور اجتماعات کی روداد کو غیر اہم بناکر، گھٹاکر اور رنگ آمیزی کر کے چھاپا کرتے ہیں، مولانا اصلاحی جیسے صاحبِ تقویٰ عالمِ دین نے بھی یہی انداز اختیار فرمایا ہے، جس کی ان سے ہمیں کسی طرح توقع ہی نہ تھی...... اس "نوٹ" میں "ذی فہم وذی علم حضرات" پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علماء کے اس کنونشن میں "جواب نامہ" سے اختلاف کرنے والوں کی ایسی تعداد ہوگی جسے قابلِ لحاظ سمجھا جاسکتا ہے، حالانکہ مولانا اصلاحی صاحب کے علاوہ صرف دو صاحبوں نے اختلاف کیا، مولانا نے "دو" (۲) کی تعداد کے لئے جس صحافتی انداز سے "حضرات" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، وہ کس قدر مغالطہ آمیز ہے! پھر ان دو اختلاف کرنے والوں کے "علم وفہم" کا جو مولانا نے اعتراف اور اظہار فرمایا ہے، وہ بھی مغالطہ سے خالی نہیں ہے، مولانا موصوف کی اس تحریر میں سب سے زیادہ غلط بات "خانہ ساز اجماع" کی طنز ہے، جس سے مولانا کے مزاج اور طبیعت اپنے اصل رنگ میں سامنے آجاتے ہیں یہ کہ جب وہ کسی سے خفا ہوتے ہیں، تو جھنجلا جاتے ہیں اور جھنجلاہٹ کے عالم میں اُن کے زبان وقلم حدِ اعتدال میں رہ ہی نہیں سکتے، افراط وتفریط اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے!

اس کنونشن میں ہر مکتبۂ فکر وخیال کے چوٹی کے علماء شریک ہوئے تھے، اگر اس کنونشن کو پاکستان کے علماء کا "نمائندہ اجتماع" کہا جائے۔ تو شاید مبالغہ نہ ہو! ان علمائے متفق ہوکر، جو باتیں طے فرمائی تھیں، اُن کو ——— خانہ ساز اجماع ——— کہنا کتنی خلافِ واقعہ طنز اور گری ہوئی پھبتی ہے!

یہ تو اس تصویر کا ایک رُخ ہے، اس کا دوسرا رُخ بلکہ یوں کہیئے اصل رُخ یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت کو اس کنونشن میں قدرے نمایاں دیکھ کر، مولانا اصلاحی صاحب اپنے غیظ وغضب کو نہ چھپا سکے، اور جو کچھ اُن کے دل میں تھا وہ باہر آگیا۔ اس کنونشن میں اصلاحی صاحب نے اپنے مزاج وافتادِ طبع کا جو مظاہرہ فرمایا، اس سے علماء کرام کو اس کا اندازہ تو کم سے کم ہوگیا ہوگا کہ اس مزاج اور طبیعت کے انسان کو جماعت والوں نے اتنے دن تک آخر کس طرح نباہا؟

دیگراں را نصیحت.....!!

"توضیحات" میں مولانا اصلاحی نے تحریر فرمایا ہے:۔

"کسی کی مخالفت میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کا ہوش وخرد اور شرمِ دُنیا اور خوفِ آخرت سے انتا بے پروا ہو جانا۔ ایک بڑا ہی دل شکن اور نہایت ہی درد انگیز سانحہ ہے"۔ (ص ۱۱۲)

"تیسری شکایت کے جواب میں گزارش ہے کہ اس معاملہ میں حقیقت سے زیادہ ہمارے مخالفین کے احساسِ کہتری کو دخل ہے"۔

"صاحبِ تحریر بزرگ سے گزارش ہے کہ وہ اپنے حلقے کے لوگوں کے بارے میں جس حُسنِ ظن سے کام لینے کے عادی ہیں، اگر اُس کے دسویں حصہ حُسنِ ظن سے بھی اس معاملہ میں کام لیتے تو ایک مسلمان کے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا نہ ہوتے۔ (ص ۱۷۵)

"جو طعنے آج مولانا صاحب، جماعتِ اسلامی کے خادموں کو سُنا رہے ہیں، بعینہٖ یہی طعنے کم وبیش انہی الفاظ میں اُن لوگوں کو سُنائے گئے تھے، جنھوں نے اگلے زمانوں میں نبیوں اور رسولوں کا ساتھ دیا تھا۔ (ص ۱۷۷)

اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے

اپنی کتاب (کیا جماعت اسلامی حق پر ہے) میں لکھا ہے:۔

"اس آیت شریفہ میں غلط کار اہل علم کی نشاندہی کی گئی ہے، کہ انھوں نے اپنے اختلافات کو اوپر بیان کی گئی، حدتک محدود نہیں رکھا، اور نہ ہی وہ اظہار اختلاف کے بعد اقامت دین کے فریضہ میں متحد و متفق رہے، اور نہ ہی آپس میں گروہ بندی اور پارٹی بازی کی شکل اختیار کرنے سے باز رہے، بلکہ انھوں نے ان اختلافات کو "حسد و بغض" کے جذبات برانگیختہ کرنے کا ذریعہ بنایا، اور وہ ایک دوسرے کے بالمقابل متحارب گروہوں کی شکل اختیار کر گئے، قرآن مجید اس کیفیت کی بار بار مذمت کرتا اور اہل علم کو اس کے نقصانات سے آگاہ کرتا ہے۔۔۔!

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الاغلوطات (ابوداؤد)

ترجمہ:۔ حضورؐ نے مغالطہ دہی سے منع فرمایا۔

ان ہر دو احادیث میں علمی مباحث (جن میں تنقید بھی شامل ہے) کی حدود متعین کردی گئی ہیں، اگر اختلاف رائے سے مقصود حق کی حمایت ہو تو ناگزیر ہے کہ تذلیل و توہین اور اشتعال انگیزی اور مغالطہ دہی" اور اظہار بغض و عناد کی روش اختیار نہ کی جائے (ص۱۲۰-۱۲۱)

"اشتعال انگیزی اور الزام تراشی سے نہ آج تک ملت اسلامیہ کو فائدہ پہنچا ہے نہ آئندہ ممکن ہے، اس کی جگہ یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو شخص جس کی بات کو غلط سمجھتا ہے، دینی خیر خواہی کے طور پر اُسے سمجھاوے، اور پھر اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے۔ (ص ۲۴۳)

مولانا اصلاحی اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے جماعت اور مولانا مودودی کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کے بجائے خود اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ جب تک ان کو پوری طرح رُسوا اور ذلیل نہ کریں گے، آرام سے نہ بیٹھیں گے! ہمارے یہ دونوں قابل احترام بزرگ اپنی تحریروں کو غور سے پڑھیں اور پھر اپنے دلوں کا جائزہ لیں کہ وہ اختلاف کی کس حد پر کھڑے ہیں؟ اور اُن کا کیا موقف ہے؟

اکتوبر ۱۹۶۰ء کے میثاق میں مولانا اصلاحی رقمطراز ہیں:۔

"انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کار کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی مخالفت و موافقت جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ للہ و فی اللہ ہوتی ہے، وہ حق کے ساتھی ہیں، خواہ وہ اُن کے دُشمن ہی کے اندر پایا جائے، اور باطل کے وہ مخالف ہوتے ہیں اگرچہ وہ اُن کے کسی ہوا خواہ کے اندر ہی کیوں نہ پایا جائے۔۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے مخالف کی خوبیوں کا اسی فیاضی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں، جس فیاضی کے ساتھ اپنے موافق کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔۔۔۔ (ص۸)

مولانا اصلاحی صاحب ٹھنڈے دل سے سوچیں، کہ مولانا مودودی کے بارے میں اُن کا کیا رویہ ہے؟؟

—اور یہ تو—

_____ علم واخلاق کا ایک "اعجوبہ" ہے کہ جب مولانا اصلاحی صاحب جماعت میں شریک تھے، اور جماعت کی جو پالیسی اور نظریات تھے، اُن کی مطابقت کے لئے بھی وہ انبیاء کرام ہی کے طریقِ کار کو مثال میں پیش فرماتے تھے، اور اب اُس پالیسی اور نظریوں کی تردید کرتے ہوئے بھی "انبیاء کرام" ہی کے طریقِ کار سے دلیلیں لاتے ہیں! کیا انبیاء کا طریقِ کار اس قدر لچکدار ہوتا ہے.. کہ

شب موم کرلیا، سحر آہن بنا دیا

"انبیاء کرام کے طریقِ کار" سے نیچے اُتر کر، مولانا موصوف کم ہی بات کرتے ہیں!

ہم نے کئی بار جماعت اور خاص طور سے مولانا مودودی کی ذات سے اختلاف کو "دشمنی اور عداوت" سے تعبیر کیا ہے، ممکن ہے کہ بعض حضرات کو ان لفظوں میں شدت محسوس ہو کہ ہم نے جذبات سے مغلوب ہو کر، ایسی باتیں لکھ دی ہیں! مگر آگے چل کر ان دونوں بزرگوں کی تحریروں کے جو اقتباسات ہم دے رہے ہیں، اُنہیں پڑھ کر، حقیقتِ حال سامنے آجائے گی کہ ہم نے اس قسم کے لفظ استعمال کر کے، کوئی زیادتی نہیں کی۔

جون ۱۹۶۰ء کے "میثاق" میں مولانا اصلاحی صاحب نے آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جو جوابات دیئے ہیں اور علماء کے کنونشن سے اپنے اختلاف کا بھی اظہار فرمایا ہے، اس کا ایک ذیلی نوٹ ہے:-

"ہم ان لوگوں کے نقطۂ نظر کو صحیح نہیں سمجھتے جو آج ہماری قوم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس ملک میں اقتدار کبھی قوم کی طرف منتقل ہی نہیں ہوا، بلکہ اس کو بالا بالا کچھ غاصبین اُچک لیتے رہے ہیں، اور اب بھی اسی طرح کے غاصبین ہی ہیں جو اس اقتدار کو غصب کئے ہوئے ہیں۔ (ص ۶)

اور

۸ر جولائی ۱۹۶۰ء کے "المنبر" میں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے لکھا:-

"بزمِ طلوعِ اسلام کی ان سرگرمیوں سے متاثر ہو کر ایک نیم سیاسی اور نیم دینی جماعت کے کارکنوں نے بھی سیاسی فائدہ اُٹھانے کی مقدور بھر کوشش کی، اور غالباً اپنے قائد کے اس خواب کی تعبیر کی جھلک بھی دیکھی کہ مارشل لار کی حکومت دیوارِ یتیم کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے بعد اقتدار اس جماعت کے سپرد ہونے والا ہے"

مولانا اصلاحی صاحب اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے مارشل لار حکومت کو جماعت اور مولانا مودودی کے بارے میں جو باتیں سُجھائی ہیں، وہ کتنی خوفناک اور بغض و عداوت کا کس قدر مکروہ نمونہ ہیں، آہ وہ "معصوم سفاک" جو مخبروں اور جاسوسوں سے زیادہ مُفسدانہ پارٹ انجام دیں، اور پھر بھی اپنے کو "مظلوم" ہی سمجھتے رہیں اور اس غلط فہمی کا شکار رہیں کہ یہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، انبیاء کرام کے طریقِ کار کے عین مطابق کر رہے ہیں۔

دسمبر ۱۹۶۰ء کے "میثاق" میں مولانا اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:-

"اگر ان حضرات کو انبیاء کے طریقہ کا علم ہوتا (فاران:- جب آپ ان حضرات سے خوش تھے اُس وقت ان حضرات کو انبیاء کرام کے طریقہ کا بے شک علم تھا مگر آپ کے خفا ہوتے ہی ان سے انبیاء کے طریقہ کا علم سلب کر لیا گیا۔ انبیاء کے طریقہ کو تو اب آپ ہی جانتے ہیں)

اور یہ اس پر چلنے کی ہمت بھی رکھتے، تو ان کو یہ اُفتاد کبھی نہ پیش نہ آتی جس نے ان کو بالکل دست و پا شکستہ کر ڈالا ہے۔ (فاران: — اور آپ جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد اس "ہمت" دکھانے کی جھنجٹ سے آزاد ہو چکے ہیں) یہی انبیاء علیہم السلام کا راستہ ہے جس پر "چلنے کی ہم دعوت دے رہے ہیں، لیکن جن لوگوں کو سیاسی توڑ جوڑ اور حصولِ اقتدار کا چسکا پڑ جاتا ہے، اور جنہیں موچی دروازے کی تقریروں کی چاٹ لگ جاتی ہے وہ ان چٹخاروں سے دست بردار ہو کر رو کے پھیکے طریقہ پر کیوں آنے لگے۔ (ص ۵۵)

ان لفظوں سے مولانا مودودی کی ذات سے بغض و دشمنی کا کتنا خوفناک دھواں نکل رہا ہے۔ توبہ!

۹ر ستمبر ۱۹۶۰ء کے "المنبر" میں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب تحریر فرماتے ہیں: —

"رابعاً یہ بات بھی تجزیہ طلب ہے کہ آج جماعتِ اسلامی موجود نہیں ہے، اُس سے مُراد کیا ہے کہا جا سکتا ہے، سیدھی سی بات ہے، جماعت موجود نہیں ہے! بالکل بجا، لیکن ذرا غور فرمایئے، جماعت نام کس چیز کا تھا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جماعت کے اجزا حسب ذیل تھے

• — مولانا مودودی کی دعوت، خاص فکر اور اُس پر مشتمل لٹریچر۔
• — مولانا کے ہم خیال اہلِ قلم کی وہ کھیپ، جو اُن کے فکر کی اشاعت کے لئے وقف تھی۔
• — تنظیم جس میں کارکن شامل تھے —

اس وقت یہ آخری جزو اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں ہے .... لیکن مولانا مودودی صاحب کا تیار کردہ لٹریچر جو پہلے جماعتِ اسلامی کے مکتبہ سے شائع ہوتا تھا اب جماعتِ اسلامی کی یہ وراثت اسلامک پبلیکیشنز کی جانب منتقل ہو چکی ہے، بعینہ اسی طرح، جس طرح جماعتِ اسلامی اپنے قیم جناب میاں محمد طفیل صاحب کے زیرِ قیام کام کر رہی تھی، یہ نوزائیدہ ادارہ میاں صاحب ممدوح کے زیرِ اہتمام چل رہا ہے، اور اس کے تحت جماعتِ اسلامی کی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں — جماعت کے لٹریچر کو بیرونِ ملک شائع کرنے کا کام بدستور سابق ہو رہا ہے، اور دونوں کام مالی مسائل کے اعتبار سے پہلے سے زیادہ بہتر حالت میں ہیں"

کیا انبیاء کرام کی راہ پر چلنے والے اور ان نفوسِ قدسیہ کے طریقِ کار کی دعوت دینے والے، اس زمانہ میں مُخبری اور جاسوسی کا پارٹ بھی انجام دینے لگے ہیں؟ کیا چودھویں صدی ہجری میں "تقویٰ" اب یہ کھیل بھی کھیلنے لگا ہے! حد ہو گئی دشمنی اور بغض و حسد کی کہ مولانا مودودی کی کتابوں کو چھپتے اور مقبول ہوتے دیکھ کر حکیم اشرف صاحب کے سینہ پر سانپ لوٹنے لگے ہیں......

حالانکہ اس لٹریچر کے بارے میں۔ اب سے پہلے وہ یہ رائے رکھتے تھے: —

"بنا بریں ہماری یہ رائے ہے کہ جماعتِ اسلامی کا لٹریچر پڑھنا پڑھانا جائز ہے، بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، اس دور میں چونکہ اس کی افادیت مشاہدے میں آچکی ہے، اور اس سے الحاد و

اباحیت کے شکار ہونے والے نوجوانوں نے بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے، اور وہ از سرِ نو اسلام سے محبت کرنے اور قرآن و سنت کی اتباع کو ضروری سمجھنے لگے ہیں، اس لئے اس لٹریچر کی اشاعت ایک تبلیغی کوشش ہے، اس میں خلوص کے ساتھ کوشش کرنے کا اجر اللہ کے ہاں ملنے کی پوری پوری توقع کی جاسکتی ہے۔" (کیا جماعتِ اسلامی حق پر ہے؟ ص ۱۲۶)

ان دلائل و شواہد کی روشنی میں "فاران" پڑھنے والے فیصلہ فرمائیں کہ ہم نے "بغض و حسد اور دُشمنی" کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ خلافِ واقعہ نہیں ہیں اور اُن کو "زیادتی" اور "مبالغہ آمیزی" نہیں کہا جاسکتا۔

مولانا امین احسن اصلاحی اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب خشیتِ الٰہی اور علم و تقویٰ کی بنا پر یہ کرسکتے ہیں کہ انسان تو انسان ایک چیونٹی کو بھی اُن کی ذات سے کوئی نقصان نہ پہنچے، وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بھی زیادہ سے زیادہ نگہداشت کا ثبوت دے سکتے ہیں، مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں اُن کا یہ رویہ انتہائی نامنصفانہ، سفاکانہ اور بے رحمانہ ہے، انکی تحریروں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ مودودی صاحب کے درپئے آزار ہیں! مولانا اصلاحی صاحب کے دل و دماغ پر جب تک مولانا مودودی کی دُشمنی کا جذبہ مُسلّط رہے گا، اُن کے قلم سے بے اعتدالی کے "شہ پاروں" کی تراوش ہوتی رہے گی، اور اُنکے دل کی جھنجلاہٹ لفظوں کے قالب میں ڈھلتی رہے گی۔

جہاں تک علمی و دینی مسائل کے اختلافات کا تعلق ہے، مولانا مودودی اپنی مدافعت کرسکتے ہیں، مگر اپنی ذات کی مدافعت وہ کس طرح کریں؟ اُن کی عربی دانی پر چوٹ کی جائے۔ تو وہ یہ کس طرح کہیں کہ مجھے عربی آتی ہے اور برسہا برس سے عربی کتابوں کا مطالعہ ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے! اُن کے "تقویٰ" کو زیرِ بحث لایا جائے، اور اُن کی دینی جدوجہد کو سیاسی توڑ جوڑ اور حصولِ اقتدار کی ہوس کا عیب لگایا جائے، تو وہ اپنے اخلاص و دردمندی کے بارے میں خود کیا کہیں، اُن کی تقریروں پر "موچی دروازے کی تقریروں کی چاٹ لگنے" کی پھبتی چسُت کی جائے تو مولانا مودودی اپنی صفائی میں اپنے گردے کے مرض، صحت کی خرابی اور اُس پر دو دو گھنٹے تقریروں کی مشقت کی تفصیل کو کس طرح زبان پر لائیں، اُن کے "دینی و علمی افکار" پر حملہ کیا جائے، تو وہ خود کس طرح یہ کہیں کہ میرے دینی افکار کے بارے میں شام کے علی طنطاوی اور مصطفیٰ زرقا، عراق کے امجد الزہاوی اور محمود صواف، نجد کے عبدالعزیز بن باز، مصر کے سید قطب اور ابومحمد زہرہ اور دوسرے علماء اور اربابِ فکر سے جاکر پوچھو، اُن کے جوابات سُن کر، شاید تمہیں اپنے "احساسِ کمتری" پر ندامت ہو!

مولانا مودودی پر ایک دینی فرقہ کے بعض اہلِ قلم نے "انکارِ حدیث" کی تہمت لگائی تھی، اور اُن کی ایک تقریر کو غلط معنی پہنائے تھے، اس زیادتی کو دیکھ کر، مولانا اصلاحی خاموش نہ رہ سکے، اور انہیں مولانا مودودی کی طرف سے مدافعت کرنی پڑی:—

"..... کسی کی مخالفت میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کا ہوش و خرد اور شرمِ دُنیا اور خوفِ خدا سے اتنا بے پروا ہو جانا ایک بڑا ہی دل شکن اور نہایت ہی دردانگیز سانحہ ہے! سوچئے کہ اس بات کے ممکن نتیجے کیا نکل سکتے ہیں؟ اس کا ایک نتیجہ تو یہ متوقع ہے کہ جو لوگ اس بات کو سُنیں وہ کہنے والوں کو لاغی اور لپاٹئے خیال کریں اور اس کو اُس بغض و حسد پر محمول کریں جس کے لئے مولوی اُن کے نزدیک ہمیشہ سے بدنام رہے ہیں..... اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکل

سکتا ہے کہ ملک کے ذہین طبقہ کے اندر اس پروپیگنڈے سے فی الواقع یہ بات پھیل جائے کہ خدانخواستہ مولانا مودودی بھی حدیث کے منکر ہیں، کیا اس کا یہ اثر نہیں ہو سکتا کہ نئی نسل کے ہزاروں لاکھوں تعلیم یافتہ جو مولانا مودودی کی مذہبی و علمی عظمت کے معترف ہیں، اس فتنہ کے زمانے میں مودودی صاحب سے بدگمان ہونے کے بجائے، خود حدیث ہی سے بدگمان ہو جائیں کہ جب اتنا بڑا عالم اور لیڈر بھی، جس کی عرب و عجم میں دھوم ہے، حدیث کا مخالف ہے، تو ضرور کچھ نہ کچھ حدیث ہی میں خرابی ہے اور منکرین حدیث ہی کی بات صحیح ہے؟ کیا یہ حضرات اپنی ان مساعی کے اس مبارک نتیجہ پر مطمئن ہیں؟ یہ حدیث کی خدمت ہوئی یا دشمنی؟ ـــ" (توضیحات از امین احسن اصلاحی صـ ۱۱۳)

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے مولانا مودودی پر الزام لگانے والوں کی مدافعت کے لئے جو دلیل پیش فرمائی تھی، ٹھیک اسی دلیل کی بنا پر، ہم نے بھی مودودی صاحب کی مدافعت کی ہے زمانہ کا انقلاب دیکھئے کہ اب سے چند سال پہلے جو پوزیشن مولانا مودودی پر الزام لگانے اور مطعون کرنے والوں کی تھی، آج مولانا اصلاحی کا وہی موقف ہے ..... کبھی کے دن بڑے، کبھی کی راتیں!

همین است رسمے سرائے فریب
گہے بر فراز و گہے بر نشیب

یہ اتنی دردناک ٹریجڈی ہے جس کی دردناکی کا تحمل الفاظ نہیں کر سکتے!

مولانا اصلاحی کی طرح دینی خیر خواہی کا یہی جذبہ ہمیں بھی مدافعت کے میدان میں لایا ہے کہ مولانا مودودی کے دینی افکار علمی عظمت اور دینی جدوجہد کو عظیم و رائگاں بے اعتبار اور انبیاء کرام کے طریق کار کا مخالف ٹھیرا دینے کے بعد، لاکھوں نوجوان جو مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ کر دین کی طرف آئے ہیں اور دینداری کا رنگ اُن کی زندگی پر غالب آیا ہے، کہیں وہ خدانخواستہ "دین" کے بارے میں مذبذب اور متشکک نہ ہو جائیں!

آہ! یہ احساسِ کمتری

یہ کھلی ہوئی حقیقت اور امرِ واقعہ ہے کہ مولانا مودودی کے علمی اور دینی مضامین اور کتابیں پڑھ کر اور اُنکے دینی افکار سے متاثر ہو کر، مولانا اصلاحی صاحب اور دوسرے حضرات جماعت میں آئے ہیں اور مولانا کی قیادت کو شرحِ صدر کے ساتھ قبول کیا ہے! اس طرح ان حضرات نے علمِ دین کے میدان میں مولانا مودودی کی برتری اور فوقیت تسلیم کی ہے! مولانا مودودی کے پاس آج بھی علم و فکر کا وہی سرمایہ موجود ہے جو پہلے تھے وہ گھٹ نہیں گیا، اس میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے ـــ

لہٰذا

مولانا مودودی کی یہ "علمی برتری" جب تک مولانا اصلاحی اور اُن کے بعض "نائبین" کو کھٹکتی رہے گی، اُن کا احساسِ کمتری اسی طرح اُن کو بے چین رکھے گا، اور وہ اسی طرح آتش زیر پا رہیں گے!

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس عقیدت و محبت کے غلو سے بچایا ہے کہ مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کا حرف حرف حق ہے، یہ تو صرف نبی کا مقام ہے، کہ اُس کی ہر بات حق ہوتی ہے! مولانا مودودی سے فکر و نظر کی غلطیاں بھی ہوئی ہیں لیکن

یہ واقعہ ہے کہ مجموعی طور پر اُن کے قلم نے اس دور میں دین کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ عظیم نہیں "عظیم ترین" ہے، اس شخص کی تنہا ذات نے، ایک ادارہ کے برابر کام کیا ہے؟ جو کوئی مولانا مودودی کی علمی اور دینی خدمات کو ہلکا اور بے اعتبار ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ دین کی خیر خواہی کی غلط فہمی میں، دین کو نقصان پہنچاتا ہے!

بات بہت طول پکڑ گئی، مگر طوالت ناگزیر تھی، اختصار سے کام لیا جاتا، تو نہ جانے کتنی باتیں مبہم اور عُقدہ نیم وا بن کر رہ جاتیں، ہم نے اپنے نزدیک جس چیز کو حق سمجھا، اُس کا کھل کر اظہار کر دیا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو خوشی و ناخوشی اور اختلاف و دوستی کی حالت میں انصاف کرنے اور حدِ اعتدال میں رہنے کی توفیق عطا فرماتے (آمین)

ماہر القادری
۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء

نوٹ:۔ فاران کے خریدار صاحبان جن کی مدتِ خریداری موجودہ یا گزشتہ ماہ میں ختم ہو چکی ہے اپنا چندہ جلد سے جلد ادا کر کے شکریہ کا موقعہ دیں۔

(پاکستان) پتہ:۔ دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ (ہندوستان) پتہ:۔ دفتر الحسنات رام پور۔ یوپی۔

ملّا واحدی دہلوی

تاثرات

سینما میں جو ڈرامے دکھائے جاتے ہیں ان کی پوری کہانی کا ریل چرخی پر لپٹا ہوتا ہے۔ ریل کا ایک ایک ٹکڑا یا کہانی کا تھوڑا تھوڑا حصہ سامنے آتا ہے۔ سینما والے اگر کپڑے کا بہت بڑا پردہ بنائیں اور پوری ریل ایکدم کھول دیں تو آپ دیکھیں گے کہ تمام واقعات ایک ہی وقت میں سرزد ہو رہے ہیں۔ وہی جو رنگ رلیاں منا رہا ہے وہی ساتھ کے ساتھ دم توڑ رہا ہے۔ ایک ہی وقت میں دونوں کیا ساری حالتیں نظر آجائیں گی۔ ایک آن میں ساری کہانی دیکھ لیجئے گا۔

زمانے کا ریل بھی ہمارے سامنے تھوڑا تھوڑا کر کے کھلتا ہے۔ لیکن زمانے کا پورا ریل اللہ تعالیٰ کے سامنے بالکل یوں عیاں ہے جیسے سینما کی پوری کہانی ہمارے سامنے آجائے۔ اللہ تعالیٰ جس وقت کُنْ فرما رہا ہے اُسی وقت یَکُوْنُ ہو رہا ہے۔ اور اسی وقت حضرت اسرافیلؑ سے صور قیامت پھکوایا جا رہا ہے اور اپنا یہ تمام کام اللہ تعالیٰ بہ یک وقت اور بیک آن دیکھ رہا ہے اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِیْبًا وہ اسے دور دیکھتے ہیں ہم اسے قریب دیکھتے ہیں وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ۔ قیامت کا معاملہ اس کے لئے ایسا ہے گویا ایک چشم زدن بلکہ پلک جھپکانے میں کچھ دیر لگتی ہے قیامت اس کے حساب وں اس سے زیادہ قریب ہے

پورا زمانہ اللہ کے لئے ایک آن ہے۔ یہاں اُسی آن واحد کی صدیوں، برسوں، مہینوں، ہفتوں اور دنوں میں تقسیم کی جا رہی ہے اور لوگ پوچھ رہے ہیں کہ یہ اللہ نے کیا فرما دیا۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ہم نے زمین اور آسمان اور زمین و آسمان کی جملہ اشیا چھ دن میں پیدا کی ہیں۔ اللہ تو دعوے کر چکا ہے اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْــٴًـا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ اللہ ایسا صاحب قدرت ہے کہ جب اُسے کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو فرماتا ہے، اے کام ہو جا اور کام ہو جاتا ہے۔ اور علامہ محمد ایوب دہلوی شبہ کا جواب دے رہے ہیں کہ ہمارے سِتَّةِ اَیَّامٍ (چھ دن) اللہ کے پورے زمانے کا ہی قلیل ترین جزو ہیں، جنھیں پلک جھپکانے سے کم سمجھنا چاہیئے۔ اللہ کے کُنْ فرمانے سے چشم زدن میں زمانہ وجود پذیر ہو گیا۔ چھ دن جن کا آیت میں ذکر ہے وہ زمانے سے باہر نہیں ہیں۔ زمانے کے اندر ہیں۔ اللہ کے لئے پورا زمانہ ایک آن ہے۔ اور تمہارے لئے اس آن کا ایک قلیل ترین جزو چھ دن ہیں میں حضرت علامہ کے جواب کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ چھ دن کا لفظ اللہ نے ہمارے حساب سے استعمال کیا ہے۔ اللہ کا حساب کُنْ فَیَكُوْنُ ہے۔

حال میں امریکہ کا ایک ہوائی جہاز چوبیس میل اونچا پہنچ گیا تھا۔ اُس کے اڑانے والے کا بیان ہے کہ اڑان میں کسی جگہ چند سکنڈ کے واسطے اُسے محسوس ہوا کہ احساس وزن جاتا رہا۔ حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی اس واقعے کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

"گویا ہماری مادّی دنیا ہی میں خاص...... بلندی پر پہنچنے کے بعد جسم انسانی سن ہو جاتا ہے وزن کا احساس جو سطح زمین پر چوبیس گھنٹے کا مستقل ساتھی ہے باقی نہیں رہتا۔ اسی مادّی دائرے کے اندر جب احساس میں اتنا عظیم الشان فرق پڑ سکتا ہے تو دوسرے عالم میں تو جتنی بھی تبدیلی

انسانی احساسات میں ہو کم ہے۔ کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو یہاں کی گرمی ہمدردی سختی نرمی اور مسافت زمان ومکان وغیرہ سارے احساسات وخواص وصفات کا اثبات اس دوسرے عالم کے لئے بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

(۲)

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ انسان قرآن مجید کی فقط اس آیت کو سمجھ لے تو دین کی ساری الجھنیں سلجھ جائیں۔ اللہ تعالیٰ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہلوا رہا ہے کہ اے اہل مکہ! میں نبوت کے دعوے سے قبل دو چار نہیں، چالیس برس یعنی قریباً پوری عمر تمہارے ساتھ بسر کر چکا ہوں کیا تم اتنی بات بھی نہیں سوچ سکتے کہ جس شخص نے کبھی لوگوں کے معاملے میں جھوٹ نہیں بولا وہ اب بڑھاپے کے وقت اللہ کے اوپر بہتان باندھے گا کہ وحی نہ آتی ہوگی اور کہے گا کہ وحی آتی ہے۔

یہ آیت حقیقتاً انھوں نے سمجھی جو اس کے مخاطب اول تھے۔ صحابہ کو حضور کی صداقت کا سو فیصدی یقین تھا اور جسے کسی کی صداقت کا سو فیصدی یقین ہو۔ اُسے پھر اُس کی بات میں مین میخ نکالنے اور چون چرا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ سو فی صدی یقین اتباع کی وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جسے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جنوں سے تعبیر کرتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

ایسا جنوں کہ شادی کی پہلی رات ہے۔ نوجوان دولہا دلہن کے پاس ہے آواز آتی ہے کہ حضور جہاد کے واسطے روانہ ہو رہے ہیں۔ دولہا دلہن کو چھوڑ کر باہر نکلتا ہے۔ جہاد میں شرکت کرتا ہے اور شہادت پاتا ہے، کیونکہ صادق نبی نے اللہ کی طرف پیغام پہنچایا تھا کہ شہید مرتا نہیں ہے۔

صحابہ رضی نے بس ایک بات پر غور کیا تھا کہ حضور کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ اُس کے بعد وہ وہموں اور شبہوں میں نہیں پڑے صَدَقْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ہی کہتے رہے کُنْ فَیَکُوْنُ اور اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ میں فرق محسوس نہیں کرتے تھے۔

اس ایمان کا صلہ انہیں اللہ کے ہاں جو ملا ہوگا وہ تو ملا ہی ہوگا۔ دنیا میں بھی وہ چند سال کے اندر آدھی دنیا کے مالک بن گئے تھے

(۳)

"دوسری چیز جس نے مجھے مذہبیت کی طرف سے بد دل کیا اس مدرسے کا حافظ خانہ تھا جس طلبہ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا حافظ قادر بخش جو اپنی خشونت میں مولانا نور محمد صاحب سے کم نہ تھے۔ اس ادارے کے تنہا ذمہ دار تھے۔ یہ جس بے دردی سے قرآن حفظ کراتے تھے۔ اُس کے خیال سے میرے جسم کے رونگٹے اب بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ حفظ قرآن کے باب میں میرے والد کا مسلک کچھ اور تھا اور وہ اس کے سخت مخالف تھے کہ بچوں کو ابتدا ہی سے کسی غیر زبان کی تعلیم میں لگایا جائے۔ اس لئے حافظ خانہ سے جو درحقیقت "عذاب خانہ" تھا مجھے واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن یہاں جیسا عذاب بچوں پر نازل ہوتا تھا اس سے میں کیا، شہر کا ہر شخص واقف تھا۔ صبح سے دوپہر تک حافظ خانے کی چیخ پکار، حافظ قادر بخش کی ستم رانیاں اور بچوں کی آہ و بکا ہر وقت کانوں میں آتی رہتی تھی۔ بچوں کے جسم کو بید کی ضرب سے لہولہان اور دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ان کے سروں کو زخمی کرنا اس ظالم اور بے رحم حافظ کا دستور تھا۔ مجھے اس سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ کبھی میں والد سے کہہ دیا کرتا تھا کہ قرآن کا حفظ کرانا اتنا

ضروری ہے کہ بچے کے جسم و دماغ کو مجروح و بیکار کردیا جائے تو قرآن[1] سے انکار ہی بہتر ہے"۔

مندرجہ بالا عبارت جناب نیاز فتحپوری کے مضمون "میری زندگی کے دو موڑ" سے اخذ کی گئی ہے۔ اسی قسم کا قصہ اپنی مثنوی میں مولانا رومی رح نے بھی لکھا ہے کہ ایک صاحب کو اذان کہنے کا بڑا شوق تھا، لیکن اُن کی آواز ایسی وحشت ناک تھی کہ اُس آواز سے نجات پانے کے لئے مسلمانوں نے چندہ کر کے ان کو حج کے لئے روانہ کردیا۔ حج کا قافلہ کہیں ٹھیرا ہوا تھا کہ انھیں اذان دینے کا پھودڑ پڑا اور تھوڑی دیر میں دیکھتے کیا ہیں کہ ان کے سامنے مٹھائی کا خوان رکھا ہے اور مٹھائی لانے والا کہہ رہا ہے کہ میں یہودی ہوں میری لڑکی مسلمان ہونا چاہتی تھی اور ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی تھی۔ لیکن آپکی اذان سن کر اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں گی ہم آپ کے شکر گذار ہیں۔

مولانا رومی رح نے قصہ لکھ کر اور مولانا نیاز نے واقعہ بیان کر کے جہاں تک توجہ دلانے کا تعلق ہے توجہ ٹھیک دلائی ہے۔ موذن اور امام مکروہ آواز کے آدمی کو حتی المقدور نہیں بنانا چاہیئے اور بچوں کو سفاک استادوں کے سپرد نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ غلط ہے کہ اذان دینے والے سب کان ہی پھاڑتے ہیں، یا قرآن مجید حفظ کرانے والے سب اپنے شاگردوں سے سفاکانہ ہی سلوک کرتے ہیں بعض مؤذنوں کی آواز سے ایمان تازہ بھی ہوجاتا ہے۔ اور بعض قرآن حفظ کرنے والے قاری وقار اللہ پانی پتی کی طبیعت کے اس وقت موجود ہیں کہ چار سو میل جا بسنے کے باوجود کراچی کے شاگردوں کو نہیں بھولے اور شاگرد ان کے والہ و شیدا ہیں۔

میرے دوست .... صاحب کو بھی مولویوں اور مولویوں کے معتقدوں کا بہت بُرا تجربہ ہوا تھا، لیکن کیا ضروری ہے کہ بُرے تجربے کا بُرا ہی اثر لیا جائے۔ آجکل مسلمانوں کا اور کونسا طبقہ اسلام کا نمونہ ہے۔

دوسروں کی فکر نے ہمیں زیادہ تباہ کیا ہے۔ ہم دوسروں کی فکر کرنے کی بجائے صرف اپنی فکر میں لگ جائیں تو ایک ایک شخص کے الگ الگ درست ہوجانے سے معاشرے کا معاشرہ درست ہوسکتا ہے۔ ڈھنک رے دھنیئے اپنی دھن۔ پرائی دھنی کا پاپ پن۔

نیاز صاحب بھی پورے مولوی ہیں اور میرے دوست ...... صاحب بھی پورے مولوی تھے۔ اسلام سے جو حضرات واقف نہیں ہیں ان پر مولویوں اور مولویوں کے معتقدین کی حرکات کا بُرا اثر پڑے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مولوی پر مولویوں اور مولویوں کے معتقدین کا بُرا اثر پڑتا ہے اور وہ اسلام سے خفا ہوجاتے ہیں۔ بُرے مولوں کی وجہ سے اسلام کیوں زد میں آتا ہے۔ اور آپ مولوی ہو کر اسلام سے کیوں بیزار ہوتے ہیں۔ مولوی آپ کی قسم کے بھی ہیں اور دوسری قسم کے بھی اور تیسری قسم کے بھی جیسے میرے دِلی کے پڑوسی مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمہ تھے۔ میں نے مفتی صاحب کو پچاس سال مسلسل دیکھا۔ مجھے ان میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ آج بھی میں جب کہ اللہ کے ہاں جانے کے لئے تیار بیٹھا ہوں۔ میرا دل اُن سے جنت میں ملنے کو چاہتا ہے۔

---

[1] اسی شذرہ میں ملا واحدی صاحب نے آگے چل کر لکھا ہے کہ "نیاز صاحب اسلام سے بیزار نہیں ہیں۔ فقط خشک مزاج مولویوں کی مذہبیت سے بددل ہیں"۔ حالانکہ نیاز فتحپوری کے قلم نے اسلام کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اتنا نقصان بڑے بڑے اہلِ نفاق نے بھی نہ پہنچایا ہوگا، فقہ، حدیث اور قرآن میں سے کون سی چیز ہے جس کو اس شخص نے مجروح کرنے اور بے اعتبار ٹھیرانے کی کوشش نہیں کی۔

جناب واحدی صاحب کی "مرنجان مرنج پالیسی" قابلِ تعریف ہو مگر "بہ لے" اتنی بھی نہ بڑھنی چاہیئے کہ "تالیفِ قلب" کی رعایت سے "ملحدوں" کو اسلام سے محبت کرنیوالا ظاہر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر حلیم اور صاحب حکمت بالغہ اور کون ہوسکتا ہے۔ مگر خود قرآن میں فرعون اور ابولہب جیسے دشمنان دین کو بے نقاب کیا گیا ہے ـــــ نیاز فتحپوری کا تازہ ترین موقف یہ ہے کہ اس شخص کو قادیان بلایا گیا۔ وہاں اس شخص کی بہت آؤ بھگت کی گئی۔ نذرانے بھی دیے گئے۔ قادیان سے لوٹنے کے بعد اس نے اپنے رسالہ نگار میں۔ مرزا غلام احمد کی جو تعریفیں کی ہیں اس نے مسلمانوں کے دلوں میں تیتے گھاؤ ڈال دیے ہیں۔ (م۔ق)

نیاز صاحب نے بھی ایک مولوی (مولوی وزیر محمد خاں صاحب) کی تعریف کی ہے۔ نیاز صاحب اسلام سے ہرگز بیزار نہیں ہیں وہ فقط خشک مزاج مولویوں کی مذہبیت سے بددل ہیں مگر افسوس میرے دوست .... اسلام سے بیزار ہو گئے تھے۔

(۴)

بچپن میں جو باتیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں وہ پھر بھلائے نہیں بھولتیں۔ میرے ایک دوست ہیں جنھوں نے انگلستان جاکر وہاں تعلیم و تربیت حاصل کی ہے۔ اب تو عمر، تجربات اور حالات انھیں بہت بدل چکے ہیں، لیکن جوانی میں غور و فکر کے اعتبار سے بالکل انگریز تھے۔ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی کہیں سن لیا تھا کہ تیسری تاریخ کا چاند دیکھنا منحوس ہوتا ہے۔ یعنی یہ نحوست کی بات ہے کہ مسلمان دوسری تاریخ کی شام تک تاریخ سے بے خبر رہے۔ مہینہ بھر چاند کی تاریخ سے وہ آج بھی بے خبر رہتے ہیں مگر دوسری تاریخ کی شام کو تیسری تاریخ کا چاند نہ دیکھنے کا صاحبیت کے دور میں بھی انھیں خیال رکھنا پڑتا تھا۔

ایک اور دوست ہیں، جو پہلے بوریہ نشین مولوی تھے۔ پھر مولوی فاضل، ایف اے۔ بی اے۔ ایم اے کر کے کسی کالج میں پروفیسر ہو گئے اکثر دیکھا ہے کہ انگریزی تعلیم پہلے پائی ہو اور دینی تعلیم بعد میں تو دین غالب آجاتا ہے، اور دینی تعلیم پہلے پائی ہو اور انگریزی تعلیم بعد میں، تو انگریزیت چھا جاتی ہے۔ چنانچہ ان دوست پر انگریزیت ہی کا نہیں دہریت کا قبضہ ہے۔ لیکن چونکہ بچپن سے نماز کے عادی تھے، نماز برابر پڑھتے ہیں۔ نماز نہ پڑھیں تو بے چینی محسوس کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا دین عرب سے چلا تھا۔ عرب ایسا ملک ہے جہاں پانی کمیاب ہے۔ اس نے مسلمانوں کے اندر ہندوستان جیسے دریاؤں کے ملک میں آکر بھی پانی کی قدر باقی رہی۔ پچاس ساٹھ برس قبل تک پانی ضائع کرنا مسلمانانِ ہند کے نزدیک گناہ تھا۔ اور جن مسلمان گھروں میں نل نہیں ہیں، وہاں شاید ہنوز گناہ ہو۔ مگر جن مسلمانوں نے نل لے لئے وہ آہستہ آہستہ پانی بہانے کے گناہ کو فراموش کر بیٹھے، کیوں کہ اب بچپن میں انھیں نہیں بتایا جاتا کہ پانی بہانا گناہ ہے۔ جن ملکوں کے بچوں کو یہ بتا دیا جاتا ہے ان ملکوں کے لوگ گھر تو گھر سڑک کا نل بہتا نظر آتا ہے تو اسے بند کرنا ثواب سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ نلوں کا پانی ان کی قوم کے روپے سے اور ان کی پوری قوم کے واسطے تیار کیا جاتا ہے، یہ ضائع ہوگا تو پوری قوم کو نقصان پہنچے گا۔ اور قوم کے ساتھ وہ خود نقصان اور تکلیف اٹھائیں گے۔ لیکن ہم تربیت سے ایسے محروم ہوئے ہیں کہ ان ملکوں کی بری باتیں تو سیکھ آتے ہیں اچھی باتیں نہیں سیکھتے۔ سوک سنس۔ سوک سنس (CIVIC SENSE) چیخنے والوں کو آپ کبھی سڑک کا نل بند کرتے یا مزدور کا بوجھ اٹھواتے نہ دیکھئے گا۔

تمام ماں باپ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے عمدہ انسان بنیں۔ یاد رکھئے یہ تمنا تکلیف اٹھائے بغیر پوری ہونی محال ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کے سامنے اپنا عمدہ نمونہ پیش کرنا چاہئے۔ حقیقی نمونہ نہیں پیش کر سکتے تو بلا سے مصنوعی نمونہ پیش کیجئے۔ مصنوعی نمونہ پیش کرنے کی تکلیف سہیئے۔ اور خود ویسے بن جائیے جیسا بچوں کو بنانا چاہتے ہیں۔ طبیعت پر جبر کیجئے اور اچھے بنیے۔ شروع میں تکلیف ہوگی پھر عادت پڑ جائے گی اور بچوں کے ساتھ آپ بھی واقعی اچھے ہو جائیں گے۔ ضرب المثل ہے: تخم تاثیر، صحبت کا اثر۔ بچے کی تربیت حمل قرار پانے کے وقت سے شروع ہو جاتی ہے۔ استقرارِ حمل کے ساتھ ماں باپ کے خیالات اور جذبات کا بھی استقرار ہوتا ہے۔ دورانِ حمل ہی ماں بچے کو بناتی اور بگاڑتی ہے اور پیدائش کے بعد بھی فوری تربیت ماں سے زیادہ بچے کو کسی کی نہیں ملتی۔ باپ کا نمبر کہیں دور جاکر آتا ہے اور استاد کا بہت دور۔ دوستوں کی صحبت میں بھی انسان بنتا اور بگڑتا ہے، لیکن دوستوں کی صحبت سے بننے اور بگڑنے کی صلاحیت کا بیج ماں باپ اور استاد بوتے ہیں، خصوصاً ماں۔ عمارتِ تربیت کے بنیادی اور ابتدائی ردّے ماں کے ہاتھ سے رکھے جاتے ہیں۔

سر سید احمد خاں، مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، منشی ذکاء اللہ، مولانا شبلی، حکیم اجمل خاں، مولینا ابوالکلام

مولینا راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کی مائیں تعلیم یافتہ نہ تھیں، اور غالباً مسٹر تلک، مسٹر گوکھلے، مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالوی کی مائیں بھی آجکل کی ماؤں کے برابر پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ مگر انھوں نے ملک وملت کو ایسے بیٹے دیئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آجکل کی مائیں ملک وملت کو کیسے بیٹے دیتی ہیں۔ ماؤں کے ہاتھ میں ہے کہ بالکل خوش بیٹیاں چھوڑ جائیں یا غیر مردوں کے سینے سے سینہ ملا کر ناچنے والی جیٹیاں چھوڑیں ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج ٭ تا ثریا می رود دیوار کج

(۵)

آپ کے بچے کے پاس ایک پیسہ ہے، جس کے نقوش ابھی گھسے نہیں ہیں۔ وہ اس کے اوپر کاغذ یا پنی منڈھتا ہے اور ہلکے ہاتھ سے پنسل پھیرتا ہے۔ نقوش کاغذ پر بھی اتر آتے ہیں اور پنی پر بھی۔ لیکن اسی پیسے کے اوپر کوئی سخت چیز رکھی جاتی ہے تو سخت چیز نقوش قبول نہیں کرتی ——————!

صحراؤں میں اہل خیر کنوئیں کھدوا دیتے ہیں اور کنوئیں میں ڈول اور رسی لٹکا دیتے ہیں تاکہ مسافر ادھر سے گزریں تو پانی پی لیں۔ مگر صحرائی کنوؤں کا پانی گھٹتا بڑھتا بہت ہے کبھی رسی پانی تک پہنچتی ہے کبھی نہیں پہنچتی۔ لہٰذا مسافر اپنے ساتھ بھی تھوڑی سی رسی لے لیتے ہیں اور اس کی مدد سے کنوئیں والی رسی کو لمبا کرتے ہیں۔ یہ رسی کا ٹکڑا اَلتَّبلِغَۃُ کہلاتا ہے۔ اسی تبلغہ سے تبلیغ کا لفظ پیدا ہوا ہے تبلیغ گویا اس رسی کے ٹکڑے کے مانند ہے جسے کنوئیں والی رسی میں جوڑا جاتا ہے۔ جس طرح مسافر والی رسی اور کنوئیں والی رسی دونوں کی ضرورت آپ نے ملاحظہ کی۔ اسی طرح تبلیغ اور تبلیغ سے متاثر ہونے والی طبیعت، دونوں کی ضرورت ہے۔ تنہا متاثر ہونے والی طبیعت بھی بیکار ہے اور تبلیغ کے لئے بھی متاثر ہونے والی طبیعت درکار ہے۔ پیسے کے نقوش پتھر پر نہیں اتر سکتے۔

تبلغہ اسی وقت کار آمد ہے کہ کنوئیں میں ڈول، رسی پہلے سے لٹکی ہوئی موجود ہو۔ اور تبلیغ اسی وقت اثر دکھاتی ہے کہ تبلیغ کا مخاطب اپنی عقل کو بھی کام میں لائے۔ جن کا مَبلغ علم بس اتنا ہے کہ جو کچھ ہے دنیا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، وہ قرآن کی تبلیغ کا اثر کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِنَ الْعِلْمِ ان کا مبلغ علم تو بس یہی ہے کہ جو کچھ ہے بس دنیا ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے ٭

• سہا انصاری لکھنوی

حضرت آرزو لکھنوی کی شاہکار تصنیف

نظامِ اُردو کے دوسرے حصّہ کی تشریح!

سب سے پہلے گزشتہ مضمون میں جو ادارۂ "فاران" کی طرف سے چند نوٹ ہیں ان کے متعلق عرض کرنا ضروری ہے اول لفظ غیض جس کے معنی صحرا و دشت ہیں وہ بے محل سہواً نقل ہو گیا اور ادارے نے اس کی صحت کی طرف اشارہ کر دیا اس کا بہت بہت شکریہ۔ دوسرے بے سر و سامانوں کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس طرح کے مرکب یا مفرد الفاظ کا جو غلط ہیں رواج یا جواز کوئی قاعدہ کی دلیل نہیں صرف قاعدہ قاعدہ کو کاٹ سکتا ہے یہاں چونکہ قاعدہ کی بحث ہے لہٰذا اسی اعتبار سے غلط اور صحیح کا فیصلہ ہونا چاہیے اور یہ کاڑی بان روز مرہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ پاؤں بروزن چھاؤں یقینی صحیح ہے صرف بحالت جمع غیر فصیح اور ذوق سلیم پر گراں ہے۔

تنسیق اجزائے زبان

تنسیق کلمات علم بلاغت کا وہ شعبہ ہے جس میں اُردو زبان کے لئے استعمال مترادفات کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔

اردو زبان جس طرح مختلف قوموں کے تعلقات سے اُن کے ایک دوسرے سے اظہار مطالب کے لئے ایک نئی وضع کی مشترک زبان بن گئی اُسی طرح اس کے مختلف الوضع الفاظ کی باہمی موانست بھی اُن اصول استعمال پر منحصر ہے جو ایک حد تک اسی زبان سے خصوصیت رکھتے ہیں (یعنی اُردو میں جو مختلف زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں ان کو کس طرح استعمال کیا جائے کہ حُسنِ کلام زیادہ سے زیادہ پیدا ہو)

ہر بحث میں اگرچہ پہلی چیز معنی اور دوسری چیز لفظ ہے مگر ابتدا ذکر لفظ ہی سے ہوا کرتی ہے کہ وہی اظہار معنی کے لئے ایک علامت ہے سلسلۂ کلام میں تمام کلمات کی باہمی چسپیدگی دو چیزوں پر موقوف ہے (چسپیدگی سے مراد وہ ترتیب الفاظ جس سے کہنے والے کا مطلب سننے والے کی سمجھ میں لطف کے ساتھ بہ آسانی آتا ہے) اس کے لئے ربط معنوی اور موانست لفظی ضروری ہیں

(۱) ربطِ معنوی

ربط معنوی اُس علاقہ ترتیب کلمات کا نام ہے جس پر اظہار معنی ارادی کا انحصار ہے۔ وہ ربط کہیں ترکیب اُردو کے ساتھ ہوتا ہے کہیں ترکیب فارسی کے ساتھ۔ ترتیب کلمات کے وقت ہر لفظ میں دو حالتوں کو دیکھنا چاہیے۔ اول جنسیت لفظ یعنی وہ ہندی کا لفظ یا فارسی و عربی کا یا ان میں سے کسی ایک کے حکم میں ہے۔ جیسے مہند صوری و معنوی وغیرہ دوسرے حیثیت لفظ

"جنسیت لفظ"

جنسیت لفظ یہ ہے کہ ربط معنی کے وقت اگر دو لفظ ایک زبان کے ہیں تو "ہم جنس" اور مختلف ہیں تو "غیر جنس" اور اگر

ایک دوسرے کے حکم میں ہیں مثلاً "ہندی اور اردو الفاظ" (یعنی مہند صوری) تو "داخل جنس"۔ اگر دونوں طرف لگاؤ رکھتے ہیں (یعنی مہند معنوی) تو "شریک جنس"۔ اور اگر بنیاد زبان کے پیشتر سے ایک دوسرے کے زیر اثر ہیں مثلاً عربی الفاظ فارسی کے تو "شامل جنس" کے نام سے ذکر کئے جائیں گے۔

"حیثیت لفظ"

لفظ کسی جنس سے ہو دو حیثیتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یعنی یا وہ عادتاً زبان پر آتا ہو جیسے "صبح" اسے معتدل کہیں گے کہ اسی قسم الفاظ سے دائرہ اعتدال زبان قائم ہے۔ دوسرے وہ کہ اُن کے بولنے میں خاص ارادہ شریک ہو جیسے "سحر" ایسے الفاظ غیر معتدل کے نام سے موسوم ہوں گے۔ معتدل الفاظ ہندی ہوں یا غیر ہندی۔ مفرد ہوں یا مرکب زبان کے اجزائے ذات ہیں انہیں سے دائرہ اعتدال زبان قائم ہوا ہے اور غیر معتدل الفاظ سے دائرہ زبان تزئین کے ساتھ وسیع ہوا ہے۔ اس تفریق الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان کا رابطہ باہمی بھی ایک طرح کا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خصوصیات ترکیب اردو و فارسی کا ذکر بھی ضروری ٹھہرا کہ کون سی ترکیب کس محل پر جائز کہاں ناجائز۔ کہاں واجب۔ اور کہاں مستحسن ہے۔

ذکر خصوصیات ترکیب اُردو و فارسی

ترکیب اُردو تمام الفاظ میں بلا امتیاز جنس عام ہے۔ جس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی کہ اُردو کی ترکیب تمام اقسام الفاظ پر حاوی ہے صرف قسم غیر معتدل الفاظ میں سوا خاص حالتوں کے جو اپنے محل پر بیان ہوں گی ترکیب اُردو درست نہیں۔ ترکیب فارسی کلمات غیر اُردو سے مخصوص ہے۔ بعض لفظوں میں ناجائز (یعنی جن غیر ہندی الفاظ کی صورت بدل گئی اُن میں ترکیب فارسی ناجائز ہے) بعض میں جائز (جہاں غیر ہندی الفاظ میں اُردو اور فارسی دونوں ترکیبیں ہو سکتی ہیں) بعض میں ضروری (ایسے الفاظ عربی و فارسی جو اردو میں انفراداً استعمال میں نہیں وہاں ترکیب فارسی ہونا چاہیے) اور بعض میں مستحسن ہے (جہاں "کی" "کا" "کے" حروف ربط کی کثرت ہو جیسے معمار کی صنعت کاری کی تعریف کے بجائے صنعت کاری معمار کی تعریف)

کلمات ہندی میں ترکیب فارسی درست نہیں کہ یہ اجزائے بنیاد زبان ہیں اور اُنکے استعمال کرنے کے لئے ہندی کے مکمل قاعدے اردو میں موجود ہیں (نوٹ یعنی ترکیب فارسی ان الفاظ میں، ناجائز ہے جو یا تو ہندی الاصل ہیں یا مہند صوری ہیں۔ عربی و فارسی الفاظ کے علاوہ صرف مہند معنوی الفاظ میں ترکیب فارسی عملاً ہوتی ہے حالانکہ اکثر اساتذہ نے اُن میں بھی ترکیب فارسی کو جائز نہیں رکھا۔ میرے خیال میں یہ زیادتی ہے (اپنے محل پر مصنف نے بھی اس کو جائز لکھا ہے) ہندی الفاظ میں اس طور سے فارسی ترکیب جیسے لب سڑک ہے اس کو مستثنیات سے سمجھ لینا چاہیے۔ لیکن اسی قیاس پر تلوار آب دار شدت پیاس۔ ندی و نالا۔ پتہ ہائے درخت بولنا یا لکھنا درست نہیں اسی طرح مفرد یا مرکب الفاظ مہند صوری میں بھی ترکیب فارسی صحیح نہیں۔ کہ کسی لفظ پر اردو کا قاعدہ جاری ہونے کے بعد دوسری زبان کا مخصوص قاعدہ جاری کرنا خلاف اصول ہے، لہٰذا ناخون شیر یا خربوزۂ شیریں وغیرہ کی ترکیب بھی غلط ہے۔ مگر ہندی کے ان اسماء میں کہ علم ہوں ترکیب فارسی صحیح ہے جیسے "لکھنؤ ہم پر فدا اور ہم فدائے لکھنؤ" یا تذکرۂ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ"   مہند معنوی میں عموماً ترکیب فارسی غلط خیال کیجاتی ہے مگر صرف معنوی تبدیلی سے لفظ کو بالکل
حکم ہندی میں مان لینا ایک طرفہ فیصلہ ہے، جو نہ قابل قبول ہے نہ لائق عمل۔ "سیر گلزار، عرصۂ دراز اور مثل ان الفاظ کے'   خود اہل تحقیق کے قلم سے

نکل جاتے ہیں پھر ایسا قاعدہ عام کیوں کر ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ لفظ مہند معنوی کی مشترکہ حالت اسی کی مقتضی ہے کہ اس کا استعمال بھی مشترک رہے۔ جیسے خواجہ آتش کا مصراع ہے "کسی کی محرم آب رواں وہ یاد آئی" (یعنی عربی لفظ محرم کے معنی بدل گئے اور اب سینہ بند زناں کے معنی میں مونث مستعمل ہے اور آب رواں فارسی بمعنی نہایت باریک کپڑا)

کلمات غیر معتدل میں فارسی ہوں یا عربی ترکیب فارسی ضروری ہے کہ یہ دائرہ زبان کے بیرونی الفاظ نہ ہر جگہ کلمات ہندی سے مانوس رہیں نہ ترکیب اردو کو قبول کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ربط ترکیب فارسی کے ساتھ لازمی ٹھہرا جس کی حد مداخلت مرکب ناقص ہے (مرکب ناقص ایسے مجموعہ الفاظ کو کہتے ہیں جس میں کوئی فعل یا حرف ربط نہ ہو جیسے "بہ کتاب زید" مرکب ناقص یا "دیوار بار محنت مزدور" ابھی تک ناقص ہے لیکن اگر حرف ربط اور فعل کا اضافہ کر دیا جائے جیسے دیوار بار محنت مزدور سے خم کہنے سے بات پوری ہو جائے گی اور ربط کلام کے ساتھ معنی ارادی ادا ہو جائیں گے)

بعض الفاظ ایک معنی میں معتدل ہیں اور دوسرے معنی میں غیر معتدل۔ جیسے لفظ "منت" بمعنی خوشامد معتدل اور بمعنی احسان غیر معتدل ہے۔ لہٰذا لفظ جس معنی میں مستعمل ہوا ہو اسی کے موافق ترکیب بھی ہونا ضروری ہے کیوں کہ اس کے خلاف یا غیر مانوس ہو جائے گا یا غلط فہمی پیدا کرے گا۔ مثلاً کوئی کہے کہ "میں نے منت کی" تو سننے والا سمجھے گا کہ التجا کی نہ کہ احسان کیا اور اگر کہے کہ "میں منت پذیر ہوا" تو سمجھا جائے گا کہ احسان کیا نہ کہ التجا کی۔ توالیٔ اضافات کے وقت بھی اگر ترکیب فارسی کا امکان ہو تو مستحسن ہے۔ مثلاً دل کی بے تابی کی حالت کہنے سے "بیتابیٔ دل کی حالت" کہنا فصیح ہے۔

ترکیب عربی کو اردو میں مطلقاً دخل نہیں کہ الفاظ عربی خود ہی قواعد اردو و فارسی کا عمل قبول کرتے رہتے ہیں۔ جیسے "امکان کی حد" "حور اور غلماں" یا حور و غلماں - حد امکاں وغیرہ ہیں۔ عربی الفاظ میں اگر ترکیب عربی ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ مرکب اصل زبان سے بجنسہٖ لے لیا گیا ہے مثلاً "لیلۃ القدر" "دار القرار" وغیرہ کی ہیئت ترکیبی اردو کے لئے حکم مفرد میں ہے اور افراد ان کے داخل ناقصات ہیں۔ لہٰذا عربی کا قاعدہ دوسرے قسم کے الفاظ پر جاری کرنا درست نہیں۔ مثلاً بے پروائی کی جگہ لاپروائی۔ ناچار کی جگہ لاچار۔ یگانگی کی جگہ یگانگت بولنا صحیح نہیں۔ (یعنی جب عربی الفاظ پر اردو اور فارسی کے قواعد کا عمل ہے تو فارسی اور اردو الفاظ پر عربی قاعدہ جاری کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کچھ عربی الفاظ کے عربی مرکبات اردو میں مستعمل ضرور ہیں لیکن عربی قاعدہ سے الفاظ کو باہم ترکیب دینے کا طریقہ اردو میں شامل نہیں اس لئے فارسی یا کسی عربی زبان کے الفاظ پر عربی قاعدہ جاری کرنا اصول کے خلاف ہے)

اس بحث میں مفردات اپنی جگہ کے لئے ہیں اور مرکبات اپنی جگہ کے لئے۔ مقصد دونوں کا تکمیل معنیٔ ارادی اور حسن ادائے مفہوم ہے۔ مثلاً مرزا غالب مرحوم کا شعر ہے ؎

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز | آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

شعر مذکور میں "دلفروز" "نیم روز" "نظارہ سوز" جس خوبی سے اپنے اپنے مفہوم کو ادا کر رہے ہیں۔ اس میں مفردات کی عاجزی محتاج بیان نہیں۔ اور مفردات کے محل پر مرکبات کی عاجزی بھی اسی جگہ نمایاں ہے۔ الحاصل اسی بحث کو اسی قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ ربط کس طرح کا ہے اور معنی ارادی حسن کے ساتھ کس لفظ سے حاصل ہوتے ہیں۔

موانست لفظی

موانست لفظی ربط معنوی کے زیر اثر تعلقات الفاظ کا وہ خوشگوار نتیجہ ہے جس پر فصاحت کلام کا دار و مدار ہے تمام الفاظ کے فرق

نوعی (یعنی لفظ مفرد ہے یا مرکب - معتدل ہے یا غیر معتدل - منفرد ہے یا مترادف اور اُردو ہے یا عربی و فارسی) اور خصوصیات ترکیبی (یعنی اُردو ترکیب ہے یا فارسی) کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر استعمال لفظ صحیح ہوگا - مگر بعض الفاظ کے لئے استعمال صحیح کا فصیح ہونا ضروری نہیں - کیوں کہ فصاحت کلام اصول موانست پر مبنی ہے - لہٰذا قبل بیانِ اصول - لفظ و معنی کی مشترکہ حالتوں کا ذکر ضروری ہے کہ امتیاز قسم لفظ میں آسانی ہو -

اقسام الفاظ باعتبار انفراد و تعدد و صورت و معنی

جو الفاظ لائق اظہار معنی ہیں وہ تین حالتیں رکھتے ہیں - اول صورت و معنی دونوں میں منفرد ہونا - جیسے "نقاب" کہ نہ اس لفظ کے کچھ اور معنی ہیں نہ اس معنی کا کوئی اور لفظ ہے - دوم - صورتیں کئی معنی ایک ہونا جیسے "بادل - ابر - سحاب" کہ سب کا ایک ہی مفہوم ہے - سوم - صورت ایک معنی کئی ہونا - جیسے "قلم" جس کے ایک معنی آلہ تحریر - دوسرے لانبی پتلی شیشی جس میں عطر وغیرہ رکھتے ہیں - تیسرے وہ شاخ جس سے درخت کی بنیاد قائم ہوتی ہے - (یعنی کسی پودے کو اسی قسم کے بڑے درخت کی شاخ میں پیوند لگا کے کسی طرح کی ترقی و تبدیلی مقصود ہے) نوٹ (اہل لکھنؤ قلم بمعنی آلہ تحریر کے تذکیر کے قائل ہیں اور دوسرے معنوں میں تانیث کے یہی معنی کے فرق کی شناخت ہے) اقسام مذکورہ میں سے - اول کو منفرد، دوم کو مترادف، سوم کو مشترک کہتے ہیں - استعمال لفظ منفرد کے لئے صرف ربط معنوی کافی ہے - (یعنی جب معنی کسی کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی لفظ ہے تو وہی استعمال کرنا ہوگا) لیکن مترادفات کی اور صورت ہے کہ باعتبار معنی تو وہ جتنے ہوں ایک کے حکم میں ہیں مگر بلحاظ جنسیت و حیثیت ان میں بہت کچھ فرق ہے جس سے ہر لفظ کے لئے محل خاص اور ہر محل کے لئے مخصوص ہے ورنہ مترادفات کا وجود ہی بے سود تھا - اور لفظ مشترک (یعنی لفظ ایک معنی کئی) معنی غیر مشترک میں قائم مقام منفرد (یعنی جب اپنے محل کے اعتبار سے ایک ہی معنی میں استعمال ہو) اور معنی مشترک میں قائمقام مترادف ہونے سے ایک لفظ دو طرف تقسیم ہو کر تین قسموں کی دو ہی رہ جاتی ہیں جن میں قسم اول کا (یعنی معنی منفرد کی حالت میں) استعمال بے خدشہ ہے - لیکن قسم دوم کا استعمال (یعنی بحیثیت مترادف) بغیر دلالت استعمال مخدوش ہے (یعنی جس طرح اہل زبان استعمال کرتے رہے ہیں وہی صورت صحیح و فصیح ہے) اور ایک حالت معنی مستعار ہے جس کے لئے کوئی علیحدہ لفظ نہیں بلکہ انہیں اقسام مذکورہ میں سے کوئی لفظ اپنے معنی مقررہ کے خلاف کسی فرض معنی میں مستعمل ہو جاتا ہے جیسے "میٹھا درد" بمعنی درد خفیف - اسی کو علم معانی میں معنی مجازی کہتے ہیں - مگر ہم اپنی اصطلاح میں معنی ترکیبی کہیں گے - کیوں کہ یہاں موضوع بحث معنی لفظ نہیں بلکہ حالت استعمال لفظ ہے جو نئے معنی کے اظہار کا سبب ہوتی ہے - اور وہ معنی ایسے ہی ہونگے جس معنی کا کوئی دوسرا لفظ بھی موجود ہو - لہٰذا مترادف مستعار کے نام سے موسوم ہوگا اب مترادف دو طرح کے ہوئے (۱) مستقل - (۲) مستعار - جن میں مترادفات مستعار کا استعمال اور سماعی ہے اور مترادفاتِ مستقل کا استعمال غیر مستقل اور قیاسی ہے - قسم اول میں دلالت استعمال شیوۂ فصحائے مستند و اہل زبان ہے اور قسم دوم میں قواعد موضوعہ -

(نوٹ لفظ منفرد ہو یا مترادف جب وہ کسی معنی مستعار میں استعمال ہوگا تو لفظ مشترک کے حکم میں آجائے گا - کیوں کہ معنی مستقل کے علاوہ اس میں ایک معنی اور پیدا ہو گئے یہی لفظ مشترک کی پہچان ہے کہ ایک لفظ کے کئی معنی ہوں - اور بحث استعمال لفظ میں لفظ مشترک کبھی منفرد کی حیثیت میں ہوتا ہے کبھی مترادف کی - لفظ منفرد کے لئے یہی ضروری ہے کہ معنی ارادی متکلم کے سامع پر واضح ہو جائیں اسی کو ربط معنوی کہتے ہیں مگر استعمال مترادفات کے لئے جنسیت - حیثیت - اعتدال اور لفظ کی نرمی کے لحاظ سے استعمال برمحل کے

...واسطے کچھ اصول ہونا چاہیے تھے وہی اصول پہلے پہل جناب آرزوؔ لکھنوی مرحوم نے قائم کئے ہیں۔ یہ اصول تمام مترادفات مستعملہ دونوں کے لئے ہیں۔

استعمال سماعی

استعمال سماعی وہ استعمال لفظ ہے جس کی مقررہ صورتوں میں مترادفات بھی مثل منفردات ہر جگہ مستقل نظر آتے ہیں (یعنی محاورہ کی طرح ان میں بھی کسی قسم کی تبدیلی جس سے معنوی یا لفظی اعتبار سے تغیر ہوجائے غلط ہے) اس بحث میں استعمال الفاظ کی دو علامتیں پائی جاتی ہیں۔ اول لفظ کا معنی اصلی سے عدول کرکے کسی نئے معنی میں مستعمل ہونا۔ جیسے "کچی لکڑی" بمعنی "نو عمر، ناتجربہ کار"۔ اس مثال میں ہر دو افراد معنی اصلی سے عدول کر گئے ہیں اور ایک نئے معنی ان کی باہمی وابستگی سے پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل اور ایک دوسرے کے معین معنی ہیں۔ (نوٹ اب چوب خام...... کہہ کے اگر کوئی نو عمر ناتجربہ کار مراد لے تو غلط ہوگا) دوم معنی اصلی پر قائم رہ کر اپنے استقلال سے معین معنی ہونا۔ جیسے "میٹھی نیند" بہ جز و دوم۔ اس اتحاد یہ عمل میں ہر دو افراد کی صورت حال خود ان کے استعمال برمحل کا بین ثبوت اور موانست باہمی کی قوی شہادت ہے۔ یہاں لفظ سے لفظ کی تبدیلی مرکب موضوع کو مہمل یا فصیح کو غیر فصیح بنا دیتی ہے۔ مثلاً "میٹھا خواب یا شیریں نیند" کہیں تو درست نہیں۔ اسی طرح "دل بجھنا، غم کھانا" کہ سماعیات میں ان کی جگہ "قلب بجھنا۔ صدمہ کھانا" بولنا درست نہ ہوگا یا میر انیس کے اس مصرع میں "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا" یہاں بھی اگر اوس کی جگہ شبنم کہیں تو صحیح نہ ہوگا (کیونکہ اوس کھانا محاورہ ہے اور محاورہ میں کوئی ایسی تبدیلی جائز نہیں) الحاصل کوئی معنی ہو یا اعانت معنی دونوں بنائے استقلال لفظ ہیں ایسے افراد میں ردو بدل غلط ہے (یعنی سماعیات میں لفظ سے لفظ کی تبدیلی محاورات وغیرہ کے وجود ہی کو ختم کردے گی)

مذکورہ بالا ہر مقررہ صورت کو اصطلاح عام میں محاورہ کہتے ہیں۔ لیکن وہ صورت استعمال جس میں قیاس کو دخل ہو اور الفاظ غیر معتدل سے پاک ہو محاورہ نہیں، روزمرہ ہے۔ جیسے رات کاٹنا محاورہ ہے اور رات گزارنا روزمرہ ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ "پاؤں پڑنا" عاجزی کے معنوں میں محاورہ اور پاؤں پر گرنے کے معنی میں روزمرہ ہے۔ الغرض محاورہ وہ مرکب ہوا جس کی معنوی حالت میں قیاس کا دخل نہ ہو۔ اور روزمرہ وہ مرکب ہوا جو الفاظ غیر معتدل سے پاک اور کسی حیثیت سے خلاف قیاس نہ ہو۔ محاورات میں ایسا تغیر جس سے اس کی اصلیت اس طرح بگڑ جائے کہ روزمرہ کی تعریف میں بھی نہ آسکے ناجائز ہے۔ اور نہ بگڑے تو جائز اور حسن کلام بڑھ جائے تو مستحسن ہے۔

ناجائز تصرفات

یعنی لفظی تبدیلی۔ مثلاً "پتھر چاٹنا" محاورہ۔ اور صدمہ کھانا۔ سنگ چاٹنا خلاف محاورہ ہے۔ یا معنوی تبدیلی۔ جیسے "آج کیا جاتی دنیا دیکھی"۔ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص خلاف توقع آجائے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ کا آنا جس کی خواہش تھی مگر امید نہ تھی کیوں کر ہوا؟ اب اگر جاتی دنیا کہہ کر گزرتا زمانہ مراد لیں تو خلاف محاورہ ہے (نوٹ ایسی تبدیلیوں سے محاورہ کا وجود ہی ختم ہوجائے گا اور بات کچھ مطلب کچھ کی صورت ہوگی)

جائز تصرفات

اول اضافۂ حرف - یعنی فعل مثبت میں حرف نفی بڑھا دینا - مثلاً شاد لکھنوی مرحوم پیرو میر کا مطلع ہے "خدا ہی اس چپ کی داد دے گا کہ تربتیں روندے ڈالتے ہیں اجل کے مارے ہوئے کسی سے نہ بولتے ہیں نہ چالتے ہیں" یہاں بول چال میں حرف نفی کے اضافہ سے ایسا تصرف ہوا جو لابدی تھا اور محاورہ کی اصلیت پر کوئی تباہ کن اثر نہیں ہوا (لوٹ ایسے محل پر یوں ہی بولتے بھی ہیں - یعنی جیسے کہیں - کہ "وہ نہ بولتے ہیں نہ چالتے ہیں چپ لیٹے ہیں") دوم اضافہ مثلاً - اسیر لکھنوی مرحوم کا مطلع ہے "نبضِ بیمار جولے اشکِ مسیحا دیکھی - آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی" اس میں ہوئی جزو زائد ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں مگر غلط بھی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ہئیتی محاورہ کی برقرار ہے - سوم تخفیف لفظ - مثلاً یاس لکھنوی والد علامہ آرزو مرحوم کا شعر ہے -

گل توڑنے پہ دیتی ہے دشنام عندلیب　　سچ ہے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے

بولتے یوں ہیں کہ "کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان چلے"

یہاں جزو زائد دور کر دینے سے نظم کی گنجائش نکل آئی اور اصلیتِ محاورہ بھی قائم رہی -

چہارم - جزو محاورہ استعمال کرکے کل سے مراد لینا - جیسے میر مرحوم کے مطلع میں ہے "اس نے دیکھا جو اُٹھکے سوتے سے + اُڑ گئے آئینہ کے توتے سے" پورا محاورہ یہ ہے کہ "ہاتھوں کے توتے اڑ گئے" شاعر نکتہ رس نے ایک ساکت چیز کی حالت تحیر کو متحرک شے سے مثال دے کر ناقابل اظہار مفہوم کو ظاہر کیا ہے - درحقیقت یہ محاورہ میں تصرف نہیں بلکہ جزو سے کل کی طرف اشارہ مقصود ہے جس کو "سے" حرف تشبیہ ظاہر کر رہا ہے -

تصرف مستحسن

انیس مرحوم کا مطلع ہے "کودکی، پیری - جوانی دیکھ لی - تین دن کی زندگانی دیکھ لی" محاورہ میں دو دن یا چار دن کی زندگی ہے جس کا مفہوم قلتِ زمانہ ہے - تعداد معینہ نہیں، مگر قادر الکلام مصنف تین زمانے ظاہر کرنے کے بعد تین دن کی زندگی کہہ کر وہ معنی آفرینی کر رہا ہے جو اسی کے لئے مخصوص ہے کہ محاورہ غلط ہونے کے بدلے نئے جامہ میں آ کر دوسرا محاورہ بن گیا - محاورہ میں ایسا تصرف جائز ہی نہیں مستحسن ہے (یہ درحقیقت تصرف نہیں بلکہ اضافہ ہے)

محاورہ کا حسن استعمال یہ ہے کہ ایک مفہوم اس کے معنیٔ معروف سے حاصل ہو اور دوسرا مفہوم الفاظ محاورہ کے لغوی معنی سے پیدا ہو جیسے پرانے اساتذہ میں سے کسی کا شعر ہے - مشہور میر کے نام سے ہے - حالانکہ اُن کے کلیات میں نہیں ملا - آئینہ اُن کا ٹوٹ گیا میرے ہاتھ سے - اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی" شعر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کوئی امکان نہ رہا جس سے میرے ہاتھ سے آئینہ ٹوٹ جانے کی شرمندگی رفع ہو سکے - اور ایک معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ اب معشوق کو اس کا منہ کیوں کر دکھائیں جب کہ منہ دکھانے والی چیز ہی نہ رہی -

جو مصادر ترکیبی (یعنی اپنے معنی اصلی سے عدول کرکے کسی اور معنی میں استعمال ہونے والے مصادر) معنی مجازی میں مستعمل ہیں ان کا استعمال ہر فاعل و مفعول کے ساتھ درست ہے - اور از روئے اشتقاق ان سے جتنی شکلیں بن سکیں سب صحیح ہیں - مثلاً

"ہوا ہو جانا" جس کے معنی تیزی سے بھاگ کے نظروں سے غائب ہو جانا" اگر یوں کہیں کہ "چور مال لے کے ہوا ہو گیا"، یا یوں کہیں کہ "کچا رنگ ہے ہوا ہو جائے گا" تو کسی طرح غلط نہیں۔

روزمرہ میں تصرف مستحسن

مثلاً "دمک" ایک خاص طرح کی تابندگی کا نام ہے۔ جس کا استعمال "ستارہ، ہیرے اور کندن وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن میر انیس نے کہا ہے کہ ع مٹی میں وہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا" شاعر نکتہ رس مٹی سی کم حقیقت چیز کو، کندن سی بیش قیمت شے پر ترجیح دینے کے لئے جو صفت کندن کی تھی اُسے مٹی کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور "وہ" حرف ترقی لا کر بتاتا ہے کہ مٹی کی چمک کندن کو مات کر رہی تھی اور لفظ "گرد" جو مٹی کے لئے وضع ہوا ہے "مات" کی جگہ صرف کر کے۔ مٹی کو سونا اور سونے کو مٹی بنائے دیتا ہے۔ اگر مصنف موصوف نے کندن کی صفت مٹی کے ساتھ لا کر مٹی کی صفت کندن کے ساتھ نہ استعمال کی ہوتی تو جملہ بے معنی یا غیر فصیح ہو جاتا۔ مقررہ استعمال پر ایسی دست اندازی انہیں قادر الکلام شعرا کا حق ہے جو اسے مہملیت سے بچا کر معنی کی نئی روح پھونک سکتے ہیں۔

استعمال قیاسی

استعمال قیاسی وہ استعمال لفظ ہے جس کی غیر مقررہ صورتوں میں ہر قسم مترادف کے لئے جگہ علیحدہ ہے کہ ایک کے مقام پہ دوسرا فصیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس بحث میں چار چیزیں قابل لحاظ ہیں۔ (۱) "امتیازاتِ لفظ" (۲) "مناسبات باہمی" (۳) محل استعمال" "دلالت استعمال"۔

امتیازاتِ لفظ

(امتیازات لفظ کا یہ مطلب ہے) کہ قبل استعمال دیکھ لینا چاہیئے کہ لفظ بجائے خود "منفرد" ہے یا "مترادف"، "معتدل" ہے یا "غیر معتدل" اور ایک دوسرے کا "ہم جنس" ہے یا "غیر جنس" لفظ منفرد بحث اعتدال وجنسیت دونوں سے مستثنیٰ ہے کہ وہ اپنی جگہ کے لئے آپ ہی ہے۔ مگر مترادف مستثنیٰ نہیں ہیں کہ وہ معتدل بھی ہو سکتا ہے اور غیر معتدل بھی۔ ہم جنس بھی غیر جنس بھی۔ مدارج واقسام مقابلتہً قائم ہو سکتے ہیں (یعنی لفظ منفرد اپنے مفہوم کے اعتبار سے اکیلا ہوتا ہے لہٰذا وہی استعمال ہوگا۔ مگر مترادف جو ایک معنی کے متعدد الفاظ ہوتے ہیں ان میں ربط معنوی کے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ جملہ میں دوسرے الفاظ کے ساتھ بیان کئے ہوئے علاقوں کے مطابق مناسبت رکھتے ہیں یا نہیں) اس فرق باہمی سے ہر ایک کے لئے جگہ علیحدہ علیحدہ ہے ورنہ مترادفات کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر تھا۔

معتدل الفاظ بلا امتیاز منفرد و مترادف اُردو کے اجزائے ذات ہیں اور ان کے استعمال کی ترکیب اصلی ترکیب اُردو ہے کہ اسما کے ساتھ افعال و حروف بھی کلیتہً "ہندی" کے موجود ہیں۔ جن کے ساتھ معتدل غیر زبان کا لفظ بھی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے غیر معتدل الفاظ جو غیر ہندی ہی الفاظ ہوتے ہیں سوا وساطت ہم جنس کے جس کے ساتھ ترکیب بھی فارسی کی لازم ہے۔ لائق استعمال اردو نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ بحث ترکیبات میں بیان ہو چکا ہے۔

(نوٹ: غیر ہندی سے مراد عربی یونانی عبرانی اور ترکی وغیرہ الفاظ ہیں جو فارسی کی وساطت سے اُردو میں آئے ہیں۔ انگریزی وغیرہ کے الفاظ صرف اُردو ترکیب سے ستعمال ہونا چاہیئے)

اس تشریح سے ستعمال لفظ کے لئے دو عام اصول قرار پائے ہیں۔ (۱) ایک ترجیح درجۂ اعتدال یعنی جو لفظ معتدل تر ہے وہی بلا امتیاز جنس فصیح تر ہے۔ دوسرے وساطت ہمجنس۔ یعنی جو لفظ یوں فصیح نہیں وہ کسی اپنے ہم جنس کے ساتھ ترکیب پاکر فصیح ہوجاتا ہے۔ یہ اصول عام اس لئے کہے گئے کہ مفردات کی کوئی قسم ان سے مستثنیٰ نہیں۔ خاص اصول کا تعلق مناسبات باہمی سے ہے جن کے زیر اثر صرف مترادفات معتدل ہیں (نوٹ۔ معتدل کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ خالص اردو ہی کے الفاظ ہوں اور یہ کبھی ہے کہ درجۂ اعتدال میں سب معتدل الفاظ برابر کبھی نہیں ہوتے جو لفظ جتنا زیادہ تقریر و تحریر میں ستعمال ہوتا رہتا ہے اتنا ہی وہ معتدل تر ہے۔ اس کا فیصلہ جنس لفظ پر نہیں۔ یعنی اُردو اور غیر اُردو پر نہیں بلکہ کثرت ستعمال لفظ پر ہے جیسے سرد اور ٹھنڈا (سیاہ اور کالا۔ زرد اور پیلا) میں ہندی یعنی اُردو الفاظ معتدل تر ہیں تو خراب اور بُرا۔ شاخ اور ڈالی۔ لہو اور خون میں غیر اُردو زیادہ معتدل ہیں)

مناسبات باہمی

مناسبت اس لگاؤ کا نام ہے جس کے اقتضائے حال سے ایک لفظ دوسرے کے ساتھ مانوس نظر آتا ہے۔ اس لگاؤ کی تین قسمیں ہیں (۱) معنوی۔ (۲) لفظی۔ (۳) ترکیبی۔ معنوی مناسبتیں دو طرح کی ہیں ایک اشتمال معنی۔ دوسرے تقابل معنی اشتمال معنی یہ ہے کہ ایک لفظ دوسرے کے ساتھ کسی حیثیت سے شامل ہو۔ یہ دو حیثیتیں ہیں۔ شامل ذات۔ شامل حال۔ شامل ذات یہ ہے کہ ایک لفظ دوسرے کا جزو ذات ہو جیسے "لہو کی بوند" یا جزو صفت ہو۔ جیسے "لہو کی لالی"۔ شامل حال یہ ہے کہ دونوں کسی ایک ذات یا نوع سے ایک طرح کا علاقہ رکھتے ہوں۔ جیسے۔ کڑوا۔ کسیلا۔ کالا۔ پیلا۔ اسمار صفات ہیں۔ یا پھول پھل۔ اجزائے درخت اور ہاتھ۔ منہ اعضائے حیوان ہے یا چوڑا چکلا۔ لڑائی جھگڑا۔ کہ ایسے مرکبات کے دونوں اجزا ایک ہی معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یا چاند۔ سورج۔ تارے اور تمام چرند۔ تمام پرند۔ تمام گزندے ایک دوسرے کے ساتھ شامل نوع ہیں۔ یا تمام اسمائے اعداد۔ ایک۔ دو۔ تین [۲] [۳] ۔ وغیرہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ غرض کہ کوئی ایسا لفظ جو کسی حیثیت میں دوسرے کا شامل حال ہو نسبت اشتمال کے زیر اثر سمجھا جائے گا۔ (نوٹ۔ جزو ذات سے مراد کسی شے کا کوئی حصہ ہونا ہے یعنی جیسے روٹی کا ٹکڑا۔ اسی طرح بہ اعتبار معنی پھول کی مہک جزو صفت ہے) (شامل حال جیسے پھول پھل پتے درخت ہی میں ہوتے ہیں۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ۔ کان۔ سب ایک جسم کے مختلف عضو ہیں۔ چاند۔ سورج۔ پرند۔ چرند۔ یا اعداد شمار فرداً فرداً ایک ایک نوع سے ہیں) کڑوا۔ کسیلا۔ وغیرہ صفت ہیں۔

تقابل معنی یہ ہے کہ ایک لفظ دوسرے کا مخالف مقابل ہو (یعنی ایک دوسرے کی ضد) جیسے آگ۔ پانی۔ دوست۔ دشمن۔ مشرق۔ مغرب۔

لفظی مناسبتیں بھی دو طرح کی ہیں۔ (۱) توازن تصریفی۔ (۲) توازن صوری۔ اور توازن تصریفی کے دو اعتبار ہیں۔ (۱) مادی۔ (۲) وضعی۔ توازن مادی یہ ہے کہ مشتقات کا ماخذ ایک ہی مادہ یا ایک مصدر ہو۔ جیسے قاتل۔ مقتول۔ مقتل کا مادہ سب کا قتل ہے۔ یا کشندہ اور کشتہ کہ دونوں مصدر کشش سے مشتق ہوتے ہیں۔

توازن وضعی یہ ہے کہ دونوں اصطلاح صرف میں ایک ہی کہے جاتے ہوں۔ جیسے قاتل۔ سائل۔ اسم فاعل ہیں اور مقتول مجروح اسم مفعول ہیں۔ نغمے۔ غنچے۔ اسم بحالت جمع اور اقرار۔ انکار مصدر ہیں۔

توازن صوری (بہ اعتبار مناسبت وزن) یہ ہے کہ ایک لفظ دوسرے سے حرکات میں مثل افاعیل وزن (ارکان بحور) کے یا حروف میں مثل قوافی کے یا دونوں طرح مشابہ ہو اس مشابہت کے دو درجے ہیں ناقص اور تام۔ جیسے رات پر رات کام کاج وغیرہ میں توازن ناقص ہے۔ اور نام۔ کام۔ قرار۔ فرار میں توازنِ تام ہے۔

ترکیبی مناسبت توازنِ ہیئت ہے۔ جیسے۔ دلفروز۔ نیم روز۔ جاں سوز۔ بانہہ بل۔ زربل۔ وغیرہ مرکب مماثل اور باہم متوازن ہیں۔ یا دستِ طلب۔ چشمِ کرم۔ آبِ سرد۔ نانِ گرم۔ یاس وحرماں۔ دین وایماں۔ آنکھ کی بصارت۔ کان کی سماعت وغیرہ مرکب مغائر ہیں۔ یہ بھی ہیئتِ ترکیبی میں باہم دگر متوازن ہیں (نوٹ۔ مرکب مماثل اور مرکب مغائر کی تعریف مضمون کی پہلی قسط میں دیکھئے) بس یہی مناسبتیں اصول خاص کی سات بنیادیں ہیں جن میں ہر مناسبت کا اقتضا کسی محل پر اتحاد جنس کا مؤید نظر آتا ہے اور کسی محل پر مساوات کا حال اور یہی تائید دلالت استعمال کے لئے حق مداخلت کو واضح کرتی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

محلِ استعمال

محل استعمال وہ جگہ ہے جہاں کی ضرورتوں کو لفظ ہر حیثیت سے پورا کرسکے ورنہ محل عجز ہے۔ یہ ضرورتیں دو ۲ ہیں۔ جن میں پہلی چیز تبلیغ معنی ہے۔ (یعنی متکلم کے مفہوم کو مخاطب کے ذہن تک پہنچانا) جو ہر جگہ کے لئے ہے اور کوئی قسم لفظ اس سے مستثنیٰ نہیں دوسری چیز موانست لفظی ہے وہ اصول موضوعہ کے زیر اثر ہے۔ جس کا تعلق مترادفات و مرکبات سے ہے۔ لفظ منفرد کا محل وقوع "محل مستقل" ہے اور مترادفات کا محل (وقوع اگر کسی مناسبت کے زیر اثر نہیں تو محل اعتدال ہے ورنہ محلِ مستعار ہے جو مناسبات معنوی کے زیر اثر کبھی محل اشتمال ہے۔ کبھی محل اتباع"۔ اور مناسبت لفظی کے زیر اثر "کبھی محل اشتقاق ہے۔ کبھی "محل تصرف" کبھی "محل توازن" اور توازن ہیئت کے زیر اثر "محل تنظیم" یہ کل محل استعمال آٹھ ہوئے۔ ان میں بعض کا اقتضائے حال تابعیت جنس ہے اور بعض کا اقتضا مساواتِ حال ہے (نوٹ یعنی کسی محل پر ہم جنس الفاظ استعمال ہونا چاہیے اور کسی محل پر اعتدال میں برابر الفاظ یا ایسے مرکبات جو صورت میں مشابہ ہوں یا ہیئت ترکیبی میں یکساں ہوں۔ مرکب مماثل یا مرکب مغائر ہوں) فقدانِ جنسیت کے وقت جو محل تابعیت میں نہ رہے گا۔ وہ "محل فقدان" کہا جائے گا اور فقدانِ مترادفات کے وقت منفرد غیر جنس کی مداخلت سے محل مستقل "محل انقطاع" ہو جائے گا۔ اب محل استعمال دس ہو گئے ہر محل کی تشریح دلالت استعمال کے تحت میں بیان ہوگی۔ (یعنی جب اقتضائے محل کی بنا پر ایسا لفظ لانا ہو جس کو دوسرے لفظ کا ہم جنس ہونا چاہیے مگر زبان میں ایسا کوئی لفظ نہ ہو تو غیر جنس استعمال کرنا ہوگا۔ یہ لفظ غیر جنس اگر مترادفات میں سے ہے تو اس محل استعمال کو "محل فقدان" کہا جائے گا اور اگر لفظ منفرد غیر جنس ہے تو محل مستقل، محل انقطاع ہو جائے گا)

دلالت ستعمال

دلالت ستعمال اُس وجہ وجیہہ کا نام ہے جو لفظ کے ستعمال برمحل کا بیّن ثبوت اور موانست باہمی کے لئے کافی ضمانت ہو سکے۔ دلالت معنوی بھی ہوتی ہے اور لفظی بھی۔ دلالت معنوی منفردات کے لئے کافی ہے مگر مترادفات کے لئے کافی نہیں

کہ وہ بہ اعتبار معنی تو ایک محل پر جتنے ہوں سب ایک ہی کے حکم میں ہیں لہٰذا ان میں ترک و اختیار کا فیصلہ دلالت لفظی ہی پر موقوف ہے۔ (یعنی جو زیادہ معتدل وہی لفظ زیادہ اچھا سمجھا جائے گا)

دلیل موانست مطابقت باہمی ہے۔ خواہ حالت لفظ کے اعتبار سے ہو یا جنس لفظ کے لحاظ سے۔ اگر کسی طرح کا اختلاف نہ ہوا تو مطابقت تامہ ہے جو محتاج دلالت لفظی نہیں (یعنی اگر جملہ میں ایسے الفاظ جمع ہو گئے ہیں جو ہم جنس بھی ہیں اور معتدل بھی تو موانست اپنی حد کمال کو پہونچی ہوئی ہے وہاں استعمال الفاظ کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ وہ فصیح ترین صورت ہے) اور اگر ایک حیثیت میں اتفاق اور دوسری حیثیت میں اختلاف ہوا تو اقتضائے حال پر نظر کر کے جب مطابقت جنس سے لفظ کو اختیار کریں گے تو وجہ ترجیح کو دلالت جنسی کہیں گے اور جب مطابقت حال سے اختیار کریں گے تو دلالت حالی کہیں گے۔ بس یہی دو دلالتیں اور سات مناسبتیں اصول موانست کی تو بنیادیں ہیں جن پر تمام مفردات و مرکبات کے استعمال پر محل کا مدار ہے۔

دلالتوں کے محل دخل و محلِ عجز

دلالت حالی وہ دلالت استعمال لفظ ہے جس کے زیر اثر اردو کا دائرۂ اعتدال قائم ہوتا ہے۔ محل دخل اس کا وہ ہے کہ تابعیت جنس سے خالی ہو یا اتحاد جنس کا امکان نہ رہے (یعنی ایک جنس لفظ کے بعد دوسرا ہم جنس لفظ نہ لایا گیا ہے یا لفظ ہم جنس زبان میں نہ ہو ایسے محل پر معتدل غیر جنس استعمال کرنا) ایسے محل چار ہیں۔ محل اعتدال۔ محل فقدان۔ محل توازن۔ محل تصریف۔

دلالت جنسی وہ دلالت استعمال لفظ ہے جس کے زیر اثر اردو کا دائرہ تزئین وسیع ہوتا ہے۔ محل دخل اس کا وہ ہے کہ یا تو لفظ نقص اعتدال سے وساطت کا محتاج ہو (یعنی کسی اپنے ہم جنس لفظ کی وساطت چاہتا ہو۔ جیسے راہوار پر سوار کے مقابلہ میں راہوار صبا رفتار پر سوار فصیح تر ہے) یا اقتضائے حال سے تابعیت میں ہو (یعنی وہ محل جہاں ہم جنس لفظ کے استعمال سے فصاحت کلام بڑھ جائے۔ وہاں بھی لفظ معتدل ہم جنس ہونا چاہیئے۔ اور معتدل ہم جنس کو معتدل غیر جنس پر بھی ترجیح دینا چاہیئے) ایسے محل بھی چار ہیں۔ محل اشتمال۔ محل اتباع۔ محل اشتقاق۔ محل تصریف۔ محل تنظیم دونوں حالتوں کے لئے مشترک ہے (یعنی محل تنظیم میں ۲ مرکب یا ۲ جملے ایسے لانا چاہیئے جن کی یا تو ساخت یکساں ہو یا الفاظ ہم جنس یا معتدل ہوں۔ اس لئے محل تنظیم دلالت حالی اور دلالت جنسی دونوں کا محلِ دخل ہو سکتا ہے) باقی ہر محل کسی ایک دلالت سے مختص ہے۔

تشریحات محل استعمال مع دلالت استعمال

محلِ مستقل لفظ منفرد کے محل استعمال کا نام ہے۔ جو صرف دلالت معنوی کا محل دخل ہے۔ مثلاً اس فقرہ میں "انتظار حد سے گزرا۔ اعتبار جاتا رہا۔" یہاں انتظار و اعتبار قسم منفرد سے ہیں کہ ان کا ہم معنی کوئی لفظ اردو میں نہیں۔ اس لئے ان کا استعمال کسی دلالت لفظی کا محتاج نہیں۔ (ظاہر ہے کہ الفاظ منفرد کے لئے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہو سکتی کہ معنوی ربط قائم رہے کیوں کہ لفظ منفرد کا بدل نہیں ہوتا)

محل اعتدال وہ جگہ ہے جہاں مترادفات کسی مناسبت کے ساتھ قبول اثر میں نہ ہوں (یعنی جہاں مترادف الفاظ ان مناسبتوں کے زیر اثر نہ ہوں جن کا اقتضا تابعیت جنس ہے) یہاں کا اقتضائے حال ترجیح درجۂ اعتدال ہے اور وہی دلالت حالی کے لئے حق مداخلت کی تائید کرتا ہے لہٰذا اصول عام کے پہلے قاعدہ کی رو سے جو مترادف معتدل تر وہی فصیح تر بھی ہے۔ مثلاً۔ بادل۔ ابر۔ سحاب میں۔ بادل

ابر سے۔ ابر سحاب سے درجہ اعتدال میں زیادہ ہے۔ اس لئے "ابر آیا فصیح ہے تو بادل آیا فصیح تر ہے" اور "سحاب آیا غیر فصیح ہے" کیونکہ "سحاب" غیر معتدل ہے جس کا محل صرف اور ہے۔ مگر جب مترادفات درجہ اعتدال میں برابر ہوں تو اصولاً ہر ایک کا استعمال درست ہے مثلاً "قسمت اچھی" "تقدیر اچھی" "مقدر اچھا" "نصیبا اچھا" یہ سب صورتیں فصیح ہیں۔ یہ دونوں محل مذکور صرف جائے آغاز مناسبات ہیں۔

محل اشتمال ربطِ معنی کی وہ جگہ اور قبولِ اثر کا وہ محل ہے جہاں منسوب۔ منسوب الیہ کے ساتھ کسی حیثیت سے شامل ہو اگر یہ اشتمال منسوب الیہ کی ذات سے ہے تو اشتمال ذاتی کہا جائے گا اور حال سے ہوگا تو اشتمال حالی ہوگا۔ اقتضا اس محل کا اتحادِ جنس ہے لہٰذا اسے دلالتِ جنسی کا محلِ دخل سمجھا جانا چاہیئے (اشتمال ذاتی یعنی شامل ذات ہونا جیسے "لہو کی بوند" "خون کا قطرہ یا خون کی سُرخی" لہو کی لالی وغیرہ۔ یہاں لہو اور بوند ایک جنس سے ہیں اور باہم جزو ذات ہیں "خون اور قطرہ دوسری جنس سے تعلق رکھتے ہیں اور جزو ذات ہیں۔ لہو کی لالی یا خون کی سُرخی۔ ایک دوسرے کے ہم جنس اور جزو صفت ہیں) اگرچہ توازن اعتدال کے لحاظ سے "خون کی بُوند" اور "لہو کا قطرہ" کہنا بھی غیر فصیح نہ ہوگا لیکن "لہو کی بوند اور لہو کی لالی" فصیح تر ہے کہ توازن اعتدال کے ساتھ یہاں اتحادِ جنس بھی موجود ہے۔ اس جگہ منسوبات کو نیم تابعیت میں سمجھنا چاہیئے (یعنی یہاں الفاظ میں کسی طرح کی مناسبت نیم تابعیت میں ہوگی اور محل اشتمال میں الفاظ ہم جنس لانا لازمی نہیں لیکن اگر ہم جنس الفاظ لائے جانے کا امکان ہو تو کلام میں فصاحت بڑھ جائے گی)

اشتمال ذاتی۔ یہ ہے کہ جیسے کہیں۔ "یہ پھل کڑوا ہے اور وہ کسیلا ہے" "اس کا رنگ نیلا ہے اس کا رنگ کالا ہے" تو فصیح لیکن اگر کہیں "یہ پھل تلخ ہے وہ کسیلا ہے یا یہ نیلا ہے وہ سیاہ ہے" تو فصیح نہ ہوگا کہ اسماء صفات میں بھی بنیاد موانست اتحادِ جنس ہے یہ حیثیتیں بہت ہیں مثلاً دو تین ذکر کر دی گئیں۔ اشتمال حالی۔ جیسے میٹھا کھٹا۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ منہ۔ ایک۔ دو۔ تین۔ ایک صفت یا ایک نوع سے ہونا۔

محل اتباع۔ وہ جائے ربطِ معنی ہے جہاں مترادفات نسبتِ تقابل کے زیر اثر ہوں۔ (یعنی ایسے مترادفات جو باعتبار معنی ایک دوسرے کی ضد یا مخالف ہوں۔ جیسے۔ موت۔ زندگی۔ مرنا۔ جینا وغیرہ) اس محل کا اقتضا بھی اتحادِ جنس ہے جس سے دلالتِ جنسی کا حق مداخلت ظاہر ہے۔ دیکھ لیجئے کہ گرمی کے ساتھ سردی بولنا فصیح اور ٹھنڈک بولنا غیر فصیح ہے یا ٹھنڈک کے ساتھ جلن بولنا فصیح اور سوزش بولنا غیر فصیح ہے اس جگہ تابعیت کے لئے ترتیب شرط نہیں۔ نسبت شرط ہے۔ مترادف پہلے ہو یا بعد ہر جگہ منفرد کی تابعیت میں ہے۔ دیکھئے جس طرح گرمی سردی فصیح ہے اسی طرح سردی گرمی بھی فصیح ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب محل تابعیت جنس کا ہو اور لفظ ہم جنس ممکن نہ ہو تو "داخل جنس" "شامل جنس" "شریک جنس" میں سے جو لفظ مل جائے اُسے غیر جنس پر ترجیح ہے۔ مثلاً اس جملہ میں "دشمن کی شکست کے معنی یہ ہیں کہ ہماری فتح ہوئی" فتح اور شکست نسبت تقابل کے زیر اثر۔ محل اتباع میں ہیں۔ لیکن دونوں میں سے کسی کا مترادف معتدل۔ عربی یا فارسی اردو میں موجود نہیں۔ لہٰذا فتح جو عربی لفظ ہے شکست کے ساتھ جو فارسی ہے شامل جنس ہونے کی وجہ سے محل استعمال۔ محل اتباع ہی رہے گا اور دلالت جنسی کا محلِ دخل مانا جائے گا۔ اگر مذکورہ بالا تینوں قسموں میں سے کسی قسم کا لفظ نظر نہ آئے گا تو فقدانِ جنسیت سمجھا جائے گا اور محل اتباع۔ محل فقدان کے نام سے موسوم ہو کر دلالت حالی کا محل دخل بن جائے گا۔

محلِ فقدان وہ محل ہے جہاں تابعیت جنس لازم ہو کر لیکن اتحادِ جنس کا امکان نہ ہو۔ ایسی حالت میں جو مترادف درجۂ اعتدال میں اپنے منسوب الیہ سے برابر ہوگا وہی لائق استعمال ہوگا۔ مثلاً۔ درخت کی شاخ سوکھ گئی۔ پتے مرجھا گئے پھول

کمھلا گئے" یہاں درخت محلِ اعتدال میں شاخ محل اشتمال میں پتے محل فقدان میں ہیں۔

محل اشتقاق وہ جگہ ہے جہاں مشتقات کا ماخذ معنوی حیثیت سے یکساں ہو۔ اقتضائے حال اس جگہ کا اشتراک مادی ہے (یعنی اس محل پر ایک ہی جنس کے مادہ سے مشتق الفاظ لانا چاہئیے) جیسے "قاتل سے مقتول کا قصاص لیا" فصیح ہے لیکن قاتل سے کشتہ کا قصاص لیا" یا "قتل کرنے والے سے مقتول کا قصاص لیا" ہو تو غیر فصیح ہو جائے گا۔

محل تصریف وہ جگہ ہے جہاں اصطلاح صرف میں الفاظ ایک ہی نام کے ہوں۔ اقتضائے حال اس کا یہ ہے کہ ساخت دونوں کی ایک ہی قاعدہ کے ماتحت ہو (یعنی عربی الفاظ ہوں یا فارسی اپنے قاعدہ گردان یا جمع بنانے کے طریقہ کی رو سے جس طرح اردو میں رائج ہیں اسی طرح لانا چاہئیے عربی کے ساتھ عربی فارسی کے ساتھ فارسی اردو کے ساتھ اردو ہونا چاہئیے ورنہ فصاحت میں خلل آجائے گا) مثلاً "افہام و تفہیم" دونوں مصدر ہیں یا "مکرم۔ محترم" دونوں اسم مفعول اور "مساجد و مقابر" دونوں میں علامت جمع عربی کی ہے۔ ان میں سے جس کی ساخت دوسرے مادہ یا قاعدہ سے ہوگی توازن باہمی میں فرق آکر غیر مانوس و غیر فصیح ہو جائے گا۔ مثلاً تفہیم کی جگہ سمجھانا یا محترم کی جگہ احترام کیا گیا یا بزرگی یافتہ بولیں تو درست نہیں۔ اسی طرح اگر علامت جمع بھی بدل دیں اور یوں کہیں کہ "مسجدیں آباد ہیں اور مقابر ویران ہیں" یا "مساجد آباد ہیں اور مقبرے ویران ہیں" تو کسی طرح فصیح نہ ہوگا۔

محل توازن وہ جگہ ہے جہاں ایک لفظ دوسرے کا ہموزن یا ہم قافیہ ہو۔ اگر ہم وزن بھی ہو اور ہم قافیہ بھی تو توازن تام ہے۔ جیسے کہیں "ہوش آیا جوش گیا" اور اگر صرف ہم وزن ہے۔ جیسے "نہ کوئی کام ہے نہ کاج" یا صرف ہم قافیہ ہو۔ جیسے کہیں "نہ وہ جوش ہے نہ وہ خروش" تو۔ توازن ناقص ہے۔ پھر نوع توازن ناقص ہو یا تام دونوں اصول فصاحت سے ٹھیک ہیں۔ اور اگر توازن تام کے ساتھ اتحاد جنس کا بھی لحاظ کر لیا جائے تو دائرۂ زبان کا بیرونی لفظ بھی جو یوں مانوس نہیں، مانوس ہو جائے گا۔ جیسے کہیں "پیٹ کی ریت سمجھو۔ تو ماں کا پان بہت ہے" یہاں دونوں فقرے یکساں فصیح معلوم ہوتے ہیں حالانکہ لفظ پیٹ انفراداً اردو میں داخل نہیں (یعنی پیٹ ٹھیٹھ ہندی اور صحیح اردو میں یہ دائرۂ زبان سے باہر کا لفظ ہے)

محل انقطاع وہ جگہ ہے جہاں ربطِ کلام میں کوئی مترادف نظر نہ آتا ہو تو استعمال لفظ منفرد لازمی ہوگا۔ لہٰذا قسم لفظ بدل جانے سے تابعیت دور ہو کر کسی دلالتِ لفظی کا محل دخل نہ رہے گا۔ اب منفرد کے لئے دو حالتیں ہیں ایک یہ کہ بحیثیت جنس وہ اپنے ماقبل کے موافق ہو جیسے کہیں "سینہ چوڑا ہے کمر پتلی ہے" تو سینہ و کمر میں اتحاد جنس اتفاقی ہے لہٰذا نسبت قطع نہ ہوگی اور محل استعمال محل مستقل ہی رہے گا۔ دوسرے یہ کہ منفرد بحیثیت جنس مخالف ماقبل ہو جیسے کہیں کہ "گردن سیدھی ہے ہاتھ ٹیڑھا ہے" اب نسبت قطع ہو جائے گی کہ گردن اور ہاتھ میں اختلاف جنس ہے۔ لہٰذا نام محل استعمال کا محل انقطاع ہوگا جو مناسبات کے دوسرے سلسلہ کے لئے محل آغاز سمجھا جائے گا۔ جس سے محل اتباع بھی مستثنیٰ نہیں (مخالف ماقبل سے یہ مطلب ہے کہ پہلے یا بعد کوئی لفظ فارسی یا عربی کا آئے اور پھر ہندی یعنی اردو کا لفظ جیسے کہیں "اس لڑکے کا ہاتھ بھی چلتا ہے اور زبان بھی چلتی ہے یا اس لڑکے کی زبان بھی چلتی ہے اور ہاتھ بھی چلتا ہے یہاں نسبت جنس منقطع ہو جائے گی یعنی اختلاف جنس لفظ ہو جانے سے ایسی جگہ محل انقطاع کہی جائے گی اور محل مستقل ہو یا محل اتباع جس میں اتحاد جنس ضروری ہے۔ چاہے نسبت تقابل قائم رہے محل انقطاع ہو جائے گا)

محل نظیم وہ جگہ ہے جو ہیئت ترکیبی کے زیر اثر ہو۔ اقتضا اس محل کا صرف توازن ہیئت ہے۔ مثلاً کہیں کہ "یہ بات دلپذیر ہے مگر دیر گیر ہے۔ یا وہ امر جان و دل سے قبول نہیں کہ دین وایمان کے خلاف ہے" اس حالت میں توازن موجود ہے برخلاف اس کے اگر یوں کہیں کہ یہ بات دل کو پسند ہے مگر دیر گیر ہے، یا یوں کہ، یہ بات دلپذیر ہے مگر دیر میں ہونے والی ہے" تو جتنا توازن میں فرق آیا اُتنا ہی فصاحت کلام میں فرق آگیا۔ اسی طرح دوسرے فقرے میں بھی مثلاً کہیں کہ وہ امر جان اور دل سے قبول نہیں کہ دین وایمان کے خلاف ہے یا بالعکس بولیں تو کسی طرح فصیح نہ ہوگا۔ ہیئت ترکیبی کے زیر اثر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جملہ کے دو ٹکڑوں میں مرکبات مماثل آئیں۔ جیسے نظر سوز۔ جگر دوز۔ یا با نہ بل۔ زر بل وغیرہ یا مرکبات مغائرہ جیسے آب سرد۔ نان گرم وغیرہ یا مرکبات عطفی جیسے ساز و سامان۔ یاس وحرماں وغیرہ۔ مگر مرکب مماثل کے ساتھ مرکب مغائرہ یا مرکب عطفی۔ یا مرکب مغائرہ کے ساتھ مرکب مماثل یا مذکورہ دونوں مرکبات کے ساتھ یوں کہ ایک جگہ مرکب مماثل دوسری جگہ مرکب عطفی وغیرہ یا بالعکس ہو تو فصاحتِ کلام کو مٹا دے گا) یہی حالت مماثلت اردو کی بھی ہے۔ مثلاً "کڑکتی بجلی۔ گرجتا بادل یا کڑکتی ہوئی بجلی گرجتا ہوا بادل"۔ دونوں صورتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ فصیح معلوم ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے کڑکتی ہوئی بجلی گرجتا بادل یا کڑکتی بجلی گرجتا ہوا بادل" بولیں تو فصیح نہیں کہ فرق توازن محل فصاحت ہے۔ توازن ہیئت کے ساتھ اگر پورے پورے فقرے اور جملے بنا کر استعمال کئے جائیں تو فصاحت بڑھتی چلی جائے گی وہ دیکھتا ہے۔ مثلاً "آنکھوں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں۔ کانوں کے موکھے چھپے پڑے ہیں۔ وہ دیکھتا سب ہے مگر سنتا ایک نہیں" بس توازن ہیئت میں ہیئت ترکیبی جس دلالت کی حامی ہوگی وہی دلالت استعمال سمجھی جائے گی۔

آخر میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اصول مذکور کلیتہً نثر سے متعلق ہیں مگر نظم میں بھی جہاں تک وزن عروضی اور قید قافیہ مجبور نہ کرے پابندیٔ اصول معین فصاحت ہو سکتی ہے کیوں کہ ہر قاعدہ جاری کرنے کے لئے امکان شرط ہے اور نظم میں پابندیٔ اوزان سب پر مقدم ہے۔ انیس ایسے فصیح البیان نے روانی و برجستگی قائم رکھنے کی غرض سے غیر معتدل و ثقیل الفاظ ترکیب اردو کے ساتھ بے تکلف استعمال کئے ہیں اور حسن نظم نے انہیں بھی فصیح کر دکھایا ہے مثلاً "نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے"۔ اس مصرع میں ضیغم غیر معتدل ہے مگر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ اگر یوں کہیں کہ "شیر اک ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے" تو وہ روانی پیدا نہیں ہوتی جس سے فصیح لفظ شیر غیر فصیح ہو گیا اور وزن بحر پورا کرنے کے لئے "اک" بڑھانا پڑا جو درحقیقت حشو ہے۔ اگر لفظ شیر کو اسی مضمون کے ساتھ کسی ایسی بحر میں نظم کیا جائے جو اس لفظ کے مناسب حال ہو تو یہ بھی فصیح معلوم ہوگا۔ جیسے کہیں "چلا کچھار سے اٹھ کر ڈکارتا ہوا شیر" دوسری جگہ اوس کے بدلے شبنم استعمال کیا ہے۔ "شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے"۔ یہاں شبنم کا استعمال بھی ایسا نہیں کہ اس کی جگہ اوس فصیح نہ معلوم ہو۔ شاعر کا مقصد پہلی فکر میں جس لفظ سے حاصل ہو گیا اس نے اُسی پر اکتفا کی ورنہ اگر یوں کہا جاتا۔

"چھلکا رہی تھی اوس کٹورے گلاب کے"۔ تو بھی فصیح بلکہ فصیح تر ہوتا (یہاں بھی ترجیح ہم جنس کی وجہ سے فصاحت بڑھ گئی حالاں کہ شبنم اور اوس درجۂ اعتدال میں بہت قریب ہیں) ضرورت قافیہ سے بھی غیر معتدل الفاظ اصول فصاحت کے خلاف استعمال میں آیا کرتے ہیں۔ مثلاً سر کے ساتھ مجمر۔ گلشن کے ساتھ گلخن۔ نمود و بود کے ساتھ دود غرضکہ صدہا غیر معتدل الفاظ بغیر ترکیب فارسی مستند شعرا کے کلام میں موجود ہیں اور غیر فصیح بھی نہیں معلوم ہوتے کہ ان میں بھی نسبت موجود ہے اگرچہ فاصلہ بعید کے ساتھ ہے۔

اس محل پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کا ہے کہ جب ایک عیب مٹانے سے دوسرا عیب پیدا ہوتا ہے اور دونوں سے بچنا محال ہے تو مدارج عیوب پر نظر کر کے فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ جیسا کہ پہلی مثال سے واضح ہے:

اثر صہبائی

بحضورِ سرورِ کائنات ؐ

یہ "فخرِ فقر" زمیں کو نہ آسماں کو ملا!
یہ تاجِ فرقِ شہنشاہِؐ دوجہاں کو ملا

حبیبِ حقؐ کی سواری اِدھر سے گزری تھی
اسی کی گرد سے یہ نورِ کہکشاں کو ملا

ترا تبسّمِ نوری ملا ستاروں کو
ترا سکوتِ حسیں شامِ گلستاں کو ملا

تری نظر سے بڑھی آبروئے اہلِ زمیں
ترے قدم سے شرف اہلِ آسماں کو ملا

بھٹک رہا تھا اندھیروں میں کاروانِ حیات
نشانِ منزلِ حق تجھ سے کارواں کو ملا

ملی پناہ یتیموں کو تیرے دامن میں
پیامِ فتح وظفر دل شکستگاں کو ملا

عجیب کیف ملا تیری یاد سے دل کو
عجیب لطف ترے ذکر سے زباں کو ملا

ریاضِ خلد سے خوشتر! فلک سے بالاتر!
عجب مقام محمدؐ کے مدح خواں کو ملا

چندر پرکاش جوہر بجنوری

دنیا کا عقیدہ بھی ہے اپنا بھی یقیں ہے
جو شے ہے مدینے میں کہیں اور نہیں ہے

اتنا کوئی اللہ کو محبوب نہیں ہے
صورت بھی حسیں آپکی سیرت بھی حسیں ہے

یہ ارضِ مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
جنت بھی یہیں قاسمِ جنت بھی یہیں ہے

اللہ کے دیدار سے محروم رہے گا
دیدارِ نبیؐ کا جسے ارمان نہیں ہے

جوہر کوئی عالم ہو ازل ہو کہ ابد ہو
ہر حال میں دلِ سرورِ عالم کے قریں ہے

اللہ رے بلندیٔ شبستانِ محمدؐ
ہے عرشِ بریں زینۂ ایوانِ محمدؐ

لو مل ہی گیا حشر میں بخشش کا سہارا
ہاتھ آ ہی گیا، گوشۂ دامانِ محمدؐ

ہے ذاتِ نبیؐ باعثِ تکوینِ دوعالم
کونین کی ہر شے پہ ہے احسانِ محمدؐ

کیوں اُن پہ نہو رحمتِ باری کی تراوش
قسمت سے ہیں جو شاملِ خاصانِ محمدؐ

فردوس ہے اک کوچۂ محبوبِ دوعالم
کونین ہے اک گوشۂ دامانِ محمدؐ

میں اور ثنا خواجۂ کونین کی جوہر
اللہ جسے بخشدے عرفانِ محمدؐ

عارف سیالکوٹی

حقائق

یہ ذکر و فکر، یہ تسبیح، یہ رکوع و سجود
خلوص ہے تو عبادت وگرنہ نام و نمود

یقیں ہے دل میں تو شعلے بھی کوثر و تسنیم
اگر ہے شرک تو جنت بھی آتشِ نمرود

خدا کو ذہن کی وسعت سے ناپنے والے
ترا دماغ ہے ناقص، قیاس ہے محدود

شکست قسمتِ باطل، ظفر مقدرِ حق
ہو بدر، نیل کا ساحل کہ آتشِ نمرود

نزولِ نورِ حقیقت اُسی پہ ہوتا ہے
ہو جس کے دل میں ذرا سی بھی روشنی موجود

ہے مقصدِ سخن لا الٰہ الا اللہ ـــ
نفس نفس ہو تلاوت، نظر نظر ہو سجود

مرا تو ہے تو یہی ایمان حضرتِ عارف
سوائے ربِّ محمدؐ نہیں کوئی معبود

ابو محمد امام الدین حافظ رام نگری

ایسے جلوے مری نگاہ میں ہیں
جیسے ہم ان کی بارگاہ میں ہیں

اب دیارِ حبیب دور نہیں
بام و در سب مری نگاہ میں ہیں

یہ حوادث کی زندگی کیا ہے؟
ہم یہ ماخوذ کس گناہ میں ہیں؟

انکے در پر پہنچ ہی جائیں گے
غم نہیں ہے ہمیں جو راہ میں ہیں

اب کوئی بھی مری نظر میں نہیں
آپ جب سے مری نگاہ میں ہیں

دور ہیں گردشِ زمانہ سے
جب سے ہم انکی بارگاہ میں ہیں

مصر کو انتظار ہے ان کا
کتنے یوسف ہنوز چاہ میں ہیں

ہم کو مٹنے کا غم نہیں حافظ!
خاک ہو کر بھی ان کی راہ میں ہیں

محسن انصاری

زور ہی آئے گا کام اور نہ زر آئے گا
عشق میں کام فقط سوزِ جگر آئے گا

اپنا اندازِ نظر تو کوئی پہلے بدلے
یہیں اک دوسرا عالم بھی نظر آئے گا

حسرتیں ترک کروگے تو ملے گا اک داغ
خاک جب ہوگے تو نالوں میں اثر آئیگا

کتنے ہی خود پرست ملے، خود نما ملے
میں ڈھونڈتا رہا کوئی درد آشنا ملے

موسم بدل گیا کہ وہ دل ہی بدل گئے
مل کر نہ خوش ہو کوئی کسی سے تو کیا ملے

سب اسی زندگی کے مارے ہیں —
کس سے کہیئے کہ زندگی ہے عذاب

منظر کلیمی

ہم کہاں اور لطفِ یار کہاں
اپنی قسمت میں یہ بہار کہاں

یونہی بیٹھے ہیں رہگزار پہ ہم
ہم کہاں اُن کا انتظار کہاں

اب ہوس کی ہے گرم بازاری
عشق و اُلفت کے کاروبار کہاں

کیوں لٹا دوں نہ جان و دل تم پر
کیا میں اپنا بھی خیر خواہ نہیں؟

وہ تو بیٹھے ہیں سامنے منظرؔ
پر یہاں جرأتِ نگاہ نہیں

صاحبِ ظرف تری ایک نظر کا قائل
بوالہوس بارِ دگر بارِ دگر کا قائل

میں نے دیکھی ہیں غزالوں کی نگاہیں اے دوست
میں نہیں حجلہ نشینوں کی نظر کا قائل

میں نے ان ہاتھوں سے توڑے ہیں دف و چنگ و رباب
میں ہوں شمشیر و سناں، تیغ و تبر کا قائل

عمر گزری شرابخانوں میں — لیکن اس پر بھی تشنگی نہ گئی

بہار کوٹی

اِسے نظر تو اُسے رُخصتِ نظر نہ ملی
کسی کو اپنی حقیقت کی بھی خبر نہ ملی

کھلا ہے دَر تو یہ کہ بند ہو جائے
یہاں گناہ کی فرصت ہی عمر بھر نہ ملی

رہِ طلب میں چراغ یقیں ہی کافی ہے
چھٹی نہ تیرگیٔ شب تو کیا سحر نہ ملی

بلاکشانِ جنوں کا ہے اتفاق اس پر
کرم کی بھیک محبت کے نام پر نہ ملی

ستم ظریفیٔ قدرت اسی کو کہتے ہیں
کہ راہبر تو ملے تیری رہگذر نہ ملی

رُخِ حیات سے پردہ اُلٹ چکا تھا میں
پھر اس کے بعد مجھے بھی مری خبر نہ ملی

بہار آکے چلی بھی گئی بہار مگر
کوئی بھی شاخ گلستاں میں بارور نہ ملی

پروفیسر عاصی کرنالی ایم اے

چار دن یوں بھی جوانی میں بسر ہوتی ہے
خاک پر پاؤں ستاروں پہ نظر ہوتی ہے

حسن اور عشق کا پیغام' —— نظر ہوتی ہے
بات کوئی نہیں ہوتی ہے مگر ہوتی ہے

زندگی عشق کی، اک نور کا پیراہن ہے
چاک ہو کر بھی گریبانِ سحر ہوتی ہے

غم کی شدت ہی سہی، دل کو پریشان نہ کرو
رات جب حد سے گزرتی ہے، سحر ہوتی ہے

آہ سینے میں جو گھٹتی ہے تو بن جاتی ہے اشک
یہ کرن ٹوٹ بھی جائے تو گہر ہوتی ہے،

رُوپ ڈھلتا ہے جوانی کا تو آتا ہے شعور
یہ تجلی جو سمٹتی ہے نظر ہوتی ہے،

شامِ گل ان کے حسیں ذہن میں آتی ہے کہاں
جب چٹکتی ہوئی کلیوں کی سحر ہوتی ہے

کثرتِ جلوہ نے اک نکتہ سمجھایا —— عاصی
آنکھ جھکتی ہے تو معراجِ نظر ہوتی ہے

شفقت کاظمی

ایک ایک کرکے ختم ہوئیں سب توقعات
اُٹھاتا ہوں تیری بزم سے محرومِ التفات

باقی ہیں مجھ سے آج بھی اُن کے تعلقات
لیکن بدل گیا ہے وہ اندازِ التفات

دُنیا نے تیری یاد کی لذت بھی چھین لی
لے دے کے رہ گئی تھی یہی اپنی کائنات

تیرا کرم کہ تو نے ہمیں غم عطا کیا!
کرتا ہے ورنہ کون فقیروں پہ التفات

حیرت لدھیانوی

کبھی ہنگامِ سحر اے دل ویرانۂ دل
ساز دل چھیڑ کے سُن نعرۂ مستانۂ دل

حسن اک موجۂ رنگیں ہے شراب دل کی
عشق اک نعرۂ مستانۂ دیوانۂ دل

پڑ گئی ہونگیں تری پرچھائیاں
ورنہ گل میں یہ کہاں رعنائیاں

درد تیرا جان لیوا ہی سہی
کٹ تو جاتی ہیں مری تنہائیاں

ماہر القادری

غم سے گھبرا کر پکارا شادمانی چاہیے
اے دلِ کم ظرف! تجھ کو شرم آنی چاہیے

بابِ زنداں بند، گلشن دُور، زخمی بال و پر
طاقتِ پرواز پھر بھی آزمانی چاہیے

روحِ انتخاب

وحید الدین خاں

سوال یہ ہے کہ ہم اپنے لئے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ کیا ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ بدی کا یہ کانٹے دار درخت اسی طرح پھیلتا رہے یہاں تک کہ زمین کا کوئی گوشہ اس کی وبا سے محفوظ نہ رہے اور خود ہماری نسلیں بھی اس کا شکار ہو کر رہ جائیں۔ یا ہم اس کو بدلنا چاہتے ہیں۔ کچھ خدا کے بندوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ان حالات کو بدلنے میں اپنی ساری کوشش لگا دیں گے۔ ہماری دعوت دراصل بدی کے ساتھ نیکی کی کشمکش ہے۔ ہم کوئی نیا نظام لے کر نہیں اٹھے ہیں۔ ہماری حیثیت نازی ازم اور مارکسزم کے علمبرداروں کی سی نہیں ہے۔ جنھوں نے محض اپنی ذاتی فکر سے ایک بالکل نرالی اسکیم جاری کی اور پھر زبردستی اس کو سوسائٹی کے اوپر مسلط کر دیا۔ ہم دراصل زندگی کی ان قدروں کو واپس لانا چاہتے ہیں جن کو شکست دے کر موجودہ تہذیب خشکی اور تری میں چھا گئی ہے۔ زندگی کی یہ قدریں ہمیشہ سے انسانیت کا اصل سرمایہ رہی ہیں۔ وہ انسانی فطرت کی پکار کا جواب ہیں۔ وہ زندگی کے تمام مسئلوں کا حل ہیں اور ان کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ وہ مغلوب ہونے کے لئے نہیں ہیں۔ وہ اسی لئے ہیں کہ زندگیوں میں انہیں غلبہ حاصل ہو۔ وہ قدیم ترین زمانے سے انسانی عقیدے کا جزو رہی ہیں ان کو جو شکست ہوئی وہ اس لئے نہیں ہوئی کہ فلسفۂ تاریخ کے جدید تصوّرات کے مطابق وہ اپنی عمر ختم کر چکی تھیں بلکہ ان کی شکست کا سبب دراصل ان کے افراد کی کمزوریاں تھیں۔ زندگی کا کوئی نظام خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ وقت کے مسائل کا حل پیش نہ کرتا ہو۔ ان قدروں کے علمبردار سینکڑوں برس پرانے زمانے کی فضا اپنے اوپر طاری کئے ہوئے تھے۔ زمانے میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور جو نئے حالات پیدا ہو رہے تھے انکی رہنمائی کے بجائے وہ ان کے خلاف بند بنا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ انسان کو آگے لے جانے کے بجائے پیچھے گھسیٹنا چاہتے تھے انھوں نے حق کو اس کی اصل شکل میں قائم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس بات کی چھان بین شروع کر دی کہ پہلے زمانے میں حق کے جو علمبردار گزر چکے ہیں وہ کیسے بال رکھتے تھے اور کس قسم کے کپڑے پہنتے تھے اور اصل مقصد کے بجائے اسی بال اور کپڑے کو قائم کرنے میں لگ گئے۔ ان کے اس طرز عمل نے حق کو گزرے ہوئے زمانے کی انوکھی چیزوں کی دوکان (OLD CURIOSITY SHOP) بنا کر رکھدیا۔ جس سے نئے دور کے انسان کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ایک بوسیدہ کھنڈر تھا جس کو توڑ کر وقت کا سیلاب آگے بڑھ گیا۔ اب اس سیلاب کا مقابلہ ہم جوابی سیلاب سے کرنا چاہتے ہیں۔ حق کی ان قدروں کو ہم ایک مستقل نظام کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ اور زندگی کے ایک ایک مسئلے میں رکھ کر موجودہ نظام پر اس کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ وقت کے نظام پر تنقید کر کے ہم یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ انسانیت کے لئے ایک بلائے عظیم ہے وہ ہمارے کسی مسئلے کو حل نہیں کر سکتا بلکہ ہم کو زبردست مصیبت میں مبتلا کر دینے والا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں نظامِ حق کی خصوصیات پیش کرتے ہیں اور دلائل سے ثابت کر رہے ہیں کہ اسی کے ذریعہ سے انسان کے تمام مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ یہ حق کیا ہے اس کے بارے میں بھی ہم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہمارا حق کوئی مارکسی سوشلزم نہیں ہے جس کی تعبیر روس میں کچھ اور ہے۔ ہندوستان میں کچھ اور۔ اور یوگوسلاویہ میں کچھ اور۔ یہ حق ہمارے نزدیک صرف اسلام ہے۔ وہ اسلام نہیں جو کچھ فرقہ پرست پارٹیاں اپنے ذاتی اور قومی مفاد کے لئے اس ملک میں عرصے سے پیش کرتی رہی ہیں بلکہ وہ اسلام جو ہزاروں برس سے انسانیت کا دین رہا ہے جس کو لیکر خدا کے بے شمار پیغمبر دنیا کے ہر حصے میں آئے اور جس کا آخری اور مستند اڈیشن حضرت محمدؐ کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے یہ اسلام صرف عبادت خانوں کی چیز نہیں وہ ملکوں کا دستور اور قوموں کا مستقبل ہے وہ سب سے بڑا حق ہے اور اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے غالب کیا جائے ✦

ہماری نظر میں!

یورپ نامہ (حصہ اول) از:- حکیم محمد سعید دھلوی، ضخامت ۴۹۶ صفحات کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، سرورق، ہر چیز حسین ودیدہ زیب، چہار رنگی تصاویر ۱۶ صفحات اور دو رنگی تصاویر ۲۴ صفحات) قیمت آٹھ روپے۔

ملنے کا پتہ:- ہمدرد اکیڈیمی، نیو ٹاؤن، کراچی ۵

ہمدرد دواخانہ کے مالک اور نگرانِ اعلیٰ جناب حکیم محمد سعید دہلوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، طب مشرقی کے وہ اس دور میں بہت بڑے سرپرست بلکہ محافظ ہیں، طب مشرقی پر حکیم صاحب موصوف کے فنی مضامین بڑے دل چسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں!

حکیم محمد سعید دھلوی نے اپنے بڑے بھائی جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی معیت میں یورپ کا سفر سنہ ۱۹۵۶ء میں کیا تھا، اُنکے اس سفر کا مقصد سیر وسیاحت سے زیادہ دواسازی کے کارخانوں اور طبی اداروں کا دیکھنا اور علاج معالجہ کے جدید طریقوں کا مطالعہ ومشاہدہ کرنا تھا! "یورپ نامہ" اُن کے اسی سفر کی دلچسپ اور معلومات آفریں روداد ہے، اس میں ترکی، یوگوسلاویہ آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ، چار ملکوں کے سفر وسیاحت کے مشاہدات بیان کئے گئے ہیں!

"یورپ نامہ" کو ہر ملک کے جغرافیہ، سیاسی حالات، صنعت وحرفت اور تہذیب وتمدن کی تفصیل اور تاریخی تذکرہ کے اعتبار سے اُس ملک کی "ڈائرکٹری" بلکہ "جیبی قاموس" (POCKET Encyclopedia) سمجھیئے، اتنی معلومات اور اس قدر تفصیل اور جزئیات اُردو کے کسی دوسرے سفرنامہ میں نہیں ملتیں! پھر لطف یہ ہے کہ انداز بیان خاصہ دلچسپ ہے اور دلی کی شستہ زبان نے اس لطف کو دوبالا کر دیا ہے — تحریر کا ایک مختصر سا اقتباس:-

> "جہاز میں انگریزی زبان سے کوئی واقف نہیں، ایئر ہوسٹس کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے "زبانِ یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم" وہ ہمیں دیکھ کر مُسکرا دیتی، جیسے ہماری اس سے دیرینہ واقفیت ہو، مگر مُسکرانے کی تعلیم ہر ایئر ہوسٹس کو دی جاتی ہے"

یورپ کے اس سفر میں دونوں بھائی دینداری اور مشرقیت کی روایات کو قائم رکھتے ہیں، ہوائی جہاز تک میں نماز پڑھتے ہیں اور عیش وعشرت اور رنگینیوں کے ہجوم سے دامن بچاکر گزر جاتے ہیں، بیلگراڈ کی میڈیکل یونیورسٹی کے رجسٹر میں اردو زبان میں اپنی رائے لکھتے ہیں، "یقیناً اردو زبان میں یہ پہلی رائے ہے جو یہاں لکھی گئی ہے"!

فاضل مصنف اور اُنکے بڑے بھائی کا یہ سفر فنی اور علمی سفر بھی ہے، ویانا کی نیشنل لائبریری دیکھتے ہیں، تو اُس کی تاریخ قیام تک اس سفرنامہ میں ملتی ہے — یہ کہ — "یہ لائبریری سنہ ۱۵۲۶ء میں قائم ہوئی تھی، اس میں پندرہ لاکھ مطبوعہ کتابیں اور ۴۹ ہزار قلمی نسخے ہیں، لائبریری کے ایک مخصوص حصے میں ایک لاکھ بیس ہزار نقشے، ۶۰ ہزار گیتوں کی دھنیں، ایک لاکھ قدیم نوشتے، ایک لاکھ پچیس ہزار صرف تھیٹر سے متعلق کتابیں اور تین لاکھ تصاویر محفوظ ہیں..."

معلومات فراہم کرنے کا یہ عالم ہے کہ انجمن صلیب احمر کا ذکر آیا ہے، تو اس ضمن میں بتادیا گیا کہ ایک سوئٹزرلینڈ کے شہری ہنری ڈونانٹ

نے ۱۸۶۳ء میں اس انجمن کو قائم کیا تھا۔ زیورخ کے سفر کا ذکر چھڑتا ہے تو مشہور مصلح تعلیم پستالوزی کی مختصر سوانح حیات بیان کرتے ہیں اور اس کی تحریر کا عکس تک چھاپ دیتے ہیں! اس سفرنامہ میں "حلف نامہ بقراط" تک کا ترجمہ درج کردیا ہے ... اور

"...... اس ادارے میں ایک مبسوط کتاب جالینوس پر موجود ہے مگر لاطینی زبان میں ہے، معلوم ہوا کہ اس کا انگریزی ترجمہ نہیں ملتا۔ یہ کتنی افسوسناک بات ہے، شاید ایلوپیتھی کے ماننے والے نہیں چاہتے کہ جالینوس کا زیادہ ذکر ہو، کیوں کہ اس طرح بہت سے نام نہاد محققین کی قلعی کھلتی ہے، جیسے ہاروے نے دورانِ خون کا نظریہ اپناکر غریب علامہ نفیس اور جالینوس کی کاوشوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، اس کا ترجمہ ہوجانے سے، بہت سے راز یقیناً منکشف ہوجائیں گے۔"

"ٹپ" (TIP) کے معنی پہلی بار اس سفرنامہ سے معلوم ہوتے کہ "یہ لفظ (ٹپ) انگریزی کے تین لفظوں "ٹو" "انشیور" پرومپٹ نیس (TO INSURE PROMPTNESS) کے ابتدائی تین حرفوں سے مل کر بنا ہے، مطلب یہ ہے کہ کچھ فالتو رقم ادا کرنے سے ہر کام کی تعمیل ذرا عجلت کے ساتھ یقینی ہوجاتی ہے۔ ..."

شہر برن میں پہنچ کر، فاضل مصنف کو عجیب انکشاف ہوا:۔

"یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ دعوتوں میں بالعموم خواتین کو یہاں مدعو نہیں کیا گیا اور خاص ضیافتوں میں عورتیں بالکل نہیں بلائی جاتیں ...."

اس سفرنامہ میں یہ بات کھٹکی کہ اتاترک مصطفےٰ کمال نے ترکی میں لادینی بنیادوں پر جو اصلاحات نافذ کی تھیں، اُن کی نہ صرف یہ کہ مدافعت کی گئی ہے بلکہ انہیں سراہا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اتاترک کی اصلاحات نے دینی اعتبار سے ترکی کو سخت نقصان پہنچایا۔

صفحہ ۸۷ پر "تنری اُلو دُر" (اللہ اکبر کا ترکی ترجمہ) نظر آیا، ہمارے خیال میں "اللہ" کے معنی میں ترکی زبان کا صحیح لفظ "تنگری" ہے۔ "ظاہری اور باطنی علوم کی ہر مد میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔" (صفحہ ۹۵) "مد" حسابی اصطلاح ہے "علوم کے ہر شعبہ" لکھنا چاہئے تھا۔ "وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ــ "کھنڈرات بتارہے ہیں، عمارت عظیم تھی"۔ (ص ۲۵۱)

اصل مصرع یوں ہے ــ "کھنڈرات کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی"۔

صفحہ ۲۷۳ پر "مُعلن" (ل بالکسر) کو "مُعلّن" (ل بالتشدید) لکھا گیا ہے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ــــ "اس کا چھلکا اتنا نرم اور گودے سے علیحدہ تھا کہ چٹکی کے ایک اشارے سے بالکل الگ ہوگیا، جیسے سانپ کی کینچلی، اس کے جسم سے اُترجاتی ہے۔" (ص ۲۹۲) انگور کے نرم وملائم ہونے کی تشبیہ "سانپ کی کینچلی سے دینا" ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔

"یورپ نامہ" دلچسپ ہی نہیں بلکہ بڑے کام کی کتاب ہے، ملکوں اور شہروں کے قدیم وجدید حالات جاننے کے لئے لائق مصنف نے نہ جانے کتنی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا، پھر جو کچھ "Matter" انہیں دستیاب ہوا ہے، اُسے کس سلیقہ سے جمع کیا ہے، حیرت ہے حکیم محمد سعید صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے ہجوم میں اتنی پُرازمعلومات کتاب لکھنے کے لئے وقت میں کس طرح گنجائش پیدا کی، اس کتاب کی اشاعت پر وہ علمی دُنیا کی طرف سے تحسین وتبریک کے مستحق ہیں۔

اعزازی (ٹائپ پر، مصور سرورق) چندہ سالانہ تین روپے، فی پرچہ بارہ آنہ،
ملنے کا پتہ: — ترقی اُردو بورڈ، شاہراہ نیشنل پارک، ڈرگ روڈ، کراچی ۲۹

ترقی اُردو بورڈ" کا یہ سہ ماہی مجلہ بڑے سلیقہ کے ساتھ ترتیب پاکر، منظرِ عام پر آیا ہے، اس کے دو شمارے اب تک آچکے ہیں، دُوسرا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔

پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی کی کتاب "حیات متنبی" پر حضرت جوش ملیح آبادی کی تنقید جاندار ہے، مگر انھوں نے اپنے مضمون کے آغاز میں بیچاری "غزل" کو خواہ مخواہ ملاحیاں سُنادی ہیں! جس طرح کسی شخص کو گلاب کے پھُول سے نفرت ہو جائے، تو یہ نفرت اُس کے مذاق کو بگاڑ دے گی، اسی طرح جوش صاحب کو صنفِ "غزل" سے جو نفرت و بیزاری اور خدا واسطہ کا بیر پیدا ہو گیا ہے، اس نے خود اُن کی شاعری کو "کرخت" بنا دیا ہے!

"شائقین" پر جوش صاحب نے جو اعتراض کیا ہے، وہ عربی لُغت کے اعتبار سے تو درست ہے، مگر "اُردو" میں "شائق" — شوق کو برانگیختہ کرنے والا — کے معنی میں نہیں بلکہ "صاحبِ شوق" ہی کے معنی میں بولا جاتا ہے اور یہ اُردو روزمرہ میں داخل ہو گیا ہے، جس طرح عربی کے "غلیظ" (گاڑھے) کو اُردو میں "ناپاک، ونجس" اور "شراب" کو "خمر" کے معنی میں بولتے ہیں، حالانکہ عربی میں "شراب" "خمر" (WINE) کو نہیں بلکہ "ہر ایک پینے کی چیز" کو کہتے ہیں!

کوئی شک نہیں "شائق" عربی میں "فریفتہ کرنے والے" (کنایتہً "شوق") کے معنی میں بولا جاتا ہے، لیکن اہلِ عجم اسے "مشتاق" کے معنی میں بولتے ہیں، قاآنی کا ایک شعر ہے: —

مُطیع درگہہ اوراز مانہ شائقِ خدمت
گدائے حضرتِ اُوراستارہ عاشقِ فرماں

غالبًا اہلِ ایران کی تقلید میں اردو میں "شائق" صاحبِ شوق، چاہنے والے اور مشتاق کے معنی میں مستعمل ہے۔

جوش صاحب نے "پہنانے" پر بھی گرفت کی ہے کہ روزمرہ "پہنانا" ہے، اُن کا یہ اعتراض بھی دُرست نہیں "پنھانا" اور "پہنانا" دونوں لفظوں کا اُردو میں چلن ہے، حد سے حد یہ کہہ سکتے ہیں کہ "پہنانا" "فصیح تر" ہے، مگر اس کو کیا کیجئے کہ زبان و روزمرہ کے شہنشاہ داغ دہلوی نے "پنہانا" نظم کیا ہے: —

آڑی زخموں کی جو قاتل نے پنھائی بدھی
آج مقتل میں شہید آئے ہیں دولھا بن کر

"نازک" خالص فارسی لفظ ہے، عربی گرامر کے اعتبار سے "نزاکت" غلط ہے مگر مومن کہتا ہے: —

اے ہم نفس! نزاکتِ آواز دیکھنا

اسی طرح جوش صاحب نے "تابع دار" پر جو اعتراض وارد کیا ہے، وہ بھی درست نہیں ہے "تابعدار" اُردو روزمرہ بن چکا ہے اسے دیس نکالا نہیں دیا جا سکتا، اگر اردو زبان میں نقد و احتساب کا یہی قاعدہ ملحوظ رکھا جائے، تو پھر اردو روزمرہ کے نہ جانے کتنے لفظ ترک کر دینے پڑیں گے، اور یہ زبان کا بہت بڑا نقصان ہوگا — کیا "مشاعرہ" کو اُردو زبان سے اس دلیل کی بنا پر خارج کیا جا سکتا ہے کہ عرب اس لفظ کو اس معنی میں نہیں بولتے اور شعر خوانی کی بزم کو وہ مشاعرہ نہیں "حفلۃ الشعر" کہتے ہیں ....!

جوش صاحب لکھتے ہیں :-

اور جو خوش قسمت حضرات طبعاً سخن سنج ہیں، انہیں بھی اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ وہ سطح کے پرکھنے کے بعد، شعریت و شاعر کے بے پایاں قلزم ہیں غوطہ اور بار بار غوطہ لگائیں، اس لئے کہ الفاظ کے سر پر انہیں اڑتے، معنی الفاظ کے سینہ میں اُتر کر دیکھو...."

"سطح کا پرکھنا" یہ کہاں کی زبان ہے! روپیہ، پیسہ، لعل و جواہر اور آدمی پرکھے جاتے ہیں، سطح نہیں پرکھی جاتی،... پھر "شعریت کا قلزم" تو درست ہے مگر "شاعر کا قلزم" کیا بات ہوئی!

بیگم شائستہ اکرام اللہ نے ڈپٹی نذیر احمد کی "مراۃ العروس" پر جو مقدمہ لکھا ہے، وہ خوب نہیں، بہت خوب ہے، اور اس شمارے کی جان ہے! دوسرے مضامین بھی علمی اور تحقیقی اعتبار سے بلند ہیں، سید یوسف بخاری دہلوی کی زیر طبع کتاب (ہماری پہیلیاں) کا جو باب اس شمارے میں درج کیا گیا ہے، اسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اس موضوع پر اُردو میں غالباً یہ پہلی کتاب ہوگی ــــ جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مقالہ ــــ ٹائپ اور رسم الخط کے طویل منصوبے ــــ فن، تحقیق اور معلومات کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے مگر انھوں نے اُردو ٹائپ سے ط، ث، ص، ح، ض، ض، ظ، اور ع کو خارج کرنے کی جو رائے دی ہے، وہ انتہائی غلط رائے ہے اور اُردو زبان کے حق میں تباہ کن ہے، حیدر آباد دکن کے ڈاکٹر جعفر حسین نے سب سے پہلے یہ آواز اُٹھائی تھی، جو دب چکی تھی مگر "اُردو نامہ" سے اُس کی بازگشت سُن کر وجدان نے اذیت محسوس کی۔

اس "قلم زدہ دور" میں ــــ اُردو نامہ ــــ بسا غنیمت ہے، مگر "ترقی اُردو بورڈ" کے آرگن کو ہم ہر حیثیت سے اور زیادہ دلچسپ، بلند اور متنوع دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں!

ماہر القادری

رُکن :۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان

جلد : ۱۲

شمارہ : ۱۱

ایڈیٹر : ماہر القادری

فاران
کراچی

فروری

سنہ ۱۹۶۱ء

سالانہ :۔

چھ روپے

فی پرچہ :۔

۵۰ پیسے

پرنٹر پبلشر : مسرور حسین

مطبوعہ :
مطبع سعیدی کراچی

ترتیب

مقام اشاعت : دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ ، کراچی نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقشِ اوّل

اس دُنیا میں ہر بڑی سے بڑی گمراہی یہاں تک کہ کفر و شرک کے جواز کے لئے بھی لوگوں نے دلیلیں تراشیں اور طرح طرح کی منطقیں چھانٹی ہیں، ہر ضلالت اپنے ساتھ تاویلیں، دلیلیں، اور لفاظیاں لے کر ہی منظرِ عام پر نمودار ہوتی ہے! جو لوگ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں، وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے ہیں اور دلیل کے بغیر کوئی بات نہیں کہتے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے مقابلہ میں، سردارانِ قریش اپنے قبیلوں کے جانبازوں کو جو بدر و اُحد میں لے کر گئے تھے، تو انھوں نے دلائل ہی سے انھیں مبتلائے فریب کر دیا تھا کہ ہمارا موقف دُرست ہے اور جن سے ہم لڑ رہے ہیں وہ اسی کے مستحق ہیں کہ اُن سے جنگ کی جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نمرود نے دلائل کے ساتھ ہی مناظرہ کیا تھا اگرچہ وہ حق کی دلیلوں کو سُن کر بھونچکا ہو گیا مگر اپنے موقف پر جما رہا، مُسیلمہ کذّاب نے اپنی جھوٹی نبوت کے اردگرد ہزاروں سرفروشوں کو دلیل کے ساتھ ہی جمع کیا تھا، اور قادیانی نبوت کا پورا لٹریچر دلیلوں سے بھرا ہوا ہے!

کوئی آدمی یہ طے کرلے کہ مجھے گمراہی پھیلانی ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے "احتیاج" ثابت کرنے کے لئے دلیلیں تراش سکتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سورج کی مدد کے بغیر روشنی اور حرارت نہیں پہونچا سکتا، ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کو انبیاء کی بعثت کا نظام قائم کرنا پڑا، اسی طرح دوسرے کاموں میں بھی اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے علاوہ غیر کی مدد کا محتاج ہے، اور اپنی تمام قدرت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے اندازے کا بھی یہ عالم ہے کہ اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کو اُسے خود منسوخ کرنا پڑا، اور اُس کی قدرت بھی "موانع اور حالات" سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی (نعوذ باللہ، استغفر اللہ ـــ! سُبحان اللہ عما یصفون)

وہ شخص، اس "کفریات" کو لفظی ہیر پھیر اور منطقی دلیلوں سے ہزاروں صفحوں میں پھیلا سکتا ہے، اور اپنے اس سو فیصدی غلط موقف کو دُرست ثابت کرنے کے لئے وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ سکتا ہے، جو خاصی وزنی محسوس ہونگی، اور عقل اس دھوکے میں مُبتلا ہو جائے گی کہ یہ باتیں کسی نہ کسی حد تک مستحقِ غور و فکر اور قابلِ لحاظ ضرور ہیں۔

ایک گمراہ اور ملحد (معاذ اللہ خاک بدہن گستاخ) قرآنِ کریم کے "تضاد" کو ثابت کرنے کے لئے لفظی دلیلوں کے انبار لگا سکتا ہے اور عقلی موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں سے لوگوں کو فریب دے سکتا ہے ـــــ یہ کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کو "حلیم" بھی کہا گیا ہے اور "سریع العقاب" بھی! ان دونوں باتوں میں "تضاد" پایا جاتا ہے! اور اللہ تعالیٰ نے خود کو "غفور الرحیم" کہا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ "شرک" قابلِ مغفرت نہیں ہے، اس شرط کے بعد اللہ تعالیٰ کو اپنے کو "غفور الموحدین" کہنا چاہئے تھا، اُس کی شانِ "غفاریت" عام کہاں رہی (توبہ ---!)

انشا پردازی، لفاظی، نکتہ آفرینی اور عقلی موشگافی کے زور سے اللہ تعالیٰ، قرآنِ کریم، نبوت و رسالت، آخرت..... غرض ہر حقیقت کو مشتبہ بنایا جا سکتا ہے! سمع و اطاعت اور حق کے مقابلہ میں اس قیاس آرائی، نکتہ آفرینی اور دلیل بازی کا موجد ابلیس لعین تھا، جسے اسی جرم کی پاداش میں مردود و مطرود قرار دیا گیا اور جس پر قیامت تک لعنت بھیجی جائے گی!

شیطان کو جس جرم کی سزا میں ملعون اور راندۂ درگاہ ٹھیرایا گیا، اس جرم کو عام کرنے کے لئے وہ ظالم اپنے بھائی بندوں.... (اخوان الشیاطین) کے ساتھ مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگاتا رہا ہے! وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا اور سمع واطاعت اور حق کے مقابلہ میں گمراہ ہونے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے لئے طرح طرح کی دلیلیں سجھاتا رہتا ہے۔

"انکارِ حدیث" کا فتنہ جو دراصل "انکارِ رسالت" کا ہمزبان اور "تحریکِ قرآن" کا دیباچہ اور مقدمۃ الجلیش ہے اس ہمارے زمانے کا بدترین فتنہ ہے جس کا سارا طلسم لفاظی اور انشاپردازی کے زور پر قائم ہے! اس فتنہ کے سربراہ کاروں نے قرآن کریم کی محکم اصطلاحات تک کے معنیٰ بدل دیئے ہیں، اور تحریفِ قرآنی کی وہ جسارت کی ہے کہ "فرقہ باطنیہ" کے گمراہ دانشوروں کو بھی منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

اس فتنہ کے رد میں کوئی مضمون یہ ثابت کرنے کے لئے لکھا گیا ہو کہ "اطاعتِ رسول منصوص ہے، تو ایک وہ شخص جو "اطاعتِ رسول" پر ایمان رکھتا ہو اس کا کیا موقف ہوگا؟ وہ اس مضمون کی تائید کرے گا، یا رسولؐ کی "بشری حیثیت" کی مثالیں پیش کر کے، یہ تک لکھ دے گا:—

> "رسولؐ ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ رسالت کا منصب اس سے ہر وقت وابستہ رہتا ہے، رسالت کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ رسولؐ جب بھی کچھ بولتا ہے، تو رسولؐ کی حیثیت سے بولتا ہے، اور وحی کے سوا اور کوئی بات زبان سے کبھی نہیں نکالتا۔"
>
> (ماہنامہ "ثقافت" لاہور —— از مولانا محمد جعفر پھلواروی)

اِن لفظوں کے ذریعہ خواہ مخواہ مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے! یہ کون کہتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضؓ سے یہ فرماتے تھے کہ "وضو کے لئے پانی لاؤ" اور حضرت عائشہ رضؓ سے یہ کہتے تھے کہ "میرا بوریا بچھاؤ" تو یہ باتیں "وحی" کی حیثیت رکھتی تھیں۔ حضورؐ کی اس قسم کی گفتگو اور "وحیٔ خفی کے کلمات" کے فرق کو ہر کوئی جانتا ہے!

ہم نے مولانا جعفر شاہ کی اس عبارت کو "مغالطہ" سے تعبیر کیا ہے، اور ہماری "گرفت و تنقید" کو اگر اس مثال کی روشنی میں سمجھ لیا جائے تو بات کھل کر سامنے آجائے گی!

فرض کیجئے مسلمانوں ہی میں ایک ایسا گمراہ بلکہ مُلحد گروہ پیدا ہو جاتا ہے، جو یہ کہتا ہے کہ قرآنِ کریم ایک خاص مُدت کے لئے نازل ہوا تھا، اور ایک مخصوص قوم اُس کی مخاطب تھی، چودہ سو سال میں دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے، اور زندگی کے مسائل میں غیر معمولی تغیر واقع ہو چکا ہے، اب اس زمانہ میں قرآن واجب الاطاعت نہیں ہے ---- اس کا فرانہ عقیدہ اور سراپا ضلالت نکتہ سنجی کے رد میں کوئی مقالہ لکھا جائے، جو ہر حیثیت سے جامع اور مانع ہو، اور اس کے پڑھنے سے ذہن و فکر پر یہ تاثر قائم ہوتا ہو کہ قرآنِ کریم کسی مخصوص قوم اور ملک اور کسی خاص مدت کے لئے نازل نہیں ہوا، اس کا خطاب تو پوری انسانیت سے ہے، اور اس کے احکام اور تعلیمات قیامت تک کے لئے منصوص ہیں۔

اب کوئی "نکتہ سنج" (؟)

اس مقالہ کی بعض باتوں کی تائید کرتے ہوئے، یہ بھی لکھ دے کہ قرآن کی ہر بات واجب الاطاعت نہیں ہے، مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے جو خواب دیکھنے کے بعد اپنے بیٹے اسماعیل کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل گرا کر اس کے حلقوم پر چھُری چلا دی تھی...

اب قرآنِ کریم کی اس نظیر اور ایماء پر حضرت ابراہیم ؑ کے اتباع میں آج کوئی شخص ' ایسا خواب دیکھ کر اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دے ، تو وہ "قتلِ عمد" جیسے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا ــــــــــــ تو ۔۔۔!

ــــــــ کہنے والے نے ــــــــ

بات غلط نہیں کہی ، مگر اس عقلی نکتہ آفرینی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ کے آخری ضابطۂ حیات (قرآنِ کریم) کی تعمیل و اطاعت کا عقیدہ اس سے مجروح ہوگا اور منکرینِ قرآن کے موقف کو اس عقلی موشگافی سے تقویت حاصل ہوگی ! اور اس انداز کی مزید دلیلیں لانے اور گراہ کُن ذہانت دکھانے کا یہ انجام ہوگا کہ لوگ "قرآنِ کریم" کے اوامر و نواہی کے بارے میں منکر، مذبذب اور متشکک ہو جائیں گے۔ مولانا جعفر شاہ پھلواروی نے اپنے مقالہ میں جس ذہانت، فکر اور نکتہ آفرینی کا مظاہرہ فرمایا ہے اس کی زد "اطاعتِ رسول ؐ" کے عقیدہ پر اگر پڑتی ہے ، اور یہ دین کا وہ بنیادی عقیدہ ہے ، جو اسلام کی رُوح اور ایمان کی جان ہے ۔

آگے چل کر مولانا جعفر شاہ اور زیادہ کُھل گئے ہیں ، فرماتے ہیں :۔

"رسول کی اپنی خواہشیں ہوتی ہیں ، اپنی رائے بھی ہوتی ہے ، اپنا گمان بھی ہوتا ہے ، اپنا اجتہاد بھی ہوتا ہے ، غرض سب کچھ ہوتا ہے ، اور ان چیزوں سے متعلق جو قول یا عمل موجود ہو ، وہ وحی کی حیثیت سے نہیں ہوتا ، اگر اجازت ہو تو زیادہ صفائی سے عرض کیا جائے کہ مشورہ تو خدا بھی زبردستی نہیں منواتا ، پھر رسول کا مشورہ ماننا کس طرح ضروری ہوگا ارشادِ الٰہی ہے کہ سفر اور مرض میں روزہ ترک کرنے کی اجازت ہے ، لیکن یہ بھی ہے کہ وان تصوموا خیر لکم ۔۔۔۔۔ الخ اگر رکھ لو تو بہتر ہے ۔ یہ حکم نہیں صرف مشورہ ہے کہ رکھ لو تو اچھا ہے ، لیکن اگر کوئی ساری زندگی اس مشورے پر عمل نہ کرے تو گنا ہگار نہیں ہوگا کیوں کہ یہ صرف خدا کا مشورہ ہے حکم نہیں ہے ، اس مثال سے رسول ؐ کے مشوروں کے سمجھنے میں کوئی دُشواری نہیں ہونی چاہیے ۔"

اس عبارت کو پڑھ کر ، ایک وہ شخص جو "اطاعتِ رسول ؐ" کے بارے میں مذبذب ہے ، اگر "اطاعتِ رسول ؐ" کا منکر ہو جائے تو یہ کوئی بعید از قیاس یا عجیب بات نہیں ہوگی اس خطرناک نکتہ آفرینی اور اس مغالطہ آمیز عبارت میں "اطاعتِ رسول ؐ" کے بارے میں ذہن و فکر کو متوحش اور مذبذب بنانے کی پوری صلاحیت موجود ہے ! اور وہ بزرگ ہیں کہ جب "موسیقی و غنا" کی حمایت فرماتے ہیں ، تو اُس کے جواز کے لئے صوفیاء تک کے قول و عمل سند میں پیش کرتے ہیں ، مگر جب اطاعتِ رسول ؐ کا معاملہ آتا ہے ، تو رسول ؐ کی خواہش ، رائے ، گمان اور اجتہاد کا اس بے پروائی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ، جیسے دین میں ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے ! گانے ، بجانے کے جواز کے لئے وہ شورا شوری اور اطاعت رسول ؐ کے معاملہ میں یہ بے نمکی ! توبہ ! کسی کے نفس کی خواہشیں جب اس قدر دلیر ہو جائیں ، تو جو حقیقت جتنی بھی مسخ ہو جائے کم ہے !

مولانا پھلواروی نے اپنے مقالہ میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ رسول ، امیر (اولی الامر) اور قاضی (جج) کی حیثیت سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فیصلہ اور ہر حکم بے چون و چرا واجب الاطاعت ہے ، اور اس کا انکار کفر ہے ۔۔۔۔ یہی جمہور امت کا عقیدہ ہے ، یہ کون کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس ترتیب کے ساتھ وضو فرماتے اور نماز ادا کرتے تھے ، اُس کی اطاعت جس طرح ضروری ہے ، ٹھیک اسی طرح حضور ؐ کی اطاعت میں تہمد پہننا بھی واجب ہے ! کسی غبی سے غبی اور متقشف سے متقشف

مسلمان نے بھی یہ نہیں سمجھا کہ اونٹ، گھوڑے اور خچر کے علاوہ کسی دوسری سواری پر سفر کرنا خلافِ سنّت ہے اس لئے ناجائز ہے!

اور اس فرق کو بھی جانا اور پہچانا جاتا ہے کہ جس طرح قرآن کے احکام میں فرضیت، وجوب، استحباب اور اباحت کے مدارج پائے جاتے ہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے احکام اور حضورؐ کے قول و عمل (سنّت) میں بھی یہ مدارج ملتے ہیں! یہی کہا جاتا ہے، اسی طرح کہنا چاہیئے، یہی دین کا بنیادی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین میں "مطاع" ہیں اور حضورؐ کی اطاعت منصوص ہے ـــــ اس عقیدہ کے ساتھ، کیا یہ لکھنا اور کہنا بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک مطاع ہیں، مگر وہ اپنی ذاتی خواہش، رائے، گمان اور اجتہاد میں مطاع نہیں ہیں، اس اندازِ بیان سے حضورؐ کے "مطاع" ہونے کا موقف مشتبہ ہوتا ہے اور سمع و اطاعت کی بجائے ذہن و فکر میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں ـــــ

قرآنی احکام کی اطاعت کی فرضیت اور اہمیت کو نمایاں کرنے کے بعد کیا یہ بھی لکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مشورے بھی دیئے ہیں، اور ان مشوروں کو چاہئے کوئی مانے یا نہ مانے، اللہ تعالیٰ کے مشوروں کے نہ ماننے سے ایمان و اسلام کا کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا، اور مسلمانوں کی یہ کتنی ناسمجھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اُن احکام میں جو اُس نے اپنے اللہ ـــــ یعنی واجب الاطاعت حاکم ـــــ ہونے کی حیثیت دیئے ہیں، اور ان باتوں میں جو اللہ تعالیٰ نے "مشیر" کی حیثیت سے فرمائی ہیں، کوئی فرق نہیں کرتے، مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے "آمر" اور "مشیر" ہونے کی دونوں حیثیتوں کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے ـــــ کیا یہ اندازِ بیان، یہ نکتہ سنجی اور عقلی موشگافی ایمان کو لرزا دینے والی نہیں ہے، جو کوئی اس طرز پر سوچتا ہے، اور ان اپنے افکار کو منظرِ عام پر لاتا ہے، دین و ایمان کے لئے اُس کے اس فعل کی خطرناکی کا کوئی بھلا اندازہ کیا جا سکتا ہے...... استغفر اللہ! اس تصریح کو ذہن میں رکھ کر، مولانا جعفر شاہ پھلواروی کی لکھی ہوئی یہ عبارت پڑھئے:-

> "دین اصالۃً صرف وحیٔ الٰہی ہے امرِ امیر (.... واولی الامر منکم) اور قضائے قاضی (حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم) کی اطاعت عین دین ہے کیوں کہ یہ بھی وحیٔ خداوندی کا حکم ہے اس کے علاوہ آنحضرتؐ کے تمام ارشادات بشری ہیں ـــــ بلاشبہ آنحضرتؐ کی بشری رائیں بھی تمام عقلائے عالم کی رایوں پر فوقیت رکھتی ہیں، اور ان کو مان لینا سعادتِ دارین ہے، اس میں کلام نہیں، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ کیا بشری ارشادات کی وہی حیثیت ہے، جو وحی و امر و قضا کی ہے؟ اور کیا ان دونوں کا ماننا نہ ماننا انسان کو یکساں طور پر خارج از اسلام بنا دیتا ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے، اور وہ ہے "نہیں"۔
> اور یہ بھی مسلّم ہے کہ ذخیرۂ احادیث میں وحی کا اعادہ (آنحضرتؐ کے اپنے الفاظ میں) بھی ہے اور امرِ امیر بھی، قضائے قاضی بھی ہے اور بشری مشورے بھی، لہٰذا پہلے تو بشری اور غیر بشری ارشادات کو الگ کرنا ہوگا، پھر واجب الاطاعت ارشادات یعنی وحی، امر اور قضا میں بھی یہ دیکھنا ہوگا، کہ کونسا ارشاد شخصی ہے، کونسا عمومی ہے، کونسا وقتی اور کونسا دوامی! کونسا مشروط، اور کونسا غیر مشروط! اور جو مشروط، وہ کن شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔"

یہ عبارت قاری کے ذہن کو یہ تاثر دیتی ہے کہ اُمتِ مسلمہ جو ہمیشہ سے احادیثِ نبوی کو دین کا ماخذ مانتی ہے، اُس نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری اور نبوی حیثیت میں امتیاز نہ کرنے کی بہت بڑی غلطی کی ہے، اور پورے مجموعہ احادیث کو اب اس انداز پر مُرتب ہونا چاہیے کہ حضورؐ نے جو کچھ بشری حیثیت سے فرمایا ہے، اُسے علیحدہ کر دیا جائے اور جو کچھ نبوی حیثیت سے ارشاد کیا ہے اُس کو متعین کر کے نشاندہی کر دی جائے، اور اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی نبوی ارشادات و احکام کو شخصی، عمومی، وقتی، دوامی اور مشروط و غیر مشروط خانوں میں تقسیم کرنے کا کام باقی رہ جاتا ہے۔

مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں بظاہر ایسی کوئی خرابی نظر نہیں آتی جس پر تجاوز عن الحق یا بے دینی کی طنز کی جائے، مگر جو باتیں سُجھائی گئی ہیں اور جو نتیجے پیدا کئے گئے ہیں، وہ "اطاعتِ رسول" کے عقیدہ کو مُشتبہ، مذبذب اور کمزور کرنے والے ہیں، اور جس کسی کا ذہن بھی اس مخمصے میں پڑ جائے گا کہ فلاں بات حضورؐ نے بشری حیثیت سے فرمائی ہے، یا نبوی حیثیت سے؟ تو اس طرح نفسیاتی طور پر سمع و اطاعت کا جذبہ اور عقیدہ مضمحل ہوتا چلا جائے گا، اور تکلیفاتِ شرعی سے بچنے اور پیچھا چھڑانے کے لئے اس کی اپنی خواہشیں ایسی ایسی رخصتیں اور اباحتیں پیدا کریں گی کہ پورا دین چوں چوں کا مُربہ بن کر رہ جائے گا! مولانا نے اگر یہ "حق" بات کہی ہے، تو یہ اُس طرح کا "حق" ہے، جس سے بے چارہ حق تو دبتا اور سکڑتا چلا جائے گا اور باطل کو اُبھرنے کے مواقع میسر آتے رہیں گے۔

ارشاداتِ نبوی ؐ کے جس فرق و امتیاز پر مولانا پھلواروی نے زور دیا ہے، ائمہ فقہ نے اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے، یہ خدمت انجام دی جا چکی ہے۔ کسی فقیہ نے یہ نہیں کہا کہ "ثرید" کھانا اور پیلو کی لکڑی سے مسواک کرنا اُمت پر واجب ہے، اور سفر میں جو کے ستو اور کھجور ناشتہ میں رکھنا ضروری ہیں، اور کوئی امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو اور اس دوران میں اُس کا کمسن بیٹا بھانجہ یا نواسہ مسجد میں آتا ہوا نظر آئے، تو امام کو خطبہ چھوڑ کر اپنے اس عزیز کو سنبھالنا چاہیے، اگر وہ ایسا نہ کرے گا، تو اس فعل کے خلافِ سُنّت ہونے کے سبب وہ گناہگار ہوگا۔

اربابِ فقہ جو اللہ اور رسول ؐ کے احکام کے لفظوں سے لے کر اُس کی معنویت اور اسپرٹ پر نظر رکھتے تھے، اُن کا مرتب کیا ہوا پورا فقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام وارشادات پر، جو حضورؐ نے نبی اور رسول ؐ کی حیثیت سے دیئے ہیں، مبنی ہے اور اُن سے ماخوذ اور مستنبط ہے۔ فقہی مسائل میں اگر حضورؐ کے ایسے ارشادات بھی آگئے ہیں، جن پر "بشری حیثیت" کا اطلاق ہوتا ہے، تو اُن کی اطاعت سے دین کا حُسن اور دوبالا ہو جاتا ہے، دین میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا، نبی اور بشر دونوں حیثیتوں سے حضورؐ کے اتباع میں سعادت ہی سعادت بھلائی ہی بھلائی فائدہ ہی فائدہ اور حُسن ہی حُسن ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری زندگی میں معاذ اللہ معصیت یا دین کے نقصان کی کوئی بات سرزد نہیں ہوئی، قرآنِ پاک میں گنتی کی جن چند باتوں پر انتباہ آیا ہے، وہ صرف نبوت کے منصب کے اعتبار سے قابلِ احتساب تھیں، ورنہ اخلاقی اعتبار سے اُن میں ذرہ برابر اونچ نیچ نہ تھی، اس کے بعد احادیث میں صحابۂ کرام کے چند واقعات ملتے ہیں، جن سے حضورؐ کے احکام کی نبوی اور بشری حیثیت کا فرق متعین ہوتا ہے...... یہ مقامات ذہن میں رکھ کر محمد جعفر شاہ پھلواروی کی یہ عبارت ملاحظہ فرمایئے:-

"صحابہ کو ملکہ تھا، اس لئے وہ آنحضرت ؐ کے ارشادات کی نوعیت کو سمجھ لیتے تھے، اور اچھی طرح تمیز کر لیتے تھے کہ یہ وحیٔ رسالت ہے، یا امر امیر ہے یا تقضائے قاضی ہے یا بشری رائے ہے اور اگر کہیں دریافت کرنا ہوتو دریافت کر لیتے ---"

مولانا پھلواروی اس اہمیت اور نزاکت کو خود محسوس فرماتے ہیں کہ رسول ؐ کے نبوی احکام اور بشری رائے کے فرق و امتیاز کا ملکہ صحابۂ کرام کو حاصل تھا، اور صحابۂ کرام اس دُنیا سے رخصت ہو گئے، تو اب کوئی شخص حضورؐ کے ان ارشادات کے فرق و امتیاز کو ظاہر کرنے

کا بیڑا اُٹھالے، تو اُس پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے، جب کہ اُس میں صحابہ جیسا ملکہ ہی سرے سے مفقود ہے، اور اس قسم کا قابلِ اعتماد ملکہ نہ ہونے کے باعث اس عظیم اور نازک ذمہ داری کو جو کوئی اپنے سر لیتا ہے وہ اپنے کو سخت خطرے میں ڈالتا ہے۔ جس سے فائدہ کے مقابلہ میں نقصان ہی پہنچنے کا امکان ہے۔

اس دور میں جب کہ ہم اہلِ ایمان طرح طرح کی اخلاقی بُرائیوں میں آلودہ ہیں، اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے گریز اور حیلہ سازی کی طرف طبیعتیں مائل ہیں، ان داخلی خرابیوں کے ساتھ ساتھ پورا معاشرہ بہت سے خارجی اور بیرونی مفاسد سے گھرا ہوا ہے، ایسی حالت میں حضورؐ کے ارشادات واحکام کی نبوی اور بشری حیثیت کے امتیاز کا درس دیتے ہوئے مسلمانوں کو یہ بتانے سمجھانا کہ صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے باوجود حضرت علی رضؓ نے لفظ "رسول اللہ" قلمزد کرنے سے انکار کر دیا حضرت عمر رضؓ نے حضورؐ کے حکم دینے پر بہ حیثیت سفیر کے مکہ جانے کے لئے عُذر پیش کر دیا یا یہ کہ حضرت زید بن حارثہ اور اُنکے صاحبزادے اُسامہ کو دو موقعوں پر امیر لشکر بنانے پر صحابہ معترض ہوئے ـــــ اس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نکل ہی نہیں سکتا کہ مسلمانوں میں "اطاعتِ رسولؐ" کے خلاف اشتباہ، بدگمانی بلکہ انکار و بغاوت کی اسپرٹ پیدا ہو جائے۔

مولانا پھلواروی کے بقول جب ان باتوں پر اللہ اور رسولؐ نے کوئی گرفت ہی نہیں فرمائی، تو ان پر عدمِ اطاعت اور انکار و گریز کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا، صحابہ کرام کے سامنے اس قسم کے امور کی مثالیں موجود تھیں، مگر انھوں نے ان مثالوں کو نظیر بنا کر دینی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرِ مُو اختلاف کی جرأت نہیں کی اور انھوں نے حضورؐ کی اطاعت کو اسلام اور ایمان کا لازمی تقاضا سمجھا! اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے ایک حدیث بیان کر کے مُسکرائے، اُن سے پوچھا گیا کہ آپ مسکرائے کیوں؟ نبی کے اُس فدائی نے جواب دیا کہ حضورؐ بھی تکلم فرماتے ہوئے مسکرائے تھے، میں نے لفظوں کے ساتھ ساتھ حضورؐ کی ادائے تبسم کی نقل اُتارنے کی سعادت حاصل کی ہے ـــــ اُس مسلمان کو ایمان کا خسارہ برداشت کرنا پڑے گا، جو حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل میں حضرت علی رضؓ کے لفظ "رسول اللہ" کو قلمزد نہ کرنے کو نظیر اور مثال بنا کر حضورؐ کے کسی حکم سے دانستہ سرتابی اور انکار کا مُرتکب ہوگا!

مولانا پھلواروی فرماتے ہیں:ـــ

"صلح نامہ حدیبیہ سے چودہ سو مہاجرین وانصار نے (ایک دو کے سوا) اپنی ناراضی کا اظہار کیا، اور سیدنا عمر رضؓ نے تو کچھ اپنی حد سے آگے بڑھ کر باتیں کیں، لیکن کسی کو رسولؐ کا نافرمان یا کافر نہیں سمجھا گیا، بلکہ ان کے لئے رضوانِ الٰہی سند نازل ہوئی۔ ۔ ۔"

اس واقعہ کو نقل کر کے مولانا جعفر شاہ پھلواروی آخر کیا تاثر دینا چاہتے ہیں؟ یہ تو وہ واقعات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیش آئے تھے حضورؐ کے بعد ان کے پیش آنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا، ان واقعات کی نظیر کو سامنے رکھ کر، اگر کوئی مسلمان حضورؐ کے کسی فیصلہ اور حکم سے دانستہ سرتابی اور ناراضی کا اظہار کرتا ہے، تو وہ بے ایمان ہے!

مولانا پھلواروی نے اس "لے" کو یہاں تک بڑھا دیا ہے:ـــ

"ہم دیکھتے ہیں کہ اجل صحابہ نے آنحضرتؐ کے امر اور قضا تک کو عصری حالات کے تقاضوں سے بدل دیا ہے، اس کی بیسوں مثالیں ہم اپنے مختلف مضامین میں پیش کر چکے ہیں، بلکہ حد تو یہ ہے کہ حالات بدل جانے کے بعد منصوصات تک میں لچک پیدا کی ہے، جن مولفۃ القلوب

کو بہ نص قرآنی صدقات دیئے جاتے تھے، انہیں سیدنا ابوبکرؓ و عمرؓ نے روک دیا۔۔۔"

حالانکہ مولانا موصوف

اپنے مضمون میں اُوپر لکھ چکے ہیں:۔

"حضورؐ کی تیسری حیثیت ہے، قاضی (جج) کی، اس حیثیت سے بھی حضورؐ کے فیصلے کی اطاعت بے چون وچرا واجب ہے اور اس سے انکار کفر ہے۔۔۔"

اور

"دوسری حیثیت ہے امیر (اولی الامر) کی! اس حیثیت سے بھی حضورؐ کے ہر فرمان کی اطاعت واجب ہے۔۔۔"

اس صورت میں اس کی اُمید ہی نہیں کی جاسکتی کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "امر و قضا" کے فیصلوں میں تغیر و تبدل کرنے کی جسارت کی ہو! مولانا پھلواروی نے اس قسم کی مثالیں جو اپنی تحریروں میں دی ہیں، اُن کا مفصل جواب ہاتھ کے ہاتھ دیا جاچکا ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر کہیں اس قسم کی ترمیم اور تبدیلی نظر آتی ہے، تو وہ بے سند اور محض قیاسی نہیں ہے، اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کوئی نہ کوئی دوسرا قول اور ایماء موجود ہے!

"مولفۃ القلوب" کو دیئے جانے والے صدقات کے روک دیئے جانے کی جو مولانا موصوف نے نظیر پیش کی ہے، وہ کس قدر خوفناک جرأت اور کس درجہ خطرناک نکتہ آفرینی ہے! حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ "مولفۃ القلوب" کو صدقات دینے کا حکم ہی ہمیشہ کے لئے سرے سے منسوخ قرار دیا گیا! انھوں نے اس وقت کی "ضرورت" اور "عدم ضرورت" کے فرق کو واضح کیا تھا، "مولفۃ القلوب" کی امداد و اعانت کے مسئلہ کی نوعیت نماز روزہ کے فرائض جیسی نہیں ہے، اس کا تعلق ضرورت اور حالات سے ہے! اسی طرح جس طرح "جہاد بالسیف" کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے، لیکن ضرورت، حالات اور شرائط کے اعتبار سے اس کی تعمیل ہوگی! حالات اور مصالح اجازت نہ دیں اور شرائط کی تکمیل نہ ہو، تو سالہا سال تک اس فریضہ کی تعمیل کی نوبت نہیں آسکتی!

مگر

"مولفۃ القلوب" اور "جہاد" کے مسائل کو نظیر بنا کر فرض نماز کے ایک سجدہ اور زکوٰۃ میں دیئے جانے والے رسّی کے ایک ٹکڑے میں بھی کمی نہیں کی جاسکتی!

حرفِ آخر

مسٹر پرویز "اطاعت رسولؐ" سے انکار کرتے ہیں، اُن کے انکار کو سُن کر اور پڑھ کر، طبیعت میں نفرت، توحش اور بیزاری پیدا ہوتی ہے، اور معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ شخص کیا مشن رکھتا ہے اور دین کو مسخ کرنے کے لئے اس نے کیا بہروپ اختیار کر رکھا ہے، مولانا محمد جعفر شاہ "اطاعتِ رسولؐ" کا اقرار کرتے ہیں، اور اس کے منکر کو کافر بتاتے ہیں، مگر اتنا سب کچھ کہنے کے بعد، صلح حدیبیہ، حضرت اسامہؓ کی فوج کی سرداری اور حضرت عمرؓ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجنے کے واقعات، ذہنوں میں اس طرح کا زہر اُتارنے کے لئے پیش کرتے ہیں:۔

"۔۔۔ جناب خبابؓ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ رسولؐ کی ہر بات وحی کا درجہ نہیں رکھتی، اور نہ ہر بات بے چون وچرا مان لینا ضروری ہے۔۔۔۔"

اور

".....بات بالکل صاف ہے کہ صحابہ آنحضرت صلعم کی ہر بات کو واجب التسلیم نہیں سمجھتے تھے، وہ صرف وحی کو بے چون وچرا مانتے تھے، یا امر کو یا قضا (فیصلے) کو آنحضرت صلعم کے ذاتی مشوروں کو نہ وہ واجب الاطاعت سمجھتے تھے، نہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم - - -"

مگر

آگے چل کر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "امر وقضا" کا منصب بھی اُنکے قلم سے محفوظ نہیں رہتا۔ فرماتے ہیں:-

"ہم دیکھتے ہیں کہ اجلہ صحابہ نے آنحضرت صلعم کے امر اور قضا تک کو عصری حالات کے تقاضوں کے تحت بدل دیا ہے، اس کی بیسیوں مثالیں ہم اپنے مختلف مضامین میں پیش کرچکے ہیں، بلکہ حد تو یہ ہے کہ حالات بدل جانے کے بعد منصوصات تک میں لچک پیدا کی ہے"

یہ وہ انداز فکر، طرز استدلال اور نکتہ آفرینیاں ہیں کہ جن سے پرویز کے مسلک کو کمک اور تقویت حاصل ہوتی ہے!

مولانا موصوف نے "اطاعت رسول" کے بارے میں جو انداز بیان اختیار فرمایا ہے جس کی تفصیل انھی کی تحریر کے اقتباسات سے پیش کی جاچکی ہے، اُسے ایک سامنے کی مثال کے ذریعہ سمجھ لیا جائے، تو اُن کے طرز فکر کی خطرناکی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ——— مثلاً کوئی یوں کہے باپ کی اطاعت بیٹے پر لازمی ہے، خود قرآن پاک میں اس اطاعت کی تاکید آئی ہے - - - - مگر ساتھ ہی وہ ایسی باتیں بھی سمجھادے اور یہ نکتے بھی ذہن میں اُتار دے کہ دوپہر کا وقت ہو، اور تیز دھوپ پڑرہی ہو، اور باپ بازار سے برف لانے کے لئے بیٹے سے کہے اور بیٹے کو ایسا محسوس ہو کہ باہر نکلنے سے لُو لگ جائے گی، اور اس طرح اُس کی جان کو خطرہ لاحق ہوجائے گا تو باپ کا حکم نہ ماننے سے کوئی قباحت لازم نہیں آتی، یا باپ بیٹے کو سینما دیکھنے سے روکے، اور بیٹے کو اپنی طبیعت اور نفس کا اندازہ ہو کہ وہ سینما دیکھنے کے لئے نہ گیا، تو کسی کبیرہ گناہ میں مُبتلا ہوجائے گا، تو ایسی صورت میں بیٹے کو سینما دیکھنے کے لئے چلے جانا چاہئیے' باپ بیٹے کو اُس کے بعض بدنام دوستوں کے ساتھ ملنے جلنے سے روکے، اور بیٹا یہ سمجھتا ہو کہ اُن دوستوں سے تعلق قطع کرنے میں انسانی مُروت کا خون ہوجائے گا، تو اُسے دوستوں سے بدستور ملتے رہنا چاہیئے اور خود قرآن میں حضرت سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کی مثال موجود ہے کہ انھوں نے باپ کو رُوحانی ایذا تک میں مبتلا کردیا۔ مگر قرآن نے اُن کو کافر نہیں ٹھیرایا۔۔۔۔ اس پورے درس و وعظ میں یہ نہیں کہا گیا کہ باپ کی اطاعت ضروری نہیں ہے! آغاز کلام میں باپ کی اطاعت کی اہمیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے مگر بعد میں جو نکتے بیان فرمائے گئے ہیں، اُن کے پیش نظر باپ کی اطاعت کی اہمیت کیا بیٹے کے دل میں باقی رہ سکتی ہے؟ یہ تعلیم و تلقین جس بیٹے کے دل میں بھی گھر کر جائے گی، وہ باپ کے ہر حکم کے مقابلہ میں اُسے ٹالنے، نہ ماننے اور پس پُشت ڈالنے کے لئے حیلے ڈھونڈے گا - - - - - -

مولانا پھلواروی صاحب نے "اطاعت رسول" کے اقرار کے بعد، "اطاعت رسول" سے انحراف کے جو نکتے سُجھائے ہیں، اور اس "کار خیر" میں اپنی جس ذہانت، باریک بینی اور ژرف نگاہی کو صرف کیا ہے، اُس کے نتائج خود اُن کی تحریروں میں واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں ——— آج کی دُنیا میں ہر خطہ اور ہر ملک میں تجدد اور تفریح دین و ایمان اور اخلاق کے مقابلہ میں حیلہ سازی تساہل و تغافل اور گریز و فرار کا ڈرامہ کھیل رہے ہیں، مولانا پھلواروی جیسے ارباب فکر نے اس اسٹیج کے پردوں کی تزئین کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے!

پاکستان میں آرٹ اور ثقافت کے نام پر رقص و موسیقی کے جو شرمناک مظاہرے ہورہے ہیں، اُن کو مولانا جعفر شاہ

کی کتاب "اسلام اور موسیقی" نے شرعی طور پر جواز کی کسی نہ کسی درجہ میں بہر حال سند عطا فرما ہی دی ہے، بنکوں کا سود ہو، فیملی پلاننگ ہو، تعدد ازدواج ہو، ان تمام مسائل میں اُن کا نقطہ نگاہ تجدد پسندانہ ہی رہا ہے، متجددین کو اسی قسم کے "ماڈرن مُفتیوں" اور "اپ ٹو ڈیٹ مولویوں" کی تلاش بھی تھی!

اللہ اور رسول کے احکام اور دینی تعلیمات میں زمانہ کی ترقی کا ساتھ دینے کے لئے لچک پر لچک پیدا کرتے رہنے اور اباحت کیا کراہت کی حد پر بھی رُکنے اور قناعت نہ کرنے کا ہی یہ نتیجہ نکلا کہ مصطفٰے کمال پاشا نے دین کی اصل قدروں تک کو مسخ کرکے رکھدیا، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور جن اربابِ اقتدار کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا، وہ پاکستان کو مصطفٰے کمال کے دور کا ترکستان بنا دینے کے عزائم رکھتے تھے، اُن لوگوں کی تو زمانہ کے انقلاب نے ترکی تمام کردی، مگر اُن کے عزائم و افکار جس علمی کارخانہ میں ڈھلتے ہیں، وہ اپنا کام کئے جا رہا ہے۔

اُس ترقی سے ہزار بار اللہ تعالیٰ کی پناہ، جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد میں ترمیم و تبدیلی کا ادنیٰ سا وسوسہ بھی دل و دماغ میں پیدا ہو، ہمیں اطاعتِ رسول کے لئے زمین میں دفن ہونا قبول ہے مگر اطاعتِ رسول سے انحراف کرتے ہوئے عطارد و مشتری میں پہنچنا قبول نہیں ہے! اگر اس عقیدہ کا نام رجعت پسندی، اور مُلّائیت ہے، تو ہم اس طنز کو خوشی کے ساتھ قبول کرتے ہیں!

ماہر القادری ۱۸ فروری ۶۱ء

٦٤

ماہر القادری

اسلام کا تاریخی کردار

یہ غلط فہمی مغرب کے علماء (مستشرقین) کی پھیلائی ہوئی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "بانیٔ اسلام" کہتے ہیں۔ اور اس طرح ظہورِ اسلام کی مدت چودہ سال کے لگ بھگ قرار پاتی ہے۔ حالانکہ قرآنِ پاک سے اس نظریہ کی واضح لفظوں میں تردید ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم "اسلام کو دینِ فطرت" کہتا ہے۔ اور پہلا انسان آدم جس کا دنیا میں وجود ملتا ہے وہ اسلام پر قائم تھا اور مسلم تھا تمام انبیاء کرام اور رسلِ عظام "اسلام" ہی کی دعوت دیتے تھے۔ اور ان کے پیرو "مسلم" کہلاتے تھے۔ اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے۔ انسانی زندگی کے آغاز ہی سے اسلام کی تاریخ شروع ہوتی ہے

اور

اسلام کا بانی خود اللہ تعالیٰ ہے۔ کسی نبی اور پیغمبر سے اسلام کی بنا اور خلق و ایجاد کو منسوب کرنا ٹھیک نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا تو اس کے لئے "ضابطۂ حیات" بھی بھیجا، انسان کو بھٹکنے کے لئے آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ کونسی چیز "حق" ہے اور کون "باطل" ہے! حق و باطل میں تفریق و امتیاز کرنے کے جس ضابطہ کو لے کر انبیاء مبعوث ہوتے، اسی کا نام اسلام ہے۔ یہ ضابطۂ حیات بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اس طرح حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے آدمی پسندیدہ انسان اور جدید عمرانیات کی اصطلاح میں "شریف شہری" بن جاتا ہے۔

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ "اسلام" دنیا میں یونہی صرف زبانی وعظ و تبلیغ سے نہیں پھیلا، اس کے لئے اسلام کی دعوت دینے والوں کو سخت جد و جہد کرنی پڑی ہے۔ یہاں تک کہ انبیاء کرام کے لئے قتل گاہیں اور آگ کے الاؤ تیار کئے گئے۔ اور صلیبیں کھڑی کی گئی ہیں۔ حدیث شریف میں اس کی صراحت آئی ہے کہ داعیانِ حق کے جسموں کو لوہے کی کنگھیوں سے کھرچا جاتا تھا۔ اور ان کے سروں پر آرے چلائے جاتے تھے۔ مگر ان تمام جان لیوا سختیوں کے باوجود، خدا کے اُن نیک اور صاحبِ عزیمت بندوں کے پائے استقامت میں جنبش تک پیدا نہیں ہوئی۔ وہ حق پر جمے رہے اور باطل کا مقابلہ کرتے رہے۔

اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں، باطل کا خواہ وہ جس شکل میں بھی نمودار ہوا ہو۔ مقابلہ کیا وہ چاہے پتھر اور لکڑی کے تراشے ہوئے صنم ہوں یا شخصیتوں کے بت ہوں، خواہشوں کے جھوٹے خدا ہوں یا تصورات کے "الٰہ" انبیاء ہوں، ملائکہ ہوں، صلحاء ہوں، چاند ستارے ہوں، ان میں سے جس کو بھی گمراہ انسانوں نے قابلِ پرستش سمجھا، اسلام نے اس گمراہی کو چیلنج کیا۔

تاریخ کے ہر دور میں اونچے طبقہ کے خوشحال لوگ (مترفین) اپنے قول و عمل سے گمراہیاں پھیلاتے اور خرابیاں پیدا کرتے رہے ہیں۔ مال و دولت کی فراوانی اور خوشحالی ان کو غفلت میں ڈال دیتی ہے اور ان کی خواہشیں زیادہ سے زیادہ آزادی رخصت اور الاؤنس چاہتی ہے۔ اس لئے جب کوئی داعیٔ حق ان کی حرکتوں پر ٹوکتا ہے۔ تو وہ ان کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو انہی کھاتے پیتے لوگوں سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جن بت پرستوں اور بت خانہ کے متولیوں سے تصادم ہوا وہ خوشحال افراد تھے۔ یہی صورتِ حال دوسرے نبیوں کو پیش آئی۔ قارون جیسے بخیل اور دولت مند گروہ ہی سے

تعلق رکھتے تھے۔ اور جو لوگ ناپ تول میں کمی (تطفیف) کرتے تھے۔ وہ بھی سوسائٹی کی اس ہائی کلاس سے متعلق تھے۔ یہاں تک کہ انبیاء کرام کو اپنے وقت کے فرمانرواؤں تک سے ٹکر لینی پڑی اور نمرود و فرعون جیسے جابر بادشاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اسلام نے حضور خاتم النبیین ؐ کی بعثت سے قبل :۔

شرک و بُت پرستی اور جاہ پرستی کا مقابلہ کیا

بخل، خیانت، بدکاری اور فسق و فجور کے خلاف جہاد کیا۔

اور

غلط کار خوشحال طبقہ اور گمراہ فرمانرواں سے ٹکر لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام "جلال" بن کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام "جمال" بن کر نمودار ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت سیدنا محمد عربی ؐ (ہماری جانیں حضور پر قربان ہوں) کے دور میں "جلال" و "جمال" ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ اسلام طائف میں پتھر بھی کھاتا ہے اور بدر و خیبر میں تلوار بھی چلاتا ہے۔ ہجرت کی مظلومیت بھی اسلامی تاریخ کا ایک ورق ہے اور فتح مکہ کی شانِ غلبہ و جبروت بھی اس کی تاریخ کا روشن باب ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کی بیوی اور وہاں کے اونچے طبقہ کی بیگمات کے "ہوسناک کردار" کی جس آزمائش سے گزرنا پڑا اور اونچے طبقہ اور ہائی کلاس سوسائٹی کے تبرج اور جاہلی کردار کے مقابلے میں اسلام کی عفت و عصمت کی تعلیم کی ایک مستقل آویزش کی تاریخ ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بتاتا ہے کہ خوش حال طبقہ میں جب کردار کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو یہ طبقہ برائیوں میں دوسرے نیک لوگوں کو بھی مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ سب ایک جیسے ہو جائیں اور انہیں کوئی ٹوکنے والا نہ رہے۔ آج کی دنیا میں بھی زلیخا اور زنانِ مصر کی تاریخ اور زیادہ اہتمام کے ساتھ وسیع پیمانہ پر دہرائی جا رہی ہے۔ دُنیا کے پردے پر ہر جگہ خوشحال طبقہ ہی نے تو کلب گھر، ڈانسنگ ہال تھیٹر اور آرٹ سرکل قائم کر رکھے ہیں اور مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط کے ذمہ دار یہی مترفین ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے اس ہولناکی کا مقابلہ اپنی عصمت کردار سے کیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس امتحان میں کامیاب ہوئے اگرچہ اس کی پاداش میں انہیں قید خانہ کی جوکھم اٹھانی پڑی۔ تو خوش حال طبقے کی طاقت سے مرعوب ہوئے بغیر کلچرڈ عورتوں کے تبرج اور ہولناکی کا مقابلہ عصمت و پاکبازی سے کرنا یہ بھی اُسلام کا تاریخ میں رُول رہا ہے۔

اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں ظاہری اعمال اور محسوس کردار ہی کا مقابلہ نہیں کیا۔ بلکہ ملحدانہ اور گمراہ کن نظریات اور خود ساختہ غلط تصورات کی بھی اسلام نے تردید کی ہے، نزول قرآن سے قبل۔

۱۔ تعدد الٰہ (۲) تثلیث (۳) ابوت اللہ (خدا کا باپ ہونا) (۴) مادہ اور عالم کی ازلیت و ابدیت (۵) کائنات میں ایک سے زائد مدبر و فاعل اور خالق کا وجود (۶) اہرمن و یزداں کی ثنویت (۷) مزدک کا یہ فلسفہ کہ زر، اور زمین میں اشتراک ہے۔ ہوا اور پانی کی طرح عورتیں بھی "ملکِ مشاع" ہیں۔ ہر ایک مرد اُن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ (۸) ذاتِ باری کا حلول و اتحاد .... اس قسم کے تمام عقائد اور نظریوں کی اسلام نے تردید کی ہے۔

تاریخ کا روشن ترین دور

دوسرے نبیوں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قریش کے متمول اور خوش حال لوگوں کی مزاحمت اور دشمنی سے سابقہ پڑا۔ عتبہ۔ ابولہب۔ شیبہ اور ابوجہل یہ سب کے سب مکہ کے خوش حال طبقہ کے ممتاز افراد تھے۔ بلال رضؓ۔ صہیبؓ اور دوسرے نادار غریب مسلمانوں پر اوپنچے طبقہ کے لوگ ہی طرح طرح کی سختیاں کرتے اور اذیتیں دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے جب چند صحابہ ہجرت کرکے حبش پہنچے تو قریش کے کھاتے پیتے لوگوں کی ایک ٹولی نے حبش جاکر وہاں کے بادشاہ کے درباریوں کو رشوتیں اور ہدیے دیئے کہ وہ دربار میں ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اس موقعہ پر اسلام نے صحابہ کی جرأت وصداقت اور حق گوئی اور سادگی کے بھیس میں اس سازش کا مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلام ہی کی جیت رہی۔

عہدِ رسالت میں اسلام نے یہی نہیں کیا کہ حجاز کی سرزمین کو لکڑی اور پتھر کے بتوں کی آلائش سے پاک کر دیا بلکہ اس کے ساتھ ہی وطن، نسب۔ دولت اور رنگ ونسل کے فخر کے بتوں کو بھی دلوں سے نکال کر چھوڑا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے داعی کی حیثیت سے یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ عرب کے طول وعرض میں جاہلی معاشرہ کے مقابلہ میں دینی معاشرہ قائم فرما دیا اور نہ صرف معاشرہ ہی نہیں بلکہ ایسی حکومت بھی جہاں صرف اللہ تعالیٰ کا حکم چلتا تھا اور جہاں کا ایوانِ ریاست "کتاب وسنت" کے محکم ستونوں پر قائم تھا۔ یہ اسلامی حکومت دنیا کے تمام دساتیر وقوانین نظام ہائے حکومت اور تہذیبوں کے لئے ایک چیلنج تھی کہ اسلام مسجدوں سے لے کر ایوانِ حکومت تک اور مدرسوں سے لے کر بازاروں اور معشیت گاہوں تک زندگی کے ہر شعبہ کی رہنمائی۔ سرپرستی اور اس کے غور وپرداخت کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بعثت نبوی ﷺ کے دور میں عرب پر جاہلیت تہذیب چھائی ہوئی تھی۔ عربوں کا ادب فحاشی اور نسلی غرور وعصبیت کا ادب تھا اور شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ قمار بازی ان کا دن رات کا مشغلہ تھی مرد وزن کا بے باکانہ اختلاط ان کی تہذیب کا سرمایہ عز وافتخار تھا، یہاں تک کہ عورتیں برہنہ اور نیم برہنہ حالت میں کعبۃ اللہ کا طواف کرتی تھیں۔ اسلام نے معاشرے کی ایک ایک برائی کو مٹایا خاص طور سے صنفِ نازک کی اصلاح میں انقلابی پارٹ ادا کیا۔ عورتوں کے چہروں اور گریبانوں پر چادریں اوڑھنیاں اور جلباب آگئے۔ مقاماتِ زینت کی پردہ پوشی ہونے لگی۔ بیباکی اور بے حیائی شرم وغیرت اور حیا سے بدل گئی۔

خلافتِ راشدہ کے مبارک دور میں "اسلام" کو سب سے پہلے فتنۂ ارتداد سے مقابلہ کرنا پڑا اور اس فتنہ کا قلع قمع کرکے چھوڑا اس کے ساتھ جھوٹی نبوت کے دعویدار جگہ جگہ اٹھ کھڑے ہوئے، اس فتنہ کی بھی پوری طرح سرکوبی کی گئی۔ بعض مدعیانِ نبوت کو قتل کیا گیا۔ کسی کسی نے توبہ بھی کرلی۔

اس کے بعد "منع زکوٰۃ" کا فتنہ ابھرا، یہ بڑا نازک موقعہ تھا، خود امتِ مسلمہ میں ایسے غلط اندیش لوگ پیدا ہوگئے جو زکوٰۃ ادا کرنے سے نہ صرف یہ کہ جی چراتے تھے بلکہ اس کے ادا کرنے سے انکار کرتے تھے۔ اسلام کے ایک بہت بڑے رکن کا اس دیدہ دلیری سے انکار کس طرح برداشت کیا جا سکتا تھا۔ اس موقعہ پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق رضؓ کو اس قسم کی رائے دی جس میں شدت کی جگہ قدرے نرمی کا انداز پایا جاتا تھا فاروقِ اعظم کی اس رائے میں مصلحتِ وقت کی نزاکت اور اس کی رعایت کی جھلک بھی ملتی تھی۔ اس پر حضرت صدیق رضؓ نے کہا کہ "عمر! تم جاہلیت میں تو بڑی آن بان والے تھے، اسلام میں کمزور کیسے ہوگئے۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں رسی کے ایک ٹکڑے پر بھی زکوٰۃ لی جاتی تھی۔ تو وہ تک ان مانعینِ زکوٰۃ سے لے کر دم لوں گا۔" چنانچہ یہی ہوا۔ ابوبکر صدیق رضؓ نے جو کچھ زبان سے کہا اسے پورا کرکے دکھایا۔ مرتدین کی طرح مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کی گئی، یہاں تک کہ

ان کو زیر ہونا پڑا۔

خلافتِ راشدہ میں "اسلام" محاذِ جنگ ہی پر نہیں۔ سیاست و تہذیب، تمدن و تجارت اور معاش و معاشرت کے ہر محاذ پر غالب نظر آتا ہے، عراق میں، مصر و شام میں، ایران و حضر موت میں اسلام جہاں پہنچا، اس نے تمام تہذیبوں پر غلبہ حاصل کر لیا جاہلیت کی کسی غلط رسم اور ناجائز قانون سے اسلام نے سمجھوتا نہیں کیا۔ حمورابی کے قانون کی دُنیا میں بہت دھوم تھی۔ مگر اسلام کے دستور و قانون کے سامنے حمورابی کے اصولِ قانون کا چراغ گل ہو گیا، ایران و روم اور مصر و بابل کی دانش، اسلام کی حکمت کے آگے طفلِ مکتب ثابت ہوئی، اللہ تعالیٰ کی زمین پر اسلام کی فوجوں کا نہیں، اسلام کی حکمت کا اسلام کے اصولوں کا اور اسلام کے قانون کا مکمل غلبہ تھا۔

ایران و عجم نے اسلام تو قبول کر لیا، مگر اس سرزمین میں ایسے عناصر بھی موجود تھے جو دل ہی دل میں اسلام کو ترقی سے جلتے تھے اور اسلام کے خلاف بغض رکھتے تھے، یہی بغض خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت بن کر رونما ہوا، فتنۂ سبائیت اسی عجمی سازش کا مظہر تھا، اس سبائیت نے حضرت علی رضؓ کی شان میں غلو کیا اُن سے الوہی صفات منسوب کیں۔ یہاں تک کہ بعض غالی سبائی تو بادلوں کو دیکھ کر چیخ اٹھتے تھے کہ:—

"یہ علی کی سواری جارہی ہے"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں کہ انھوں نے اس قسم کے غالی عقیدت مندوں کو نہ صرف یہ کہ ٹوکا بلکہ انھیں عبرتناک سزائیں دیں۔

رفض و خروج کے فتنے بھی کسی نہ کسی حیثیت اور نوعیت سے "اسلام" کی وحدت اور مرکزیت پر ضرب لگانے والے ثابت ہوئے۔ ان فتنوں کا بھی توڑ کیا گیا مگر جس طرح دنیا میں حق کے ساتھ باطل بھی پایا جاتا ہے بلکہ انسانوں کی آزمائش و امتحان کے لئے اسے باقی رکھا جاتا ہے اسی طرح رفض و خروج بھی آج تک پائے جاتے ہیں مگر ان فتنوں کی نشاندہی اور ان پر انگلی رکھ کر بتانے کے لئے اسلام کے جاننے والے آج بھی موجود ہیں۔

ملوکیت کی برائیوں کے خلاف حضرت حسین اور حضرت عبد اللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے جو معرکہ آرائی کی اور اپنی جانوں کی بازی تک لگادی وہ اسلام ہی کے اصول کی فتح تھی۔ بعد میں جاکر حضرت نفس زکیہ نے بھی اسی تاریخ کو دہرایا۔

اسی صدی میں حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے تجدید و احیاءِ دین کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور دُنیا نے محسوس کیا کہ فاروقِ اعظم رضؓ کا دورِ خلافت پھر لوٹ کر آگیا۔

"طلاقِ مکرہ" کی آڑ میں "جبری بیعت کا فتنہ" اور "خلقِ قرآن کا فتنہ" اسکے خلاف امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ نے جو سرفروشانہ موقف اختیار فرمایا تھا۔ وہ اسلام کے دفترِ مفاخر کا بہت روشن باب ہے، ملوکیت کے جبر و ظلم بے راہ روی اور اطمینان و فساد کے مقابلہ میں "اسلام" عزیمت و سرفروشی اور حق گوئی بن کر نمودار ہوا ہے۔

گمراہیاں عجم و یونان کا فلسفہ جب مسلمانوں میں پھیلا، تو اس نے بہت سے روپ اختیار کئے، ان گمراہ کن فلسفیانہ تصورات کی برائیاں اور مضرتیں مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں بٹ گئیں ــــ باطنیت، اعتزال، جہمیت کرامیت، تعطیل، مرجیت، جبریت، قدریت، لاادریت، دہریت اور سفسطائیت یہ عجمی عقائد و تصورات کے مظاہر ہیں! کسی نے ذاتِ باری کے لئے جسم مانا، کسی نے اس کی قدرت کو محدود گردانا کسی نے "دہر" کو ازلی اور ابدی ٹھہرایا۔ کسی نے

کہا کہ بندہ صدور فعل میں جمادات کی طرح مجبور ہے۔ کسی نے بندہ کو اس کے فعل کا فاعل حقیقی قرار دیا۔ کسی گروہ نے احادیث نبوی ص کا انکار کیا، فلاسفہ کی ایک جماعت نے مادہ ہی کو سب کچھ سمجھا۔ اس عقیدہ کے لوگوں کو "اصحاب الہیولیٰ" کہا جاتا ہے۔

فارابی اور بوعلی سینا مسلمان بھی تھے مگر ارسطاطالیس اور بر قلس کے افکار کے ترجمان۔ انھوں نے عالم کو "قدیم بالذات والصفات" کہہ کر عالم کو "خالقِ عالم" کا ہمسر ٹھہرا دیا۔

مگر

متکلمین نے فلاسفہ کے ان گمراہ کن عقائد کا رد کیا اور اس طرح اسلامی افکار کی بروقت نمائندگی کی مختصر لفظوں میں یوں سمجھیے کہ بارہ سو سال کی مدت میں فلاسفہ اور متکلمین کے درمیان مستقل نزاع برپا رہی ہے۔ فلاسفہ نے تصور و تخیل کے بت تراشے ہیں اور اہلِ کلام نے ان کو پاش پاش کیا ہے۔ اگرچہ اس بحث و نزاع اور کلامی و فلسفیانہ معرکہ آرائی اور موشگافی میں بعض متکلمین سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں۔

فلاسفہ کے ان گمراہ کن معتقدات کے خلاف اشاعرہ نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے "قدم عالم" کے رد میں بہت کچھ لکھا! مسلمانوں میں راوندی جیسے غلط اندیش فلسفی پیدا ہوئے۔ تو اس کے مقابلہ میں صحیح الفکر متکلمین بھی میدان میں آگئے۔ جنھوں نے ان ملحدانہ عقائد کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں!

ہوتا یہ رہا ہے کہ جب بھی دین میں کوئی زیادتی ظہور میں آئی اسلام کے صحیح ترجمانوں اور نمائندوں نے اس کی اصلاح کے لئے جد و جہد کی اور مسلمانوں کو بتا دیا کہ دین کی قبا میں یہاں یہاں جھول پیدا کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک تزکیہ نفس کا تعلق ہے تصوف کی افادیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ "تصوف" کے نام سے دین میں بہت سی خرابیاں بھی داخل ہو گئیں اسی طرح فقہی مسائل میں وہ چیز جس کا نام "اہل ذکر" پر اعتماد تھا رفتہ رفتہ تقلید جامد سے بدل گیا — تو تصوف کی غلطیوں اور تقلید کے جمود کے خلاف بھی ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے اکابر نے شدید احتجاج کیا۔

اسی طرح شرک و بدعت کا بھی ہر دور میں رد ہوتا رہا اور ابن جوزی، شیخ محمد بن عبدالوہاب اور شاہ اسماعیل شہید جیسی توحید شناس اور کتاب و سنت کی علمبردار ہستیاں ظہور میں آتی رہیں۔

اسلامی عزیمت کی چند جھلکیاں

اسلام ہی کا یہ فیضان تھا کہ ملوکیت کی تمام بدعتوں کے باوجود، صلاح الدین ایوبی، ناصر الدین محمود اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے حق پسند فرمانروا بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ افسوس ہے۔ اس مزاج اور کردار کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہے۔ پھر بھی جتنے نام بھی ملتے ہیں، ان پر تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

سلطان محمد تغلق کو بعض قدیم مورخین نے عجب انداز میں پیش کیا ہے۔ ان تاریخوں کو پڑھ کر عہدِ تغلق کے بارے میں حسنِ ظن مشکل ہی سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے اپنی بعض کوتاہیوں کے باوجود یہ بادشاہ بڑا ہی صاحبِ فراست اور دور اندیش تھا اس کا سب سے بڑا کارنامہ شرک و بدعت کا استیصال ہے اسی لئے اہلِ خانقاہ اس کو ناپسند کرتے تھے اور انکی یہ ناپسندیدگی ایک عوامی مسئلہ بن گئی۔

مسلمانوں میں جلال الدین اکبر جیسے جاہل اور بے مغز فرمانروا بھی پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے بادشاہت کے تخت پر اپنی خدائی کی کرسیاں بچھا دی تھیں۔ مگر انکے دربار میں جہاں ابوالفضل اور فیضی جیسے زمانہ ساز درباری پائے جاتے تھے وہاں ملا عبدالقادر

بدایونی جیسا حق گو بھی موجود تھا، جس کی عزیمت نے "اکبر اعظم" کے جاہ وجلال کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔

پھر تقریباً اسی دور میں حضرت مجدد الف ثانی رح منظرِ عام پر آتے ہیں جن کی حق گوئی جہانگیر کے جاہ وسطوت سے ٹکر لیتی ہے اور آخر کار میدان اسی فقیرِ بے نوا کے ہاتھ رہتا ہے۔

اسلام ہر دور میں اپنے جانباز سرفروشوں کو میدان میں لایا ہے وہ بالاکوٹ کے شہیدا ہوں شیخ سنوسی ہوں مہدی سوڈانی ہوں ۵۷ سنہ ء کے جنگِ آزادی کے ہیرو مولوی احمد اللہ مدراسی ہوں، یا ہمارے زمانہ کے شیخ حسن البناؒ اور عبد القادر عودہ ہوں ان کی قربانیوں نے ایثار وسرفروشی کے سلسلۃ الذہب (GOLDEN CHAIN) کو استوار رکھا ہے۔

اور

ابھی کروڑوں آدمی اس کے گواہ موجود ہیں کہ لاہور کے پھانسی گھر میں ایک باعزیمت مردِ مومن کے ماتھے پر موت کا حکم سن کر ہلکی سی شکن بھی نہیں آئی معاصرت کا فتنہ بعض اوقات بڑا ہی ظالم اور نامنصف ثابت ہوتا ہے۔ آج کہنے والے جو کچھ کہہ لیں مگر اسلامی تاریخ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ بیسوی صدی عیسوی کے وسط میں اس کے قلم نے اسلام کی یقیں آفریں ترجمانی اور نمائندگی کی ہے۔

حرفِ آخر اسلام نے ہر دور کے فتنہ کا مقابلہ کیا ہے، تلوار سے بھی اور زبان وقلم سے بھی اسلام نے صرف شمشیر آزمائی ہی نہیں کی وہ ابرِ رحمت بن کر بھی برسا ہے۔ آج کی دنیا میں جہاں کہیں جس مقدار میں بھی صداقت پاکیزگی اور نیکی پائی جاتی ہے وہ سب اسلام کا طفیل ہے۔ اس دور میں تمام مذاہب ایک مستقل معذرت بن کر رہ گئے ہیں۔ صرف اسلام ہے جو ہر فتنہ سے برد آزمائی کر رہا ہے۔ اسلام دنیا سازی تو جانتا ہی نہیں ہے اس لئے وہ غیر اسلامی نظریوں سے کبھی مصالحت نہیں کرتا۔ آؤ ہم سب مل کر اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کی کو[illegible]ں کریں۔

○ ناظر انصاری

شاعر و فنکار

اقبال کی نظر میں

کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یقین محکم اور عملِ پیہم سے زندگی سنورتی ہے۔ جہدِ مسلسل اور محنتِ پیہم سے ثبات اور دوام حاصل ہوتا ہے۔ شاعر کو زندگی کا نقاد ہونا چاہیے۔ اور شاعری کو حیاتِ انسانی کی تنقید و تفسیر۔ زندگی کی جد و جہد اور کش مکش سے علیحدہ رہ کر کارزارِ حیات میں انسان نہ تو فتح مندی اور کامرانی حاصل کر سکتا ہے اور نہ اُسے ثبات و دوام نصیب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے تمام اکابر شعرا ہمیشہ اپنے دور کے واقعات و حادثات سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ بلا شُبہ اُن کے شعر و ادب میں خیال آرائی اور خلاقیِ فکر موجود ہے لیکن وہ حقائق سے نا آشنا اور بے بہرہ نہیں رہے۔

یہ امر مُسلّم ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ شاعر بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

شاعر کا کام صرف تخیلات و تصورات کے عالم میں کھو جانا نہیں ہے بلکہ اُس کا فرض ہے کہ وہ حقیقتوں کے رُخ سے نقاب اُٹھائے۔ شاعر کو تعمیرِ نو کا معمار ہونا چاہیے۔ اسی لئے اقبال تلقین کرتے ہیں کہ شاعر کو زندگی کا مطالعہ نہایت غور و فکر سے کرنا چاہیے۔ اگر وہ حیاتِ جاوداں حاصل کرنا چاہتا ہے تو زندگی کی کش مکش سے علیحدہ رہ کر حاصل نہیں کر سکتا۔ اُن کے خیال میں شاعر کو آفاقی صداقتوں کا عرفان بخوبی ہونا چاہیے۔ اُسے وقت کے تیور پہچاننے کا شعور ہونا چاہیے۔

قیامِ یورپ کے زمانے میں اُنھوں نے جنبشِ پیہم اور حرکتِ مسلسل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ فلسفے کے مطالعے اور یورپ کے علماء اربابِ فکر اور سیاست دانوں کی صحبتوں نے اُنہیں بہت متاثر کیا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ اہلِ یورپ کارزارِ حیات میں ہمہ وقت پابہ رکاب ہیں۔ مغربی ممالک کی بیداری اور جوشِ حرکت و اضطراب کے بالمقابل مشرقی ممالک کی زبوں حالی اور خصوصًا ہندوستان کی پسماندگی اور خستہ حالی کو دیکھ کر اقبال کا دردمند دل بہت متاثر ہُوا۔ اقبال کے نزدیک شعر ایک بڑی پوشیدہ قوت رکھتا ہے۔ اور اصلاحی و تعمیری امکانات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ ہر حساس اور کامیاب، شاعر کو قوم کے لئے "دیدۂ بینا" کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ شاعر کو قوم کا ہمدرد و بہی خواہ اور "رہنما" تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم　　منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم　　شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

رات اور شاعر کے مکالمے میں اقبال رات کی زبان سے شاعر کے دل کو سکوں ناآشنا بتاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے شاعر کو بیتاب و بیقرار دل عطا کیا ہے۔ یہ بھی شاعر کے دیگر اوصاف میں ایک نمایاں وصف ہے۔

رات شاعر سے کہتی ہے ؎

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں — خاموش صورتِ گل مانندِ بُو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو — مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نُور کی تو
خاموش ہو گیا ہے تارِ ربابِ ہستی — ہے میرے آئینے میں تصویرِ خوابِ ہستی
دریا کی تہ میں چشمِ گرداب سو گئی ہے — ساحل سے لگ کے موجِ بیتاب سو گئی ہے
بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے — یوں سو گئی ہے جیسے آباد ہی نہیں ہے

اس کے بعد رات شاعر کے دل کو سکوں ناآشنا قرار دیتی ہے ؎

شاعر کا دل ہے لیکن ناآشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا تو کیوں کر مرے فسوں سے

شاعر رات کو جواب دیتا ہے ؎

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں — چھُپ کے انسانوں سے مانندِ سحر روتا ہوں
دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں — عُزلتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں
برقِ ایمن مرے سینے میں پڑی روتی ہے — دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے!
ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سُنا جاتا ہوں

اسی طرح وہ سُبک رفتار موٹر سے بھی شاعر کے لئے ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں ؎

شاعر کے فکر کو پرِ پرواز خامُشی
سرمایہ دارِ گرمیِٔ آوازِ خامُشی

اقبال اپنے دور کے شاعروں اور سخن سنجوں سے شاکی ہیں۔ اُن کی ناخوش اندیشی سے مُتنفر اور بیزار ہیں۔ اُن سے یُوں شکایت کرتے ہیں ؎

افسردہ اگر تیری نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

درحقیقت ایسے فنکاروں اور شاعروں کی نوا ریزی اور خامشی یکساں ہے بلکہ بعض اوقات نوا ریزی مُضر ثابت ہوتی ہے جو قوم کے لئے نقصان دہ اثرات مرتب کرتی ہے۔ اگرچہ وہ ایسے شاعروں اور فنکاروں سے شاکی ضرور ہیں ان شاعروں کی ناخوش اندیش روش اُن کے دل پر افسردگی کا پرتو ڈالتی ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہوتے۔ وہ تو یاس سے آس اور نومیدی سے اُمید کی تخلیق

کرتے ہیں۔ اُن کا مسلک محبوب تو عملِ پیہم اور یقینِ محکم ہے۔ دوسرے شعرا کو بھی اسی شاہراہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال نے یہ جو کچھ کیا وقت کے اقتضا کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کیا۔ ادب کے تقاضے سے نہیں۔

چنانچہ اقبال نے اپنی نظم "شمع اور شاعر" میں جو انھوں نے ۱۹۱۲ء کے فروری میں کہی تھی۔ شمع کی زبانی شاعر سے خطاب فرمایا ہے ؎

نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگامِ خاموشی نہیں — ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش
در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز — گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری — ہاں سُنا دے محفلِ ملّت کو پیغامِ سروش
آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

اسی طرح اپنی نظم "شاعر" میں جوئے سرود آفریں کی مثال لے کر ہمارے فنکاروں اور شاعروں کے لئے ایک بے بہا درس مہیا کر رہے ہیں ؎

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے — پی کے شرابِ لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مستِ مئے خرام کا سُن تو ذرا پیام تو — زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دخترِ خوشِ خرامِ ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے

اس کے بعد شاعر سے کتنا صحیح مخاطب ہے ؎

شاعرِ دلنواز بھی بات کہے اگر کھری — ہوتی ہے اُس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اُس کے کلام سے عیاں — کرتی ہے اُس کی قوم جب اپنا شعار آذری
اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیِ دوام ہے — خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخن وری

اس کے بعد وہ ایک نتیجہ اخذ کرتے ہیں ؎

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو کلی نہ ہو سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

ہم اقبال کے فن میں اور اُن کے نظریۂ شاعری میں اس امر کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کے نزدیک شاعر و فنکار کی ضرورت و اہمیت کیا ہے اور وہ کونسا فرض شاعر کو تفویض کرتے ہیں اُن کا نظریۂ زندگی اور نظریۂ شاعری بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ اُنھوں نے شاعر کی ہستی کو مختلف مقامات پر نہایت عمدہ پیرائے میں شرح و بسط اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ مرقعِ چغتائی کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ :-

"جو آرٹ زندگی کا مقابلہ کرتا ہے وہ انسانیت کے لئے باعثِ برکت ہے اُس کی رُوح میں زمانہ اور ابدیت کا پرتو منعکس ہوتا ہے۔"

شاعری زندگی کی تنقید ہے۔ اس کی وضاحت اس سے ہوتی ہے کہ اگر کوئی

آرٹسٹ زندگی کو فراوانی اور فروغ نہیں بخشتا۔ اگر اُس کے آرٹ سے سرشتِ
بصیرت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر اُس سے حقائقِ حیات کے اُلجھے ہوئے
تار نہیں سلجھتے تو وہ آرٹ بے معنی اور مہمل ہے اُس کا کوئی مصرف نہیں"

اقبال ایک ایسے شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں جس نے مشعلِ فن جلا کر ابدی نور حاصل کر لیا ہے۔ وہ شاعر کو تلقین کرتے ہیں کہ شاعرانہ زندگی اور فنکاری کے لئے ایک دستور العمل اور ایک شاہراہِ سفر مقرر کر لے۔ ورنہ اُس کی شاعری ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی بے راہ روی کی مانند ہو گی۔ وہ شاعر سے توقع رکھتے ہیں کہ زندگی کی پختہ اور جاندار حقیقتوں کو اپنی شاعری میں وضاحت سے بیان کرے ایسا موضوعِ سخن جو اقوام و ملل کی زندگیوں کو سنوارنے، سیرتوں کو بنانے اور اعمال و کردار کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہو۔ افراد کو پختہ اخلاق بنا دے۔ اور نیکی و سعادت کے جادۂ مستقیم پر گامزن کر دے۔

اُن کے نزدیک شاعر کا فرض ہے کہ وہ زندگی کی تگ و دو، اور کش مکش میں سب کے ساتھ حصّہ لے رہے۔ اور انہیں محسوسات و تاثرات کو اپنے شاعرانہ و فنکارانہ خواص کے ساتھ بیان کر دے۔ اِس جدّ و جہد میں اُسے خونِ دل و جگر صرف کرنا پڑے گا۔ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے نہایت خلوص و ایثار سے کام لینا پڑے گا۔ اور یہی کارنامہ اُسے شاعری کی معراج عطا کرے گا۔

اقبال شاعر کو تلقین کرتے ہیں کہ کارزارِ حیات میں کلفتوں مصیبتوں اور سنگین مرحلوں سے نبرد آزما رہے ان کے سامنے سپر نہ ڈالے۔ اپنی شکست تسلیم نہ کرے۔ حادثات و اتفاقات سے راہ و رسم پیدا کرے۔ سینہ سپر ہو کر طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہے۔ حرکت و پیکار اور ارتقا کی منزلوں کو چھونے کی کوشش کرے۔

وہ شاعر کو جذبۂ عشق کی تخلیق کا مشورہ دیتے ہیں۔ کیوں کہ جب تک شدید جذبۂ عشق پیدا نہ ہو، بہتر اور معیاری شعر وجود میں نہیں آسکتا۔ دوسرے یہ کہ اضطراب و ہیجان تخلیقی قویٰ کے حامی و ناصر ہوتے ہیں۔

وہ عشق کو زندگی کی بلند ترین تخلیقی استعداد بتاتے ہیں، عشق باعثِ تخلیقِ کون و مکاں ہے۔ عشق زبردست محرکِ شعری ہے لہٰذا ایک بلند مرتبت شاعر کے لئے عشق ضروری و لازمی ہے۔ مگر وہ عشق جو انسان کے دل میں پاک جذبات پیدا کرے وہ عشق جو سراپا حضور ہو جس سے انسان صدق و صفا کی صفات سے متصف ہو جائے۔

اقبال ایسی شاعری چاہتے ہیں جو خوش آئند نغموں کی حامل ہو بے سرے راگ نہ ہوں جہد و عمل میں تیز گامی لئے ہوئے ہو۔ شاعر زندگی کے عزیز لمحات کو بیکار نہ کھو دے۔

وہ ایسے شاعر کے قدرداں ہیں جس کے گفتار و کردار میں ہم آہنگی ہو۔ اِسی لئے وہ اپنے آپ پر بھی طنز کئے بغیر نہ رہ سکے

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا!

انہیں خیالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے شاعری کو معراجِ ارتقا عطا کی۔ شاعر کو شاہراہِ فن دکھائی جس پر چل کر وہ حقیقی معنوں میں تلمیذ الرحمٰن کہلائے جانے کا مستحق بن سکے۔ اُس کی شاعری کو ع

شاعری جزویست از پیغمبری

کا عظیم و بلند پایہ اور پاکیزہ منصب عطا ہو سکے۔ ایسے ہی فنکار اقوام و ملل کو زندگی جاوداں کی شاہراہ کی جانب لے جاتے ہیں ایسے شاعر کی نوا افرادِ قوم کو متاثر کر کے شورشِ طوفان کو حلال اور لذّتِ ساحل کو حرام قرار دیتی ہے۔ ایسا شاعر اپنے شعر کو اعجاز سے

ملت کے خوابیدہ افراد کو بیدار کرتا ہے۔ کہتا ہے ع

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

اقبال کے کلام کا بیشتر حصّہ وہ ہے جس میں جہدِ مسلسل اور کوشش ناتمام کی تعلیم دی گئی ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ اس عالم جہد و پیکار میں جسے دُنیا کہتے ہیں، جہدِ مسلسل کے بعد ہی کامیابی و کامرانی حاصل ہو سکتی ہے۔ جو انسان کشاکش حیات سے راہِ فرار اختیار کرے وہ ہمیشہ کے لئے گمنامی کے غار میں پڑا رہے گا۔ اُن کے نزدیک مصائب و تکالیف عارضی چیزیں ہیں، اور اگر غور کیجئے تو یہی چیزیں انسان کی بقائے دوام اور حیاتِ جاوداں کا باعث بن جاتی ہیں۔ انھوں نے کئی مقامات پر یہ بتایا ہے کہ زندگی کش مکش ہی کا دوسرا نام ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا | نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا غلط و با موجش در آویز | حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عیش و آرام اور عشرت و راحت کی زندگی قوائے عمل کو نہ صرف بیکار بلکہ مفلوج بنا کر رکھ دیتی ہے اور نحوست و بدبختی کا باعث بن جاتی ہے۔ اگر انسان حیاتِ جاوداں کا متمنی ہے تو اُسے اپنے آپ کو محنت و ریاضت کے لئے وقف کر دینا چاہیئے۔ اس راہ میں جس قدر آلام و مصائب اور دشواریاں حائل ہوں۔ تب ہی وہ منزلِ مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔

ایک اور مقام پر اُنھوں نے زندگی اور عمل کے متعلق نہایت واضح طور پر کہہ دیا ہے ؎

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شُد آہ کہ من چیستم

موجِ ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

ساحل نے جو مطلقاً جامد و ساکن ہوتا ہے موج سے کہا کہ اگرچہ میں نے دُنیا میں عمرِ دراز پائی ہے۔ لیکن مجھے اس کا علم نہ ہو سکا کہ میں کیا ہوں۔ موج نے جو کبھی ساکن و جامد نہیں رہتی نہایت تیزی سے چل کر جواب دیا کہ اے ساحل! تو میری حقیقت سے واقف ہو گیا۔ درصل میری زندگی کا راز حرکت ہی میں ہے۔ اگر میں حرکت میں نہ رہوں تو میری ہستی کچھ نہیں گویا جب تک موج حرکت میں ہے۔ پیچ و تاب کھاتی ہے اُس وقت تک موج ہے۔ اس کے برعکس وہ بند پانی ہے۔ جس میں فساد کی بو آتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ پیچ و تاب اور اضطراب و بے قراری کا دوسرا نام موج ہے۔ یہی طرح حیاتِ انسانی کی معراج اُس کی تگ و دو اور سعی مسلسل میں پوشیدہ ہے۔ نہ کہ عیش و عشرت میں۔

اقبال رسمی شاعری سے بیزار ہیں وہ اُن شاعرانہ الہامات کے قائل ہیں جو شاعر کے آئینۂ قلب کو گاہے گاہے اپنی جھلک دکھاتے ہیں وہ شاعر کو ان خصوصیات کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں ؎

پُرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خرسند

حضرتِ اقبال ایک حق گو اور حق پسند شاعر کو جہاں دو دیدۂ بینائے قوم کے معزز خطاب سے یاد کرتے ہیں۔

وہاں الشعراء تلامیذ الرحمٰن پر بھی اُنہیں یقینِ کامل ہے ۔ اور وہ شاعر کو خدا کا شاگرد تسلیم کرتے ہیں ۔ اسی لئے شاعر کو تلقین فرماتے ہیں ؎

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم   شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو   ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

جو شاعر حقیقتاً تلمیذِ رحمانی کا مستحق ہے ۔ اور واقعی وہ خدا کا فیض یافتہ ہے اُس کی شاعری الہامی شاعری ہوتی ہے ۔ اُس کے خیالات و افکار کا منبع وہ ذاتِ اقدس و برتر ہی ہے جو "الرحمٰن" ہے ۔ ایسے شاعر کا کلام معجزے سے کم نہیں ہوتا ، اُس کے شعر کا اعجاز خوابیدہ قوم کو بیدار کر دیتا ہے ۔

ایک مقام پر وہ شاعر کی فطرت کو سراپا جستجو اور شاعر کو "وارثِ پیغمبری" کہتے ہیں اس لحاظ سے شاعر گویا وارثِ پیغمبر ہوا ، لیکن وارثِ پیغمبر ہونے کے لئے ایک کڑی شرط بھی لگا دی ہے کہ شعر کا اصل مقصد "آدم گری" ہے اور شاعر کو سراپا جستجو ہونا چاہیئے ۔ فرماتے ہیں

فطرتِ شاعر سراپا جستجو ست   خالق و پروردگارِ آرزو ست
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل   ملتے بے شاعرے انبارِ گل
سوز و مستی نقشبندِ عالمے ست   شاعری بے سوز و مستی ماتمے ست

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اقبال کو ہندوستان کے شاعروں ادیبوں افسانہ نگاروں اور مصوروں سے شکایت ہے کہ اُن کی تخلیقات ذہنی عیاشی کی راہ دکھاتی ہیں ، اُن میں شہوانی جذبات کے سوا کچھ نہیں ہوتا ، اُن کے شاہپاروں سے چند ساعتوں کے لئے جسمانی اور مادی سرور و کیفیت تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن رُوح کے لئے اُن کی تخلیقات سمِ قاتل کا اثر رکھتی ہیں ، اس کا حقیقی سبب یہ ہے کہ اُن کے اعصاب اور حواس پر عورت سوار ہے ، چنانچہ اپنی نظم "ہنروران ہند" میں وہ اپنی اس شکایت کو یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل اُن کا   اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری اُن کے صنم خانوں میں   زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند   کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس!
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اقبال کی شاعری کسی روایتی شاعر کی خیال آرائی ، قافیہ پیمائی ، یا تصوّر آفرینی نہیں ــــ یہ تو ایک ایسے عظیم شاعر کی سخنوری ہے جس نے نہ صرف تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے بلکہ وہ قرآن و حدیث کے ساتھ منطق و فلسفہ کا بھی بہت بڑا عالم تھا ، جس نے نہ صرف ممالکِ اسلامی کی سیاحت کی بلکہ بلادِ یورپ و افریقہ کو بھی چشمِ بصیرت سے دیکھا جس نے اقوام و ملل کے عروج و زوال پر گہری نظر ڈالی اُس عظیم المرتبت شاعر کے کلام میں کتنی عظیم ذہنی صلاحیت اور عملی صلابت ملتی ہے ۔ اُن کے یہاں یاس انگیزی نہیں

نشاط کوشی ہے۔ جو خوش گوار اور خوش آئند ماحول کی تخلیق کی جانب رجوع کرتی ہے۔ اسی لئے وہ شعر کا ایک معیار مقرر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو شعر حیاتِ ابدی کا پیغام سُناتا ہو وہ نغمۂ جبرئیل اور بانگِ اسرافیل کی تاثیر رکھتا ہے ؎

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن — یہ نکتہ ہے تاریخِ اُمم جس کی ہے تفصیل

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے — یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل!

ان تاثرات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس شعر میں روح نہیں وہ شعر نہیں الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ شعر دلآویز کی تعریف وہ یوں بیان کرتے ہیں ؎

صد نالۂ شبگیرے صد صبح بلاخیزے

صد آہِ شرار ریزے یک شعر دلآویزے

شعر کی یہ اعلیٰ صفت یا شانِ دلآویزی شاعر کے دلی سوز اور عشقِ صالح کے تاثرات ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ بقول جناب نیاز فتحپوری

"جب تک شاعر کی رُوح کا کوئی جزو شعر میں شامل نہ ہو۔ وہ غیر فانی شعر پیش نہیں کر سکتا"

اقبال ماضی کی روایات، حال کے رجحانات اور مستقبل کے امکانات سے پُوری طرح باخبر اور اپنے دور کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات و تحریکات سے بخوبی واقف تھے، زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات اور کروٹیں لیتی ہوئی اقدار کا انہیں بخوبی ادراک تھا۔ وہ رفتارِ دوراں کے بھی نبض شناس تھے، اسی لئے نہ تو آئینِ نو سے وحشت کرتے تھے، اور نہ طرزِ کہن سے بیزار تھے وہ قدیم روایات اور اقدار کے مداح و قدر شناس ہونے کے باوجود، جدید صالح قدروں کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ وہ ایک صاحبِ بصیرت فنکار تھے۔ اسی لئے انھوں نے لازوال اور غیر فانی ادبی شہ پارے پیش کئے ہیں۔

اسی نظریئے کے تحت نیاز فتحپوری نے اقبال کے متعلق اپنی بیش قیمت رائے کا اظہار یوں کیا ہے ۔

"اقبال کی بعض نظمیں وقت کا تقاضہ بھی ہیں اور غیر فانی ادب پارے بھی لیکن یہ دور زیادہ تر وعظ و تبلیغ کا تھا۔ یعنی عملی جہاد تو انھوں نے نہیں کیا لیکن اُس کی فضا ضرور پیدا کی اور ذہن انسانی کی راہیں یقیناً بدل دیں"۔

"شعر کو کیا اور کیسا ہونا چاہیئے، اس پر اقبال کا یہ تبصرہ کس قدر "انقلاب انگیز" ہے ۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلآویز

اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں

بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے

جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

اسی طرح شاعر کو مخاطب کرتے ہیں ؎

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نَے — شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم — اچھی نہیں اُس قوم کے حق میں عجمی نَے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو — شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری نَے

اور ان اشعار میں کتنا بیش قیمت درس دے رہے ہیں ؎

ایسی کوئی دُنیا نہیں افلاک کے نیچے — بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کَے
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ہر فنکار کا مذاقِ سلیم اور موزونیٔ طبع اُس کے فن کو فروغ وارتقاء کی منزلوں تک پہنچانے کے لئے واقعی اہم اور مفید ہے۔ لیکن مسلسل جد و جہد اور محنتِ پیہم کے بغیر کوئی ہنر اور کوئی فن معراجِ ارتقا حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی نکتے کو اقبال کتنے عمدہ طریقے سے بیان کرتے ہیں ؎

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد — کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر — میخانۂ حافظ ہو کہ بُت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اسی طرح ہر فنکار کو نئی تخلیق پیش کرنے کی رائے دیتے ہیں۔ کیوں کہ ہر فنکار کے فن کی روح اور تخلیق کی جان جدتِ افکار ہے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

شاعر و فنکار کے سلسلے میں اقبال نے فنونِ لطیفہ پر بہت وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ فنونِ لطیفہ کے باب میں جرمنی کے مشہور شاعر اور فلسفی شوپنہار کی رائے ہے کہ :—

"اگر دُنیا میں حسن و عشق، فنونِ لطیفہ اور مذہب کا وجود نہ ہوتا تو انسانی زندگی کی تلخیاں اور المناکیاں کم کرنے کا کوئی علاج نہ تھا"

اقبال کی نظر میں فنونِ لطیفہ کی موجودہ روش قابلِ قبول نہیں۔ اُن کے خیال میں محکوم قوم کو غلام بنائے رکھنے کے لئے یہ ایک بہتر حربہ ہے کہ اُسے فنونِ لطیفہ کا چسکا لگا دیا جائے ؎

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

فنونِ لطیفہ میں شاعری، مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی، سنگ تراشی اور معماری کا شمار ہوتا ہے۔
مسجدِ قرطبہ میں اقبال فن کے متعلق اپنا نظریہ یوں بیان کرتے ہیں ع

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اس خونِ جگر کا اطلاق فنونِ لطیفہ کے ہر فنکار پر ہوتا ہے، جب تک فنکار اپنے فن پارے کی تخلیق و تکمیل میں اپنا خونِ جگر صرف نہ کرے گا۔ اُس کی تخلیق قابلِ تعریف نہیں ہو سکتی۔ اور اُسے حیاتِ جاوداں بھی نصیب نہیں آسکتی۔

خونِ جگر کو ایک اور شعر میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو!

ہر فنکار کی شخصیت کا خلوص اور فن کی تخلیق کا حقیقی جذبہ ہی خونِ جگر کا دوسرا نام ہے۔ فنکار اپنے فن پارے میں اپنے تخیل سے کسی تصور کو اجاگر کرتا ہے۔ یقینی طور پر تصور کی صداقت اور اُس کے اوصاف اُس فنکار کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے چاہئیں۔

فنکار اپنے فن پارے پر مکمل طور پر یقین و ایمان رکھتا ہے اُس کی تخلیق کا محرک بھی وہی حقیقی جذبہ ہے۔ جو اُس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ مخلصانہ طور پر اپنے فن کی تکمیل میں منہمک ہو جاتا ہے۔ یہیں وہ فن کے اسرار و رموز اپنے دل کی گہرائیوں میں اُترتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ازاں بعد اُس کا فن پارہ بے پناہ تاثیر کا حامل بن جاتا ہے۔ اسی سے نغمہ نَے میں سُرور پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے ع

مُعجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

فنونِ لطیفہ کے باب میں اقبال کا نظریہ بہت بلند ہے وہ تعمیرِ خودی کے اعلیٰ مقصد کو ہر جگہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ اُن کا مطالعۂ تاریخ بہت وسیع اور گہرا تھا۔ اسی لئے وہ فنونِ لطیفہ کے پرستاروں کو تلقین کرتے ہیں کہ "حفظِ خودی" کو اپنا اوّلین فرض سمجھو۔ جن قوموں کے ادب اور دین خودی سے بیگانہ ہوتے انھوں نے ذلت و رسوائی کے کچھ نہ پایا ؎

ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود اُن کی　　گہر ہیں اُن کی گرہ میں تمام یک دانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات　　بلند تر ہے ستاروں سے اُن کا کاشانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی

خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اسی طرح ایک اور مقام پر بہت واضح طور پر فرماتے ہیں ؎

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود　　کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود

گر ہُنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر

وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

اسی طرح "فنونِ لطیفہ" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ وہ نظر جو کسی شے کی حقیقت کو نہ پہچان سکے کسی مصرف کی نہیں۔ ہُنر مند اور فنکاری کا مقصد سوزِ حیاتِ ابدی ہے۔ جو ہُنر ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ گویا جسدِ بے رُوح کی مانند ہے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن　　جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہُنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے　　یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا　　اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی فرما گئے ہیں ؎

ہجومِ بلبل ہوا چمن میں کیا جو گل نے جمال پیدا
کمی نہیں قدرداں کی اکبر کرے تو کوئی کمال پیدا

اقبال بھی ہر مجتہد اور صاحبِ ایجاد انسان کے لئے کہتے ہیں کہ زمانے کے لوگ اُس کا طواف کرتے ہیں۔ لیکن صاحبِ ایجاد کو چاہیئے کہ وہ اپنی خودی کو تقلید سے بچائے رکھے ؎

جو عالمِ ایجاد میں ہو صاحبِ ایجاد — ہر دور میں کرتا ہے طواف اُس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اُس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

فنونِ لطیفہ میں نغمہ و موسیقی کا درجہ بہت بلند ہے۔ اپنی نظم "سرودِ حلال" میں اقبال نغمے کی معنی آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سینۂ افلاک کی یہ نوا ایسی نوائے سروش ہو جس سے ستاروں کا وجود بھی پگھل جائے۔ جسے سُن کر انسان کے دل میں خوف و غم کا وجود بھی باقی نہ رہے۔ ایاز مقامِ محمود حاصل کرلے یعنی غلامانہ ذہنیت کا خاتمہ ہو جائے۔ حریتِ افکار اور آزادانہ جذبات کی تخلیق ہو ؎

کھُل تو جاتا ہے مُغنّی کے بم و زیر سے دل — نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پیدا وہ نوا — جِسکی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے — تو رہے اور ترا زمزمۂ لاموجود
جس کو [illegible] سمجھتے ہیں فقیہانِ حرم
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سُرود

یہ نغمہ و موسیقی کا ایک رُخ تھا، اُس کے دوسرے رُخ نے اقبال نے اس طرح نقاب کشائی کی ہے:۔

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرور — نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اُسے اتفاق ہو مجھ سے — فقیہ شہر کہ ہے محرمِ حدیث و کتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے چنگ و رباب

موسیقی کے سوز و اثر کے لئے شرطِ اولیں ضمیر کی پاکیزگی ہے۔ لیکن اقبال کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کی سرزمین میں اس شے کی تلاش کی مگر اس کا وجود کہیں نظر نہ آیا ؎

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل — کہ جس کو سُن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود — وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

مجسمہ سازی کو فنونِ لطیفہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مجسمہ ساز کی تمام کاوشیں اور کوششیں مُسلّم سہی لیکن اقبال

کے نزدیک یہ تمام مجسّمے عہدِ رفتہ کے ٹوٹے ہوئے لات و منات ہیں۔ جن سے انسان شرک اصنام پرستی اور توہم کا شکار بنجاتا ہے

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہُنر کی تعمیر — فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانہ ذات
نہ خودی ہے نہ جہانِ سحر و شام کے بعد — زندگی کی حریفانہ کشاکش سے نجات

آہ وہ کافرِ بیچارہ کہ ہیں اُس کے صنم
عہدِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات

اسی طرح سینما کو بھی فنونِ لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اقبال اُسے بھی ایک قسم کی بُت فروشی اور بُت گری اور صنعتِ آذری کے خطاب سے یاد کرتے ہیں ؎

وہی بُت فروشی وہی بُت گری ہے — سینما ہے یا صنعتِ آذری ہے
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا — یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا — یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے

وہ دُنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی
وہ بُت خانہ خاکی یہ خاکستری ہے

(انجمن اقبال ادب جلگاؤں کی نشست میں پڑھا گیا)

محمد افتخار الحق انوار (کھام گاؤں)

منکرِ معراج سے

مزائلوں سے ہے زیر و زبر فضائے حسیں
بہت قریب ہے تسخیرِ زہرہ و پرویں

فسانہ ہو کے رہی دوریٔ زمان و مکاں
ہوا ہے دور بتدریج بُعدِ چرخ و زمیں

خطا سرشت، خطاکار، خاک کا پُتلہ
کرے فضا پہ تصرف بنے خلا کا امیں!

یہ کہکشان و ثریا ہیں اس کے نقشِ قدم
یہ کائنات تو کیا ہے فلک بھی زیر نگیں

پہنچ ہی جائے گا مریخ و ماہ میں اک دن
عجب نہیں کہ جو چھُولے فرازِ عرشِ بریں

یہ اعتراف ہے تجھ کو کہ آدم مجبور
ہے آج قدرتِ علم و ہُنر سے اوج نشیں

عروجِ آدمِ خاکی پہ لا چکا ایماں!
کمالِ حکمت و سائنس کا ہے تجھ کو یقیں

رسائی اس کی ہو ناہید و مُشتری سے پرے
وہ آدمی کہ جو ہے بندۂ ظن و تخمیں!

مگر نبیؐ کہ جو ہیں پیکرِ جلال و جمال
تمام مہر و محبت تمام عشق و یقیں

خودی ہے جن کی جہانگیر و آسماں پیما
رکاب تھامتے ہوں جن کی جبرئیل امیں

فضا کے پار اُنھیں کا گذر ہو ناممکن!
انھیں کو راہ نہ دے گنبدِ سپہرِ بریں!

خدا جو آدم و ارض و سما کا خالق ہے۔
اسی کی قوت و قدرت کا اعتبار نہیں

عروجِ احمدِ مُرسل ہی وہ حقیقت ہے
گواہ جس کے ہیں افلاک اور زمان و زمیں

شعر و نغمہ

شفیق جونپوری

شاہانہ بنایا نہ گدایانہ بنایا
تو نے مرا دل سب سے جداگانہ بنایا

ہر درد گوارا ہے کہ تو نے مرے مالک
اپنی طلبِ غم سے نہ بیگانہ بنایا

محروم ہے بلبل تپشِ سوزِ دروں سے
اس چیز نے پروانے کو پروانہ بنایا

اللہ کی رحمت ہے مرے پیرِ مغاں پر
کیا صاحبِ الطافِ کریمانہ بنایا

باقی نہ رہی خانقہِ شیخ کی رونق
جس دن سے قدح نوشوں نے خمخانہ بنایا

پیدا ہوں وہاں کیا دلِ بیدار کے اوصاف
فطرت نے جہاں ظرفِ غلامانہ بنایا

کچھ مصلحتِ عقل مجھے راس نہ آئی
کچھ تم نے سمجھ بوجھ کے دیوانہ بنایا

اللہ رے شرف بن کے غبارِ درِ ساقی
رندوں نے مری خاک سے پیمانہ بنایا

گلشن میں بہلتا ہے نہ ویرانے میں یارب
کیا تو نے مزاجِ دلِ دیوانہ بنایا

کیوں ہم سے زمانے کو ہے تفریق کا شکوہ
ہم نے تو ترے نام سے افسانہ بنایا

الزام ہے ہنگامہ ناقوس و اذاں کا
خوب ایک وفادار کو دیوانہ بنایا

اپنے لئے سامانِ خدائی تھا منظور
تیرے ہی لئے کعبہ و بت خانہ بنایا

تو نے اسی آشفتہ کو الجھاؤ میں رکھا
جس نے تری زلفوں کے لئے شانہ بنایا

وہ اور جہاں میں ہدفِ تشنہ لبی ہو
جس نے ترے میخانے کو میخانہ بنایا

تھا شیخ کو غرہ کہ ہمیں ہم ہیں حرم میں
رندوں نے بھی اک حلقۂ یارانہ بنایا

کام آیا شفیق جگر افگار کا مٹنا
اللہ نے خاکِ درِ جانانہ بنایا!

عروج زیدی

ثباتِ عزم، خلوصِ عمل، کمالِ یقیں
یہ وصف جس میں ہوں کونین اسکے زیرِ نگیں

وہی بشر جسے کہتے تھے نازِ عرشِ بریں
وہی بشر ہے زمانہ میں آج بارِ زمیں

ہجومِ جلوۂ رنگیں میں بند رہیں آنکھیں
ابھی نظر کو یہ ماحول سازگار نہیں

رہِ تلاش میں یہ کیا مقام آیا ہے
کہ میرے پیشِ نظر اب نہ آسماں نہ زمیں

وہ سامنے ہوں تو اٹھتی ہے بار بار نظر
نہیں نہیں مجھے توفیقِ احتیاط نہیں

خفا ہوئے تو چمک رخ کی ہو گئی دونی
نہ چوم لے کوئی بڑھ کے تمہاری چینِ جبیں

بہارِ عیش کے پھولوں سے کھیلنے والو!
غمِ نشاط میسر نہیں تو کچھ بھی نہیں!

مآل یہ ہے مرے والہانہ سجدوں کا
نہ اختیارِ جبیں ہے نہ اعتبارِ جبیں!

جھکا دی میں نے جبیں جب تمہارے قدموں پر
مجھے دریچوں سے جھانکتے مہ و پریں
عروج اُن کی خوشی بھی شریک ہے اس میں
غمِ حیات کا حاصل غمِ حیات نہیں!

رعنا اکبر آبادی

محبت نامکمل رہ گئی، پوری ہوئی ہوتی
بسر جتنی ہوئی ہے اور اتنی زندگی ہوتی

سمٹ کر رہ گئی وسعت جنوں تک کہیں میری وحشت
حدودِ آستانِ ناز تک تو آ گئی ہوتی!

ابھی ہوں آشنائے دہر تم سے اجنبی رہ کر
تعارف تم سے ہو جاتا تو دنیا اجنبی ہوتی

نہ ہو دردِ محبت، تو آدمی کیا ہے
تڑپ تڑپ کے نہ گزرے تو زندگی کیا ہے

ابھی تو صرف نشیمن کی خاک اُڑتی ہے
ابھی اٹھے گا قفس سے دھواں ابھی کیا ہے

خدا نے خوب معمہ بنا کے بھیج دیا
خود آدمی بھی نہ سمجھا کہ آدمی کیا ہے

یہ چند خون کے قطرے اُڑائے پھرتے ہیں
جو دل نہ ہو تو زمانہ میں آدمی کیا ہے

اجل نے پردۂ ہستی اٹھا دیا آ کر
ابھی میں سوچ رہا تھا کہ زندگی کیا ہے

اجل ہی ہجر کے آنسو سکھائے گی رعنا
تمام عمر کا رونا ہے زندگی کیا ہے

ماہر القادری

نور کی تحریر تھا ہر خط پیمانہ مجھے
یاد ہے اب تک طلوعِ صبحِ میخانہ مجھے

عشق نے بخشا ہے جذبِ ہر فروشانہ مجھے
اُن کو کیا کہیے کہ جو کہتے ہیں دیوانہ مجھے

بھیجتا ہوں چشمِ ساقی کے تصور پہ درود
کر دیا ہے بے نیازِ جام و پیمانہ مجھے

اس تغافل کے تصدق، اس توجہ کے نثار
جاتے جاتے اُس نے دیکھا بن کے بیگانہ مجھے

یہ شبِ غم کا اندھیرا، ہائے! یہ تنہائیاں
جذب کر لے اے خیالِ بزمِ جانانہ مجھے

میری وحشت ڈھونڈتی ہے اور ہی کوئی فضا
اب گلستاں روک سکتا ہے نہ ویرانہ مجھے

میں ہوں ماہرؔ میگسار و بادہ آشامِ غزل
یہ شرف پہنچا ہے پیمانہ بہ پیمانہ مجھے

ضیاء شبنمی

ہر ذرہ خاک، دل کا ہے خورشید در کنار
اک چھوٹ پڑ گئی جو رُخِ بے نقاب کی

میری غزل کو دیکھتے مجھ کو نہ دیکھئے
ہر شعر میں ہے بند کہانی شباب کی

یہ نو شگفتہ غنچہ کا عالم ہے اے ضیا
پھوٹی ہو جیسے پہلی کرن آفتاب کی

فضلِ کریم فضلی: — نکھرتا جا رہا ہے حسنِ خوباں
عشق کی کوئی حد ہی نہیں ہے
بہ فیضِ عاشقانِ لااُبالی
عشق میں کیسا حد سے گزرنا

مسعود تابش دہلوی: — جتنے سرکش اسی قدر نازک
اپنی حالت حباب کی سی ہے

نخشب جارچوی: — بے تعلق ہیں بے سہارے ہیں
اب کہیں کیا کہ ہم تمہارے ہیں

ناممکمل قرآن

از: مولینا عبدالماجد دریابادی

انکارِ حدیث کا شاید سب سے زیادہ معتدل، روشن خیال علمبردار کا ایک لمبا مکتوب معاصر ماہنامہ ترجمان القرآن (اکتوبر نمبر) میں شائع ہوا ہے، اس کے جستہ جستہ فقرے قابل توجہ ومطالعہ ہیں:—

"رہا یہ سوال کہ آیا میں سنت کو قرآن کے ساتھ ماخذ قانون مانتا ہوں یا نہیں؟ میرا جواب نفی میں ہے ...... بے شک حضور نے حاکم اعلیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی۔ لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (معاذاللہ) نامکمل تھا۔ اور جو کچھ حضور نے عملاً کیا اس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی۔ میرے لئے ناقابلِ فہم ہے ...... نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بنا پر کتاب اللہ کے قانون کو نامکمل قرار دیتے ہیں۔ کم از کم میرے لئے تو یہ تصور ہی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے ...... اگر فرض کر لیا جائے کہ جیسا آپ فرماتے ہیں کہ حضور جو کچھ کرتے تھے وحی کی رُو سے کرتے تھے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کو اپنی طرف سے بھیجی ہوئی ایک قسم کی وحی پر (نعوذ باللہ) تسلی نہ ہوئی، چنانچہ دوسری قسم کی وحی کا نزول شروع ہو گیا؟ یہ دورخی وحی آخر کیوں؟ پہلے آنے والے نبیوں پر جب وحی نازل ہوئی تو اس میں نزول قرآن کی طرف اشارہ تھا۔ تو کیا اس اللہ کے لئے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ بڑا مشکل تھا کہ دوسری قسم کی وحی جس کا آپ ذکر کرتے ہیں، اس کا قرآن میں اشارہ کر دیتا"

مکتوب نگار کے اصل دعوے اور دلیلوں کا معقول مدلل وشافی جواب معاصر موصوف نے دے دیا ہے۔ صرف ایک خاص پہلو یعنی یہ قرآن کو "نامکمل" قرار دینے کا طعنہ ایسا ہے، جس کا مزید جائزہ لینے کی گنجائش ہے۔

وقت کی سطحیت اور فضا کی بے مغزی کے تقاضے سے یہ رواج عام سا پڑ گیا ہے کہ سنجیدہ واہم دینی، اخلاقی بحثوں کا فیصلہ بھی بجائے ٹھوس، علمی، وزندار دلائل کے محض ہوئے فقروں سے کیا جانے لگا ہے ——— "تعلیم ہر انسان کے لئے لازمی ہے" یہ ایک اصول قائم کیا گیا اور اس کے بعد آم گھاس، الم غلم، جو کچھ بھی خواہش نفس کے مطابق نظر آیا، "تعلیم" کے مرعوب کن نام سے بچوں اور بچیوں کے دماغ میں ٹھونسا جانے لگا۔ "آزادی ہر فرد بشر کا قانونی حق ہے"۔ اور یہ نعرہ لگانے کے بعد ہر اخلاقی قید سے پیچھا چھوٹ گیا اور ہر قسم کی گندہ خیالی اور فحش کلامی آزادیٔ تحریر و تقریر کے نام سے ناجائز ٹھہر گئی! "عورت و مرد کی مساوات، تہذیب کی ایک بنیادی حقیقت ہے"۔ اور اس نظریہ کو اچھالنے کے بعد ہر عیب عورت کے لئے ہنر اور شر اس کے حق میں خیر بن گیا؟ نعروں (SLOGAN) کی اس درجہ حکومت قاہرہ دلوں دماغوں پر شاید ہی تاریخ کے کسی دور میں رہی ہو۔

"اتباع سنت کو لازمی ماننے اور حدیث کو بھی ایک ماخذ قانون قرار دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ قرآن بجائے خود نامکمل وناقص ہے" اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید کو نامکمل یا ناکافی تسلیم کرنے کے تصور ہی سے ہر مسلمان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جائے گی، اور وہ گھبرا کر اور بدحواس ہو کر اس عقیدہ سے توبہ کرنے لگے گا۔ اور اپنے کو انکار حدیث پر مجبور پائے گا! ...... شاعرانہ اور ساحرانہ مغالطہ کی زد، اگر تاریخ امت میں کسی کو ملتی ہے، تو اس وقت جب معرکۂ قتال میں خلیفۂ راشد، امیر المومنین حضرت علی رضؓ کے مقابلہ میں قرآن کو نیزوں پر بلند کر کے پکار کر دی گئی تھی، کہ ہم تو بس قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ہی کے فیصلہ کے آگے سر جھکانے کو حاضر و آمادہ ہیں! قرآن مجید پر اور ظلم بھی بارہا ہوئے ہیں لیکن نوعیت ظلم کی طرفگی اور درجۂ ظلم کی سنگینی کے اعتبار سے، تاریخ اُمت میں یہ دوسرا ظلم ہے، جو اس پہلے ظلم کے بعد خود قرآن مجید کے ماننے والوں کے ہاتھوں سرزد ہوا ہے۔

سمجھ دار مسلمان آخر اس الزام کے تسلیم کرنے سے شرماتے، گھبراتے کیوں ہیں؟ صاف صاف، کہہ کیوں نہیں دیتے کہ جو معنی آپ نے

لئے ہیں، بے شک اس معنی میں قرآن ناکافی، یا آپ ہی کے مرغوب محاورہ میں، نامکمل ہے۔ تکمیل ایمان کے لئے، ایمان قرآن رسول پر لازمی ہے، اور جس طرح اگر کوئی خبطی محض صرف محمدؐ بن عبداللہ کی تصدیق کرے، اور قرآن کو کلام الٰہی تسلیم نہ کرے، تو اس پر مومن کا اطلاق نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی دانشمند اگر اپنے ایمان کو قرآن مجید تک محدود رکھے۔ اور رسولؐ کے حق "تحکیم" سے حق "تعلیم" و تشریح قرآن تک، حق تبیین و توضیح قرآن سے، حق تزکیۂ نفس و اخلاق تک، رسولؐ کے عملی نمونہ (اسوہ) پر چلنے سے، عبادات و معاملات میں آپؐ کے احکام کے "اتباع" و اطاعت" سے دین میں آپ کے نقش قدم پر قدم رکھنے (اقتدا) سے اور آپ کے ہر فیصلہ پر بہ طیب خاطر راضی ہونے سے انکار رکھتا ہو، تو وہ بچارہ بھی ایمان سے اسی درجہ میں محروم ہے ——— قرآن مجید کی ایک دو آیتوں میں اور وہ بھی سرسری نہیں۔ بلکہ بیسیوں آیتوں میں، جو مضمون تصریح و تاکید کے ساتھ بیان ہو چکا ہے اس سے بے خبری قرآن فہمی کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔

سنت کو جو ناقابل اعتنا سمجھتا ہے، اس کی طرف سے بے پروا ہے، اس کی تحقیر پر تلا ہوا ہے، وہ اپنے ایمان کی خیر منائیے! اس کا ایمان اسی طرح یک طرفہ۔ ناقص۔ ناتمام۔ نامکمل ہے۔ جس طرح محض قرآن کے ماننے والے کا۔ جب ایک ترکیب کے دو اجزائے ترکیبی مساوی وزن و قوت کے ہیں۔ تو ان میں سے کسی ایک کے منکر کو مسلم آخر دنیا کی کس منطق کی رو سے تسلیم کیا جائے! اور رسولؐ کی تصدیق کے معنی وہی ہیں، جس کی مختصر تشریح ابھی ابھی گزر چکی ہے، یعنی عملی زندگی میں قدم قدم پر رسولؐ کی رہنمائی تسلیم کرنا۔ نہ یہ کہ محض ایک امانت دار ڈاکئے یا ہرکارے کی طرح، قرآن مکتوب کو حفاظت سے امت تک پہنچا دینے والا!

ظاہر اور بالکل ظاہر ہے کہ اگر محض مکتوب قرآنی بغیر رسولؐ کی شخصیت کو درمیان لائے، ہدایت کے لئے کافی ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کو رسولؐ کے بھیجنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی؟ کیا اس کے لئے اس میں کچھ دشواری تھی، کہ قرآن اپنی کتابی شکل میں کسی بلند ٹیلے پر رکھا ہوا کا بہ امت کو مل جاتا؟ یا اس کی ہزار ہا جلدیں فرداً فرداً افراد اُمت کے ہاتھ تک پہنچ جاتیں؟ یا کسی غیبی آواز کے ذریعہ سے اس کے الفاظ و حروف ایک ایک اُمتی کے کانوں تک پہنچ جاتے؟ رسولؐ کی شخصیت کا واسطہ آخر درمیان میں لایا ہی کیوں گیا؟ اور ایک طرف سے حرب و ضرب ظلم و شقاوت اور دوسری طرف سے صبر و مدافعت کا ہنگامہ سالہا سال تک خواہ مخواہ ہی قائم کیا گیا!

ہمیں تعلیم اس کی ملی ہے کہ ہم ایمان پیام اور پیامبر، کتاب اور رسول دونوں پر یکساں اور ایک ہی وجہ میں لائیں۔ اور ہم مکلف اسی کے بنائے گئے ہیں کہ :-

یریدون .... رسلہ — جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی ڈال دینا چاہتے ہیں

(النساء آیت ۱۵۰)

اور جو لوگ :-

یریدون .... سبیلاً — ایمان و انکار کے بین بین راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں

انہیں :-

اولئک ہم الکافرون حقا۔ — ہم قطعی کافر سمجھیں۔

یہ سوال عجب طفلانہ ہے کہ اللہ نے وحی جلی (قرآن) آخر ناکافی سمجھ کر دوسری قسم کی وحی (وحی خفی) اپنے رسولؐ پر کیوں بھیجی؟ اگر اس منطق میں کچھ بھی وزن سمجھا جائے۔ تو اس قسم کے تو بے شمار عقیدے لاینحل سمجھے جا سکتے ہیں۔ اللہ نے ہم پر مسلسل کیوں بھیجے؟ کیا ایک صاحب وحی پیمبر کا آنا کافی نہ تھا؟ اللہ نے مختلف قوموں کے لئے الگ الگ پیمبر کیوں بھیجے؟ کیا ایک ہی پیمبر ایک ہی بار ساری دنیا کے لئے

کافی ہوتا؟ وقس علیٰ ہٰذا ——— رہا وحی خفی کا اشارہ تو اشارہ کا کیا ذکر قرآن مجید میں تو صراحت موجود ہے کہ توریت و انجیل میں جہاں ذکر نبی اُمّی کا ہے وہیں اس کے یہ اوصاف درج ہیں کہ:۔

یامُرُہم .... وہ انھیں نیک کرداری کا حکم دیگا، (الاعراف آیت ۱۵۷)

.... کانت علیہم ۔ اور انہیں بدکرداری سے روکے گا۔ اور وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہرائے گا، اور ان پر گندی چیزیں حرام کردے گا، اور جو بوجھ اور قیدیں ان پر اس وقت تک ہوں گی، انھیں وہ اُتار دے گا۔

مطالبہ "اشارے" کا تھا۔ کوئی تصریح اس سے بڑھ کر کیا ہوگی؟ یہ سب اختیارات اس پیمبر کو حاصل ہونگے۔ وہ اللہ کی طرف سے ان سب چیزوں کا مجاز ہوگا۔ اس میں دخل اس کی ذاتی رائے ۔ قیاس و اجتہاد کو نہ ہوگا، پر وہ جو کچھ کرے گا، سب خدا ہی کی طرف سے مختار ہوکر کرے گا ۔ اور جس کی نظیر کچھ نہیں ہے۔ وہ سُنّتِ رسول ؐ کو قرآن کی شارح اس کے اجمال کی تفصیل ۔ اور ہر حال میں اس سے ہم آہنگ ہی پائے گا۔ پرانے مسلمانوں پر قرآن کو نامکمل سمجھنے کا طنز اگر کچھ بھی صداقت رکھتا ہے۔ تو اس سے کہیں زیادہ صداقت اس طنز میں ہے کہ "ماڈرن" مسلمان، محض ایک "نامکمل" رسول ؐ کا قائل ہے ۔ اور اس کو حیثیت ایک اونچے نامہ بر "چٹھی رساں" یا ہرکارے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ (صدقِ جدید)

ہماری نظر میں

منہاج العابدین

از:- حجۃ الاسلام امام غزالی، ترجمہ:- مولانا عابد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی،

ضخامت ۲۸۰ صفحات (بڑا سائز)، مجلد خوب صورت رنگین سرورق) قیمت مجلد: چھ روپے

ملنے کا پتہ:- محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس گرانقدر تصنیف (منہاج العابدین) کا موضوع اخلاق و تقویٰ اور تزکیۂ نفس ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے دل میں گداز، خشیت اور تعلق مع اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، محمد سعید اینڈ سنز قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کا اردو ترجمہ اپنے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

ترجمہ عام فہم ہے .... "مجھے استفادہ حاصل ہو۔" (ص۱۷) "استفادہ" کے ساتھ "حاصل ہونا" درست نہیں یہ زائد لفظ ہیں کہ "استفادہ" فائدہ حاصل کرنے ہی کو کہتے ہیں —— "شرطی کے کوڑے" (ص۳۷) اردو جاننے والے "شرطی" کو نہیں سمجھ سکتے۔ "سپاہی یا پولس کے کوڑے" ترجمہ کرنا چاہیے تھا —— "دنیا اور آخرت کی مثال سوتھنوں کے طریقہ پر ہے"۔ عربی کے "ضرۃ" کا اردو ترجمہ اور اس کا صحیح املا "سوتن" یا "سوکن" ہے —— "اور کبر و بڑائی سینوں میں بھری ہے": عربی اور اردو کے لفظوں کے درمیان واوِ عطف لانا درست نہیں! عربی کی ایسی بلند پایہ اور شہرہ آفاق کتابیں کاش! اردو میں زبان و ادب کی ممکنہ خوبیوں کے ساتھ منتقل ہو سکتیں۔

"منہاج العابدین" کے اس اردو ترجمہ سے اردو جاننے والوں کو یقیناً فائدہ پہنچے گا، ڈراموں اور ناولوں کے اس دور میں ایسی کتابوں کا مطالعہ بہت بڑی نعمت ہے۔

خدائی وعدہ

از:- ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ترجمہ:- معراج محمد بارق، ضخامت ۳۶۰ صفحات، (مجلد، رنگین گرد پوش)

قیمت:- تین روپے آٹھ آنے،

ملنے کا پتہ:- نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی۔

"الوعد الحق" مصر کے مشہور نابینا عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی معرکہ آرا اور بلند پایہ تصنیف ہے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے افکار اور دل و دماغ پر "تجدد اور تفرنج" کا غلبہ ہے مگر یہ کتاب، آزاد خیالی اور تجدد و مغرب زدگی کے غبار سے آلودہ ہونے نہیں پائی! اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اخوان المسلمون" نے جب مصر میں ایک مؤثر عنصر کی حیثیت حاصل کر لی تھی، تو یہ کتاب غالباً اسی دور میں لکھی گئی تھی

اسلام کی جدوجہد میں تمام صحابہ کرامؓ نے جان و مال کی گرانقدر قربانیاں پیش کی ہیں اور یہ تمام نفوسِ قدسیہ ہمارے محسن اور مخدوم ہیں، مگر حضرت عمار بن یاسر، بلال حبشی، صہیب رومی اور خباب بن ارت (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) جیسے نادار، مفلس اور بے سہارا اصحاب نے جس قربانی کا ثبوت دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جیسی جاں گداز اور دل شکن صعوبتیں جھیلی ہیں، وہ اسلامی تاریخ کا دیباچہ ہیں! یہ کتاب انہی مظلوم اور بیکس صحابہ کی جاں نثاری، ایثار و قربانی عزیمت و استقامت

اور اللہ اور رسول ؐ کی محبت اور اطاعت کے ایمان افروز تذکرے سے لبریز ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس کتاب میں بعض باتیں لائق احتساب ہیں ۔۔۔۔۔ مثلاً :۔

"حضرت عثمان رضؓ سے انتقام لینے والے باغی جب تمام صوبوں سے اکٹھے ہو کر مدینہ آئے، تو عمار رضؓ نے ان سے کوئی اظہار نفرت نہیں کیا اور نہ انھیں واپس کرنے کی کوشش کی، پھر حضرت عثمان رضؓ قتل ہو گئے، تو ان کے قتل پر انھیں کوئی افسوس نہیں ہوا، بلکہ بعض اوقات تو وہ اس بات پر جھگڑتے تھے کہ حضرت عثمان حالتِ ایمان میں قتل ہوتے یا حالتِ کفر میں ۔۔۔۔۔" (ص ۳۳۰)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ بالکل غلط بات کہی ہے! کوئی شک نہیں کہ انتظام مملکت کے چند معاملات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعض اقدامات سے بعض صحابہ خوش نہ تھے لیکن ان معاملات میں اختلاف کی نوعیت "کفر و اسلام" کے اختلاف کی ہرگز نہیں تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایمان اور اسلام میں کسی صحابی نے کوئی شک نہیں کیا، حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ نے تو اپنے صاحبزادوں (حسنین) کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لئے بھیجا تھا اور ان کی شہادت کا انہیں ملال ہوا تھا، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہ ہی کی جماعت کے ایک جاں نثار فرد تھے، اس لئے ہم ان کے متعلق یہی گمان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان کے بارے میں جو حضرت علی رضؓ کے خیالات تھے وہی حضرت عمار کے تھے!

"حضرت عمار کو اس بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ تھا کہ معاویہ اور ان کے ساتھی ہی باغی گروہ ہیں اور یہ جنگ جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی کے خلاف کر رہے ہیں، بالکل انھی جنگوں کے مشابہ ہے، جو کفار قریش نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدر، احد اور خندق کے روز کھڑی کی تھیں (ص ۳۳۱)

ان مقامات پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین "رفض" کے ترجمان نظر آتے ہیں (استغفراللہ) جمل و صفین کی جنگوں کو بدر و خندق کا مماثل ٹھیرانا فکر و نظر کی غلطی نہیں بلکہ کھلی ہوئی گمراہی ہے، بدر و خندق میں کفر، اسلام کے مقابل تھا اور جمل و صفین میں مسلمان، مسلمانوں کے مقابل تھے اور جمل میں حضرت معاویہ اور ان کے ساتھی حضرت علی خلیفۂ راشد کے مقابلہ میں بے شک باغی تھے مگر وہ "مسلمان باغی" تھے یہی سبب تھا کہ ان باغیوں کے ساتھ حضرت علی رضؓ نے وہ سلوک نہیں کیا جو غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزیمت خوردہ کفار کے ساتھ کیا تھا! جمل و صفین میں بے شک حق، حضرت علی رضؓ کے ساتھ تھا، لیکن ان کے مخالف کیمپ کے افراد غلطی پر ہونے کے باوجود صاحبِ ایمان تھے!

کتاب کا ترجمہ سلیس اور رواں ہے، بعض مقامات بڑے اثر انگیز ہیں، اس کتاب کے پڑھنے سے اسلام کی سربلندی کے لئے سرفروشی، ایثار و قربانی اور عزیمت و استقامت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

حضرت امام حسین شہید حصہ دوم

از:۔ ابو محمد امام الدین، ۲۰۸ صفحات، مجلد، قیمت: دو روپے، پچیس نئے پیسے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تحفظ ملت، رام نگر بنارس (بھارت)

محمود عباسی کی کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کو جمہورِ امت نے متفقہ طور پر رد کر دیا ہے، مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر جماعت نے اس کتاب پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اس کتاب کے دو نتیجے ظہور میں آ رہے ہیں — ایک یہ کہ رفض

میں شدت پیدا ہو رہی ہے، دوسرا یہ کہ بعض اہلِ سنت "خارجیت" سے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور حضرت علی رضؓ اور حضرت حسین رضؓ کے خلاف ان کے دلوں میں تکدر پیدا ہو رہا ہے! اس ناپسندیدہ کتاب کی حمایت، مدافعت اور منقبت سرائی میں ماہنامہ "تجلّی" نے جو پارٹ انجام دیا ہے، وہ یقیناً قابلِ احتساب ہے! محمود عباسی کے غلط موقف کی حمایت میں مدیرِ تجلّی کے قلم سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں!

مولانا عامر عثمانی جب کراچی تشریف لائے تھے، تو ہم نے اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ محمود عباسی صاحب نہ دینی فکر رکھتے ہیں اور نہ دینی زندگی! یہ کتاب انھوں نے دینی طبقوں میں تفرقہ اور ہنگامہ پیدا کرنے کے لئے لکھی ہے! مولانا عامر صاحب کے سامنے ہماری موجودگی میں بعض حضرات نے اس کی شہادت دی تھی کہ یہ شخص (محمود عباسی) حضرت علی اور حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی شان میں نازیبا کلمات تک کہہ دیتا ہے! ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ محمود عباسی صاحب بڑی حد تک "منکرینِ حدیث" کا مسلک رکھتے ہیں اور اُن کی آزادخیالی کا یہ عالم ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں احکام باقی رہنے چاہئیں قصص کو خارج کر دینا چاہیے (نعوذ باللہ)

———— پھر ————

ایک ثقہ عالمِ دین نے، جو معتدل مسلک رکھتے ہیں، مولانا عامر صاحب سے "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کی کھلی ہوئی کمزوریوں پر بھی تاریخی اور دینی دلائل کے ساتھ گفتگو کی تھی، توقع تھی کہ جناب عامر صاحب اپنے موقف پر نظرِ ثانی فرمائیں گے، یا کم سے کم "تجلّی" میں اس بحث ہی کو بند کر دیں گے مگر انھوں نے اس کے بعد محمود عباسی کے مضمون کو شائع کیا اور پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ عباسی صاحب کے موقف کی حمایت و تائید کی۔

جناب مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری نے اپنی اس کتاب میں مولانا عامر عثمانی مدیرِ "تجلّی" پر خوب کس کر جرح و تنقید کی ہے انھوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:-

"خلافتِ معاویہؓ و یزید" مسلک اہلِ سنّت والجماعت کے قطعاً خلاف ہے"۔

———— اور ————

"خلافتِ معاویہ و یزید" درصل تاریخ اور سیرت کی کوئی کتاب نہیں ہے، یہ ایک سیاسی نظریہ کی داعی اور علمبردار ہے، اور اس سیاسی نظریہ کو اگر کسی نام سے یاد کیا جائے تو اسے "یزیدی نظریۂ سیاست" کہا جائے گا، "یزیدی نظریہ سیاست یہ ہے کہ اسلامی سیاست و نظامِ حکومت کا کوئی معیار و منہاج نہیں ہے، معیار و منہاج صرف حکومت و اقتدار ہے جس کے قبضہ میں حکومت و اقتدار آجائے وہی امیر المومنین، امام المسلمین اور خلیفۂ راشد ہے، اس نظریہ و مسلک کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کا دورِ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شروع ہو کر حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر ختم ہو گیا، اس باب میں جو حدیثیں وارد ہیں اور جن پر اہلِ سُنّت کا اتفاق ہے وہ سب معاذ اللہ جعلی اور وضعی ہیں"

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی کرم اللہ وجہ نے جو معزول فرما دیا تھا، اُس کو مولانا عامر عثمانی درست نہیں سمجھتے، جناب ابو محمد امام الدین نے اس پر صحیح تنقید کی ہے۔

"..... معزولی کے لئے کسی چارج شیٹ یا جرم کی کوئی پابندی نہیں ، امیر و عامل پر خلیفہ کی اطاعت واجب ہے ، وہ جب بھی اس کی معزولی کا حکم صادر کر دے ، بے چون وچرا اس کو اپنی جگہ خالی کر دینی چاہیے ...."

حضرت امیر معاویہ رضؓ کی انتظامی اور سیاسی کارگزاریاں کتنی ہی شاندار رہی ہوں ، ان کی بنا پر "امارت" ان کا کوئی "حق" یا "وراثت" نہیں بن گئی تھی ، معزولی کے بارے میں انھیں اسی تسلیم و رضا کا ثبوت دینا چاہیے تھا ، جیسا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں سمع و اطاعت کا ثبوت دیا تھا ! امیر معاویہ کو دین اور اسلامی حکومت کی خدمت کرنی تھی ، چاہے وہ صوبہ کے گورنر بن کر کرتے یا معمولی عامل یا رعایا کے ایک فرد بن کر ! حضرت علی رضؓ کو امیر معاویہؓ سے یہی توقع تھی کہ وہ ابو عبیدہ بن الجراح اور خالد سیف اللہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کی روش اختیار کریں گے مگر امیر معاویہ رضؓ نے اطاعت کی جگہ عدول حکمی کی روش اختیار کی !

عباسی اور مدیر تجلی نے قاضی ابو بکر صاحب "عواصم و قواصم" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام حنبل نے تابعین سے پہلے زہاد میں یزید کا ذکر کیا ہے ، مگر اس کتاب میں مشہور محدث امام ذہبی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے :۔

مقدوح فی عدالتہ لیس باھل ان یروی عنہ وقال احمد حنبل لاینبغی یروی عنہ ۔ (میزان الاعتدال)

یعنی یزید اپنی عدالت حدیث میں مقدوح ہے ، وہ اس لائق نہیں ہے کہ اس سے حدیث روایت کی جائے ۔

—— اور ——

"مدیر "تجلی" کے قلم کا مرکز و محور دو باتیں ہیں ' ..... اول یہ کہ یزید حضرت معاویہ رضؓ کا فرزند دلبند تھا ، اور اس کو انھوں نے اپنا جانشین بنایا تھا ، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کو تمام محامد و محاسن کا پیکر یقین کیا جائے اور اس کے فسق و فجور اور ظلم و شقاوت کے متعلق ائمہ محدثین اور علماء مورخین نے جو کچھ لکھا ہے ، سب کو کذب و افترا مانا جائے ، دوم یہ کہ یزید جہاد قسطنطنیہ کا امیر تھا اور شرکاء جہاد قسطنطنیہ کے لئے حدیث نبوی ؐ میں "مغفور لہم" آیا ہے ، اس لئے یزید خواہ کیسا ہی ظالم و سفاک اور فاسق تھا ، خواہ اس کی مرضی اور ہدایت سے عترت رسول ؐ کا قتل عام ہوا ، مدینہ منورہ کے کوچہ و بازار صحابہ و تابعین کے خون سے لالہ زار بن گئے ..... خاتونان حرم کی عصمتیں حلال ہوئیں ، مسجد نبوی ؐ کی بے حرمتی ہوئی ، اور کعبۃ اللہ پر آگ ، اور پتھر کی بارش ہوئی ، یہ تمام مفاسد و قبائح اور فواحش یزید کے اعمال حسنہ قرار دیئے جائیں گے ۔"

یزید کو جب امیر معاویہ رضؓ نے ولی عہد بنایا ہے ، تو عام مسلمان ان کے اس فعل سے راضی نہیں تھے ، جمہور مسلمین کے خلاف یہ کارروائی کی گئی ، خود علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :۔

"اب رہی یہ بات کہ حضرت معاویہ رضؓ نے اپنے ناخلف بیٹے یزید کو خلافت کے لئے نامزد کیا تو یہ ان کی ذاتی خواہش تھی ، عام مسلمان اس سے راضی نہ تھے ۔"

—— اور ——

مصنفِ کتاب کے قول کے مطابق :—

"..... عترتِ رسول ﷺ کا قتلِ عام اسی ولیعہدی کا فیضان تھا! مدینۃ النبی ﷺ کی بربادی اور مکہ معظمہ اور بیت اللہ کی بے حرمتی و بربادی اسی ولیعہدی کا نتیجہ تھی! کیا اس سے پہلے بھی اُمت نے یہ برُے دن دیکھے تھے ...."

"خلافتِ معاویہؓ و یزید" کے مصنف نے اپنی کتاب میں دجل و تلبیس سے کام لیا ہے، اصل اقتباسات میں کتر بیونت کی ہے، اصل حقیقت کچھ اور ہے، اور اُسے اپنے خامہ باطل رقم کے زور سے مسخ کر کے پیش کیا ہے .... مثلاً :—

"...... اسی سلسلہ میں "العواصم" کے متعلق عباسی صاحب لکھتے ہیں :

—— "اس کا حوالہ مورخ ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق مقدمہ تاریخ میں ولایت العہد (یزید) کی بحث کے سلسلہ میں دیا ہے"۔

عباسی صاحب نے

"اس شان کے ساتھ قارئین کو یہ تو بتایا کہ ابن خلدون نے کتاب العواصم کا حوالہ دیا ہے مگر یہ نہ بتایا وہ حوالہ کیا ہے؟ یہ عباسی صاحب کا مستقل دیانت دارانہ (؟) اصولِ تحقیق ہے، جو اُن کی کتاب میں شروع سے آخر تک چلا گیا ہے —— حوالہ یہاں ملاحظہ ہو :—

وقد غلط القاضی ابو بکر بن العربی المالکی فی ھذا قال فی کتابہ الذی اسماہ بالعواصم والقواصم ما معناہ ان الحسین قتل بشرع جدہ وھو غلط حملۃ علیہ الغفلۃ عن اشتراط الامام العادل ومن اعدل من الحسین فی زمانہ فی اُمتہ وعدالتہ فی قتال اھل راء۔

(مقدمہ ابن خلدون)

قاضی ابو بکر مالکی نے اپنی کتاب "العواصم والقواصم" میں یہ کہہ کر سخت غلطی کی ہے کہ حسینؓ اپنے نانا کی شریعت کے مطابق قتل کئے گئے ابو بکر سے غلطی یہ صادر ہوئی کہ شریعت نے امام کے خلاف کھڑے ہونے والے کے لئے جو سزا تجویز کی ہے، اُس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ امام عادل ہو، قاضی ابو بکر نے امام عادل کی اس شرط کو نظر انداز کر دیا ہے، حسین رضؓ کے زمانے میں اُمت کی امامت کے لئے حسین رضؓ سے زیادہ عادل کون ہو سکتا ہے۔

محمود عباسی نے اپنی کتاب میں حضرت علی رضؓ اور حضرت حسین رضؓ کو گرانے اور امیر معاویہ رضؓ اور یزید کو بڑھانے کی کوشش کی ہے، یہی اس کتاب کا سب سے بڑا عیب ہے، مثلاً :—

"ابن الحدید کے قول کے آخر میں ہے "ہم ناقلین کی تکذیب نہیں کر سکتے، اور نہ اس کی استطاعت رکھتے ہیں کہ ان کا اسلام بالغین کے اسلام کے برابر رکھیں"۔

"آپ نہ سمجھے ہونگے محقق بے بدل نے کتابوں کے انبار میں سے یہ مردود قول ڈھونڈ کر کیوں نکالا ہے، غرض یہ ہے کہ ابو سفیان رضؓ اور امیر معاویہ رضؓ کے اسلام کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اسلام سے فائق و افضل ثابت کر دکھائیں، کیوں کہ یہ دونوں بزرگوار بڑھاپے اور جوانی میں اسلام لائے ...."

اس لغو اور ناپسندیدہ کتاب کی مدح وستائش میں ماہنامہ "تجلّی" کے فاضل مدیر یوں رطب اللسان ہیں :-

"کتابیں روز لکھی جاتی ہیں، لیکن زیر نظر کتاب ان کتابوں میں ہے، جو صدیوں میں ایک آدھ لکھی جا سکتی ہے، فاضل مصنّف جناب محمود احمد عباسی نے انتہائی دیدہ ریزی اور تلاش وتحقیق کے بعد خلافتِ معاویہ ویزید کے بارے میں وہ فرید ووحید مواد پیش کیا ہے، جس سے ہر انصاف پسند آدمی پر منکشف ہو جاتا ہے کہ حقیقت کیا تھی، اور آج کن خرافات وکذبات کو حقیقت کہا جا رہا ہے"۔ ۔ ۔ (تجلّی۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

مولانا عامر عثمانی کا یہ موقف کسی عنوان بھی تائید تو کجا، صرفِ نظر کا بھی مستحق نہیں ہے، ارباب حق کو اس سے بیزاری کا اظہار ہی کرنا چاہیئے!

اس کتاب ———— حضرت امام حسین شہیدؓ ———— میں علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کے اقوال پر بھی گرفت کی گئی ہے، علامہ ابنِ تیمیہ کا علم وفضل اور تقویٰ اپنی جگہ آفتاب کی طرح روشن ہے۔ مگر "شہادتِ حسینؓ" کے مسئلہ میں اُن کی رائے جمہور اُمت کے خلاف ہے اور ہم اس مسئلہ میں جمہور اُمت کے ساتھ ہیں۔

فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر وپس منظر

حصّہ سوم

از:- افتخار احمد بلخی، ضخامت ۵۸۲ صفحات، (خوب صورت سرورق) قیمت سات روپے۔
ملنے کا پتہ :- مکتبہ چراغِ راہ، کراچی۔

مولانا افتخار احمد بلخی کی اس کتاب کے دو حصے شائع ہو کر، مقبول ہو چکے ہیں، یہ تیسرا حصہ "فتنۂ انکارِ حدیث" کے رد میں پہلے دو حصوں سے بھی زائد وزنی، مدلل، موثر، اور مفید ہے! فاضل مصنف نے "پرویزیت" کو ننگا کر کے چوراہے پر کھڑا کر دیا ہے!

اس کتاب میں "منکرینِ حدیث" کی ٹولی کے سرغنہ مسٹر پرویز کی کتابوں کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ اس شخص نے "قرآنِ کریم" کے مفہوم ومعنیٰ کو مسخ کرنے کے لئے کیسی کیسی موشگافیاں کی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے دین کو ہوا وہوس کا بازیچہ بنا دینے کے لئے اہلِ نفاق کا پارٹ انجام دیا ہے، اس شخص کی تحریروں کے تضاد کو بھی دکھایا گیا ہے، مثلاً ۱۳۵۲ ہجری میں مسٹر پرویز کا یہ فیصلہ تھا۔

"قرآنِ کریم نے تخلیقِ آدم کا مقصد تفویض خلافت ونیابتِ الٰہی قرار دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ شرک کو ظلم عظیم اس لئے کہا کہ انسانی تخلیق کا مقصد تو یہ تھا کہ انسان تمام موجوداتِ عالم پر حکمرانی کرے اور ایک خدا کا نائب اور بندہ ہو کر، اس کی مخلوقات سے خدمت لے۔ ـــ
(مضمون "حقیقتِ شرک" رسالہ ترجمان القرآن جمادی الاُخریٰ ۱۳۵۲ھ)

مگر آج "پرویز صاحب" اس طرح قلابازی کھا رہے ہیں :ـــ

"۔ ۔ ۔ ۔ نیابتِ الٰہی کا نظریہ سراسر غیر قرآنی ہے، یہ تھیوکریسی کا وہ تصور ہے، جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
(اسباب زوالِ اُمت معارف القرآن اور قرآنی فیصلے)

یہ کتاب مسلمانوں کے ہر حلقہ میں خاص طور سے نوجوان طبقہ میں زیادہ سے زیادہ پھیلائے جانے کی مستحق ہے! اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ "انکارِ حدیث" دراصل "انکارِ رسالت" ہے، جو ایمان کے لئے زہر قاتل ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس فتنۂ عظیم کی پرچھائیں سے بھی بچاتا رکھے!

مسئلہ وحدت الوجود کی تحقیق

مرتب و مولف :— صفوۃ الرحمٰن، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت : ایک روپیہ
ملنے کا پتہ :— ادارۂ اہل سُنّت و جماعت سلطان شاہی حیدرآباد دکن (بھارت)

مولانا صفوۃ الرحمٰن صابر مدیر "الحق" توحید خالص کے داعی ہیں، شرک و بدعات کے خلاف اُن کے قلم نے جہاد کیا ہے کتاب و سُنّت سے بال برابر بھی تجاوز کہیں نظر آتا ہے، تو اُسے وہ برداشت نہیں کرسکتے اور اُن کی غیرتِ ایمانی حرکت میں آجاتی ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ ایمان، اسلام اور عبادت کی جان "توحید" ہے، اس پر حرف آیا، تو پھر کسی چیز کی خیر نہیں! یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے :—

(۱) باب اول :— وحدۃ الوجود کا مروجہ مفہوم اور اُس کی قرآنی تردید

(۲) باب دوم :— وحدۃ الوجود کا ماخذ؟

(۳) باب سوم :— اکابرِ اہلِ تحقیق کی آرار

اپنے موضوع پر یہ بڑی کارآمد، مفید اور تحقیقی کتاب ہے، فاضل مولف نے ثابت کیا ہے کہ "وحدت الوجود" کا نظریہ قرآن کے مطابق نہیں ہے، یہ "عینیت" اور "غیریت" کی بحثیں یونان و روم کے فلسفیوں اور بھارت کے گیانیوں کی پیدا کی ہوئی ہیں، اسلام نے اس قسم کی بحثوں اور عقلی موشگافیوں میں اُلجھنے کو کبھی پسند نہیں کیا، شیخ محی الدین ابن عربی "صاحب فصوص الحکم" بہت ذہین عالم تھے مگر اُن کی ذہانت نے ذہن و فکر کے لئے بڑے اُلجھاوے پیدا کر دیئے۔

صُوفی شعراء نے اس "لے" کو اور بڑھا دیا ہے، اُن کے یہاں اور زیادہ بے احتیاطیاں پائی جاتی ہیں، شیخ فریدالدین عطار کے جو اشعار اس کتاب میں دیئے گئے ہیں، وہ دینی اعتبار سے سخت وحشت ناک اور قابلِ اعتراض ہیں :—

قل ہو اللہ وصف احمد دان		از میانش ولیک میم برار

("قل ہو اللہ" کو "احمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی تعریف سمجھ! لیکن اُس کے درمیان سے "میم" نکال دے (پھر "احد" رہ جاتا ہے)

اور

شیخ عطار نے اپنی مثنوی میں یہاں تک لکھدیا ہے کہ —— "حضرت موسیٰ ؑ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ مجھے کوئی مرشد عطا ہو، حق سے آواز آئی کہ ابلیس کے پاس جاؤ، بہ تعمیل حکم حضرت موسیٰ ابلیس کے پاس گئے، اور اس سے یہ تعلیم پائی :—

عین آبیم ما و اُو با ما		بہم آمیختہ شکر کردار

(یعنی ہم اور خدا عینِ یکدیگر ہیں)

ناظر خود است و خود منظور		خود تماشا و خود تماشا کار
عاشق خود است و خود معشوق		خود طبیب خود است خود بیمار
خود پیمبر شد و پیام آورد		گشت خود منکر و نمود انکار
خود کند سانہ ہر گناہ کہ ہست		خود زند باز بابِ استغفار

ان تصورات سے خدا کی پناہ! توبہ! استغفر اللہ! "تصوف" کا یہی مزاج ہے، جو ان شعروں سے نمایاں ہے! یہ دیکھکر حیرت ہی نہیں اذیت بھی ہوتی ہے کہ حامیان کتاب و سُنت اور علماء شریعت "وحدت الوجود" کی مدافعت فرماتے اور "صوفیاء" کے ان شطحیات کی تاویلیں کرتے ہیں۔

مولانا صفوۃ الرحمٰن قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اللہ اور رسول ؐ کے مقابلہ میں شخصیتوں سے مرعوب ہوئے بغیر "مسئلہ وحدت الوجود" کی تحقیق فرماکر، اس مسئلہ کی کمزوریوں بلکہ گمراہیوں کو ظاہر کر دیا۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

برگِ آوارہ

از:- حبیب جالب، ضخامت ۱۳۶ صفحات (مجلد، رنگین سرورق) قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ "کارواں" ایبک روڈ، انارکلی، لاہور

پاکستان اور ہندوستان میں "شعر کہنے والوں" کی کمی نہیں ہے مگر ان میں کتنے ایسے ہیں، جنھیں "شاعر" کہا جاسکتا ہے! جناب حبیب جالب کا شمار "شعر گووں" میں نہیں بلکہ "شاعروں" میں ہوتا ہے، انھوں نے کسی پروپیگنڈے کے بغیر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر ترقی کی اور نام پیدا کیا ہے!

حبیب جالب کی غزلوں کی نمایاں خصوصیت نغمگی ہے اور جہاں کہیں شاعر نے اپنے چوٹ کھائے ہوئے دل کی دھڑکنوں کو شعر میں سمو دیا ہے، وہاں تاثیر کا یہ عالم ہے:- ؎

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

×

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں!
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

بہت سے شاعر سالہا سال کی مشق کے بعد بھی اپنا کوئی آہنگ پیدا نہیں کر سکتے، مگر حبیب جالب نے بہت سے بہت آٹھ سال کی مدت میں غزل میں "اپنا آہنگ" پیدا کر لیا!

چند منتخب اشعار:-

آج اس شہر میں، کل نئے شہر میں، بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

جس پر تھا اک ہجوم کبھی اہلِ شوق کا
تنہا گزر رہے ہیں اب اس رہگزر سے

ترکِ وفا کا دل میں نہ آنے دیا خیال
اس آئینہ کو ہم نے بچایا غبار سے

یہ اور بات تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر ترا چھوڑ جائیں ہم

مدت ہوئی ہے کوئے بتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے

ہر چند وہاں بھی خزاں کی اداس دھوپ
دل پر نہیں تھا غم کا اثر اس دیار میں

محسوس ہو رہا تھا، ستارے ہیں گردِ راہ
ہم تھے ہزار خاک بسر اس دیار میں

• دُنیا تو چاہتی ہے یوں ہی فاصلے رہیں
دُنیا کے مشوروں پہ نہ چل، اُس گلی میں چل

تیرے گیسوؤں ہی پر میری جاں نہیں موقوف
ذرہ ذرہ ہستی کا آج کل پریشاں ہے

• اگر دامن نہیں اُن کا میسر
کسی دیوار ہی سے لگ کے رو لیں

بہت آسان ہو جائے گی منزل
چلو ہم بھی کسی کے ساتھ ہو لیں

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی، بات بڑی بات ہے پیارے

حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے

اک عمر سنائیں تو حکایت نہ ہو پوری
دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے

بہت روئے زمانے کے لئے ہم
ذرا اپنے لئے آنسو بہا لیں

ہم اُن کو بھولنے والے نہیں ہیں
سمجھتے ہیں غمِ دوراں کی چالیں

نکلنے کو ہے وہ مہتاب گھر سے
ستاروں سے کہو نظریں جھکا لیں

ہم اپنے راستہ پر چل رہے ہیں
جناب شیخ اپنا راستہ لیں!

یہیں ٹھہر، یہیں ٹھہر میں آ رہا ہوں میری جاں
بُلا رہا ہے اک ذرا سی دیر کو غمِ جہاں

کتنی روشن ہے تنہائی جب سے یہ معلوم ہوا
میرے لئے اپنی پلکوں پر تم بھی دیپ جلاتی ہو

یہ کیا کہ تجھے بھی ہے زمانہ سے شکایت
یہ کیا کہ تری آنکھ بھی پُرنم ہے مری جاں

یہ تیری توجہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
ہر شخص ترے شہر کا برہم ہے مری جاں

اس قدر بے رُخی سے بات نہ کر
دیکھ تو ہم کہاں سے آتے ہیں

ہم سے پوچھو چمن پہ کیا گزری
ہم گزر کر خزاں سے آتے ہیں

شب کی تاریکیوں میں، تیرا خیال
جیسے کھو جائے روشنی میں نظر

شوقِ آوارگی میں کیا نہ ہوا
ایک تیرا ہی سامنا نہ ہوا

ناخدا تو ہمیں ڈبو دیتا
خیر گزری کہ وہ خدا نہ ہوا

شاید اسی لئے ہمیں منزل نہ مل سکی
جتنے بھی ہم کو لوگ ملے راہبر ملے

• پھر رہا ہوں یوں تری گلیوں سے دور
جیسے کوئی راستہ بھولا ہوا

اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے
ساتھ کون تھا پہلے ہو گئے جو اب تنہا

• شہرِ ظلمات کے ثناخوانو!
شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں!

اور کچھ دیر صبح پر ہنس لو
اور کچھ دیر ... کوئی بات نہیں

رنگ و بوئے گلاب کہہ لوں گا
موجِ بادہ شراب کہہ لوں گا

لوگ کہتے ہیں تیرا نام نہ لو
میں تجھے ماہتاب کہہ لوں گا

ہمارا داغِ دل جائے نہ جائے
ترا دامن تو ہم نے دھو دیا ہے

• اِن کے آنے کے بعد بھی جالب
دیر تک اُن کا انتظار رہا

میں بھی ہوں تری طرح سے آوارہ و بیکار   اُڑتے ہوئے پتے مجھے ہمراہ لئے چل
ستارو! یوں ہی جگمگاتے رہو   رفیقو! کہیں ٹوٹ جائے نہ آس

گیت لکھائیں، پیسے نا دیں فلم نگر کے لوگ
ان کے گھر باجے شہنائی لیکھک کے گھر سوگ
گائک سُر میں کیوں کر گائے کیوں نا کالے گھاس

بھئے کبیرا داس

دوسرا رُخ :

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں   (ص ۱۱)

"موسم نے نظریں بدلیں" اس شعر کا یہ ٹکڑا، شعر کے دوسرے لفظوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے

دور افتادہ بستیوں میں کہیں   تیری یادوں سے لو لگائیں گے   (ص ۱۵)

شعر یوں بھی سطحی ہے، یاد کی جمع "یادوں" نے اسے اور کمزور کر دیا۔

یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا   جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے   (ص ۱۷)

شعر بہت اچھا ہے ــــ مگر "حسن" زائد لفظ ہے، اس کی جگہ "اپنی" ہوتا تو شعر میں اور زیادہ قوت پیدا ہو جاتی ــ

جاگ اُٹھے سوتے ہوئے درد تمناؤں کے   راستے ذہن میں لہرا گئے اس گاؤں کے   (ص ۲۰)

شعر میں بڑا تکلف اور آورد پائی جاتی ہے! "درد کا سونا" خاصہ محلِ نظر ہے! پھر "درد" کی اُردو میں جمع نہیں آتی ــ اور آتی ہے تو "دردِ زہ" کے لئے آتی ہے!

صبح سے شام تلک گرم ہوا چلتی ہے   دن بہت سخت ہیں تپتے ہوئے صحراؤں کے   (ص ۲۰)

اس شعر میں کوئی فکر نہیں، خیال نہیں! سامنے کی بات کو نظم کر دیا ہے!

پھر دل سے آ رہی ہے صدا اس گلی میں چل   شاید ملے غزل کا پتا اس گلی میں چل   (ص ۲۳)

کیا "غزل" کھو گئی ہے، جو یار کی گلی میں اُس کی تلاش کے لئے جانے کی تمنا کی جا رہی ہے! شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ شاید اُس گلی میں غزل کے لئے کوئی موضوع مل جائے یا غزل کہنے کے لئے وہاں جا کر دل و دماغ میں کوئی تحریک پیدا ہو جائے!

آج بھی نگاہوں سے وحشتیں نہیں جاتیں   آج بھی نگاہوں میں کائنات ویراں ہے   (ص ۲۵)

سپاٹ شعر! اس قسم کے اشعار مجموعۂ کلام سے چھانٹ دینے چاہئیے تھے ــ

جس کی سرِ افلاک بڑی دھوم مچی ہے   آشفتہ سری ہے، مری آشفتہ سری ہے   (ص ۳۵)

آخر اس کا کیا ثبوت ہے کہ شاعر کی آشفتہ سری کی افلاک میں دھوم مچی ہے، بات کہنے کا کوئی قرینہ، تلمیح یا کنایہ ہونا چاہئیے ــ

اپنی تو اُجالوں کو ترستی ہیں نگاہیں   سورج کہاں نکلا ہے، کہاں صبح ہوئی ہے

"سورج کہاں نکلا" میں "الف" بُری طرح دب رہا ہے!

ہم سے روٹھ کے جانے والو! اتنا بھید بتا جاؤ   کیوں نت راتوں کو سپنوں میں آتے ہو من جلتے ہو   (ص ۳۷)

شعر میں کوئی لطف نہیں ـــــ پھر "من جاتے ہو" اس ٹکڑے نے شعر کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔

پیار کی بات نہ پوچھو یارو! ہم نے کس کس سے نہیں پیار کیا (ص ۵۷)

شعر سطحی اور بے مزہ ہے۔

نظر نظر میں لئے تیرا پیار پھرتے ہیں مثال موجِ نسیمِ بہار پھرتے ہیں (ص ۶۰)

محبت کو پیار کہتے ہیں، مگر یہاں "پیار" کی جگہ "محبت" ہی کہنا چاہیے تھا۔

حسرت رہی یہاں تو کوئی دیدہ ور ملے لیکن تری گلی میں سبھی کم نظر ملے (ص ۶۵)

محبوب کی گلی کے تمام لوگوں کو "کم نظر" کہنے سے، محبوب کی توہین کا پہلو نکلتا ہے کہ اس کے جتنے بھی چاہنے والے ہیں وہ نگاہ میں بلندی اور وسعت نہیں رکھتے!

ہم کو تو داغِ دل کے سوا کچھ نہ مل سکا ان بستیوں میں پیار کسی کو مگر ملے (ص ۶۶)

دوسرے مصرعہ میں شعریت کا دور دور پتا نہیں!

اب نہ وہ غزل اپنی، اب نہ وہ بیاں اپنا راکھ ہوگیا جل کر ہر حسین گماں اپنا (ص ۶۷)

"گمان" کا جل کر راکھ ہوجانا، اس میں کس قدر غرابت پائی جاتی ہے، جیسے "گماں" بھی گھانس پھونس اور لکڑی کی طرح کوئی مادی چیز ہے!!

اب اُن کی یاد سے پلکوں پہ روشن اب اُن کو کہہ نہیں سکتے ہم اپنا (ص ۱۲۶)

یہ بات آخر کیا ہوئی؟ محبوب کی یاد میں پلکوں پہ آنسو آجانے سے محبوب غیر کیسے ہوگیا۔ "اپنا" کیوں نہیں رہا۔

شہر سے بستی سے ویرانے سے جی گھبرا گیا اے جنوں تیرے ہر افسانے سے جی گھبرا گیا (ص ۱۳۰)

مصرعہ ثانی، پہلے مصرعہ کے جوڑ کا نہیں ہے!

دُنیا نے وہ درد دیئے بھول گئے ہم اُن کی گلی (ص ۱۳۱)

اس شعر میں "درد" کی جمع لائی گئی ہے! درد کی جگہ "رنج" آسکتا تھا!

چراغِ راہ کا نظریۂ پاکستان نمبر

مرتبہ:۔ خورشید احمد اور محمود فاروقی، مینجنگ ایڈیٹر:۔ چوہدری غلام محمد۔ ضخامت ۴۴۵ صفحات

قیمت:۔ پانچ روپے (سرورق رنگین وجاذبِ نظر)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر "چراغِ راہ" کراچی ۱

ماہنامہ "چراغ راہ" کے "نظریۂ پاکستان نمبر" کا بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔ اس کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے ہی اس کی بہت دھوم تھی، یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ یہ شمارۂ خاص توقع سے بڑھ کر کامیاب نکلا، مضامین میں تنوع بھی ہے، گہرائی اور بلندی بھی ہے، پھر سب سے بڑھ کر مقصد کی افادیت! ایک سے ایک بڑھ کر مضمون!

حصۂ اول:۔ اسلامی نظریہ

حصۂ دوم:۔ پاکستان، ماضی، حال، مستقبل

حصۂ سوم:۔ مذاکرہ، پاکستان اور اسلامی نظریہ

حصۂ چہارم:۔ تاریخی دستاویزات

لکھنے والوں میں بہت سے تو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، ہر مضمون نگار علم و ادب کے اعتبار سے کسی نہ کسی قابل لحاظ خصوصیت کا حامل ہے، پاک و ہند کے شاید ہی کسی رسالہ اور اخبار کو اتنے بلند پایہ مضمون نگار میسر آئے ہوں!

مضامین کی ترتیب میں بھی بڑا سلیقہ اور خوش ذوقی پائی جاتی ہے، بعض مستشرقین کے مضامین کے تراجم بھی اس میں شامل ہیں جہاں جہاں ان حضرات کے قلم نے اسلام کے بارے میں نیلش زنی کی ہے، جناب خورشید احمد نے ہاتھ کے ہاتھ اس کا ازالہ بلکہ مداوا بھی کر دیا ہے!

یہ خاص نمبر اس مقصد کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے کہ پاکستان "نظریہ اسلام" کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے، اس لئے یہاں کی سیاست حکومت اور معاشرت میں "اسلام" ہی کو غالب ہونا چاہیئے ــــ اگر خدانخواستہ "اسلام" کو پاکستان میں غلبہ میسر نہیں آتا، تو یہ پاکستان کے مقصد وجود کے ساتھ بہت بڑی بے وفائی ہوگی!

"نظریۂ پاکستان نمبر" کامیاب ترین دینی پیش کش ہے، اللہ تعالیٰ اس کے مرتبین کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ نمبر شائع کر کے دین کی، ملت کی اور پاکستان کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے! یہ بہت بڑا تعمیری کام ہے جو انہی کی کوشش سے پورا ہوا ہے! یہ نمبر یوں تو مسلمانوں کے ہر طبقہ میں بار پانے کا مستحق ہے، مگر حکومتِ پاکستان کے چھوٹے بڑے کارکنوں کی نگاہ سے خاص طور سے گزرنا چاہیئے، اس کے پڑھنے سے اسلامی آئین و قانون کے بارے میں ذہن صاف ہوتا اور بہت سی الجھنیں دور ہوتی ہیں!

علم و عمل (جلد اول)

وقائع عبدالقادر خانی - ترجمہ :- مولوی معین الدین افضل گڑھی - ترتیب و حواشی :- محمد ایوب خاں قادری (بی اے) تعارف :- نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ضخامت ۴۰۰ صفحات، بڑا سائز۔ مجلد، رنگین گرد پوش، قیمت :- آٹھ روپے۔

ملنے کا پتہ :- آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، سعیدہ منزل متصل سرسید گرلز کالج ناظم آباد، بی روڈ - کراچی!

اس کتاب پر "تقریب" سید الطاف علی بریلوی نے "تعارف" نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اور مقدمہ محمد ایوب قادری (بی - اے) نے لکھا ہے! یہ کتاب مولوی عبدالقادر کا خود نوشتہ فارسی تذکرہ ہے، جس کا ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی نے کیا ہے، یہ تذکرہ ۱۸۳۱ء میں مرتب ہوا تھا ــــ "پہلی جلد روہیل کھنڈ، بنگال اور دہلی کے حالات پر مشتمل ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۵ء تک کے حالات آگئے ہیں ---- یہ وقائع اُس دور کے تمدن اور سیاسی حالات کے عکاس ہیں، ریاست رام پور کے تاریخی واقعات خاص طور سے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اس تذکرہ سے انگریز حکام کے مزاج و طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس حکمت اور معاملہ فہمی کے ساتھ حکومت کرتے تھے اور اُنکے انصاف، انتظام اور فرمانروائی کا کیا انداز تھا۔"

صاحبِ تذکرہ نے جن مقامات کی سیر کی ہے، وہاں کے عمائد اور علماء کے حالات بھی اپنی کتاب میں درج کر دیئے ہیں - دلّی کے علماء اور شعراء کا تذکرہ خاص طور سے اس کتاب کا اہم حصہ ہے - مارہرہ شریف کے حالات میں یہ تک ملتا ہے :-

> "خانقاہ میں بہت سی کتابیں اور عمدہ نسخے ہیں، دوسری نادر چیزیں جو علماء اور مشائخ کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں، بڑی سرکار میں موجود ہیں - منجملہ اُن کے "ہمائے مردہ" بھی ہے، لیکن میں نے اس کو دیکھا نہیں، لوگوں کی زبانی سنا ہے۔"

مولوی عبدالقادر سنہ ۱۷۸۰ء میں رام پور میں پیدا ہوئے اور وہاں کے مشہور عالم مولانا شرف الدین سے علوم متداولہ کی تحصیل شروع کی اور چار سال تک یہ تعلیم جاری رہی، اس کے بعد مولوی ضیا الدین رام پوری کی علمی صحبت سے استفادہ کیا، اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ علم مناظر و مرایا، اصطرلاب اور ہندسہ میں خاص طور سے مہارت حاصل کی، اس کتاب میں متعدد زائچے اور مساحت کی شکلیں صاحب تذکرہ کی بنائی ہوئی ملتی ہیں! اس زمانہ میں صحتِ زبان کا کس قدر خیال رکھا جاتا تھا، اس کی تفصیل تذکرہ نگار کی زبان سے سنیئے :—

"زبان کھلنے پر میں نے دادی کی زبان سیکھی جو شاہ جہاں آباد (دلی) کی اُردو تھی۔ میری دادی نے میری ماں کو بھی شاہ جہاں آباد کی اُردو سکھائی تھی، اگر کوئی محاورہ مراد آباد کا میری ماں کی زبان سے نکلتا جو شاہ جہاں آباد کے محاورے کے خلاف ہوتا تو میری دادی فوراً ٹوک دیتیں ....."

مولوی عبدالقادر متعدد کتابوں کے مُصنّف تھے، اُردو اور فارسی کے شاعر تھے، یہ شعر ہم نے بچپن میں سُنا تھا! ؎

یہ ہے قسمت کی خُوبی دیکھیے میرے جنازے پر
نمازی یاں تلک بھٹکے کہ اک تکبیر کم کر دی

اس کتاب کے پڑھنے سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ یہ شعر عبدالقادر غمگین رام پوری کا ہے —

مولوی عبدالقادر بہت سے سرکاری عہدوں پر مامور رہے، لارڈ ولیم بنٹنک نے مراد آباد میں "صدر الصدور" کے عہدے پر اُن کو مقرر کر دیا، چھ مہینے اُن کا سراج الدین شاہ ظفر کے دربار سے بھی تعلق رہا — انگریز حاکموں کے وہ بہت مداح ہیں اور اپنی اس کتاب میں انھوں نے ایک انگریز حاکم کو، جو اُن کا مُحسن ہے، جگہ جگہ "آقا" لکھا ہے! صاحب تذکرہ نے اُس دور کے اجل علماء اور مشاہیر کو دیکھا ہے، یہاں تک حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی محفلوں میں شرکت کی سعادت حاصل کی ہے!

خواجہ الطاف حسین حالی نے "یادگارِ غالب" میں بھی مولوی عبدالقادر رامپوری کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے مرزا غالب کے سامنے دو مصرعے موزوں کر کے پڑھے —

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

اور کہا کہ یہ آپ کا شعر ہے، غالب اس پر چونکے بلکہ حیران و پریشان ہو گئے، اور کہا کہ حاشا وکلّا یہ میرا شعر نہیں ہے، مولوی صاحب نے کہا میں نے یہ شعر آپ کے دیوان میں دیکھا ہے :—

"آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرایہ میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں"۔

جناب محمد ایوب قادری نے صحیح لکھا ہے کہ :—

"حاصل یہ ہے کہ مولوی عبدالقادر جیسے نقادانِ سخن کی نکتہ چینیوں اور تعریضوں سے مرزا غالب نے مشکل پسندی کو چھوڑ کر، سلاست و روانی کو اختیار کیا"۔

عبدالقادر "مولوی" تھے۔ ہندسہ اور ہیئت کے عالم تھے مگر ساتھ ہی سخن سنج اور سخن گو بھی تھے، اس لئے اُن کے اس سنجیدہ تذکرہ میں، یہ عبارت بھی نظر آئی :—

"پاتر گاؤں میں بقیہ دن اور تمام رات گزاری، گاؤں سے کھانے کا سامان آگیا مگر قیمتاً انھوں

لئے نزلی، گاؤں والے مرد و عورت سب خوب صورت خصوصاً عورتیں پری پیکر ہیں، اس گاؤں کی رہنے والی رنڈیاں ہندو مذہب کی اور گویتے ڈومرہ قوم کے ہیں، یہ گویتے ہرلکھ کہلاتے ہیں، اس قوم کا حسن ہر پیر و جوان کے لئے بلائے جان اور ہر گبر و مسلمان کے مذہب کا لٹیرا ہے۔"

یو۔پی کے شہروں میں پہاڑی کنچنیں جو "پاتر" کہلاتی ہیں، اور جو اپنے حسن و جمال کے سبب مشہور ہیں، اسی علاقہ کی ہیں اور غالباً "پاتر گاؤں" ہی سے نسبت و تعلق کے سبب "پاتر" کے لقب سے مشہور ہیں۔

مشہور فلسفی عالم مولوی فضل حق خیر آبادی کے حالات میں لکھا ہے:۔

"...... ایک روز میں نے کہا حج اصغر عمرہ ہے اور حج اکبر میں عرفات کا قیام بھی ضروری ہے، جناب مولوی فضل حق نے فرمایا، حج اکبر وہ ہے کہ جمعہ کے روز ہو، ہر چند میں اپنے مدعا پر عقلی دلیلیں لایا۔ مگر انھوں نے اپنے حسن بیان سے سب کو ہیچ اور پوچ بنا دیا۔"

اور اس مسئلہ میں مولوی عبدالقادر رام پوری ہی کا موقف صحیح ہے، مولوی فضل حق خیر آبادی نے جو یہ فرمایا کہ "حج اکبر وہ ہے کہ جمعہ کے دن ہو" اس کی سند کتاب و سنت سے نہیں ملتی، یہ "جمعہ کے روز حج اکبر" ہونے کی بات عوام میں مشہور ہے، جس کی کوئی اصل نہیں! اس سے مولوی فضل حق خیر آبادی کے مزاج اور معتقدات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مولوی اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی جو مخالفت کی تھی، اس کا پس منظر کیا تھا؟

مولوی عبدالقادر نے اپنے تذکرہ میں قبروں پر جاکر ان سے مرادیں مانگنے والوں کو "جہلاء" کہا ہے، (ص ۱۷۱) اور حضرت بوعلی شاہ قلندر رح کے مزار پر جو عجیب قسم کی مشرکانہ بدعات ہوتی ہیں، ان کو "بے ہودگی" سے منسوب کیا ہے (ص ۱۷۷ و ۱۷۸)

—— اور ——

"ماہ ربیع الاول میں "قدم شریف" پر بہت زیادہ ہجوم ہوتا ہے، اس کی اصلیت یوں ہے کہ اس پتھر پر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش معجزہ کے طور پر ہو گیا ہے، روایت کے اعتبار سے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے نادان لوگ وہاں پر ہجوم کرتے ہیں، اور اس قدم تعظیم کرتے ہیں جو پیغمبر کے لئے بھی جائز نہیں، اس کو سجدہ کرتے ہیں، آنکھیں ملتے ہیں۔"

—— اور ——

"... مشائخ کے ملفوظات بطور تلاوت پڑھنا، بزرگوں کے نام اسماء حسنیٰ (خدا کے ناموں) کی طرح وظیفہ بنانا اور حل مشکلات میں مستند اور محترم سمجھنا اور استغاثہ و مناجات میں خدا کی طرح یاد کرنا.... ان کی صورت کے تصور کو عبادت سمجھنا...... یہ سب بدعتیں ہیں، بعض کفر کی حد میں آجاتی ہیں اور بعض فسق ہیں......"

کتاب کا ترجمہ عام فہم اور سلیس ہے، فاضل مرتب نے اصل ترجمہ پر نظر ثانی کی ہے، صفحہ ۲۷ پر ایک جملہ ہے:۔

"... اور کبھی اس برے کام کا جو اس کے خاندان نے اس کے باپ کے ساتھ کیا تھا،

اس کا اشارہ وایما تک زیرلب نہ لایا . . ."

اس جملہ میں ذم پایا جاتا ہے، آئندہ ایڈیشن میں اس جملہ کو بدل دینا چاہیئے!

جناب محمد ایوب قادری وقائع اور تاریخی تذکروں میں قابلِ اعتماد بصیرت رکھتے ہیں، اس فن میں اُن کی نظر اور معلومات بہت وسیع ہیں، اس کتاب پر اُنکے حواشی پڑھ کر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کس قدر وسیع المطالعہ ہیں اور انھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں کتنی محنت اور تفحص سے کام لیا ہے!

صفحہ ۱۲۶ پر فاضل حاشیہ نگار نے ضلع بجنور کے مشہور قصبہ چاندپور پر جو مختصر سا نوٹ دیا ہے، اُس میں مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کا ذکر تو کیا مگر چاندپور کی سب سے زیادہ مشہور و ممتاز شخصیت قائم چاندپوری کا نام تک نہیں لیا — اسی طرح ص۱۰۷ پر ضلع مرادآباد کے قصبہ کندرکی کا جو نام آیا ہے، تو اس سلسلہ میں سر سید رضا علی مرحوم کا ذکر کرنا چاہیئے تھا کہ وہ کندرکی میں پیدا ہوئے تھے!

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہے، مستقبل کے مورخین اور تذکرہ نگار اس کتاب ——— وقائع عبدالقادر خانی ——— سے یقیناً فائدہ اُٹھائیں گے۔

گفتنی

از:۔ مخمور سعیدی، ضخامت ۱۴۴ صفحات (مجلد، رنگین سرورق) قیمت:۔ دو روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تحریک ۹، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔

جناب مخمور سعیدی ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں، انھوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے، اور تعارف و شہرت کی منزل تک پہنچنے میں بڑی سلامت روی کا ثبوت دیا ہے اُن کے مجموعۂ کلام ——— گفتنی ——— کے دیباچہ میں جناب گوپال متل لکھتے ہیں:۔

> "..... آپ (مخمور) کے کلام میں ندرتِ فکر بھی ہے اور ندرتِ احساس بھی، اس کی جمالیاتی اور عشقیہ شاعری میں آپ فتادگی تو پائیں گے، لیکن یہ فتادگی ایک غیور انسان کی فتادگی ہے . . ."

مُنتخب اشعار:۔

بربطِ دوش کا میں نغمۂ سرشار بھی ہوں　　سازِ امروز کی اک آہنی جھنکار بھی ہوں
شاخِ گل کی بھی لچک ہے مری فطرت میں مگر　　وقت کے ہاتھ میں چلتی ہوئی تلوار بھی ہوں

اے شبِ زندگی کی تابانی　　دے دُعا، ہم سے کج دماغوں کو
• ہم نے خود بجھ کے کر دیا روشن　　کتنے بجھتے ہوئے چراغوں کو

خاکِ پا میں ہماری تابندہ　　علم و ادراک کے شرارے تھے
آج تہذیب کے چراغ میں وہ　　کل جو نقشِ قدم ہمارے تھے

خرد غیروں کے در پر سر بسجدہ　　جنوں ہے آپ اپنا آستانہ
خرد کی روشنی جگنو کی جھل مل　　جنوں ہے آندھیوں میں شمعِ خانہ

عقل اگر نا شگفتہ غنچہ ہے　　عشق بادِ سحر کو کہتے ہیں

عقل اک آئینہ سہی لیکن — عشق آئینہ گر کو کہتے ہیں

اک غریبِ شہر کو یہ کون بتلائے کہ تو — کس کے خوابوں کی دلھن ہے، کس کے بستر کی شکن

سانحے جو گردشِ ایام کی تفسیر بھی ہیں — میری ہستی کا جو حاصل بھی ہیں، تقدیر بھی ہیں

بھیجے تھے تو نے، جو گلِ شاداب تحفتاً — مرجھا گئے تو کیا، ابھی مہکے ہوئے تو ہیں

اب تحفہ ہائے گل کی ضرورت نہیں مجھے — اب[1] خود بہار بن کے مرے گلستاں میں آ

کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے۔

کہ زندگی میں یہ غم نہ ہوتے
یہ دکھ یہ رنج والم نہ ہوتے
جو آج ہم ہیں، یہ ہم نہ ہوتے

پیشانیٔ صبح پہ وہ رقصِ رنگِ دنور — وہ چتونوں کی اوٹ میں لرزاں چراغ طور

عارض پہ جھلکیاں وہ طلوعِ شباب کی — جیسے چھلک رہی ہو صراحی[2] شراب کی

یہ شور تھا شبِ معراج آسمانوں پہ — اٹھو کہ جشنِ عقیدت کا اہتمام کریں

زمیں سے آج وہ انسان آنے والا ہے — قدم قدم پہ فرشتے جسے سلام کریں

میری دیوانگیٔ دل پہ کوئی پیکرِ ناز — کھلکھلا کر جو ہنسا بندِ قبا ٹوٹ گیا

دیکھے ہیں زندگی میں کچھ ایسے بھی حادثات — ڈرتے ہیں موت سے بھی سوا زندگی سے ہم

حسن پر آنے نہ پائے کوئی الزام شکست — خود محبت سپر انداز ہوئی جاتی ہے

شاید کوئی کہیں سے آواز دے رہا ہے — اے فرطِ شوقِ منزل، لوٹ آئے ہم کہاں سے

یہ کس خیال نے کی ہے مری زباں بندی — تجھی سے کہنے کی باتیں، تجھی سے کہہ نہ سکوں

یہ ستارے ہیں ہی کاہکشاں کے شایاں — میرے آنسو تری پلکوں پہ سجا دے کوئی

• دو دھڑکتے دل ہوتے ہیں آشنا باہمدگر — دو جواں روحوں کی تقریبِ شناسائی ہے آج

• میری دیوانگیٔ شوق مسلّم لیکن — تم نے خود بھی نہ مجھے ہوش میں لانا چاہا

نسبتِ دوست سنبھالے رہی ورنہ دل[3] نے — مجھ کو اکثر مری نظروں سے گرانا چاہا

دہر میں پھیل گیا ہے غمِ دوراں ہو کر — ہم کہاں جائیں ترے غم سے گریزاں ہو کر

میری آشفتہ نگاہی پہ نہ کر طنز اتنا — تیرے جلوے بھی نہ رہ جائیں پریشاں ہو کر

اب حسن منفعل نہ ہو اپنے سلوک پر — اب عشق کو ملال کسی بات کا نہیں

خدا ہی جانے کس امید پر دھڑکتا ہے — وہ دل کہ جس کو تمنا تری نہیں ہوتی

• کچھ لوگ تھے کہ وقت کے سانچوں میں ڈھل گئے — کچھ لوگ تھے کہ وقت کے سانچے بدل گئے

[1] "تو" ہوتا، تو شعر میں اور قوت پیدا ہو جاتی۔ [2] "صراحی" کی جگہ "گلابی" ہوتا تو شعر کی رنگینی بڑھ جاتی
[3] "دل" زائد ہے۔

اور بھی تیز ذرا گردشِ جام اور بھی تیز — اس قدر تیز کہ رُک جائے زمانہ ساقی

غنچوں کے لبوں پر مسکراہٹ آئی — بجھتے تاروں میں جگمگاہٹ آئی
دل پچھلے پہر آج کچھ ایسے دھڑکا — جیسے ترے قدموں کی اب آہٹ آئی

دوسرا رُخ :—

بدل سکتا ہے تقدیرِ دو عالم — جنوں کا ایک حکم والہانہ (ص ۱۴)

"جنوں کا حکم" اس شعر میں کھٹکتا ہے، اور پھر "حکم" کی صفت "والہانہ" بھی محلِ غور ہے۔

دماغِ دو جہاں رقصندہ جس میں — جنوں کا دل اک ایسا شامیانہ

"دماغ" کو "رقصندہ" کہنا ہی عجیب سی بات ہے! مصرعہ ثانی بچکانہ ہے۔

اس نظم (جنوں و خرد) کا

یہ شعر کتنا تابناک ہے :—

خرد کی روشنی جگنو کی جھل مل — جنوں ہے آندھیوں میں شمعِ خانہ

اپنے سوئے ہوئے سنسان دریچے سے ملے — دیکھتا ہوں میں جہاں تک بھی نظر جاتی ہے (ص ۲۶)

"دریچے" کہیں سویا بھی کرتے ہیں! اس نام نہاد "ترقی پسند" نے کیسے کیسے اچھے ذہنوں کو متاثر کر دیا ہے۔

ڈر رہا ہوں کہ مجھے پھر کوئی سودا تو نہیں — کارگر مجھ پہ پھر افسونِ تمنا تو نہیں

پورا شعر ہی بے کیف اور کمزور ہے، "مجھ پہ پھر" کا تنافر اس پر مستزاد!

سُرخ عفریت کہ ہے اہر منِ عصرِ جدید — اس کی تلبیس کا ثبت ہے نشانہ اب تک (ص ۲۸)

شعر میں آورد ہی آورد پائی جاتی ہے! جناب مخمور سعیدی کی نظموں میں بڑی جان اور شگفتگی ملتی ہے مگر جہاں جہاں اُن کے شعروں پر "ترقی پسندی" کی پرچھائیں پڑ گئی ہے، وہاں وجدان گھٹن محسوس کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ انھوں نے "بے سر و پا نظمیں (بلینک ورس) تک کہی ہیں!!

دورِ رفتہ کا یہ خمیازہ ناحق کب تک — جامِ امروز مجھے کیوں نہیں پینے دیتے
اپنے وقتوں کے خوش اوقات و خوش انجام — میرے وقتوں میں مجھے کیوں نہیں جینے دیتے (ص ۳۳)

"خمیازہ" حق اور ناحق بھی ہوا کرتا ہے؟؟ . . . خوب!! دوسرے شعر میں "خوش انجام" کی جگہ "خوش انفاس" ہوتا تو شعر میں تغزل پیدا ہو جاتا۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "میرے وقتوں" وجدان کو بہت کھٹکتا ہے!

؎ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

اس مصرعہ میں "وقت" کی جمع "وقتوں" ٹھیک استعمال ہوئی ہے کہ "وقتوں" سے یہاں "ادوار" (Periods) مُراد ہیں، مگر یوں نہیں بولتے :—

"میرے وقتوں کے لوگ زمانہ ساز ہیں"

ہر قدم پر مرے سجدوں کی پنہ گاہیں ہیں — اَن گنت بُت تھے تصور کے صنم خانوں میں (ص ۵۰)

"سجدوں کی پناہ گاہیں" کیا ہوتی ہیں! پھر "پناہ گاہ" کا "الف" حذف کر دینے سے یہ لفظ کیا بن گیا؟ ---- توبہ!

موجِ تن پروری سے ٹکرا کر کشتیٔ روح ڈوب جاتی ہے
اُف وہ آغازِ عمرِ عقل کہ جب دفعتاً دل کو موت آتی ہے (ص ۱۰۶)

اِن شعروں میں کوئی لُطف اور رمزہ نہیں! "موجِ تن پروری" کی ترکیب کس قدر غریب ہے!

گزر گئی ہے حدودِ نشاطِ قرب سے بھی غمِ فراق کی لذت کبھی کبھی اے دوست (ص ۹۶)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ غمِ فراق کی لذت کبھی کبھی محبوب کے نشاطِ قرب سے بھی بڑھ گئی ہے مصرعہ اولیٰ میں یہ خیال ٹھیک طرح ادا نہیں ہوا،

ہم پہ دُنیا جو نام دھرتی ہے اعترافِ شکست کرتی ہے
ہم کہ اپنی خودی کے بندے ہیں یہ ہماری خودی سے ڈرتی ہے (ص ۱۴۳)

ایسے کمزور اور سپاٹ شعر مجموعہ کلام میں نہ رہنے چاہیئے تھے۔

نصیحۃ المسلمین

از:- مولانا خرم علی بلھوری (المتوفی ۱۲۷۳ھ) ضخامت ۶۷ صفحات قیمت: چار آنہ
ملنے کا پتہ :- جمعیۃ اہلِ حدیث، مصری شاہ، لاہور

مولانا خرم علی بلھوری رحمۃ اللہ علیہ ایک عالم تھے، شاعر تھے، مُصنف تھے اور مُجاہد تھے، انھوں نے حضرت سید احمد شہید قدس سرہٗ کے ساتھ جہاد میں حصہ لیا تھا، نثر و نظم پر یکساں قدرت رکھتے تھے، علامہ صغانی کی "مشارق الانوار" کو موصوف نے اُردو میں منتقل کیا تھا۔

مولانا خرم علی بلھوری کی یہ کتاب ــــــ نصیحۃ المسلمین ــــــ شرک و بدعت کے رَد میں بے مثل کتاب ہے، اور زبان کی سلاست و روانی، اسلوبِ بیان، استدلال اور وعظ و نصیحت میں رفق و اعتدال کے اعتبار سے "تقویۃ الایمان" سے زیادہ مؤثر اور مُفید ہے، "تقویۃ الایمان" کے بعض مقامات پر الفاظ کی گرفت ہو سکتی ہے مگر اس کتاب میں شرک و بدعت کی دھجیاں بکھیر کر رکھدی ہیں، لیکن لفظ و بیان میں اونچ نیچ پیدا نہیں ہونے پائی۔

یہ کتاب ڈیڑھ سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے، جب کہ اُردو زبان سچ مچ گھٹنوں چل رہی تھی اور مرزا غالب نے نثر لکھنی بھی شروع نہیں کی تھی، اُس دور میں اتنی سلیس، عام فہم، رواں اور سلجھی ہوئی نثر کا لکھنا، معجزہ سے کم نہیں، ایک نمونہ

"توحید ہندی زبان میں ایک جاننے کو کہتے ہیں، اور شرک ساجھا کرنے کو کہتے ہیں، اول مُسلمان پر یہی فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو جانے، اور شرک سے بچے، توحید اس کا نام نہیں کہ خدا کو زبان سے ایک کہے اور اپنی حاجتوں اور مُرادوں کے واسطے پیغمبر اور پیروں کی نذر مانے، اسی کا نام تو شرک ہے، بلکہ توحید کے یہ معنا ہیں کہ بس اللہ ہی کو ہر چیز کا مالک و مُختار جانے اور یہ سمجھے کہ اس کے سوا، پیر ہوں، یا پیغمبر ہوں یا شہید، کسی کو کچھ اختیار اُس کے کارخانے میں نہیں ۔ ۔ ۔"

جمعیۃ اہلِ حدیث مصری شاہ لاہور نے اس کتاب کو چھاپ کر، دین کی قابلِ قدر اور مُستحق اجر و ثواب خدمت انجام دی ہے، اس رسالہ کے مُطالعہ سے عقیدہ توحید کو اور زیادہ رسوخ حاصل ہوتا ہے اور شرک و بدعت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

حیات وحید الزماں

از:- مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، ضخامت ۱۶۵ صفحات (بڑا سائز) قیمت:- چار روپے
ملنے کا پتہ:- نور محمد، اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی۔

مولانا وحید الزماں نواب وقار نواز جنگ مرحوم علمی دُنیا میں خاصی شہرت رکھتے ہیں اور خاص طور سے احادیث نبوی کے تراجم نے اُن کو بہت زیادہ مُتعارف اور مشہور کیا ہے! مولانا محمد علی عبدالحلیم چشتی نے اس نامور عالم، مُصنّف اور مترجم کے سوانح حالات لکھ کر علم و ادب کی قابل ذکر خدمت انجام دی ہے، اس کتاب کا سب سے اہم باب، آخری باب ہے جس میں مولانا وحید الزماں کی تصانیف و تالیفات کا مفصل تذکرہ درج ہے! فاضل تذکرہ نگار نے کتابوں پر جس انداز میں تبصرہ فرمایا ہے، وہ اُن کی بالغ نظری اور وسعتِ مطالعہ کا روشن ثبوت ہے!

مصنف اپنے تذکرہ نگار کے صرف مداح و منقبت خواں ہی نہیں ہیں، بلکہ ناقد اور محتسب بھی ہیں، نواب وقار نواز جنگ کی زندگی کے اُن واقعات کو بھی ظاہر کر دیا ہے، چھپایا نہیں ہے، جن میں کمزوری کا پہلو نکلتا ہے، اور اُن کی کتابوں کی تحسین کے ساتھ تنقید بھی کی ہے، مثلاً "کنز الحقائق فی فقہ خیر الخلائق" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس کا اندازِ نگارش عام ہندوستانی علماء سے کچھ بلند ہے اور صرف و نحو کی غلطی سے پاک ہے، لیکن انشاء کا صحیح مذاق نہ ہونے کے باعث وہ غلطیاں موجود ہیں، جو ایک عجمی سے عموماً ہوتی ہیں، جس کی وجہ الفاظ کے برمحل استعمال سے ناواقفیت ہے"

"حیات وحید الزماں" سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ اب سے تقریباً پچاس سال قبل ۱۹۱۳ء میں "جمعیۃ الاتحاد والترقی" نے عمائدین عرب اور سربرآوردہ ترکوں کے باہمی اتحاد سے مدینہ منورہ میں ایک یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا ----- اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے اراکین میں حسن آفندی اور مولانا وحید الزماں بھی تھے ------"

—— مگر ——

اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت شاہ سعود ابن ملک عبدالعزیز کے لئے مُقدر فرمادی تھی کہ جلالۃ الملک نے مدینہ یونیورسٹی کے قیام کی طرح ڈال دی ہے، اُس کی پلاننگ کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے، جس کے ایک رُکن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی ہیں۔ (ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء)

ماہنامہ "ادیب" کا شبلی نمبر

نگراں:- سید ظہیر الدین علوی، مُدیر:- ابنِ فرید ایم - اے)
ضخامت ۴۰۴ صفحات، قیمت: چھ روپے -
ملنے کا پتہ:- سر سید بک ڈپو، علی گڑھ ۲
پاکستانی پتہ:- ماہنامہ "اچھا ساتھی" بارنس اسٹریٹ، کراچی ۳

ماہنامہ "ادیب" جامعہ اُردو علی گڑھ کا آرگن ہے، یہ مجلّہ باوقار اور سنجیدہ مضامین سے مُزیّن ہوتا ہے، "شبلی نمبر" اُس کی عظیم ادبی پیش کش ہے! علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی شخصیت گوناگوں کمالات کی حامل تھی، وہ عالم تھے مفکر و مورخ تھے، مصنف، ناقد و شاعر، اور ادیب اور انشاپرداز تھے، اُن کی ان تمام خصوصیات پر "شبلی نمبر" میں مقالے ملتے ہیں، ہر مقالہ اپنی جگہ کسی نہ کسی حیثیت سے انفرادیت رکھتا ہے، مقالہ نگاروں میں اکثریت مشاہیر اہلِ قلم کی ہے!

شبلی اور حالی معاصر تھے، مگر ایک دوسرے کے حریف نہ تھے، مگر انکے بعد یار لوگوں نے "شبلی اسکول" اور "حالی اسکول" کی تفریق کردی، اور "حالی اسکول" والوں نے عطیہ فیضی کے خطوط کا سہارا لے کر "شبلی" سے "معاشقہ" منسوب کردیا، اور اس طرح رائی کو پربت بناڈالا، شبلی کی سیرت کا یہ بڑا ہی اہم موضوع اور نازک مبحث ہے، جس پر جناب ابنِ فرید نے — شبلی چوں بہ خلوت می رود — کے عنوان سے سیر حاصل مقالہ لکھا ہے، اور شبلی کے بدنام کرنے والوں کو دنداں شکن جواب دیاہے، یہ مقالہ ان جملوں پر ختم ہوتا ہے :—

> "اب تو ضرورت اس کی ہے کہ شبلی کے حیاتِ معاشقہ کو چھوڑ کر عطیہ کی زندگی کے اُس دور کے بارے میں حقائق تلاش کئے جائیں، کیوں کہ شبلی کی رنگین زندگی کے بارے میں جو قیاسات کئے جاسکتے تھے، وہ حقائق میں احتمال کی حد تک بھی تبدیل نہیں ہوتے۔"

جناب ابنِ فرید "شبلی نمبر" کی ترتیب و اشاعت پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں، ادیب کا یہ خاص شمارہ اُن کی خوش مذاقی اور ادبی ذوق کی بلندی کا ثبوت ہے!

الاتباع

از :— علامہ قاضی صدر الدین — تصحیح و تعلیق :— مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، ضخامت ۹۴ صفحات قیمت بارہ آنہ — ملنے کا پتہ :— مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور —

عربی کا یہ رسالہ حنفی عالم سے منسوب ہے مگر ایک حنفی سے ہم اس کی توقع نہیں رکھتے کہ وہ اپنے فقہی مسلک کی تضعیف پر دلیلیں لائے اس لئے رسالہ ہٰذا کی حنفی عالم سے نسبت مُشتبہ ہے بلکہ مصنّف کے بارے میں تدلیس سے کام لیا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُصنّف نے اپنے فقہی مسلک کو دانستہ چھپایا ہے اور حنفی بن کر شافعی مذہب کی تحسین و تقویت اور حنفی مذہب کو گرانے کی غرض سے یہ رسالہ تصنیف کیا ہے — ایک دو نمونے :—

وہ تنور جس میں گوبر وغیرہ جلایا جاتا ہے، اُس کی پکی ہوئی روٹی کا کھانا امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز ہے مگر امام شافعی کے نزدیک جائز نہیں ہے — تو جس کتاب کے رد میں، یہ رسالہ (الاتباع) لکھا گیا ہے، اُس کتاب کے مصنف کہتے ہیں کہ اگر ابو حنیفہ کا مذہب نہ ہوتا تو شہروں میں تنور میں پکی ہوئی روٹی کے کھانے کے بارے میں لوگ مخمصے میں پھنس جاتے۔

اس رسالہ کے مُصنف، اس کی شرح یوں فرماتے ہیں کہ نجاست سے جو دھواں نکلتا ہے، اُن کے طاہر ہونے کا جو جواز فقہ حنفی میں ملتا ہے، وہ ابو حنیفہ کے مذہب کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، امام مالک امام احمد نے بھی یہی کہا ہے اور امام شافعی نے بھی اپنے پہلے قول سے رجوع کرکے، یہی بات کہی ہے!!

اس عجیب کا کوئی ٹھکانہ ہے کہ مذہب حنفی کی جس مسئلہ میں خصوصیت، توسع اور تقدم پایا جاتا ہے، اس فضلیت کا اس طرح انکار کیا جاتا ہے، ساری دُنیا جانتی ہے کہ احناف کا مذہب، تینوں مذاہب سے قدیم ہے، تو امام مالک اور امام احمد بن حنبل تک امام ابو حنیفہ کا یہ قول پہنچا ہے، جس کی انھوں نے تصویب کی ہے، یا پھر بر سبیل تنزل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں ان دونوں ائمہ کا امام ابو حنیفہ سے توارد ہوگیا، مگر اس توارد کے باوجود تقدیم کی فضیلت مذہب

ابوحنیفہ ہی کو سزاوار ہے، اب رہے امام شافعی، تو انھوں نے امام ابوحنیفہ کے قول کی بنا پر اپنے پہلے فیصلہ سے رجوع کیا ہے، یہ کھلی ہوئی دلیل ہے حنفی مذہب کے قوی ہونے کی!

امارت کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ اگر سلطان سے گناہ کبیرہ سرزد ہو۔۔۔ تو اُسے اس بنا پر معزول نہیں کیا جاسکتا کہ ایسا کرنے میں فساد اور خلل امن کا اندیشہ ہے مگر امام شافعی کہتے ہیں کہ معزول کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔۔

"الاتباع" کے مصنف نے اس پر یہ حاشیہ چڑھایا ہے کہ امام غزالی نے "البسیط" میں یہی بات کہی ہے کہ فسق کے سبب سلطان کو معزول نہیں کیا جاسکتا ـــــ اس مسئلہ میں بھی مذہب ابی حنیفہ کا شرفِ تقدم ثابت ہے کہ امام غزالی تو امام ابوحنیفہ کے کئی سو سال بعد ہوئے ہیں، اور اس مسئلہ میں انھوں نے ابوحنیفہ اور شافعی (رحمہما اللہ تعالیٰ) دونوں کے اقوال میں غور و خوض کرنے کے بعد امام شافعی کے قول کو چھوڑ دیا اور امام ابوحنیفہ کے قول کو صائب مان لیا۔

اہل حدیث اور سلفی مذہب والوں نے مذہب ابوحنیفہ کی تضعیف و توہین کی جو مہم شروع کر رکھی ہے وہ کوئی مفید کام نہیں ہے اُن کو چاہیے جتنی قوت وہ حنفی مذہب کی تضعیف میں صرف کرتے ہیں اگر شرک و بدعت کے رد میں اس قوت کو صرف کریں، تو اس کے خاطر خواہ اچھے نتائج برآمد ہونگے اور اس کا اجر بھی انھیں ملے گا، آخر میں اتنی بات اور عرض کردیں کہ مذاہب اربعہ کے فقہی اختلاف کو "تفریق دین" کا مصداق ٹھیرانا واقعہ کی مبالغہ آمیز اور غلط تعبیر ہے، کیا صحابۂ کرام فقہی مسائل میں بالکل متفق تھے، اُن میں اختلاف نہیں پایا جاتا؟ جو کوئی اس حقیقت کو سمجھ لے گا، وہ فقہی مذاہب کے اختلاف کو دین کا اختلاف سمجھ کر متوحش نہیں ہوگا۔

حرفِ جنوں

از:- بشیر فاروقی - ضخامت ۱۰۷ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش)
قیمت تین روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ "ماحول" بہادر شاہ مارکیٹ، کراچی

بشیر فاروقی جانے پہچانے شاعر ہیں، "مینائے غزل" کے بعد اُن کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام منظر عام پر آیا ہے، جس پر مولوی عبدالحق اور نیاز فتحپوری کی مختصر رائیں درج ہیں، پھر رئیس امروہوی کا محاکمہ ہے اور اس کے بعد بشیر فاروقی نے "حرفِ جنوں" کے نام سے خود اپنے فن کے بارے میں اور ساتھ ہی دوسرے ادبی اور شعری مسائل پر ایک مقالہ لکھا ہے!

"مینائے غزل" پر موافق و مخالف آراء کی بحث کا ایک سلسلہ چھڑ گیا تھا، اس بحث میں کچھ تیزی بلکہ تلخی بھی پیدا ہوگئی تھی۔ رئیس امروہوی نے اپنے "محاکمہ" میں اسی نزاع پر گفتگو کی ہے اور اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے وزنی دلائل پیش کئے ہیں۔

بشیر فاروقی ایک خوش فکر شاعر ہیں، اُن کے کلام میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے، اُن کی غزل اور نظم کا قریب قریب ایک ہی "آہنگ" ہے۔ جو کہیں نغمۂ چنگ ہے اور کہیں بانگِ جرس ہے، مگر "قلقل مینا" بننے نہیں پاتا۔ میں تو اُن کے فن کا اس لئے بھی قدر دان ہوں کہ تجارتی کاروبار کی مصروفیت کے باوجود وہ شعر کہنے کے لئے وقت میں گنجائش پیدا کرلیتے ہیں، اور شعر و سخن سے اور شاعروں سے محبت کرتے ہیں۔

"حرفِ جنوں" کے ان منتخب شعروں سے قارئین "فاران" کی تواضع کی جاتی ہے:۔

زمانہ ہوگیا گزرا تھا کوئی صحنِ گلشن سے — چمن کی ہر روش ہے لالہ کار و مشکبار اب تک

ماہ و انجم کے رازداں ہیں بہت — کوئی ذروں کا ہم نوا نہ ہوا

مسکراتے جو گلوں کو دیکھا　　تیرا بیساختہ پن یاد آیا

شگفتہ لالہ و گل کی خبر تو ہے معلوم　　نسیم صبح چمن لا کوئی خبر تازہ

تری رات ماہتابی، مری صبح شب گزیدہ　　تجھے عشرتیں میسر، مرا دل الم رسیدہ

تری محفل میں اجازت نہ سہی رونے کی　　مسکرانے کی اجازت بھی مگر ہے کہ نہیں

غم کے طوفان سے لبریز ہے سینہ ساقی　　ایسا جینا بھی بھلا ہے کوئی جینا ساقی

بہارِ نغمہ و نکہت کا ذکر کر فاروق　　یہ بزمِ مے ہے یہاں چشم تر کی بات نہ کر

جو نہ سوزِ عشق سے واقف تھے وہ دیکھا کئے　　جن کو جلنا تھا چراغ انجمن تک آ گئے

تذکرے تو بزم میں اپنی پریشانی کے تھے　　بڑھتے بڑھتے اُن کی زلفِ پُرشکن تک آ گئے

تجھ سے انداز لیا موجِ صبا نے اے دوست　　لالہ و گل نے اڑائی تری نازک بدنی

میں سنگ و خشت کو لعل و گہر نہیں کہتا　　یہی ہے میری خطا، اور مری خطا بھی نہیں

یا تو اپنے لئے مخصوص تھا ہر شیوۂ لُطف　　آپ کا نہ مکتوب، نہ پیغام ہے اک مدت سے

صحرا سے کیا غرض کسی گلشن پرست کو　　خلوت نشیں کو رونقِ محفل سے کام کیا

گزری ہے عمر اپنی تلاطم کی گود میں　　ہم کو سکونِ دامنِ ساحل سے کام کیا

جہاں والے بھی ہم سے سرگراں ہیں　　مزاجِ دوست ہی برہم نہیں ہے

تو ہی برگشتہ نہیں ہم سے نسیم سحری　　سایۂ گل بھی گریزاں ہے خدا خیر کرے

وہ مے نشاط ہی کیا جو نہ ہر سبو سے چھلکے　　وہ بہار جانفزا کیا جو نہ ہر چمن سے جھلکے

وہی نازِ دلبری ہے وہی شانِ دلکشی ہے　　کہیں گل نہ آ گئے ہوں ترا پیرہن بدل کے

کوئی کانٹوں کا طلب گار نہ دیکھا ہم نے　　صرف پھولوں کے گلستاں میں خریدار ملے

تغافل پر بھی اے پیماں شکن تیری ہی یاد آئی　　بھلانے پر بھی لب پر بارہا تیرا ہی نام آیا

لب وہ کیا جن کا مقدر نغمہ پیرائی نہیں　　خامشی کیا آشکارا جس سے گویائی نہیں

مری نماز، مری بندگی، مرا ایماں　　ترا خیال، تری یاد، آرزو تیری

وہ کم نصیب جو تیری طلب نہیں رکھتے　　وہ خوش نصیب جو کرتے ہیں جستجو تیری

تبسم گل و لالہ بھی خوب ہے لیکن!　　کچھ اور بات ہے ساقی کے مسکرانے میں

عجیب سادہ طبیعت ہیں آپ بھی فاروق　　لبوں پہ ذکرِ وفا اور اس زمانے میں

ہیں دامنِ غبار میں کچھ قافلے ابھی　　کچھ منزلیں چھپی ہیں ابھی گردِ راہ میں

رات کی رانی کو بخشی اس نے بوئے جانفزا　　لاجونتی کو عطا کی اس نے اک تازہ پھبن

دُوسرا رُخ :—

خامشی خود بھی شرحِ گویائی　　عشق مجبورِ التجا نہ ہوا　　(ص ۲۹)

"مجبور" کا نہیں یہاں "مرہون" کا محل تھا۔

سارے آلامِ جہاں بھول گئے — جب ترا طرزِ سخن یاد آیا
غمزہ و ناز کبھی یاد آئے — گاہ وہ عشوہ و فن یاد آیا (ص ۵۰)

دونوں شعر کمزور اور بے مزہ ہیں!

یہ بہار کا فسوں ہے کہ نوازشِ جنوں ہے — یہ کلی بھی آبدیدہ، وہ کنول بھی آبدیدہ (ص ۵۲)

کنول کے مقابلہ میں کسی پھول کا نام لانا چاہیئے۔۔۔۔ پھر "یہ" اور "وہ" نے مصرعہ میں "سکتہ" سا پیدا کر دیا۔

مجھے یاد آ رہا ہے کوئی غمزۂ گریزاں — مرے دل میں جلوہ گر ہے کوئی آہوئے رمیدہ (ص ۵۲)

"جلوہ گر" کی جگہ "خراماں" ہوتا، تو شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ (مرے دل میں ہے خراماں کوئی آہوئے رمیدہ)

اس میں شامل ہے مرے ذوقِ تمنا کا لہو — بادۂ خوں کو شرابِ ارغواں کیسے کہوں (ص ۵۳)

"ذوقِ تمنا" کا لہو کیا ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔

تری محفل میں ساقی راس آئی ہے خوشی کس کو — ترے میخوار کا باچشمِ تر جانا ہی اچھا ہے (ص ۵۲)

سپاٹ شعر۔۔۔! میخوار کا باچشمِ تر جانا آخر کس لئے اچھا ہے؟؟؟

تجھے اے داغِ دل پایا ہے جس درجہ حسیں ہم نے — گلِ رعنا کو بھی دیکھا نہ اتنا دل نشیں ہم نے (ص ۵۶)

غزل کا مطلع اور اس قدر بے مزہ!

ہم نہ ہوتے تو نئے رنگ نکھرتے کیسے — گیسوئے شاہدِ آلام سنورتے کیسے (ص ۵۹)

مطلع میں آمد اور شگفتگی کا دور دور پتا نہیں! "شاہدِ آلام" کی ترکیب نئی ہے مگر اس سے شاعر کے ذوقِ شعر پر حرف آتا ہے۔

حسن تو آج بھی ہے بزم میں جلوہ آرا — نگہِ عشق میں، وہ ذوقِ نظر ہے کہ نہیں (ص ۶۰)

"نگاہِ عشق" میں "ذوقِ نظر" کا پایا جانا "لیلۃ القدر کی رات" والی بات ہوتی

کچھ اور درد بڑھاتے ہیں چارہ ساز تو — ہزار زخم سہی چارہ گر کی بات کرو (ص ۶۴)

"درد" کی جمع اردو میں نہیں بولی جاتی۔ شعر یوں بھی پست سے پست تر ہے۔

عشق والے حلقۂ دار و رسن تک آ گئے — آگہی کے مدعی دیوانہ پن تک آ گئے (ص ۶۷)

مفہوم گنجلک اور مبہم ہے۔

دیکھے نہ گئے مجھ سے خزاں دیدہ گلستاں — دیکھی نہ گئی مجھ سے نشیمن کی تباہی (ص ۸۷)

صرف لفظوں کو جوڑ کر دیا ہے۔

دل کا ارشاد یہ ہے نالہ و فریاد بھی کر — اور صیاد کا یہ حکم کہ لب تک نہ ملے (ص ۹۳)

"ارشاد" نہیں "اصرار" کہنا تھا۔

جب سرِ شاخ کوئی غنچۂ تازہ چٹکا — ہم یہی سمجھے کہ کچھ آپ نے ارشاد کیا (ص ۹۷)

جوش ملیح آبادی کا بہت مشہور شعر ہے:

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کہ چٹکی جو کلی — میں نے جھک کر یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

"ہلالِ عید" سے شاعر خطاب کرتا ہے :۔

اے کہ تو لاتا رہا صدیوں پیامِ انبساط　　اے کہ ہستی ہے تری پیمانۂ عیش و نشاط (ص۱۱)

شعر و سخن کی بالکل نومشقی کے زمانہ میں ایسے سطحی شعر کہے جاتے ہیں ۔

تو گیا کیا چاشنی تقریر کی غائب ہوئی　　تیرے اٹھ جانے سے خود لطفِ زباں جاتا رہا (ص۱۳)

"چاشنی تقریر کی غائب ہوئی" ۔ اس ٹکڑے نے شعر کا سارا لطف غارت کر دیا ۔

حسنِ تدبیر سے تقدیر بنا دیتے ہیں!　　کشتیاں اپنی جو ساحل پہ جلا دیتے ہیں (ص۲۴)

اس شعر میں :۔

طارق کہ بر سفینۂ اندلس سفینہ سوخت

کی تلمیح نظم کی گئی ہے! مگر اس واقعہ کی ساری اہمیت جوش و بے باکی اور اعتماد علی اللہ سے وابستہ ہے کہ یا تو اندلس کو فتح کر کے رہیں گے، ورنہ اسی زمین کو اپنے لہو سے لالہ زار بنا دیں گے، وطن کو ناکام لوٹ کر نہیں جائیں گے ۔۔۔ اس صورت میں "حسنِ تدبیر" کی اس واقعہ سے نسبت ہی عجیب سی بات ہے ۔

جناب بشیر فاروق اللہ تعالیٰ کے فضل سے صاحبِ ثروت ہیں، انھیں اپنا مجموعہ ظاہری صورت کے لحاظ سے خاص اہتمام سے شائع کرانا چاہیئے تھا، مکتبہ "ماحول" نے "حرفِ جنوں" کو رواروی میں چھاپا ہے!

فاران
ماہر القادری

رکن: انجمن ادبی رسائل پاکستان

جلد: ۱۲

ماہنامہ **فاران** کراچی

شمارہ: ۱۲

ایڈیٹر: ماہر القادری

ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء

سالانہ چھ روپے

ترتیب

فی پرچہ ۵۰ پیسے

مقام اشاعت: دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی، نمبر ۱

مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

"اقامتِ دین" وہ عظیم ترین اجتماعی ذمہ داری ہے، جو ہر مسلمان کو سونپی گئی ہے، قیامت کے دن ہر صاحبِ ایمان سے پوچھا جائیگا کہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے اُس نے کیا کیا؟ اس ذمہ داری کے دائرے میں ہر مومن کی خود اپنی ذات بھی شامل ہے، یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ کے دین کو معاشرے میں قائم کرنے کے لئے اُٹھتا ہے اُسے اپنی ذات سے بھی اللہ تعالیٰ کے دین کے تقاضوں کو پُورا کرنا چاہیے۔

ہر نیکی اور ہر معروف اقامتِ دین کا ایک جزء ہے، جو کوئی مسلمان اپنے دینی بھائی کو صحیح تلفظ کے ساتھ کلمہ پڑھا کر اُس کے معنی اور مفہوم بتا دیتا ہے، تو اُس کی یہ کوشش بھی اقامتِ دین ہی کے کام آتی ہے ——— مگر "کُل" قائم کرنے کے لئے "جزء" پر قناعت نہیں کی جا سکتی اور نہ کرنی چاہیے! مکان کی تعمیر کے لئے اگر صرف زمین ہی ہموار کی جاتی رہے، تو اس کوشش میں صدیاں صرف ہو جانے کے بعد بھی مکان کی ایک دیوار بھی کھڑی نہیں ہو سکتی، اسی طرح دیواریں کھڑی کر کے، اگر چھت نہ ڈالی جائے تو دیواریں بے شک کھڑی ہو گئیں مگر مکان مکمل نہیں ہوا، مکان تیار کرنے کے لئے نقشہ بنانا، زمین ہموار کرنا، نیو کھودنا، تعمیر کے لئے ملبہ اور مسالہ فراہم کرنا، پھر نقشہ کے مطابق پوری عمارت کی تعمیر اُس کے بعد در و دیوار کی خوشنمائی کے لئے اُن پر سفیدی، گلکاری اور رنگ و روغن کہ مکان مضبوط بھی ہو اور ساتھ ہی دیدہ زیب اور خوش منظر بھی! ان میں سے ہر چیز مکان کی تعمیر میں اہمیت رکھتی ہے اور جب تک پورا مکان بن کر تیار نہ ہو جائے، اُس کے کسی ایک جزء کی تعمیر پر قناعت نہیں کرنی چاہیے ——— اور پھر مکان بن جانے کے بعد اُس کی نگہداشت اور صفائی ستھرائی کی ضرورت باقی رہتی ہے، مکان کی دیکھ بھال، مکان کی تعمیر ہی کی طرح ضروری ہے، اس سے غفلت برتی جائے گی تو مکان بے رونق اور ویران ہو جائے گا۔

مکان کی تعمیر کی مثال کا "اقامتِ دین" کی جد و جہد پر جس حد تک بھی انطباق ہو سکتا ہے، اُس کے اعتبار سے پوری ذمہ داری اور یقین و وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کلمہ پڑھانے سے لے کر صالح معاشرہ اور اسلامی حکومت کے قیام تک، اقامتِ دین کا ہر مرحلہ ضروری ہے۔ اس راہ میں مکہ کی مظلومیت بھی آتی ہے اور حبشہ و مدینہ کی ہجرت بھی! یہاں بدر و حنین کے معرکے بھی پیش آتے ہیں اور فتح مکہ کی بشارت بھی ملتی ہے، ہر قدم پر نازک مرحلے، ایمان اور عزیمت و استقامت کے جانچنے کے لئے طرح طرح کی آزمائشیں.....

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا دین پوری طرح غالب ہو جاتا ہے!

نبئ آخر سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوہ تمام انبیاء کرام کے اُسووں کا خلاصہ ہے۔ حضور ہی کے اسوۂ قدسیہ پر دین کی تکمیل اور سرکار ہی کی ذاتِ بابرکت پر نبوت کا اختتام ہو جاتا ہے، اور یہی اسوہ انسانیت کے لئے آخری معیار ہے! حضور نے اللہ تعالیٰ کے حکم و ہدایت کے مطابق جو جد و جہد فرمائی تھی، اُس کی شانِ تکمیل کا ظہور صالح معاشرہ اور اسلامی حکومت کی صورت میں ہوتا ہے! اور حکومت تدبیر و سیاست کے بغیر چل نہیں سکتی ——— اس لئے "سیاست و حکومت" نہ تو وحشت کرنے کی چیزیں ہیں، اور نہ ان پر دُنیا داری کی پھبتی چُست کی جا سکتی ہے، جو کوئی "سیاست و حکومت" کو نبوی طریقہ سے خارج سمجھتا ہے، اس نے یا تو سیرتِ نبوی کا مطالعہ نہیں کیا اور کیا ہے تو راہب اور بھکشو بن کر کیا ہے!

اس نوبت پر کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا داروں اور ہوس کے بندوں نے "سیاست" کو بہت کچھ گندہ بنا دیا ہے، بے شک آج کل کی سیاست کا یہی رنگ ہے، جھوٹ، فریب، دغا، چالبازی اور غرض پرستی موجودہ سیاست کے حواس خمسہ ہیں، مگر سیاست ہی پر کیا منحصر ہے، خدا ناشناسوں نے زندگی کے کس شعبہ کو اچھوتا اور پاک رہنے دیا ہے، آج کی تجارت کیا سیاست سے کم گندی اور ناپاک ہے

—— تو پھر ——

اس بنا پر کہ تجارت کو لوگوں نے بے ایمانی کا دھندا بنا دیا ہے اور تجارتی کاروبار میں پھنس کر، آدمی پاکباز، ایماندار اور صادق القول نہیں رہ سکتا، کیا تجارت کو چھوڑ دیا جائے گا؟ "تجارت" اپنی ذات سے تو کوئی بُری چیز نہیں ہے، جو لوگ ایماندار ہیں اور کاروباری صلاحیتیں رکھتے ہیں، اُن کا فرض ہے کہ وہ بازاروں، منڈیوں اور تجارت گاہوں میں آئیں اور ایماندارانہ تجارت کو برت کر دیانت داری اور سچائی کا بول بالا کر دیں

—— اسی طرح ——

ارباب حق و صداقت کو سیاست کی تطہیر کا فرض انجام دینا چاہیئے، اُن پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مصنوعی سیاست کے مقابلہ میں حقیقی سیاست کو پیش کریں، اس سیاست کو جسے نبوی سیاست کہتے ہیں! نبوی سیاست جب تک دُنیا میں بروئے کار نہیں آئے گی حکومتوں اور سلطنتوں کے کاروبار میں ابتری اور انتشار ہی نمایاں رہے گا —— تطہیر "منکر" کی نہیں ہو سکتی، اُس سے اجتناب و احتراز لازم ہے، مثلاً سود، قمار بازی اور خمر کی اصلاح اور تطہیر نہیں کی جا سکتی کہ یہ اپنی ذات سے نجس اور ناپاک واقع ہوئے ہیں مگر "سیاست و حکومت" کا شمار "منکر" میں نہیں ہوتا، یہ تو مباح اور جائز چیزیں ہیں اور نبوی اسوہ میں شامل ہیں، اُن میں بگاڑ پیدا کر دیا جائے، تو اس بگاڑ کو دور کرنا، اہل ایمان کا فرض ہے۔

نبوی سیاست اور اسلامی حکومت کو قائم کرنے کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں آئیں گے، یہ کام اسی زمین پر بسنے والے اربابِ عزیمت کو کرنا ہوگا، اور ظاہر ہے کہ جب یہ مہم شروع کی جائے گی تو اس منزل میں حالات کے لحاظ سے جلسے، جلوس، تقریریں، ایڈریس، پروپگنڈا، الیکشن، انٹرویو اور پریس کانفرنسیں جیسی چیزیں بھی آئیں گی، دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے جس کسی کے نفس کو ان چیزوں میں لذت ملتی ہوگی۔ اُس کا اجر اسی لذت کے بقدر آخرت میں کم کر دیا جائے گا، مگر اس راہ کے مسافروں اور اس تحریک کے کارکنوں پر جو کوئی حصول اقتدار اور سیاست بازی کی پھبتی چست کرتا ہے وہ "اقامتِ دین" کی جدوجہد پر ضرب لگاتا ہے اور اقامت دین کے بارے میں اہل ایمان کو مایوس، مذبذب اور پست حوصلہ بناتا ہے۔

اقامتِ دین کا کام بے شک خلوص و صداقت کے علاوہ تدبیر و حکمت کو بھی چاہتا ہے، صحابہ کرام نے مکہ سے حبشہ کو ہجرت فرمانے کے بعد حبشہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد نہیں فرمائی تھی مگر مکہ سے مدینہ پہنچے کے بعد شروع ہی سے اسلامی حکومت کی داغ بیل کے آثار نظر آتے ہیں، ہر خطہ اور ہر دور کے ظروف و حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اقامتِ دین کے لئے راہیں اور گنجائشیں پیدا کی جاتی ہیں! امریکہ میں اس کام کا آغاز "کلمہ پڑھانے" سے ہوگا مگر وہ ملک جہاں مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی ہے، وہاں طریق کار کی نوعیت بدلی ہوئی ہوگی، یا یوں کہیے اُس "آغاز" سے منزلوں آگے ہوگی، یہاں اسلامی تاریخ کے "مدنی دور" کو واپس لانے کی جدوجہد کی جائے گی، جہاں اہل ایمان کی اکثریت ہو، وہاں بھی اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ ہو سکے، تو اور کہاں ہوگا؟

یہ کون کہتا ہے اور کون سمجھتا ہے کہ "حکومت" مسلمانوں کا مقصود ہے یا ہونا چاہیئے، اصل مقصود تو اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول

ہے، مقصود تو نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ بھی نہیں ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں، اسی طرح "اسلامی حکومت" کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رضا اور خوشنودی مقصود ہے!

نماز پڑھتے میں وسوسے بھی آتے ہیں، مگر وسوسوں کے آنے کے سبب نماز کو چھوڑا نہیں جا سکتا، اس طرح نماز میں کسل بھی پیدا ہو جاتا ہے، نفس کی غفلت کے سبب نمازیوں کی صفیں کج اور سجدے بے ذوق بھی رہتے ہیں، کبھی کبھار نماز قضا تک ہو جاتی ہے، ان تمام غفلتوں اور کمزوریوں کے باوجود نماز ترک نہیں ہو سکتی، اس فریضہ کو ادا ہی کیا جاتا ہے، اسی طرح "اقامت دین" کی راہ میں جس میں نماز بھی شامل ہے، کوتاہیاں اور غفلتیں بھی ہو سکتی ہیں مگر یہ جدوجہد جاری ہی رہنی چاہئیے! کسی رفیق کو اس راہ کے بعض مسافروں میں کچھ کوتاہیاں نظر آئیں، یا وہ کسی اور سبب سے اس رفاقت کو نہ نباہ سکے، اور وہ ان رفیقوں سے علیحدہ ہونے کے بعد، اُن پر طنز و تنقید ہی کو اپنا شعار بنالے اور اس موقف پر جم جائے کہ جب تک دُنیا کی نگاہ میں، وہ اپنے سابق رفیقوں کو ذلیل و رسوا اور بے نقاب نہ کر لے گا اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا ——— تو اس "المیہ" کی درد ناکی کس سے بیان کی جائے کہ جن دلوں میں یہ نشتر پیوست کئے جا رہے ہیں، وہی اس اذیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔

کرفیو آرڈر کے زمانہ میں نمازی اگر مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے لئے نہ جا سکیں اور کوئی ناقد نمازیوں کے اس اضطرار اور مظلومیت کا مذاق اُڑائے اور اُن کی عزیمت پر طرح طرح کی پھبتیاں چست کرے، حالانکہ اس زمانہ میں وہ ناقد بھی گھر میں چھپ کر بیٹھ گیا ہو تو اس مزاج و طبیعت کے ناقد کی اس طنز و احتساب کو اگر بے رحمانہ اور معاندانہ کہا جائے، تو یہ کوئی زیادتی کی بات نہ ہوگی "اقامتِ دین" کی جدوجہد کو بھی اس قسم کی صورتِ حال سے سابقہ پڑ جائے تو ایسی حالت میں اس راہ کے مسافر ہمدردی کے مستحق ہو سکتے ہیں یا دل شکنی کے؟ کسی فرد یا جماعت پر کوئی وقت آن پڑتا ہے تو ایسی حالت میں شریف آدمی اپنے بڑے بڑے اختلافات کو بھول جاتے ہیں یا کم سے کم چھیڑ چھاڑ اور طنز و تشنیع سے گریز کیا جاتا ہے مگر اُن مدعیانِ زہد و تقویٰ کو کیا کہیے جنہیں کسی کی پریشانی اور مصیبت کے وقت زخموں پر نمک پاشی کرنے ہی میں لطف آتا ہو اور اس سفاکی کو یہ سمجھ لیا گیا ہو کہ اس طرح حق گوئی کا فرض ادا کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کلمہ

کوئی شک نہیں کہ اذان و تکبیر سے بھی اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو غلبہ اُس وقت حاصل ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کے کلمہ کے آگے اور تمام آوازے پست ہو جائیں! تمام قرآن اللہ تعالیٰ ہی کا کلمہ ہے، یہ کلمہ جب معاشرے اور حکومت پر نافذ اور غالب ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے دین کو سربلندی نصیب ہوتی ہے، اور یہی اقامتِ دین کی تحریک کا اصل مقصود ہے! نمازوں میں قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو مگر قرآنی احکام معاشرے میں عملاً نافذ نہ ہوں، تو اس طرح نمازیں بے شک پڑھی جا رہی ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا کلمہ غالب نہیں ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے کا "حکومت کی طاقت" نہایت ہی موثر اور کارآمد ذریعہ ہے!

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح "مذہب" نہیں ہے بلکہ "الدین" ہے اور ساتھ ہی "الدین الکامل" بھی ہے، یہ فرد سے لے کر اجتماعیت تک اور مسجد و مدرسہ سے لے کر ایوانِ حکومت تک محیط ہے، فرد میں، جماعت میں، معاشرے اور حکومت میں غرض انسانی زندگی کے جس شعبہ میں بھی اسلام نافذ نہیں ہے، وہیں فساد پایا جاتا ہے، اسی فساد کو رفع کر کے اللہ کے دین کو غالب کر دینے کا نام اقامتِ دین ہے!

کفر اور لادینی کے ماحول میں بھی جن مسلمانوں کو زندگی کے دن کاٹنے ہوتے ہیں، اُن کے ایمان میں ذرہ برابر شک نہیں کیا جا سکتا، اُن کے باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے ——— یہ کہ وہ اس ماحول میں شدید گھٹن محسوس کرتے ہوں، اُن کو اپنے

اضطرار کا احساس ہو، اور حکمت و مصلحت کے ساتھ اقامتِ دین کے جس تقاضے کو بھی پورا کرنے کی اُن میں استطاعت ہو، اُس سے غفلت نہ برتیں، ہو سکتا ہے کہ اس عالم میں ایک درازمدت انھیں بسر کرنی پڑے مگر اقامتِ دین کی لگن دل میں موجود ہو اور اس خلش نے انھیں بے چین کر رکھا ہو ——— تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس اضطراب و بے چینی کا انھیں اجر ملے گا۔

اُوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اصل مقصود "حکومت و اقتدار" نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے، حکومت و اقتدار کے ذریعہ "امر معروف اور نہی عن المنکر" کا فریضہ ادا ہوتا ہے، اس لئے "حکومت" اللہ تعالیٰ رضا کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے!

یہ طنز اور پھبتیاں

——— اگر ———

کسی ملک میں "ایلیکشن" کے ذریعہ "اسلامی حکومت" قائم ہونے کا امکان ہو، تو ایلیکشن سے کام لینا چاہیئے، ایلکشن (ELECTION) اپنی ذات سے کوئی بُرائی اور مُنکر نہیں ہے، ہاں! سیاست بازوں نے اسے بے شک گھناؤنا بنا دیا ہے، تحریکِ اقامتِ دین کے کارکن جب انتخابات کے میدان میں آئیں گے، تو ایلیکشن سے جائز حدود میں کام لیں گے، اور اُن کی دینی کوششوں کے طفیل ایلیکشن کی بھی تطہیر ہو جائے گی!

——— اب کوئی ———

"انبیائی مسلک" اور "انبیائی طریق کار" کے جاننے کا دعویدار بلکہ اجارہ دار "الیکشن" پر طنز کرتا ہے کہ الیکشن انبیائی مسلک اور انبیائی طریقہ نہیں ہے، تو وہ ایک ایسی غلط بات کہتا ہے کہ دل کا غیظ و غضب اور طبیعت کی جھنجلاہٹ دور ہونے کے بعد، جب حواس میں اعتدال پیدا ہوگا، تو اُسے اپنی کہی ہوئی بات پر خود پشیمانی ہوگی کہ میرے قلم سے یہ کیا بات نکل گئی؟

کسی کو طنز کرنے اور پھبتیاں چُست کرنے کا شوق ہو، تو اخباروں پر، رسالوں پر، کتابوں کی اشاعت پر طنز کر سکتا ہے کہ انبیاء کرام کا یہ طریقہ نہیں رہا، کسی نبی نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، اس طرح مسجدوں کی نگرانی کے لئے جو کمیٹیاں مقرر ہوتی ہیں اور عربی مدرسوں کے چلانے کا جو نظام پایا جاتا ہے، اُس پر بھی طنز کی جا سکتی ہے کہ انبیاء کرام نے نہ عبادت خانوں کی نگرانی کے لئے کمیٹیاں بنائیں نہ دفاتر قائم کئے اور نہ تعلیم و تبلیغ کے لئے مدرسوں کا نظام قائم فرمایا، انبیائی طریقہ سے علیحدہ طریقہ نکالنے کا یہ نتیجہ ہے کہ مسجدوں کی نگرانی کے لئے جو کمیٹیاں بنتی ہیں اور مدرسے قائم کرکے جس نہج پر چلائے جاتے ہیں، ان میں جھگڑے اور اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں! اسی طرح یہ قومی اور دینی جلسے، یہ پنڈال، یہ اشتہار، یہ جلسوں کے صدر اور آرگنائزر، یہ مجلس مضامین، یہ ریزولیوشن، یہ اجتماعات کے مطبوعہ نظام العمل، یہ پوسٹر، یہ ہینڈ بل، حکومت چلانے کے لئے دفتروں کا قیام، یہ وزیروں، سکریٹریوں اور انڈر سکریٹری کے عہدے، یہ حاضری کے رجسٹر، یہ رخصت حاصل کرنے کے لئے درخواستوں کا دیا جانا اور اُن کی منظوری....... نمازوں کے اوقات کے یہ چھپے ہوئے چارٹ، یہ حج کمیٹیاں ——— ان میں سے کوئی چیز بھی انبیائی طریق کار نہیں رہی، اس لئے یہ سب طریقے ناجائز اور غلط ہیں یا کم سے کم یہ کہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں!

ہر آدمی کے منہ میں زبان ہے وہ جو چاہے کہہ سکتا ہے، قلم سے ہر بات لکھی جا سکتی ہے مگر اس قسم کی طنز کرنے والوں کے بارے میں کتنی بُری رائے قائم کی جائے گی کہ یا تو وہ کسی خاص جماعت اور مخصوص افراد کو اس طنز کے پردے میں نشانۂ ملامت بنانا چاہتے ہیں یا اُن کے اندر کوئی ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے جس نے اُن کی فکر کو متوازن اور حقیقت پسند نہیں رہنے دیا۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ تہذیب و تمدن کے تنوع اور زمانہ کی مادی ترقی کے ساتھ خیر و فلاح کے حصول کے ذریعے بھی بدلتے

رہتے ہیں' یہ ذرائع دینی نقطۂ نگاہ سے اگر مباح ہیں، تو ان کا استعمال کرنا اور ان سے کام لینا انبیائی طریقہ کے مخالف نہیں ہے! انبیاء کرام نے جہاد کے لئے یا غریبوں کی امداد کے لئے اجتماعات پر ٹکٹ نہیں لگائے، مگر اس کی ممانعت بھی نہیں آئی اور ایسا کرنا دین کی کسی اصل کے خلاف نہیں ہے، اس لئے کسی اجتماع میں شامل ہونے والوں پر ٹکٹ لگایا جا سکتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ اس قسم کی مباح تحریص سے پاک ہو تو اور زیادہ پسندیدہ ہے، لیکن کسی نیک مقصد اور رفاہی کام کے لئے چندہ حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ناجائز ہو جاتا ہے، جب رقص و سرود کی محفلوں پر ٹکٹ لگا کر چندہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔

حصولِ خیر و فلاح کے لئے ذرائع کا کوئی چارٹ شریعت نے مرتب نہیں کیا، طریق کار اور ذرائع کے انتخاب کا معاملہ اہل ایمان کے اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے، ہر وہ طریقہ اور ذریعہ نیکی پھیلانے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنے کے لئے اختیار کیا جا سکتا ہے جس سے دین کی کسی اصل پر آنچ نہ آتی ہو اور دین کا ضابطۂ اخلاق جس سے متاثر نہ ہوتا ہو۔۔۔۔۔ پس "الیکشن" کے ذریعہ اگر کسی ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کا امکان ہو سکتا ہے، تو اس ذریعہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے! ہاں! وہ "اہل تقویٰ" جو حکومت و سیاست ہی کو سرے سے شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں، ان کو اقامتِ دین کی اس جدوجہد میں بے شک دنیاداری نظر آتی ہے، ان کے اس زاویۂ نگاہ کو بدلنے کی ہم اپنے میں قدرت نہیں پاتے، سوائے اس کے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ اس مزاج و فکر کے بزرگوں کو اسوۂ نبی ﷺ کے یک رُخے مطالعہ کے بجائے، انھیں اسوۂ نبوی ﷺ کے مکمل اور ہمہ جہتی مطالعہ کی توفیق عطا فرمائے۔

رضائے الٰہی اور تزکیۂ نفس

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان کی زندگی کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے سوا کوئی اور مقصد ہوتا ہی نہیں چاہیئے، یہی عقیدہ عمل میں اخلاص پیدا کرتا ہے! آج کی دنیا میں جب کہ چاروں طرف طرح طرح کے فتنے اٹھ رہے ہیں، ایمان و اسلام کی حفاظت کے لئے جو کم سے کم کوشش بھی کی جا رہی ہے وہ بھی قدر و ستائش کی مستحق ہے، اس دورِ ہوا و ہوس میں کسی کی پند و نصیحت سے کسی بے پردہ مسلم خاتون کے چہرے پر نقاب آ جاتی ہے، کسی کی صحبت میں رہ کر کوئی سینما دیکھنے سے اجتناب کرنے لگتا ہے، کسی کی تربیت کی بدولت، کوئی بے نمازی نمازی بن جاتا ہے، کسی کے کہنے سننے سے کوئی فحش لٹریچر کے مطالعے کے بجائے، پاکیزہ ادب کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے، یہ سب کوششیں اقامتِ دین ہی کے متعلقات ہیں کہ اس سے اقامتِ دین کے لئے فضا سازگار ہوتی ہے۔

تزکیۂ نفس کی ضرورت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے، یہ نعمت خواہشوں کی جتنی بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی حاصل ہو جائے، اس میں منفعت ہی منفعت ہے! تحریر و تقریر میں نیکی کی بہت سی لمبی چوڑی باتیں کہی جا سکتی ہیں مگر عملی زندگی میں نفس کیسی کیسی آنکھ مچولیاں کھیلتا اور کیسے کیسے چور دروازے پیدا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اور خاص طور سے ان سطور کے راقم کو مکروہات و منکرات سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائے، قول و عمل سے نفاق دور ہو، آخرت کی باز پرس کا عقیدہ، یقین بن کر فکر و ذہن پر چھایا رہے اور کم سے کم یہ حالت پیدا ہو جائے:-

اُس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے

ماہر القادری　　۲۳ فروری ۱۹۶۱ء

ملا واحدی

تاثرات

قرآن مجید معمولی سے معمولی بات میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ارشاد ہے: لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ "جس بات کو تم جانتے نہیں اُس پر بحثتے کیوں ہو۔"

ایسے اُمور میں گفتگو کرنا جن کی ا۔ ب۔ ت سے ہم واقف نہیں ہوتے، ہمارا معمول سا بن گیا ہے، آپ کسی کے سامنے کوئی مضمون چھیڑ کر دیکھیے۔ سننے والا ہرگز نہیں سوچے گا کہ میں اسے جانتا بھی ہوں، بلکہ فوراً بولنے لگے گا جیسے اُس مضمون کا وہ ماہر خصوصی ہے۔ انجنیر نہ ہونے کے باوجود ہر شخص انجنیری میں دخل دیتا ہے۔ طبیب نہ ہونے کے باوجود ہر شخص طبیب ہے۔ فقیہ نہ ہونے کے باوجود ہر شخص فقیہ ہے۔

قرآن مجید ہدایت فرماتا ہے کہ اندھا دھند مت بولنے لگا کرو۔ جس کام میں درک ہو اُسی میں دخل دیا کرو۔ خاموش رہنے سے ممکن ہے تمہاری نسبت اچھی رائے قائم کی جائے، اندھا دھند بولنے سے تمہیں عالم فاضل نہیں مانا جا سکتا بلکہ لوگوں کی نظروں میں تمہارا وقار گھٹ جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ میں فلاں بات نہیں جانتا اس سے بہتر ہے کہ اُلٹی سیدھی زبان چلے، نہ جاننے کا احساس خود ایک قسم کا علم ہے، بلکہ ایک قسم کا نہیں حقیقتاً علم ہے، آپ کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ فلاں بات نہیں جانتے، جاہل ہو کر عالم بننا دوسروں کے ساتھ بھی فریب کرنا ہے اور اپنے نفس کو بھی دھوکا دینا ہے ؎

آں کس کہ نہ داند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

جہل مرکب یعنی جہل + جہل۔ ایک تو جہالت، دوسرے اس کا یقین کہ جاہل نہیں ہوں۔ سب کچھ جانتا ہوں، یہ بری عادت بُری طرح ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے، اللہ چاہتا ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں۔

—— ۲ ——

قرآن مجید کی دلیلیں کس قدر جامع اور مختصر ہیں، دو لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کر دیا: رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ اللہ وہ ہے جو پیدا کرتا اور مارتا ہے۔

پیدائش اور موت سے تو واقف ہی ہو؟ اللہ وہ ہے ؎

جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

اللہ کی وحدانیت کے لئے فرمایا: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ اللہ کے علاوہ دوسرے بھی کائنات کے نظام میں دخیل ہوتے تو نظام کو درہم برہم کر ڈالتے۔ نظام قائم نہ رہتا۔ زمین اور آسمان ٹکرا جاتے۔

عیسائیوں کے دعوے الوہیت حضرت عیسیٰ کی یوں تردید کی۔ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ۔ عیسے اور مریم تو کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھانے

سے پہلے کھانے کی احتیاج اور پھر کھانا کھانے کے بعد کے نتائج۔ بھلا اللہ کے شریک کی یہ شان ہے۔

قیامت کے متعلق ارشاد کیا: ۔ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ۝ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ کہتے ہیں کہ جب ہڈیاں ہڈیاں نہیں رہیں گی، گل سڑ جائیں گی تو انھیں کون زندگی بخشے گا۔ فرما دیجیے کہ وہ جس نے اول مرتبہ زندگی بخشی تھی۔

سارا قرآن ایسی جامع اور مختصر دلیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ۔ وَلَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ ۔ کفار کوئی اعتراض آپ کے سامنے ایسا نہیں پیش کر سکتے جس کا جواب ہم آپ کو بالکل صحیح اور بہترین پیرائے میں نہ بتا دیں۔

۳

عورت میں مرد کے لئے اور مرد میں عورت کے لئے کتنی کشش ہے۔ میاں بیوی بن کر عورت مرد قریبًا بھول جاتے ہیں کہ ہمارا اپنے ماں باپ سے بھی کچھ تعلق تھا۔

لیکن میاں بیوی کی کشش عارضی ہوتی ہے۔ دور مقناطیسی کو قیام حاصل نہیں ہے۔ حالات کے ساتھ اور عمر کے ساتھ کشش گھٹتی رہتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات طلاق تک نوبت آجاتی ہے۔

اولاد میاں اور بیوی سے بھی زیادہ محبوب شے ہے۔ لیکن انسان کبھی کبھی اولاد کو عاق کر دیتا ہے اور اولاد کی صورت سے متنفر ہو جاتا ہے۔ تعلقات کی دنیا میں میاں بیوی، اولاد اور ماں باپ سے بڑھ کر کون سا رشتہ ہوگا۔ ان رشتوں کی یہ کیفیت ہے تو اور رشتے کس شمار قطار میں ہیں۔ کوئی رشتہ ایسا نہیں ہے جو ایک حال پر ٹھہر سکے اور جو ٹوٹنے نہ پائے۔

اصل محبوب درحقیقت جلب منفعت اور دفع مضرت ہے، میاں بیوی، اولاد اور ماں باپ اور دیگر اعزا و احباب سے جلب منفعت اور دفع مضرت وابستہ ہیں تو ان میں کشش ہے ورنہ کشش ختم۔ جس سے منفعت حاصل نہ ہو اور جس کے ذریعہ مضرت دور نہ ہو وہ اگر جگر کا ٹکڑا بھی ہے تو اسے دفن کر دیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد کسی محبوب کو سینے سے نہیں چمٹایا جاتا۔ اسے جلد از جلد گھر سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر انسان اسے ایسا بھولتا ہے گویا وہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

دوامی اور حقیقی نفع رساں فقط اللہ کی ذات ہے، اور مضرتوں سے بھی ہمیشہ اور حقیقتًا صرف اللہ بچاتا ہے۔ اس لئے مستقل اور حقیقی تعلق کے لائق بس وہی ہے۔

زبان سے کہیے یا نہ کہیے انسان فطرتًا اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اللہ کسی مصیبت میں بھی مبتلا کر دیتا ہے تو انسان اس کا دامن نہیں چھوڑتا جس طرح بچے ماں سے پٹتے جاتے اور ماں سے چمٹتے جاتے ہیں اسی طرح انسان اللہ کی ڈالی ہوئی مصیبت پر اللہ سے بگڑتا نہیں بلکہ اللہ کی طرف اور زیادہ متوجہ ہوتا ہے۔ اللہ سے سرکشی کرنے والے بھی مصیبت میں اللہ اللہ پکار اٹھتے ہیں۔

۴

کسی شخص سے خواہ کتنا ہی تعلق ہو اور کتنا ہی دل ملا ہوا ہو لیکن اگر دین کے معاملے میں اختلاف ہے تو وہ ہمارا اہل نہیں کہلا سکتا۔

بیٹے سے زیادہ تعلق کس سے ہوتا ہے، حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جب پانی کا عذاب آیا تو حضرت نوح نے جانوروں تک کو کشتی میں بٹھایا مگر انھیں بیٹے کے بٹھانے کی اجازت نہیں ملی۔

بیٹا ڈوبتا دکھائی دیا تو حضرت نوح پکارے: ۔ الٰہی! میرا بیٹا میرے اہل و عیال میں شامل ہے، اور تو نے میرے اہل و عیال کو بچانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ ج وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ۔ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ج اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ق فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ وہ

تمہارا متبع کب ہے جو تمہارے اہل وعیال میں سمجھا جائے۔ تمہارا بیٹا تمہارے اہل وعیال میں شامل نہیں ہے، اُس کے عمل خراب ہیں۔ مجھ سے ایسی بات کی خواہش مت کرو جس کا اونچ نیچ تم نہیں جانتے۔ اے نوح! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ناوان نہ بنو اور ناوانوں کی سی درخواست نہ کرو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی اور حضور سرورکائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا سب غیر اہل قرار دیئے گئے۔

اصل رشتہ دین کا رشتہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے مجوزہ نظام حیات سے متعلق نہیں ہے اُسے متفقین کے ساتھ شمار کیسے کیا جا سکتا ہے کھلی بات ہے کہ جو ایک معاملے میں ہمارا ہم خیال نہیں ہے اُسے اُس معاملے میں اپنا ہم خیال کیوں کر کہدیں۔ وہ خود بھی یہی کہے گا سب معاملہ میں ہم خیال ہوں مگر فلاں معاملہ میں ہم خیال نہیں ہوں۔ انکار اور اقرار کی تفریق کے وقت تو منکروں کی فہرست مُقروں کی فہرست سے الگ ہی بنے گی اہل ہونا اور بات ہے اور تعلق خاطر ہونا اور بات۔ تعلق خاطر فطری چیز ہے۔ حضرت نوح ؑ تنبیہ سے پہلے بیٹے کو بچانا چاہتے تھے۔ حضرت ابراہیم ؑ کا دل باپ کی نجات کا خواہاں تھا۔ حضرت لوط ؑ کی بیوی بہرحال حضرت لوط ؑ کی بیوی تھیں۔ اور ابوطالب کے لئے حضور سرورکائنات ؐ کی بے چینی بھی معلوم ہے۔ لیکن اللہ کا تعلق چونکہ ہر تعلق پر غالب تھا۔ جونہی پتہ لگا کہ اللہ نا اہل کے متعلق کچھ سننا پسند نہیں فرماتا تو سب نے اللہ کی پناہ مانگی اور کہا کہ آئندہ ایسی درخواست نہیں کریں گے اور حضور سرورکائنات ؐ نے تو اللہ سے اس بارے میں عرض بھی نہیں کیا۔ ابوطالب ہی سے اصرار کرتے رہے کہ عار آتی ہے تو لوگوں کے سامنے اقرار نہ کرو صرف میرے سامنے کلمہ پڑھ لو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ط وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ اے مسلمانو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کریں تو تم انھیں اپنا رفیق نہ گردانو۔ جو تم میں سے اُن کے ساتھ ایسی حالت میں رفاقت کا معاملہ رکھے گا تو سمجھ لو کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم توڑنے والے ہیں۔

— ۵ —

ایک بدوی عورت حضور سرورکائنات صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بولی کہ میرے خاوند نے مجھے ماں کہدیا ہے۔ کچھ حرج تو نہیں ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا۔ طلاق ہوگئی۔ عورت بولی۔ اُس نے طلاق کا لفظ زبان سے نہیں نکالا تھا۔ حضور ؐ نے فرمایا۔ ماں کہنا اور طلاق دینا ایک بات ہے۔ عورت بولی۔ طلاق کیسے ہوگئی۔ میں نے اُسے جنا تھوڑا ہی ہے۔ محض ماں کہنے سے ماں کیوں کر بن سکتی ہوں

حضرت لوط ؑ نے بھی بیوی کے لئے اللہ سے عرض نہیں کیا تھا اور حضرت ابراہیم ؑ کا اپنے باپ کے لئے مغفرت چاہنا اُس وعدے کی بنا پر تھا جو اُنھوں نے باپ سے کرلیا تھا لیکن پھر جب اُنھیں اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ باپ اللہ کا دشمن ہے اور یہ دُشمنی جائے گی نہیں، باپ کو کفر ہی کی حالت میں مرنا ہے تو اُنھوں نے باپ سے بالکل کنارہ کشی کرلی۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ج فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ط

نبی اور نبی پر ایمان لانے والوں کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ مشرکوں اور کافروں کے واسطے طلب مغفرت کریں خواہ وہ اُن کے کیسے ہی عزیز رشتہ دار ہوں، بالخصوص اِس بات کے واضح ہوجانے کے بعد کہ وہ بحالت کفر مرے ہیں اور دوزخی ہیں۔ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ٥

عورت کی بحث جاری تھی کہ وحی آئی: ۔ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖۗ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ اے رسول! اللہ نے اُس عورت کا بیان سُنا جو تم سے اپنے خاوند کے معاملے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ سے اپنی شومیٔ قسمت کا شکوہ کر رہی تھی۔ اللہ تم دونوں کے سوال جواب سُن رہا تھا۔ اللہ سب کچھ سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ تم میں بیویوں کو غصے سے یا کسی اور وجہ سے ماں کہدیتے ہیں تو بیویاں اُن کی مائیں نہیں بن جاتیں، مائیں تو بس وہی ہیں جنھوں نے اُن کو جنا اور پالا پوسا ہے۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ نامعقول بات کہتے ہیں اور جھوٹ بکتے ہیں اُنہیں ایسی بکواس سے احتراز کرنا چاہیے اور توبہ کرنی چاہیے۔ اللہ معاف کرنے والا اور بخش دینے والا ہے۔

اس آیت کے نزول سے قبل عرب میں یہی رواج تھا کہ اگر بیوی کو ماں کہدیا جاتا تھا تو طلاق ہو جاتی تھی۔ حضورؐ کے پاس اُس وقت تک اللہ کی طرف سے چونکہ کوئی حکم نہیں پہنچا تھا حضورؐ نے رواج کے بموجب فتوے دے دیا تھا۔ اب چونکہ حکم پہنچ گیا تو باوجودیکہ حکم حضورؐ کے فتویٰ کے خلاف اور عورت کی رائے کے مطابق تھا حضورؐ نے فوراً حکم کا اعلان کیا۔

یہ قریب قریب ویسے ہی آیت ہے جیسی عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ (تیوری چڑھائی اور رُخ پھیر لیا۔ کیوں کہ اُن کے پاس ایک اندھا آیا تھا اور وہ اُس وقت بڑی حیثیت کے لوگوں سے باتیں کرنے میں مصروف تھے) والی آیت ہے۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى میں کسی قدر تنبیہ بھی ہے۔ اس آیت میں تنبیہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس قسم کی آیات سے بھی اُسی طرح ایمان تازہ ہوتا ہے جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تطہیر والی آیت سے ہوتا ہے۔ آیت تطہیر سے حضورؐ کا مطمئن ہو جانا اور ان آیتوں سے سُبکی محسوس نہ کرنا سب حضورؐ کی صداقت کا نقش دل پر بٹھاتی ہیں۔

—— ۶ ——

قِرَاءَۃٌ کے معنی ہیں پڑھنا اور تِلَاوَۃٌ کے معنی ہیں اتباع اور عمل کرنے کے لئے پڑھنا۔ قرآن کے قاری بھی ہوتے رہیں، یعنی جو اُسے صحیح تلفظ کر کے اور خوش الحانی سے پڑھتے ہیں، لیکن قرآن مجید کے ساتھ تلاوت کا لفظ زیادہ بولا جاتا ہے۔ لوگ تلاوت کا مفہوم بھول گئے ہیں۔ تاہم تلاوت کا لفظ موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ جو کتاب الٰہی کو ایسے طریقے سے پڑھتے ہیں جس طریقے سے اُسے پڑھنا چاہیے (یعنی اُس کا اتباع اور اُس کے مُطابق عمل کرتے ہیں) کتاب الٰہی پر ایمان لانے والے یہی لوگ ہیں۔

پڑھنے کو غیر مسلم کیا قرآن مجید نہیں پڑھتے۔ غیر مسلموں نے قرآن کے ترجمے کئے ہیں اور قرآن کے متعلق بہت کچھ کام کیا ہے مگر قرآن پر عمل کرنا اور قرآن کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنا اُن کا مقصود نہیں ہے۔ قرآن کو پڑھا جائے اور سمجھا جائے اور اس نیت اور ارادے سے سمجھا جائے کہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے تلاوت اسے کہتے ہیں۔ اللہ ایسے ہی پڑھنے والوں کی بابت فرماتا ہے کہ انھوں نے پڑھنے کا حق ادا کر دیا اور اُن کا ایمان مجھے تسلیم ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے پڑھے لکھے مسلمان یا عربی زبان نہ جاننے والے مسلمان اس معیار پر کیسے پورے اُتر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے عربی زبان نہ جاننے والوں کو تو تھوڑی سی مدد ترجموں اور حاشیوں سے مدد مل سکتی ہے اور بے پڑھے لکھے مسلمانوں کی ذمہ داری انھیں پڑھا لکھا لکھنے والوں کے اوپر ہے۔ معاشرہ جن لوگوں کے قبضے میں ہے وہ اپنے بھی جواب دہ ہونگے اور ساری قوم کے بھی جواب دہ ہونگے۔ البتہ بے پڑھے لکھے مسلمانوں کی یہ نیت ضرور رہنی چاہیے کہ جتنا اسلام علم میں آتا جائے گا اُسے بغیر اتباع کے

نہیں چھوڑیں گے۔

ترجموں اور حاشیوں سے قرآن مجید کا مفہوم یونہی سا پلّے پڑا کرتا ہے، لہٰذا ترجموں اور حاشیوں کے ذریعے قرآن کو سمجھنے والوں کی نیت بھی یہی رہے کہ جتنا اسلام علم میں آئے گا اُس کی تعمیل کریں گے۔

کسی کام کی چیٹک ہو تو اللہ وہ کام آسان کر دیتا ہے۔ قرآن فہمی کی بھی چیٹک ہونی چاہیے۔ چیٹک سے اسلام خود دوڑا دوڑا دماغوں میں آجائے گا۔

حق تلاوت کا خیال کرکے قرآن کو ناظرہ پڑھنے والے کہیں قرآن پڑھنا نہ چھوڑ بیٹھیں۔ قرآن مجید سے بالکل بے تعلق ہو جانا حق تلاوت ادا نہ کرنے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ بالکل بے پڑھے لوگ جو قرآن مجید کی سطور پر روزانہ صرف اُنگلیاں پھیر لیتے ہیں میں اُنھیں بھی اچھا مسلمان سمجھتا ہوں۔ اُنھیں قرآن سے کچھ نہ کچھ تعلق تو ہے۔ وہ معذور ہیں۔ اُمید ہے اللہ اُن کی معذوری کا لحاظ رکھے گا۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا۔

———— ۷ ————

فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ ۝ پس قوم ثمود کو زلزلے نے دھر دبایا۔ "آتش فشاں پہاڑوں میں دھماکا ہوا۔ ایک چیخ، ایک گرج، ایک کڑک کی آواز گونجی" اور سب کے سب اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ اور "بستیاں خاک کا ڈھیر بن گئیں"۔

معلوم ہے، یہ عذاب کیوں آیا تھا؟ صرف پانی کے معاملے میں بے انصافی برتنے کی وجہ سے۔

قوم ثمود کو ثمود کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اُن کے ہاں پانی کی قلت تھی۔ ثمود ثَمَدٌ سے مشتق ہے۔ ثَمَدٌ کے معنی ہیں۔ کسی گڑھے میں جمع شدہ تھوڑا سا پانی۔ اہل ثروت و طاقت اس تھوڑے سے پانی پر قبضہ جما بیٹھے تھے اور غریب و کمزور انسان اُن کی نظریں دیکھتے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے للکارا کہ پانی اور کھانا ہر شخص کا حق ہے۔ انبیا کا ایک کام یہ بھی تھا کہ "رزق کے سرچشموں کو مُستبد قوتوں کے ہاتھوں سے نکالیں اور عام کردیں۔ حضرت صالح عٰؑ نے فرمایا: ۔ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ۝ اللہ کی زمین میں بے انصافی اور فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

بحث مباحثے کے بعد طے پایا کہ امیر اور غریب باری باری سے پانی لیں گے۔ حضرت صالح عٰؑ نے فرمایا: اچھا، میں یہ اونٹنی چھوڑتا ہوں۔ دیکھوں تم اسے پانی پینے اور گھاس چرنے دیتے ہو یا نہیں۔ اُنھوں نے پانی پلانے اور گھاس چرانے کی بجائے اونٹنی کا خاتمہ کر دیا اور اُسے مار ڈالا جسے حضرت صالح عٰؑ نے اپنی نہیں، اللہ کی اونٹنی (نَاقَۃُ اللّٰہِ) اور "آیۃ" کہا تھا۔ ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمۡ اٰیَۃً فَذَرُوۡھَا تَاۡکُلۡ فِیۡۤ اَرۡضِ اللّٰہِ وَلَا تَمَسُّوۡھَا بِسُوۡٓءٍ فَیَاۡخُذَکُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے واسطے ایک نشانی ہے۔ لہٰذا اسے تم آزاد رکھو کہ اللہ کی زمین میں جہاں سے چاہے کھائے پیئے۔ اور تکلیف دینے کے خیال سے اس کو چھونا بھی مت۔ ورنہ دردناک عذاب تمہیں آن پکڑے گا۔

چنانچہ زلزلے کے عذاب نے اُنھیں پکڑ لیا جو سردی کا موسم نرم اور ہموار زمین پر محلوں میں گزارتے تھے اور گرمیاں پہاڑوں پر مکان تعمیر کرکے۔ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُہُوۡلِہَا قُصُوۡرًا وَّ تَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُیُوۡتًا ج عمائد ثمود سے خطاب ہے کہ ہم نے تمہیں اس طرح بسایا کہ تم نرم اور ہموار زمین پر تو جاڑوں میں رہنے کے لئے محل بناتے ہو اور گرمیوں میں رہنے کے لئے پہاڑوں کو تراش تراش کر مکان تعمیر کرتے ہو

———— ۸ ————

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ؕ کیا مسلمین اور مجرمین سے ہم یکساں سلوک کریں گے۔ یہاں مجرمین کا لفظ مسلمین کی ضد کے طور پر آیا

ہے، مسلم کی ایک ضد تو کافر ہے اور ایک یہ خاص قسم کا مجرم۔ گویا جس طرح اسلام اور کفر جمع نہیں ہو سکتے اسی طرح اسلام اور اس خاص جرم کا اجتماع نازیبا ہے۔ مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ یہ جرم کرے۔ یہ جرمِ خاص کونسا ہے۔ چھوٹے موٹے جرم تو مسلمان کرتے ہی ہیں۔ مسلمان بالکل معصوم نہیں ہیں۔

پارہ تبارک الذی کی اڑھسٹویں "سورۃ القلم" دیکھئے۔ اوپر اس جرم کے کرنے والے کا ذکر ہے۔

کوئی امیر آدمی تھا۔ جس کے پاس بڑا اچھا باغ تھا۔ جب پھل توڑنے کا موقع آتا تو وہ پھل تنہا کبھی نہیں کھاتا تھا بلکہ ایسے لوگوں کو بھی کھلاتا تھا جنھیں خود پھل میسر نہ تھے۔ اُس امیر آدمی کا انتقال ہو گیا اور بیٹے باغ کے مالک بنے تو اُنھوں نے طے کیا کہ ہم کسی کو پھل نہیں کھلائیں گے۔ صبح بہت سویرے توڑیں گے اور سارے پھل گھر لائیں گے۔ چنانچہ سب اندھیرے سے باغ پہنچے دیکھتے کیا ہیں کہ باغ اُجڑا پڑا ہے۔ پہلے تو لڑکے سمجھے کہ ہم غلط باغ میں گھس آئے ہیں مگر پھر پتہ چل گیا کہ باغ غلط نہیں ہے ہم نے نیت بگاڑ کر غلطی کی ہے۔

اس غلطی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ کیا مسلمین اور مجرمین سے ہم یکساں سلوک کریں گے۔

اپنے پھلوں کے کھانے میں دوسروں کو شریک نہ کرنا اتنا عظیم جرم ہے کہ اُس کے مرتکب کو مسلم کی ضد قرار دیا جا رہا ہے تو دوسروں کی محنت کے پھل کھانا کتنا عظیم جرم ہوگا۔ قرآن مجید کی رو سے ایسا معاشرہ جہنمی معاشرہ ہے جس میں دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش اُڑائے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ تم چاہتے ہو کہ جس طرح گڑھوں میں پانی چاروں طرف سے بہہ کر جمع ہو جاتا ہے اُس طرح تمہارے ہاں سب کی دولت بہہ آئے۔ اسلام اس ذہنیت کے سخت خلاف ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اسی ذہنیت کا پیدا کردہ ہے۔

— ۹ —

جس شخص نے پہیا ایجاد کیا تھا، وہ زیادہ قابلِ قدر ہے یا جس نے موٹر کار ایجاد کی۔ وہ زیادہ قابلِ قدر ہے۔ پہیے کا تصور مقدم ہے اور موٹر کار کا بننا موخر۔ پہیے کا تصور دماغ میں نہ آتا تو موٹر کیسے بنتی۔

یہ بات پہیے کے موجد ہی نے سوچی تھی کہ گول چیز آسانی سے لڑھکائی جا سکتی ہے، چوکور چیز کا تو سرکانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ لوگوں کو پہیے ملے تو اُنھوں نے دو پہیوں کے درمیان لکڑی جوڑ کر پہیوں کا چلنا اور آسان کر دیا۔ پھر اُس لکڑی پر تختہ جڑا تو بیل گاڑیاں چلنے لگیں۔ بیل گاڑیوں کے بعد اونٹ گاڑیاں۔ گھوڑا گاڑیاں۔ موٹر گاڑیاں اور ہوائی جہاز۔ اب آپ رفتار بڑھائے جائیے۔ بنیاد موٹر کار اور ہوائی جہاز کی پہیا ایجاد کرنے والے نے ہی رکھی تھی۔

پہیے کے موجد کی اولاد میں کوئی پہیے پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہا اور کسی نے پہیے کو ہوائی جہاز تک پہنچا دیا۔

اسی طرح علم کا آجکل جتنا چرچا ہے پہلے اتنا نہیں تھا۔ لیکن علم کی ابتدا جس نے کی، وہ زیادہ مستحقِ احترام ہے۔ اندھا ساری دنیا کا سفر کر آئے، اُسے بینا نہیں کہیں گے۔ بینا وہی کہلائے گا جو دیکھ سکنے کی قابلیت رکھتا ہے خواہ دیکھا اُس نے ایک آدھ شہر ہو علم کی ابتدا کرنے والوں کے دل کی آنکھیں وا تھیں۔ آجکل کے اہلِ علم ٹٹول ٹٹول کر علم کا راستہ طے کرتے ہیں۔

آجکل کتابوں کا ذخیرہ اتنی اہم چیز ہے کہ لندن میں جو لائبریری ہندوستان سے متعلق تھی ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان نے اُس کی تقسیم کا بھی سوال اُٹھایا تھا، مگر بھولنا نہ چاہیے کہ نینوا میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے سات سو برس قبل لائبریری موجود تھی اور اسکندریہ میں دو سو تیر اسی برس قبل، اور مسلمانوں نے تو لائبریریوں کا جال بچھا دیا تھا، اگرچہ اب مسلمان پہیے

کے موجد کی اُس اولاد کے متبع ہیں جس نے بیہیئے پر قناعت کرلی۔ مسلمان اپنی کم علمی اور بے علمی پر مطمئن ہیں۔ علم کی طرف اُنھیں توجہ نہیں ہے لیکن اُن کے بزرگوں نے بنو اُمیہ کے زمانے سے لائبریریوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو پہلی اسلامی پبلک لائبریری قائم فرمانے کا شرف حاصل ہے۔

جب تک مسلمانوں کا عروج رہا مسلمانوں میں کتابیں پڑھنے، تصنیف کرنے اور جمع کرنے کا شوق رہا۔

چھاپے خانے تو تھے نہیں، مسلمانوں نے لائبریریوں کے لئے کتابیں فراہم کرنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ ایک شخص کتاب پڑھتا جاتا تھا اور سینکڑوں خوشنویس اُسے لکھتے جاتے تھے۔ حضرت امیر خسرو اور فیضی جیسے بے شمار اہل علم اپنے اپنے وقت کی شاہی لائبریریوں کے مہتمم تھے۔

۱۰

قرآن مجید کے دعوے بھی قرآن مجید کے منِ جانبِ اللہ ہونے کا بڑا اچھا ثبوت ہیں۔ مثلاً یہی دعوے ہے کہ فقط اللہ جانتا ہے کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ عکس ریز(X-Ray) سے پتہ چلانے کی کوشش کے علاوہ ٹابک ٹوئیے بہت مارے جاتے ہیں مثلاً ہماری بے پڑھی لکھی دادیاں نانیاں، جنھیں معلوم نہیں تھا کہ قرآن نے کیا کہا ہے، عورت کی رفتار سے اندازہ لگایا کرتی تھیں دائیں پیر پر زور پڑ رہا ہے تو لڑکی اور بائیں پیر پر زور پڑ رہا ہے تو لڑکا۔ پیر بھاری ہونا اُردو زبان کا محاورہ تھا جو حاملہ عورت کے متعلق بولا جاتا تھا۔ فلاں عورت کا پیر بھاری ہے، یعنی وہ حاملہ ہے، علیٰ ہذا فلاں عورت فلاں پیر پر زور دے کر چلتی ہے۔ مگر یہ سب اندازے اور ٹابک ٹوئیے تھے۔ یقینی طور پر کوئی نہیں بتا سکا اور چودہ سو برس سے قرآن مجید کا دعوےٰ سچا ثابت ہو رہا ہے۔

کیا اللہ کے سوا کسی میں اتنی جرأت ممکن ہے کہ ایسا دعویٰ کرے۔ وہی اتنی جرات کر سکتا ہے جسے اطمینان ہو کہ میں دعوے کی لاج رکھنے کی طاقت و قدرت رکھتا ہوں۔

ہمارے ہاں کی عورتیں جس نوعیت کے ٹابک ٹوئیے لگاتی تھیں بالکل اُسی نوعیت کے ٹابک ٹوئیے متعدد فرنگی سائنسٹ لگا چکے ہیں لیکن اللہ کی بات جہاں تھی وہیں ہے۔

لڑکا یا لڑکی؟ اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ راز ہمیشہ کی مثل پوشیدہ اور محفوظ ہے۔

خردبین کی مدد سے یہ تو معلوم کر لیا گیا کہ بیضہ بارور ہو کر جب جنین کی شکل اختیار کرتا ہے تو اُس میں دونوں جنسوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، لیکن یہ متعین نہیں کیا جا سکا کہ کس قسم کا خلیہ بیضے کے ساتھ شامل ہو کر کس جنس کی نشو و نما کا سبب بنے گا۔

بعض ڈاکٹر عورت کا لعاب دہن دیکھتے ہیں۔ بعض عورت کے رحم سے سیال جزو نکال کر اُس کا امتحان کرتے ہیں۔ بعض عورت کے پیشاب پچکاری کے ذریعہ خرگوش کے جسم میں پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں، خرگوش کے غدودوں کا خون جم جائے تو لڑکی ورنہ لڑکا۔

غرض کہ پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں پیشین گوئیاں بھکاری فقیروں کی پوری ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی شان تو بلند اور ارفع ہے۔ بھیک مانگنے والے دس کو بیٹا بتاتے ہیں تو ایک دو کی گود بیٹے سے ضرور بھر جاتی ہے۔ ڈاکٹروں کی پیشین گوئیاں فقیروں کی پیشین گوئیوں سے آگے نہیں بڑھی ہیں۔

۱۱

اللہ تعالیٰ کے ننانوے صفاتی ناموں میں ایک نام اَلْمُؤْمِنُ ہے۔ اَلْمُؤْمِنُ اللہ کا نام بھی ہے اور مؤمن مسلمانوں کو بھی کہتے ہیں۔ بلکہ مسلمان دراصل وہی ہے یا پورا مسلمان وہی ہے جو مؤمن ہے۔

قرآن مجید میں ہے:۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَاِنْ

تُطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۔ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ اے رسولؐ! بدّوں کا دعویٰ ہے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ۔ آپ اُن سے فرما دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ، بلکہ یوں کہو کہ ہم مخالفت ترک کر کے مُطیع و فرماں بردار بن گئے ہیں ۔ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ۔ ایمان کے داخل ہو جانے کے بعد ایمان سے عمل جُدا نہیں رہتا ہاں اطاعت و فرمانبرداری کرو گے تو ایمان دل میں اُترتا اور جمتا جائے گا ۔ اگر تم واقعی اللہ اور اُس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق عمل کرنے لگے تو اللہ تمہارے عملوں کا اجر دینے میں کمی نہیں چھوڑے گا اللہ بڑا غفور و رحیم ہے ۔

مومن کے معنی ہیں امان دینے والا ، امن کا ضامن ۔ اللہ مومن ہے ۔ یعنی اللہ تمام کائنات کو اپنی امان میں رکھتا ہے ۔ مسلمان مومن ہیں یعنی مسلمان امن عالم کے ضامن ہیں ۔

اللہ تعالیٰ کے افعال ، چاند ۔ سورج ۔ دریا ۔ پہاڑ ۔ نباتات اور حیوانات سے جس طرح کام لیا جاتا ہے اور فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ کے اقوال ، قرآن مجید سے کام لیا جائے اور فائدہ اُٹھایا جائے تو مسلمانوں کے ادعائے امن عالم کی صداقت ظاہر ہو سکتی ہے ، ورنہ یہی حال رہے گا جو آجکل ہے کہ مسلمان اپنی تک حفاظت نہیں کر سکتے ۔ کبھی روس کی طرف دیکھتے ہیں ، کبھی امریکہ کی طرف ۔

روس و امریکہ نے دنیا کو بے چین کر رکھا ہے ، وہ دنیا کی حفاظت کیا کریں گے اور دنیا کو اطمینان قلب کیا دیں گے ۔ میں روس و امریکہ کے اقتدار سے قبل کا زمانہ دیکھ چکا ہوں ۔ اتنی بے چینی کبھی نہیں تھی جتنی آجکل ہے ۔ جس طرح ۱۹۱۹ عیسوی میں عالمگیر انفلوانزا پھیلا تھا کہ دُنیا کا کوئی گوشہ انفلوانزا کی وبا سے نہیں بچا تھا اُسی طرح آجکل عالمگیر بے چینی پھیل رہی ہے اور دنیا کا کوئی گوشہ بے چینی سے خالی نہیں ہے ، کم یا زیادہ ، بے چینی ہر جگہ ہے ۔

اللہ اِس بے چینی کو دور کرنے خود نہیں آئے گا ۔ بے چینی پھیلی بھی انسانوں کے ہاتھوں سے ہے اور بے چینی دور بھی انسانوں کے ہاتھوں سے ہوگی ۔ جو کچھ کرایا جاتا ہے انسانوں کے ہاتھوں سے کرایا جاتا ہے ۔

جنہیں اللہ کے افعالی قوانین کے ساتھ اللہ کے اقوالی قوانین کا حقیقتاً یقین ہے اُنھیں آگے بڑھنا چاہیئے ۔ اقوالی قوانین سے مراد ہیں منزل من اللہ قوانین ۔ جو انبیاء کے ذریعہ ہمیں پہنچے ہیں اور جو اب قرآن مجید میں محفوظ ہیں ۔ مومن کی تعریف فقط یہ نہیں ہے کہ اس کا اللہ کے وجود پر ایمان ہو ۔ مومن کے لئے وحی پر ایمان لانے کے ساتھ اُس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے ۔ جن کا اللہ کے وجود پر ایمان ہے مگر وحی پر ایمان نہیں ہے اللہ اُنہیں مومن تسلیم نہیں کرتا ۔ قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا .... ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ط اے رسولؐ ان منکروں سے پوچھئے ۔ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کی مِلک ہے ۔ جواب دیں گے ۔ اللہ کی مِلک ہے ۔ قُلْ مَن رَّبُّ السَّمٰوٰتِ ..... سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ط اچھا پوچھئے کہ آسمانوں کا مالک کون ہے ۔ جواب دیں گے کہ آسمان بھی اللہ کی ملکیت ہیں ۔ قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ .... سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ط پوچھئے کہ دُنیا کی چھوٹی بڑی ہر چیز کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے اور کون ہے جو فریادی کی فریاد سنتا ہے ۔ جواب دیں گے کہ سب اللہ کے قبضے میں ہیں ۔ قُلْ فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ ۝ ان سے فرمایئے کہ سب کچھ اللہ کے قبضے میں ہے تو اللہ کا کہا کیوں نہیں مانتے ۔ تم پر کیسا جادو کر دیا گیا ہے ۔ بَلْ أَتَيْنَاهُم بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ جادو وادو نہیں کیا گیا ۔ بلکہ ہم نے ایک حقیقت اور سچائی اُنھیں پہنچائی ہے اور یہ اُسے اپنی بدسرشتی کی وجہ سے سمجھنا نہیں چاہتے ۔ یہ جھوٹے ہیں ۔

محض اتنا قائل ہو جانا کافی نہیں ہے کہ اللہ کی ہستی ہے اور اللہ کائنات کا خالق ہے اور وہی اس کارخانے کو چلا رہا ہے ۔ اپنی زندگی کو ایک صفت کیا اللہ کی تمام صفات حسنٰے کا عکس انسانیت کی حد تک انسان بھر بڑھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ قوانین الٰہیہ کا پابند ہو جائے تخلقوا تخلقوا باخلاق اللہ ۔

اللہ کی راہ نمائی میں بسر کرو۔ اللہ کی راہ نمائی کیا ہے ۔ وحی ۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ ایک ایسی بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو بہت مامون اور مطمئن بستی تھی جس کے رہنے والوں کو ہر نوع کی آسائش حاصل تھی ۔ اُن لوگوں کا رزق چاروں طرف سے فراغت کے ساتھ آجاتا تھا ۔ لیکن اُن لوگوں نے بجائے اس کے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرتے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی ۔ لہٰذا اُن کے کرتوتوں کے بدلے اللہ تعالیٰ نے اُنھیں بھوک اور خوف کا مزا چکھایا ۔

۱۲

بچپن کا زمانہ دوسروں سے اپنی خدمت لیتے ہوئے گزرتا ہے ۔ چھوٹا سا اور بالکل مختصر سا انسان رو رو کر اور مچل مچل کر دوسروں کو مجبور کرتا رہتا ہے کہ اُس کی ہر خواہش اور ہر ضد پوری کی جائے ۔ نہ عقل ہوتی ہے اور نہ اندیشہ انجام ، زندگی کا مقصد کھیلنے اور کھانے کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا ۔

شباب طوفانی آندھی کی طرح آتا ہے اور اکثر و بیشتر تخریب اور بربادی کے ساتھ لاتا ہے ۔ نیم مکمل انسان اس زمانے میں انانیت اور سرکشی کا پتلا بن جاتا ہے ۔ وہ خیال کرتا ہے کہ تمام دُنیا تنہا اُس کے لئے ہے ، جائز و ناجائز کی تفریق اُسے نظر نہیں آتی ۔ دُوسروں کا دل دُکھتا ہے تو دُکھا کرے ۔ دوسروں کے جذبات پامال ہوتے ہیں تو ہوا کریں ۔ اُس کے عیش و عشرت اور لطف و مسرت میں کمی نہ پڑنی چاہیئے ۔

اس کے بعد عقل کی پختگی اور دُور بینی اور عاقبت اندیشی کا دور شروع ہوتا ہے ۔ کس قدر بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس دور کو بھی بچوں کی طرح خدمت کرا کر اور نوجوانوں کی طرح نفس پروری میں ختم کر دیں گے ۔ زندگی کے یہ چند لمحے اور عمرِ انسانی کا یہ قلیل حصہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اسے بھی فضول اور لغو حرکات میں بسر کر دیا جائے ۔ زندگی کا یہ چھوٹا سا حصہ دوسروں پر ناز کرنے کے لئے نہیں ہے ، بلکہ دُوسروں کے ناز اُٹھانے کے لئے ہے یہ تخریب کا نہیں تعمیر کا وقت ہے ، مُبارک ہیں وہ رُوحیں جو کم از کم اس فرصت کو تو اللہ کے حکم کے مطابق گزارتی ہیں ۔

—— ۱۳ ——

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ اللہ نے اہل ایمان سے اُن کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے ۔ یعنی مومن کی جان اور مومن کا مال اللہ کی ملکیت ہیں ۔ مومن خود اُن کا مالک نہیں ہے ۔

جہاں تک جان کا تعلق ہے غریب مسلمان آج بھی اُسے اللہ کی ملکیت سمجھتے ہیں ۔ اللہ اور اللہ کے رسول ؐ کے نام پر جان دینے کے لئے غریب مسلمان ہمہ وقت تیار رہتا ہے ۔ غریب مسلمان بے پڑھے لکھے ہونے کے سبب اسلام کی اور باتیں پڑھے لکھے مسلمانوں کی نسبت کم جانتے ہیں ۔ لیکن یہ ایک بات اُنہیں کسی طرح یاد رہ گئی ہے کہ جان دو گے تو جنت پاؤ گے ۔ باقی امیر مسلمان اس پوری آیت کو بھول چکے ہیں ۔ امیر اور پڑھے لکھے مسلمانوں میں ممکن ہے بہت سے ایسے نکل آئیں جنہیں اسلام کا نمونہ کہا جا سکے مگر اس آیت کا اُن پر اثر نہیں ہے ۔ اس آیت کے ساتھ امیر اور پڑھے لکھے مسلمانوں کا معاملہ ایسا ہے جیسے یہ آیت عمل کے لئے نہیں اُتری تھی ۔ یا یہ آیت گویا منسوخ ہو گئی ہے ۔ اس آیت سے زیادہ قرآن مجید کی کسی آیت سے تغافل نہیں برتا گیا ۔ یا برتا گیا ہے تو اسی نوع کی آیتوں سے برتا گیا ہے ۔ مثلاً :- وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی اور تباہی ہے جو لوگوں سے خود ناپ کر یا تول کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں[ا]

ا خریدتے وقت بیچنے والے یا چیز کے بنانے والے (کاریگر) کی مفلسی اور دوسری مجبوریوں سے اور بیچتے وقت خریدار کی ضرورت مندی سے

(بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

یا یسئلونک ماذا ینفقون - قل العفو - اے رسول آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ دین کے قیام و استحکام کے لئے کس قدر رقم پیش کریں بتا دیجئے کہ جس قدر ضروریات سے بچ جائے سب دین کے قیام و استحکام کے لئے دے دو۔[1]

امیر اور پڑھا لکھا مسلمان نہ جان کو اللہ کی ملکیت خیال کرتا ہے اور نہ مال کو۔ جان کا تو خیر سوال کیا ہے مال کے معاملے میں امیر مسلمان دنیا کی تمام قوموں کے امیروں سے پیچھے ہیں۔

جان اور مال اللہ کی ملکیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین اور اللہ کے مجوزہ نظام معیشت کے قیام و استحکام کے لئے جان و مال سے دریغ نہ کریں۔ تو دوسری قوموں کے امرا اپنے دین اور اپنے نظام معیشت کے قیام و استحکام کے لئے جتنا روپیہ خرچ کرتے ہیں مسلمان امرا اُس کا پاسنگ بھی اللہ کے دین اور اللہ کے مجوزہ نظام معیشت کے قیام و استحکام کے لئے نہیں کرتے مسلمان امرا کے دم سے صرف بھیک مانگنے والوں اور نذریں لینے والوں کی جماعتیں ضرور زندہ ہیں مگر اللہ کے دین اور اللہ کے نظام معیشت کو انھوں نے مردہ کر کے چھوڑ دیا ہے۔

(بقیہ فوٹ: صفحہ گزشتہ) اندھا دھند فائدہ اٹھانا بھی اسی قبیل کی حرکت ہے۔ مگر اب تو مصنوعی قحط پیدا کر کے من مانی قیمتیں وصول کرنا ایک فن ہے یہ فن ہمیں دوسروں نے سکھایا ہے۔ لیکن ہم اس کا استعمال دوسروں سے زیادہ آنکھیں بند کر کے اور نہایت بھونڈے پن کے ساتھ کرتے ہیں اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا قول دہرا دیتے ہیں۔ اَن نَّفعَلَ فِیٓ اَموَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط اِنَّکَ لَاَنتَ الحَلِیمُ الرَّشِیدُ ہ ہم اپنے مالوں میں اپنے حسب منشاء تصرف نہ کریں۔ جی ہاں تم ہی تو بڑے نرم دل اور نیک اطوار دنیا میں رہ گئے ہو۔

حضرت شعیبؑ کا ارشاد بھی ہمیں یاد رکھنا چاہیئے :- اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیکُم عَذَابَ یَومٍ مُّحِیطٍ - مجھے تم پر ایک ایسے دن کے عذاب کے نازل ہونے کا ڈر ہے، جو اتنا سخت ہوگا کہ اُس کا عذاب تم سب کو گھیر لے گا اور تم میں سے کوئی عذاب سے بچ نہ سکے گا۔

یہ بے چینی اور بے اطمینانی کا عذاب جو ساری دنیا کے اوپر چھایا ہوا ہے اُس دن کے عذاب کے سامنے کچھ نہیں ہے۔ ہم نے مال اور جان کو اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے تو جنت ہمیں کیوں کر ملے گی۔ مال اور جان کے عوض جنت دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

[1] خلافت بادشاہی سے نہ بدل جاتی اور بادشاہ اور حکام گلچھرّے نہ اُڑانے لگتے ہوں تو قل العفو پر یقیناً عمل ہوتا رہتا۔ امیر مسلمانوں نے بادشا اور حکام کے کرتوت دیکھے تو ہاتھ روک لیا کہ دیں تو کسے دیں اور کس کام کے لئے دیں۔ کیا اور گلچھرّے اُڑانے کے لئے دیں۔ اور پھر بعد میں مسلمان امرا کے سامنے یہ چیز ہی نہیں رہی کہ دین اور نظام معیشت کے استحکام پر اپنا سب کچھ لگا دینا بھی اسلام ہے، حالانکہ یہی وہ حکم تھا کہ اس کی تعمیل جاری رکھی جاتی تو مسلمانوں کی کوئی کل نہ بگڑتی اور مسلمان اسی طرح چھائے رہتے جس طرح ابتدائی چند سال میں چھا گئے تھے۔

شمس الحق خاں

حقیقی تصوّف کیا ہے؟

شریعت کا کامل اتباع، اخلاقِ حسنہ، نیکی و تقویٰ کو اختیار کرنا اور مشتبہات سے اجتناب!

[اس دور میں مشائخ اور پیروں کے جو حالات ہیں، وہ کسی تفصیل اور گفتگو کے محتاج نہیں ہیں آج کلب گھر ہی نہیں خانقاہیں بھی اصلاح و تطہیر کی احتیاج رکھتی ہیں، کوٹ پتلونوں کا کس زبان سے گلہ کیجیے جب کہ جبہ و دستار دین کی رسوائی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

بہ زیرِ دلق مرقع کمندہا دارند

درازدستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں

یہ حافظ شیرازی نے اب سے تقریباً چھ سو سال پہلے کہا تھا، اب تو حالات اُس دور کے مقابلہ میں بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں۔۔۔۔۔!

مولوی شمس الحق خانصاحب نے ایک طویل مقالہ "ہمارے پیر" کے عنوان سے "فاران" میں چھپنے کے لئے بھیجا ہے، جس کی تلخیص ذیل میں پیش کی جارہی ہے!] (م۔ق)

حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، جن کا سلسلہ دو واسطوں سے امام العارفین حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ ۴۲۱ھ میں سلطان سبکتگین کے زمانہ میں لاہور تشریف لائے اور مرتے دم تک وہیں اقامت گزیں رہے، مقامِ حیرت و افسوس ہے کہ جس بزرگ نے "توحید" کا درس دیا تھا، اُسی کا مزار شرک و بدعات کا گڑھ بن گیا ہے! حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور و معروف کتاب "کشف المحجوب" میں لکھتے ہیں:-

"ان الصفا صفۃ الصدیق ——— ان اردت صوفیا علی التحقیق۔

یعنی یاد رکھ صفا درحقیقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صفت ہے اگر از روئے حقیقت صوفی بننا چاہتا ہے، تو اس مفہوم کو پیش نظر رکھ، اور ان کا اتباع کر۔

شیخ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ صوفی (شیخ و مرشد) درحقیقت وہی شخص ہے، جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں صفت اپنے اندر پیدا کر چکا ہو۔ یعنی ایک تو خدا سے تعلق اس قدر مضبوط اور قوی ہو۔ کہ کسی وقت توجہ اُدھر سے نہ ہٹ سکے، دُوسرے دُنیوی مکروہات سے دل پاک ہو، اور دُنیا میں رہنے کے باوجود، دُنیا کی کسی شے کی رنگینی اور چمک دمک کی طرف دل کا میلان نہ ہو، اسی حقیقت کو حضرت شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بیان فرمایا:-

"الصوفی لا یری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ۔ یعنی صوفی کے قلب و نظر میں، دین و دُنیا کی

کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے سوا سماتی ہی نہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے قلب پر اس قدر غالب ہوتی ہے، کہ دنیا کی رنگینیوں اور دل کشیوں میں اس کے لئے کسی قسم کی جاذبیت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

اور حضرت شیخ ابوالحسن نوری قدس سرہٗ یوں فرماتے ہیں:۔

"التصوف ترک کل حظا للنفس ۔ یعنی تصوف یہ ہے کہ اپنی ہر مرغوب شے کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی پر قربان کردے"۔

اور

"التصوف حسن الخلق" ۔ اس کی شرح شیخ سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں کہ حسنِ خلق کا پہلا اور بنیادی تقاضا تو یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اخلاق درست رکھے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائے، اس کے حکم کی تعمیل کرے، اس کے بعد "حسنِ خلق" کا تقاضا یہ ہے کہ مخلوقات کے ساتھ اپنے اخلاق درست رکھے، بعد ازاں انسان اپنی ذات اور اپنے نفس کے ساتھ اپنے اخلاق درست رکھے، یعنی جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں امتیاز کئے بغیر نفس کا کہنا نہ مانے اور خواہشات نفسانی کے آگے مجبور بے بس نہ ہو، بالفاظ دیگر وہ نفس کو شریعت کے تابع رکھے، شریعت کو نفس سے مغلوب نہ ہونے دے۔

شیخ ابو علی قزوینی رحکا ارشاد ہے:۔

"التصوف اخلاق الرضیہ"

کا مطلب یہ ہے، تصوف پسندیدہ اخلاق کا نام ہے، اور پسندیدہ اخلاق و اعمال وہ ہیں جو شریعتِ اسلامیہ کے عین مطابق ہوں (کشف المحجوب)

صوفیہ متقدمین کے سرخیل حضرت شیخ عبدالقادر بن زید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے صوفی کی تعریف دریافت کی، تو آپ نے فرمایا:۔

القائلون بعقولہم فہم السنۃ والعاکفین علیہا بقلوبہم والمعتصمون بسیدہم من شرنفوسہم ہم الصوفیہ .... یعنی جو اپنی عقل کو سنّتِ رسول کے سمجھنے میں اور اس پر عمل کرنے میں صرف کرتے ہیں، اور اپنے قلوب کو اس کے احترام کے لئے متوجہ رکھتے ہیں اپنے نفسوں کی شرارتوں سے، اپنے سردار سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، وہی لوگ صوفی کہلاتے ہیں ---- (عوارف المعارف)

حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:۔

"جب ہم ایسے شخص کو دیکھیں، جو حدودِ شریعت کی تحقیر کرتا ہو، اور فرض نمازوں کو چھوڑے ہوئے ہو، تلاوتِ قرآن مجید اور نماز روزہ میں حلاوت محسوس نہیں کرتا، اور حرام و مکروہ مقامات پر آمد و رفت رکھتا ہو، تو ہم اسے رد کردیں گے، اور اسے قبول نہ کریں گے ..."

اور

"عہدِ رسالت میں مواخذہ وحی کے مطابق کیا جاتا تھا، اب وحی کا سلسلہ بند ہوچکا ہے ہم تم سے مواخذہ تمہارے اعمال کی بنا پر کریں گے، پس جس کے اعمال خیر ہم پر ظاہر

ہونگے، ہم اسے قبول کریں گے، اور اسے مقرب سمجھیں گے، ہمیں اس کے باطن سے کوئی غرض نہیں اس کے باطن سے محاسبہ کا تعلق، حق تعالیٰ سے ہے، اور جس شخص کے اعمال اس کے علاوہ (یعنی غیر صالح و مذموم) ہونگے، تو ہم اسے قبول نہیں کریں گے، چاہے وہ یہی کہتا رہے کہ میرا باطن پاک ہے"۔

حضرت شیخ المشائخ امام الطائفہ جُنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک بار معرفتِ الٰہی پر گفتگو کر رہے تھے، ایک شخص نے پوچھا کہ اہلِ معرفت (صوفی) کیا اعمالِ صالحہ کے ترک کے مقام تک پہنچ جاتا ہے، اس سوال پر حضرت جُنید بہت زیادہ برہم اور غضبناک ہوئے اور آپ نے جو کچھ فرمایا، اُس کا خلاصہ اور شرح یہ ہے:—

"یہ قول اس گروہ کا ہے جو ترکِ اعمال کا قائل ہے، یہ میرے نزدیک بڑی بیباکی کی بات ہے، چور اور زانی میرے نزدیک بہتر حال والا ہے، اس سے جو اس کا قائل ہے، اگر میں ہزار سال زندہ رہوں، تو بھی اعمالِ خیر سے ایک ذرہ کم نہ کروں، سوائے اس کے کہ کوئی چیز حائل بن جائے"۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:—

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی، حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کیا تجھے معلوم ہے، اللہ تعالیٰ نے تیرے ہم عصروں میں تجھے یہ بلند مرتبہ کیوں عطا فرمایا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! نہیں، اس پر آپ نے فرمایا کہ میری سُنّت کے اتباع اور صالحین کی خدمت اور اپنے عزیزوں کو (دین کے بارے میں) نصیحت کرنے اور میرے اصحاب و اہل بیت سے محبت رکھنے کی وجہ سے، اللہ تعالیٰ نے تجھے ابرار کے مراتب پر پہنچایا..."

شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کشف المحجوب میں فرماتے ہیں:—

"لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان تصوف کی وجد آفریں کیفیات میں محو ہو کر شریعت کے احکام و فرائض سے غافل و بے گانہ ہو جاتے، جیسے کہ کتنے مست فقیر یہ حالت اختیار کئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یاد رہے کہ احکامِ شرعی کی پیروی اور فرائض کی بجا آوری، کسی بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ اور حاملِ تصوف ہستی کے لئے کسی حالت میں معاف نہیں ہو سکتی......"

امام ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں:—

"......جو حقیقت (تصوف) قیدِ شریعت سے آزاد ہے، وہ بیکار ہے اور لاحاصل ہے"

اور

وبناء ھذا الامر وملاکہ علیٰ حفظ آداب الشریعۃ وصون الیدعن المدالی الحرام والشبہ وحفظ الحواس عن المحظورات وعد الانفاس مع اللہ تعالیٰ عن الغفلات۔

"یعنی تصوف کی بنیاد آدابِ شریعت کی حفاظت، حرام و مشتبہات سے اجتناب، اپنے حواس کی ممنوعات سے حفاظت اور غفلتوں سے بچ کر، خدا کی یاد میں تمام وقت گزارنے پر ہے..."

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز و رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، اپنے صاحبزادے کو وصیت فرماتے ہیں:۔

"اوصیک بتقوی اللہ فطاعۃ لزوم ظاہر الشرع ـــــ میں تجھے وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ظاہری شریعت کی پابندی کرنے میں ہے ....:

ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ہر مومن کے لئے ہر حالت میں یہ تین چیزیں ضروری ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کے اوامر کی تعمیل، دوسرے ممنوعات سے پرہیز، تیسرے تقدیر پر راضی ہونا، پس مومن کے لئے کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ وہ کسی حالت میں ان تین چیزوں سے خالی نہ ہو۔

(فتوح الغیب، مقالہ دوم ۔ اردو ترجمہ)

فتوح الغیب مقالہ دوم میں حضرت شیخ جیلانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

اتبعوا ولا تبتدعوا واطیعوا ولا تمرقوا ووحدوا ولا تشرکوا و بفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید نزھوا الحق ولا تتھموا ولا تشکوا واصبروا ولا تجزعوا واجتمعوا علی الطاعۃ ولا تتفرقوا

"یعنی سُنّت کی اتباع کرتے رہو، اور بدعات میں مبتلا مت ہو، اطاعت کرو اور دائرہ اطاعت سے خارج مت ہو۔ توحید خداوندی پر قائم رہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو، خدا جو چاہتا ہے، اپنے ارادہ اور مشیت سے کرتا ہے، حق تعالیٰ کو ہر نقص سے پاک جانو، اور اس پر تہمت مت لگاؤ، اُس کی تصدیق کرو، اور شک میں مت پڑو، صبر سے کام لو، اور بے صبری میں مبتلا نہ ہو، خدا کی اطاعت پر متفق ہو جاؤ؛ اور تفرقہ مت پیدا کرو۔

حقیقت ہو یا طریقت یہ سب "دین" کے تابع ہیں، اگر کوئی شخص ساری عمر ہوا پر اُڑتا رہے، مگر اُس کی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے مطابق نہ ہو، تو اُس کی یہ "کرامت" اللہ اور رسول کے نزدیک، گھاس کے تنکے کی برابر بھی وزن نہیں رکھتی! شرافت و کرامت اور بزرگی کا دارومدار شریعت کے اتباع پر ہے، شرک و بدعت کی ادنیٰ مشابہت سے بھی مردِ مومن کو دور رہنا چاہیئے۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
که هرگز به منزل نخواهد رسید

ـــــ اور ـــــ

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

اللہ تعالیٰ ہم سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے اور حضورؐ کی اطاعت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرماتے! (آمین)

اسعد گیلانی (بی اے)

آدم خور

حرام خوری ایک مکروہ حرکت ہے۔ لیکن آدم خوری تو ابن آدم کے لئے اسفل ترین درجہ ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں آدم خوروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ ہر کہیں آدم خوری پائی جاتی ہے۔ اور لوگ اس قبیح عادت میں اس طرح مبتلا ہو گئے ہیں۔ جیسے وبائے عام کے دنوں میں کھانسی نزلہ اور ملیریا پھیل جاتا ہے۔ کوئی مجلس آدم خوروں سے خالی نہیں ہوتی۔ اور جہاں کہیں دو چار آدمی جمع ہونگے ان میں کوئی نہ کوئی آدم خور ضرور پایا جائے گا۔ یہ وبا ایسی عام ہوئی ہے کہ بستیاں بھیڑیوں اور درندوں کے بھٹ بن کر رہ گئی ہیں۔ یہی وہ آدم خوری ہے جسے قرآن نے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ الرَّحِيمٌ۔

بھلا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اللہ سے ڈرو وہ رجوع فرمانیوالا اور رحیم ہے

دُنیا کی دیگر قوموں کے لئے اجتماعیت قائم کرنے کے لئے بہت سی بنیادیں ہیں۔ کہیں قومیت کی بنیاد نسل ہے۔ کہیں وطن ہے۔ کہیں زبان اور رنگ ہے۔ غرض کئی قسم کے محسوس اور مادی اشتراک سے قومیں وجود میں آجاتی ہیں لیکن مسلم قوم جو معاشرہ وجود میں لاتی ہے۔ اس کے پاس ان میں سے کوئی ایک وجہ بھی تو قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتی اور اگر کہیں کی کوئی مسلم آبادی ان وجوہ میں سے کسی ایک کو قومیت کی بنیاد بنانا بھی چاہے تو بالآخر وہ ملت کے بین الاقوامی وجود سے کٹ جاتی ہے۔ مسلم ملت کے بنیادی عوامل توحید و رسالت کا اقرار اور اسلام کے معروفات اور منکرات کا اہتمام ہے۔ انہیں عوامل سے ایک مخصوص تہذیب۔ ایک مخصوص سانچہ۔ اور ایک مخصوص طرز کا انسان وجود میں آتا ہے۔ جسے مسلمان کہا جاتا ہے۔

یہ معاشرہ اپنے مزاج کے لحاظ سے خالص نظریاتی بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ نظریات کا تعلق ہمیشہ انسان کے تصورات اور کردار سے ہوتا ہے۔ جغرافیائی لسانی یا نسلی عوامل سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک مسلم معاشرے کی اجتماعیت جو نظریات اور جذبات پر قائم ہوتی ہے۔ جہاں ایک طرف انتہائی مضبوط ہے کہ زبان و مکان کی حد بندیاں اس کے لئے روک نہیں بن سکتیں۔ وہاں انتہائی نازک ہے کہ ظاہری محسوس عصبیتوں میں سے کوئی بھی عصبیت اس کا سہارا نہیں بن سکتی۔ جہاں خدا اور رسولؐ سے گہری محبت اور کائنات سے متعلق ایک خاص نظریہ مختلف نسل اور رنگ اور ملک کے دو انسانوں کو باہمی گہری محبت میں جوڑ دیتا ہے۔ وہیں ان امور کا اختلاف دونوں کو اس طرح کاٹ بھی سکتا ہے۔ کہ ان کی شناسائی بھی محل نظر ہو جائے۔ اشتراک نظریات وجذبات سے یہ معاشرہ وجود میں آتا ہے اور اختلاف نظریات وجذبات سے اس کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی اجتماعی ہیئت کو منتشر اور مجروح کرنیوالی تمام چیزوں کی اسلام نے شدید مذمت کی ہے۔ جھوٹ بُرا ہے کہ وہ اجتماعی ہیئت کے اندر بے اعتمادی کے جراثیم پرورش کرتا ہے۔ وعدہ خلافی اجتماعی زندگی کا اعتبار کھو دیتی ہے۔ خیانت اور بددیانتی اجتماعی جھگڑے فساد پیدا کرتی ہیں۔ غداری اور دغابازی سے معاشرے پر سخت ابتلا وارد ہو سکتی ہے۔ بہتان سے دل پھٹ جاتے اور افراد ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں۔ چغلخوری سے سینوں میں کدورتیں

بھر جاتی ہیں۔ جن کو رفع کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ غیبت اور بدگوئی سے نفرت کا زہر فرد فرد میں سرایت کر جاتا ہے۔ دو رُخے پن سے مسلمان کا مسلمان پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ بدگمانی سے دلوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ خوشامد سے انسان ذلیل و پست ہو جاتا ہے۔ بخل سے طبیعت میں کمینہ پن آجاتا ہے۔ فخر و غرور سے انسان ہمدردیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ غرض وہ سب باتیں جو انسانی نفسیات کو پراگندہ کر کے اجتماعیت کو بگاڑنے والی ہیں۔ ان سب پر اسلام نے "رذائل اخلاق" اور منکرات کا لیبل لگا کر انہیں اسلامی معاشرے میں پرورش پانے سے روک دیا ہے اور جو کوئی ان میں سے کسی بھی اجتماعیت کش بیماری کو پرورش کرتا ہوا نظر آئے اس کو سختی سے نگاہ رکھنے اور باز پرس کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور معاشرے کا اجتماعی مزاج اس سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ ایسے مکروہات کی مزاحمت کرے اور جو کوئی اس میں مبتلا ہو جائے اس کی ہمت شکنی بھی کرے اور اسے معاشرے میں نکو بنا کر رکھے۔

اخلاق کی ان بھیانک بیماریوں میں جن میں سے ہر ایک اجتماعیت پر سخت وار کرنیوالی اور مسلمان کو مسلمان سے توڑنے والی ہے، بدترین بیماری غیبت، نجوی، اور بدگوئی ہے۔ یعنی کسی کو اس کی پیٹھ پیچھے برا کہنا۔ اسی مکروہ عادت کو قرآن نے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کسی اجتماعیت کو جس قدر نقصان اس سے پہنچتا ہے اتنا نقصان کالا ناگ بھی نہیں پہنچا سکتا اس کا سب سے پہلا اثر ہوتا ہے کہ یہ بیماری متعدی ہو جاتی ہے۔ ایک سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو لگتی ہے، ہر ایک کبھی ہمدردی۔ کبھی افسوس کبھی تعجب۔ کبھی غصے اور کبھی اصلاح کی نیتِ خیر سے گندگی کی اس پوٹ کو چپکے چپکے معاشرے کے دوسرے افراد کے درمیان لڑھکاتا چلا جاتا ہے۔ شخص متعلقہ جو زیر بحث ہوتا ہے، ممکن ہے کہ اس آفت سے کافی عرصے تک واقف نہ ہو کہ اس کے گوشت کو یار لوگ مزے لے لے کر چپکے چپکے تناول فرما رہے ہیں۔ بالعموم وہ آخری شخص ہوتا ہے جسے اطلاع ملتی ہے کہ اس میں فلاں خرابی ہے۔ جو مجالس میں زیر بحث ہے۔ لیکن وہ خود اس کی طرف سے بے خبر ہے۔ جب اسے خبر ہوتی ہے تو جس ذات شریف نے اس کے بارے میں گندگی کی پوٹ لڑھکائی تھی۔ وہ کتنوں کے ہی دامنوں کو آلودہ اور دلوں کو کبیدہ کر چکی ہوتی ہے اور اس کے بس سے یہ بالکل ہی باہر ہوتا ہے کہ وہ نامعلوم افراد کے دلوں کے نامعلوم کانٹے چنتا پھرے۔ اور اگر چنے تو اس کی کوشش کو مخلصانہ سمجھا جائے گا یا مشتبہ یہ خود اس پر واضح نہیں ہوتا۔ چنانچہ کانٹے بکھرتے رہتے ہیں اور دلوں میں چبھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ معاشرے کے اندر اس شخص کا حلقۂ تعارف اس کے لئے بھڑوں کا چھتہ بن جاتا ہے۔ اور ہر راستہ کانٹوں سے پُر۔ اس کی مدد کرے تو کون کرے۔ اگر شبہات کا شیطان مددگار پر بھی حملہ کر دے تو پھر کیا ہو۔ یہ خدشات قائم رہتے ہیں، اور شخص متعلقہ شک و شبہ کے پتھروں سے سنگسار ہوتا رہتا ہے۔ اس اجتماعی نفسیاتی بیماری کا علاج کسی کے بس میں نہیں ہوتا اور جس ظالم نے اپنے بھائی کا گوشت معاشرے میں تقسیم کیا ہوتا ہے اگر اس کا چہرہ تانبے کے ناخنوں سے بھی نوچا جائے اور اس کی انتڑیاں تانبے کے سلاخوں سے بھی نکال نکال کر پھینک دی جائیں۔ اور یہ عمل برسوں تک ہو تو بھی یہ انفرادی سزا اس اجتماعی کوفت اور تکلیف کا مداوا نہیں بن سکتی جو مجرم کی زبان کے چند غیر محتاط اور زہریلے الفاظ نے کسی کو پہنچائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے اس قبیح حرکت کو زنا سے بدتر قرار دیا ہے۔

حضرت ابی بن سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

"غیبت زنا سے بدتر ہے"۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ زنا سے زیادہ بری کیوں کر ہو سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا آدمی زنا کرتا ہے۔ پھر توبہ کرتا ہے۔ اور خداوند تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ اور ایک روائت میں ہے کہ پھر زانی توبہ کرتا ہے اور اللہ اس کو بخش دیتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کو خدا نہیں بخشتا۔ جب تک کہ وہ اس شخص کو معاف نہ کر دے

جس کی اس نے غیبت کی ہے۔ حضرت انس رضؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ زانی توبہ کرتا ہے۔ لیکن غیبت کرنے والے کے لئے توبہ نہیں ہے۔" (بیہقی)

جو شخص کسی کی غیبت کرتا ہے۔ حقیقت میں وہ اس کی عزت اور آبرو کو اس کی غیر موجودگی میں معاشرے میں جگہ جگہ نوچتا پھرتا ہے۔ جبکہ وہ غریب ایک مردے کی سی بے بسی سے اپنی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔ یہی اس کی عزت و آبرو کو جگہ جگہ نوچنے کا فعل ہے جس کی سزا کو تمثیلاً حضورؐ نے معراج کے موقعہ پر دیکھا۔

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

"جب مجھے معراج کرائی گئی کہ میں ایسی قوم کے پاس سے گزرا جس کے تانبے کے ناخن تھے۔ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے کہا جبریل یہ کون لوگ ہیں۔ انھوں نے جواب دیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے اور ان کی آبرو ریزی کرتے تھے۔" (ابو داؤد)

غیبت جبکہ بھی کی جاتی ہے۔ اس کی بے خبری اور غائبانے میں کی جاتی ہے۔ اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے خلاف کہی جانیوالی بات کی تردید کر سکے یا اس کی صحیح صحیح نوعیت جان سکے۔ اس لئے جو بھی اس کے بارے میں کوئی بات سنتا ہے اگر ناپختہ مزاج ہوگا تو اس کے دل میں بھی کچھ نہ کچھ کدورت اور غبار اس کی طرف سے پیدا ہوگا۔ ایسے کم لوگ بلکہ شاذ لوگ پائے جاتے ہیں۔ جو مخاطب کی بات سن کر اس پر گرفت کریں۔ اس سے ثبوت طلب کریں یا اسے پکڑ کر اس کے پاس رُو در رُو لے جائیں جبکی غیبت کی جا رہی ہوتی ہے۔ حالانکہ معاشرے کے افراد میں یہی شے مطلوب ہے۔ جو معاشرے کو غیبت کی زہریلی بیماری سے بچا سکتی ہے چنانچہ یہ کدورت آگے چل کر غیر محسوس طور پر انقباض۔ کراہت اور بالآخر نفرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور غیبت کرنیوالے نے جو شبہ کا بیج بویا تھا۔ وہ نفرت کا درخت بن کر اگتا اور تعلقات کی سخت کشیدگی کے برگ و بار لاتا ہے۔ سینے کدورتوں سے بھر جاتے اور دل خلوص و محبت سے خالی اور مہر و وفا سے خالی ہو کر بجھ جاتے ہیں۔ اور کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی عالم الغیب نہیں ہوتا کہ معاملے کی صحیح صورت کو جان سکے۔ اسی لئے حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا۔

"میرے اصحاب میں سے کوئی کسی کے بارے میں مجھے کوئی بات نہ پہنچائے اس لئے کہ میں چاہتا ہوں کہ میری ملاقات تم لوگوں سے اس حال میں ہو کہ میرا سینہ ہر ایک سے صاف ہو۔" (ترمذی)

زبان کی حفاظت ایک بڑا مشکل امر ہے اور انسان جس کسی سے بھی کسی بنا پر کبیدہ خاطر ہوتا ہے تو اس کے بارے میں اس کی زبان کا محفوظ رہنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت سہل رضؓ بن سعد کہتے ہیں۔ کہ حضورؐ نے فرمایا ہے۔

"جو شخص مجھ سے اس کا عہد کرے کہ وہ اپنے دونوں کلوں کے درمیان چیز (زبان) اور اپنے دونوں پاؤں کے درمیان (شرمگاہ) کی حفاظت کرے گا اور لوگوں کو برا نہ کہے گا۔ نہ کسی کی برائی اور غیبت کرے گا اور بدکاری اور زنا سے بچے گا تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کر لوں گا۔" (بخاری)

چنانچہ اس کی حفاظت کے لئے حضور اکرمؐ نے ایک نفسیاتی تدبیر حضرت ابوذر رضؓ کو بتائی۔ جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:۔

"جب کسی کی غیبت گیری کا خیال تیرے دل میں پیدا ہو تو اس کے اظہار سے تجھکو تیرا یہ خیال روک دے کہ مجھ میں بھی کچھ عیب ہیں۔" (بیہقی)

ایک دوسرے موقعہ پر جیسی بات سنی ویسی ہی آگے چلا دینے کی عادت کو رد کرنے کے لئے حضورؐ نے فرمایا:۔

"انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے بلا تحقیق آگے بیان کر دے۔" (مشکوٰۃ)

اور یہ کہ

"قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بہت برے لوگوں میں تم ان کو پاؤ گے۔ جو دو رُخے ہوں۔ یہاں اس کی بات کر دی۔ وہاں اس کی بات کر دی۔" (نسائی)

اور یہ کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

"میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں۔ پھر فرمایا جو چغلیاں کھاتے پھرتے اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔" (مسند احمدؒ)

یہ متعدی مرض جو چھوت کی طرح ایک سے دوسرے کو لگتا ہے اور حسن ظن کی فضا میں بعض اوقات اس لئے زیادہ پروان چڑھ جاتا ہے کہ کہنے والا درست ہی کہہ رہا ہوگا۔ اس کی تحقیق کی ضرورت کیا ہے۔ "اپنے اندر بہت سے نفسیاتی اثرات رکھتا ہے۔

اس کا ایک نفسیاتی اثر یہ ہے کہ چغلی اور غیبت کرنے والا شخص اگر سات پردوں کے اندر بھی بیٹھ کر کسی کی غیبت کرتا ہے تو کوئی... غیر محسوس انسانی جذبہ دوسرے کے دل میں اس شخص کی طرف سے ایک غبار پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ سونگھ لیتا ہے کہ اس کے بارے میں فلاں کے دل میں ضرور ہی کچھ نہ کچھ غبار پیدا ہو گیا ہے۔ یہ چیز ایسی غیر محسوس ہے۔ کہ اس کا تجزیہ یا تاویل کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن ہوتا یوں ہی ہے۔ کوئی نفسیاتی اور روحانی عوامل کام کر جاتے ہیں۔ جن کے سبب دو فریق کے درمیان کدورت کی دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ یہ دیوار پھر اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب تک کہ دو طرفہ صفائی کا کوئی عظیمت انتظام نہیں ہو جاتا۔

اس کا دوسرا نفسیاتی اثر عیب چینی اور خردہ گیری کے جذبہ کا فوری ابھر آنا ہے۔ جو شخص بھی کسی کے خلاف یہ زہر آلود کارروائی کر گزرتا ہے۔ پھر اس کی طبیعت ثانیہ سی بن جاتی ہے کہ وہ جس کا ایک بار گوشت کھایا ہے تو اس سے اپنے کام و دہن کو بار بار آلودہ کرتا ہے۔ پہلے اگر اس نے کسی ہنگامی جذبہ کے تحت ایسا کیا ہوتا ہے۔ تو پھر وہ اسے اپنا حق اور فرض اور قطعی ضرورت سمجھ کر کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے علاوہ دوسرے کے کردار پر اپنی طرف سے قطعی آنکھیں بند کر کے خوردبین لگا دیتا ہے۔ اور اس کی ایک ایک کوتاہی موہوم یا معلوم کو تلاش کر کے اس کو بڑا بنا تا رنگ آمیزی کرتا اور تشہیر کرتا ہے۔ پھر وہ بے دلیل دوسرے کی تذلیل اور آبروریزی کو اپنا فطری حق سمجھنے لگتا ہے۔

اس کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ بدگوئی اور غیبت کرنے والا سخت قسم کی اخلاقی بزدلی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی بجائے کہ بات کو کھل کر صاف صاف اس کے سامنے کہے ادھر اُدھر کہتا ہے اور اس کی بجائے کہ فریق معاملہ کو دلائل سے اپنے موقوف پر مطمئن کرے وہ معاشرے کے دوسرے افراد کو جو غیر متعلق ہوتے ہیں۔ اپنے موقوف پر مطمئن کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس حرکت سے بعض کے درمیان وہ خود بے وزن ہو جاتا ہے اور بعض کو وقتی طور پر اپنا موافق بنا لیتا ہے۔ لیکن اسے ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ فریق معاملہ کہیں اس سے مل کر اپنی پوزیشن صاف نہ کر دے۔ یعنی اب اس سے معاملے کی صفائی مطلوب نہیں ہوتی بلکہ کسی کی آبروریزی اور معاملے کی گندگی اور تعلقات کی پراگندگی مطلوب ہوتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں یہ بیماری اتنی عام ہو گئی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اپنی مجالس میں بطور تفریح یہ شغل فرماتے دیکھے جاتے ہیں کہیں مجالس میں کسی غیر حاضری کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کہیں انکے نام دھرے جاتے ہیں اور کہیں انکے عیب گنائے جاتے ہیں۔ جن کا اجتماعی مفاد سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ عادت لوگوں میں پست حوصلگی و دنائت اور بازاری پن پیدا کر دیتی ہے۔ واقعہ

انکے میں ایسی عادت نے مسلمان معاشرے کو دہلا کر متزلزل کر دیا تھا ۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہایت شدید وعید آئی ہے کہ انکے درمیان نبی صلعم نہ ہوتے تو ایسی سخت بات پر عذاب نازل ہو گیا تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ بخوئی اور غیبت سے زیادہ اجتماعیت کو تباہ و برباد کرنیوالی اور کوئی چیز نہیں ہے اس سے دوست دوستوں سے رفیق رفیقوں سے کٹ جاتے ہیں ۔ اس سے برسوں تک یکجا بھائیوں کی طرح مل کر کام کرنیوالے ایک دوسرے کی خوبی کی طرف سے آنکھ بند کر کے باہمی مطعون کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ یہ عادت آدمی کے اخلاق جذبہ خدا ترسی ۔ باہمی محبت والفت کو اس طرح تراش دیتی ہے ۔ جیسے حجام کا استرا بالوں کو تراش دیتا ہے ۔ اس سے ہم نے ہمسفروں کی تیرتی ہوئی کشتیوں کو الٹتے اور ساتھیوں کی پُر رونق محفلوں کو اجڑتے دیکھا ہے ۔ یہ ایک ایسی ظالم چیز ہے ۔ جو الفت و محبت کو نفرت سے ۔ میل ملاقات کو جدائی سے ۔ حسن ظن کو سوءظن سے ۔ رفاقت کو عداوت سے ۔ اور کامیابی کو ناکامی سے بدل دیتی ہے ۔ اور ہر وہ معاشرہ جو اپنی اجتماعیت برقرار رکھنا چاہتا ہے ۔ اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس زہریلی اجتماعی بیماری کی طرف سے اس طرح چوکنا رہے ۔ جیسے چوکیدار چور کی طرف سے اور سانپ لاٹھی کی طرف سے چوکنا رہتا ہے ۔ اسی لئے حضور اکرم صلعم نے واضح طور پر اس بیماری کی طرف اشارہ کیا اور نہایت وضاحت سے بلا تشبیہ و تمثیل فرمایا کہ :۔

> "اے وہ لوگو جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے ۔ نہ مسلمانوں کی غیبت کرو ۔ نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو ۔ کیونکہ جو شخص انکے عیوب کی تلاش میں رہے گا ، خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا ۔ اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا ۔ خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کر دے گا ۔" (ابوداؤد)

صفحات ۳۲۰ ۔ مجلد قیمت :۔ پچاس پیسے

حمید اللہ صدیقی
ایم اے

مذہب اور ادب

ہمارا دور بڑی حد تک بڑھتی ہوئی خدا بیگانگی اور باہمی اجنبیت کا دور ہے اسے سمجھنے کے لئے اس کے ذہنی پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ انیسویں صدی کے وسط ۱۸۴۶ء میں کرک گارڈ Kirkgard نے کہا تھا کہ صنعتی تہذیب کی بدولت جو عمل ہمواری Levelling Process شروع ہو چکا ہے اس سے انسان کی روحانی زندگی عنقریب ختم ہو جائے گی یہ وہی بات تھی جسے ٹھیک سو سال کے بعد جارج اورول George Orwell نے اپنے ناول ۱۹۸۴ء میں کہا۔ کرک گارڈ نے اس عمل ہمواری کے مقابلے کے لئے یہ مشورہ دیا کہ انسان انفرادی طور پر اپنے اندر وہی شعور اور جرأت پیدا کرے جس کی بدولت ایک مذہبی انسان اپنے کو خدا کے آگے جواب دہ سمجھتا ہے اس حقیقت کا ادراک ہمیں دستووسکی کے ناولوں میں بھی ملتا ہے کہ انسان کی نجات صرف خدا کے سامنے اس کی ذاتی جواب دہی کے شعور میں مضمر ہے لیکن انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مادیت پرستانہ نظریات کا اتنا زور ہوا کہ اس طرح کی باتوں کو کوئی خاطر میں نہ لایا۔ ۱۸۴۸ء ہی میں مارکس اور اینجلز نے کمیونسٹ مینی فیسٹو شایع کیا اور ۱۸۵۵ء میں بچینر Buchner نے Kraft und Stoff میں سب سے پہلے فلسفہ مادیت کو پوری تشریح کے ساتھ پیش کیا ۱۸۵۹ء میں ڈارون کی کتاب Origin of Species شایع ہوئی جس کی رو سے دنیا ایک اسباب و علل کا ایک سلسلہ بن گئی اور ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو گئی۔ جس نے ارتقاء کے مدارج کا سلسلہ جہاں کہیں بھی ٹوٹا ہوا نظر آیا اسے کسی نہ کسی طرح جوڑنے کی کوشش کی۔ علماء ارضیات نے زمین کی ارتقاء کا نظریہ اس سے پہلے پیش کر دیا تھا۔ اس لئے خدا اور تخلیق کائنات جیسے غیر عقلی تصورات کو رد کرنے میں زیادہ دقت پیش نہ آئی اس طرح انیسویں صدی کے آخر تک تمام مابعد الطبیعات نظریات بڑے مزے سے لپیٹ کر رکھ دئے گئے تھے اور ہربرٹ اسپنسر جیسے فلاسفر کے لئے کائنات کا خالص میکانکی نظریہ پیش کرنے کے لئے زمین بالکل ہموار ہو چکی تھی۔

یہ سب کچھ جب ہو چکا تو پہلی جنگ عظیم ہوئی جس نے ان تصورات کو زبردست دھکا لگایا اور یورپ کو شدید روحانی افراتفری سے دوچار ہونا پڑا۔ نشاۃ الثانیہ کے بعد سے گذشتہ چار صدیوں میں انسانی ذہن پر مذہب انسانیت Humanism کی اقدار مسلط رہی ہیں۔ جنہیں انسان اپنی ضرورت اور سہولت کے اعتبار سے بدلتا رہا ہے پہلی جنگ عظیم کے قبل ہی سے اس کے بھی پیر اکھڑنے لگے تھے۔ ہیوم نے بہت پہلے ہی جب یہ سوال کیا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جمالیات میں ذوق کی یہ تبدیلی اس بات کی غماز ہے کہ انسان پرستی کی روایات ٹوٹ رہی ہیں تو اسی وقت سے انسان پرستی قدم اکھڑ چلے تھے۔ جنگ کے بعد ہمیں اس کی مزید شہادتیں ملتی ہیں جب جگہ جگہ روحانی توتوں کے سرچشمے ابلنے لگتے ہیں۔ ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کے پہلے ہی حصہ میں جس کا عنوان "شطرنج کا کھیل ہے" ہمیں یہ سوال ملتا ہے "ہم کل کیا کریں گے۔؟ ہم آخر کار کیا کریں گے؟" اس سوال کے بہت سے جوابات ہو سکتے ہیں۔ ویسٹ لینڈ بھی موجودہ مسائل کا ایک حل پیش کرتی ہے جو ایلیٹ کا کوئی

ذاتی حل نہیں۔ اگرچہ اسے اعتراف ہے کہ، یہ چند تنکے میں نے اپنی بربادی کے مقابلہ میں جمع کئے ہیں۔ These fragment
I have stored against my ruins اسی طرح روحانی افراتفری سے بچنے کے لئے مختلف فنکاروں نے اپنے الگ الگ سفینے بنائے۔ اصل میں فنکار اس نتیجہ پر پہونچا کہ وہ انسانیت یا تہذیب کا نجات دہندہ بن سکتا اس کے اندر نہ کشتی نوح بنانے کا نہ حوصلہ تھا نہ صلاحیت۔ اس بحرانی دور میں اس نے سوچا کہ اگر وہ صرف انھیں اقدار کی علمبرداری کرتا رہے جو اس کے نزدیک اہم ہے تو اس کی نجات کے لئے کافی ہوگا۔ فنکار فطرتاً روحانی اقدار کا علمبردار ہوتا ہے اور ایسے دور میں جب مادّی اقدار معاشرے پر حاوی ہو جائیں تو عام انسانیت سے اس کا ناطہ ٹوٹ جانا ناگزیر ہے۔ نتیجتہً اس کی شخصیت تقسیم ہو جاتی ہے ایک طرف اس کی وہ شخصیت ہوتی ہے جسے وہ تمام روحانی اقدار عزیز ہو جاتی ہیں اور دوسری طرف اس کا وہ بہروپ ہوتا ہے جو اسے ایک مادی سماج میں اختیار کرنا پڑتا ہے ایسی صورت میں کشمکش لازمی ہے بیسویں صدی میں ابتدا ہی سے فضا کچھ ایسی تھی کہ فنکار کا کسی بھی سماجی عمل میں اپنی پوری شخصیت کے ساتھ شریک ہونا ممکن نہ رہا۔ اب خدا ایک حرف مکرر بن گیا تھا اور اس کی جگہ مشین نے لے لی تھی۔ کمانا اور خرچ کرنا معاشرہ کی سب سے بڑی قدر تھی۔ عام انسان کی طرح فنکار کے لئے ایسے سماج سے بہتر سے بہتر تعلقات پیدا کرنا ممکن نہ تھا عام انسان خدا سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ خدا سے بیگانگی کا مطلب یہ ہے کہ وہ منزل جس کے لئے ساری انسانی جدوجہد ہوتی ہے وہ، وہ نہیں ہے جہاں انسان اپنے کو اس مابعد الطبیعات حقیقت سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے اور خود کو اس کے اخلاق کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے خدا سے بیگانگی اس لئے بھی ضروری سمجھی گئی کہ اس سے آزاد خیالی Free thinking پیدا ہوتی ہے اور مادیت پسند سائنٹفک سماج میں آزاد خیالی ضروری تھی۔ حالانکہ سنجیدہ فکر کبھی آزاد نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ ہمیشہ مفکر کی ذہنی ساخت اور وضعیت سے متاثر ہوتی ہے اس لئے آزاد خیال یا دہریہ جب خدا سے انکار کرتا ہے تو درحقیقت ایک بڑے پنجرے سے نکل کر رضاکارانہ طور پر ایک تنگ پنجرہ میں چلا آتا ہے اور اس کی ساری فکر چند سماجی اور سیاسی امور سے منسلک ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس فرد یا قوم کے لئے حقیقی آزادی ممکن ہی نہیں جو خدا بیگانہ ہو کیونکہ وہ آزادی جس کا کہ سیاستدان ذکر کرتے رہتے ہیں ایک جزوی آزادی ہے انسان کی داخلی آزادی اس سے زیادہ اہم ہے اگرچہ بیرونی آزادی کے احساس سے ہم کبھی کبھی یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری داخلی آزادی بہت محدود ہے۔ انسان کی سب سے زبردست آزادی وہ ہے جس میں وہ اپنے آپ کو خدا اور صرف خدا کے آگے جواب دہ سمجھے ورنہ پھر مختلف ازم isms اور آقاؤں کی غلامی سے نجات ممکن ہی نہیں۔ ایک ایسے دور میں جبکہ بے پناہ قوتیں انسان کو زیر کئے ہوئے ہیں۔ صرف مذہب ہی اسے ڈوبنے سے بچا سکتا ہے کیونکہ محض مذہب ہی ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو وہ اندرونی توانائی بخشتا ہے جس کی بدولت وہ ان تمام قوتوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اس طرح اگر دیکھا جائے تو عام عقیدہ کے برعکس مذہب ہی فرد کی شخصیت کی تکمیل کا وسیلہ بن سکتا ہے یہ محض شخصیت ہی کی تکمیل کی خواہش تھی جس کے لئے انفرادی آزادی اور فرد پرستی کا نعرہ بلند ہوا تھا جمہوریت تمام بنیادی حقوق کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ انسان کے لئے ایسا معاشرہ فراہم کرے جس میں ہر فرد کی شخصیت کی زیادہ سے زیادہ تکمیل ہو سکے اور یہی مقصد ریاست کا بھی ہوتا ہے لیکن مادی سماج میں جب فنکار ایک شدید روحانی بحران سے دوچار ہوا تو اس کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ ایک باضمیر انسان جو بعض مذہبی اقدار میں ایمان رکھتا ہے ایک ایسے سماج سے کس طرح نباہ کرے جس کی ساری کی ساری اقدار مادی تھیں اس کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ اولاً یہ کہ وہ اس سماج سے علیحدہ ہو جائے اور اس طرح اپنے آزاد ضمیر کا پورا پورا اظہار کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے کو دنیا کے مقدر میں شامل کرے اور اس کے بچاؤ کی کوشش کرے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں اسے اپنے فن میں بعض غیر فنی عناصر کو شامل کرنا

پڑے اور اس طرح اس کی شخصیت بحیثیت ایک فنکار کے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

بیشتر فنکاروں نے یہی رویہ اختیار کیا۔ ان میں انیسویں صدی کے علاماتی فنکار Symbolists بھی شامل ہیں۔ انھوں نے دیدہ و دانستہ طور پر اپنے کو اپنے دور کی زندگی سے الگ کر لیا۔ ان کے چاروں طرف جب مادیت کا دور دورہ ہوا تو انھوں نے مناسب یہی سمجھا کہ خود کو اس سے علیحدہ کر کے کم از کم ان اقدار کو جس میں ایمان رکھتے ہیں اپنے اندر محفوظ رکھیں۔ اس کے نتیجہ میں رمباڈ، پرنہٹ، جوائس، رکلے، ییٹس جیسے انفرادیت پسند خیال پرستوں نے جنم لیا۔ انھیں اپنے اظہار خیال کے لئے اپنی ذاتی علامات وضع کرنی پڑیں، کیونکہ مسیحیت کی مروجہ علامات ان کے اظہار مدعا کے لئے ناکافی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تخلیقات گنجلک اور مبہم بن گئیں اور ان کی اپیل محدود ہو گئی۔ درحقیقت فنکار نے اپنی اور اپنے سماج کی اقدار و نظریات میں جو تناقض محسوس کیا اس کی وجہ سے اس کی حیثیت "باہر والے" کی ہو گئی اور وہ ایسی صورت میں سماج کی نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے جب سماج اس کے نظریات کو قبول کر لے یہ بات اسے کسی طرح ممکن نظر نہ آئی اس لئے وہ صرف اپنی ذات کی فلاح و نجات تک محدود ہو کر رہ گیا یہ رویہ بظاہر فرار پسندانہ رویہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر فنکاروں کو ان کے مذہبی پس منظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاید اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہ سکتے۔ ان کی عظمت کا بہرحال یوں اعتراف کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اپنے زمانے سے صلح نہ کی اور اپنے محدود ذرائع کے باوجود وہ آورش دیتے رہے۔ جس میں ان کا ایمان تھا مسیحیت کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ افراد کا مذہب ہے اس کے پاس اجتماعی نظام حیات کا کوئی تصور نہیں ہے وہ زیادہ سے زیادہ ایک فرد کی اخلاقی زندگی سنوارنے کی کوشش کرتا ہے درحقیقت یہ زوال پذیر یہودیوں کی اخلاقی اصلاح کے لئے اس میں ہدایات تھیں۔ اس کو ان معنوں میں مذہب کہنا ہی غلط ہے جن معنوں میں ہم اسلام کو مذہب کہتے ہیں مسیحیت پسند فن کاروں کے لئے ایک بڑی دقت اس وقت پیش آتی ہے جب وہ زندگی سے متعلق بعض بنیادی مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اپنے مذہب سے اس معاملہ میں کوئی فیضان نہیں حاصل ہوتا۔ کیونکہ وہاں انہیں جو کچھ ملتا ہے وہ آج کی دنیا کے پس منظر میں انتہائی ناقابل اطمینان ہوتا ہے انسان کے ازلی گناہ اور خدا کے بیٹے کا صلیب پر چڑھ کر انسانیت کے گناہوں کا کفارہ جیسے عقائد کے بعد کائنات کے اندر کوئی مفہوم دریافت کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ داستوسکی اور کرک گارڈ کی حد تک یہ کہہ سکتا ہے کہ انسانیت کی فلاح فرد کے انفرادی احساس جوابدہی میں مضمر ہے لیکن فرد کو یہ احساس کیونکر ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام آگے بڑھ کر یہ بتاتا ہے کہ معاشرہ کی طرف سے فرد کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اور اگر اسے کوئی مشعلِ راہ مل جائے تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہ اس چراغ سے دوسرے چراغ روشن کرے ورنہ محض اپنی زندگی کی حد تک جوابدہی کافی نہیں۔ وہاں تو اس کا مقدر ملت کے مقدر سے وابستہ ہے۔ اسی لئے سارے معاشرے سے علی الرغم اس کا اپنی ذاتی فلاح کی تلاش میں خیال پرست

VISIONARY بن جانا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی خدا کی تلاش میں رہبانیت اختیار کرے جسے اسلام میں گوارا تو کر لیا جاتا ہے مگر صحت مند نہیں سمجھا جاتا۔ پھر یہاں انسان کی دنیاوی زندگی کسی گناہ کی سزا کا نتیجہ نہیں ہے، یہاں آخرت کا بہت ہی ہمہ گیر تصور ہے۔ یہاں خود خدا کا تصور بھی مسیحیت سے بڑا مختلف ہے۔

دوسری جنگ عالم کے بعد یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا ہے کہ فن کار کیا کرے؟ موجودہ ایجادات نے پوری انسانیت کا مستقبل بہت ہی تاریک کر دیا ہے۔ انسان کو آج یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کا شکار نہ ہو جائے گا۔ اب تک اس کا کوئی ثبوت ملتا نظر نہیں آتا۔ کیا انسان اتنا قد آور ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کا مقابلہ کر سکے گا؟ اس سوال کا جواب صرف مغرب کے

ذمہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کے ذمہ ہے۔ یہ بات بہر حال بلا کسی مبالغہ کے کہی جا سکتی ہے کہ ہمارا اور ایک آزمائشی دور ہے۔ یہ ایک ایسا دور ہے جس میں انسان نے جو کچھ حاصل اور مسخر کر لیا ہے۔ وہ سب اس کے مقابل پلڑے میں ہے اور اسے ثابت کرنا ہے کہ وہ ان سب میں بھاری بھرکم ہے۔

اس موقع پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تہذیبوں کا عروج و زوال ہوتا ہی رہتا ہے لیکن محض اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ ٹوئن بی صاحب فرماتے ہیں کہ "محض یہ بات کہ بیس پچیس تہذیبیں ایک ہی انداز میں عروج اور زوال سے دوچار ہوئیں اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ مستقبل کی ساری تہذیبیں اسی فارمولے سے دوچار ہوں گی یہ بات بڑی رہبانیت پسندانہ ہے اور اس سے خاصی ڈھارس بندھتی ہے۔ لیکن ٹوئن بی صاحب یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اگر بیس تہذیبوں کے ساتھ بعینہ ایک معاملہ ہوا تو اکیسویں کے ساتھ کیوں نہیں ہوگا۔ جسے وہ فارمولا کہتے ہیں وہی ممکن ہے قانون فطرت ہو۔ ماضی بہر حال اس لئے ہوتا ہے کہ اس سے عبرت حاصل کی جائے۔ یہ بھی آجکل کہا جاتا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی اہمیت اسی وقت ہوگی جب اس کے اندر اتنی جان ہو کہ بربادی کی کھائیوں میں جھانک کر پلٹ آئے اور ان تمام قوتوں کو دبائے جو اسے چھلانگ لگانے کا مشورہ دیں۔ یہ سب باتیں بہت صحیح ہیں۔ لیکن انسانی قاعدہ اور تجربہ دونوں یہی ہے کہ کھائی کے کنارہ تک بار بار جا کر لوٹ آنا ممکن نہیں رہ جاتا۔ ہو سکتا ہے، کہ جو قوتیں اسے بار بار ڈھکیل کر وہاں لے جاتی ہیں۔ وہ کبھی عین وقت پر اتنی توانا ثابت ہو جائیں کہ یہ اسے نیچے ڈھکیل دیں اور یہ کھائی کے کنارے BRINK OF WAR کی جھگڑا ہی ختم ہو جائے مقدر ہمیشہ انسان کی روحانی قوتوں کو چیلنج کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا اظہار سیاسی اور معاشی مسائل میں ہوتا ہے، ہمارے دور میں اس چیلنج کا جواب بقائے باہمی سے دیا جا رہا ہے۔ مگر یہ کوئی جواب نہیں۔ کیا انسان اپنی تباہ کن قوتوں پر قابو پا کر اسے تعمیری کاموں میں لگا سکتا ہے۔ کیا وہ موجودہ قومی، نسلی، لسانی اور رنگ وغیرہ کے اختلافات کو مٹا کر عالمگیر اخوت اختیار کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہماری دانست میں اسی اور اسی میں اس کی فلاح مضمر ہے اور یہ چیز بیسویں صدی میں لندن اور امریکہ میں کالے اور گورے کے مسئلہ پر فسادات اور افریقہ میں ریشہ دوانیوں سے نہیں حاصل ہو سکتیں۔ یہ چیزیں خوف خدا اور تصورات آخرت کے بغیر ممکن نہیں۔ خواہ یہ خوف خدا، یہ تصورات آخرت اور یہ محبت رسول ادب کے ذریعہ سے پیدا کیا جائے۔ یا فلسفہ کے ذریعہ سے!

ماہر القادری

شعرالعجم — ایک مُطالعہ

شاعری پر تنقید کرنے کے لئے کسی ناقد کا ادیب و انشاپرداز، ذہین و نکتہ رس اور صاحب مُطالعہ ہونا ہی کافی نہیں ہے یہ تمام خوبیاں تو ایک ناقد میں ہونی ہی چاہئیں، شاعری کے ناقد کی طبیعت و مزاج کو ان تمام خوبیوں کے علاوہ شعر سے خاص مناسبت ہونی ضروری ہے۔ تنقید شعری کا بہت کچھ دارو مدار ذوق و وجدان پر ہے، اگر کسی ناقد کو شعر پرکھنے کے لئے وجدانِ صحیح میسّر نہیں ہے تو وہ شعر کے خارجی عوامل پر چاہے شرح و بیان کا ایک طلسم کھڑا کر دے مگر اس کا موئے قلم شعر کی حقیقت کو نہیں چھو سکتا۔ ایسے ناقد کا حال اس سائنس داں جیسا ہے جس کی قوت شامہ بیکار ہو گئی ہو۔ مگر وہ "خوشبو" پر کتابوں کی مدد سے مضمون لکھتا چلا جائے۔

اصناف ادب میں سب سے زیادہ لطیف و نازک صنف "شاعری" ہے اس لئے اس کے ناقد کا ذوق بھی انتہائی لطیف و پاکیزہ ہونا چاہیئے! شیشوں اور آبگینوں کی کارگاہ میں ایک جوہری اور آئینہ ساز ہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ایک آہنگر کا وہاں کیا کام۔

علامہ شبلی نعمانی کو اللہ تعالیٰ نے وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائیں تھیں جو ایک ادیب، شاعر، ناقد، مورخ اور مفکر میں ہونی چاہئیں، وہ خود ایک نغز گو شاعر تھے، مگر افسوس ہے کہ ان کے دوسرے کمالات کے سامنے ان کا یہ کمال دب کر رہ گیا، خاطر خواہ اُبھر نہ سکا، یہ ٹریجڈی بعض دوسرے اہل کمال کو بھی پیش آئی ہے۔ مثلاً اسحاق موصلی کو دنیا ایک مُطرب و مغنی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ حالانکہ علم و فضل میں وہ بلند مقام رکھتا ہے۔ مانی کا نام ایران کے مشہور مصوّر "بہزاد" کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ مانی ایک مذہب کا بانی ہے اور "مانویت" ایک مستقل مکتبۂ فکر ہے۔

شبلی کا شاعرانہ ذوق بلند ہی نہیں "معیاری" تھا بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جس طرح بعض علماء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں عالم اپنی جگہ ایک "اُمت" کی برابر ہے تو شبلی بھی شاعرانہ ذوق کے اعتبار سے، اہل ذوق کی ایک پوری "امت" کے ہم پلّہ ہیں۔ جس کسی پر شبلی کے مذاق شاعرانہ کی پرچھائیں بھی پڑ جائے گی وہ سخن سنج اور سخن فہم ہو جائے گا۔ اُردو میں تنقید و انشاء پردازی اور تاریخ نگاری کا شبلی "معلم اول" ہے۔

شبلی کے نقد و نظر کا کمال اور شاعرانہ ذوق کی بہار دیکھنی ہو تو "شعرالعجم" کا مطالعہ کیجئے اور گلگشت مصلّا و آب رکناباد بن کر رہ جائیے! اس کتاب نے اُردو کی آبرو بڑھائی ہے اور اسے ترقی و بلندی عطا کی ہے! یہ واقعہ ہے کہ لاکھوں اردو جاننے والوں کو "شعرالعجم" نے فارسی زبان سے وابستہ رکھا ہے اور انکے ذوق شاعری کو سنوارا ہے! "ادبیات ایران" پر ہم نے پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر رضا زادہ شفق کی معرکہ آرا کتابیں بھی پڑھی ہیں مگر "شعرالعجم" کی بات ہی اور ہے؟

بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں ایک ہزار سال کی ایرانی شاعری کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ شبلی کی نگاہ جوہر شناس کو آفرین و مرحبا جس نے کیسے کیسے لعل و گہر کا انتخاب کیا ہے جن کی جوت سے آنکھوں کی روشنی بڑھتی ہے۔ "شعر العجم" کے مطالعے سے شعر فہمی کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کے مصنف کا اصل مقصود ہے! شعر العجم میں صرف شاعرانہ چٹخارے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ علم و ادب اور نفسیات کے نازک مسائل بھی ہیں! یہ کتاب شاعرانہ خطوط پر دل و دماغ کی تربیت کرتی ہے، اس کا مطالعہ تنہا ذوق و وجدان ہی کو آسودہ نہیں بناتا، بلکہ پڑھنے والا اپنے دامن میں علم و خبر کی ثروت بھی پاتا ہے! ڈیڑھ ہزار صفحات کی کتاب میں ایک صفحہ بھی ایسا نہیں ہے جو اکتا دینے والا ہو یا قاری اس سے جلد گزر جانا چاہے۔ ع

این شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

شاعری کیا ہے؟

شعر کیا ہے؟ اس کو ناقدین اور ارباب علم و معنی نے طرح طرح سے سمجھایا ہے اور مختلف تعریفیں کی ہیں۔ شبلی کس قدر شاعرانہ انداز میں شعر کی حقیقت کو سمجھاتے ہیں:۔

"حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً مور چنگھاڑتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں، انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں، لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی اس لئے جب اس پر.... کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے"

(شعر العجم جلد چہارم ص ۳۰۲)

اور

"(شاعری) ایک آگ ہے جو خود مشتعل ہوتی ہے ایک چشمہ ہے جو خود ابلتا ہے، ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے" (جلد چہارم ص ۱۷)

شاعری یوں تو فطرت کا ترجمان اور جذبات و مناظر کا مصوّر و عکاس ہوتا ہے، مگر اس کا ایک اور "عالم" بھی ہے جسکی تشریح شبلی کی زبانِ نزاکت بیان سے سنیئے:۔

"اس عالم میں شاعر کی تاریخ زندگی عجب دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے، بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے۔ پروانے اس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، شمع سے وہ رات رات بھر سوز دل کہتا رہتا ہے، نسیم سحری کو اکثر اس نے اکثر قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہے۔ بار بار اس نے غنچہ کی عین اس وقت پر وہ دری کی جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا"

(شعر العجم، جلد چہارم، ص ۳۴۵)

شبلی نے خصوصیت تو فردوسی کی شاعری کی دکھائی ہے۔ مگر در اصل یہ ہر اچھے شاعر کی خصوصیت ہے اور ہونی چاہیئے۔

"شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے، ان دونوں باتوں میں وہ (یعنی فردوسی) تمام شعراء کا پیش رو امام ہے وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے اس کے تمام جزئیات

اور گرد و پیش کے ہر قسم کے حالات اور واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے پھر ان کو اس خوبی کے ساتھ ہو بہو ادا کرتا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور شعراء تو واقعہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ڈالنا ضروری نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں، لیکن طبیعت فطرت شناس نہیں ہوتی، اس لئے باریک باتوں پر نظر نہیں پڑتی یا پڑتی ہے لیکن زبان پر قدرت نہیں کہ جوں کا توں ادا کر دیں۔ اس لئے یا بات کو بدل بدل کر کہتے ہیں یا استعارات و تشبیہات کے دامن میں پناہ لیتے ہیں .....''

(شعر العجم۔ حصہ اول ص۱۵۱-۱۵۲)

آج ہمارے دور میں کتنے شعراء ہیں جو زبان پر قدرت نہ رکھنے کے سبب اچھے خاصے خیال اور واقعہ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں، جس کسی کو زبان پر قدرت اور الفاظ کے برتنے کا سلیقہ نہ ہو اس کی شعر گوئی شاعری کے ساتھ بڑا ظالمانہ مذاق ہے۔

بندش کی چستی اور الفاظ کا در و بست اور صحیح نشست شعر کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے؟ شبلی نے مثال کے ذریعے سے واضح کیا ہے

شعراء دل کو آگ سے مشابہت دیتے ہیں اور یہ عام مضمون ہے لیکن اول اول جب یہ خیال ادا کیا گیا تو اس کی یہ صورت تھی ؎

احوال دلم مپرس کاں بے چارہ

چوبے است در و فتادہ آتش دل نیست

ترجمہ:- میرے دل کا حال نہ پوچھو وہ ایک لکڑی ہے جس میں آگ لگ گئی ہے۔

اسی خیال کو متاخرین نے یوں ادا کیا ہے ؎

یک پارہ آتشے است۔ دلم نام کردہ اند

ایک ذرا سے تغیر سے مصرعہ چست ہو گیا۔

''چوب'' کا لفظ بھدا تھا وہ نکل گیا۔ اس کے بجائے ''پارۂ آتش'' نے لطافت پیدا کر دی۔ ''نام کردہ اند'' نے لطافت کو اور بڑھا دیا.....

(شعر العجم حصہ چہارم ص۱۲۳-۱۲۴)

ایک اور مثال:-

فیضی کا شعر ہے ؎

بانگِ قلمم دریں شبِ تار

بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار

''شعر کا اصل مضمون یہ ہے کہ شاعری میں میں نے بہت سے نئے مضمون پیدا کئے۔ اس کو استعارے کے پیرایہ میں یوں ادا کیا ہے کہ:- کہ میرے قلم کی آواز نے بہت سے سوتے ہوئے مضمونوں کو جگا دیا'' اب اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو:-

''بانگ خاص اس آواز کو کہتے ہیں جس میں بلندی اور ضخامت ہو جو جگانے کے لئے موزوں ہے، بانگ، آواز اور صریر ہم معنی ہیں۔ اس لئے بانگ قلم کی بجائے آواز قلم اور صریر

قلم بھی کہہ سکتے ہیں اس موقع کے لئے صرف بانگ موزوں ہے۔"

"قلم کو فارسی میں خامہ اور کلک بھی کہتے ہیں لیکن قلم کے لفظ میں جو فخامت اور رعب ہے اور لفظوں میں نہیں متکلم کے "میم" نے مل کر اس فخامت کو اور بڑھا دیا۔ بانگ اور قلم کی ترکیب نے لفظ کو زیادہ پُر وزن کر دیا ہے۔

رات کو "تیرہ" اور "تاریک" بھی کہتے ہیں۔ لیکن مصرعہ میں حسن صوت کے لحاظ سے "تار" ہی موزوں ہے۔

بس کے ہم معنی بہت سے الفاظ ہیں مثلاً بسیار، بختے، خیلے، وغیرہ، لیکن "بس" کے لفظ میں کثرت کی جو توسیع ہے، اور لفظوں میں نہیں ہے۔

ان تمام باتوں پر غور کرو۔ تب یہ نکتہ حل ہوگا۔ کہ اس شعر میں جو اثر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مضمون کی ایک ایک خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے جو الفاظ درکار تھے اور جن کے بغیر وہ خصوصیت ادا نہیں ہو سکتی تھی سب شاعر نے جمع کر دیئے اور ان باتوں کے ساتھ اصل مضمون میں اصلیت اور طرز ادا میں جدت و ندرت پیدا کر دی۔ - - - -

(شعر العجم حصہ چہارم ص۸۳)

شاعر کے صحیح ذوق کا پتہ اس کے منتخب اور پسندیدہ اشعار سے چلتا ہے۔ یہ ایسی کسوٹی ہے جس سے ہر شاعر کے ذوق کو پرکھا جا سکتا ہے:-

"ابو تمام ایک مشہور شاعر گزرا ہے جو متنبی کا ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے، اس نے ایک مجموعہ انتخاب کیا تھا جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے اور فن ادب کی جان ہے، اہل فن کا بیان ہے کہ ابو تمام کی شاعری کا کمال جس قدر اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے، خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا۔

میرزا صائب کے انتخاب کا بھی بعینہ یہی حال ہے۔ جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دیئے ہیں وہی اس کے تمام دیوان کا عطر ہے۔"

(شعر العجم - حصہ سوم ص۲۰)

الفاظ اور خیال

الفاظ و خیال (IDEA END EXPRESSION) میں کس کو ترجیح اولیت و فوقیت حاصل ہے یہ شعر و ادب اور بیان و معانی کا بڑا نازک اور دلچسپ اور معرکہ آرا بحث ہے شبلی کا فیصلہ "الفاظ و بیان" کے حق میں ہے اور یہ بالکل صحیح فیصلہ ہے، بڑے سے بڑا نازک خیال بیان کی کمزوری اور الفاظ کی غیر ہم آہنگی اور غلط استعمال کے سبب اچھا خاصا مضحکہ بن کر رہ جاتا ہے مگر سامنے کی معمولی سی بات حسین الفاظ کے قالب میں ڈھل کر "سحر حلال" بن جاتی ہے۔

شبلی کے ذوق صحیح اور وجدان شاعرانہ سے اسی فیصلے کی توقع تھی:-

اہل فن کے دو گروہ بن گئے ہیں، ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی تمام تر کوشش الفاظ کے حسن و خوبی پر مبذول ہوتی ہے۔ عرب کا اصلی انداز یہی ہے، بعض لوگ مضمون کو ترجیح

دیتے ہیں، اور الفاظ کی پرواہ نہیں کرتے۔

"یہ ابن الرومی اور متنبی کا مسلک ہے۔ لیکن زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں، لیکن شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے اور بندش کیسی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے، گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں۔ لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے، انھیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے ظہوری کا ساقی نامہ، نازک خیالی مو شگافی مضمون بندی کا ایک طلسم ہے، لیکن "سکندر نامہ" کا ایک شعر پورے "ساقی نامہ" پر بھاری ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ "ساقی نامہ" میں الفاظ کی وہ متانت اور شان و شوکت اور بندش کی وہ پختگی نہیں جو سکندر نامہ کا عام جوہر ہے...... ذیل کے دو مصرعوں میں

ع تھا بلبل خوش گو کہ چہکتا ہے چمن میں

ع بلبل چہک رہا تھا، ریاض رسول میں

"مضمون بلکہ الفاظ تک مشترک ہیں، پھر بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔"

(شعر العجم جلد چہارم ص۷۳)

تشبیہ و تخییل

شاعری کا قصر دلکش و رفیع "الفاظ و تخییل" ہی کے ستونوں پر قائم ہے۔ بلکہ انہیں سے عبارت ہے۔ الفاظ و بیان کے بارے میں شبلی کا فیصلہ اوپر درج ہو چکا ہے۔ "تخییل" پر انھوں نے شعر العجم میں بڑی نازک بحثیں کی ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ایک معمولی سی معمولی چیز پر قوت تخییل مدتوں صرف کی جا سکتی ہے اور سینکڑوں مضامین پیدا کئے جا سکتے ہیں جس کی محسوس مثال شعراء متاخرین کی نکتہ آفرینیاں ہیں، لیکن اس کی مثال سرکس کے گھوڑے کی ہے جو ایک خیمہ کے اندر طرح طرح تماشے دکھا سکتا ہے لیکن طے منازل میں میدان جنگ میں، گھوڑ دوڑ میں کام نہیں آ سکتا۔ اسی طرح تخییل کا عمل بھی ایک محدود دائرے میں جاری رہ سکتا ہے، لیکن اس کی وسعت کیا ہوگی؟ اور ایسی شاعری کس کام آئے گی؟ وہ شاعری جو ہر قسم کے جذبات کا آئینہ بن سکتی ہو، جو فطرت انسانی کا راز کھول سکتی ہو۔ جو تاریخی واقعات کو دلچسپی کے منظر پر لا سکتی ہو، جو فلسفہ اخلاق کے وقائق بتا سکتی ہو، اس کے لئے ایسا محدود تخییل کیا کام آ سکتا ہے، تخییل جس قدر قوی، باریک، متنوع اور کثیر العمل ہوگی، اسی قدر مشاہدات کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ جس قدر بلند پرواز طائر ہوگا اسی قدر اس کے لئے فضا کی وسعت زیادہ درکار ہوگی۔"

(شعر العجم جلد چہارم، ص۵۲)

تخیل کے میدان اور فکر و تصور کی جولاں گاہ کو وسیع بلکہ بیکراں ہونا چاہیئے ۔ مگر اس میدان میں شعرا بے اعتدالی کی ٹھوکریں بھی کھاتے ہیں ۔ شبلی شاعروں کی ان لغزشوں سے اچھی طرح باخبر ہیں ۔

قوت تخیل کو سب سے زیادہ بے اعتدالی کا موقعہ مبالغہ میں ملتا ہے ۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مبالغہ کے لئے اصلیت اور واقعیت کی ضرورت نہیں اس بنا پر قوت تخیل جی کھول کر بلند پروازی دکھاتی ہے اور کجروی اور بے راہ روی کی اس کو پروا نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ !

وہ تخیل اکثر بے کار و بے اثر ہوتی ہے جس میں تمام عمارت کی بنیاد صرف لفظی تناسب یا ابہام پر ہوتی ہے، متاخرین کی اکثر نکتہ آفرینیاں اس قسم کی ہیں، مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

مستانہ کشتگاں تو ہر سو فتادہ اند
تیغ ترا مگر کہ بہ مے آب دادہ اند

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کی تلوار کے مارے ہوئے، ہر طرف مست پڑے ہوئے ہیں، مستی کی وجہ یہ ہے کہ معشوق نے جس تلوار سے قتل کیا ہے اس پر شراب کی باڑھ رکھی گئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس تمام عمارت کی بنیاد "آب" کے لفظ پر ہے، اس لفظ کے دو معنی نہیں ہوتے تو یہ گورکھ دھندا قائم نہیں رہ سکتا ۔"

"تخیل کی بے اعتدالی کا بڑا موقعہ استعارات و تشبیہات ہیں، استعارات اور تشبیہیں جب تک لطیف، قریب المأخذ اور اصلیت سے ملتی جلتی ہیں شاعری میں حسن پیدا کرتی ہیں لیکن جب تخیل کو بے اعتدالی کا موقعہ ملتا ہے تو دور از کار اور فرضی استعارات اور تشبیہیں پیدا کرتی ہے، اور پھر اس پر اور بنیادیں قائم کرتی جاتی ہے ۔ مثلاً مرزا بیدل کہتے ہیں ؎

تبسمے کہ بہ خوف بہار تیغ کشید
کہ خندہ بر لب گل نیم بسمل افتادہ است

اصل خیال یہ تھا کہ معشوق کا تبسم پھول کے نیم شگفتہ ہونے کی حالت سے زیادہ خوشنما ہے ۔ اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ تبسم ایک قاتل ہے اس نے بہار کی خونریزی کے لئے تلوار کھینچی ہے ۔ اس کا وار خندہ گل پر پڑا ۔ خندہ گل نیم بسمل ہو کر رہ گیا ۔

اس تخیل میں جو بے اعتدالی ہے استعارات کی وجہ سے ہے، بہار کا خون، تبسم کی تلوار خندہ گل کا بسمل ہونا دور از کار استعارات ہیں ۔"

(شعر العجم جلد چہارم ص ۵۴ ۔ ۵۵ ۔ ۵۶ ۔ ۵۷)

تخیل کا غلط استعمال شعر کے حسن اور اس کی اثر آفرینی کو خاک میں ملا دیتا ہے، شبلی ان شاعرانہ باریکیوں پر کس قدر دیدہ ورانہ نگاہ رکھتے ہیں ۔

"تخیل اور محاکات اگرچہ دونوں شاعری کے عنصر ہیں، لیکن دونوں کے استعمال کے موقعے الگ الگ ہیں ۔ یہ سخت غلطی ہے کہ ایک کے بجائے دوسرے کا استعمال کیا جائے ۔ مثلاً

مناظر قدرت کا بیان محاکات میں داخل ہے، اگر بہار، خزاں، باغ، سبزہ، مرغزار آب رواں کا بیان کیا جائے تو محاکات سے کام لینا چاہیئے، یعنی اس طرح بیان کرنا چاہیئے کہ ان چیزوں کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

متاخرین کی سخت غلطی جس سے ان کی شاعری بالکل برباد ہوگئی ہے یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخیل سے کام لیتے ہیں مثلاً بہار کی تعریف میں کلیم کہتا ہے

بہ نوع آتش گل در گرفت است،

کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

یعنی پھولوں کی وجہ سے باغ میں اس طرح آگ لگ گئی ہے کہ بلبل نے جاکر پانی میں گھونسلا بنالیا"۔ (شعرالعجم جلد چہارم ص۔ ۵۹ - ٦۰)

"شاعری در اصل تخیل کا نام ہے، محاکات میں جو جان آتی ہے تخیل ہی سے آتی ہے ورنہ محاکات نقالی سے زیادہ نہیں، قوت محاکات کا یہ کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے اس کو الفاظ کے ذریعے بعینہٖ ادا کردے، لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا اور توافق کو کام میں لانا ان پر آب و رنگ چڑھانا قوت تخیل کا کام ہے"۔

(شعرالعجم جلد چہارم ص۔ ۳۱ - ۳۲)

تشبیہ اور استعارے کے فرق ان کی ضرورت، اور شعر و ادب میں انکے وظیفہ عمل (EUNCTION) کو شبلی نے کس قدر بلیغ اور جامع انداز میں بیان کیا ہے:-

"یہ چیزیں (یعنی تشبیہ و استعارہ) شاعری بلکہ عام زبان کے خط و خال ہیں جن کے بغیر انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا ایک عامی سے عامی جب جوش یا غیظ و غضب میں لبریز ہوجاتا ہے تو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے استعارات کا قالب بدل کر نکلتا ہے غم اور رنج کی حالت میں انشا پردازی اور تکلف کا کس کو خیال رہتا ہے، لیکن اس حالت میں بھی بے اختیار استعارات زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کا عزیز مرجاتا ہے، تو کہتا ہے "سینہ پھٹ گیا" "دل میں چھید ہوگئے" "آسمان ٹوٹ پڑا" "تجھ کو کس کی نظر کھاگئی" یہ سب استعارے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ استعارہ در اصل فطری طرز ادا ہے، لوگوں نے بے اعتدالی سے تکلف کی حد تک پہنچادیا۔۔۔"

"اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص نہایت شجاع ہے تو اگر انھیں لفظوں میں اس مضمون کو ادا کریں، تو یہ معمولی طریقہ ادا ہے۔ اس بات کو اگر یوں کہیں "وہ شخص مثل شیر کے ہے" تو یہ تشبیہ ہوگی اور معمولی طریقہ کی بہ نسبت کلام میں کچھ زیادہ زور پیدا ہوجائے گا اور اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر ہے"۔ تو زور اور بڑھ جائے گا لیکن اگر شخص کا مطلق ذکر نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ "وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا

تو ہل چل پڑ گئی"۔ ڈکارنا خاص شیر کی آواز کو کہتے ہیں) یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے کی
نسبت زیادہ لطیف ہے۔

"اکثر موقعوں پر تشبیہ اور استعاروں سے کلام میں جو وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے
وہ کسی اور طریقے سے پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر اس مضمون کو کہ فلاں موقع پر نہایت
کثرت سے آدمی تھے یوں ادا کیا جائے کہ " وہاں آدمیوں کا جنگل تھا تو کلام کا زور بڑھ
جائے گا۔ یہاں کلام کا اصلی مقصد آدمیوں کی کثرت کا بیان کرنا ہے۔ جنگل کی تشبیہ کی
وجہ سے کثرت متعدد وجہوں سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے"۔

"جب کسی نہایت نازک اور لطیف چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو الفاظ
اور عبارت کام نہیں دیتی اور یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نے اگر ان کو چھوڑا تو ان کو صدمہ پہنچ
جائے گا جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے، وہ اسی قسم کی لطیف اور نازک صورت
کو ڈھونڈ کر پیدا کرتا ہے اور پیش نظر کر دیتا ہے۔ مثلاً نظیری کہتا ہے ؎

ہمہ شب بر لب و رخسار و گیسو میزدم بوسہ
گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن است امشب

ترجمہ:- میں معشوق کے لب و رخسار اور گیسو کو تمام رات چھوتا رہا۔ آج گل و نسرین و سنبل کے
خرمن میں ہوا گھس آئی ہے۔

لب و رخسار کی نزاکت اور ان کا نام اور لطیف بوسہ الفاظ کی برداشت کے قابل نہ تھا
اس حالت سے تشبیہ دی گویا ہلکی ہلکی ہوا پھولوں کو چھو کر گزر جاتی ہے۔ اور بار بار
آکر چھوتی اور نکل جاتی ہے۔

(جلد چہارم - ۶۱-۶۲-۶۴)

اور

"ہر تشبیہ ابتدا میں نادر اور پر لطف ہوتی ہے لیکن بار بار کے استعمال سے اس کی ندرت
اور تازگی جاتی رہتی ہے اور بے اثر ہو جاتی ہے اس لئے شاعر کا فرض یہ ہے کہ نادر اور
جدید تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈ کر پیدا کرے بڑے بڑے شعراء کا معیار کمال یہی ہے
کہ ان کے کلام میں اچھوتی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بوسہ
کو ایشیائی شعراء شیریں اور گلو سوز کہتے ہیں۔ لیکن یورپ کا جادو طراز کہتا ہے "کہ وہ
ایک پیمان وفا ہے جو مجسم بن جاتا ہے، ایک راز پنہاں ہے جو سامعہ کے بجائے ذائقہ
سے کہا جاتا ہے لذت آلود نگاہیں ہیں جو سمٹ کر نقطہ بن گئی ہیں۔۔۔"

(جلد چہارم، ص ۶۶)

میں بڑی مشکل سے ضبط کر کے اور طبیعت کو مار کے رہ جاتا ہوں، ورنہ جی یہی چاہتا ہے کہ شعرالعجم کے صفحے کے صفحے

........نقل کرتا چلا جاؤں۔ مگر اپنے ذوق کی رعایت اور دل کا کہنا کروں تو یہ مضمون پوری کتاب بن جائے گا میرا حال اس تماشائی کا سا ہے جس کے سامنے حدِ نظر تک سبزہ و گلزار ہو مگر وہ بے چارہ وقت کی قلت کی مجبوری کے سبب ایک دو تختوں کی سیر کر کے ہی رہ جائے۔

آب و ہوا کا اثر مقامات اور خطوں کے حالات کے اختلاف کا ایرانی شاعری پر کیا اثر پڑا۔ اس پر شبلی کا محاکمہ پڑھیے اور اس ناقد شاعر کے حضور خراجِ عقیدت پیش کیجیے:۔

"......اصفہان اور شیراز، یزد وغیرہ کی آب و ہوا میں لطافت اور نزاکت تھی وہاں کے رہنے والے نازک اندام اور لطیف المزاج ہوتے تھے۔ معاشرت کے لحاظ سے یہ شہر گویا اس زمانے کے پیرس یا لکھنؤ تھے، یہ اختلاف واثر دونوں ممالک کی شاعری میں صاف محسوس ہوتا ہے، غزنین اور سمرقند وغیرہ کے شعراء پختہ گو اور سادہ گو ہیں بخلاف اس کے شیراز وغیرہ کے شعراء کا کلام لطافت و نزاکت سے گویا عروس رعنا ہے شیراز اور اصفہان کی زبان میں جو نفاست شیرینی، روانی، لطافت، لوچ پایا جاتا ہے سمرقند اور غزنین کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔ (جلد چہارم۔ صـ ۲۱۳)

اور

"یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا سرسبزی اور شادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعے سے انشا پردازی اور شاعری تک پہنچتا ہے۔ عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، جنگل، صحرا، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے راستے، مٹے ہوئے کھنڈر ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں، یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں، لیکن یہی عرب جب بغداد میں پہنچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا۔ ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آب رواں، سبزہ زار آبشاریں ہیں بہار آئی اور تمام سرزمین تختہ زمردیں بن گئی باد سحر کے جھونکے خوشبوؤں کی لپٹ سبزہ کی مہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آسکتا۔

اس حالت کا یہ اثر ہوا کہ ایران کی تمام انشاء پردازی پر رنگینی چھا گئی۔ کسی چیز کی خوبی یا کمال کو بیان کرنا چاہیں گے۔ تو رنگ و بو کے ذریعے سے کام لیں گے۔ فردوسی جس کی زبان سے پہلوانی اصطلاحات اور الفاظ کے سوا کوئی لفظ نہیں نکل سکتا۔ فوج کی تعریف میں کہتا ہے ؎

سوئے شہر ایران نہاوند روئے
سیاہی بداں گونہ با رنگ و بوئے

اسی بناء پر رنگیں سخنی، رنگیں ادائی کے محاورات پیدا ہوئے......اسی طرح پھولوں کی افراط

نے گُل کے لفظ کو اس قدر عام کیا کہ کوئی چیز گُل سے خالی نہیں، چراغ میں گُل، آنکھ میں گُل، شراب میں گُل، پیکاں میں گُل، صبح کا گُل، چاند کا گُل...... دو چار قدم ٹہلنا ہو تو گُل گشت کہیں گے، گویا ہر قدم پر پھول بچھے ہوئے ہیں کہ جو قدم پڑتا ہے پھولوں پر پڑتا ہے۔ زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا ہو تو گُل زمین کہیں گے۔ جب کسی موقعہ پر کوئی شخص کوئی عمدہ بات کہتا ہے تو سب بول اٹھتے ہیں "گُل گفتی" یعنی "خوب گفتی" پہلوان حریف کو جب کشتی کا پیغام (چیلنج) دیتے ہیں تو پھول بھیج دیتے ہیں ؎

دریں بہار نہ شد کس حریف فریادم
نہ بلبلان چمن ہم گلے فرستادم

(جلد چہارم صـ ۲۱۵ - ۲۱۶ - ۲۱۷)

جس طرح شاعری پر آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے اسی طرح تمدن و تہذیب اس پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ شاعر بھی اپنی تمام شاعرانہ بلند پروازیوں کے باوجود معاشرے ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔

"پانچویں اور چھٹی صدی میں چونکہ ملکی تمدن خراب ہو گیا تھا۔ اس لئے زبان میں فحش الفاظ آچکے تھے، ہجو نے اس کو ترقی دی۔ یہاں تک کہ ملک کی عام زبان خراب ہو گئی اب مہذب سے مہذب حضرات بھی شاعری کو فحش سے نہ بچا سکے۔ گلستاں کا باب پنجم اور مثنوی مولانا روم کی بعض حکایتیں اسی حالت کے نتائج ہیں۔

(جلد چہارم صـ ۱۷۲)

ایشیائی شاعروں کی کمزوری

شبلی مشرق کی ایک ایک ادا پر جان دیتے ہیں۔ اور سر سید اور حالی کی طرح یورپ سے مرعوب نہیں ہیں۔ مگر وہ ایک منصف مزاج ناقد ہیں۔ اس لئے ایشیائی شعرار کی کمزوری سے بھی صرف نظر نہیں کرتے۔ بلکہ کھُل کر کہتے ہیں۔

"ایشیائی شعرار کا عام قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن و عشق کا کہیں اتفاقی موقع آجاتا ہے تو اس قدر پھیلتے ہیں کہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں۔ نظامی اور جامی جیسے لوگ اس حمام میں آکر ننگے ہو جاتے ہیں" (جلد اول صـ ۱۲۲)

یہ تذکرے

ایرانی شاعروں کے سوانح حیات اور جو تذکرے شبلی کو دستیاب ہوئے ہیں ان کے بارے میں ان کی یہ رائے کتنی واقعہ کے مطابق ہے۔

"شعرار کے تذکرے بہت ہیں، لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعرار کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیئے ہیں۔ شعرار کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں۔

(جلد اول صـ ۳)

بیاض اشعار کہہ کر فاضل تنقید نگار نے ایرانی شعرار کے تذکروں کی حیثیت بیان کر دی کہ وہ در اصل کیا ہیں؟

عربی شاعری کا اثر

فارسی شاعری نے عربی شاعروں کا کس حد تک اثر قبول کیا ہے اس پر شعر العجم میں جگہ جگہ بحث کی گئی

ہے ..... مثلاً۔
"عربی قصائد کی تمہید میں اکثر ممدوح یا معشوق کے ملنے کے لئے سفر کرنے کا حال لکھتے ہیں اور راستہ کی سختی، پہاڑوں کی چڑھائی گھوڑوں کی جفاکشی اور گرم رفتاری کے ذکر سے اس کو طول دیتے ہیں۔ فارسی میں بھی قدیم شعراء کا یہ خاص انداز تھا جو آخر متروک ہوگیا۔ منوچہری دامغانی اور عمعق بخاری نے متعدد قصیدے اس طرز پر لکھے ہیں۔"

(جلد چہارم صفحہ ۱۳)

شبلی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ عربی شاعری میں الفاظ کی جس قدر کثرت اور وسعت ہے فارسی کو یہ وسعت میسر نہیں، اس کے الفاظ بہت محدود ہیں، پھر عربی شعراء کو ایک آسانی یہ حاصل ہے کہ شاعری میں زحافات کی کوئی حد و نہایت نہیں وہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کر سکتے ہیں ..... مگر:۔

"ان تمام وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔"

(جلد دوم صفحہ ۱۵)

شبلی کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی متعصب ان پر "عجمیت" کی پھبتی چست کردے کہ آجکل دینی مباحث میں یہ طنز عام ہوگئی ہے۔

مگر اس کے باوجود کہ مجموعی اعتبار سے شبلی فارسی شاعری کو عربی شاعری سے بلند و بالا سمجھتے ہیں۔ لیکن قصیدہ گوئی میں وہ عربی شاعری کے زیادہ واقعاتی، پرجوش اور فطری ہونے کے قائل ہیں۔ سبعہ معلقہ کے ایک قصیدے کے چند اشعار پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"اس قصیدے کا ایک ایک شعر جوش و غیرت، حمیت و آزادی اور دلیری کے صاعقہ کی گرج ہے۔" (جلد پنجم صفحہ ۲۷)

اور

"غور کرو! شعرائے فارس اس کے مقابلے میں کس چیز پر فخر کر سکتے ہیں۔ نظامی اور عرفی نے بڑے زور کے فخریئے لکھے ہیں لیکن فخر کی ساری کائنات یہ ہے کہ ہم اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں الفاظ اور حروف ہمارے باجگزار ہیں۔ مضامین ہمارے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں اس سے آگے بڑھے تو یہ کہ ہم پری پیکر ہیں۔"

(جلد چہارم صفحہ ۲۸)

ایرانی شعراء کی ذہانت و فطانت پر یہ چند جملے برہان قاطع ہیں۔

"اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعر ہے۔ علامہ زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے، لیکن زبان دانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے۔"

(جلد دوم صفحہ ۱۵)

غزل گوئی

غزل کو ایران میں ترقی بلکہ معراج کیوں نصیب ہوئی ! اس کے اسباب کیا ہیں ؟ شبلی اس کا جواب دیتے ہیں۔

"ایران کا تمدن کئی ہزار برس کا تمدن ہے معاشرت اور کاروبار زندگی میں ہمیشہ سے نزاکت موجود تھی۔ تین ہزار برس کی متصل عیش و نعمت اور جاہ و ثروت نے نفاست و لطافت کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ آب و ہوا۔ سبزہ زار۔ آب رواں۔ لالہ و گل۔ دماغوں اور طبیعتوں کو ہمہ وقت نشاط انگیز اور ولولہ خیز رکھتے تھے، ان سب پر مستزاد یہ کہ حسن و جمال کے لحاظ سے ملک کا ملک بوستان تھا، نوشاد، فلخ، فلخار، کشمیر جو حسن کے چمن زار تھے ایران کے دامن میں تھے، وہاں کی پیداواریں، ایران ہی کے بازاروں کو سجاتی تھیں ان سامانوں کے ساتھ۔ ایران میں غزل گوئی کی ترقی ایک لازمی چیز تھی۔

(جلد پنجم ص ۶۹)

اس تجزیے کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ درست ہے بلکہ اس پر اضافہ کرنا بھی دشوار ہے، یوں کوئی بات کو پھیلانا اور کلام کو طول دینا چاہے۔ تو یہ سلسلہ دراز تر ہو سکتا ہے۔

ایران میں غزل کو ترقی دے کر شاعروں کی تخیّل و بیان کی بدولت نصیب ہوئی ؟ شبلی۔ اس پر تبصرہ فرماتے ہیں :۔

"سب سے پہلے حکیم سنائی نے غزل کو ترقی دی انکے بعد اوحدی، مراغی نے غزل کو جذبات سے لبریز کردیا۔ ۔ ۔ ۔ اوحدی کے بعد خواجہ فرید الدین عطار، مولانا روم اور عراقی وغیرہ نے غزل کو نہایت ترقی دی، لیکن یہ لوگ چونکہ عشق حقیقی کے جانداده تھے اس لئے انکے کلام میں حقیقت کا پہلو غالب رہتا تھا، اس بنا پر ان کی غزلیں عام نہ ہوئیں"۔

"اسی زمانے میں شیخ سعدی پیدا ہوئے وہ ایک مدت تک عشق و عاشقی میں بسر کر چکے تھے اخیر اخیر تصوف کے حلقہ میں آئے وہ فطرتاً شاعر تھے، زبان خداداد تھی ان باتوں نے مل کر ان کی غزل میں یہ اثر پیدا کردیا کہ تمام ایران میں آگ لگ گئی، انکے بعد خسرو اور حسن نے اس شراب کو اور تیز کردیا۔

اس دور کے بعد شاعرانہ حیثیت سے سلمان اور خواجو نے غزل کو ترقی دی۔ لیکن سلمان اور خواجو دونوں تصوف سے محروم تھے اس لئے ان پھولوں میں رنگ تھا نہ بو تھی سلمان اور خواجو زندہ ہی تھے کہ خواجہ حافظ نے غزل گوئی شروع کی اور اس جوش سے نغمہ چھیڑا کہ زمین آسمان گونج اٹھا۔۔

(جلد پنجم ص ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸)

غزل میں دور جدید کا امام کون تھا۔ شبلی بتاتے ہیں "تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ اس دور جدید کے آدم بابا فغانی ہیں"۔

"چنانچہ والہ داغستانی کی عبارت ہم تیسرے حصہ میں نقل کر آئے ہیں، اوحدی نے عرفات میں تصریح کی ہے کہ تمام متاخرین فغانی کے مقلد ہیں، اندرونی شہادت یہ ہے کہ عرفی شفائی نظیری وغیرہ عموماً فغانی کی راہ پر غزل لکھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ غرض یہ امر مسلم

ہے طرزِ جدید کا موجد فغانی ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس کے متعلق کسی نے ایک حرف بھی نہیں لکھا کہ فغانی کا طرز کیا ہے؟ اور اس کی خصوصیتیں کیا ہیں؟ اس لئے ہم کو خود اپنی رائے اور استقرا سے کام لینا پڑے گا۔"

(جلد پنجم ۔ صفحہ ۵۹ ۔ ۶۰)

"غزل کے سلسلے میں علامہ شبلی نے اس فرق کو ظاہر کیا ہے کہ ایران کا معشوق اکثر شاہد بازاری اور مبتذل ہوتا ہے جب وہ محفل میں جلوہ آرا ہوتا ہے تو چاروں طرف سے عشاق کا جمگھٹا ہوتا ہے، وہ کسی سے آنکھیں لڑاتا ہے کسی سے اشارے کنائے کرتا ہے۔ کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا ہے، کسی کو فریب آمیز نگاہوں سے جھوٹی محبت کا یقین دلاتا ہے، عشاق ایک ایک ادا پر بچھے جاتے ہیں..... برخلاف اس کے عرب کا معشوق عفت و عصمت کا حریم نشین ہے، وہاں تک رسائی مشکل ہے، کوئی شخص ادھر کا رُخ کرے، تو پہلے تلواروں کا سامنا کرنا ہوگا۔" (جلد پنجم)

مثلاً

"مجنوں کہتا ہے" کہ میں جب نماز پڑھتا ہوں تو لیلیٰ کے خیال میں یہ یاد نہیں رہتا کہ میں نے دو رکعت نماز پڑھی یا چار رکعت ادا کی" ایرانی شاعر کے نزدیک یہ نہایت معمولی بات بلکہ منصب عشق کی توہین ہے، لیکن اس واقعیت اور اثر سے کون انکار کر سکتا ہے".....

ایرانی شاعر بعض وقت ممکن اور قریب الوقوع دعویٰ کرتا ہے، لیکن چونکہ یہ معلوم ہے کہ وہ خود اس وصف سے خالی ہے، اس لئے اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً سعدی کہتے ہیں ؎

حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر
بہ سر نکوفتہ باشد درِ سرائے را

یعنی وہ شخص عشق کا معاملہ کیا سمجھ سکتا ہے جس نے تمام عمر ایک دفعہ بھی کسی کی چوکھٹ پر اپنا سر نہ دے مارا ہو۔

یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن واقعیت کے لحاظ سے خود سعدی بھی انہی لوگوں میں نظر آتے ہیں، جن کے سر کو آستاں کوبی کی نوبت نہیں آئی ہے۔ برخلاف اس کے جب عرب کا شاعر کہتا ہے۔

ذکرتک والخطی یخطر بیننا
وقد نھلت منا المثقفۃ السمر

ترجمہ:۔ "میں نے اس وقت تجھ کو یاد کیا جب گندم گوں برچھیاں میرے خون سے سیراب ہو چکی تھیں۔ تو چونکہ معلوم ہے کہ شاعر نے میدانِ جنگ میں جو برچھیاں کھائی ہیں، اس لئے شعر دل پر اثر کرتا ہے..." (جلد پنجم صفحہ ۷۸ ۔ ۷۹)

تنقید اب ہم مختلف شاعروں پر شبلی کی تحسین و تنقید کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ نظامی گنجوی کی غزل گوئی پر صرف ایک جملہ لکھا ہے اور اس ایک جملہ میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔

"غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنم کدہ کے آذر نظامی ہی ہیں۔" (جلد اول صفحہ ۲۱)

انسان کتنا ہی مشاق چابک دست اور اپنے فن میں یکتا کیوں نہ ہو جائے تھوڑی بہت کور کسر ہر کسی کے یہاں رہ جاتی ہے، یہی حال مشاہیر شعراء کا ہے، ان کا کلام کمزوریوں سے خالی نہیں ہے، شبلی کی نگاہ سے مشاہیر کی یہ کمزوریاں چھپ نہیں سکتیں۔ نظامی کے وہ بہت بڑے مداح ہیں مگر اس کے ایک شعر میں نقص دکھائی دیا، تو اسے ظاہر بھی کر دیا کہ دوسرے اس سے درس عبرت لیں:-

"نظامی خدائے سخن ہیں، تاہم دارا کے خط میں جو سکندر کے نام تھا لکھتے ہیں ؎

وگرنہ چنانت وہم گوش پیچ
کہ دانی تو ہیچی و کمتر ز ہیچ

ترجمہ:- "ورنہ میں تیرے اس طرح کان ملوں گا کہ تو جان جائے کہ نا چیز سے بھی نا چیز ہے"۔

نظامی گوشہ نشین شخص تھے۔ شاہی درباروں میں جانے کا کم اتفاق ہوا تھا۔ شاہانہ آداب اور طریق گفتگو سے واقف نہ تھے اس لئے وہی عام بازاری "گوش پیچ" (کان اینٹھنا) لکھ گئے اس نقص کی وجہ سے واقع کی صحیح تصویر نہ اتر سکی"۔

(جلد چہارم صفحہ ۲۳۲)

نظامی کو مناظر قدرت کی عکاسی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ شاعر کے اس کمال کا ذکر کس قدر دل کش انداز میں کیا ہے۔

"مناظر قدرت کو جا بجا لکھا ہے اور جہاں لکھا ہے نیچر کی تصویر کھینچ دی ہے"۔ مناظر قدرت میں باغ و بہار ایک عام موضوع ہے جس پر تمام شعرائے طبع آزمائیاں کی ہیں اور داد سخن دی ہے۔ لیکن نظامی یہاں بھی سب سے علیحدہ اور سب سے ممتاز ہیں۔ تمام شعرائے صرف بہار کا سماں دکھانے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن نظامی نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ بہار میں ایک رنگین مزاج پر کس طرح نشہ چھا جاتا ہے، وہ باغ میں جاتا ہے، پھولوں سے کھیلتا ہے، گلدستے بنا کر درختوں پر اچھالتا ہے، نہر کے کنارے بیٹھ جاتا ہے اور شگوفے توڑ توڑ کر نہر میں بہاتا ہے، حوض کے پاس چنبیلی کے پھولوں کا بچھونا بچھاتا ہے، بغل میں معشوق ہے، اس کی زلفوں کے حلقے اپنی گردن میں ڈالتا ہے اور دنیا سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مرغان چمن سے فرمائش کرتا ہے کہ ہاں! پھر اسی انداز سے اڑنا۔ پھر ساتھ ہی ساز بھی چھیڑ جاتا ہے اور قابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔

(جلد اول، صفحہ ۳۲۶ - ۳۲۷)

سکندر نامہ پر تنقید اور شاہنامہ سے موازنہ کس دقتِ نظر کے ساتھ کیا ہے۔
"سکندر نامہ کے ہیرو کے انتخاب میں غلطی ہوگئی، لیکن مجبوری تھی۔"
"قومی تاریخ فردوسی کے حصے میں آچکی تھی۔ رسول اللہؐ کے غزوات اور خلفاء کے معرکوں میں گنجائش کم تھی۔ کیوں کہ صلیت سے بال برابر بھی ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے اور شاعری کے لئے کچھ نہ کچھ آب و رنگ چڑھانا ضرور تھا۔ خود کہتے ہیں ؎

چو نظم گزارش بود راہگیر
غلط کردن رہ بود ناگزیر
مرا کار با نغز گفتار نیست
ہمہ کار من خود غلط کار نیست
دگر بے شگفتے گزاری سخن
نہ دارد نوی، نامہ ہائے کہن

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی مشہور کشورستان کی داستان اختیار کی جائے اس حیثیت سے سکندر کا کوئی ہمسر نہ تھا، ایشیاء اور یورپ دونوں اس کو مانتے ہیں۔
"سکندر نامہ میں اگرچہ شاعری کے محاسن بہت زیادہ ہیں۔ بایں ہمہ شاہنامہ کے برابر مقبول نہ ہو سکا۔ اس کے خاص اسباب ہیں۔
(۱) سکندر نامہ میں اکثر جگہ تعقید ہے جو بات کہنا چاہتے ہیں اس طرح صاف نہیں کہہ سکتے کہ زبان سے نکلنے کے ساتھ ہی دل میں اتر جائے یہی وجہ ہے کثرت سے شرحیں اور حاشیے لکھے گئے، اس پر بھی بہت سے مقامات لاینحل رہ گئے اور اکثر جگہ زبردستی مطلب پہنانا پڑا۔
(۲) سکندر نامہ کا ہیرو ایک غیر شخص یعنی سکندر تھا۔ اس لئے ایرانیوں کو اس کے واقعات سے ایسی دل چسپی اور محبت نہیں ہو سکتی تھی جو خود اپنی قوم سے ہو سکتی تھی۔ شاہنامہ کے مقبول ہونے کا بڑا گر یہ تھا کہ خود اپنی قوم کی داستان تھی۔
(۳) تمام کتاب میں صرف ایک شخص کی داستان ہے، پڑھنے والا اکتا اکتا جاتا ہے، برخلاف اس کے شاہنامے میں سینکڑوں اشخاص کے واقعات اور گوناگوں حالات ہیں ایک غذا سے جی گھبرا جائے تو طرح طرح کے ایوان نعمت موجود ہیں۔
(۴) تمام کتاب میں کوئی درد انگیز اور عبرت خیز واقعہ نہیں ہے۔ برخلاف اس کے شاہنامہ میں رستم، سہراب، منیزہ، وبیژن، جمشید و ضحاک کی داستانیں نہایت پر اثر اور حسرت آمیز ہیں۔" (جلد اول صفحہ ۳۳۶ - ۳۳۷ - ۳۳۸)

اگر کسی ناقد کو شبلی کے اس محاکمہ سے اختلاف ہو تو وہ سامنے آئے اور اس کوہ گراں سے ٹکرانے کی ہمت کرے۔

مگر

مگر — نظامی جہاں فردوسی سے بڑھ گئے ہیں ان مقامات کی شبلی نے صرف یہ کہ نشاندہی کی ہے بلکہ دونوں کے شعروں کا مقابلہ کرکے دکھایا ہے۔

فردوسی :— فراواں پرستندہ پیشش بپاتے

نظامی :— صف اندر صف آراستہ آں دل فریب

"فردوسی کے بیان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کا ہجوم تھا سب کھڑے تھے۔ لیکن نظامی کے بیان سے ان کا باقاعدہ صف بہ صف ایستادہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ آراستہ کے لفظ نے اس خصوصیت کو اور روشن اور خوشنما کر دیا ہے۔"

فردوسی :— سکندر بداں در شگفتہ بماند
فراواں نہاں نام یزداں بخواند

نظامی :— نہانے دراں قصر زیبندہ دید
بہشتی سرائے فریبندہ دید

"فردوسی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر بالکل ندیدہ تھا۔ دربار کے ٹھاٹ کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا۔ اور بار بار خدا کا نام لیتا تھا۔
نظامی نے مکان اور ایوان کی عمدگی اور خوبی کا اثر سکندر پر طاری کرنا چاہا کہ وہ کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔"

(جلد اول ص ۳۴۹ - ۳۵۰)

شبلی فردوسی سے بہت زیادہ متاثر ہیں، انکے نزدیک غالباً وہ دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے، اس ایک جملہ میں فردوسی سے اپنی عقیدت، شاعرانہ اور خود اس کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔

"فردوسی خدائے سخن ہے اس کے آگے بندوں کو زبان کھولنے کی کیا جرأت ہو سکتی ہے۔" (جلد اول ص ۱۷۲)

لیکن

ان کو دقیقی کے اس شرف اولیت کا بھی احساس ہے کہ شاہنامہ کی طرح اس نے ڈالی تھی۔

"دقیقی کی بدقسمتی دیکھو کہ اس فخر کا تاج، شہرت کے ہاتھوں نے اس سے چھین کر فردوسی کے سر پر رکھ دیا۔" (جلد اول ص ۱۵۸)

شیخ سعدی کے شاعرانہ کمال کا شبلی کو اعتراف ہے انھوں نے امیر خسرو کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ "سعدی غزل کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتے"۔ شبلی غزل کے علاوہ مثنوی اور قصائد میں بھی سعدی کی بلند پایگی کو تسلیم کرتے ہیں مگر شیخ نے

.... کہیں کہیں رزمیہ شاعری جو کی ہے، اس پر شبلی کی یہ تنقید کتنی صائب ہے۔

"لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ سے یہ کمان (یعنی رزمیہ کی کمان) زہ نہیں ہو سکتی دو چار قدم تن کر اور اکڑ کر چلتے ہیں، لیکن پھر طبعی بڑھاپے کے ضعف سے دفعتاً جھک جاتے ہیں، رزم کا آغاز کس زور شور سے کیا گیا ہے ؎

برانگیختم گرد ہیجا چو دود

لیکن دوسرے ہی قدم پر لڑکھڑا کر گرتے ہیں ؎

چو دولت نہ باشد تہور چہ سود۔"

امیر خسرو کا کلام شبلی کو اس قدر پسند ہے اور ان کی ذات و شخصیت سے اتنی دل چسپی ہے کہ شعر العجم جلد دوم جو ۳۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اس کے اٹھاسی صفحے تذکرۂ خسرو کی نذر کر دیئے ہیں۔ امیر خسرو نے موسیقی میں کون کون سے راگ ایجاد کئے انکی فہرست تک درج کی ہے اور یہ تک بتایا ہے کہ خسرو کا ایجاد کردہ راگ کن راگوں سے مرکب ہے مثلاً:۔

عشاق — سارنگ اور بسنت اور نوا سے مرکب ہے

فرغنہ — کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے

سرپردہ — سارنگ، بلاول اور راست کو ترکیب دیا ہے

خسرو کی بارگاہ میں شبلی اس طرح نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے ہونگے! صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، نظیری، اور عرفی بے شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں، لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن خسرو کی جہانگیری میں، غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں"

(جلد دوم — ص ۱۳۲)

لیکن

خسرو کی مشہور مثنوی قران السعدین کی کمزوریوں تک بھی ان کی نگاہ پہنچی ہے۔

"لیکن لغزشیں کون بتائے، کس کا منہ ہے ہم دبی زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام (قران السعدین و اعجاز خسروی) میں لفظی رعایت، بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی ہے، اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

(جلد دوم ص ۱۲۹)

قرآن السعدین میں امیر خسرو نے بادشاہ کے گستاخ بیٹے (کیقباد) کی طرف سے جو صفائی پیش کی ہے اور کیقباد کی دیدہ دلیری کو اس کا کارنامہ اور باپ کی موجودگی میں اسے تخت کا مستحق ثابت کرنا چاہا ہے۔ اس پر شبلی کی گرفت خاصی سخت ہے مگر منصفانہ ہے

"۔۔۔۔ اس جھوٹی منطق کو امیر نے جہاں تک ہو سکا خوب نباہا ہے۔۔۔۔"

(جلد دوم ص ۱۵۴)

"فیضی کے کمالات کے شبلی بے حد مداح ہیں، اس کے کلام کی خصوصیت ان لفظوں میں بیان کی ہے۔

"فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر، جوش بیان ہے جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی! جوش بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے اور اعلیٰ درجہ پر ہے، لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے! فیضی کے یہاں، فخریہ عشقیہ، فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین میں وہی جوش پایا جاتا ہے۔"

(جلد سوم ص ۴۲)

مگر

فیضی کے قصیدوں کو شبلی نے بے مزہ کہا ہے۔ اور اس کی بے نقط تفسیر کو بیہودہ مغز کاوی اور جابیجا مہمل الفاظ جمع کر دینے (جلد دوم ص ۵۷) سے تعبیر کیا ہے۔ تنقید کے وقت شبلی کے سامنے تصویر کے دونوں رُخ رہتے ہیں اور کسی کے چہرۂ کمال پر ذرا سی چھائیں بھی ہوتی ہے، تو شبلی کی نگاہ اسے دیکھ لیتی ہے۔ قاآنی کے کلام کی کیا خصوصیات ہیں! اس کی بہار شعرالعجم میں دیکھیے

"قاآنی کے تمام قصائد قدما یعنی، فرخی منوچہری، سنائی اور خاقانی کے جواب میں ہیں۔ الفاظ کی بہتات، مرادف الفاظ کا اجتماع، صنعت ترصیع اور لف و نشر مرتب جو قدما کے خصائص ہیں، ان باتوں میں وہ قدما کا ہمسر ہے۔ ان باتوں کے ساتھ جو قدرت کلام اور صفائی و روانی اس کے کلام میں ہے قدما میں بھی نہیں۔۔۔"

(جلد پنجم ص ۱۵-۱۶)

"قاآنی کے خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ قدما کے جو الفاظ سینکڑوں برس سے متروک ہو گئے تھے اور جن میں اکثر غلط بھی تھے۔ قاآنی ان کو بے تکلف استعمال کرتا تھا۔۔۔۔ شعر کے زحافات بھی جو متروک ہو چکے تھے قاآنی نے ان کو استعمال کیا ہے، جس کی وجہ سے قاآنی کا طرز تمام ایران پر چھا گیا، بُرے بھلے سب اسی رنگ میں کہنے لگے، لیکن یہ وہ روش ہے کہ قاآنی ہی کے رتبہ کی شاعری ہو تو لطف دیتی ہے ورنہ بالکل بدمزہ اور خالی الفاظ کا ڈھیر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاآنی کے بعد پھر ایران میں کوئی نامور نہیں ہوا۔ (جلد پنجم ص ۲۰)

سلمان ساوجی کی شاعرانہ عظمت اور امتیازی شخصیت پر صرف دو جملوں میں اظہار رائے کیا ہے اور "تنقید" کو "جزویست از پیغمبری" بنا دیا ہے۔

"۔۔۔۔۔ وہ (سلمان) قدما اور متوسطین میں برزخ ہے"۔

ان کا کلام قدماء کے دور کا خاتمہ اور متوسطین کا آغاز ہے۔

(جلد دوم ص ۲۰۳)

متاخرین شعراء کے کلام میں کیا کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں، اس کی نشاندہی علامہ شبلی فرماتے ہیں۔

"مثنوی بالکل اپنے درجہ سے گر گئی (فیضی اس سے مستثنیٰ ہے) مثنوی میں عموماً تاریخی واقعات یا اخلاقی مضامین ادا کئے جاتے ہیں، لیکن ان مضامین کے لئے سادگی اور پختگی درکار ہے متاخرین ہر بات میں رنگینی کے عادی ہو گئے تھے اس لئے مثنوی مثنوی نہیں رہی بلکہ غزل بن گئی، کلیم کا شاہجہاں نامہ پڑھو "رزم" لکھتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزم نشاط میں گانا ہو رہا ہے"۔

"قدما اور متوسطین کسی خیال کو پیچیدگی سے نہیں ادا کرتے تھے، متاخرین کا یہ خاص انداز ہے کہ جو بات کہتے ہیں پیچ دے کر کہتے ہیں۔

"متاخرین کی شاعری سے اگر ایہام کو الگ کر دیا جائے تو ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ دفعتاً برباد ہو جائے گا"۔ (جلد سوم ص ۲۳-۲۴)

شعر و سخن کی تنقید کے معاملے میں شبلی کسی مشہور ناقد یا تذکرہ نگار سے مرعوب نہیں ہوتے، اس تجربے کر ان کے وہ خود بہت بڑے شناور اور ان موتیوں کے قابل اعتماد جوہری ہیں، اوحدی نے وحشی، یزدی اور محتشم کے بارے میں لکھا تھا

"وقتے کہ مولانا محتشم طنطنہ شاعریش قاف تا قاف گرفتہ بود، او در برابر آمد و طرز نوی در عرصہ آورد و ہم در زمان او طرز او را منسوخ گردید"۔

اس پر شبلی کس خود اعتمادی کے ساتھ تنقید فرماتے ہیں۔

"لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں نہ وحشی نے کوئی خاص طرز ایجاد کیا۔ نہ محتشم کا کوئی خاص طرز تھا جس کو وحشی منسوخ کرتا ...."

(جلد پنجم ص ۶۸)

ابوطالب کلیم پر ایک جملہ شبلی نے لکھا ہے جو ایک دفتر کے برابر ہے۔

"یہ یگانۂ فن صحیفۂ شاعری کا آخری ورق ہے ...." (جلد سوم ص ۲۰۵)

اسی کلیم نے قصیدہ میں کیا اضافہ کیا اور کیا چیز کم کر دی۔

"قصیدہ میں حاجی محمد جان قدسی کا انداز ہے یعنی عرفی اور نظیری کی پیچدار اور مشکل بندشیں صاف کر دیں۔ مبالغہ اور حسن تعلیل کو وسعت دی، لیکن اس کے ساتھ قصیدے کی متانت زور اور بلندی کم ہو گئی۔ اور غزلیت کا رنگ غالب آ گیا"۔

(جلد سوم ص ۲۱۳)

تصوف

وحدت وجود کے مسئلہ کو شبلی نے "سرتا پا شاعری" کہا ہے۔ اور ٹھیک کہا ہے۔

"ہر چیز جو دل پر تعجب انگیزی کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے، فضائے غیر محدود، صحرائے بیکراں

سیارہ ہائے غیر متناہی - باد صرصر امواج دریا - سب مجسم شعر ہیں، اسی بنا پر وحدت وجود کا مسئلہ سرتاپا شاعری ہے۔" (ج ۵ - ص ۱۵۱)

اور

"عالمِ طبعیات میں انسان ایک حقیر اور کمزور ذرہ ہے، لیکن تصوف میں وہ ذرہ ہے جو آفتاب سے ٹوٹ کر آیا ہے اور پھر آفتاب بن جانے کا قطرہ ہے جس نے آغوش میں دریا کو چھپا رکھا ہے - نقطہ ہے جو دائرے سے ہمدوش ہے۔"

(جلد پنجم صـ ۱۴۷)

"عارف کی آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن وہ دل کی آنکھوں سے علانیہ اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک لذت محسوس ہوتی ہے، یہ کیفیت بیان میں نہیں آسکتی اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے سے

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی"

(جلد پنجم صـ ۱۵۳)

تصوف نے فارسی شاعری میں کس قدر انقلاب پیدا کیا --؟ شبلی اس انقلاب کے حدی خواں ہیں:—

"فارسی شاعری اس وقت تک قالب بے جان تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا تھا - شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے - تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا - قصیدہ، مداحی اور خوشامد کا نام تھا - مثنوی واقعہ نگاری تھی - غزل زبانی باتیں تھیں - تصوف کا اصلی مایہ خمیر عشق حقیقی ہے، جو سرتاپا جذبہ اور جوش ہے - عشق حقیقی کی بدولت مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے تمام شیشہ و دل گرما دیئے، اب زبان سے جو کچھ نکلتا تھا گرمی سے خالی نہیں ہوتا تھا ارباب دل ایک طرف - اہل ہوس کی باتوں میں بھی تاثیر آگئی ...."

(جلد پنجم - صـ ۱۲۰)

شعروں کا ترجمہ

شعر پھول سے زیادہ نازک شے ہے کہ ذرا سے چھونے سے اس کی پتیاں بکھر جاتی ہیں - اس لئے دوسری زبان میں شعر کا ترجمہ ہونا بہت مشکل ہے، ترجمہ میں مفہوم تو سمجھایا جا سکتا ہے مگر شعر کی لطافت، نازکی اور باریکیوں کو ہو بہو منتقل کرنا بہت دشوار بلکہ اکثر صورتوں میں ناممکن ہے؟

شبلی نے فارسی شعروں کے ترجمہ میں جس کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہو کر رہ گیا ہے؟ کہیں کہیں تو "ترجمہ" اصل شعر سے زیادہ لطیف محسوس ہوتا ہے! چند نمونے:—

آں کہ چوں در کتفِ چترِ ہمایوں آثار

ہم عنان ظفر از راہ غزا گردد بازہ

زہرہ گیسو بہ تشاید کہ شود گرد فشاں

ازرکابش کہ پذیرفتہ غبار از تگ وتاز
فتح گوید چہ کنی چشم من است ایں نہ رکاب
سرمۂ چشم جہاں بین مرا پاک بسا ز　　(عرفی)

"یعنی جب رسول اللہؐ جنگ کے سائے میدان غزا سے واپس آتے ہیں تو زہرہ چوٹی کھول کر چاہتی ہے کہ رکابوں پر جو گرد پڑگئی ہے اس کو جھاڑ دے۔ فتح کہتی ہے، ایں یہ کیا کرتی ہے؟ یہ رکاب تھوڑی سی ہی ہے یہ تو میری آنکھیں ہیں اس کے سرمہ کو دگرد کو سرمہ قرار دیا ہے) کیوں چھڑاتی ہے۔　(جلد سوم صلا۱۱۵)

بگذشت ز پیش من وغیرش بہ حکایت
بپیچید کہ ہرگز نتواند بہ قفا دید　　(علی قلی)

"شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق سامنے سے جارہا تھا، رقیب بھی ساتھ تھا۔ اس نے اس طرح اس کو باتوں میں لگالیا کہ معشوق مڑکر پیچھے نہ دیکھ سکا (ورنہ شاید میری طرف بھی اس کی نگاہ پڑجاتی) "بپیچید" کے لفظ سے واقعہ کی صورت جس طرح ذہن میں آجاتی ہے اور کسی لفظ سے نہیں آسکتی۔"　(جلد چہارم، صنـ۲۰)

برقع بر رخ افگندہ برو ناز بہ باغش
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

"معشوق جالی کا نقاب پہن کر باغ کی سیر کو نکلا۔ شاعر کو قوت تخیل سے یہ نظر آتا ہے کہ معشوق چونکہ نہایت نازک، اور لطیف الطبع ہے، اس لئے چاہتا ہے کہ پھولوں کی خوشبو دماغ میں آئے تو چھن کر آئے اس لیے اس نے جالی کا نقاب پہن لیا ہے۔"
(جلد چہارم صلا۴۱)

باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد
گل بہ خندہ گفت آرے ایں چنیں باید ہمی

"ہوا نے لالہ کا پیالہ اٹھاکر زمین پر پٹک دیا۔ پھول نے ہنس کر کہا خوب، یہی کرنا چاہیئے تھا۔"　(جلد چہارم صلا۶۸)

چشم چوں بر عشوہ کرد اوّل بسوئے خویش دید
پارۂ خود خورد ساقی ساغر لبریز را
(صلا۲۳۴)

"اس شعر میں جو مضمون ادا کیا ہے بڑی مشکل سے کسی اور زبان میں ادا ہوسکتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معشوق جب بن ٹھن کر تیار ہوتے ہیں تو مزے میں آکر خود اپنی سج دھج کو دیکھنے لگتے ہیں۔ شاعر اس حالت کی تصویر کھینچتا ہے اور کہتا ہے۔

"جب معشوق کی آنکھوں میں کرشمہ بھر گیا تو اس نے پہلے خود اپنے آپ پر نظر ڈالی، گویا ساقی نے جب پیالہ بھرا تو پہلے خود بھی تھوڑی سی پی لی ۔ ۔ ۔ ۔"

(جلد چہارم صـ۲۳۴)

جاتے مشام دیدہ کشودم ببوئے گل
پنداشتم کہ گرد رہ یار می رسد

"یعنی پھولوں کی جو خوشبو آئی تو میں نے بجائے اس کے کہ شامہ سے کام لیتا۔ آنکھیں کھول دیں۔ میں سمجھا کہ معشوق کے راستے کی گرد ہے۔" اس لطافت خیال کو دیکھو کہ کوچۂ معشوق کی گرد لطافت کی وجہ سے بوئے گل ہے، اس لئے پھولوں کی جو خوشبو آئی تو دھوکا ہوا کہ کوئے یار کی گرد ہے ۔ یہ خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تاب اظہار نہیں لاسکتے، گویا حباب ہیں کہ چھونے سے ٹوٹ جاتے ہیں، میں اردو میں ترجمہ کرتا ہوں اور افسوس آتا ہے کہ تمام لطافت خاک میں مل جاتی ہے ۔ ۔ ۔" (جلد چہارم صـ۲۳۵)

سیف الدولہ کے عربی اشعار کا ترجمہ کس خوبی سے کیا ہے ۔ (قوس قزح کی تشبیہ)

"ہوا نے افق پر ایک چادر پھیلا دی ہے، جس کے کنارے زمین تک لٹک آئے ہیں چادر کے کنارے پر قدرت نے سرخ سفید، سبز رنگ کی بیلیں ٹانک دی ہیں گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عروس نازنین نے اوپر تلے مختلف رنگ کے پیراہن پہن لئے ہیں، جن کے دامن بہ ترتیب ایک دوسرے سے چھوٹے ہوتے چلے گئے ہیں ۔ ۔ ۔"

(جلد چہارم صـ۱۴۱)

شعر العجم کی جامعیت

اگر فارسی شاعری کو ایک شاہد نازنیں تصور کر لیا جائے تو "شعر العجم" کے آئینہ خانہ میں اس کی ایک ایک ادا اور سج دھج دکھائی دیتی ہے! پوری کتاب ادب و معانی کا گلدستہ ہے ایک ایک سطر سے شعریت کی خوشبو آتی ہے اور مطالعہ کے دوران میں روح کو کیف حاصل ہوتا ہے، لطف و دلچسپی کی "لے" ایک لمحہ کے لئے بھی ٹوٹنے نہیں پاتی۔ شروع سے کر آخر تک نگاہ و دل کے لئے آسودگی اور کیفیت و مسرت کی فراوانی!

یہ نہیں ہے کہ "شعر العجم" میں صرف زبان و ادب کا لطف اور شعر و شاعری کا چٹخارہ ملتا ہے، اس کتاب کی علمی حیثیت سے بھی بہت بلند ہے، عوفی یزدی کے لب اللباب سے لے کر ہدایت علی خاں کی "مجمع الفصحاء" تک فارسی شعراء کے تمام قابل ذکر تذکرے مصنف کے سامنے رہے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جرمنی کے پروفیسر ڈاکٹر مسٹیٹر روس کے ناقد والن ٹن ژوکوسکی اور دوسرے یورپین تذکرہ نگاروں نولڈیکی، سرگور آوسلی اور براؤن نے فارسی شعر و ادب پر کیا لکھا ہے، ارسطو کی بوطیقا، ابن رشیق کی کتاب "العمدہ" سڑفل کے تنقیدی مضامین اور حمید الدین فراہی کی جمہرۃ البلاغہ ان سب سے صاحب "شعر العجم" نے استفادہ کیا ہے۔ عربی شعر و ادب میں مصنف کے "تبحر" نے "شعر العجم" کی علمی سطح کو بلند تر کر دیا!

"شعر العجم" میں شاعروں کے تین دور قائم کئے ہیں، قدما متوسطین اور متاخرین ۔ پہلا دور حنظلہ سے شروع ہو کر نظامی پر تمام ہوتا ہے، دوسرا کمال اسمٰعیل سے جامی تک اور تیسرا فغانی سے ابوطالب کلیم تک۔" (جلد اول۔ حصہ چہارم)

ہر شاعر کے خصوصیات کلام کو اس طرح بیان کیا ہے کہ نقد و تجزیہ کا حق ادا کر دیا ہے۔
شعر کیا ہے؟ تخییل محاکات، تشبیہ کسے کہتے ہیں۔ شاعری میں ان سے کیا کام لیا جاتا ہے، ان نازک مباحث کو چھیڑ کر "اطمینان خاطر" کی حد تک پہنچا دینا، علامہ شبلی کا بہت بڑا تنقیدی کارنامہ ہے! قصیدہ، غزل، رباعی، اور مثنوی کی ابتدا کب، اور کیسے ہوئی، کس شاعر نے کس صنف کو ترقی دی، ان میں آورد، تکلف اور انحطاط کب پیدا ہوا؟ یہ تمام مباحث "شعر العجم" کا طغرئے امتیاز ہیں، جن کے پڑھنے سے روشنی ملتی ہے!
شبلی صوفی نہیں ہیں، مگر تصوف پر جو گفتگو کی ہے۔ تو کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ محی الدین اکبر بول رہے ہیں! وہ جانتے ہیں کہ تصوف کے مضامین تو قریب قریب تمام شاعروں نے نظم کئے ہیں، مگر ہر شاعر "اہل حال" تو نہیں ہے۔

"صوفیانہ انداز چونکہ بہت مقبول ہوا۔ اس لئے تمام شعراء اسی انداز میں کہنے لگے، عرفی نظیری طالب، محتشم، شفائی، سب یہ بولی بولتے ہیں۔ لیکن صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ نری نقالی ہے، پھول ہیں، لیکن خوشبو نہیں، شراب ہے لیکن نشہ نہیں، حسن ہے لیکن دلفریبی نہیں، قالب ہے لیکن روح نہیں۔ بخلاف اس کے مولانا روم، سنائی، اوحدی، سلطان ابو سعید کا لفظ لفظ بتاتا ہے کہ کہاں سے نکلا ہے ؎

گویند ہر آں کہ یافت خاموش گردد
نے نے غلط است آں کہ یابد گوید (جلد پنجم صفحہ ۱۵۶)

شاعروں کے کلام کا موازنہ، کس کا شعر دوسرے شاعر سے بڑھا ہوا ہے اور اس کے وجوہ ترجیح کیا ہیں؟ فارسی شعروں کی دل نشین تشریح، ان کی خوبیوں کا بیان۔ پھر فارسی کی کتنی ترکیبیں تو ایسی ہیں کہ شبلی اگر ان کی شرح نہ کرتے تو یہ غنچے بند کے بند ہی رہ جاتے، وانہ ہو پاتے۔ مثلاً:-
دورگردی کے معنی ہیں الگ الگ کترتے پھرنے کے "سخت کمان" وہ شخص جس کا نشانہ دور تک جاتا ہے "آشنا رو" وہ شخص جس کے دل پر محبت کا کچھ اثر نہ ہو لیکن چہرے سے محبت ظاہر ہوتی ہو۔ "قاصدان بے تصرف" وہ قاصد جو اپنی طرف سے گھٹاتے بڑھاتے نہیں، بلکہ جو کچھ سنا اس کو بے کم و کاست بیان کر دیا۔ "نسخہ برداشتن" کتاب کا نقل کرنا۔ "از شیر باز شدن" دودھ چھڑایا جانا "بخواب گرفتن" سوتے میں لے جانا۔
"بدیہہ آفریدن" اعتراض کے جواب میں جھٹ پٹ بات گھڑ لینے کو کہتے ہیں۔ "پاس غلط کردہ واشتن" کے معنی شبلی نہ بتلاتے تو یہ شعر بھلا سمجھ میں آسکتا تھا ؎

قمریاں پاس غلط کردہ خود می دانند
ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

"پاس غلط کردہ داشتن" کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص ناواقفیت سے کوئی غلط بات کہہ جائے اور واقف ہونے کے بعد بھی اپنی بات کی پچ کرتا ہے، شعر کا مطلب یوں ہے کہ قمریوں نے غلطی سے کہہ دیا تھا کہ سرو معشوق کے قد کا ہمسر ہے، اب ان کو اپنی غلطی معلوم ہو گئی لیکن بات کی پچ کرتی ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی سرو معشوق کے اندام کی ہمسری

نہیں کرسکتا۔　　(جلد چہارم ص۲۳۳)

تاریخ وواقعات ہم اس سے بے خبر نہیں ہیں، کہ "شعرالعجم" کی تاریخی غلطیوں کی بعض ناقدین نے گرفت کی ہے اور ان کے جوابات بھی دیئے گئے۔ "شعرالعجم" میں جہاں کہیں، تاریخی واقعات کے اعتبار سے کمزوری پائی جاتی ہے ہم اس کی کوئی مدافعت نہیں کرتے، غلطی چاہے زبان و بیان کی ہو یا واقعہ و تاریخ کی اس کا پایا جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مگر شبلی نے جتنا بھی تاریخی مواد جمع کر دیا ہے وہ قابل تحسین، کوشش اور سعی مشکور ہے۔

"شعرالعجم" کی تصنیف کا اصل مقصد شعرا کے حالات کی تدوین نہیں ہے، یہ کتاب شاعری کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے "یہ کتاب تاریخی تذکرے" سے زیادہ "شعریت کی عکاس" و "ترجمان، نبض شناس بلکہ "شعر پیما" ہے! اس کے کتاب کے مطالعہ سے وجدان نکھرتا اور ادبی ذوق جلا پاتا ہے! والہ داغستانی کا سال ولادت کسی کو غلط یاد ہو، منوچہری کے باپ کے نام کا اسے پتہ نہ ہو، قزل ارسلان کے کسی جنگی کارنامے کی تفصیل اسے ٹھیک طرح یاد نہ ہو۔ مگر اس کا ذوق شعری صحتمند ہو اور شعر کو پرکھنا جانتا ہو، شبلی "شعرالعجم" کے ذریعے ایسے ہی ذوق صحیح کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لحاظ سے ان کی یہ کتاب کامیاب ہے۔

دوسرا رُخ:- "شعرالعجم" میں بعض باتیں کھٹکتی ہیں۔ شبلی نے بیدل کو نہ صرف یہ کہ نظرانداز کیا ہے، بلکہ اس کو گرایا ہے اور اسے لے جاکر ناصر علی کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ "مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا ابتدا میں وہ بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔"　　(حصہ پنجم ص۲۱)

حیرت ہے کہ وہ صائب سے متاثر ہیں مگر بیدل کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔

شبلی سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ شعرائے متغزلین کے موازنے اور اظہار کمال میں "تخییل" کے لحاظ سے نظیری کو حافظ پر ترجیح دیں گے۔!

شبلی شعروں کے انتخاب میں معجزہ دکھاتے ہیں۔ مگر یہ شعر ؎

طرز بے رحمان دیگر گشتہ بود الحق کہن
اختراع چند در نامہربانی کردہ است

انھوں نے کسی جگہ درج کیا ہے، حالانکہ اس کا مصرع اولیٰ بہت کمزور اور غیر شاعرانہ ہے!

تصوف پر ایک جگہ علامہ شبلی نے تنقید کی ہے کہ:۔

"اس مسئلہ کی تلقین کے وقت علم تصوف سفسطہ کے قریب آجاتا ہے یعنی ہر چیز کی نسبت سے پیدا کر دیتا ہے۔"　　(حصہ پنجم ص۱۵۸)

مگر بہت سے مقامات پر شعروں کی شرح اور تصوف کی تحسین کرتے ہوئے گزر گئے ہیں، حالانکہ دینی نقطۂ نگاہ سے بعض صوفیانہ اشعار، رمز و کنایہ کے پیرایہ ہی میں سہی احتساب کے مستحق تھے اور یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ شبلی محمد حسین آزاد کی طرح صرف تذکرہ نگار اور ادیب نہیں ہیں، وہ "سیرۃ النبی" اور "الفاروق" کے مصنف بھی ہیں۔

"شعرالعجم" میں مرزا غالب کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔ حالانکہ غالب کا فارسی کلام اس قابل تھا کہ اس پر ایک مستقل باب لکھا جاتا ؎

مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

وجدان مکدر سا ہوجاتا ہے جہاں شبلی نظم یا غزل "کہنے" کے بجائے جگہ جگہ "غزل لکھنا اور نظم لکھنا" استعمال کرتے ہیں!

اس دور میں جب کہ شعر و تنقید کا ذوق پست ہوتا جا رہا ہے! "شعر العجم" کے مطالعہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے آج کل ہو یہ رہا ہے کہ لفظ و بیان کی صحت و خوبی کی لوگ، پروا نہیں کرتے، ایسی ایسی بے تکی نظمیں رسالوں میں نگاہ سے گزرتی ہیں کہ وجدان فرط اذیت و کرب سے چیخنے لگتا ہے، نہ اظہار خیال کا سلیقہ نہ زبان پر قدرت، نہ نظم کے آہنگ و لہجہ کی خبر! جو لفظ ذہن میں آیا اسے جوڑتے چلے گئے! لفظوں کی کرختگی کو "انقلاب کی زبان" سمجھ لیا گیا ہے، اور بیان کی بے ربطی کا نام "جدت و ترقی" پڑ گیا ہے! تنقید کا یہ رنگ ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھ جائیے کچھ نہیں کھلتا کہ ناقد کہنا کیا چاہتا ہے؟ ژولیدہ بیانی "نئی بات نئے پیرایہ میں کہنے کا لپکا! شاعر نے شعر میں اپنی واردات کو بیان کیا ہے۔ مگر تنقید نگار اس کی شرح کرتے ہوئے "کوئلہ کی کان کی ہڑتال" سکہ کی قیمت کی کمی" اور "ملک کے بجٹ اور سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کے touches دیئے جاتے ہیں!

"شعر العجم" بے راہ روی کے اس دور میں خضر راہ بن کر سامنے آتی ہے کہ شعر کو اس طرح پرکھا جاتا ہے۔ تنقید کا یہ اسلوب ہوتا ہے بات اس انداز میں کہی جاتی ہے! علمی مواد اور تاریخی واقعات کو تنقید میں اس عنوان سے استعمال کرتے ہیں۔ طنز کا یہ ڈھنگ اور تحسین کا یہ پیرایہ ہے! لفظوں کو صحیح طور پر اس طرح برتا جاتا ہے، زبان کی سلاست تحریر کو یوں دل نشین بناتی ہے —
شبلی پر سلام و رحمت ہو کہ وہ اردو کو "صحیفہ ادب" عطا کر گئے ہیں۔

بہارِ تغزل

بابا ذہین شاہ تاجی

مصلحت حُسن کو بیگانہ بنا دیتی ہے
یہ ادا عشق کو دیوانہ بنا دیتی ہے

دو جہاں حرفِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
عقل اس بات کو افسانہ بنا دیتی ہے

عشق انسان کو انسان بنا دیتا ہے
عقل انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے

عشق کا روئے توجہ طرفِ کعبہ حُسن
ہوس اس کعبے کو بُت خانہ بنا دیتی ہے

حسن کی ایک تجلی کے ہیں دو نام ذہین
شمع بن جاتی ہے پروانہ بنا دیتی ہے

عروج زیدی

مری آسودگیٔ ذوق کا ساماں نہیں ہوتا
ذرا سا کام تجھ سے گردشِ دوراں نہیں ہوتا

اسیرِ زیست اس زنداں کو اپنے ساتھ لایا ہے
یہ دُنیا بھی نہیں ہوتی اگر انساں نہیں ہوتا

مجھے دیکھو کہ میں پروردۂ سیلِ حوادث ہوں
اُدھر کشتی نہیں جاتی جدھر طوفاں نہیں ہوتا

تری چشمِ توجہ واقعی زندہ کرامت ہے
سُنا یہ تھا مداوائے غمِ پنہاں نہیں ہوتا

زمیں جاگی، فلک جاگا، مکان و لامکاں جاگے
گراں خوابی سے کیوں بیدار اب انساں نہیں ہوتا

محبت اصلِ ایماں، جانِ ایماں، شرطِ ایماں ہے
جہاں کفرِ محبت ہو وہاں ایماں نہیں ہوتا

یہ دُنیا کس قدر بے کیف ہوتی، بے مزہ ہوتی
اگر ہاتھوں میں اُن کا گوشۂ داماں نہیں ہوتا

میکش اکبر آبادی

یہ ترا وہم و گماں، وہم و گماں ہے کہ نہیں
یہ جہاں کچھ بھی ہو لیکن یہ جہاں ہے کہ نہیں

باغباں تیری توجہ میں نہیں شک لیکن
جس سے برباد ہو گلشن وہ خزاں ہے کہ نہیں

دل کو ہونے نہیں دیتا ہوں میں مایوس مگر
ہر سحر شعلہ، ہر اک شام دھواں ہے کہ نہیں

جس میں رکھ چھوڑیئے اُن مست نگاہوں کی شراب
ایسا شیشہ کوئی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

دل میں جو آپ نے رکھا ہے چھپا کر وہ راز
دیکھئے تو مرے چہرے سے عیاں ہے کہ نہیں

خون سے اپنے جو سینچا تھا وہ گلزار سخن
آج تاراجِ بہارِ دگراں ہے کہ نہیں

جس کو تم خود بھی نہ سمجھو وہ زباں ہے مانا
سب سمجھتے ہیں جسے وہ بھی زباں ہے کہ نہیں

سحر رامپوری

اے دیکھنے والو! مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو[1] تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے
اپنی محفل بھی نہیں اپنے چراغوں کیلئے ہم تو چپ ہیں مگر اوروں کی نظر جاتی ہے
بہت داستانیں بنی ہیں حقیقت مری داستاں، آجتک داستاں ہے
پہلے ڈھل جاتا تھا، کچھ دل کا غبار اب تو رونے سے بھی کچھ حاصل نہیں
ڈھونڈے سے بھی ملنے کا نہیں نام وفا کا ارباب جفا بھی ہمیں کیا یاد کریں گے
زمانے میں ہیں وہ بھی میں تو پھر کیوں زمانے کی شکایت کر رہا ہوں
زندگی بیچ کے ترے غم سے جہاں گزری ہے ایک لمحے کی مسرت بھی گراں گزری ہے
مری دُنیا کا حال کیا جانیں جن کی دُنیا میں دن ہے رات نہیں
یوں ہی رہی بہار اگر گلستاں کے ساتھ وابستہ ہو نہ جائیں امیدیں خزاں کے ساتھ

ہر اک اُفتاد کو کہنے لگا ہے مصلحت اُنکی
سحر، اب کوئی عالم ہو پریشاں ہو نہیں سکتا

---

[1] یہ شعر بہزاد لکھنوی کے نام سے مشہور ہے مگر درحقیقت یہ میرا شعر ہے اس کے ثبوت میں بہزاد صاحب کا "نغمہ نور" موجود ہے ... سحر رامپوری

روحِ انتخاب

جس احساس کو عام طور پر "زمانے کے تقاضے" کے نام سے بیان کیا جاتا ہے وہ درصل زمانے کے تقاضے نہیں بلکہ مغربی اقدار کے تقاضے ہیں، جنہیں ان متجددین کی ذہنی مرعوبیت نے زمانے کے ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ انھوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ زمانہ درصل مغرب ہی ہے اور جو کچھ وہاں اس وقت موجود ہے وہی صحیح اور برحق ہے اور فطرت کے عین مطابق۔ اس لئے ہمارے اپنے ملک اور قوم میں اگر کوئی چیز ایسی موجود ہے جس کی نظیر وہاں نہیں ملتی تو وہ بوسیدہ اور ناکارہ ہے اور اس لائق ہے کہ اسے فوراً مٹا دیا جائے۔ اسی طرح اگر وہاں کسی نظریہ یا عمل کو قبولِ عام ہے اور ہمارے ہاں وہ ناپید ہے تو ہمیں اسے فوراً رواج دینا چاہیئے کیوں کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر ہم زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کرسکیں گے اور زمانہ ہم سے ہماری رجعت پسندی کی بنا پر سخت انتقام لے گا۔

یہ بنیاد جس پر ہمارے متجددین کے فکر و عمل کی ساری عمارت تعمیر ہوئی ہے یہی غلط اور کمزور ہے، مغربی اقدار کو زمانے کے تقاضے نہیں کہا جاسکتا اور نہ مغربی تہذیب کے استیلاء کو فطری مجبوریوں کا نام دیا جاسکتا ہے مغربی تمدن کوئی معیار حق و باطل نہیں جس کے مطابق ہم اپنے افکار و اعمال کو پرکھنے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک باطل تہذیب کی عملداری اور غلط رجحانات کا دھارا ہے جسے ہم اپنی کوتاہ نظری سے زمانے کے تقاضے یا عصری مطالبات سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک ہمارے فکر کی بنیادی خامی ہے۔

ہم جب کبھی اپنے معائب کا جائزہ لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو مغرب کی عینک لگا کر ساری صورتِ حال پر نگاہ ڈالتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے عیوب اور کمزوریوں کو اچھی طرح دیکھ نہیں پاتے۔ ہماری تنقید کا ہدف پھر کر وہی موضوعات بنتے ہیں جو مغرب کی نظر میں قابلِ اعتراض ہیں اور جن میں اہلِ مغرب ترمیم اور تصحیح چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے پورے معاشرتی، سیاسی، سماجی اور روحانی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں اور اُن پہلوؤں میں تغیرات کا مطالبہ کرتے ہیں جن میں کسی تبدیلی کی سرے سے ضرورت ہی نہیں اور اُن حصوں کو صحیح سمجھ کر جوں کا توں رہنے دیتے ہیں جو سرتاپا غلط ہیں اور جن کی وجہ سے ملت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ اسی بنیادی نقطہ نظر کے تغیر کا اعجاز ہے کہ آج اس ملت میں رقص و سرود، قماربازی اور زنا کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو کسی تشویش کی نگاہ سے نہیں دیکھا جارہا ہے بلکہ اس کی باقاعدہ پشت پناہی ہورہی ہے اور اگر کسی چیز سے ہم پریشان نظر آتے ہیں تو وہ عفت و عصمت کا وہ مضبوط نظام ہے جو ہمارے اخلاق کے لئے حصار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہے وہ غلط نقطہ نظر جس نے ذم کو مدح، معائب کو محاسن اور مثالب کو مناقب میں بدل دیا ہے اور ہم خواہ مخواہ احساس کہتری میں مبتلا ہوکر صحیح تصورات کو بھی باطل ٹھہرا رہے ہیں۔

(عبدالحمید صدیقی - ایم اے)